



ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA

JAMIA NAGAR

NEW DELHI

CALL NO.

Accession No.

Call No.....

Acc.No.....

Accession Number

.....

Date



قیمت فی کاپی ۶۰

سالنامہ "منار" ۱۹۵۱ء

مُستقبل کی تلاش میں

انتساب

دُنیا کے تمام کاشتکاروں، مزدوروں اور
جماعتِ اسلامی کے ہر ہر فرد کے نام

شیرشو، شیرانہ در صحرائے شیراں پائے نہ
مردشو، مردانہ پندِ ناصحاں را گوش گیر

نیاز

ایک مستقبل کی تلاش میں (مارس ہنڈس)

مترجم - لطیف الدین احمد اکبر آبادی

جنگ عظیم کے بعد اسلامی سلطنتوں کا انقلاب

نیاز فچپوری

اظہار تشکر

میں جناب لطیف اکبر آبادی کا حد درجہ ممنون ہوں کہ انھوں نے مارس ہنڈس کی کتاب کے ترجمہ و تلخیص کا بار اپنے سر لیکر سالنامہ کی طیاری میں میری بڑی مدد فرمائی
نیاز

ایک مستقبل کی تلاش میں

حال ہی میں ایک یورپین سیاح مارس ہنڈس (Marx Hinds) کی کتاب شائع ہوئی ہے، جس کا نام ہے ”In search of a future“۔ یہ کتاب نتیجہ ہے ایران، مصر، عراق اور فلسطین کی سیاحت کا جو اس نے صرف اس غرض سے کی تھی کہ وہاں کے حالات کا مطالعہ کر کے ان ملکوں کے مستقبل کے متعلق خود کو نئی رائے قائم کر سکے۔ اس نے سیاحت کے لئے اس سرزمین کو اس لئے پسند کیا کہ مشرق وسطیٰ کے مسائل سے روس و امریکہ کو جو گہرا تعلق حاصل ہے، اس کے اسباب و نتائج کو اچھی طرح سمجھ سکے کے لئے خود وہاں جانا ضروری تھا۔ اس نے ایران میں کافی وقت صرف کیا کیونکہ یہاں وہ ملک ہے جو روس و امریکہ کے درمیان عرصہ سے ”استخوان جنگ“ بنا ہوا ہے اور جس کا وزن یہاں کی سیاسی ترازو کے پلہ کو جس طرف چاہے جھکا سکتا ہے، اس نے گاؤں گاؤں جا کر یہاں کی اقتصادی و معاشی حالات کا مطالعہ کیا، اس نے ہر طبقہ کے لوگوں سے ملکر ان کے رجحانات کا پتہ چلایا اور وہ یہاں کی آبادی کے افلاس، ملک کی تباہ حالی اور حکومت کی پچھلی سے اس قدر متاثر ہوا کہ بجائے اس کے کہ وہ یہاں کی سیاسیات کا مطالعہ کرنا یہاں کے اقتصادی حالات پر آنسو بہانے لگا اور سوچنے لگا کہ اس خوبصورت، زرخیز، شاداب و منگھٹھری زمین کو اس کے ہونا کے مستقبل سے کیونکر بچایا جاسکتا ہے۔

انہیں تاثرات کو لئے ہوئے وہ ایران سے مصر گیا، اور مصر سے عراق و فلسطین پہنچا، لیکن پہلے اسکے کہ ان تاثرات میں کمی ہوتی، ان میں اور اضافہ ہوتا گیا، کیونکہ اس نے ان ملکوں کی حالت بھی دیکھی ہے خراب پائی اور وہ آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر مشرق وسطیٰ کی مسلم حکومتوں اور مسلمانوں کو دنیا میں باقی رہنا ہے تو انہیں فلسطین کی اسرائیلی حکومت سے سبق لینا چاہئے میں نے صحرا اور ریگستان کو چند دنوں میں غور جانے کیا ہے کیا بتا دیتا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ اگر فلسطین میں یہودی نہ ہوتے تو

مشرق وسطیٰ کی نجات کے لئے یہودی پیدا کرنا پڑتے تاکہ ان کو دیکھ کر مشرق وسطیٰ کے مسلمان سمجھ سکیں کہ محنت و کوشش اور صحیح دسالیہ تڑا میرے انسان کیا نہیں کر سکتا۔

اس نے ایران، مصر اور عرب ہر جگہ عام آبادی اور خصوصیت کے ساتھ کاشتکاروں اور مزدوروں کے حالات کا مطالعہ کر کے افسوس کیا ہے کہ مصر میں جسے کروڑوں زمین کا چمنستان کہنا چاہئے۔ تین چوتھائی وہی آبادی پاؤں کی ایک خاص بیماری (Bilham) میں صرت اس لئے مبتلا نظر آتی ہے کہ وہ جوتا نہیں خرید سکتے۔ شام کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہاں کی دو تہائی آبادی گاؤں میں رہتی ہے اور چھ حصہ زمین کا ان زمینداروں کے قبضہ میں ہے جنہوں نے جا کر کبھی یہ بھی نہیں دیکھا کہ کاشتکاروں کی حالت کس قدر خراب ہے۔

عراق میں جہاں قابل کاشت زمین کی کمی نہیں، صرت چھ حصہ کاشت کیا جاتا ہے اور وہ بھی نہایت تکلیف دہ مصیبت کے ساتھ۔ وہ کہتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے کاشتکار بلقہ کا تصور کر لیں ”فائدہ دمت“ کا تصور کر لیں اور یہاں کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی، صحت پانی حاصل کرنے کے لئے بھی ان کے پاس پیسہ نہیں ہے، یہاں کے لوگ جانوروں کو بھی اپنے ہی جھونپڑوں میں رکھتے ہیں اور گندگی نے ان کی صحتوں کو بالکل تباہ کر رکھا ہے۔

سیاح مذکور جب ان ملکوں کی سیاحت کر کے اسرائیلی حکومت میں پہنچتا ہے تو اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی اور اس کو یقین نہیں آتا کہ کیا یہ بھی اسی سرزمین کا حصہ ہے، جسے وہ اس قدر بد حال دیکھ چکا ہے۔ چھ مہینے کی سیاحت کے بعد سب سے پہلے اُسے یہیں جراثیم بھری ہوئی گرد و ایک سلیقہ کی دوکان سے ناسپاتی لیکر کھا سکتا اور صحت پانی سے نہا سکتا۔

نڈس، یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ اسرائیلی حکومت کیونکر چند دنوں میں صحرا اور ریگستان کو باغ و بہار بنا سکی۔ اس نے دلدلی زمینوں کو جہاں کے مچھروں سے طیرا پھیلتا تھا ختم کر دیا، آبپاشی کے ذرائع پیدا کر کے خشک ریتیلے میدانوں کو گلزار بنا دیا، ان حصوں کو جہاں کبھی غلہ کا ایک دانہ پیدا نہ ہوتا تھا، ہری بھری کھیتوں میں تبدیل کر دیا اور ان مقامات میں جہاں لوگ پانی کے ایک ایک قطرہ کے لئے ترستے تھے نہریں بہا دیں۔ اور یہ سب اس لئے ہو سکا کہ انہوں نے سب سے پہلے کاشتکاروں کی اصلاح کی، کاشت کے نئے طریقوں سے انہیں آگاہ کیا، کاشتکاروں میں زرنگی کا وہ احساس پیدا کیا جس سے وہ اس وقت تک بالکل بے خبر تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسطین کی بے آب و گیاہ زمین سونا لگانے لگی۔

سیاح مذکور کہتا ہے کہ ایران، مصر و عراق سب کو اسرائیلی حکومت سے سبق لینا چاہئے اور اگر

وہ تودہ رہنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے انھیں کاشتکار طبقہ کی اصلاح کرنا چاہئے۔

اس نے ایران میں تودہ تحریک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے اپنے ایک سال کے دوران اقتدار میں آذربائیجان کے اندر کافی اصلاح کرنا چاہی لیکن وہ معمولی سی طہرائی فوج کے سامنے ٹھہر کر۔ حالانکہ کچھ زمانہ قبل اسی فوج کو کاشغائی علاقہ کے قبائل نے شکست فاش دیدی تھی) اس کا سبب یہ تھا کہ تودہ تحریک کاشتکاروں کی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوئی اور ان کی حمایت نہ حاصل کی۔ لیکن یہ سمجھنا کہ کاشتکاروں کی یہ یقین حالت ہمیشہ ایسی ہی رہے گی غلط ہے، کیونکہ روس میں بھی کاشتکاروں کی بالکل یہی حالت تھی اور جب ان کا پیادہ صبر لبریز ہو چکا تو انھوں نے حکومت کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔

سیاح ذکور لکھتا ہے کہ: ”ہمارے مدیرین یہ تو سوچتے رہتے ہیں کہ روس کے اقدامات اور اشتراکیت کی ریشہ دوانی کو کیوں کفر قلم کیا جائے، ایشیا و افریقہ کی انقلابی تحریکوں پر کس طرح قابو پایا جائے، مٹی نہ مٹی نہیں کھود کر معلوم کیا جائے کہ پٹرول کے چشمے کہاں کہاں ہیں، اور جدید مالیاتی منصوبے قائم کر کے نئی نئی منڈیاں پیدا کی جائیں۔ لیکن غریب فلاح و کاشتکار کو کوئی ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ انھیں سمجھنا چاہئے کہ اگر زمین کے مسئلہ کو طے نہ کیا گیا تو کاشتکار خود اسے طے کرے گا اور اس کا نتیجہ دہی ہوگا جو روس میں ہوا اور اب چین میں ہمارے سامنے ہے یعنی اشتراکیت اور صرف اشتراکیت“۔

(نیاز)

پیش لفظ یہ کتاب ان ملکوں کے حالات پر ہے جو اپنا مستقبل پالنے کی جستجو میں ہیں، یعنی ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ۔ اس کتاب کا موضوع انھیں ملکوں کی آبادی اور سرزمین ہے، وہاں کے شہروں اور کچھ کا ذکر محض ضمنی طور پر آیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہودی فلسطین جس کا نیا نام اسرائیلی حکومت ہے ان قوموں کی ترقی کے لئے ایک عمدہ مثال بن سکتا ہے، بشرطیکہ وسطی مشرق کی مسلمان قومیں اپنے اپنے ملک کی طبیعت حالات کے پیش نظر اس دستور العمل سے فائدہ اٹھائیں جو اسرائیلیوں نے صحرا و بیابانوں کو سرسبز و زرخیز بنا کر پیش کیا ہے اور اگر انھوں نے ایمان نہ کیا تو انھیں ایک سخت خونیں انقلاب کا منتظر رہنا چاہئے، جس کا رہرسل ایرانی آذربائیجان میں بھی ہو چکا ہے۔

یہودی فلسطین آج سے ایک نسل پہلے تک اسی طرح خواب خیز گوش میں مبتلا تھا جس طرح عرب فلسطین۔ لیکن اس مختصر زمانہ اسرائیلی فلسطین میں باوجودیکہ وہ بیرونی اور خصوصاً برطانوی اثرات کا ہدف بنا رہا، حیرتناک

ترقی کرنی ہے اور اس علاقے کی اندرونی ترقیوں کا نہایت مکمل دستور العمل بن چکا ہے، اس کے برعکس مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک جو ابھی تک بیرونی مداخلت سے محفوظ ہیں، اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے اندھیرے کوٹھل رہے ہیں۔ یہ تصنیف نہ تو سیاسی بحث و بحث ہے نہ تاریخی مقالہ۔ مجھے صیہونی یا عربی فلسفے سے بھی واسطہ نہیں ہے۔

اس کتاب میں میرا واسطہ عربوں، ایرانیوں، مصریوں اور یہودیوں سے صرف انسانیت کا واسطہ ہے۔ فلسطین کا لفظ جن سیاسی اختلافات اور تاریخی موضوعات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے جو بین الاقوامی نزاعیں پیدا ہو سکتی ہیں، اس پر نہایت قابل لکھنے والوں نے قلم اٹھایا ہے۔ لیکن فلسطین کی ریل کمیشن نے ۱۹۷۳ء میں جو رپورٹ شائع کی ہے وہ اس مسئلہ پر نہایت واضح تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ Sumner Welles کی تصنیف We can not fail بھی ایک ایسی کتاب ہے جو اس موضوع پر جامع اور دستاویزی شہادت ہونے کے ساتھ ہی برطانوی ذمہ داریوں اور ناکامیوں، امریکی وعدوں اور بدعہدیوں پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔

اسرائیلی حکومت کا مستقبل جو کچھ بھی ہو۔ لندن کا دفتر خارجہ اور امپیریل جنرل اسٹاف یہودیوں کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے، مگر اس قوم کا یہ روشن کارنامہ کہ اس نے ریگستانوں کو سرسبز و شاداب باغوں میں بدل دیا ہے کبھی نہیں بھلایا جاسکتا۔ غرض قسمتی سے میں آنجنابی Zaid al-Rikabi سے متعارف تھا۔ ایک ملاقات کے دوران میں اس نے ایشیائی ملکوں کی پستی کے متعلق ایک نہایت اہم بات کہی کہ ”ان کروڑوں کسانوں کے پاس اگر صرف اتنی زمین ہوتی کہ وہ سال میں ایک جوڑا کپڑوں کا، ایک جوڑا جوتہ، دو بنیان، دو قمیص اور دو سوزے ہی خرید سکتے تو خیال کرو کہ ہم ان کے ساتھ کتنی بڑی تجارت کر سکتے تھے!“۔ دلی خود پانچ زراعتی فارموں کا مالک تھا اس لئے کاشت اور آزمائشی کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔ اور اس کا یہ کہنا کہ افریقہ و ایشیا کی نہایت پست قوموں کے افلاس کی جڑ آزمائشی کی غلط تقسیم ہے، نادرست نہ تھا اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ کروڑوں انسانوں کی زمین سے محرومی اور اسی کے ساتھ پڑانے طریقوں اور آلات سے کاشتکاری کے اندر وہ طوفان بھی چھپا ہوا ہے جو چالاک کھیتی کے دھوئیں کی طرح دنیا کے بہت بڑے حصے پر منڈلا رہا ہے اور اس وقت ایران، مصر، عراق اور ایشیا و افریقہ کے دوسرے ملک بھی اس طوفانِ عظیم کے منظر ہیں۔ — باوجود اس کے کہ اسرائیلیوں کی زرعی پالیسی اور ترقی، اس کی آبادی کی صحت مندی، کاشتکاروں کی پر اُمید زندگی، بلاشبہ ایک مستحکم چٹان ہے مگر تنکا اعرار و فی امن و سکون یقیناً اقلیتوں کے ہاتھوں خطرے میں ہے۔ یہودی فلسطین نے جو امن اور خوش حالی حاصل کر لی ہے وہ ایسی چیز نہیں ہے جسے وسطی مشرق کی مسلمان قومیں حاصل نہ کر سکتی ہوں۔

David Ben-Gurion ایک اسرائیلی گاؤں کا نام ہے۔ میں اس گاؤں کو دیکھنے گیا تھا اور جب میں اس کے

رہنہ کھیتوں میں گھوم رہا تھا، میں نے دیکھا کہ سیاہ چادریں اوڑھے عرب عورتوں اور بچے بڑے کپڑے پہنے عرب بچوں کے ہجوم نے ایک یہودی کی گاڑی پر تہ بول دیا ہے۔ میں نے اسے فرقہ واری بلوہ سمجھ کر گاؤں کے سکڑے یہودی کے سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا کہ بلوہ نہیں ہے بلکہ جب کوڑے کی گاڑی آتی ہے تو یہ لوگ اس میں سے کچھ کاٹ کر چیزیں ڈھونڈنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں اور گودے وغیرہ چن لے جاتے ہیں۔

یہودیوں کے پاس کوئی نیا موسیٰ نہیں آیا جس نے اپنا عصا مار کر فلسطین میں پانی کے چشمے جاری کر دئے ہوں، بلکہ یہودیوں نے اسی زمین سے پانی نکال کر صحرا کو سیراب کیا اور زمین کو زرخیز بنا دیا ہے۔ انہوں نے ایک کے سوا باقی سب دلدلوں کو خشک کر کے طاعون اور ملیریا کو ختم کر دیا ہے جو صدیوں سے عرب باشندوں کے لئے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے صحرا اور پہاڑیوں پر اپنا پسینہ اور روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ ایشیا و مغربہ میں یہودیوں سے زیادہ ہوشیار اور محنتی شاید ہی کوئی ہو۔ ان مقامات کی مردہ زمین میں اس طرح کہیں بھی جان نہیں ڈالی گئی کہ بیا بانوں میں روٹی اور پھل اُگنے لگے ہوں۔ انکار رفتہ موسیٰ کو کوئی زندگی دینا، بھیڑ، بکریوں اور دیگر مویشی کو کار آمد و نفع بخش بنالینا اور پولٹری کی افراط اس میں شک نہیں بڑا کارنامہ ہے۔

اسرائیل کے یہودی دولت مند تو نہیں بن گئے ہیں مگر سالانہ ایک جوڑا کپڑا اور جوتا جس کا ذکر وہ لکھنے لگا تھا ضرور خرید سکتے ہیں۔ یہ بات عرب ملکوں کے لئے خواب کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کتاب کے صحیح مخاطب چونکہ امریکن لوگ ہیں اس لئے میں نے ایران کے ذکر کو زیادہ جگہ دی ہے۔ میں نے جن ملکوں کی سیاحت کی ان میں ایران سب سے زیادہ دلکش ملک ہے۔ ایک غیر ملکی نے ایران کو ”امریکہ کی لاٹلی“ کا نام دیا تھا۔ بلاشبہ روس اور امریکہ کی کشاکش میں ایران کبھی کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ایران تو امریکہ کی لاٹلی ہونا چاہئے۔

ایک انگریز مصنف (A. C. Edwards) نے لکھا ہے کہ ”ایران میں جو حکومت بھی قائم ہوتی ہے، بیشتر برطانوی یا روسی سفارت خانے کی اشارہ سے قائم ہوتی ہے۔ مجھے اس پر اعتراض ہے۔ کیونکہ غیر ملکی اثر کے اعتبار سے امریکہ، روس اور برطانیہ دونوں پر سبقت لے گیا ہے۔ چنانچہ آج ایرانی فوج کی نئی تنظیم، امریکن فوجی مشن کے ہاتھوں ہو رہی ہے اور پولیس کو از سر نو منظم کرنے کے لئے بھی امریکہ ہی کا ایک فوجی افسر مقرر کیا گیا ہے۔

امریکہ کے دوست اور دشمن صحیح یا غلط طور پر مسئلہ میں ایران کو صوبہ آذربائیجان میں جو کامرانی عام ہوئی اس کا سبب امریکہ ہی کو قرار دیتے ہیں اور وزیر اعظم غضام نے روس سے تیل کی جن مراعات کا وعدہ تھا اور مسئلہ میں مجلس نے جن استقلال کے ساتھ اس روسی مطالبہ کو مسترد کیا، وہ بھی امریکہ کے اثر نفوذ ہی کا نتیجہ تھا۔

لیکن امریکہ کے اس اثر و نفوذ نے باوجود ایران کا حسد و دشمنی کے لئے ایک مشکل مسئلہ بنا دیا ہے اور آئندہ امریکہ کا یہ اثر رہے یا نہ رہے لیکن میں اپنے یقین کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ایران کے بارے میں دانشمندی کو جتنی وسیع اور مکمل معلومات حاصل ہیں ایسی وسط ایشیا کے کسی دوسرے ملک کے بارے میں حاصل نہیں ہیں۔ باوجود ایران کی سفارت کے زمانہ میں، جو خود ایک صحافی رہ چکا تھا۔ اس کے اشارات کی توجہ سے ایرانی زندگی کا کوئی پہلو مشکل سے بچ سکا۔

کے انجینئرنگ فرم *McDonnell Douglas* کی آٹھ سو صفحے کی رپورٹ ایران کے متعلق اطلاعات کا ایک خزانہ ہے۔ یہ رپورٹ حکومت ایران کی خواہش پر اس فرم کے ماہروں نے طیارہ کی تھی، لیکن یہ رپورٹ شایع نہیں ہوئی۔ مجھے طہران نیشنل بینک کے گورنر نے اس کی کاپی دیکھنے کو دی تھی اور اس سے میں نے اندازہ کیا کہ یہ رپورٹ ایران کی کتنی بڑی خدمت ہے۔ ایران کے متعلق ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان جو معرکہ بھی ہو اور اس ملک میں امریکہ کی موجودہ پوزیشن باقی رہے یا نہ رہے، لیکن جو مواد اور معلومات امریکہ کے پاس ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ایرانی کے باب میں پریسیڈنٹ کانگریس کوئی غلطی کر بیٹھے تو اس کا سبب یہ نہ ہوگا کہ امریکہ کو یہاں کی بابت کافی اطلاعات حاصل نہ تھیں۔

ان تمام حالات کے پیش نظر یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت اسرائیلی حکومت ہی تنہا ایسی حکومت ہے جو نہ صرف ایران بلکہ مصر، عراق اور شام وغیرہ کو بھی غمزدگی کا کام دے سکتی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ اسرائیلی اصولی ترقی جوں کے توں ان ملکوں کے لئے موزوں ہوں گے لیکن یہ ضرور سمجھنا ہوں کہ وہ یہودی حکومت کو سامنے رکھ کر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

فلسطین کے یہودیوں کے بارے میں لارنس آف عربیہ نے قیس سال پہلے لکھا تھا:-

”ان کی (یہودیوں کی) اسکیموں کی کامیابی کا انحصار اس پر ہوگا کہ موجودہ عرب آبادی خود

ان کی (یہودیوں کی) مادی و اقتصادی سطح پر آجائے۔ یہ کام یہودیوں کی ترقی کر لینے کے فوراً

بعد شروع ہو جانا چاہئے۔ ایسا ہو سکا تو عرب دنیا کے مستقبل کے لئے اہم نتیجہ رونما ہو سکیں گے۔

اسرائیلی حکومت سے عربوں کی دشمنی کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو، لیکن اب وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ یہودیوں نے کس کامیابی کے ساتھ اپنے مسائل کو حل کیا اور اسے نظر انداز کر دینا بالکل ایسی بات ہوگی جیسے ڈاکٹر کسی کو فیلین تجویز کرے اور وہ انکار کر دے محض اس لئے کہ اس علاج سے اس کا پڑوسی جس سے اس مرض کی مخالفت تھی شفا پا چکا ہے۔

پہلا باب

(ایران)

دنیا کے سر پر اپنا سفر میں نے صینا (سوئٹزرلینڈ) سے شروع کیا، اور طہران پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ میں دنیا کے آخری سر پر پہنچ گیا ہوں۔ طہران، ایران کا بہت بڑا، نئی وضع قلع کا شہر ہے، جس کی آبادی ساڑھے سات لاکھ ہے، مگر ہوائی جہاز یہاں بہت کم آتے ہیں، کیونکہ اس طرف مسافروں کی آمد و رفت اتنی کم ہے کہ ہوائی کمپنیاں اپنے اڈوں کے مصارف نہیں نکال سکتیں۔

امریکہ کی ہوائی ڈاک ہندو دن سے پہلے طہران میں تقسیم نہیں ہوتی اور کبھی کبھی پورا مہینہ لگ جاتا ہے۔ یورپ کے اخباروں کا طہران کے گلی کوچوں میں بکنا تو بڑی بات ہے، اخبار فروشوں کے ہاں بھی نہیں ملتے۔ اور اگر پہنچتے بھی ہیں تو بہت دیر میں۔ ہاں قریب کے روسی علاقے کے اخبار ضرور آ جاتے ہیں، مگر روسی زبان جاننے والوں کے لئے بھی ان میں دنیا کی خبریں خاص ترتیب و سلیقہ کے ساتھ نہیں دی جاتیں۔

دنیا کے حالات سے بے خبری کا احساس جتنا مجھے طہران میں ہوا، کہیں نہیں ہوا۔ جن سیاحوں کی اپنے ملک کے سفارت خانوں تک پہنچ ہوتی ہے وہ البتہ طہران میں دنیا کے حالات و واقعات سے اتنے بے خبر نہیں رہتے کیونکہ ہر سفارت خانہ تازہ خبریں حاصل کرنے کا انتظام رکھتا ہے، لیکن غیر ملکی سیاح جس کی رسائی اپنے سفارتخانہ تک نہیں دنیا کے حالات سے بالکل بے خبر رہتا ہے۔ غیر ملکی زبانوں میں سے صرف فرانسیسی زبان کا ایک اخبار ”روزان دو تہران“ یہاں چھپتا ہے۔ مگر اس اخبار میں صحافت کی تمام خوبیاں ہونے کے باوجود دنیا کے تازہ واقعات کی صحیح اطلاع نہیں ملتی۔ چنانچہ میرے قیام طہران کے دوران میں دو مرتبہ یہ افواہ اڑی کہ روس و امریکہ میں جنگ چھڑ گئی ہے۔

تہران صبح منے میں مشرق ہے، پُرسکون و غوا بیدہ! تہران کو شورش و ہنگامہ بھی بمشکل جنبش دے سکتا ہے۔ اس شہر کے حال و مزاج کا اندازہ یہاں کے نقیروں اور کتوں سے ہوتا ہے؛ افریقہ و ایشیا کے سارے

فقیروں میں تہران کا فقیر بڑا مسکین و خوش مزاج فقیر ہے۔ یہاں ہر موڑ پر ہر گلی کوچے میں میلے کچیلے، لنگڑے لوگ نظر آتے ہیں، کوئی بیساکھیوں پر چل رہا ہے، تو کوئی سکڑا ہوا بڑا ہے، کوئی بے ٹانگوں کے گھسٹ رہا ہے تو کوئی درخت یا دیوار کا سہارا لے کھڑا ہے، ان کا ٹھکانا راستے اور فٹ پاتھ ہیں، جہاں بیٹھے ہیں وہیں سو جاتے ہیں اور سوتے وقت اپنی ٹوپی اٹھی کر کے رکھ دیتے ہیں تاکہ گزرنے والے خیرات کی یاد نہ بھولیں۔ تہران کے فقیر براہ راست سوال نہیں کرتے۔ میرے قیام تہران میں صرف ایک فقیر نے مجھ سے سوال کیا اور دور تک پیچھا بھی کیا۔ اس کے برخلاف قاہرہ کے فقیر جب انھیں مایوسی ہوتی ہے تو برا بھلا کہنے سے بھی باز نہیں رہتے۔

تہران کو شہر نہیں بلکہ ایک تمدن کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا، اور تمدن بھی ایک نہیں بلکہ مختلف تمدنوں کا مجموعہ۔ جس کیفیت کی کاریوں میں یکساں طور پر پانی نہ پہنچے گا پیداوار اتنی ہی ناہموار ہوگی۔ یہی کیفیت تہرانی کچھر کی ہے۔ پُرانے بازار تنگ پٹے ہوئے ہیں جہاں گرمیوں کی تپا دینے والی دھوپ ستا سکتی ہے اور دھندلوں کی بر فباری۔ پُرانے شہر کی گلیاں ٹیڑھی میڑھی ہیں اور بازاروں میں کافی شور ہوتا رہتا ہے، سردی کے موسم میں دکتی ہوئی انگلیٹھیاں ہر جگہ دکھائی دیتی ہیں، بو اور خوشبو، جھنکاریں اور راگتیاں، طہران کی قدامت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن پرانی آبادی سے ماہر ہر طرف کشادہ سڑکیں اور نیا بان ہیں۔ سڑکوں پر سایہ دار درختوں کی دو روئے قطاریں، مجلسا دینے والی دھوپ سے پناہ دیتی اور آنکھوں کو طراوٹ پہنچاتی ہیں۔ گرمی کے موسم میں خاص طور پر ٹھنڈے پانی کے مشینز اُٹھائے، سقے پیاسوں کو پکار پکار کر پانی پلاتے پھرتے ہیں ایران میں دودھ بھی مشینوں ہی میں لایا جاتا ہے، اور اس وجہ سے خراب بھی جلدی ہو جاتا ہے۔

ٹیکسی اور بس سروس کا انتظام حال ہی میں ہوا ہے، اور سچ یہ ہے کہ تہران کی یہ سروس بہترین سروس ہے۔ نئی، خوبصورت اور چمکیلی گاڑیوں کا ایک بیڑہ انگلستان سے یہاں پہنچا ہے۔ طہران کی ٹیکسی سروس اس میں شک نہیں قابل رشک چیز ہے۔ البتہ بوڑھا ”در دشتی“ (کوچباں) اس سے خوش نہیں ہے۔

سارے شہر میں ہمہ وقت یہ تیز رو اور سستی ٹیکسیاں دوڑتی پھرتی ہیں، اور بھروسے کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس باب میں سہولت و آرام کے اعتبار سے تہران کو دنیا بھر کے شہروں پر فوقیت حاصل ہے۔ نقل و حمل کی اس خوبصورت و راحت رساں سواری کے ساتھ ساتھ بار برداری کے گدھوں اور اونٹوں کی قطاریں بھی سڑکوں پر دیکھی جاتی ہیں، اس لئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ طہران کا چہرہ جوان اور جسم بوڑھا ہے اور یہ کارنامہ ہے رضا شاہ پہلوی کا۔

رضا شاہ اور روسی دار پٹر اعظم میں مماثلت تام ہے۔ پٹر کی طرح رضا شاہ ایران کی پستی سے بہتر اور

اسے یورپ کے سانچے میں ڈھال لینے پر تل گئے تھے، کچے مکاں اور چھپر ڈھاندے گئے، کچے گلیاں صاف کی گئیں، بدبودار چشے اور تالاب خشک ہوئے، اور ان کی جگہ نئی اور عالیشان عمارتیں، سیدھی اور وسیع سڑکیں اور بازار بن گئے۔ پیر کی طرح رضا شاہ نے بھی ناراضی و مخالفت کی پروا نہ کر کے سختی سے کام لیا، اور جس طرح روس کی آبادی پیر سے خوف زدہ تھی اسی طرح ایرانی عوام رضا شاہ سے ڈرتے تھے۔ ایرانیوں نے صدیوں سے زندگی میں اتنا تیز انقلاب نہیں دیکھا تھا کہ سروں کی پگڑیاں دم بھر میں جیٹ کی صورت اختیار کر لیں، اور لمبی عباؤں کوٹ پہنوں بن جائیں۔ ایرانیوں کے خواب میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ نقاب پوش خاتونیں دیکھتے دیکھتے نقاب ترک کر کے میم بن جائیں گی!۔

۱۳۰۰ء میں ایرانی عورتیں ریٹوراں اور سینا گھروں میں داخل ہوئیں۔ شروع شروع میں کم عورتوں نے ایسی دلیری دکھائی! لیکن ۱۳۳۰ء میں جب تہران گرل ہائی اسکول کی لڑکیوں نے ورزش کی نمائش کی اور رضا شاہ، معہ اپنی ملکہ اور خیمہ زادوں کے مغربی لباس میں یہاں آئے تو گو اس واقعہ سے ملک بھر میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ اسی روز سے ایرانی رسم و رواج تیزی سے بدلتے گئے۔ کم از کم نئے تہران میں، آج نقاب پوش عورت نہیں دیکھی جاتی۔ اور اگر دیکھی بھی جائے تو خیال یہی ہوتا ہے کہ یہ نقاب یا تو شلاخت کرنے کے لئے ہے یا پھر چہرہ عیب دار ہے۔ اس کے باوجود پرانی عادتیں ابھی تک باقی ہیں! ایرانی مرد عورت ہاتھ میں ہاتھ دیکر نہیں چلتے، بجز ان چند نوجوانوں کے جو یورپ و امریکہ سے تعلیم پا کر واپس آئے ہیں۔

جدید ایرانی عورت ایک غیر ملکی زبان ضرور جانتی ہے اور قہقہہ طائفوں یا باغوں میں اتلی ہی آزاد و بے تکلف نظر آتی ہے جتنی کوئی یورپین عورت۔ لیکن یہ جدید ایرانی عورت کسی دوست بلکہ منگیتر کے ساتھ بھی تنہا تفریح کو نہیں نکلتی۔ باپ یا بھائی کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

غیر ملکی سیاح جب تہران میں داخل ہوتا ہے تو شہر کی خوبصورتی اور صفائی سے بہت متاثر ہوتا ہے! شہر و بازار کا نقشہ، جدید اور عالیشان عمارتوں کی قطاریں، وسیع چکیلی سڑکیں، چاقی چو جہ پولیس کے سپاہی، یہ سب باتیں اسے یورپ کی یاد دلاتی ہیں۔ لیکن اس حسین و دلکش چہرے کے نیچے وہ سن رسیدہ جھریاں پڑے ہوئے جسم کی جھلک بھی دیکھتا ہے۔

روشن خیال رضا شاہ نے پائے تخت میں نمونوں کے ذریعہ سے پانی کی بہر سانی اور حفظانِ صحت کے اصول پر توجہ نہیں کی۔ تہران میں پہاڑوں کا پانی کھلی نالیوں میں شہر کے ہر کوپہ و بازار میں بہتا نظر آتا ہے شہر کی ساری گندگی ان نالیوں میں بہتی ہے اور یہیں کپڑے دھوئے جاتے ہیں، لوگ نہاتے ہیں اور جانور

پانی پیتے ہیں۔

حال میں ایک برٹش انجینئرنگ فرم کو تہران کی آب رسانی اور زمیں دوز بدر رو ہنسنے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔

تہران کی زندگی میں قدیم ”دیروز“ اور جدید ”فردا“ آپس میں اس طرح نے جلے نظر آتے ہیں، جیسے کانٹوں کے درخت پر گلاب کی بیل۔ لیکن ایسا ہوتے ہوئے بھی ایرانی قوم نہ تو سست و کاہل ہے اور نہ انکے اندر شکست خوردگی کا انداز پایا جاتا ہے، کم از کم تہران کا سیاح تو یہی کہے گا۔

جس ایرانی کو دیکھئے سر اٹھائے تیزی سے ہاتھ ہلاتا ہوا چلتا ہے، ایرانیوں کو شائستگی کا خیال ہر وقت رہتا ہے۔ افتاد طبع و مزاج کے اعتبار سے ایرانیوں اور فرانسیسیوں میں مماثلت ہے اور شاید اسی لئے فرانس کی ثقافت و ذہنی ایران میں زیادہ مقبول ہے۔ ایک ایرانی کتنی ہی خستہ حالت میں ہو، افسردہ و غمگین نظر نہیں آتا، وہ اس وقت بھی اداس نہیں معلوم ہوتا جب وہ اپنے گھریا دوکان پر پلٹی ماسے بیٹھا ایرانی ریڈیو کے غمگین نغمے سنتا ہوتا ہے۔ (مغربی کانوں کو یہاں کی موسیقی اداس ہی معلوم ہوتی ہے)

اوسطاً ایرانی چھریس بدن کا مستقل مزاج انسان ہوتا ہے، موٹا آدمی یہاں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے اور جب نظر آ جاتا ہے تو انگلیاں بھی اٹھ جاتی ہیں، ایک یونیورسٹی کے پروفیسر نے باتوں باتوں میں کہا کہ ”ہمارے سب موٹے آدمی پارلیمنٹ میں ہیں“ اس کا مطلب یہ تھا کہ الیکشن میں زیادہ تر تاجر اور زمیندار ہی چنے جاتے ہیں جن کو عمر بھر کوئی کام نہیں کرنا پڑتا اور عیش و آرام آدمی کو موٹا بنا ہی دیتا ہے ایک ظہرائی ادیب سے میں نے سوال کیا :-

”کیا آپ کے ملک میں لوگ خود کشی بھی کرتے ہیں؟“ — اس نے جواب دیا

”ہاں سکر بہت کم، کیونکہ ہماری قوم بڑے بڑے دشوار حالات سے گزر چکی ہے، اور کوہ و صحرائے ہماری زندگی کو صعب و دشوار بنا دیا ہے اس لئے کوئی مصیبت ہمیں مایوس نہیں کرتی، ہم ہر حالت میں بچے جاتے ہیں“ قاہرہ کے بازاروں میں گزرتے وقت وہاں کی بھیڑ بھاڑ اور قہوہ خانوں کی رونق و آبادی دیکھ کر میں سوچتا تھا کہ مصری کام کس وقت کرتے ہیں؟ لیکن جب میں تہران کے گلی کوچوں میں گھوما تو وہ سوال اٹھا ہو گیا یعنی ایرانی راحت و آرام کس وقت کرتا ہے؟ گرمی کے موسم میں تہران کی تمام دوکانیں زیادہ دیر تک بند رہتی ہیں۔ اس وقفے کے علاوہ میں نے ایرانیوں کو ہر وقت مصروف اور کام کرتے دیکھا۔ شاید کام کرتے رہنا ایرانی خون میں داخل ہے۔ ہر ایرانی جو طبقہ اشارت میں شمار نہیں ہوتا ہر وقت مصروف نظر آئے گا۔

اشراف ایرانی بے شک اپنے ہات سے کام کرنے کو ذلیل سمجھتے ہیں، تاجروں و زمیندار کی طرح اہل فن و مشلاہ (انجینئر وغیرہ) بھی اس بیماری میں مبتلا نظر آتے ہیں اور اپنے ہات سے کوئی کام نہیں کرتے۔ ہر کام کے لئے نوکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایرانی سرمایہ داروں میں آپ کو کوئی ایسا آدمی نہ ملے گا جو امریکی سرمایہ دار کی طرح ضرورت کے وقت آستینیں چڑھا کر کام میں لگ جائے۔ جنگ کے زمانہ میں جب ایران میں امریکی فوجوں کے افسر راستے میں خود اپنی موٹر درست کرنے لگتے تو اس منظر سے ایرانی شرفاء کو حیرت ہوتی تھی۔

جب زرشتی تعلیمات پر نظر پڑتی ہے تو جسمانی محنت اور ہات سے کام کرنے سے شرفائے ایران کی یہ بیماری زیادہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے، زرشتی تمدن میں محنت و مشقت پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ ہل چلانا، کنواں کھودنا، کاشت کرنا، درخت لگانا اور مویشی پالنا بلند انسانیت کا ثبوت تھے، زنداوستا میں لکھا ہے کہ ”جو محنت و توجہ سے زمین بوتا جوتا ہے وہ ایسا ذخیرہ اکٹھا کرتا ہے جو دس ہزار عبادتوں سے افضل ہے“ راستگونی اور مویشیوں کی خدمت اونچے درجے کی نیکیاں تھیں۔ آج کی ایرانی زندگی میں اس ضابطہ اخلاق کی طرف سے بے اعتنائی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ میرے تہران پہنچنے کے چند ہی دن بعد ایک انگریزی تعلیم پائے ہوئے ایرانی نے مجھ سے کہا:-

”ایرانیوں کے متعلق پہلے تھیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ بہت جھوٹے ہیں!“

”تم تو جھوٹے نہیں؟“ میں نے مذاقاً کہا۔

”میں ایک ایٹمی ہوں!“ اس کا بیخ جواب تھا۔

”یعنی؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

اس نے کہا: ”اگر تم اس کو سمجھنا ہی چاہتے ہو تو تمہیں ہماری قومی تاریخ پڑھنا چاہئے۔ زمانہ تاریخ میں ایرانی قوم نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں، بڑے بڑے فاتحوں، غیر ملکی مدبروں اور خود ایرانی حکمرانوں نے قوم کو اتنا رگیدا ہے کہ تحفظ ذات کے لئے جھوٹ سے کام لینا ایک فطری اور موثر حیلہ بن گیا ہے۔ تم شاید مجھ سے اتفاق نہ کرو گے، لیکن اگر ایرانی شاہنشاہوں کے مفتوح ہو جانے اور ایران پر عربوں کے قابض ہو جانے کی تاریخ کا مطالعہ کر لو گے تو میرے ہم خیال بن جاؤ گے۔“

تعلیمیافتہ ایرانیوں میں میں نے یہ قابل تعریف خصوصیت پائی کہ وہ اپنی قومی کمزوریوں کے اعتراف میں تامل نہیں کرتے۔ اور اس اعتبار سے ایرانی تمام مسلم قوموں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ حکومت ایران کے اقتصادی مشیر A.C. MILSPAUGH نے ایرانی پارلیمنٹ کے ممبر علی دشتی کا یہ قول نقل کیا ہے:-

”ہمیں خود ستائی کا مرگب نہ ہونا چاہئے اگر کسی نے کسی عہد میں ساری دنیا فتح کر لی تھی تو کیا آج تو

لت یہ ہے کہ جتنے غدار، و خائن ایران میں ملیں گے کسی دوسری قوم میں نہیں ملیں گے اور جس طرح ایران میں یہ لوگ قانون کی زد سے محفوظ ہیں ویسے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہونگے!“

ایران کی سیاست میں ریشہ دوانیوں اور دروغ بافیوں نے ایران کے سنجیدہ لوگوں کو اس قدر ہیرا دیا ہے کہ مجلس کے ایک ممبر نے دوران گفتگو میں مجھے کہا: ”میرا کتا البتہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا!“

مہری ملاقات ایران کے سب سے بڑے لکھے افراد اور یونیورسٹی کے پروفیسروں سے ہوئی اور مجھے یہ سوس ہونے لگا کہ یہ سب زرتشتی ضابطہ اخلاق کو زندہ کرنے کے کتنے متمنی ہیں۔ ایک اہل قلم نے ایک بار کہا کہ ”ہماری قوم جب ہی عظمت پاسکتی ہے جبکہ ایک بار پھر زرتشت ہمارے دل و دماغ پر حکمرانی کرنے لگے؟“

ماتے کہا:۔ ”لیکن امتداد وقت کے ساتھ زرتشتی اصول میں بھی تو فرق آگیا تھا!“

اس نے جواب میں کہا:۔

”صحیح کہ ایسا ہوا، لیکن گرا ہوا مکان پھر سے تعمیر کیا جاسکتا ہے: زرتشتی ضابطہ اخلاق ہمارا ”ایرانی مکان“ ہے۔ ہماری اچھائیوں کا ”ایرانی مندر“ تھا، جسے ہم نے اپنے ہی ہاتھوں سے بنایا تھا، اور اس روحانی مسلا، بنایا تھا جو ہمارے ہی ملک کا تھا۔ عربوں کی طرح ہم صحرائی انسان نہ کبھی تھے اور نہ آج ہیں۔ اسلام کے اندر بڑی خوبیاں ہیں، لیکن ان خوبیوں کے باوجود اسلام برویوں کا مذہب ہے۔ ہمارے وہ مراہمی جو بڑے سخت مسلمان تھے (جیسے نظامی، سعدی) زندگی کے بڑے شیدا اور رومان کے متوالے۔ وہ اسلامی نقشب کو قبول نہیں کر سکے، ان کی روح ایرانی روح تھی!“

ایران کی سماجی زندگی میں بعض اور بھی خرابیاں ہیں جن کے ذکر سے آجکل کے مغربی سیاح کو بہت دکھ بچتا ہے۔ مثلاً ”آپ میرے گاؤں آئے!“ یہ جملہ میں نے ایک ایرانی زمیندار سے اپنے پہلے سفر ایران کے ران سلسلے میں سنا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ”آپ کتنے گاؤں کے مالک ہیں؟“۔ ”میں بائیس گاؤں مالک ہوں!“ یہ جواب دیتے وقت میں نے محسوس کیا کہ اس ایرانی زمیندار کو کسی قسم کی ناخوشگوار سی یا فی کا احساس نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ ایران میں غلامی کا رواج نہیں ہے اور زراعتی پیداوار کی طرح انوں کو فروخت نہیں کر دیا جاتا ہے۔ مگر چونکہ اسی فیصدی زمین زمینداروں کی ملکیت ہے۔ اس لئے اسکے ”ملکیت کا شعور“ جڑ پکڑ گیا ہے۔ ایرانی کسان جہاں چاہے جا بھی سکتا ہے اور تعلیم پا کر اونچے سے اونچے نہ تک پہنچ بھی سکتا ہے، لارڈ کرزن نے اپنی قابل ذکر کتاب میں لکھا ہے کہ ”اس اعتبار سے ایران دنیا میں سب سے زیادہ جمہوری ملک ہے کہ وہاں اونچے نیچے کی تفریق مطلق نہیں ہے اور ہر شخص ذاتی جمہور بنیاد پر بڑے سے بڑا رتبہ پاسکتا ہے۔“ رضا شاہ کی ذات خود اس کا ثبوت ہے، لیکن ایران کا دیہاتی

اپنی تمام نارسائیوں کے باوجود اپنی جگہ نہیں چھوڑتا، اور یہ جبر بھی برداشت کر لیتا ہے کہ پارلیمنٹ کے چناؤ میں زمیندار کی مرضی کے مطابق ووٹ دے۔ مغرب کے مفہوم میں یہ بات اصول جمہوریت کے منافی ہے۔ میری آخری سیاحت ایران ۱۹۷۷ء میں ہوئی، اور میرے وہاں پہنچنے کے فوراً بعد میرے ایک ادیب دوست نے مجھے شوقیہ ڈراما کرنے والوں کے ایک جلسہ میں مدعو کیا۔ ہم تھیٹر میں بیٹھے پردہ اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے، میرے دوست کا ایک دوست جو نہایت اعلیٰ انگریزی بولتا تھا، ہمارے پاس آیا اور مزاح پر سی کے بعد ادھر ادھر نظر دوڑا کر تماشائیوں کو دیکھا جو بالعموم پتے کھا رہے تھے، اور کہنے لگا ”سب تیسرے درجے کے لوگ ہیں!“ اس کا یہ کہنا نفرت و حقارت کی بنا پر نہ تھا، بلکہ اس کا مقصد مجھے یہ بتانا تھا کہ اول درجے کے ایرانی ایسے برقی نہیں ہوتے جو تھیٹر میں پتے کھاتے رہیں۔ بایں ہمہ، اس کا یہ کہنا میرے لئے خاص معنی اور اہمیت رکھتا تھا۔ ایران میں اگرچہ ہندوستان کی طرح نیچے اونچے نہیں ہیں لیکن اول درجے اور تیسرے درجے کے لوگ ایرانی سماج میں بھی ہیں۔ دوسرے درجے والے اول تو وہاں ہیں نہیں اور اگر چند نفوس ہیں تو وہ آسانی سے اول یا تیسرے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ایرانی سماج میں درمیانی کڑی غائب ہے۔

تہران کافی بڑا شہر ہے مگر وہاں بڑی اور نازک چیزیں نہیں بنتیں، وہاں کی فیکٹریاں بھی ایسی ہیں طیارہ نہیں کرتیں۔ صنعتی پیداوار کا بڑا حصہ ہاتھوں اور سادہ اوزاروں سے طیارہ کیا جاتا ہے۔ ایرانی دماغ فردی ضرورت کے لئے بہت سی چیزیں نہایت خوشنما وضع کی طیارہ کر سکتا ہے۔ حرفت و دستکاری کا شوق اور مستقل مزاجی ایرانی کارگر کے مخصوص اوصاف ہیں۔ نئی بسوں کی ”باڈیز“ بھی ہاتھ ہی سے بنائی جاتی ہیں چاندی اور دوسری دھاتوں کی چیزوں پر باریک قسم کی نقاشی، قالین بانی اور چوب کاری کی نزاکتیں خیابان لالہ زار کی دوکانوں میں بکثرت دیکھی جاسکتی ہیں جو سچے حیرتناک ہیں۔ پرانا ایران اہل حرفہ اور دستکار کا ملک تھا اور دنیا میں مشہور تھا۔ نیا ایران بھی دستکاروں ہی کا ملک ہے اور اگرچہ پرانی عظمت و شان کے ساتھ بہت سے فنی تصورات ختم ہو گئے ہیں مگر اصفہان کے سادہ شیراز کے تقریبی ظروف اور قالین آج بھی دنیا میں بے مثل سمجھے جاتے ہیں۔ ایران کی پیداوار بیشتر مضبوط اور چست چالاک ہاتھوں کی مرہون ہے۔ ایک امریکن افسر نے خوب کہا کہ ”تین چوتھائی طبع ایرانیوں میں سے ساڑھے سات لاکھ ایرانی صرف اپنے لئے تجارت کرتا ہے۔ خیابان لالہ زار میں دوکانیں بہت ہیں مگر ڈیپارٹمنٹل اسٹور کوئی نہیں ہے۔ کارگر بوڑھے بچے چیزیں طیارہ کر کے زیادہ تر خود ہی بازار میں لاتے اور فروخت کرتے ہیں۔“

تاجروں میں شاید اس وجہ سے کہ وہاں غیر ملکی آبادی زیادہ اور ایک عظیم الشان پونیورسٹی ہے، غریب کتابیں

کی دنیا کی دست میں گر تھیں ہیں بہت ہیں، تہران میں بڑی آبادی کے باوجود چندی صدیوں سے یہاں کی زبان غیر ملکی مطبوعات پر تھیں، ایران میں عبریہ و لازمی تعلیم کا قانون جاری ہے لیکن یہ تعلیم بھی کی حقیقت نہیں، مل کی آئندہ ہے، یہ تعلیم ڈاکٹر صادق کے قول کے مطابق سلسلہ میں ساڑھے تین لاکھ سے کم بچے اسکولوں میں جاتے تھے اور بارہ لاکھ سے کم نہیں جاتے تھے،

ایران کی واحد جہانی میں سب سے زیادہ پچھنے والا اخبار اطلاعات ہے لیکن اس کی اشاعت بھی تیس ہزار سے زیادہ نہیں، چار ہزار کی اشاعت والا اخبار بھی کامیاب سمجھا جاتا ہے،

ایران کا تعلیم یافتہ طبقہ غیر ملکی علمی مطبوعات کا بھوکا ہے، اور اضافی ادب کے لگاؤ نہیں رکھتا،

(GONE WITH THE WIND) ایک ناول ایسا ہے جو دوسرے ملکوں کی طرح ایران میں بھی نہایت مقبول ہے، تقریباً پچتر سال ہوئے جب ناصر الدین شاہ قاجار نے یورپ کا سفر کیا تھا، اس وقت سے یورپ فاکٹر فرانس کے مشہور و مستند لکھنے والوں کے تقریباً دو ہزار ناول فارسی زبان میں منتقل ہو چکے ہیں، پڑھا لکھا ایرانی یورپی ادب کی حقیقت نگاری کا شہساز ہے، اور زندگی کی یہ ترجمانی اس کے ذہن و خیال کو مسحور کر لیتی ہے، اس لئے اس کا مطالعہ وسیع ہوتا رہتا ہے، ایرانی نوجوان عقل کی بچگی کے بعد تعلیمی ادب سے ہٹ کر سنجیدہ علمی مطالعے کی طرف مائل ہو جاتا ہے، میں نے ایک مشہور ایرانی سے سوال کیا کہ "ایرانی تعلیم یافتہ طبقہ فلسفہ و فنیات کے مطالعہ کا اتنا شائق کیوں ہے؟" اس نے جواب دیا "اس لئے کہ ہم ہنوز سیکور ہے ہیں، ابھی تک صداقت کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، نئی اور پرانی دونوں صداقتوں کیلئے؟" ہر ایرانی اپنے قدیم شعرا اور پختویان مذہب کا احترام کرتا اور مان پرنازا ہے، ہر ایرانی کلاس کی شاعری کے وہ سچے جن میں قومی کردار کو سراہا گیا ہے اکثر گنگنا رہتا ہے، مائیں بچوں کو لڑیاں بھی ایسی ہی شاعری کی سناتی ہیں، اچھی قسم کے گپ خانے (چائے خانے) صرف شہروں میں نہیں دیہات میں بھی ہیں، قصہ خواں نوکر رکھے جاتے ہیں، جو لوگوں کو ایرانی شجاعت و بہادری کی داستانیں اور ایرانی قہر و سر بلندی کے افکار طلبا کرتے ہیں، ایران ایک مہیا ملک ہے جہاں کلاسیکی شاعری سب سے بیش قیمت قومی دولت سمجھی جاتی ہے اور یہ جذبہ ادبی وادتی دونوں طبقوں میں یکساں پایا جاتا ہے، لیکن نئی نسل کا ایرانی اس شاعری کے ادبی جذبات و اثرات خصوصیات سے مطمئن نہیں کیونکہ اس شاعری میں قومی عظمت و ترقی کا نشان اسے نہیں ملتا، ایران کی نئی نسل کو شدید احساس ہے کہ پانچ سو برس کی طاقت ہے، اور اس نے ایک وقت غلاب بھی ہے اور خسارت بھی، ایسا ایرانی مجرم و گناہ کے ساتھ کھیل رہا ہے، لیکن اس کا فلسفہ بھی بڑھتا ہے، کیونکہ وہ اس نئے زمانہ کو سمجھنا چاہتا ہے، پنا ایرانی نئے زمانہ کو اس لئے سمجھنا چاہتا ہے کہ جو مشن ہو گیا ہے کہ اسے نئے تو اس زمانہ سے مغرب اور نہ وہ اسے بدل سکتا

دوسرا باب

عقل و دانش کا سرکین

صوبہ فارس کی راجدھانی شیراز ایرانی قوم کا محبوب و عزیز ترین شہر ہے، اور عقل و دانش کا مسکن سمجھا جاتا ہے، یہی وہ علاقہ ہے جسے ایرانی قوم کا گوارہ کہنا چاہئے، ایرانیوں کے دلوں میں شیراز کے احترام و محبت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس ملک کے لوگ آپس کی بات چیت میں تہران، اصفہان و ہمدان وغیرہ کی عیب جوئی تو کر سکتے ہیں لیکن شیراز کا نام بے ادبی سے لینے کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا، ایرانیوں کے دلوں میں شیراز کا احترام و اعزاز ایک معبد کی طرح ہے، اور اس کی اس تکریم و تحریم کا راز شیراز کی ادبی روایات سے وابستہ ہے، ایران کی سب سے زیادہ مقبول و محبوب شاعر سعدی و حافظ تھے، جو اسی سرزمین میں دفن ہیں، جن کے مزار آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی زیارت گاہ عوام ہیں، یہ دونوں مقبرے ایک دوسرے سے نیا دور نہیں، لوگ صاحب مزار سے عقیدت کی بنا پر اور اس جگہ کو بہترین تفریح گاہ سمجھ کر جاتے ہیں جمعہ کے روز بھوم زیادہ ہوتا ہے اور جا بجا قالینوں کے فرش پر بیٹھے لوگ سوار میں چائے دم کرتے، فوجان کے ڈھ چلتے اور تار و رباب پر کلاسیکی غزلیں گاتے اور سنتے ہیں، میری گاڑی واسے نے بتایا کہ: ”یہاں تو جمعہ کے روز آئیے،“

سعدی و حافظ کی طرح شیراز محبوب و مقبول شاعر خیام ہے، میں شیراز کے ہوٹل سعدی میں ٹھہرا تھا، ہوٹل کے ڈرائیونگ ہال میں کسی ایرانی کی قلم کاری کا نتیجہ خیام کی ایک تصویر لٹکی ہے، اس تصویر پر مسم کو ایک سیدریش بوڑھا دکھایا گیا ہے، جس کا عامہ بھی سفید ہے، لانی جاپہنے ہے، ساعت بادہ سفید رنگی بوتل ہے اور بٹل میں ایک دوشیزہ سیاہ گیسو کھڑائے برید کے تاروں کو چھو رہی ہے، ہم چند آدمی اس تصویر کو غور سے دیکھ رہے تھے کہ ایک ایرانی بولا:۔

”وہ تھا نوینشاہودی جو یہاں سے دور ہے لیکن خیام خود شیراز تھا۔“

اس ایرانی کا مطلب یہ تھا کہ شیراز مہارت ہے حسن ورومان ہے، شیراز سلامت ورمز ہے ذہن وڈکا کی، شیراز محمد ہے زندگی کی خوشگلی و نفاست کا، اور شیراز نام ہے شاعرانہ رموز و کنایات کا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ طایفہ فرمان فرمائی کے خلاف تفلسف کی بغاوت نے شیراز کی صورت اختیار کر لی ہے! تہران میں مجھ سے ایک تہرانی شاعر نے کہا تھا کہ اب تک تم جتنے ایرانیوں سے ملے ہو، شیرازی ان سب مختلف ہیں، اور یہ بات سچ نکلی، میں شیراز پہنچا تو ایک جوان عورتا جیسے ہی ملاقات ہوئی، تعارف ہوتے ہی اس نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا میں شعر کہتا ہوں، اور میرے انکار پر اسے حیرت بھی ہوئی، میرے سوال کے جواب میں کہ کیا وہ شعر کہتا ہے، اس نے کہا:۔ بلاشبہ! شیرازی سب شاعر ہوتے ہیں!

اس خیال کے مطابق ایک پڑھا لکھا شیرازی شعر نہیں کہتا تو یا تو وہ پڑھا لکھا نہیں ہے یا شیرازی نہیں ہے، سعدی و حافظ، ہر چند بہت مقبول و ممتاز ہیں، لیکن ایرانی قوم اپنے تمام شاعروں سے محبت کرتی ہے، خجام، فردوسی اور نظامی بھی بے انتہا مقبول ہیں، یہ سوال ہر سوچنے والے کے دماغ میں آتا ہے کہ ایرانی اپنے شعراء سے ایسی غیر معمولی محبت و عقیدت کیوں رکھتے ہیں، اس سوال کا جواب غالباً اس حقیقت کے اندر پوشیدہ ہے کہ ایرانی زندگی سے محبت کرتا ہے، اور اسلامی نقشب کو اس روح سے کوئی مناسبت نہیں ہے، اور چونکہ ایرانی شعراء نے اپنے شعر میں ایرانی روح سمو دی ہے اور اسلامی نقشب سے بغاوت کی ہے اس لئے ایرانی عوام ایسے باغی شعراء افسانہ کی شاعری کے شیدا ہیں، ایسے شعرا میں حافظ و خجام کا مرتبہ بہت بلند ہے،

ایرانی شاعری میں زندہ دلی و خوش باشی کو بہت سراہا گیا ہے، لیکن اس کے اندر سماجی مقصد اور روحانی ارتقاء کی تعلیم بھی دی گئی ہے، چنانچہ ایران میں جب بھی کوئی ترقی پسندانہ تحریک اٹھتی ہے تو حافظ کے اشعار اس تحریک کے نعرے بنتے ہیں، کیونکہ حافظ جس خوش باشی کی تعلیم دیتا ہے وہ چند منتخب لوگوں کی خوش باشی نہیں بلکہ عامۃ الناس کی خوش باشی ہے، وہ ہر انسان کو خوش و خرم دیکھنے کا ارادہ مند ہے،

شیراز کی آبادی ایک لاکھ ہے، افسانہ ایران میں عام ہے مگر شیراز کی خصوصیت ہے، اس کے باوجود شیراز ایران کے تمام شہروں میں سب سے زیادہ زندہ دل شہر ہے، یہ ایران کا ادبی مرکز و گوری منقر ہے اس کی دکان کے جزائے نے بھی مدد کی ہے، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں نے شہر کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، اور شہر سے مل کر کل جائے تو قہم قہم کے دھڑلے و طغیان اور خوبصورت درخت دیکھنے میں آئیں گے، شیراز کا گھبراہٹ بھی اس کی وجہ سے ہے جتنا حافظ کے عہد میں تھا، اور وہاں میں اب بھی پہلے ہی کی طرح خزانوں ہے، شیراز کی سطح مرتفع و اونچا گدار، مطلع صاف اور سورج چمکیلا ہے،

مشرق وسطیٰ کی کسی قوم میں شیراز یوں کی سی زندہ دلی، شگفتہ مزاجی اور خودداری نہیں ملے گی، شیراز میں ہر قسم پوش عورت کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے، مصنفان و تبریزی طرح شیراز کی عورتیں بھی بالعموم عظیم سے بے بہرہ ہیں، اور ہر قسم کی روشن خیالی سے محروم ہونے کے باوجود ہر قسم اور صف پر راضی نہیں، یہ عقیدہ عام ہے کہ شیرازیوں کا خون اب تک خالص اور بے میل ہے، چنانچہ شیرازی عورت کی خصوصیت سارے ایران میں عظیم المثال ہے، اور ایک ایرانی کا یہ قول خاص اہمیت رکھتا ہے کہ: ”ان کو مغربی لباس پہنا دیجئے پھر دیکھئے!“

ہر چند شیراز میں افلاس بہت ہے لیکن اس افلاس نے شیرازیوں کے حسن و جمال کو متاثر نہیں کیا ہے، شیرازی عورت میلے چمکے لباس میں بھی قمر طلعت نظر آتی ہے، اس کی غلائی سیاہ آنکھیں، سفید موتیوں سے دانت، اور باریک ترشے ہوئے خدو خال اور شگفتہ روئی اس کی خصوصیات ہیں،

شیرازی عورتیں کثرت اور بلا تکلف دوکانداری کرتی اور سودا بچتی ہیں، ایران کے دوسرے شہروں میں میں یہ بات نہیں ہے، میں نے دیکھا ایک بوڑھی عورت سودا بچتے میں بے تکان سگریٹ پتی جاتی ہے، راستہ بازار میں پیشہ ور عورتیں لوگوں کو اس بے تکلفی کے ساتھ مخاطب کرتی اور اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے سگریٹ کی فرمائش کرتی ہیں، جس طرح یورپ کے بڑے شہروں میں،

شیراز کو اپنی قدیم عظمت اور ثقافتی سر بلندی، اپنے دلفریب مصافات و ماحول، اپنے شہریوں کی خند روئی اور زندہ دلی کے باوجود ایک بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس کی خوش حالی و شادابی کا انحصار ”اب رکنا باد“ پر تھا جو اب سوکھتا جا رہا ہے، تیس سال سے پہلے رضا شاہ کے حکم سے بندر بوشہر بند کر دیا گیا، یہ حکم گویا شیراز کو پچاسی کا حکم تھا، کیونکہ بندر بوشہر کی تجارت کا راستہ شیراز ہو کر تھا، رضا شاہ کو ایرانی اگر برا لگتے ہیں تو صرف اسی ایک قصور کی بنا پر، کہا جاتا ہے کہ بندر بوشہر پھر سے کھول دینے کے سوا پر غور ہو رہا ہے، گور رضا شاہ کے حکم سے شیراز کو یہ نقصان پہنچا، مگر دوسری طرف وہاں کے عاجزوں اور زمینداروں نے رفاہ عام کے وہ کام بھی کئے جن کی مثال دوسری جگہ مشکل سے ملے گی، شیراز کے بازار کشادہ و خوبصورت بنائے گئے اور وارڈ کس قائم کیا گیا، یہ وہاں کے بیسہ والوں کی مالی ہمتی کا نتیجہ تھا،

پورے صوبہ فارس کی آبادی میں لاکھ ہے، اور یہ علاقہ سے زیادہ زرخیز اور ہر اہم اسے خاک کی سر زمین ہر قسم کی زراعت کے لئے موزوں ہے، لیکن آبپاشی مفقود ہے، رکنا باد کو خشک ہونے لگا، کنوئیں کھدوانے کا انتظام کیا جا رہا ہے، ایک یورپی انجینئر نے پہلا کنوئیں کھودا تو فی کشتہ میں ہزار

لیکن پانی دینے لگا، ایران کی عام پکار پانی کی ہے، حالانکہ زمین میں پانی کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، شیراز کو بھکاریوں کا چھتہ کتنا سہاگہ کتنا، ایران کے دوسرے شہروں میں اپنا بچ اور ناکارہ لوگ بیکس مانگتے نظر آتے ہیں، مگر شیراز میں کنبے کے کنبے یہی پیشہ کرتے ہیں، بوڑھے جوان، عورت، مرد اور بچے ٹولیاں ہٹا کر مانگتے ہیں،

شیراز میں مزدوروں کی گنتی پچاس ہزار ہے، جس میں فیکٹریوں میں کام کرنے والے صرف دو ہزار ہیں، سرکاری محلوں میں اگرچہ تین ہزار آدمی لگے ہوئے ہیں مگر ان میں نصف تعداد فالتو ہے، پینتیس ہزار ایسے ہیں جو گھروں میں رہ کر کوئی نہ کوئی چیز بناتے اور سدرتی حاصل کرتے ہیں، باقی دس ہزار سرکاری اہلکار کے مطابق بے روزگار ہیں،

شیرازی شعرو شاعری کے شیدا ہیں، لیکن اس ذوق و اہتمام کے باوجود نوے فیصدی آبادی بے بڑھی کھڑی ہے، سارے شہر میں صرف دو سینا ہیں اور ایک طائفہ شوقیہ ڈرامہ کرنے والوں کا ہے، یہ شوقین ڈراما کرنے والے سب کے سب جدید تعلیم یافتہ ہیں، شیراز میں اخبار تو اٹھ نکلتے ہیں، لیکن ان کی مجموعی اخراجت تیس ہزار سے زیادہ نہیں، روزانہ ایک بھی نہیں ہے، پوری آبادی کیلئے صرف دو پرائی اسکول ہیں، کالج ایک بھی نہیں، برٹش کونسل نے ایک اینگلو ایرانی انسٹی ٹیوٹ جاری کر رکھا ہے، اس کی لائبریری لمبرو کیلئے کھلی ہے، یہ تنہا ادارہ ہے جو جدید فکر کی ترویج کر رہا ہے،

میرے شیراز پہنچنے کے چند ہی روز بعد وہاں کے نوجوانوں نے جن کو جدید تعلیم ملی تھی میرے خیر مقدم میں ایک گارڈن پارٹی دی، یہ لوگ انگریزی یا فرانسیسی بھولی بولتے تھے، اور پوری رسم و قواعد سے پوری طرح واقف تھے،

میں خاموش ایرانیوں کا وسطی مشرق کی دوسری قوموں سے مقابلہ کرنا رہا، ایرانی جب دوستی کو ہے تو پھر نہایت دلکش طریق پر اور حیرت انگیز حد تک صفا بیانی سے کام لیتا ہے، فصاحت بیان ایرانی قوم کا جوہر خصوص ہے، مگر اسی وجہ پر اس کی خود تنقیدی بھی ایک خصوصیت ہے،

اس شام کو میں نے جس پارٹی میں شرکت کی تھی، وہاں خوش باشی اور گپ زنی کے سوا کوئی بات نہ تھی لیکن اس وقت بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایران کی یہ نئی نسل ایک عدالت ہے بڑی بڑی شخصیتوں کے کردار و گفتار کی جانچ پوری تھی اور بڑے عمدہ اداروں کی بدگالیوں کی گرفت کی جا رہی تھی، دفعہ پہ نوجوان جھڑپت کھڑے تھے۔

آپ جانتے ہیں، میں ایک اجلاس میں گیا مگر میں کبھی نہیں جاتا، اس لئے کہ مجھے ملے سے سخت نفرت

ہے، ”تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد بھر کھینے لگا۔“ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں ترک وطن کا ارادہ کر رہا ہوں کیونکہ وطن کے اندر حالات سخت حوصلہ فرسا اور مایوس کن ہیں۔

”کہاں جاؤ گے؟ میں نے پوچھا،

”کیں بھی، آسٹریلیا، جنوبی امریکہ، کنیڈا یا آپ کے وطن!“

یہ نوجوان ایرانی دل شکستہ تھا، اور ایران میں ایسے بہت یس گے، بہت سے تو ترک وطن کر چکے ہیں اور بہت سے امید پر جی رہے ہیں، لیکن جو لوگ دوسرے ملکوں میں بس چکے ہیں وہ بھی منتظر ہیں کہ کوئی عوامی تحریک اٹھے جس میں غیر ملکوں کا ہاتھ نہ ہو تو وہ وطن واپس آکر اس تحریک کو کامیاب بنانے میں اپنا فرض ادا کریں،

”من ویزوال“ کا پہلا حصہ

مولانا یازمچوری کی ہم سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو ”انسانیت کبریٰ“ داخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند انشا اور پند و خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے، ضخامت ۶۴ صفحات مجلد سات روپیہ آٹھ آنے (معبر) علاوہ محصول،

”من ویزوال“ کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسائل پر حضرت یانہ نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فرست یہ ہے:-
 اصحاب کف — معجزہ و کرامت — انسان مجبور ہے یا مختار — مذہب و عقل —
 طوفان نوح — خضر کی حقیقت — مسیح و تائیک کی روشنی میں یونانی اور دہلوی
 حسن یوسف کی داستان قارون سامری سامری علم غیب وحی کی حقیقت
 دعا و توبہ لقمان عالم بدیخ یا جمیع جمیع ہدایت ہدایت وحی کوثر
 نور محمدی اور بنی صراط آتش مزود نفس و روح آدم اور شجر ممنوع
 لفظ امی کا صحیح مفہوم معاد و غیرہ ضخامت ۶۴ صفحات کاغذ سفید و پیر قیمت علاوہ
 محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے مینجر نیکار لکھنؤ

تیسرا باب

شہسواری کی طاقت

ایران کے صوبہ فارس میں ایک پہاڑی علاقہ کاشغی قبیلے کا مکن ہے، یہ پہاڑی علاقہ (ایران کا نیپال) ہے، قبیلے کا خان یا سردار ناصر خان ہے، جو جدید قسم کی تعلیم سے نا آشنا اور غیر ملکی زبانوں سے بالکل ناواقف ہے اس کے تین بھائی اور ہیں، ایک بھائی حسین کاشغی ایرانی مجلس کا ممبر ہے اور انگلستان و جرمنی کا تعلیم یافتہ ہے، انگریزی اور جرمن نہایت اچھی بولتا ہے، ایک ملاقات میں میں نے اس سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں شیراز جا رہا ہوں، چاہتا ہوں کہ ساتھ ہی کاشغی علاقے کی سیاحت بھی کر سکوں،

میں یہ سن چکا تھا کہ شاہ ایران کو یہ بات پسند نہیں کہ کوئی امریکن سپاہ قبائلی علاقے میں جائے، اور شاہ نے یہ بات حسین اور دوسرے بھائیوں کے گوش گزار بھی کر دی تھی، میں حسین کاشغی سے اس بات کی تصدیق بھی کر لینا چاہتا تھا کہ میرے دوران سفر میں سیاسی مداخلت تو نہیں کی جائے گی،

حسین نے شاہ ایران کی ناراضماندی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا کہ ”آپ کب جانا چاہتے ہیں، آپ کے سفر کا سب انتظام ہو جائے گا“ یہ امر واقعہ ہے کہ طہران اور فیروز آباد کا کاشغی نظام کے مرکز کے درمیان کچھ اس قسم کی دشمنی ہے کہ وہ جب ضرورت سمجھیں ایک دوسرے سے بات چیت کر لیں اور جب بات چیت سے نتیجہ نہ ملے تو توپ بندوق کی زبان میں گفتگو کرنے لگیں،

اس قبیلے کو دوبانے کی رضا شاہ نے انتہائی کوشش کی تھی، اس وقت ان بھائیوں کا باپ زندہ تھا، سردار قبیلہ تھا، اس کو اور بڑے بیٹے ناصر خان کو جیل میں ڈال دیا تھا، باپ جیل میں مر بھی گیا، اور اس کے بھائی آج تک اس میں رہتے ہیں کہ ان کے باپ کو زہر دیا گیا تھا، اس کا بدلہ کاشغی قبیلے نے سوشلسٹ میں اس طرح لیا کہ بغاوت کی اور حکومت کی فوجوں کو زیر کر لیا، وجہ یہ تھی کہ صوبہ فارس میں فوج کی تعداد زیادہ نہ تھی اور کاشغی بھی وہ زیادہ طاقتور نہ تھی کاشغی چند دہشت گرد اور مسلح خائس کا علاقہ ہے کہ کے شیراز پر بڑھنے والے تھے

مگر شیرازیوں کی اصلاح و زاری پر دم کر کے قبضہ اٹھایا، ایک ذمہ دار کاشفی لینڈ سنے بتایا کہ یہ جنگ اس مطالبہ کے لئے کی گئی تھی کہ آذربائیجانی باغیوں کا قتل و قتل کیا جائے اور صوبہ فارس میں کاشفی قبیلے کو خاص رعایتیں دی جائیں، کاشفی باغیوں کی ہر کامیابی سے نوجوان شاہ کو مدد پہنچا دیتی بات تھی، اور ایرانی فوج کے جرنیلوں کے لئے ذلت کا موجب تھا، اسی لئے تازہ ملک بھیجی جا تھی، اور ممکن تھا کہ باغیوں کی سرکوبی اس طرح ہو سکتی، مگر کسی خاص وجہ کی بنا پر ارباب حکومت نے مصالحت کر لینا ہی بہتر سمجھا،

غرض حسین کاشفی نے ایک ذمہ دار آدمی میرے ساتھ کر دیا اور ہم فیروز آباد کے سفر پر روانہ ہو گئے، پہاڑی راستہ دشوار گزار تھا، اور ہماری موٹر کو ایسے موقع بھی پیش آئے کہ میرے روٹے کھڑے ہو گئے، جب میں فیروز آباد پہنچا تو محسوس ہوا کہ میں ہزاروں سال پہلے کی دنیا میں پہنچ گیا ہوں، اور جلد بدینہ خواب و خیال بن گئی ہے،

یہ علاقہ سورج کی گرمی سے جھلسا ہوا سیلابان ہے، اور جہاں تہاں خیموں اور چھوٹے درویشوں کی جنتیں ہیں، بھیرؤوں کے گلے ہیں اور یہی ان لوگوں کا ذریعہ معاش ہیں، اونچے پہاڑوں کے بیچ میں وسیع وادی کا یہ علاقہ قبیلے کے بانی نے غالباً جنگی مصلحتوں کی بنا پر منتخب کیا ہو گا، اس علاقہ پر اچانک حملہ ہو جانا ناممکن ہے، کاشفی لوگوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے، یہ لوگ بلا کے خاکش، بے مثل شہ سوار اور غصے کے نشانہ باز ہیں، ان کا رہنا سہنا خیموں کے اندر ہے، اور قالینوں کا فرش ان کا انتہائی تعیش ہے، ان لوگوں کو قدامت سے عشق ہے، اور جدید تمدن کی ہر چیز سے نفرت، یہ لوگ جتنے قدامت پرست ہیں اتنے ہی دلکش بھی ہیں، جس شدت کے ساتھ وہ بیرونی دنیا سے بیزار ہیں اتنے ہی اپنے عیوں یا محاسن پر مصر ہیں، جہاں کے موسم میں یہ لوگ اپنے اونٹوں، گدھوں اور بھیرؤوں کو خلیج فارس کے علاقہ میں لے آتے ہیں اور گریس میں شمالی علاقہ میں لے جاتے ہیں، گویا وہ باروں میں سورج کی روشنی میں رہنا چاہتے ہیں،

میں نے جب پہلی بار ان لوگوں کو اپنے تیز اور زچھل گھوڑوں پر سوار دیکھا تو میں خیال ہوا کہ یہ لوگ بڑے سپاہیانہ زندگی کے لئے ہیں، ہر چھوٹے بڑے کے کانڈھے پر بندوق لگتی نظر آئی، قدرتی طور پر کاشفیوں نے فیر کا شکاری ہی ہے، ان کی شکاری روسی کاسکوں کی یاد دلاتی ہے، ہر گھر میں کم سے کم ایک بندوق اور ایک گھوڑا ضرور ہونا چاہیے،

ان لوگوں کی زبان فارسی نہیں بلکہ ترکی ہے، مگر ایران پرستی میں یہ لوگ اپنے تئیں کسی ایرانی سے کم نہیں ہیں، لیکن چونکہ یہ لوگ الگ تھلک زندگی گزارتے ہیں، اس لئے ایران کے لوگ ان کو بدلتے سمجھتے ہیں،

کہتے ہیں، اور اس سے کاشفی خفا ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر حکومت تہران انھیں غیر مسلح کرنا چاہتی ہے، جس میں وہ کسی حد تک کامیاب ہو رہی ہیں مگر یہی بات اس کے لئے درد سر بھی بن گئی ہے۔

کاشفی نہ تو وحشی ہیں اور نہ انھیں غیر مذہب کہا جاسکتا ہے۔ تعلیم بالکل نہیں لیکن حد درجہ متواضع و خلیق ہیں۔ بات بہت دھیمے لہجے میں کرتے ہیں جو تمدن سماج میں کمال شناسائی کا ثبوت سمجھی جاتی ہے۔

میرے لئے بڑے بجائی، مآصر خاں کا مکان کھول دیا گیا۔ وہ خود تہران میں تھا۔ مگر کوئی تواضع ایسی نہ تھی جو اٹھا رکھی گئی ہو۔ یورپ کی شرابیں بھی فراہم تھیں۔

میں اکثر ان لوگوں کی خیموں کے کمپوں میں چلا جاتا تھا۔ عورتیں غیر ملکیوں سے بھی پردہ نہیں کرتی ہیں اور ہر پہلو سے ان کو کامل آزادی حاصل ہے، وہ شہسواری بھی کرتی ہیں۔ البتہ خاکی مصروفیات کی بنا پر شرار کو نہیں جاتی ہیں، ان عورتوں کی خود اعتمادی انتہا کی ہے اور پوری مسلم دنیا میں اسکی مثال نہیں مل سکتی۔ ان لوگوں اور عام ایرانیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کاشفی تہذیب ایران کے گم شدہ تمدن کے صحیح نشانی ہے۔ میں نے ان کی عورتوں کی آزادی، خود اعتمادی اور مردوں سے مساوات دیکھ کر ایک کاشفی سردار سے کہا:-

”یقین نہیں آتا کہ یہ مسلم عورتیں ہیں!“

اس نے اپنی زبان میں میرا خیال ان عورتوں کو سنایا جو اس وقت وہاں موجود تھیں اور ایک شادی کی تقریب میں جمع ہوئی تھیں وہ سب تہقہب مار کر کہنس دیں۔

کاشفی اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ کٹر مسلمان بھی ہے اور یہ لوگ اپنے ایمان و عقیدہ کے لئے جان تک قربان کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے یہاں ملا کی دوکان نہیں لگنے دی، اسی لئے مذہبی تقشف ان میں نہیں پایا جاتا۔ کاشفی لوگ عام طور پر پڑھ لکھ نہیں سکتے، مگر قرآن ضرور گردن میں حایل ہوگا کیونکہ اس کی برکت سے بلائیں رد ہوتی ہیں۔ شراب بالکل نہیں پیتے۔

اسلام میں چار بہنیں تک جائز ہیں، مگر ان میں ایک سے زیادہ بیوی رکھنے والے شاذ ہوتے ہیں اور حداثہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اسلام میں عورت کا نکاح ثانی ہوتا ہے لیکن یہ لوگ اپنی لڑکیاں غیر کاشفی سے نہیں بیاتے کیونکہ وہ طلاق دے سکتا ہے اور یہ بڑی ذلت کی بات ہے۔ چنانچہ اس قوم میں طلاق بھی اتنی ہی شاذ ہے جتنی ایک سے زیادہ بیوی رکھنا۔ اس قبیلے کے سردار چار بجائی ہیں لیکن انہیں سے صرف ایک شادی بالعموم سولہ سال سے پہلے ہی کر دی جاتی ہے، مگر مرد شادی میں جلدی نہیں کرتے

لڑکی کی شادی بالعموم سولہ سال سے پہلے ہی کر دی جاتی ہے، مگر مرد شادی میں جلدی نہیں کرتے

کیونکہ یہ لوگ شادی کو ایک قسم کا قید و بند سمجھتے ہیں۔ ایک کاشغی نے مجھے بتایا کہ:-
”آدمی یا تو بیوی کا انتخاب کرے یا بندوق کا“

ایک موقع پر میں اپنے کاشغی رہنما کے ساتھ جا رہا تھا کہ ایک جگہ شادی کی تقریب نظر آئی۔ میرے ساتھی نے بلا محابا بھیڑ کے اوپر بندوق کے دو فرکے۔ میرے حواس گم ہو گئے۔ گرمیں نے دیکھا کہ وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ خوشی کے موقعہ پر اسی لوگوں میں بندوقیں داغی جاتی ہیں۔

کاشغی عورتیں بھی دوسری مشرقی عورتوں کی طرح شوخ رنگوں کو پسند کرتی ہیں اور اس کو ہستانی پس منظر میں ان کے رنگ برنگ سر بند اور لباس بہت دلکش معلوم ہوتے ہیں۔

سارے ایران میں کاشغی لوگوں کی تندرستی بہتر ہے۔ یہ علاقہ ٹائیفاڈ، چیچک اور میربو کی ہلاکت محفوظ ہے۔ دق کا مرض البتہ ہے جو وہاں کے جغرافیہ اور آب و ہوا کا نتیجہ ہے۔ ان لوگوں میں اعصابی اور داخلی مریض سنے نہیں گئے حالانکہ جدید تمدن میں ایسے مریض سہر جگہ ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی غذا سادہ ہوتی ہے۔ اور ان کی ضروریات محدود ہیں۔ چائے۔ شکر ان کی سب سے بڑی عشرت ہے جو مشکل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

ایک کاشغی خان سے میں نے پوچھا کہ کیا ان کے قبیلہ میں خودکشی کے واردات ہوتے ہیں؟ وہ میرے سوال پر حیران رہ گیا اور بولا کوئی خودکشی کیوں کرتا ہے؟ محبت میں ناکام رہنے یا زندگی کے ناقابل برداشت ہو جانے پر۔ ہمارے یہاں نہ تو پہلی صورت ہے نہ دوسری۔ اگر کوئی کاشغی مصیبت میں پڑ جائے تو سب مل کر اس کی مدد کرتے ہیں اور اسے بھوکا نہیں مرے دیتے۔ زندگی میں انتشار و بے حوصلگی مشینی تمدن کی خصوصیت ہے، مگر کاشغی قوم اس سے متاثر نہیں اس لئے انتشار سے بھی واقف نہیں ہے۔

اس قوم کی جنگجو یا نہ مصروفیات کی بنا پر امریکی مشین نے حکومت ایران کو مشورہ دیا تھا کہ انھیں چند امر کے انصری اسکول میں داخل کیا جائے۔ اس تجویز کی تہ میں وہ بات تھی کہ پہلے پولس اور پھر فوج میں کاشغی لوگ کا داخلہ قومی دفاع کو مضبوط بنائے گا۔ لیکن ایرانی جرنیلوں نے اس اسکیم کو خطرناک سمجھا کیونکہ کاشغی قبیلہ خاص طور پر ناقابل اعتبار سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنی جگہ خود ایک فوج ہیں اور اپنی جنگی طاقت کو قائم رکھتے ہیں۔

میرے قیام شیراز کے زمانہ میں، ایک نامور و قدیم خاندان کے فرد نے مجھے اپنے باغ میں چائے کی پارٹی دی۔ اس باغ کو دیکھ کر مجھے یقین کرنا پڑا کہ ایران اپنے باغات پر کیوں فخر و غرور کرتا ہے۔ یہ پارٹی نہایت پُر لطف و دل خوش کن صحبت تھی۔ ایرانی قوم نہایت مہذب و شائستہ ہے، ان کی صحبت نہایت پُر لطف

ان کا طرزِ ماند و بود نہایت نفیس، ان کی فطرت جمال پرستی اور گفتگو ذہین و ذریغ ہے! جب میں اس پارٹی سے واپس ہوا تو چند لوگ مجھے ہوٹل تک پہنچانے آئے۔ موٹر میں انھوں نے ذکر کیا کہ جلسہ سے چند گھنٹے قبل میزبان کے یہاں ڈاکہ بڑا تھا۔ لیکن میزبان نے مہمانوں کی دلداری کے خیال سے پارٹی کو مٹھی نہیں کیا۔ قبائلی لوگ ایسا اکثر کرتے رہتے ہیں۔

ان لوگوں سے مجھے معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں نہ اسپتال ہیں نہ ڈاکٹر، نہ اسکول ہیں نہ ریڈیو۔ اور نہ کہیں سینما ہے۔ عام حالت یہ ہے کہ خوش حال کاشغی معلم رکھ کر اپنے لڑکوں کو تعلیم دلاتے ہیں، لڑکیوں کے لئے تعلیم غیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ لیکن علم سے بے بہرہ ہونے کے باوجود کاشغی بھی شاعری کے اتنے ہی شیدا ہیں جتنے دوسرے ایرانی۔ شاہنامہ ان کی مقبول کتاب ہے اور اس کے حصے جو شجاعت و قوم پرستی کے جذبات اُبھارتے ہیں، ہر کاشغی کو زبانی یاد ہیں۔ ایک سال پہلے حکومت تہران کی فوجوں سے مقابلہ ہوا تھا تو کاشغی عورتوں نے شاہنامہ کے اشعار سننا کر کاشغی جنگجویوں کو جنگ پر اُبھارا تھا۔ ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ:-

”ان لوگوں (کاشغیوں) کی رات جب اوپر چاند اور تارے چمکتے ہوتے ہوں اور نیچے ریگستان میں جہاں تہاں چولھوں کی آگ روشن، بڑا دلکش نظارہ ہوتا ہے۔ مجھ جیسے سیاح کے لئے ان لوگوں کی زندگی میں بڑی کشش پائی جاتی ہے، ایک آزاد زندگی، زمین سے محبت، فطرت سے قریبی تعلق، جدید تمدن کی اُلجھنوں سے بے تعلق، مختصر و سادہ ضروریات! کس قدر دلچسپ باتیں ہیں، لیکن آج کی دنیا، سائنس اور مشین کی دنیا، تمام اقوام کو متاثر کر رہی ہے اور کرے رہی گی۔ آج بھی دنیا میں زبردست قوم زبردست پر جبر و تشدد کر رہی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ کاشغی اور ایران کے دوسرے قبائل کب تک الگ تھلگ رہ سکیں! صحیح اعداد و شمار موجود نہیں مگر اندازہ کیا گیا ہے کہ ایران کی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی میں تیس چالیس لاکھ کے درمیان قبائلی ہیں اور ان میں سے بہت تھوڑے لوگ متحدہ و پرامن زندگی کے راستے پر ڈالے جاسکتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی خانہ بدوشی میں مست ہیں۔ آج حکومت اور قبائلیوں کے درمیان جنگ نہیں ہے، لیکن اسے امن کی حالت بھی نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ قبائلی ٹیکس ادا نہیں کرتے۔ یہ لوگ فوجی خدمت کے لئے نہایت مناسب ہیں لیکن حکومت ان پر اعتبار نہیں کرتی۔ ملک کے اندر رشوت کا بازار گرم ہے اور بیرونی طاقتیں بین الاقوامی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں۔ اس لئے حکومت تہران کے خلاف ان قبائل کو بغاوت پر آمادہ کر لینا دشوار نہیں ہے۔

البتہ اعلیٰ تدبیر کی پالیسی اس خلیج کو پاٹ سکتی ہے جو تہرانی حکومت اور قبائل کے درمیان حائل ہے

اگر ان کی جنگی اسپرٹ سے اپیل کی جائے تو قبائلی لوگ دفا دار فوجی بن سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ فوجی افسر اپنے ماتحتوں پر جبر کرنے اور ان سے رشوتیں لینا چھوڑ دیں۔

کاشغری علاقے سے واپسی پر تہران میں میں نے پہلا کام یہ کیا کہ شیخ قبیلہ ناصر خاں سے ملاقات کی۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ اپنے قبیلے کے مستقبل کے متعلق اس کا کیا خیال ہے تو اس نے جواب میں کہا کہ: ”آپ ہمارے علاقہ میں گھوم کر آئے ہیں، آپ نے دیکھا ہوگا کہ باقی تمام ایرانیوں کے مقابلے میں ہم لوگ بہتر زندگی گزار رہے ہیں، ہم آزاد ہیں، ہم نے اپنی عورتوں کو دبا کر نہیں رکھا ہے، ہماری صحت سائے ایرانیوں سے بہتر ہے۔ ہمیں نہ زمیندار کا ڈر ہے نہ جندرمہ کا خوف! جب ہمارا ملک ایران ترقی کی اس منزل پر پہنچے گا کہ تمام کاشتکاروں کے پاس فولادی ہل ہوں، دیہات میں بجلی پہنچ جائے، ڈاکٹر دستیاب ہونے لگیں، اسپتال کافی بن جائیں، لوگوں کے رہنے کو مناسب مکان ملیں، بچے کو صحت اور عمدہ پانی ملے اور پولس کے جبر و تشدد کا خاتمہ ہو، اس وقت کاشغری خانہ بدوشی ترک کرنے پر سوچ سکے گا۔“

میں نے اسے توجہ دلائی کہ:-

”آپ مائیں گے کہ کاشغری لوگ اس سے بہت زیادہ کر سکتے ہیں جتنا وہ کر رہے ہیں، اور ان کی بڑی قوت ضایع ہو رہی ہے، انھوں نے مولیشیوں کے چرانے کے لئے لاکھوں ایکڑ آراضی کو چراگا چیں بنا رکھا ہے جہاں غلہ، پھل اور ترکاریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح اس پر بھی غور کیجئے کہ صحیح علاج دستیاب نہ ہونے سے کتنے مولیشی ضایع ہو جاتے ہیں!“

اس نے کہا:- ”میں مانتا ہوں کہ مولیشی کے علاج کے لئے ہم کو سلو تری میسر نہیں ہیں، اور نہ صرف جانور بلکہ معالجہ نہ ہونے سے آدمی بھی ضایع ہوتے ہیں، لیکن ہمارے علاقہ میں کوئی بھکاری تو نہیں ہے۔“ ناصر خاں کی دلیلیں سچتے ہیں اور جھٹلائی نہیں جاسکتیں۔ لیکن جس طرح امریکہ کے قدیم باشندے نعلی زندگی میں کھپ گئے ہیں، اسی طرح ایک دن کاشغری اور دوسرے ایرانی قبیلے بھی خانہ بدوشی کو خیر باد کہیں گے۔

مالہ و عالیہ

جوش، جگر، سیلاب و غیرہ بڑے مشہور شاعر ہیں لیکن کبھی کبھی وہ بھی ایسی فاش غلطیاں کر جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہو حضرت نواز نے انھیں مشہور شاعروں کی بعض نظمیں اور غزلوں پر تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ فن شمر کتنا تاریک فن ہے اور بڑے سے بڑا شاعر بھی کبھی نہ کبھی اس میدان میں ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ سرفروغ رنگین، قیمت دور و پیہ علاوہ محصول۔ میٹر نگار

چوتھا باب

(چاول کا گاؤں)

ایک یورپی مصنف جس نے کافی مدت ایران میں قیام کیا تھا، کہتا ہے کہ:-
 ”ایرانیوں کو خلق و تواضع کی تعلیم درکار نہیں، یہ وہ ماں کے پیٹ سے ساتھ لاتے ہیں۔“
 میری ایرانی سیاحت میں اس قول کی تصدیق ہر جگہ ہوئی، ایک بار میں ایک فوجوان ایرانی کے ساتھ
 جو کیمبرج کا تعلیم یافتہ تھا، بحر قزوین (اسپین) کے ساحلی علاقے کی سیاحت کو گیا۔ یہ علاقہ گیلان کہلاتا ہے۔
 ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو ایک مکان کے سامنے دو فوجوان لڑکیاں دھان کوٹ رہی تھیں۔ ہمیں
 دیکھتے ہی ان لڑکیوں نے کام روک دیا۔ کپڑے جھاڑنے اور چہرہ صاف کرنے میں لگ گئیں، بالکل اسی طرح
 جس طرح یورپ کی کسی گاؤں کی لڑکیاں باہر کے لوگوں کے آجانے پر کرتی ہیں۔ سرکارو مال کھول کر جھانٹا اور
 پھول بانڈھ کر مسکراتے ہوئے ہمیں سلام کیا۔ پھر چند بچے بھی آگئے اور انھوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ایسے صاف
 ستھرے بچے میں نے کسی ایرانی شہر میں نہیں دیکھے تھے۔ ان سب بچوں نے ہمیں سلام کیا۔ غیر لوگوں کے
 آجانے سے ان کو بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی یورپ کے بچوں کو ہو سکتی ہے۔ ان بچوں کی آنکھوں میں روشنی
 اور چہرے پر ہنسی تھی، اور انہیوں سے مطلق مرعوب نہیں تھے۔
 اس کے بعد ہی گھر کا مالک اندر سے باہر آیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر گردن جھکائی اور اس طرح ایرانی
 تہذیب کے مطابق ہمارا خیر مقدم کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے بچوں کی ماں تھی۔ اس نے بھی بڑی خندہ روئی اور
 سنجیدگی کے ساتھ رسم سلام ادا کی۔ اور فوراً دونوں لڑکیاں بھی آگئیں۔ اتنی دیر میں انھوں نے منہ ہاتھ
 دھو کر بال سنوار لئے تھے اور سر کے رومال خوبصورتی کے ساتھ باندھ لئے تھے۔ یہ لڑکیاں ایک کرسی لیکر
 آئیں۔ یہ کرسیاں گھر کے اندر استعمال نہیں ہوتیں بلکہ جب روضہ خوانی ہوتی ہے تو اس وقت کام آتی ہیں
 یا کوئی مہان آجائے تو استعمال کی جاتی ہیں۔

ماں نے چپکے سے ان لڑکیوں سے کچھ کہا اور وہ مسکراتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئیں۔ پھر واپس آکر جہانوں کے سامنے ایک نے چھوٹی سی میز لگا دی اور دوسری نے چائے کی پیالیاں چن دیں۔ ہم مالک خانہ سے باتیں کر رہے تھے کہ اس کی بیوی اندر گئی اور ایک پلیٹ میں خربوزے کی قاشیں سجا کر لے آئی۔

اس قدیم رسم تواضع اور ہمانداری میں جذبات سے سوا بھی ایک بات ہے جو تخیل اور منطق پر مبنی ہو ساتھ کھانے پینے سے اجنبیت رفع ہو جاتی ہے، میزبان و مہمان کے درمیان ارتباط کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ بحر قزوقین کا یہ ساحلی علاقہ نہایت زرخیز ہے۔ پھل اور گھنے سایہ دار درخت بکثرت ہیں۔ مکان کے صحن کی دیوار ٹٹی کی تھی اور صحن کے اندر بھی متعدد درخت تھے۔ یہاں مکانات ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ بنے ہیں اور درمیان میں درختوں کی آڑ بھی پائی جاتی ہے۔

یہاں میں نے جس قسم کے مکان دیکھے، ویسے ”نیم مہذب ملکوں“ میں کہیں نہیں دیکھے، عمارت کا سارا سامان مقامی پیداوار سے تعلق رکھتا ہے جو مفت یا بہت ارزاں مل جاتا ہے، یعنی مٹی، لکڑی اور پیال۔ ان دیہاتی انجینئروں کی تعمیری صلاحیت دیکھ کر ایرانیوں کی تخلیقی محنت سے محبت کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ افلاس اور جہالت کے باوجود اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود اپنے ہی ہاتھ سے بنالیتے ہیں ان کے مکان دوہرے ہوتے ہیں، ایک حصہ گرمیوں کے اور دوسرا سردیوں کے استعمال کے لئے۔ سارے کام ایک بڑے کمرے میں ہوتے ہیں۔ دوسرا کمرہ بالعموم سامان رکھنے کے لئے ہوتا ہے۔ اسی کمرے میں کھانا پکاتا ہے اور وہ دھوئیں سے کالا ہو جاتا ہے۔ میرے کہنے پر کہ دھواں آسانی سے نکالا جاسکتا ہے، بتایا گیا کہ دھواں قصداً مکان کے اندر رکھا جاتا ہے کیونکہ وہ چاول کی طیاری میں کام آتا ہے۔

بحر قزوقین کا یہ علاقہ نہایت زرخیز ہے مگر لیر یا کا گھر ہے۔ مکانوں میں چٹائیوں اور قالینوں کے سوا اور کوئی فرنیچر نہیں ہوتا، مجھے سارے ایران کی عورتوں سے زیادہ اس علاقے کی عورتوں نے متاثر کیا۔ گیلانی عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ ان کے دانت غیر معمولی طور پر سفید آنگٹھیں بادامی، پلکیں دراز، پتلیاں نیلی ہیں اور ان میں سے نکلنے والی نظریں زندہ محسوس ہوتی ہیں۔ بال زیادہ تر سنہرے ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان میں سے ہر ایک سلیقہ مند ہوتی ہے۔ انھیں اپنی شخصیت کا بھی پورا احساس ہے اور سب خصوصیات کے ساتھ وہ مسلم عورتیں ہیں۔

کاشتکاری کا سارا بار گیلانی عورت کے کندھوں پر ہے۔ کاشتکاری کا سارا کام بہت پرانے ڈھنگ کا ہوتا ہے۔ ہل اب تک لکڑی کے ہیں۔ فصل کاٹ کر سروں پر اٹھا کر گھراتی ہیں۔ شاڈوٹا در کسی کے پاس گھوڑا ہوتا ہے۔ اس علاقے میں گاڑی ٹھیلہ کو کوئی نہیں جانتا۔

میں نے زمیندار کے کاروبار سے سوال کیا کہ کیا اس علاقے میں ایک سے زیادہ کھجور کھانے کا رواج ہے اس نے بتایا کہ ”ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اگر کسی کو کھیتی کے کام میں زیادہ سہولت پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو البتہ وہ دوسری شادی کا خیال کر سکتا ہے۔“

میں نے سوال کیا کہ ”اگر کوئی دوسرا کھجور کھانے کو پہلی بیوی کیا کہتی ہے؟“

بولوا۔ ”وہ کوشش تو یہی کرتی ہے کہ دوسرا کھجور کھانے کو پہلی بیوی جاتی ہے، لیکن پھر آجاتی ہے۔“

میرے اس سوال پر کہ طلاقیں بھی ہوتی ہیں، اس نے جواب دیا۔

”بہت کم، بات اصل یہ ہے کہ گیلانی عورت بہت کام کرتی ہے اس لئے مرد ایسی غلطی کرتا ہی نہیں

رود بہت نرمی برتتا ہے۔“

میرے میزبان نے مجھے بتایا کہ۔

”گیلان بھر میں ایسا گاؤں کوئی دوسرا نہیں ہے، مقابلہ یہاں کے کسان خوش حال ہیں۔“ اپنے قول کی

تائید میں اس نے ایک کچی سڑک کی طرف اشارہ کیا جو گاؤں کو بڑی سڑک سے ملاتی تھی۔ یہ کچی سڑک پکڑنڈی

سے ذرا چوڑی تھی، یہ گاؤں کسی موسم میں شہر سے کٹ کر علیحدہ نہیں ہو جاتا کیونکہ یہاں تک سڑک پائی جاتی ہے،

ور آدھ رفت باروں جینے جاری رہتی ہے۔ گیلان کے دوسرے گاؤں سڑک نہ ہونے کے باعث بعض موسم میں

شہروں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ پہلے ہونے کے سبب سے جب ندیاں چڑھتی ہیں تو ذرا بعد آمدورفت منقطع ہو جاتی

ہیں اور اس زمانہ میں گاؤں والے طبی امداد اور معمولی دواؤں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

یہ سڑک اس گاؤں کے زمیندار نے بنوائی تھی اور اس وجہ سے لوگ اسے بہت اچھا سمجھتے تھے۔ اس

سڑک کے علاوہ گاؤں مالدار کی خوشحالی کا ثبوت ان کے لباس سے بھی ملتا تھا، چند بچوں کے سوا میں نے کسی کو

نگے پاؤں نہیں دیکھا۔

گیلان میں بنائی کا طریقہ رائج ہے۔ لیکن فصل کا آدھا غلہ غنہ کے علاوہ کسان کو کچھ دوسری رعایتیں

بھی حاصل ہیں۔ گھر کے ساتھ ایک باغچہ ہوتا ہے جس میں پھل اور ترکاریاں ہوتی جاتی ہیں، ٹماٹر، کھیر،

نرہڑ، لہسن، پیاز وغیرہ ہوتے جاتے ہیں۔ اس کا لگان کچھ نہیں دینا پڑتا، سہر جنگوں میں شکار بہت

ہے اور کسان اپنی قربان سے شکار کر لیتا ہے۔ کوئی ممانعت نہیں ہے۔

میں جس زمیندار سے یہ باتیں سن رہا تھا اس کا مالک تہران میں رہتا ہے، میری ملاقات اس سے وہیں ہوئی۔ اور

وہ پورے وسطی مشرق میں سب سے زیادہ رحمدل اور بامروت زمیندار سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنے علاقے میں

اکثر جاتا رہتا ہے اور اپنے پیونجے کی اطلاع بازار میں ٹولس لگا کر کر دیتا ہے اور کسانوں کی فریاد بھی سناتا

وہ انگریزی اور فرنیچے زبانیں بخوبی بولتا ہے۔ اس نے اپنی زمینداری میں پختہ عمارت بنوا کر اسکول جاری کر رکھا ہے جس میں پچاس بچے پڑھ رہے تھے۔

ایران کی زراعتی پستی موت کے بچے کی طرح پورے ملک پر چھائی ہوئی ہے۔ اس خوش حال گاؤں میں بھی ہل تو بے شک جانور کھینچتے ہیں، باقی تمام کام صرف ہاتھ سے انجام پاتے ہیں۔ گیلان کا پورا علاقہ چاول کی کاشت کرتا ہے۔ ساری آبادی کا مدار چاول پر ہے۔ میرے سوال کرنے پر معلوم ہوا کہ اوسطاً ہر خاندان ڈھائی ایکڑ سے زیادہ کاشت نہیں کرتا کیونکہ دھان کی فصل بہت محنت چاہتی ہے۔ اس میں سے کسان کو آدھا چاول ملتا ہے جو تیس چالیس ”بوشل“ کے درمیان ہوتا ہے۔ قرض ادا کرنے اور ضرورت کی چیزیں خریدنے کے بعد اُس کے پاس موسم بہار کے ختم ہونے سے پہلے غلہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ نیا قرض لینے پر مجبور ہوتا ہے قرض کا سود دو گنا تک ہوتا ہے۔ اس مخصوص گاؤں کے بھی سب کسان مقروض تھے۔ اس گاؤں کے لوگوں کی خوش پوشاکی امریکہ سے آئے ہوئے پرانے اور استعمالی کپڑوں کی بدولت تھی۔ اکثر ایرانی امریکہ کے ممنون ہیں کہ وہ انھیں کپڑا پہننے کے قابل تو کر دیتا ہے۔ ایک کسان نے مجھ سے کہا کہ ”سڑکیں نہ ہونا، قرض اور بھاری ایران کی تین نعمتیں ہیں“۔ خود اس گاؤں کے نوے فیصدی باشندے لبریا کا شکار تھے۔ اور ان میں صرف چند ایسے تھے جنھیں کوئین نصیب تھی۔

اس علاقے کے جنگلوں میں خود رو پھلوں کی کثرت ہے۔ میرے سوال پر کہ لوگ ان پھلوں کا جام (مرتا) بناتے ہیں، جواب ملا کہ ”شکر کہاں سے آئے؟ چائے کے لئے تو شکر میسر نہیں، جام کون بنائے؟“ یہ گاؤں مجھے ایسا سمجھا کہ میں وہاں دوبارہ گیا۔ دوسری دفعہ میں اُس روز پہونچا جب وہاں ہاٹ لگ رہی تھی۔ آدمیوں کی ایک بڑی بھیڑ اکٹھا تھی اور ایک میلے کی سی صورت تھی، گو وہاں کھیل تاشے مطلق نہ تھے۔ دوکانیں تھیں اور دوکانوں میں سامان تجارت تھا۔ بہت سے ایسے تھے جو بعض چیزیں خریدنا چاہتے تھے مگر خرید نہ سکتے تھے۔ لیکن سب خوش تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہ انھیں افلاس کا طال ہے نہ قرض کی فکر۔ نہ بخار سے پریشانی ہے نہ سڑک بننے کی آرزو۔ بس باہم ایک جگہ اکٹھا ہو جانا ہی ان کی مسرت کے لئے کافی ہے۔ میلوں میں لڑائی جھگڑا ہو جانا یورپ میں عام ہے، کیونکہ لوگ شراب کی بدستی میں جھگڑ پڑتے ہیں لیکن چونکہ مسلمانوں میں شراب ممنوع ہے اور یہاں شراب کی کوئی دوکان بھی نہ تھی اس لئے یہاں کے میلے میں نے لڑائی جھگڑا نہیں دیکھا، ان کی تنہا مسرت آپس کی بات چیت تھی یا پھر چائے کا دور۔ علاقہ کا زمیندار غیر معمولی طور پر بھلا آدمی تھا مگر اس کا لارندہ اس کا بالکل عکس تھا۔

اس علاقے کے لوگوں نے عمر میں ایک ہی دفعہ سینما دیکھا تھا، اور وہ بھی اس وقت جب جنگ کے

مانے میں برٹش ٹوفصل کی طرف سے انتظام ہوا تھا۔ آس پاس کے کوئی تین ہزار آدمی جمع ہو گئے تھے۔
س فلم کا چرچا وہاں آج بھی ہے۔ میں نے کچھ لوگوں سے سوال کیا کیا وہ پھر سینما دیکھنا پسند کریں گے تو ایک نے
جواب دیا کہ :

”کیا ہی اچھا ہو ————— مگر!“

”مگر کیا؟“ میں نے کہا۔

”بعض شاید اسے پسند نہ کریں! کیونکہ سینما دیکھ کر ہم لوگ کچھ سیکھ جائیں گے!“

”وہ کون ہو سکتا ہے — کارندہ؟“ میں نے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے —“

”زمیندار؟“ میں نے پھر کہا۔

”ہو سکتا ہے —“

جس مکان میں ہم لوگ بیٹھے تھے، ایک پڑوسی یہ سن کر کہ کوئی امریکن آیا ہے، بے بلائے آگیا تھا۔ میں نے
اس سے سوال کیا کہ کام کے علاوہ تفریح کی اور کیا صورتیں ہیں۔ تو اس نے بر ملا جواب دیا ”بیاری!“ اسے
تو یہ ہنس کر کہا مگر اس جواب کے اندر بڑی تلخ حقیقتیں پوشیدہ تھیں۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ وہاں
کوئی گاڑی ٹھیلہ کیوں نہیں ہے ایک نے جواب دیا کہ:-

”آپ کی اطلاع غلط ہے: زمیندار کی موٹر پھیوں ہی پر چلتی ہے! اور شاید صرف اس لئے کہ

وقت ضرورت وہ اس میں بیٹھ کر فرار ہو سکے!“

اس صحبت میں ایک ایسے زمیندار کے متعلق جس کی لوگ تعریف بھی کرتے ہوں، تیز تیز فقرے سنکر
مجھے حیرت سی ہوئی۔ میرے ساتھی نے بتا دیا کہ:

”تو وہ تحریک سے پہلے یہ لوگ ایسی باتیں کرنا جانتے بھی نہ تھے۔“

تو وہ تحریک ختم کر دی گئی لیکن لوگوں کو بے چین ضرور بنا گئی ہے۔ کوئی دہقان اقرار نہیں کرے گا کہ
اسے تو وہ بارٹی سے تعلق ہے یا وہ ایسے خیالات رکھتا ہے کیونکہ ہر آدمی کارندے سے ڈرتا ہے۔ اور
تو وہ کا نام لینا بھی خطرہ کی بات تھی۔

زمیندار کا کارندہ بہت زیادتیاں کرتا تھا، اور اگر زمیندار کے علم میں یہ باتیں آج بھی جاتی تھیں تو
وہ ڈانٹ ڈپٹ سے زیادہ کچھ نہیں کہتا تھا۔ کیونکہ کارندے کی سخت گیری وصولیابی کی ضامن تھی۔ اس
گاؤں میں کارندے کی شکایت کرنے کی کسی کو ہمت ہو ہی نہ سکتی تھی کیونکہ شکایت کا بدلا بہت سخت ہوتا

تھا۔ ہانی بند کر دینا تو پہلی سزا تھی۔ اس لئے لوگ اسی میں عافیت سمجھتے تھے کہ کارندے سے بگاڑ نہ کریں۔
 قودہ تحریک کے مطالبوں میں پہلا یہ تھا کہ کاشتکار کا حصہ زیادہ ہونا چاہئے۔ طبی امداد اور تعلیم عام اور
 مفت ہو، سب کو روزگار دیا جائے، اور جندرمہ کو موتوں کو دیا جائے۔ اس آواز نے ایرانی خاص کر گیلانی کسان
 کی روح کو جگا دیا ہے۔

تہرانی حکومت نے غفلت نہیں کی اور کسانوں کا حصہ زیادہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ سارے زمینداروں
 نے اس حکم پر عمل نہیں کیا۔

میرے ساتھی نے بتایا کہ:-

”ہمارے علاقے میں چاول، چائے، تمباکو، جوٹ اور ریشم کی قیمتی پیداوار ہوتی ہے۔ اور ہم اس کو بڑھا
 بھی سکتے ہیں۔ آراضی کی استعداد بھی بہت بڑھائی جاسکتی ہے۔ لیکن زمینداروں کو پروا نہیں اور کسان میں اپچ
 نہیں۔ چاول کی کاشت میں مشینوں سے اسی طرح کام لیا جاسکتا ہے۔ جیسے آپ امریکہ میں لیتے ہیں۔ لیکن ہم ایسا
 نہیں کر سکتے۔ ہم لیریا کو بھی ناپید کر سکتے ہیں لیکن نہیں کر سکتے!“

حکومت کے پاس پیسہ نہیں اور کسان تلاش ہے اور زمیندار اپنی دولت غیر ملکوں میں عیاشی کی زندگی بسر
 کرنے میں خرچہ کر رہا ہے!“

”اس اصل کیا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے جواب دیا ”کون بتائے؟“

جہانستان

(تازہ اوڈیشن)

اڈیشہ نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، قدرت بیان
 اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی
 نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اوڈیشن میں
 متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اوڈیشنوں میں نہ تھے قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول
 میجر نگار لکھنؤ

پانچواں باب

(ابر آلود مطلع)

ایرانی آذربائیجان کا مستقر تہتر تہ ہے اور دوسرا بڑا اور اہم شہر ہے۔ میری تہتر تہ کی سیاحت نہایت نازکی بخش ثابت ہوئی۔ وسط گرا میں تہتر تہ کا موسم تہر آن سے زیادہ خوشگوار تھا، ہوائی جہاز سے اترتے ہی پہاڑوں کی خشک و خوشگوار ہوا کے مسلسل جھونکے ایک بہشتی تحفہ معلوم ہوتے تھے۔ آفتاب کی حرارت طہر آن کی طرح تیز نہ تھی۔ شمالی ایران میں سفر کرنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ آذربائیجان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ایرانیوں اور آذربائیجانیوں کا فرق محسوس ہوا۔ آذربائیجانی صرف نسلی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ جسمانی ساخت میں بھی ایرانیوں سے مختلف ہیں۔ انکا قد دراز، جسم بھاری اور رنگ کھلتا ہوا ہے۔ وہ زیادہ جھاکش اور زیادہ سنجیدہ ہوتے ہیں۔ روسی اور ایرانی آذربائیجان کے لوگ ہم نسل و ہم زبان ہیں۔ دونوں علاقے ترکی بولتے ہیں۔ انوار کلام میں سنجیدگی، حرکات میں سہولت پائی جاتی ہے اور آسانی سے ہنس دیتے ہیں۔

لیکن باوجود اس اختلافات کے آذربائیجانی ایرانیوں سے کم متواضع نہیں ہیں۔ بے ایک سینما میں دیکھا کہ فلم کے گانے کے ساتھ تاشائی خود بھی گانے لگے۔ بازاروں کا گشت کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ چائے خانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ گارہے ہیں۔ آذربائیجانی بھی ایرانیوں کی طرح شاعری کے شیدا ہیں۔ ان کے مقبول و ممتاز شاعر فضلی بندادی اور حاج رضا اشرف ہیں۔

آذربائیجان کے لوگ خود دار بہت ہیں۔ حد یہ ہے کہ ایک آذربائیجانی گدا اگر غیر آذربائیجانی سے کبھی بھیک نہ لے گا۔ ایران کے مشنری ادارے تہتر تہ میں بھی کام کر رہے ہیں اور یہ حقیقت ماننا پڑے گی کہ مشنریوں نے آذربائیجان کے سماجی سدھار میں بڑی خدمت کی ہے۔ تہر آن میں ایک تعلیم یافتہ خاتون نے مجھ سے کہا کہ ”آپ کی مشنری ہماری ”مدد مالی نجات“ کے لئے آئے تھے لیکن انھوں نے ہماری مادی بہبودی کا کام بھی کیا ہے۔“ امریکن اور برٹش مشن مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں تو کامیاب نہیں ہوئے لیکن تعلیم پھیلانے میں انھوں نے بہت کامیابی حاصل کی۔

۱۳۳۹ء میں رضا شاہ نے ان مشنریوں کو ممنوع قرار دے دیا، حالانکہ تعلیم یافتہ ایرانیوں کو اقرار تھا کہ مشنری تعلیم گاہوں کے مقابلے میں ایرانی تعلیم گاہیں بیچ تھیں۔ چنانچہ مشنری اسکولوں اور کالجوں کے بند ہو جانے سے ایران کو سخت نقصان پہنچا اور روشن خیال ایرانی اس پر متاسف ہیں۔

تبریز میں پریس بیڑیاں مشن اسپتال سارے آذربائیجان مشہور ہے۔ اس اسپتال کا بڑا ڈاکٹر، ڈاکٹر چارلس لام ہے۔ یہ ۱۳۳۹ء میں آذربائیجان آیا تھا۔ اُسے مقامی زبان پر پورا عبور حاصل ہے۔ سائنس دان کے علاوہ ایک طرف گیلان اور دوسری طرف کردستان کے ملحقہ علاقوں سے بھی مریض آتے ہیں۔ ڈاکٹر نے نرسوں کی ٹریننگ کا بھی ایک اسکول جاری کر رکھا ہے اس اسکول سے ٹریننگ پائی ہوئی نرسیں دائیاں سارے ایرانی اسپتالوں میں کام کر رہی ہیں۔ جب یہ اسکول جاری ہوا تو مسلم ماں باپ نے ان بچیوں کے لئے غیر مذہب والوں سے میل جول بڑھانا اور نرس بنکر رات رات بھر گھر سے غیر حاضر رہنا اچھا نہیں سمجھا۔ لیکن ڈاکٹر لام کی ہر دل عزیزی نے اس مورچے کو آسانی سے فتح کر لیا اور یہ مخالفت دن قائم نہ رہ سکی۔

چونتیس برس کی جانفشانی کے بعد بھی ڈاکٹر لام آذربائیجانیوں کی صحت میں نمایاں بہتری پیدا نہ کر سکا، اس لئے کہ پانی کی بہم رسانی حفظان صحت کے اصول پر نہیں ہے اور کلویم ڈالنے کی مشین کہیں نہیں ہے۔ زمین دوز بدر رو بنانے کا خیال تک نہیں کیا گیا اور پبلک حمام جہاں تمام لوگ ایک ہی حوض میں غسل ہیں، متعدی امراض کو پھیلاتے رہتے ہیں۔ خاص طور سے چیچک، ٹائیفائیڈ اور آنکھوں کی بیماریاں عام لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ وہ لال دوا سے پھیل اور ترکاریاں دھو لیا کریں تو وہ کہتے ہیں مزا خرا ہو جائے گا۔

ایرانیوں کی طرح آذربائیجانی بھی اعلیٰ درجے کے دستکار ہیں، قالین بانی، چاندی سونے کا کام چمڑے کی دستکاریوں میں صنایع کا درجہ رکھتے ہیں۔ البتہ انھیں ایرانیوں کی طرح باغ لگانے کا ذوق نہیں ہے۔ تبریز کی آبادی ڈھائی لاکھ ہے مگر ایک قصبہ معلوم ہوتا ہے، حالانکہ ایک نسل پہلے تک بڑی ترقی مند تھی تھا۔ شہر میں رونق و خوبصورتی یا جدید تمدن کا نشان نہیں، سارے شہر میں صرف ایک لائبریری کل ۴۴۸ ٹیلیفون ہیں، ایک روزانہ اخبار ہے جس کی اشاعت پوری ہزار بھی نہیں، دوسرا سہ روزہ۔ اس کی اشاعت اتنی بھی نہیں ہے، ایک تیسرا اخبار بھی نکلتا ہے جس کی اشاعت کا کوئی وقت ہی نہیں۔ غرض پورا علاقہ تو کیا، شہر میں بھی تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہیں کی گئی ہے۔

زار شاہی زمانہ ہی سے تبریز ایک مفعلاقی شہر رہا ہے جس کی ہر چیز چھوٹ کے ناولوں کا زمانہ اور

مناظر پیش کرتی ہے۔ یہاں کھانے بھی روسی قسم کے زیادہ پسند کئے جاتے ہیں کیونکہ سلاوی لوگ ہمسایہ ہیں۔ عام طور سے روسی زبان بولی سمجھی جاتی ہے۔ روس کا یہ اثر تعجب کی بات بھی نہیں جغرافیائی قربت ہونیکے ساتھ تجارتی تعلقات بھی گہرے رہے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ آذربائیجان بنیادی طور پر ایرانی ہی ہے، بازار سارے مسقف ہیں، دستکاریاں بھی تمام ایرانی ہیں، اہل حرفہ کے اوزار بھی وہی ہیں۔ اور رہنے سہنے کے طریقے بھی ایرانی ہیں۔

تبریز میں مجھے سہتے زیادہ حیرتناک بات یہ نظر آئی کہ وہاں کی مسلم عورتیں حد درجہ شریعت و محتاط ہیں۔ رضا شاہ نے پردہ ترک کر دیا تھا مگر تبریزی عورتوں نے سچرا اختیار کر لیا ہے، ان کی چادر یا پیرقہ سیاہ ہوتی ہے اور ان سیاہ پوش عورتوں کی وجہ سے بازار تاہم خانہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایک پردہ ہی نہیں اور بہت سی پرانی رسمیں جو حکماً ترک کرادی گئی تھیں سچرا اختیار کر لی گئی ہیں، رمضان کے چینیے میں کھانے پینے کی دوکانیں خواہ وہ غیر مسلموں کی ہی ہوں بند رکھی جاتی ہیں۔

جنگ ختم ہونے کے بعد سے چونکہ ایرانی حکومت بین الاقوامی معاملات میں زیادہ الجھی رہی اس لئے ملاؤں کو قدامت پرستی اور مذہبی تنگ خیالی کی تبلیغ کرنے کا کافی موقع ملا ہے۔ ملاؤں کی یہ تحریک شروع میں خفیہ رہی مگر چونکہ نوے فیصدی آبادی جاہل ہے اس لئے ملاؤں کی مذہبی تحریک زور پکڑ گئی ہے عورتوں میں جتنی جہالت زیادہ ہے، یہ تحریک ان میں اتنی ہی زیادہ تیزی سے مقبول ہوئی ہے، حد یہ ہے کہ فیکٹری کے مزدور بھی اس سے متاثر ہیں۔

میسرے قہام اصفہان کے زمانہ میں بارپہ بانی کے ایک کارخانہ کے مزدوروں نے ایک ایسے مزدور کو برطرف کر دینے کا مطالبہ کیا جس نے دوسرا مذہب اختیار کر لیا تھا، اور مل کے ذمہ دار اس مطالبہ کو مان لینے کو طیار بھی ہو گئے تھے، مگر ایران کی مشنریوں نے احتجاج کیا اور کہا کہ یہ مذہبی اقلیتوں کے حقوق پر دست درازی کا مترادف ہوگا، اس لئے مقامی حکام نے اس مطالبے کو رد کر دیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ شیراز کے قریب ایک گاؤں میں ہوا تھا جہاں عیسائیوں کے دس خاندان بنے تھے ملاؤں کے مدغلانے پر کچھ مسلمان لاریوں پر سوار ہو کر وہاں پہنچے اور رات میں عیسائی گھروں پر تہ بول دینا چاہتے تھے مگر وہاں کے مکھیا اور مسلم آبادی نے عیسائیوں کی حمایت کی۔

ایرانی آذربائیجان کا دوسرا بڑا شہر رضایہ ہے۔ جب سلطنت میں آذربائیجان کی نئی خود مختار حکومت قائم کر دی گئی تو اس وقت بعض مسلم مذہبی دیوانوں نے عیسائیوں کے چار گاؤں کو آگ لگا دی اور بعض گاؤں

میں مال بھی لوٹا۔ ان علاقوں کے بعض عیسائی لیڈروں نے مجھے بتایا کہ ان حالات سے مجبور ہو کر وہاں کے عیسائیوں نے ہجرت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اور انھیں توقع تھی کہ امریکہ و برطانیہ میں انھیں پناہ مل جائے گی یہ مذہبی دیوانگی تہران کی پرانی آبادی میں زیادہ تھی جہاں زیادہ مزدور اور چھوٹے دوکاندار رہتے ہیں، میں نے خود بھی دیواروں پر ایسے پوسٹر لگے دیکھے جن میں بے نقاب عورتوں کو اہانت آمیز لفظوں سے مخاطب کیا گیا تھا۔ بعض دوکاندار تو عریاں چہرہ والی عورت کو ”ننگی“ کہتے اور ان کے ہاتھ سودا بیچنے سے انکار کر دیتے تھے۔ بے نقاب عورتوں کو بازاروں کی مسجدوں سے نکالا بھی گیا۔

مگر اسی کے ساتھ روشن خیال مذہبی پیشوا جو تمام مسلم ممالک میں سب سے زیادہ ترقی پسند ہیں، ایسے تعصب اور مجنون ملاؤں سے اتنے ہی سیزار ہیں جتنا ایران کا تعلیم یافتہ طبقہ خفا ہے۔ ان بالغ نظیر ایرانیوں کو یقین ہے کہ ان ملاؤں کی ہمت افزائی اوپر سے ہو رہی ہے۔

مذہبی تعصب کی تبلیغ کا اثر اس حد تک ہوا کہ ایک فوجی افسر جس نے ہٹلر کی جرمنی میں تعلیم پائی ہے، ایران کی معاشری خرابیوں اور فوجی کمزوریوں کا افسوس کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا کہ:

”اپنی حفاظت کے لئے ہمارے پاس ایک ہی ہتھیار ہے اور وہ مذہبی تعصب ہے، ہمیں اس ہتھیار کو تیز رکھنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ یہ اسکی ذاتی رائے ہو، اور ممکن ہے کہ یہ کوئی غلط شدہ پالیسی ہو، مگر مجھے جتنے تعلیم یافتہ اور روشن خیال ایرانیوں سے تبادلہ خیال کا موقع ملا وہ سب اس خیال پر مہلتے تھے۔

ایرانی ملاؤں کو مذہبی منافرت پھیلانے میں جو کامیابی آذربائیجان اور خاص کر تبریز میں ہوئی وہ ایران کے دوسرے علاقوں میں نہیں ہوئی۔ یہ علاقہ پتالیس لاکھ آبادی کا علاقہ ہے جہاں کسانوں کی اکثریت اپنی زمین کی خود مالک ہے۔ جیل آر میا اسی علاقے میں جو استی میل لانبی اور کم و بیش پچیس میل چوڑی ہے اس علاقہ میں پانی بافراط ہے۔ پہاڑی ندیاں علاقے کو بخوبی شاداب رکھتی ہیں اور زمین زمین بھی پانی کی کمی نہیں۔ بعض جگہ نو دس فٹ پر پانی نکل آتا ہے۔ اس شادابی کا نتیجہ ہے کہ یہ علاقہ پورے ایران کے لئے غلہ فراہم کرتا ہے، انگور، کشمش اور خوبانیاں بکثرت ہوتی ہیں۔ ایسی ناسپائیاں میں نے سارے ایران میں کہیں نہیں دیکھیں۔ ترکاریاں بھی ہر قسم کی بکثرت پیدا ہوتی ہیں۔

ایسا ہوتے ہوئے بھی آذربائیجان کی زراعت اور دیہی زندگی المناک نقشہ پیش کرتی ہو ذریعہ رسل و رسائل محدود اور مال کی آمد و رفت برائے نام ہے۔ ٹریکٹر کو یہاں کوئی جانتا ہی نہیں اور موٹر ٹھیلہ شادابی دیکھا جاتا ہے۔ قصبہ خوش میں میں نے البتہ دلچسپ کھیلنے کی لمیں دیکھیں مگر وہ بھی روسی ساخت کی تھیں۔ باغوں میں درختوں کی کاٹے چھانٹ بہت کم ہوتی ہے۔ بہترین پھل کیڑے مکوڑوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دئے جاتے ہیں۔

پہل ہاتھوں سے نہیں توڑے جاتے بلکہ درخت کو ہلا کر گرا دئے جاتے ہیں جو زخمی ہو کر جلد خراب ہو جاتے ہیں۔ اس علاقے میں فصل پانچ حصوں میں بانٹی جاتی ہے۔ ایک حصہ زمین کا، دوسرا پانی کا، تیسرا بیج کا چھٹا بیل کا اور پانچواں کسان کا۔ جس کسان کے پاس اپنا بیل ہے وہ تو چالیس فیصدی پالیتا ہے ورنہ بیس فیصدی ہی پر قناعت کرنا پڑتی ہے۔ بیج اسے بالعموم زمیندار ہی سے لینا پڑتا ہے کیونکہ اپنا غلہ تو وہ کھا چکا ہے۔ الحاصل وہاں کی زراعت جہاں ہزار سال پہلے تھی وہیں آج بھی ہے اور اس نہایت زرخیز علاقے کا کسان بدستور افلاس زدہ ہے۔

حکومت ایران نے حکم جاری کر دیا ہے کہ خود مختار حکومت کے زمانے کا بقایا لگان وصول نہیں کیا جائیگا۔ مگر زمیندار جو اس زمانہ میں وہاں سے بھاگے ہوئے تھے اب واپس پہنچ کر وصول کر رہے ہیں۔ حالانکہ کسان نے وہ لگان اس حکومت کو ادا کر دیا تھا۔

زمیندار کے ساتھ جندارمہ (پولس) بھی بکھر خوار ہو گئی۔ یہ دونوں کسان کے لئے وباد کا درجہ رکھتے ہیں۔ خود مختار حکومت قائم ہو جانے کی اہمیت کو زمیندار نے محسوس نہیں کیا تو جندارمہ کیا کرتی جو زمیندار سے رشوت پا کر بقایا وصول کر رہی تھی۔ ایک امریکن ڈپلومیٹ موٹر سے آذربائیجان کا سفر کر رہا تھا۔ اسے ایک رات کسی کسان کے گھر ٹھہرنا پڑا۔ جہاں اسے معلوم ہوا کہ چند روز پہلے ایک جندارمہ کا سپاہی اسی گھر میں ٹھہر چکا تھا اور غریب کسان نے حد سے زیادہ تواضع بھی کی تھی، لیکن چلتے وقت اس سپاہی نے دو سو ریال طلب کئے جو غریب کسان کے لئے بڑی دولت کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن سپاہی کے جبر و تشدد کے سامنے کسان کو یہ رقم ادا کرنا ہی پڑی۔ زمیندار و جندارمہ کی سختیوں سے کسانوں میں بے چینی ہے اور باغی جماعت اس بے چینی کو بھادے رہی ہے۔ ایک ایرانی مصنف نے مجھ سے کہا کہ:

”ہمارا ملک اس آدمی کی طرح ہے جو سونے کے تخت پر بیٹھا ہو مگر بھوکا ہو!“

بلاشبہ آذربائیجان کی حالت اس قول کی شرح و تفسیر ہے۔ جدید آلات سے کام لیا جائے تو یہ علاقہ فی الواقع سوونا اگلے۔ لیکن زمیندار ترقی کرنے کی خاطر روپیہ لگائے اور بغاوت ہو جائے تو اس کی دولت تو گئی! یہ خطرہ ہر وقت زمیندار کے سامنے ہے۔ اس لئے وہ تہران میں بیٹھا چین کر رہا ہے۔

مذہب

حضرت نیاز کا وہ مرکزہ الکارا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اس کا مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔ مینبرنگار

چھٹا باب (مرکز طوفان)

سلسلہ میں تہرہ، ایشیا کا مرکز طوفان تھا اور دنیا کی نظریں وہاں کے واقعات پر لگی ہوئی تھیں۔ خاص طور پر لندن و واشنگٹن میں یہ خطرہ زیادہ محسوس کیا جا رہا تھا اور ماسکو میں امیدیں قائم ہو رہی تھیں۔ اس طوفان کے بادل اکٹھا ہونے میں وقت زیادہ لگا۔ یہ رضا شاہ ہی کے وقت سے اکٹھا ہوتا شروع ہو گئے تھے، کیونکہ رضا شاہ نے اصلاحات جاری کر لینے کے ساتھ آزادی کی خواہش کا بھی گلہ دیا۔ لیکن نئی سرگرمیوں کی تعمیر، ریلوے کا اجراء اور نئی فیکٹریاں قائم ہونا، ایک نئی سماجی طاقت کو وجود میں لانے والے اسباب تھے، یہ نئی سماجی طاقت ”مزدور“ کی ہے! ان تمام کاموں کے جاری ہونے سے مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ رضا شاہ مزدور تنظیم کا زبردست دشمن تھا، اسے لفظ WORKER سے چڑھ تھی۔ اس کے لئے اس نے LABOURER کا لفظ اختیار کیا۔ مزدور سنگٹھن، رضا شاہ کے استبداد کے لئے ایک چیلنج تھا اس لئے وہ اس تحریک کا دشمن تھا۔ رضا شاہ کو روس اور بالشویک تحریک سے بھی سخت نفرت تھی۔ شاید اس لئے کہ روس WORKER کے لفظ پر مصر اور اسے اعلیٰ صفات کا مجسمہ اور نوع انسان کا نجات دہندہ باور کرتا ہے۔

رضا شاہ کی یہ نفرت اس وقت اور شدید ہو گئی جب اسے گیلان کے بالشویک لیڈر مرزا کچک خاں سے واسطہ پڑا۔ آذربائیجان کی خود مختار حکومت کا سرخیل مرزا کچک تھا اور اس نے اپنی حکومت کے دنوں میں ”ورکر“ اور ”پرولتاریہ“ لفظوں کی زبردست اشاعت و تبلیغ کی تھی۔ لیکن بالآخر رضا شاہ مزدوروں کی بعض خفیہ جماعتوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا، مگر اس چہرہ استبداد کا یہ نتیجہ نکلا کہ سوشلسٹ، کمیونسٹ اور تعلیم یافتہ طبقوں کے ساتھ مزدور اور لیبرل جماعتیں بھی متحد ہو گئیں اور ان سب کی ایک خفیہ جماعت بن گئی تاکہ رضا شاہی استبداد کا مقابلہ کیا جائے۔ سلسلہ میں اس جماعت

ایک مستقبل کی تلاش میں
کے ترین ممبر کی طرح میں ڈال دے اور پھر دوسروں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ اس تحریک کے لیڈر تغلی ایلانی کو قصر قاجار جیل میں کوئی مہلک انجیکشن دیکر مار دیا گیا۔

اگست ۱۹۷۷ء میں روسی اور برٹش فوجیں ایران میں داخل ہوئیں اور جب رضا شاہ معزول ہو کر جلاوطن ہوئے تو سارے سیاسی قیدی بھی رہا ہوئے۔ جعفر پشوازی دس سال سے جیل میں تھا، وہ بھی رہا ہوا۔ بعد میں اس نے آذربائیجانی بغاوت کی رہنمائی کی۔ پشوازی جرمی اور فاشزم کا زبردست مخالف ہے۔ رہائی کے بعد اس نے تودہ پارٹی قائم کی اور مردم اخبار بھی نکالا جو جرمی کے طرفدار ایرانیوں کے خلاف لکھتا رہا۔ تودہ پارٹی میں ہر ایرانی ممبر ہو سکتا تھا مگر جو لوگ رضا شاہ کے ہوا خواہ رہے تھے ان کو ممبر نہیں بنایا جاتا تھا۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں اس پارٹی نے ٹریڈ یونین کی بنا ڈالی۔ ۱۹۷۷ء کے آخر تک پورے ایران میں مزدور تحریک کا ایک مضبوط نظام قائم ہو گیا۔ جس کی رہنمائی ”فیڈریشن آف دی ٹریڈ یونین آف ایران“ کے ہاتھ میں تھی۔ ایران میں مزدوروں کی گنتی زیادہ نہیں مگر تودہ پارٹی کی سیادت میں تنظیم اتنی صحیح تھی کہ تحریک ایک طاقت بن گئی۔ کارخانہ دار، زمیندار اور حکومت، سب ڈرنے لگے۔ اصفہان کی لول اور انیکلو ایرانی آئل کمپنی کی کامیاب ہڑتالوں سے پورا اندیشہ ہو گیا تھا کہ ایک روز ملک کی حکومت پر یہ جماعت متا بعض ہو جائے گی۔ چنانچہ اس کے خلاف سہ قس کی کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ اس تحریک میں سارے کے سارے کمیونسٹ نہ تھے مگر انھیں کمیونسٹ کہہ کر اور روسی تحریک نام دیکر بدنام کیا گیا۔ آذربائیجان کی خود مختار حکومت میں صفت و تجارت کا وزیر ایرج اسکندری ایک عالی خاندان شخص تھا، مگر تودہ پارٹی کا سخت دشمن بھی اسکندری پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ غدار ملک یا کسی بیرونی طاقت کا آدمی تھا، حالانکہ اسکندری آج جلا وطنی کی حالت میں یورپ میں پڑا ہوا ہے۔ وہ ایک ممتاز قانون دان اور نہایت خوش بیان مقرر ہے۔ اس کے سیاسی عقاید سوشلزم کے ہیں۔ وہ زمین کی مساویانہ تقسیم فوراً کرنا چاہتا تھا مگر زمینداروں کو معاوضہ دیکر اسے اس بات کا یقین تھا کہ اگر کسان کو زمین کا مالک بنا دیا جائے اور اسے زمینیں ادا دی جائے تو ایران ارتقائی اصول پر ترقی کر کے متمدن ملکوں کے دوش بدوش ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی یہ اسکیم جس میں نہ خون خرابے کا اندیشہ تھا، نہ ڈکٹیٹری کا اور نہ بیرونی طاقتوں کے نفوذ و اثر کا، انقلابی اسکیم کہہ کر دیا دی گئی۔

انتخاب میں پشوازی، مزدوروں کے ووٹ سے مجلس کا ممبر چنا گیا مگر جب مجلس نے اس کے انتخاب کو منسوخ کر دیا، تو اس نے آذربائیجان جا کر ایک اور پارٹی ”ڈیموکریٹک“ کے نام سے بنالی۔ اہل ایران کا خیال ہے کہ پشوازی دہسانہ کرتا تو وہ پارٹی ایک طاقت بنی رہتی۔ ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں تودہ پارٹی کو خاص کامیابی ہوئی اور کمیونسٹ میں اس کے تین ممبر لگے تو بحران کی صورت پیدا ہو گئی۔ تعلیم، صحت اور صنعت و تجارت کی وزارتیں تودہ پارٹی

کے ہاتھ میں تھیں جن میں ایک اسکندری تھا۔ ایران کی تاریخ میں ”لیبرلا“ کا تخیل ہی بالکل نئی چیز تھا۔ تودہ کا نام لوگوں کے دلوں میں امنگ پیدا کر دیتا تھا اور لوگ اس خیال سے خوش تھے کہ ہزاروں برس کی پرانی شاہنشاہیت ختم ہو کر ترقی پسند جمہوریت قائم ہونے کا وقت آگیا ہے۔ ایرانی عوام کی تودہ تحریک نے جو بیداری اور حرکت پیدا کر دی تھی، اس کا اعتراف ہر حلقے میں کیا جاتا تھا۔ لیکن تبریز کے واقعہ نے اس تحریک کو نہ صرف آذربائیجان میں بلکہ پورے ایران میں ختم کر دیا۔ تبریز کی خود مختار حکومت کا بننا اور بگڑنا ایک اُلجھی ہوئی داستان ہے جو مورخوں کے منصفانہ فیصلے کی منتظر ہے۔

میں نے ایران کی سیاحت کی اور خصوصیت کے ساتھ آذربائیجان کی بناوت کے متعلق ہر قسم کے لوگوں سے تبادلہ خیال کیا، میں نے سفارت خانوں کے ریکارڈ بھی دیکھے اور غیر ملکی عینی شاہدوں کے بیان اور فیصلے بھی سنے، اور شہادت کے اس بڑے انبار میں سے ایک ہی بات چن سکا، وہ یہ کہ آذربائیجان کی پہلو و خود مختار حکومت کا قیام ایک زبردست اور حقیقی انقلاب کی ”ڈریس رہرسل“ تھی۔ تودہ تحریک ختم کر دی گئی ہے مگر اس کی مختصر تاریخ کے نمایاں واقعات ایرانی حکومت، روس، برطانیہ اور امریکہ کے دہروں کے دماغوں پر جموت کی طرح چڑھے رہیں گے۔

جعفر پشوازی اور اس کے ساتھیوں نے تبریز کی خود مختار حکومت کی طرف سے اعلان کیا تھا کہ آذربائیجان ایران سے الگ نہیں بلکہ ایک جمہوری نظام میں داخلی اختیار کے ساتھ ایران ہی کا جزو رہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۰۷ء میں وہاں الیکشن ہوا، پارلیمنٹ چنی گئی۔ کینٹ بنی، پولس کا نظام قائم ہوا۔ قانون پاس ہوئے اور ٹیکسوں کی وصولی ہوئی۔ ایران سے تعلق ضرور رہا مگر برائے نام۔

اس خود مختار جمہوریت سے روس نے تعاون کیا اور امریکہ و برطانیہ نے اسے روسی حکمت عملی کہہ کر کوئی واسطہ نہ رکھا۔ طہرانی حکومت نے مصالحت کی پالیسی اختیار کی اور وزیر اعظم غفام اور پشوازی کے درمیان طہران میں جو گفتگویں ہوئیں ان کی تفصیل تو کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکی لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ مصالحت کی یہ کوشش ناکام رہی۔ خیال یہ ہے کہ گفتگو ناکام رہنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ پشوازی کو اصرار تھا کہ آذربائیجان میں باغی فوج کے افسروں کو جو ترقیاں ملی ہیں وہ تسلیم کی جائیں مگر طہرانی حکومت اس بات کو باقی ایرانی فوج کے افسروں میں بے چینی پیدا ہو جانے کے خیال سے مان نہیں سکتی تھی۔ بالآخر ایک سال کی طواری کے بعد طہران نے فوج کشی کر دی۔ مگر اس فوج کے پہنچنے سے تین دن پہلے تبریزی حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایران کے لوگوں کا خیال ہے کہ پشوازی بہت سارے روپیہ اور سامان لیکر روس چلا گیا ہے جو صرف اسی میل پر ہے لیکن پشوازی

کے دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ آذربائیجان ہی میں ہے۔

میں نے اپنی سیاحت کے دوران میں اندازہ کیا کہ تبریز میں بے چینی سطح پر بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ فوجی پہرہ بھی معمولی سا ہی رہتا ہے، لیکن میں اس خیال کو دماغ سے دور نہیں کر سکا کہ انقلاب کے مخالفوں کے باوجود، جمہوری حکومت نے ایک سال کی قلیل مدت میں جس قدر اصلاحات جاری کر دیں، اس شہر کے لوگوں نے ان باتوں کو شاید کبھی جانا بھی نہ تھا۔ ان تمام خرابیوں کے ہوتے ہوئے جو اس کم عمر جمہوری حکومت سے منسوب کی جاتی ہیں، اس نے شہر میں چار میل سڑک کو تار سے بنوائی، گر اگر اور پیشہ وند تیس شہر سے غائب ہو گئیں، ایک زچاؤں کا اسپتال قائم کیا، ایک یونیورسٹی قائم کی جس میں دوسرے شعبوں کے علاوہ میڈیسن، زراعت کے شعبے بھی ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن بنایا، پولس کا انتظام ایسا تھا کہ عورتیں اندھیرے میں بھی بلا خوف آجا سکتی تھیں، قانون آراضی میں بھی اصلاح شروع کر دی تھی، طہرآن کا ”لیبرلا“ معطل ہوا تھا اسے بدی طرح نافذ کیا، افیون کی تجارت یک قلم ختم کر دی۔ حکومت کے دفاتروں میں قالتو اور نکلے اسٹاف کی تخفیف کر کے کام اور قانون کا اجراء آسان کر دیا۔

ایسے کارناموں کے بعد بھی یہ نظام منتشر ہو گیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حکومت نے اپنی فوجی طاقت نہیں بنائی جو طہرانی فوج سے مقابلہ کر سکتی۔ حالانکہ طہرانی فوج اپنی شاندار وردی کے علاوہ کسی امتیاز کی مالک نہیں ہے، پھر آذربائیجان اسی نسل سے ہیں جس سے کاشغری ہیں۔ اس جمہوری نظام کو عوام کی پوری ہمدردی حاصل نہیں ہوئی اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس خود مختار حکومت نے جب کسان سے زمینداری لگان وصول کیا تو وہ سمجھا کہ یہ حکومت پرانے زمیندار ہی کی قائم مقام ہے۔ اس نے زمیندار کے کارندے اور حکومت کے تحصیلدار میں فرق نہیں کیا۔ کیونکہ اس سے وعدہ تو تھا کہ زمین اس کی ہو جائے گی۔ دوسری وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نظام نے اپنے اوپر سے اس الزام کو ہٹانے کی کوشش مطلق نہیں کی۔ زار کے زمانہ ہی سے ایرانیوں کو روس کے نام سے بیزار ہی ہے، اور طہرانی حکومت کے خفیہ ایجنٹوں نے عوام میں روس کو زیادہ غیر مقبول بنادیا تھا، جمہوری حکومت نے یہ کوشش ضرور کی کہ آذربائیجان عوام میں قوم پرستی کا جذبہ شدید ہو جائے۔ اور اگر یہ کوشش کامیاب ہو جاتی تو یقیناً طہرانی حکومت کا پروگنڈا ناکام رہتا مگر قوم پرستی کا جذبہ ابھارنے کو زیادہ دقت زیادہ کوشش درکار تھی۔

میری سیاحت کے دنوں میں تبریز پر خاموش تھا، زندہ دلی کے آثار مفقود تھے۔ اقتصادی بد حالی شدید تھی۔ دن بھر کی مزدوری چھ تو مان تھی، حالانکہ گدھے کا کرایہ دن بھر کے لئے سات تومان ہوتا ہے

کا رو ہار سرد تھا کیونکہ سرمایہ دار کو ڈر تھا کہ روس صرف استی میل پر ہے۔
میری سیاحت کے دنوں میں آذربائیجان کا ایرانی گورنر جنرل علی منصور تھا جو ایک وقت ایران کا وزیر اعظم
بھی رہ چکا تھا اور مانا ہوا مدبر سلطنت تھا۔ علی منصور کو پوری امید تھی کہ امریکہ نے روپیہ کی مدد دی تو
حکومت کا ہفت سالہ پلان کامیاب ہو کر حالات کو بدل دے گا۔

تبریزی کی خود مختار حکومت کے ختم ہو جانے سے ایرانیوں میں قومی جذبہ اُبھر آیا تھا۔ شاہ نے آذربائیجان کا
سفر کیا اور نہایت پر عیش خیر مقدم ہوا۔ طہران کے غیر ملکی سفارت خانوں نے بھی اطمینان کی سانس لی۔
گویا مغربی طاقتوں نے روس پر فتح حاصل کی تھی!

میں سمجھتا ہوں کہ یہ اطمینان عارضی ہے، سوویت کے خیالات پھیل رہے ہیں۔ جن اسباب نے پہلا
انقلاب کرایا ان کی جڑ زمین کے اندر ہے اور وہ اب بھی جیسے کے تیسے موجود ہیں۔ باغی جماعت متحرک ہے
پہاڑوں میں ان کے تین ریڈیو اسٹیشن روزانہ پروگنڈا کر رہے ہیں۔ اور حکومت تہران صرف امریکہ
کا آسرا تک رہی ہے۔ لیکن امریکہ کی امداد گولے برساکر آبادیاں تو تباہ و سہا کر سکتی ہے، سبھو کوں کا پیٹ نہیں
بھرسکتی۔ ایرانی عوام کے لئے روٹی تو تیار ہے مگر تہرانی حکومت ہی کا کام ہو اور وہی کر بھی سکتی ہے۔

حسن کی عیاریاں

اور

دوسرے افسانے

ترغیبات جنسی

اور

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں
کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و
بسط کے ساتھ محققانہ تبصرو کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب
اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذہب عالم نے اسکے رواج
میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز و تھماں نظر آئے گی
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

منیجر ملکار لکھنؤ

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ
اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا
اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ
تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش
حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور
زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ساتواں باب

(تشہ جواب)

شمالی سوڈان، مائڈن راک کے شہر رسار میں پہنچ کر ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں ایران میں نہیں ہوں۔
ہاں ایرانی تہذیب و تمدن جسے میں اپنی سیاحت کے دوران میں سرِ لحظہ دیکھتا رہا ہوں۔ مفقود
تسا نہ وہ مشرقی مناظر تھے امد نہ اس کی صدائیں۔

ایرانی دوستوں نے اس علاقے کی بڑی تعریفیں کی تھیں۔ مگر جب میں رسار پہنچا تو ایسا معلوم ہوا
کہ ایران کے کسی شہر میں نہیں بلکہ قبل از جنگ کے کسی مغربی شہر میں پہنچ گیا ہوں یا امریکہ کا کوئی شہر اٹھاکر
ہاں بسا دیا گیا ہے۔

بندی پر ایک ہوٹل کی شاندار، سفید عمارت کے دروازوں کے چمکتے ہوئے شیشے، وسیع اور ہوادار
برآمدہ، کشادہ چمکدار زینہ، لمبے چوڑے صحن میں خوش قطع چین زار کی نیرنگی، نسرین و نسرین کے نظر فریب
نختے، قسم قسم کے بلند دخت، الغرض ہر چیز سترے پن کی زندہ شہادت تھی۔ بیرونی شان اور دلکشی سے زیادہ
زائش ہوٹل کے اندر تھی۔ ایران بھر میں صرف یہیں پانی کی بہر سانی کا انتظام تھا جو صاف شفاف پہاڑی
پشموں سے عموں کے ذریعہ پہنچتا تھا۔ پورے ہوٹل میں کمران و کاشان کے قیمتی قالینوں کا فرش تھا۔
س سے بہتر ہوٹل تصور میں نہیں آ سکتا۔

یہ ہوٹل سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے باطل دامن میں بنا ہے۔ ان پہاڑیوں پر گھنا جنگل ہے جہاں
ہر قسم کے جانور اور پرند ملتے ہیں۔ دوسری طرف سمندر کی ساکھیں سطح کو سورج کی روشنی نے آئینہ بنا رکھا تھا
پہاڑی سلسلے کی چوٹیوں پر بادلوں کا گھرا ہوا ایک پُر لطیف منظر پیش کرتا تھا۔ غرض ہوٹل کے تمام جدید ترین
سامان عشرت کے ساتھ ساتھ قدیم زمانہ کا یہ جنگل ایسا نظارہ تھا کہ ایران تو کیا غالباً سارے ایشیاء میں
میسرہ ہوگا۔

صرف سترہ سال پہلے رمسار کے مکانات کا ایک گھاؤں تھا۔ رضا شاہ نے اس گاؤں کو خوش تفریح گاہ بنا کر شہر آباد کر دیا۔ اس شہر کی تعمیر پر کتنی دولت خرچ ہوئی کوئی نہیں جان سکتا کیونکہ یہ رضا شاہ کی جیب میں سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی طرح یہ بھی پتہ نہیں لگ سکتا کہ اس کی تعمیر کے زمانہ میں مزدوروں کی کتنی تعداد لیبریا اور دوسری دہاؤں کا شکار ہوئی۔

لیکن وہ لوگ بھی جو رضا شاہ سے کسی نہ کسی بنا پر خفا ہیں، اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ رمسار سا حسین شہر محض رضا شاہ کی کوشش کا نتیجہ ہو سکتا تھا کسی دوسرے کی بس کی بات نہ تھی۔

رمسار میں میری ملاقات ایک ایرانی سائنسدان سے ہوئی جو فرانس کا تعلیم یافتہ تھا، کہنے لگا۔

”ہمارے ملک میں دولت کی کمی نہیں، ہم فرانس سے زیادہ متمول ہیں، ہمارے

زرمعی وسیعہ جرمنی سے زیادہ ہیں، لیکن رضا شاہ کی معزولی کے وقت سے ہم

بے حس و حرکت کھڑے ہیں، کچھ کر نہیں رہے!“

یہ شکایت بجا ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ایرانی سرمایہ دار اپنی دولت کو دبائے بیٹھے ہیں۔ میرے خیال میں

ایرانی سرمایہ دار دنیا بھر میں سب سے زیادہ خسیں اور بہت زیادہ زیرک ہے۔ اس کا ثبوت اصفہان میں کپڑے کی کامیاب صنعت سے ملتا ہے۔

رضا شاہ نے خود اصفہان آکر وہاں کے دو تھندوں کو بلایا اور ایک تقریر میں بتایا کہ اس زمانے میں

مشین سے کام نہ لیکر ہاتھوں ہی سے کام لینا حاکمیت ہے۔ تم لوگوں کو اصفہان میں کپڑے کی مین قائم کرنا چاہئے لوگ چپ رہے۔ وہ سمجھ نہ سکے کہ شاہ انھیں مشورہ دے رہا ہے یا یہ فرمان شاہی ہے۔ مشورہ کو تو مالا جا سکتا

تھا مگر فرمان کی تعمیل لازمی تھی! دوسرے دن گورنر نے ان لوگوں کو پھر بلا کر شاہ کی مرضی بتائی، تب لوگ

مجبور ہو گئے اور مین قائم ہو گئیں جن سے بہت نفع ہو رہا ہے اور اصفہان، ایران کا منچسٹر بن گیا ہے۔ لیکن

باوجود اس کے کہ مالک بے حد منافع اٹھا رہے ہیں۔ ان کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ قلیل رقم کے صرف سے ایک

ماہر انجینئر یورپ سے بلا کر رکھیں تاکہ وہ ان کی مشینوں کو بہترین حالت میں رکھ سکے اور یہ لوگ برٹش اور آٹلی

کے کپڑے کی قیمتوں کا مقابلہ کر سکیں۔

شعبہ کے موسم خزاں میں مجلس نے ایک سو دو ووٹ سے بمقابلہ دو ووٹ کے روس کے اس مطالبہ

کو مسترد کر دیا کہ اسے شمالی ایران میں تیل نکالنے کے مراعات دئے جائیں۔ ایران میں تعلیم یافتہ طبقہ ہی پبلک

اسپرٹ رکھتا ہے اور سیاسی معاملات کو دیکھتا سمجھتا ہے۔ ایران کی پبلک سائے کے معنی اسی طبقہ کی راسا

ہے۔ اس طبقہ میں جن لوگوں کے دلوں میں تو وہ تحریک کی یاد باقی تھی اور اس تحریک کے ختم ہو جانے پر

جن کو طاعن تھا، وہ لوگ اس فیصلے سے رنجیدہ ہوئے۔ لیکن دوسرے گروہ نے اسے ایک قومی فتنہ ہی سمجھا، انہیں یقین تھا کہ روس نے انکار کر دینے کے بعد ایرانی سرمایہ دار تیل کی صنعت میں فراخ دلی سے سرمایہ لگائیں گے جو نفع بخش ہونے کے علاوہ سلفانی ہمسایہ کے ساتھ درجہ خصامت کو بھی دور کر دیتا۔

لیکن ایران کا سرمایہ دار آج تک خواب گراں میں محو ہے، اور ایرانی تعلیم یافتہ طبقے کے دو ٹوٹ گروہ ٹریڈ اور بائیں بازو والے، حیران ہیں کہ قوم ملک کا حشر کیا ہونا ہے! کیونکہ وہ خوب واقف ہیں کہ روسی سرحد پر مکرین سرمایہ دار ایک ڈالر لگانے کو طیارہ ہو گا اور نہ دوسرا کوئی ملک اس مخدوش کام میں ہاتھ ڈالے گا۔ جو قوم شمالی ایران میں نکالے آئے گی، روس سمجھے گا کہ اس کے علاقہ سرکشیا کے تیل کو ہتھیلے کی سازش ہے۔ اس لئے خواہ مخواہ روس سے جھگڑا کون سولی لے؟

ایران کا تعلیم یافتہ طبقہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس مشینی زمانے میں جبکہ صرف صنعت بلکہ زراعت اور فوجی ساز و سامان کے لئے بھی پٹرول کی ضرورت ہے، ایرانی تیل زمیں کے اندر دبا پڑا نہیں رہنا چاہئے۔ ایک اعلان ہوا تھا کہ شمالی ایران کا تیل خود ایران نکالے گا۔ مگر سیاسی تذبذب کی صورت میں جو اس وقت ایران پر چھایا ہوا ہے، لوگوں کو بھروسہ نہیں کہ ایران ایسا کر سکے گا۔

ایرانی تاجر اس میں شک نہیں کہ زیر کی ودانائی میں تمام دنیا کے تاجروں سے ہمہ سہی کا دعویٰ کر سکتا ہو لیکن وہ معیار نہیں ہے، اس کا صنعتی مزاج نہیں ہے، اس لئے جس بات کا نتیجہ بہت عرصے بعد نکلے اس میں اسے دلکشی نظر نہیں آتی۔ ایرانی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے خوب کہا کہ ”ایرانی تاجر شخص صراف ہے، وہ خرید و فروخت کر کے فوری نفع حاصل کرنا چاہتا ہے، اس لئے اس کے اندر یورپ کے تاجروں کی سی وہ اسپرٹ نہیں ہے جو انہیں خطرہ کا مقابلہ کرنے پر طیارہ کر دیتی ہے۔“

ایرانی تاجر کی یہ فطرت حکومت ایران کو اُس طرف لئے جا رہی ہے کہ خود حکومت تمام تجارت کی اجازت دیا جائے۔ حالانکہ امریکہ کا تاجر حکومت کے ایسے اقدام کو کبھی گوارا نہ کرے گا۔

ایرانیوں کے اس مخصوص کردار کا ایک خاص سبب ہے، غیر ملکیتوں کے حملے، مسلسل سازشیں، ہر وقت کی دھمکیاں اور لوٹ کھسوٹ، اسی کے ساتھ مل کر ان کے تاجروں کا جبر و استبداد، یہ تمام باتیں ہیں جن کی وجہ سے ایک ایرانی کو اپنے ملک و قوم پر بھروسہ نہیں رہا۔ کم از کم ایرانی تاجر تو ان دلیلوں سے اپنی معذوری ثابت کر دیتا ہے۔ لیکن یورپین یا امریکن کی نظر میں اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اہل مشرق صبر و قناعت کے عادی ہیں اور راحت و سکون کی تلاش ان کی فطرت ہے اور ایسی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی جو ان روایات پر ایک کاری ضرب لگاتی، ایران میں نہ کوئی سماجی انقلاب ہوا نہ ذہنی! البتہ رضا شاہ نے ایرانی تاریخ کو

ایک دھکا دیا تھا، لیکن اس کا کام کرنے کا ڈھنگ ایسا نہیں تھا جو ایرانی تاجر کو تعمیری کاموں کے لئے اُبھار سکتا بلکہ وہ سبھوچک اور مایوس زیادہ ہو گیا۔

ایران غیر ملکوں خاص کر امریکہ سے قرضہ لینے کی آس لگائے بیٹھا ہے۔ اور بلاشبہ ایسا قرضہ مل جانے سے ایران ترقی کر بھی سکتا ہے۔ لیکن اگر ایرانی زمیندار عقل سے کام لیتا اور مستعدی دکھاتا تو یقیناً ایرانی کاشتکار کا مقدار اس قرضے کے بغیر بھی بدلا جاسکتا تھا۔

ایران کی وزارت زراعت نے امریکن ماہر ڈاکٹر لایل ہیڈن کو بلا کر ایک زرخیز علاقے میں پانچ گاؤں پر تجربہ کرنے کے لئے مقرر کیا۔ اس ماہر نے بغیر کسی مدعی اصلاح کا قانون جاری کر کے نہایت قلیل صرف پر بہت زیادہ کامیابی حاصل کر کے دکھا دی۔ میں نے مزان کے گاؤں کو خود جا کر دیکھا، جہاں ڈاکٹر لایل نے تجربہ کیا تھا۔ ایرانی دہقان نے مکھی، مکڑی، جوں، بچھو اور دوسرے حشرات الارض کو ایک اٹل تقدیر کی طرح مان لیا تھا، لیکن ان پانچوں گاؤں میں آج کسی قسم کا کیڑا مکوڑا نہیں ہے۔ پورے ایران میں یہی ایک گاؤں میں نے ایسا دیکھا جہاں کے آدمی بدن نہیں کھجاتے تھے۔ کوئی خاشکی کتا بھی نظر نہیں آیا، اس کامیابی کے لئے ڈاکٹر ہیڈن نے فی گھر پونے دو ڈالر خرچ کئے، جس میں ایک تہائی سرکاری خزانے میں کسٹم ڈیوٹی کی صورت میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر ہیڈن نے حکومت ایران کو بتا دیا کہ اگر تین سال تک پانچ ڈالر فی کنبہ کے حساب سے خرچ کیا جائے تو پورا ایران جملہ وباؤں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ اس اسکیم پر باتیں بہت کی گئیں مگر ہنوز روز اول ہے۔ اس کا سبب متعین کرنے کے سلسلہ میں ایک یونیورسٹی کے پروفیسر نے بہت محقول بات کہی کہ:-

”ہماری ملک میں لوگ صرف زمینداری اور تجارت ہی سے روپیہ نہیں کماتے، بلکہ سیاست

کو بھی نفع بخش بنا لیتے ہیں۔“

ایک ممتاز وکیل نے اعتراف کیا کہ لوگ دو دو کھاتے رکھ کر انکم ٹیکس کی چوری کرتے ہیں۔ ایران میں امریکہ کا فوجی مشن فوجی حالت سدھارنے کا کام کر رہا ہے۔ اس مشن نے چھ جرنیلوں کی برطرفی تجویز کی کیونکہ وہ رشوت کے خوگر بن گئے تھے۔ ایران کے فوجی افسر بالعموم غریبی یا معمولی حالت میں داخل ہوتے ہیں اور امیرین کر سبکدوش ہوتے ہیں۔ بے اعتباری کی حد یہ ہے کہ ایرانی تاجر فوج کی سپلائی، مہوار بل کے اصرار پر نہیں کرتے بلکہ بازاروں کی طرح اسی وقت قیمت وصول کر لیتے ہیں۔ دنیا کے ملکوں میں ایران ہی ایسا ملک ہے جس نے اندرون ملک کوئی قرضہ نہیں لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت پر ایرانی پبلک دغا خانہ دو متحد طبقہ کو بھروسہ نہیں ہے۔

ایرانی تاجر کی زیر کی دہشتمندی کا سب سے بڑا ثبوت ایران کے نیشنل بینک کے ریکارڈ سے ملتا ہے، جسے گریٹر جرنیل امیر خسروی نے قائم کیا تھا۔ یہ رضا شاہ کا مقرب خاص تھا۔ اس بینک کی بنیاد ڈالتے وقت یہ بات بنیاد طور پر مان لی گئی تھی کہ ایران بالطبع بددیانت نہیں ہے چنانچہ ملازموں کو اتنی کافی تنخواہیں دی جاتی ہیں کہ انھیں چوری یا رشوت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ امیر خسروی کا یہ اصول بہت کامیاب رہا۔ اس وقت اس بینک کا گورنر ابو الحسن ابتہاج ہے اور اس کی قابلیت مسلمہ ہے۔ اس کے دشمنوں نے متعدد سیاسی الجھنوں میں پھنسا کر اسے ذلیل و رسوا کرنا چاہا مگر اس کی ساکھ کو صدمہ نہ پہونچا سکے۔

یہ بینک اپنے چار ہزار ملازموں کو معقول تنخواہوں کے علاوہ اور بھی خاص رعایتیں دیتا ہے۔ مثلاً انھیں خاص چھٹیاں بھی لینے کا حق دیا گیا ہے، ان کی صحت کا بیمہ کرتا ہے، ملازموں کی لڑکیوں کی شادی پر بینک کی طرف سے جہیز کے لئے ایک رقم دی جاتی ہے، ان کو سامان غذا سستی قیمت پر اور کم تنخواہ والوں کو بازار سے نصف قیمت پر دیا جاتا ہے، ملازموں کی بیویاں حاملہ ہوں تو زچگی کا خرچ دیا جاتا ہے غرض ابتہاج نے اپنے ادارے کو بددیانتی سے پاک رکھنے کے لئے بہت کچھ کیا ہے اور وہ اس میں کامیاب ہے ایک ملاقات میں ابتہاج نے مجھ سے کہا کہ:-

”اگر اسٹیٹ بینک کے چار ہزار ملازم کامل دیانت اور وفاداری کے ساتھ کام کر سکتے ہیں تو

چار لاکھ کو بھی ایسا بنایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ انھیں خدمت کا معاوضہ اتنا دیا جائے کہ وہ

لاچے کا شکار نہ بن سکیں۔“

میں نے اکثر لوگوں سے یہ بات سنی کہ: ”ایران میں سو ابتہاج ہوتے تو ایران کی سر زمین جنت کو شرا دیتی۔“ پہلے ذکر آچکا ہے کہ ایک انجینئرنگ فرم کے دو انجینئروں نے ایران کے اقتصاد پر آٹھ سو صفحے کی رپورٹ طیارہ کر کے اپنے فرم کو بھیجی تھی (تاکہ امریکن حکومت کو اعلیٰ عمال کے صحیح اعداد و شمار اور اصل واقعات و صورت حال کی پوری اطلاع پہونچ جائے) اس رپورٹ کی بنیاد تھی کہ ایران کو قرضہ دیا جائے اور وہ قرضہ خود بخود ادا ہو جائے۔ اس کتاب میں اس رپورٹ پر تبصرہ تو کیا نہیں جاسکتا لیکن مجھ جیسے نادان کا یہ کار آدمی کی نظر میں اس رپورٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایرانی زراعت کو درختوں کی بیماریوں سے جو بڑا نقصان ہوتا ہے، اس کے دفع کرنے کی بڑی موثر تدبیر بتائی ہے، کیڑے کوڑوں کی بدولت اناج کی پیداوار میں ایران کو تین کروڑ ڈالر کا سالانہ نقصان ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اگر رپورٹ کی ہدایات پر عمل کیا جائے تو ایرانی کو ڈھائی کروڑ سالانہ کی بچت ہو سکتی ہے۔

ایران، دنیا میں سب سے زیادہ چائے پینے والا ملک ہے، لیکن سادار چائے اور استخار

(کاشغ کا جھوٹا گلاس) یہ تینوں لفظ روسی ہیں۔ ایران، خود بھی چار ہزار ٹن چائے پیدا کرتا ہے؛ لیکن ایک کمزور ڈالر کی چائے باہر سے آتی ہے۔ حالانکہ بحر قزوین کے علاقے میں میں ہزار ایکڑ زمین ایسی پڑی ہے جہاں چائے کی کاشت بڑھا کر ایران غیر ملکی چائے سے بے نیاز ہو سکتا ہے لاکھوں ڈالر بچا سکتا ہے۔ اسی طرح وہاں زمین کی پیداواری طاقت کو بھی دوگنا کیا جا سکتا ہے۔

ذیرِ غلم غلام نے ایک طاقہ میں مجھے بتایا کہ بہت بڑے علاقے کو قابل کاشت بنا کر زمین کسانوں کو مفت دیا جاسکتی ہے۔ دس پندرہ سال ان سے کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا، مگر اس کے لئے بیرونی قرضے کی ضرورت ہے۔ یہ ایرانی حکومت کا طریق کار ہے، ورنہ بہت سا کام بغیر بیرونی قرضے کے بھی انجام پا سکتا ہے۔

سرزمین ایران غیر معمولی طور پر حسین بھی ہے اور زرخیز بھی، لیکن ایسا ملک اور یہ قوم، دیکھئے دوسرے لیکر پاؤں تک، زخم ہی زخم ہے!

تاریخ کے ایک دور میں ایران دنیا کی زبردست طاقت رہ چکا ہے۔ میں نے ایک ایرانی میوزیم میں ڈھائی ہزار سال پُرانا فولاد سی ہل دیکھا۔ یہ ہل ان تمام ہلوں سے بہت زیادہ اور بہتر کام کر سکتا ہے جو اس وقت ایرانی کاشتکار استعمال کرتے ہیں، مگر کسی کو توجہ نہیں۔ اس لئے آخر میں یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ نجات کی صورت کون سی ہے؟ میرے خیال میں ایران کو ایک مضبوط ہاتھ کی ضرورت ہے! پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ وہ رضا شاہ ایسے آدمی کا ہاتھ ہو، یا دارا اور شاہ عباس جیسے مصلحوں کا؟ آیا وہ ہاتھ ایرانی سرزمین سے اٹھنے والے انقلاب میں لے گا یا روس کی ڈکٹیٹری کی صورت میں نمودار ہوگا؟ یا پھر واشنگٹن ولڈن کی مالی امداد ہی نجات کی صورت پیدا کرے گی؟

ایک غیر ملکی مقیم ایران نے مجھ سے کہا کہ:-

”ایک بلین (دسویں) ڈالر کا قرضہ اور ایک سو یورپین یا امریکن ماہر و انجینئر دس سال

میں ایران کی صورت بدل دے سکتے ہیں!“

بہر حال دو باتیں اٹل ہیں: اس مشینی عہد کی ترقیوں کے زمانہ میں ایران کا جمود عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا، اور ترقی و خوشحالی کے لئے جو پروگرام بھی بنایا جائے گا اس کی ابتدا زمین اور کاشت کی اصلاح ہی سے ہوگی۔

آٹھواں باب

(قاہرہ)

جنگ کے زمانہ کا قاہرہ کچھ اور تھا، اور سہ ماہی کا کچھ اور اب وہ بالکل پہلے کا سا قاہرہ ہو گیا تھا وہی کابلی، وہی چیخ کربات کرنا وہی عمامہ پوش Dyaqoman وہی گداگروں کی کثرت اور وہی خواجہ فروشوں کی سہرا مار۔ ایام جنگ کی خوشحالی مفقود تھی۔

بڑے بڑے ہوٹل آدھے خالی پڑے تھے، اور ان ہوٹلوں کے بار روم اسپتال کی طرح خاموش تھے۔ بڑے بڑے بازاروں کے دوکاندار گاہکوں کی کثرت سے بوکھلائے ہوئے نہ تھے بلکہ ہاتھ پر ہاتھ دھربے بیٹھے تھے۔ سونا بٹورنے کا زمانہ ہوا ہو چکا تھا۔

بائیں ہمہ، یورپ سے آٹ کر قاہرہ پہنچے جانا ایک عجیب اور حرکت میں لے آنے والا تجربہ تھا، معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کی بندی سے کسی نئے براعظم پر نہیں بلکہ کسی نئے کُرسے پر ٹپکا دئے گئے ہیں۔ جہاں کی آب و ہوائی، تہذیب نئی اور لوگ مختلف ہیں۔ بازاروں میں مال و اسباب کی کثرت حیران کر دینے والی تھی۔ یورپ کو چھوڑے، سوئٹزر لینڈ میں نہ تو ڈالر کی حکمرانی تھی اور نہ ڈالروں میں ہیر و کا درجہ رکھنا تھا، اسلئے سوئٹزر لینڈ کی ٹرین ”ڈی لکس“ کے مسافروں کو بھی قہورہ میں سیکرین ملتی تھی۔ لیکن قاہرہ میں ڈالر کا قحط ہونے کے باوجود شکر کیا معنی کسی چیز کی کمی تھی ہی نہیں، وہاں نہ کسی چیز کا راشن تھا اور نہ کوئی شے ایسی کہ قابل حصول نہ ہو۔ قاہرہ میں لوگ چیزیں ڈھونڈتے نہیں پھرتے تھے بلکہ خود سامان خریداروں کا منتظر رہتا تھا۔ یورپ کی فاقہ کشی کے بعد قاہرہ میں کچور اور انجیریوں کے انبار کیلے امرود کے ڈھیر، آموں کی افراط دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

مصر میں جنگ نے کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہٹا یا نہ تھا۔ عیش و آرام کے اسباب مغربی ملکوں میں ناپید ہو گئے تھے مگر مصر میں کثرت سے ملتے تھے۔ مصر کی راجدھانی ایک ایسا شہر تھا جہاں کسی کو قیام گاہ کی

جتنی میں سرگراں نہیں ہونا پڑتا تھا۔ زیورچ اور جینوا میں ڈالر کی بڑی ارزانی تھی مگر وہاں سیاحوں کو قیام و طعام اور نغمہ و شراب اس آسانی سے میسر نہیں ہو سکتے تھے جس طرح قاہرہ میں، شبنہ کلب، قصبہ کلیں، منخانے اور سینما، نہایت خندہ پیشانی سے سیاحوں کا خیر مقدم کرنے کو ہمہ وقت طیار تھے۔ ہر قسم کی عیاشی و ستر کے اندر تھی اور اس کے ہیا کرنے والے موٹر پر سیاحوں کا پیچھا کرنے کو موجود تھے۔

بیروزگاری شدید ہونے کے باوجود قاہرہ کے بازاروں میں ہر قسم کے سامان کی کثرت دیکھ کر یورپ سے آنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اور سب سے زیادہ متعجب کرنے والی چیز یہاں کا تضاد ہے۔ ایک طرف قدیم اہرام اور عالیشان مسجدوں کے پُراںے گنبد و مینار اور دوسری طرف جدید وضع کی شاندار دلکش عمارتیں اور پھر اسی کے ساتھ کچی جھونپڑیاں بھی ملتی و دوں صحرا کے بالکل کنارے ایسے باغ نظر آتے ہیں جو دنیا کے کسی شہر میں نظر نہیں آ سکتے۔

بیش قیمت اور شاندار امریکن موٹریں دوڑتی پھر رہی ہیں اور اُسی کے ساتھ اونٹوں اور گدھوں کے قافلے بھی ہٹو بچہ کہتے گزر رہے ہیں۔ مصری لوگ دنیا میں سب سے زیادہ خوش باش اور خرچیلے ہیں اور یورپ کا تازہ ترین فیشن قاہرہ کی سڑکوں پر عام طور پر ہر جگہ نظر آتا ہے۔ مصری قوم اتنی ہی خلیق و باتمیز ہے جتنی دنیا کی کوئی قوم ہو سکتی ہے مگر انڈاس اور غریبی بھی اس ملک میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

ایران کی طرح قاہرہ میں بھی عورتیں نقاب پوش رہتی ہیں۔ لیکن وہ مصری لڑکیاں جو نقاب نہیں ڈالتیں اور سرخی و غارہ، پوڈر وغیرہ کمال صناعی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں، دنیا کی حسین ترین عورتوں میں شمار ہو سکتی ہیں۔ قاہرہ میں مرد عورت بالعموم آدھی درجن زبانیں بلا تکلف بول سکتے ہیں۔ مگر دوسری طرف بے شمار مصری اپنا نام تک نہیں لکھ سکتے۔ اس شہر میں نمائش بے حد اور سنجیدگی کم ہے۔ فوری طور پر وہاں بڑے سے بڑا واقعہ رونما ہو سکتا ہے مگر استحکام و استقلال کم باتوں میں ہوتا ہے۔ وہاں اگر سنجیدگی و ہم آہنگی دیکھی جاسکتی ہے تو اس کے ساتھ شور بھی ایسا ہے جو کانوں کے پردے پھاڑ دے، اگر وہاں کے مرد بالعموم بلند آواز سے باتیں کرنے کے عادی ہیں تو وہاں کی عورتیں نرم کلامی کی عادی ہیں، اگر وہاں خونچے والے باتمیز و گستاخ ہیں تو اسی کے ساتھ بڑے دوکاندار و حدودہ مہذب و شایستہ ہیں۔

قاہرہ کی ٹیکسیاں یورپ کے اکثر شہروں کے مقابلہ میں زیادہ چکیلی اور شاندار ہیں۔ امریکن بسیں جس کثرت سے قاہرہ میں چلتی ہیں زیورچ میں بھی نہیں دیکھی تھیں حالانکہ زیورچ ہی ایک ایسا شہر ہے

جہاں ڈالر بکثرت اور ارزال ہے۔

اسکندریہ کے شہر ڈھول سے پانچ منٹ چلے تو آپ کو دنیا کی حقیر ترین بستیاں اور جھونپڑیاں دکھلائی پڑیں گی جہاں کی گندگی اور بوداغ پریشان کر دے گی۔ جہاں بچوں کی اکثریت آنکھوں کی بیماری میں مبتلا نظر آئے گی۔ گراگرنٹ ہاتھ پر لاشوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے نظر آئیں گے۔ مصر کی اوسط اموات ساری دنیا سے زیادہ ہے۔ ایک سال کے ہر چار بچوں میں سے ایک مر جاتا ہے۔

الغرض قاہرہ، تضاد و تخالف کا مرکز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد ۵۲۵ھ قبل مسیح پڑی تھی۔ اس کی آبادی ۱۹۵۰ء میں ساڑھے چھ لاکھ سے کچھ ہی زیادہ تھی اور آج بیس لاکھ کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ غیر ملکی سیاح جب مصر کی راجدھانی میں پہنچتا ہے تو لب صحرا ایک عالیشان شہر بسا دینے والی قوت و ذہانت پر عیش کرنے لگتا ہے۔ مشرق اگر اپنی خوبیوں اور خرابیوں کو انتہائی صورت میں کسی جگہ پیش کر سکتا ہے تو وہ جگہ قاہرہ ہے۔ افریقہ بھر میں سب سے بڑا اور جنگامہ آفریں شہر ہونے کے ساتھ ہی قاہرہ ہزار مسجدوں والا شہر بھی کہلاتا ہے۔ یہاں ایک ہزار سال کی قدیم یونیورسٹی ”ازہر“ قائم ہے۔ اس جامعہ میں تیرہ ہزار لڑکے تعلیم پاتے ہیں، جن میں چھ ہزار دیگر ممالک کے ہیں۔ ایک مصری عالم کے لفظوں میں ”قاہرہ اسلامی دنیا کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔“

قاہرہ میں ایک جماعت ”اخوت اسلام“ کے نام سے قائم ہے جو ہر جماعت اور نئی تحریک کی دشمن ہے۔ اگر یکلچہ کالج کے طلبہ و طالبات اور پروفیسروں نے ایک محفل رقص و سرود جمائی جس میں ”ایوننگ ڈریس“ ضروری تھا، اس محفل میں بادۂ ارغواں کے دور بے تکلف چلے۔ ”اخوت والوں نے اس کو نجس اور گندہ کا لقب دیا۔

میرے قیام قاہرہ کے دوران میں ”اخوت“ والوں نے ایک ادیب کی گرفتاری کا مطالبہ کیا کیونکہ اس نے اپنے کسی مضمون میں اس بات کا مذاق اڑایا تھا کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو جانے پہچانے بغیر شوہر اور بیوی بن جاتے ہیں۔ ”اخوت“ کے ایک اخبار نے ان اخباروں کی اشاعت روک دینے کا بھی مطالبہ کیا جو لباس غسل میں لڑکے لڑکیوں کی تصویریں شائع کرتے ہیں۔

قاہرہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے مجھے ایک شام بدیعہ میں مدعو کیا۔ بدیعہ ایک نہایت فیشن ایبل اور مشہور ریستوران ہے جہاں الازہر اور اخوت کی طاقت و اثر کے باوجود نوجوان لڑکیاں ناچی گاتی ہیں۔ اس مجلس میں شریک ہونے سے پہلے میں تصور میں نہ لاسکتا تھا کہ مسلم تاشائی ایسے منظر کو گوارا کر سکتے ہیں، خاص کر جس شہر میں جامعہ الازہر قائم ہو !

میں نے اپنے میزبان دوست سے سوال کیا کہ مسلمانوں کے اتنے بڑے مجمع میں اسلامی تعلیم کی یہ پامالی کیونکر ممکن ہے تو اس نے کہا کہ ”یہ قاهرہ ہے!“

مصری پایہ تخت میں کسی مذہب کی تعلیم کا کوئی اثر نہیں ہے اور یہ بالکل سچ ہے کہ:-
”قاهرہ ساری دنیا کے شہروں میں سب سے زیادہ کھل کھیلنے والا شہر ہے۔“

مصریوں کی متضاد طبیعت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ایک طرف مصر جو ڈالر کا بھوکا ہے یہ بھی چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ غیر ملکی سیاح یہاں آئیں،
مگر دوسری طرف ان کی قوم پرستی کا اشتعال غیر ملکیوں کے خلاف متشدد مظاہرے بھی کراتا رہتا ہے۔

مصری حکومت چاہتی ہے کہ سیاح زیادہ سے زیادہ تعداد میں مصر آئیں مگر ساتھ ہی پاسپورٹ کے حاصل کرنے میں اتنی الجھنیں اور دقتیں پیدا کی جاتی ہیں کہ سیاح گھبرا جاتا ہے۔
مصری حکومت چاہتی ہے کہ غیر ملکی سرمایہ مصر میں لگے مگر اس کے لئے شرطیں ایسی رکھی جاتی ہیں کہ یہ کام مشکل ہو جاتا ہے۔ رشوت کا یہ عالم ہے کہ جو غیر ملکی، مصر میں کاروبار کر رہے ہیں وہ اپنا کام کسی دوسرے ملک میں منتقل کرنے کی فکر میں ہیں۔ مصر کی اقلیتیں انھیں وجہ پر غیر مطمئن ہیں۔ یہودی حکومت اسرائیل کی طرف نظریں لگائے ہیں اور آرمینین، روس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ مصر کو اسرائیل سے نفرت اور روس کی طرف سے شبہ ہے۔

غرض مصر میں منفی و مثبت طاقتیں متوازی کام کر رہی ہیں جیسے کسی چیز کے حرکت میں آنے سے اس کا سایہ بھی متحرک ہو جاتا ہے۔ قاهرہ کے تمدن کا تضاد انسان کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔
لسانی اعتبار سے قاهرہ اصلاً عرب ہے لیکن کلچری پہلو سے وہ قدیم و جدید اثرات کا مجموعہ ہے قدیم و جدید آرزوؤں کا معرکہ ہے! وہاں پرانے اور نئے خیالات کا مجادلہ جاری ہے! اور یہی وہ خصوصیت ہے جو قاهرہ کو ایک جیتا جاگتا ڈراما بنا دیتی ہے!

یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ دوسرے ملکوں کی راجدھانیوں کی طرح قاهرہ بھی ایک کاساپولیٹن (مخلوط النسل آبادی کا شہر) ہے۔ اس کے برخلاف قاهرہ جو کہتا ہے وہی پورا مصر، بلکہ عرب دنیا کا ایک بڑا حصہ کرنے لگتا ہے۔ قاهرہ کا جغرافیہ، تاریخ، دولت، ضخامت، کلچر، سماجی ہنگامہ خیزی اور ذہنی شورش — روایتی اور جدید، دونوں قسم کی — قاهرہ کی اس سائیکالوجی کا جو انہیں قاهرہ، اپنی پر عظمت قدیمیت کے باوجود اپنی خامیوں اور گمراہیوں کو نوجوانی کے جوش میں قابلِ مٹنا

نہیں سمجھتا ہے۔ وہ اپنی فوجوں اور دولت پر اس قدر نازاں ہے کہ اس نے فلاحوں (کسانوں) کی حالت ناز کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ اپنے وقار اور اپنے ارادے کو دنیا اور خاص کر عرب ملکوں کے سامنے اس طرح پیش کرنا چاہتا ہے جیسے کہ کوئی نوجوان لوگوں کے سامنے اپنی طاقت و جوانی کی نمائش کرے۔ مصری حکومت کے سامنے اس وقت بہت سے بین الاقوامی مسئلے ہیں! ان میں اسرائیلی حکومت اور نہر سوئیز کے علاقے اور سوڈان کا انخلا، بہت اہم ہیں۔ ان مسئلوں نے مصر میں بحار کی سی حالت پیدا کر رکھی ہے۔ وزارت خارجہ کے دفتر سے مجھے بہت سالٹرکچر دیا گیا جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سوڈان پر قاہرہ کے جو حقوق ہیں ان سے انکار ممکن نہیں، ایک اقتباس یہ ہے :-

”بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ اقتصادی ترقی اور زراعت کو وسیع کرنے کے لئے مصر کا

انحصار، سوڈان پر ہے، نہج زمینوں کو صرف اسی صورت میں قابل زراعت بنایا جاسکتا

ہے کہ آبپاشی کا انتظام ہو، اور یہ بات جب ہی میسر ہو سکتی ہے جب نیل کے پانی پر پورا

کنٹرول ہونے کی اسکیم پر عمل درآمد ہو، اور طغیانیوں کے پانی کا ذخیرہ کیا جاسکے

اور یہ حقیقت کہ مصر کی خوشحالی کا تمام تر انحصار بالائے نیل پر پورے کنٹرول اور

اس پانی کے مناسب استعمال پر موقوف ہے، مصری مدبرین سلطنت کے دماغوں

میں مرتسم ہو چکی ہے، جو گزشتہ سو سال سے برابر جڑ پکڑتی جا رہی ہے!“

ایک غیر ملکی حکومت اگر سوڈان کے نظم و نسق میں دخیل ہو تو بلاشبہ نیل کا پانی روک کر مصر کی خود مختاری

کو بے معنی اور اس کے وجود کو خطرے میں ڈالا جاسکتا ہے۔ لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ سوڈانیوں کو اپنے مقصد کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے تو مصری آتش بپا ہو جاتا ہے۔

قاہرہ کے سوڈانی باشندوں نے اپنے لئے ایک مقام بنالیا ہے۔ یہ لوگ بالعموم ادنیٰ اقسام کے

روزگار کرتے ہیں مگر مصری اور اجنبی سب اس پر متفق ہیں کہ سوڈانی بالعموم قابل اعتماد ہوتا ہے۔ سوڈانی

قاہرہ میں ہوٹلوں وغیرہ میں خدمتگاری یا دو لقمہ مصریوں اور غیر ملکیوں کی نجی ملازمتیں کرتے ہیں، کچھ

ٹیکسی ڈرائیور بھی ہیں۔ یہ لوگ نہایت سنجیدہ و متین اور تمیز دار ہوتے ہیں۔ مصری جس قدر بسیار گو ہیں،

سوڈانی اتنے ہی کم گو ہیں۔ سوڈانی بالعموم دراز قد، چڑے چکلے، مضبوط و توانا ہوتے ہیں، جسمانی و

اخلاقی دونوں اعتبار سے توانا! لیکن اس کے باوجود مصری وزارت خارجہ کے ایک ذمہ دار افسر کے

سامنے جب سوڈان کو عام رائے دہی کا حق دینے کی بات میرے منہ سے نکلی تو معلوم ہوا کہ میں نے اس

افسر کی نہیں بلکہ پوری مصری قوم کی توہین کی ہے۔

مشرق وسطیٰ کے تمام اسلامی ملکوں میں، تعلیم یافتہ عورت، خیال و عمل کے لحاظ سے اتنی ترقی یافتہ نہیں ہے جتنی مصری عورت ہے۔ اور اسی طرح مصر کی جاہل اور قدامت پرست عورت کی طرح کوئی نیک بھی نہیں ہے۔

مصر کی نئی روشنی والی نسل کی لڑکیوں کو اجنبی لوگ FLAPPER (یعنی ایسی لڑکی جو عام صحبتوں میں شریک ہوتی ہو) کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ غلط ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ مصری لڑکیاں قدیم اثر و رسوخ سے ہٹ کر آزاد زندگی گزارنے پر تل گئی ہیں، ایسی باغی لڑکیوں کی گنتی اگرچہ ابھی زیادہ نہیں لیکن ان کی خود رائی متحیر کر دینے والی ضرور ہے۔ انکا نعرہ ”آزادی“ اور عمل ”خود نمائی“ ہے۔ وہ جدید تمدن کی آرائش و زیبائش کے تمام طریقے استعمال کرتی ہیں اور اپنے جسم کے سڈول پن پر یورپ کی لڑکیوں کی طرح فخر کرتی ہیں۔ ساحل پر غسل کرنے کا جست لباس، جسے مصری بڑھیاں شیطا کی ایجاد کہتی ہیں، لڑکیاں اسکے پہننے میں اپنی شان سمجھتی ہیں۔ مصری لڑکیاں سینما دیکھنے کی اتنی شوقین ہیں کہ ہفتے میں دو بار ضرور جاتی ہیں۔ گھر پر نوجوان دوستوں سے ملاقات کے امکان کم ہیں اس لئے سینما بہترین وعدہ گاہ ہے۔ وہ پارٹیوں اور رقص کی محفلوں میں شریک ہوتی ہیں اور کبھی کبھی سگریٹ بھی پی لیتی ہیں۔ احترام نسوانیت کے خیال سے سگریٹ نوشی عام اور شدید نہیں ہے۔ اسے ہالی ووڈ کے تمام فلم اشاروں کے نام یاد ہیں اور غیر ملکی ملاقاتیوں کے سامنے اسے یہ کہنے میں ہلک نہیں ہوتا کہ وہ کس فلم اشار کو دوست بنا سکتی ہے اور کس کو شوہر۔ ایک مسلم گھر پر ایک ٹی پارٹی میں ایک لڑکی کو میں نے خود یہ کہتے سنا کہ وہ کیری گرانٹ کو دوست بنا سکتی ہے، ہیریٹ مارشل کو شوہر اور کلارک گیبل کو یہ بھی اور وہ بھی! جب میں نے اُسے ٹوکا کہ اس کے گھر والے اسے کیونکر پسند کریں گے تو بولی کہ ”میرے باپ کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ اور ماں سمجھتی ہے کہ میں پوری طرح گمراہ ہو چکی ہوں، دادی البتہ یہ عقیدہ بانڈھے بیٹھی ہے کہ ایک دن مجھے ہدایت ضرور ملے گی اور میں بے دینی کی راہ چھوڑ دوں گی۔ حالانکہ میں نے اپنے کہہ دیا ہے کہ میں ان کی طرح کی نہیں بلکہ نئی قسم کی عورت بننا چاہتی ہوں! میں اپنی معاش کی خود کفیا ہوں اس لئے کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا، آزاد ہونا بڑے لطف کی بات ہے!“

پُرانی اور اسلامی روایات کی پامالی کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بدتمیز ہو گئی ہیں، نفاست و شائستگی کا انھیں اتنا ہی شدید احساس ہے جس طرح جدید لباس اور بناؤ سنگھار کا! چنانچہ مصر کی جدید عورت اصل میں نتیجہ اور رمز علامت ہے اس سماجی شورش کی جو دو عظیم جنگوں کے درمیان وقفے میں مسلم ملکوں کے اندر ہوتی رہی ہے۔ اس شورش کو اعلیٰ اور درمیانی طبقے کی مسلم لڑکیوں

جدید تعلیم لےنے سے اور بھی تقویت پہونچی ہے۔

ہر چند مردوں کی طرف سے کافی مخالفت ہوئی مگر مسند سے مصری یونیورسٹی میں لڑکیوں کا داخلہ شروع ہو گیا تھا۔ آج مصر کے پانچ ہزار ڈاکٹروں میں ڈیڑھ سو عورتیں ہیں۔ ایسے ملک کے لئے جہاں یہ کہاوت ہو کہ عورت دو ہی بار گھر سے نکلتی ہے، ایک شادی کے بعد رخصت ہو کر دوسرے مر کر۔ وہاں بیس سال کی مدت میں ڈیڑھ سو عورتوں کا ڈاکٹر ہو جانا واقعی حیرت کی بات ہے۔

ایران کے روشن خیال علماء کی طرح مصر کی تعلیم یافتہ عورت بھی اس کو غلط کہتی ہے کہ اسلام وحیت کو کمتر سمجھتا ہے اس کی کتتری کا ذمہ دار ہے۔ مسلم عورت جس ادنیٰ درجے میں پہونچا دی گئی ہے مصر کی تعلیم یافتہ عورت کا عقیدہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اسامہ خدیجی جو زمانہ کالج میں اسسٹنٹ ٹرین ہے، لکھتی ہے کہ:-

”یورپ والوں کا یہ خیال غلطی پر مبنی ہے کہ اسلامی احکام مسلم عورتوں کو تعلیم دئے جانے کے خلاف ہیں۔ اس کے برخلاف اسلام عورتوں کی تعلیم پر نہایت زور دیتا ہے پیغمبر اسلام کی بڑی خواہش تھی کہ ان کی بیویاں لکھنا پڑھنا سیکھ جائیں۔ رسول خدا کی حدیث ہے کہ عالم کا حاصل کرنا ہر مسلم مرد اور عورت کا فریضہ ہے۔ اسلامی ادب میں ایسے حوالے ملتے ہیں جن سے لڑکے لڑکیوں کا ایک ہی مکتب میں پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی سوانحوں میں بہت سے اذکار ملتے ہیں کہ عورتیں ادب اور ذہنیات کے مطالعہ میں ممتاز ہو سکتی اور مردوں کو لکچر دیا کرتی تھیں۔“

مصر کی یہ عالم خاتون مسلم عورت کے اس ”ذہنی درو حافی زوال“ کا ذمہ دار قدامت پرستی کو قرار دیتی ہے۔ یہ خاتون مسلمانوں کی اس جہالت و عصبیت کو اس عقیدے کا سبب قرار دیتی ہے کہ:-

”عورت کو جاہل رکھ کر چار دیواری میں بند رکھا جائے تو اس کی عصمت محفوظ ہے!“

اسامہ خدیجی کے اس مضمون نے ”اخوت اسلامی“ کے حلقوں میں ہلچل ڈال دی اس لئے یہ مضمون کتابی صورت میں شائع ہوا تو وہ کتاب شاہ فاروق سے معنون کی گئی۔

۱۹۵۲ء میں ایگریکلچر کالج میں ۳۷ مصری عورتیں داخل ہوئیں اور تین لڑکیوں نے جرأت کی اور انجینئرنگ کالج میں داخلہ کرا لیا۔ جرنلزم کے اسکول میں مردوں سے زیادہ عورتیں ہیں۔ اسی اسکول کی تعلیم یافتہ متعدد خاتونیں آج متعدد اخبار رسالے ایڈٹ کر رہی ہیں۔

ایس جے یہ کاما بیاں اور ترقیاں شہروں تک محدود ہیں۔ مصر کے دہقان ہنوز فراغۂ عہد میں

جی رہے ہیں۔

مصر کی نئی نسل کی لڑکیوں کی یہ پیشقدمیاں اسی طرح سماجی اور ذہنی شورش و انتشار کی علامت ہے جس طرح طلبہ کے مظاہرے اور ہنگامہ خیزیاں۔ پورے مشرق وسطیٰ میں یونیورسٹی کے طلبہ اتنے پرجوش و عمل نہیں جتنے مصر کے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں میڈیکل طلبہ کے ایک مظاہرے کو پولیس نے منتشر کر دیا تو انھیں اتنا غصہ آیا کہ تمام درسی کتابیں جلادیں اور لیبریریٹری کا سامان توڑ پھوڑ ڈالا۔ مظاہرے کا تقریباً ایک لاکھ ڈالر کا یہ نقصان پولیس کا نہیں بلکہ خود ان طلبہ کا نقصان تھا۔ یونیورسٹی کھلنے پر یہ نوٹس نکلا کہ تمام طلبہ کو پہچان کے کارڈ رکھنا لازمی ہے تاکہ آئندہ اگر وہ یونیورسٹی کا نقصان کریں تو ان سے یا ان کے سرپرستوں سے وصول کیا جاسکے۔

مصر کے لوگوں میں باغیانہ اسپرٹ عام ہے، صرف نئی نسل کے لوگوں میں نہیں۔ جنگ کے بعد سے بے شمار مظاہرے اور بلوے ہو چکے اور ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مظاہرے برٹش کے خلاف ہوتے ہیں کبھی تمام غیر ملکیوں کے خلاف۔ کبھی وہ اسرائیل کا مسئلہ ہوتا ہے اور کبھی سوڈان کا۔ اور اب تو خود مصری حکومت کے خلاف بھی مظاہرے ہونے لگے ہیں۔ غرض ہنگامہ آرائی کے لئے مصریوں کو حیلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ قومی اور بین الاقوامی حیلہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ قاہرہ کے ایک اساتذہ نے اس ہنگامہ آرائی کا سبب یہ بتایا کہ طلبہ کی تعداد قاہرہ میں بہت زیادہ ہے ایک دوسرے مابہر تعلیم نے اس طرح رائے زنی کی کہ :-

”ہمارا ملک غیر ترقی یافتہ ہے اور اپنے اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے تمام لوگوں کو کام نہیں دے سکتا!“

اور یہ سچ بھی ہے کہ حکومت نے اسی شور شرکے دباؤ سے بہت سے محکمے بیکار یا ضرورت سے زائد کھول رکھے ہیں تاکہ کچھ لوگ کھپائے جاسکیں اور زیادہ آدمی کھپانے کی خاطر تنخواہیں کم کی جا رہی ہیں جسکی وجہ سے رشوت کی گرم بازاری ہے، چنانچہ نوجوان طبقہ جب روزگار نہیں پاتا تو شورش پسند بن جاتا ہے مگر میں ابتدائی تعلیم عام ہے اور پڑھے لکھے بے روزگاروں کی کثرت اسی کا نتیجہ ہے۔ مگر مصر میں ابھی صرف چالیس فیصد ہی بچے ابتدائی درسا ہوں میں داخل ہو سکے ہیں۔ ابتدائی تعلیم پر جتنا روپیہ صرف ہوتا ہے اس کا دو گنا اعلیٰ تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مصر کی روح اس کے جسم سے زیادہ قوی اور اس کی آرزوئیں ان کے پورا ہونے کے سوا دوسامان سے بہت زیادہ ہیں۔ قومی انتشار کی حالت میں ایسے نوجوانوں کا ذاتی انتشار بہت زیادہ وزنی ہو جاتا ہے، جن کو غیر مذہبی قسم کی تعلیم ملی ہو۔ مصر کے طلبہ اور تعلیم یافتہ نوجوان یا تو زمیندار اور تجارت پیشہ طبقے کے

ہیں یا سرکاری افسروں کی اولاد میں اور نئی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ دنیا کا تازہ ترین ادب اور سیاسی خیالات ان کے مطالعے میں آتا رہتا ہے، چنانچہ ان کے سامنے ایک نئی دنیا ہوتی ہے جسے وہ پیار بھی کرتا ہے اور اس سے نفرت بھی۔ ہر ہوائی جہاز جو قاہرہ کے اڈے پر اترتا ہے تعلیم یافتہ مصری کے لئے کچھ نہ کچھ نئی چیز لیکر آتا ہے اور اس کا قومی و ذاتی انتشار اس سے اور بڑھ جاتا ہے۔ وہ اپنے دماغ سے نئے خیالات کو نکال نہیں سکتا! وہ مصر کی خرابیوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے کیونکہ مصر کے غریب اور دیہات کی حالت زار برداشت نہیں کر سکتا، مگر اس اصلاح میں خود اس کے قدامت پرست گھروالے نکل جاتے ہیں۔ یہ حالت اسے کرب و غضب میں مبتلا رکھتی ہے اور وہ احتجاج کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسے غیر ملکیوں سے نفرت ہے مگر وہ مصری پاشا سے بھی نفرت کرتا ہے۔ وہ عمل کا طالب ہے! دراصل وہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا چاہتا ہے مگر یہ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نہیں چاہتا! اسی لئے وہ کمیونزم کو اپنا لیتا ہے۔ لیکن اصلاً مصری نوجوان وطن پرست ہے۔ وطن عزیز کو ترقی کی راہ میں تیزی سے گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے غم و غصہ دل میں لئے ”مرتا کیا نہ کرتا“ پر عمل کرنے لگتا ہے۔

یہ حقیقت، نہایت اہم ہے کہ اس ملک میں جو اسلام کا قلعہ ہے، ایسے نوجوان موجود ہیں جو اپنے باپ کو چور اور ڈاکو کے نام سے یاد کرنے میں ہاک نہیں کرتے۔ اور ایسے باپ بھی موجود ہیں جو اپنے بیٹے کو مصر کی حالت پر اظہار خیال کرتے سنتے ہیں تو ”ناچختہ جوانی کی بکواس“ کہہ کر ٹال دیتے ہیں، یا اپنے لخت جگر کے ان ”غیب خیالات“ پر کڑھٹے رہتے ہیں۔

ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ڈک ایٹس بیٹے نے اپنے باپ کی دولت کو پس پشت ڈال کر راحت و آرام کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی ہے۔ اور ایسے نوجوان بھی ہیں جو ”زمیندار کا ناس!“ ”افلاس کو ختم کر دو!“ ”سرمایہ داری ختم کر دو!“ ”نا برابر کو مٹا دو!“ قسم کے نعروں میں بہت دلکشی پاتے اور ہر انقلاب و طوفان کو ”خوش آمدید!“ کہنے کو طیار ہیں، بشرطیکہ وہ مصر کے ان خوابوں کو حقیقت میں بدل دینے کے لئے ہو! میں نے چند نوجوانوں سے سوال کیا:-

”تم لوگ روس کی تقلید کرنا چاہتے ہو یا امریکہ کی؟“

”کسی کی نہیں! ہم یہ چاہتے ہیں کہ مصر اپنی کامل خود مختاری کی حفاظت کرے، لیکن ہم نہیں چاہتے کہ مصری پاشا اپنے قانون دان گروگوں کو پارلیمنٹ کے ممبر بنوا کر مصری قوم کی قوت اسکی

صلاحیت اور قابلیت کو خیر کا پابند بنا دیں!“

قانون کے ایک طالب علم نے مجھے جواب دیا:-

”مصر کی نئی نسل شدید قسم کی وطن پرست ہے، اور مشکلوں سے حاصل کی ہوئی آزادی کو نہایت عزیز رکھتی ہے اور غور فرمادہ ہے کہ کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو جائے کہ کوئی مشرقی یا مغربی طاقت کسی بہانے مصر کو پھر دبوچ لے۔ اس لئے یہ لوگ لفظ انقلاب سے بھی ڈرتے ہیں۔“

حکومت مصر نے ہفتہ دار الجہور کو کچل دینے کی کوشش کی تھی جسے ایک نوجوان پروفیسر اور کئی قانون دان اور طلبہ ایڈٹ کرتے ہیں مگر وہ زندہ رہا اور جب مصر نے اسرائیل کے خلاف جنگ شروع کی تو وہ تنہا اخبار ستعا جس نے اس جنگ کی تنہا مخالفت کی۔ مصر کے طلبہ در در جاکر اس اخبار کو پیچھے اور چندہ وصول کرتے ہیں۔ مزدور لیڈروں سے اسے مدد ملتی ہے۔ حالانکہ مصر میں مزدور تحریک اس مفہوم میں موجود نہیں جو یورپ کے ملکوں میں لیا جاتا ہے۔ مجھے ایک سفارت خانے کے ایجنٹی نے بتایا کہ:-

”جس وقت فرانس میں انقلاب ہوا تو فرانس موجودہ مصر کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ملک تھا۔“

وزارت کے ایک ذمہ دار افسر نے جسے کالج چھوڑے زیادہ مدت نہ ہوئی تھی۔ ”غلطی آواز میں مجھے اعتراض کیا کہ

”ہٹلر اگر لڑائی میں جیت جاتا تو مصر کا تعلیم یافتہ طبقہ فاشزم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔“

یہ اس نے صحیح کہا۔ کچھ دنوں کے لئے ”نوجوان مصر“ کی تحریک اٹھی تھی اور چند ہی دنوں میں کافی مدد حاصل کر لی تھی۔ اس کا طاقتور پرہیں بھی وجود میں آگیا تھا۔ مگر اتحادیوں کی فتح نے اس تحریک کو ٹھنڈا کر دیا۔ تحریک ختم ہو گئی مگر اس کی اسپرٹ ابھی باقی ہے۔ اس اسپرٹ نے حال میں نیا روپ اختیار کر لیا ہے اور فلسطین کا مسئلہ اس کا بنیادی پتھر ہے۔

”اخوت اسلامی“ ۱۹۶۸ء سے قائم ہے۔ ایک لاکھ ممبر ہیں جس میں دس ہزار مجاہدوں کی فوج ہے اس جماعت کو غیر ملکیوں سے سخت مخالفت ہے اور مذہبی قدامت پرستی اس کا نصب العین ہے۔ اگر وہ یوٹوشوک کا دشمن ہے تو اسی کے ساتھ جمہوریت کا بھی ہے۔ وہ عرب ملکوں کا اتحاد چاہتی ہے اور مصر کی سیادت چاہتی ہے۔

الحاصل یہاں قدامت پرستی اور جدت پسندی کا معرکہ قائم ہے۔ شیپرڈ ہوٹل کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو میں نے دیکھا کہ جنازے پر ایک جامنی رنگ کی چادر پڑی تھی اور سرانے ایک طربوش (ترکی ٹوپی) رکھی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ مرنے والا صاحب اثر و رسوخ تھا۔ میت کے پیچھے سیاہ برقعے ڈانے عورتیں بین و بکا کرتی جا رہی تھیں۔ یہ سب قدامت پرستی کے آثار تھے اور ان کے ساتھ ایک بینڈ باجہ CHOPAN کا FUNERAL MARCH بجاتا جا رہا تھا۔ یہ نئے تمدن کی علامت تھی۔

نواں باب

(مصر، عالم نزع میں)

مصری کسان کا سب سے زیادہ عزیز سرمایہ اس کی بھینس ہے جو دودھ دینے کے ساتھ بل چلانے کا کام بھی دیتی ہے۔ مصر کی رائٹ ایگریکلچرل سوسائٹی نے ایک نمونے کا گاؤں آباد کیا ہے۔ اس گاؤں میں بیس پہلی دفعہ دیکھا کہ بھینس ایک الگ گھرے میں بندھی تھی، ورنہ کاشتکار اس کو اسی گھرے میں باندھتا ہے جس میں خود رہتا ہے، اس لئے کہ وہ اس کو سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہے۔ یہ بھینس شمالی امریکہ کی گائے کے مقابلے میں صرف پانچواں حصہ دودھ دیتی ہے۔ مگر اس کی یہ بھینس ایک اور کام بھی دیتی ہے اور وہ یہ کہ کسان کے بچے اس کے ساتھ کھیل کود لیتے ہیں اور تالاب میں اس کو نہلانے کے وقت خوب خوش ہوتے ہیں۔

مصر میں کسانوں کے تیس لاکھ گنے ہیں مگر بھینسوں کی گنتی صرف پندرہ لاکھ ہے، اس لئے بعض کسان دودھ کے لئے بکری پال لیتے ہیں اور باقی جو زیادہ خرچ نہیں کر سکتے، بغیر دودھ ہی کے جیتے ہیں۔ مصریوں نے ابھی دودھ کی خاطر گائے پالنا نہیں سیکھا اور اس کے دودھ کے فوائد سے واقف نہیں ہیں۔

مولشی کی یہ کمی مصر کا ایک قومی مسئلہ ہے۔ کیونکہ مصریوں کو دودھ نصیب نہیں ہوتا، ڈنمارک میں اگر دودھ کی سپلائی اٹھائیس ہے تو مصر میں صرف ایک ہے۔ مصری کسانوں کی ادنیٰ اور گری ہوئی صحت کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھیں دودھ نصیب نہیں۔

کسان عورتیں اگر اپنے بچوں کو دودھ نہیں دے سکتیں تو انھیں ہر وقت اونٹنی رہنے والی سیاہ چائے پلاتی ہیں۔ اور چائے کی یہ عادت مصری کسانوں میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ اس کے لئے اپنی قمیص بھی گرو کر سکتا ہے۔

پولے دو کھور کے قریب آبادی رکھنے والا مصر، صرف پچیس لاکھ ایکڑ زمین کاشت کرتا ہے۔ اور یہ زمین نیل کی طغیانیوں کے باعث دنیا میں سب سے زیادہ زرخیز زمین ہے۔ دنیا کی کسی قوم کی ہستی کا انحصار دریا پر اتنا نہیں ہے، جتنا مصری قوم کا دریائے نیل پر اور دنیا کا کوئی ملک اپنی زرخیزی کے لئے کسی دریا کا اس قدر ممنون نہیں جتنا مصر نیل کا ہے۔ نیل نہ ہوتا تو دنیا میں قدیم و جدید مصر وجود ہی میں نہ آتا۔

مصری آب و ہوا خشک ہے اور وہاں اوسط بارش بہت کم ہے۔ اس لئے ہر قطعہ زمین آبپاشی چاہتا ہے۔ پچیس فیصدی زمین کی آبپاشی تو نیل کی طغیانی سے پوری ہو جاتی ہے باقی کے لئے نہری آبپاشی کا انتظام ہے۔ یہ نہری آبپاشی محمد علی پاشا (۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۹ء) کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ برطانیہ نے بھی آبپاشی کے ذرائع بڑھانے میں مدد کی ہے اور اسوان کا بند برٹش اسکیم ہی کا نتیجہ ہے۔ نیل کی طرح دوسری نعمت مصریوں کے لئے سورج ہے۔ مسلسل دس گھنٹے کی دھوپ مصر کی زمین کے لئے ایک نعمت ہے۔ پانی کی افراط اور دھوپ دونوں ملکر مصر کو قحط سالی سے بچاتے رہتے ہیں۔ یہاں کی زمین ہر قسم کی کاشت کے لئے مناسب ہے۔ روٹی تو مصر کا سونا ہے، گو قابل زراعت زمین کے صرف پانچویں حصے میں کپاس بوئی جاتی ہے، لیکن برآمد میں روٹی کا اوسط اسی فیصدی رہتا ہے۔ کیونکہ وہاں کی روٹی دُنیا بھر کی روٹی سے بہتر سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کی ترکاریاں، پھل اور غلہ بھی بہتر ہوتا ہے لیکن اسکے باوجود مصری کسان بھوکا، تنگا اور بیمار رہتا ہے۔

مصر میں میں نے پر شوکت اہرام بھی دیکھے، عظمت آفریں ابوالہول کو بھی دیکھا۔ عجائب خانے میں اعلیٰ صناعی کے نمونے بھی دیکھے، اور ہر منظر نے میرے اندر حیرت و استعجاب کی لہر دوڑا دی، لیکن جب میں نے مصر کے گاؤں دیکھے تو قدیم و جدید مصر کی عظمتیں میرے ذہن و خیال سے محو ہو گئیں۔ مصری کسان کچے مکان میں رہتا ہے جو بد وضع بھی ہوتا ہے۔ در نہ مٹی گارے کے مکان بھی خوبصورت اور آرام دہ بنائے جاسکتے ہیں۔ الیکٹرک چرل سوسائٹی نے نمونے کے گاؤں میں نہایت خوبصورت اور آرام دہ مکان بنوائے ہیں، جو گرمی میں سرد اور سردی میں گرم رہتے ہیں۔ مولشی بانڈھے کا اسٹبل رہنے کے کمرے سے الگ بنایا ہے۔ قبل جنگ اس مکان کی لاگت سو امریکن ڈالروں کے برابر تھی اور مصری کسان کے لئے یہ رقم بہت بڑی رقم تھی۔ لڑائی کے بعد کی گرائی میں تو اس کے لئے یہ مکان نہ کرنا ناممکن سا ہے۔ جو مکان وہ بناتا ہے بہت سستے میں بن جاتا ہے۔ مٹی مفت اور سرکڈے وغیرہ بھی نہایت ارزاں، اور یہی وجہ ہے اس کی تعمیر کا مسالا ہیں۔ مکان نہایت بدبودار ہوتا ہے کھیتوں کی انتہا نہیں۔ موسم البتہ مصری کسان کا دوست ہے اور وہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ کھیلے میاں

کرتا ہے۔

مصر کے دیہاتی پینے کا پانی تالابوں سے حاصل کرتے ہیں جن میں بچے اور مویشی نہاتے بھی ہیں۔ پانی کے گھونگے ایک خاص بیماری کا ذریعہ بنتے ہیں۔ دیہاتی لوگ جو تہ پینے والے کو دو لہند سمجھتے ہیں مرد اور بچوں کو کپڑا بہت کم نصیب ہے۔ البتہ عورت کا لباس غنیمت ہوتا ہے۔ دیہاتی عورت پر وہ نہیں کرتی لیکن اس کی عصمت و پاکبازی کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔

دنیا میں دیہات کے لوگ اس قدر مریض و بیمار کہیں کے نہ ہوں گے جتنے مصر کے ہیں۔ آنکھوں کی بیماری بہت عام ہے اسی لئے وہاں اندھوں کا اوسط سب ملکوں سے زیادہ ہے۔ طبریا اور گھونگے سے پیدا ہونے والی بیماری جس کا نام ”نہار زیا“ پڑ گیا ہے عام ہے۔ ستر، اسی فیصدی کسان اس بیماری اور داد کے مریض ہیں۔

مصر کے دیہاتی بچے اتنے ہی چونچال اور کھلندڑے ہیں جتنے کسی دوسرے ملک کے ہو سکتے ہیں۔ گھر میں نے دیکھا ہے کہ سرخ و مریض آنکھیں اور سو بے چہرے پر مکھیاں کھیل کے وقت بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ مصری کسان کا افلاس و جہالت اس حد تک ہے کہ وہ ارزا ترین دوائیں بھی خرید کر اپنے بچوں کی آنکھیں نہیں دھو سکتا۔

الغرض دنیا بھر کے ملکوں سے بہتر آب و ہوا کا مالک اور دنیا بھر میں سب سے زیادہ زرخیز زمین کا مالک ہوتے ہوئے بھی، مصر میں افلاس کی انتہا نہیں ہے۔

ایک مصری ماہر زراعت کے ساتھ مجھے ایک مرتبہ قاہرہ سے ذرا دور ایک گاؤں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بازار میں وہ کسی شناسا سے بات کرنے لگا اور میں ایک صحن میں داخل ہو گیا۔ فوراً میں نے اپنے دوست کو پکارتے سنا کہ ”واپس آ جاؤ!“ پھر اس نے معذرت کے لہجے میں مجھے بتایا کہ اس طرح کسی مکان میں داخل ہو جانا خطرے سے خالی نہیں۔ میں نے کہا کہ دن دباڑے اور آدمیوں کی موجودگی میں میرے داخل ہونے پر کوئی شک شبہ کیسے کر سکتا ہے تو اس نے بتایا کہ مصری لوگ جلدی شک کر لیتے ہیں اور جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔ پھر اس نے بتایا کہ مصر میں قتل کی وارداتیں دیہات ہی میں زیادہ ہوتی ہیں اور اس کی وجہ پیشتر یہی بدگمانی ہوتی ہے۔

مصر میں تعدد از دواج برائے نام ہے مگر شک کی بنا پر طلاق کی کثرت ہے یہ بھی مصریوں کی برصیہوں میں سے ایک برصیہی ہے۔

مصر کے لوگ کافی تغذیہ نہ ہونے کے باعث کمزور ہیں اور چونکہ اپنی قوت مردمی کے بارے میں

نہایت ذکی الحس بھی اس لئے حشیش کا استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔

اپنی ان کمزوریوں کے باوجود، دنیا بھر کے کسانوں کی طرح، مصری کسان میں خوبیاں بھی ہیں۔ وہ عام مصریوں کی طرح غیر ملکیوں کو ناپسند کرتا ہے، وہ ایرانی کسان کی طرح زود آہیز بھی نہیں لیکن آپ سے تھوڑی شنا سائی بھی ہو تو اس کی کم گوئی ختم ہو جاتی ہے اور وہ کھل کر باتیں کرتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے حالات کے متعلق سوالات کرتا ہے۔

مسلمہ طور پر مصر کے لوگ جلدی مشتعل ہو جانے والے ہیں لیکن مصری کسان اجنبیوں کے سامنے بردبار اور خلیق ثابت ہوتا ہے۔ وہ دوسرے فلاح کے کھیتی باڑی کے کام میں بوقت ضرورت عملی مدد دینے کو ہر وقت آمادہ رہتا ہے۔ وہ اپنے بچوں سے محبت کرتا اور انہیں شفقت سے رکھتا ہے۔ طلاق کا رواج عام ہے مگر بیوی سے اُلفت کرتا اور اس کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔ اسے فطرت سے بھی محبت ہے اپنی زمین سے بھی وابستہ ہے اور اس کی سب سے بڑی خواہش ایک قطعہ زمین کا مالک بننا ہے؟ وہ محنت کرتا اور بار بار داری کے مولشی کی طرح ہر وقت جُتا رہتا ہے۔ اس کی زندگی میں مسرت برائے نام اور امید مفقود ہے۔ دودھ، گوشت، انڈا، مچھلی وغیرہ اس کی غذا کا جزو نہیں۔ ہر وقت اونٹنی رہنے والی چائے اس کی سب سے بڑی عشرت ہے۔ چائے میں کبھی شکر ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ مٹی کا تیل، صابن اور کپڑا بس اسی حد تک خرید سکتا ہے۔ جتنی اس کی قلیل آمدنی، چائے اور شکر کے صرف کے بعد اجازت دیتی ہے۔ وہ درحقیقت بے والی وارث ہے، وہ محض فطرت کے رحم پر مبتلا ہے۔ صرف ایک سورج ہے جو اس کا دوست ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصری فلاح مصر کی شان و عظمت ہے اور اسی کی قوت بازو سے مصر کی خوشحالی قائم ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ مصر کی ٹرسٹڈ بھی ہے۔ شاہ مصر نے، سماجی بہبود کے لئے تعلیم یافتہ جماعت اور سیاسی لیڈروں نے جہالت، افلاس اور بیماریوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا۔ یہ نعروں نے ہر جگہ سنا اور یہ بھی دیکھا کہ بعض زمیندار کچھ رفاہی کام کر رہے ہیں، مگر یہ کام قوقوی عمل اور قومی ارادے ہی سے انجام پاسکتا ہے، جو یہاں مفقود ہے۔

مصر کے افلاس کی بنیاد اس کی کثرت آبادی بتائی گئی ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ دنیا کے کثیر آبادی رکھنے والے ملکوں میں ایک مصر بھی ہے۔ مصر کا علاقہ ویسے تو زمین لاکھ چھپاسی ہزار میل مربع ہے، لیکن قابل زراعت زمین صرف ساڑھے تین فیصدی ہے۔ باقی سب صحرا ہے۔ چھ ہزار سال پہلے جس طرح وہ محض نیل کے ذریعہ سے رزق حاصل کرتا تھا اسی طرح آج بھی حاصل

کر رہا ہے۔ ملک کی انسانی فوسو ساتھ میل ہے اور ساری آبادی اس کے کنارے چر ہے۔ اس علاقہ میں کوئی دوسری عری آکر کرتی بھی نہیں ہے۔ یہ حقیقت کہ صرف پچیس لاکھ ایکڑ زیر کاشت ہے اور دو لاکھ ایکڑ مزید زیر کاشت کافی جاسکتی ہے۔ اس کا گھٹا ہوا ثبوت ہے کہ شکر کی زمین پر اس کی آبادی کا ہزار ہا دست بار ہے۔ جہم بھی کثیر آبادی کا ملک ہے مگر وہاں فی کلو میٹر صرف دو سو چھیانوہ آدمی ہیں اور مصر میں پانچ سو تینتیس۔

اس مشکل کا حل سوڈان کی طرف ہجرت کرنا سمجھا گیا ہے، لیکن خود سوڈان کا مسئلہ ہنوز لانچل ہے اور اس ذیل میں اب تک کوئی کام نہیں ہوا ہے اور نہ ابھی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ افزائش نسل پر کنٹرول، یہاں شاید قابل عمل نہ ہو کیونکہ مصری کسان خیال کرتا ہے کہ جتنے بچے ہوں گے اتنے ہی کام کرنے والے بڑھیں گے۔

اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک کنبہ چار ایکڑ زمین پر بخوبی کاشت کر سکتا ہے۔ اس نے اس حساب سے آدھے مصری کسان کے اور خالتو بوجاتے ہیں۔ اس خالتو آبادی کو وہ عراق منتقل کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ مگر اس کام کے لئے بھی پہلے بیت کچہ کر لینا ہے۔

اس کے علاوہ متصرفین صنعت بڑھانے کی تجویز بھی سوچی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے لئے پہلی خام پیداوار کی کمی ہے۔ اس سے قطع نظر صنعتی پیداوار کے لئے منڈی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ صنعت کی سب سے پہلی منڈی خود اپنا ملک ہوتا ہے، مگر متصرفین اب میں بھی قسمت ہے کہ ان کے کسانوں کے پاس یہ نہیں ہے۔ قانون آراضی کی اصلاح ہو تو کسان کی آمدنی بڑھے اور اس کا متصرفین چرچا بھی نہیں ہے۔

عقائد و شکستہ خیالات نہ کہ حق کے سوا کچھ۔
 انسانوں کے لئے یہ ہے کہ حق کے سوا کچھ نہ مانیں کہ کائنات کے ہر شے میں صرف حق ہی ہے۔ ان کے لئے
 ان کے لئے یہ ہے کہ حق کے سوا کچھ نہ مانیں کہ کائنات کے ہر شے میں صرف حق ہی ہے۔ ان کے لئے
 حق ہی ہے۔ ان کے لئے یہ ہے کہ حق کے سوا کچھ نہ مانیں کہ کائنات کے ہر شے میں صرف حق ہی ہے۔ ان کے لئے
 حق ہی ہے۔ ان کے لئے یہ ہے کہ حق کے سوا کچھ نہ مانیں کہ کائنات کے ہر شے میں صرف حق ہی ہے۔ ان کے لئے

1. General
 2. Specific
 3. Particular
 4. Detail
 5. Example
 6. Illustration
 7. Case
 8. Story
 9. Anecdote
 10. Parable
 11. Fable
 12. Legend
 13. Myth
 14. History
 15. Biography
 16. Autobiography
 17. Journal
 18. Diary
 19. Letter
 20. Speech
 21. Essay
 22. Article
 23. Book
 24. Scripture
 25. Law
 26. Contract
 27. Agreement
 28. Treaty
 29. Decree
 30. Edict
 31. Order
 32. Command
 33. Instruction
 34. Rule
 35. Regulation
 36. Law
 37. Statute
 38. Code
 39. Canon
 40. Canon
 41. Canon
 42. Canon
 43. Canon
 44. Canon
 45. Canon
 46. Canon
 47. Canon
 48. Canon
 49. Canon
 50. Canon

دسواں باب

(زرعی اصلاحات یا تباہی)

میں جنگ کے دنوں میں بالائے نیل، لکس میں تھا، تو ایک قبلی ڈاکٹر نے مجھے ایک بہت بڑے پاشا زمیندار سے ملایا جو تہذیبی آپ و ہوا کے لئے ونٹر پیلنس ہوٹل میں مقیم تھا۔ پاشا کی سرخ طربوش اور اس کا ہلتا ہوا سیاہ ریشمی بھندنا بڑا مرحوب کن تھا۔ ٹائی پن کا چمکیلا مہیرا اور اس سے بڑا انگوٹھی کا دھمتا ہوا مہیرا اسکی دولت مندی کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس کا بہترین انگریزی لباس اور صحیح انگریزی اور فرانسیسی گفتگو اس کی تہذیب و تعلیم کا ثبوت تھے۔ وہ بے انتہا متواضع اور حد درجہ شایستگی و سنجیدہ تھا۔

اس پاشا نے انگلستان اور فرانس میں تعلیم پائی تھی اور امریکہ کی سیاحت کر چکا تھا۔ اپنی سیاحت کے اذکار بڑے جوش و انہماک کے ساتھ سناتا رہا، ایک پر جوش وطن پرست کی طرح مصریوں کی حالتِ دار کا ذمہ دار وہ برٹش حکومت کو سمجھتا تھا، جو مصر کے اقتصاد، کلچر اور جینیٹس کا گلا گھونٹتے رہے ہیں، اس نے کہا کہ اگر انگریز، مصر و سوڈان سے چلے جائیں تو مصر اپنی پہچان، شان و عظمت کو بھر سے ذبح کر سکتا ہے۔

یہ باتیں میں نے مصر میں ہر ایک کی زبان سے سنی تھیں۔ اس لئے میں نے اس سے ایک سیدھا سا سوال کیا، ”کیا انگریزوں نے مصریوں کو زرعی اصلاحات سے روکا ہے؟“ اس نے تسلی کی باتیں کرنا شروع کیں، ”تو پھر میں نے دوسرا سوال کیا۔“ ”پھر قانون آراضی میں اصلاحات کیوں نہیں ہوئی؟“ اس نے کہا ”میں اس لئے بے طاقنے والا جواب دیا کہ: ”یہ بیند قسم کی سیاست ہے!“ میں نے اسے قوی دلائل دیے۔ ”کیا برطانوی مقلد و فراست، برطانوی سراپا، برطانوی رہنمائی نے مصر کو اور خاص پاشا کو غیر سہ دولت مند نہیں بنا دیا ہے؟“ تو اس نے جواب دیا کہ۔ ”برطانیہ نے ان باتوں کا کوئی سادہ و سہل بھی بالیا ہے۔“

حقیقت امر یہ ہے کہ برٹش مداخلت کے خلاف ایچی ٹیشن کرنے سے سرکاروں کو صدمہ پہنچنے کی

اور اسرائیل کے غلام ہنگ شروع کر دینے سے مصر میں کاہنہ قوم بدستی پہنچ گیا وہ آج بھاری لیا ہے۔ اس سے اصل مقصد پورا ہوا ہوا نہ اٹھا ہو، مگر مصری قوم اپنی مصیبتوں کو ضرور سمجھ گئی ہے۔ نہر سوئز کے کنارے کے غلاوہ انگریزوں نے مقرر فرما کر دیا ہے مگر مصری کسان کو کوئی سہولت نہیں مل پائی ہے، اس کی مفلسی اتنی ہی شدید ہے، اس کی بیماریاں وہی ہیں اور مقرر کا تعلیم یافتہ طبقہ اسی طرح بے روزگار ہے۔ جب ام ہوئی سے نکل رہے تھے تو میرے ڈاکٹر دوست نے بتایا کہ حال ہی میں تیسری کی دہانے ایک لاکھ جائیں تلف کی ہیں۔ اس بیماری کے پتھر ہوائی جہازوں کے ذریعہ مغربی افریقہ پہنچے اور مصریوں میں تباہی مچا دیتا تھا اس لئے وہاں ہی طرح پھیل گئی۔

میں اس ڈاکٹر کے مصرعوں کے غلغلے اور مرض رہنے پر بات چیت کرتا رہا مگر میں نے دیکھا کہ وہ کل کر اقامت ہار چکا ہے۔ میں نے اس کو کہہ دیا کہ وہ ذہنیاً عیسائی تھا۔ میرے اس کہنے پر کہ آخر ہے تو وہ بھی مصری اس نے شد و مد کے ساتھ کہا کہ وہ ”بے میل مصری ہے!“ سچ اس نے بتایا کہ:-

”اس پاشا کی طرح کے لوگوں نے مقرر کی ترقی روک رکھی ہے۔ اس کے پاس دولت ہے اور

جس طرح آپ نے دیکھا، عیشت و عشرت میں پڑے ہیں۔

اس قبلی ڈاکٹر کے خیالات و احساسات بھی وہی تھے جو بے شمار دوسرے مسلمان مصریوں میں پائے جاتے ہیں۔ ترقی پسند خیالات رکھنے والے مصری بخوبی سمجھتے ہیں کہ صرف قوم پرستی کا نشانہ سماجی اصلاح نہیں کر سکتا اور سمجھتے ہیں کہ مصر کی اقتصادی تباہ حالی میں ان پاشاؤں کی پیش پرستی کو بڑا دخل ہے۔ زیادہ مدت قائم نہیں رہ سکتی۔

وہ مصری جنہیں زراعت کی تعلیم ملی ہے بخوبی جانتے کہ مصر اپنی روئی کی پیداوار پر انحصار کر کے بیٹھا رہے۔ حالات زمانہ بدل رہے ہیں اور ایک دن آئے گا کہ مصری روئی بہت اعلیٰ ہونے کے باوجود دنیا کے کسی ملک میں نہیں بکے گی۔ جس طرح روس اور برازیل وغیرہ نے اپنی زرعی پیداوار کا رائج بدل دیا ہے، ترک جانتے ہیں کہ مصر بھی ایسا ہی کرے۔

ایک امریکہ ماہر نے مصر کی کاشت کو مطالعہ کرنے کے بعد کہا ہے کہ:-

تحریر: مولانا محمد رفیع الرحمن

میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ لیکن میں ایک قانون آؤں گی۔

25. 10. 1944

مجلس شورای عالی قضاة و اوقاف و امور خیریه

ہیں جائے گا۔ لیکن اس غریب کو تو یہ ماریوں نے معذور بنا رکھا ہے۔

مصر کے زرعی سائنسدان اپنے ملک کی بہبود کے لئے بہت کچھ اور بھی سوچ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ڈیری فارم، شہد اور مرغی خانے وغیرہ کی انڈسٹری کو درہات میں بڑھا کر مصری فلاح کے افلاس کو کم کر دے گا اور اس کی غذا بھی بہتر ہو جائے گی۔

مصر میں ہر دس بارہ آدمیوں کے پیچھے ایک دودھ کا جانور ہے، امریکہ میں ہر پانچ آدمیوں کے لئے ایک۔ لیکن مصری اور امریکن مویشی کے دودھ دینے کی استعداد پر نظر کی جائے تو فرق بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔

مصر نے امریکہ کے مختلف قسم کے انگوروں کی کاشت کی۔ یہ انگور اتنے اچھے تو نہ ہو سکے لیکن یورپ میں ان کی مانگ ہو گئی۔ اسی طرح کھجور، انجیر اور کیلے کی پیداوار بڑھائی جاسکتی ہے۔ پھلوں کے علاوہ پھولوں خاص کر گلاب کے پھولوں کی کاشت کر کے برآمد کی جاسکتی ہے۔

مصر کے تمام روشن خیال لوگ متفق الخیال ہیں کہ قانون آزادی کی اصلاح لازمی و لا بدی ہے۔ حکومت مصر نے ایک وزارت سماجی بہبود کے کاموں کے لئے قائم کر رکھی ہے۔ اس وزارت کا ایک محکمہ فلاح کے بہبود کے لئے قائم کیا ہے۔ اس کا انچارج ڈاکٹر احمد حسین ہے۔ میں نے اس کی بہت تعریفیں سنیں تو اس سے ملا بھی۔ اور ان تعریفوں میں کوئی مبالغہ نہ پایا۔ ڈاکٹر حسین اپنا سارا وقت اور ساری قوت دیہاتی زندگی اور دیہاتی مسائل کے سمجھنے میں صرف کرتا ہے، اور بلاشبہ ان مسائل پر عبور رکھنے والا دوسرا آدمی مصر میں نہیں ہے۔ پورے قاہرہ میں وہ سب سے زیادہ مصروف آدمی ہے وہ محل کے گفتگو کرتا ہے اور جتنی صاف گوئی سے بات کرتا ہے اتنا ہی صاف سوچتا بھی ہے، اور پھر اسی شدت سے اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ حسین سخت قسم کا حقیقت پرست انسان ہے، اور یہی نہیں کہ وہ صرف دیہی مسائل کو سمجھتا ہے بلکہ مصری تعلیم یافتہ طبقے کے محسوسات و خیالات کو بھی اچھی طرح جانتا ہے اس کی نظر کسان کی مصیبت اور تعلیم یافتہ مصریوں کی بغاوت، دلوں پر ہے اور ان دونوں کا باہمی تعلق اس کے پیش نظر ہے۔ گفتگو کرتے ہوئے بولا:-

”ہم اپنی قوم کو اقتصادی بے بسی اور امراض میں مبتلا رکھنا چاہیں بھی تو نہیں رکھ سکتے۔ بلاشبہ مصر کو یورپ کا کیلیفورنیا بنانا چاہئے۔ اس کی ہمیں اشد ضرورت ہے کیونکہ اس سے مصری عوام کی خیریت دور ہوگی۔ لیکن اس کام کے لئے دو اصلاحیں لازمی ہیں: ایک کاشتکاری کے طریقوں میں اور دوسری آزادی کی حالت کے قانونی میں۔ دولاکہ ایکٹر پر روٹی کی کاشت کے بدلے باغ لگائے جائیں اور کھجور کی کاشت کی جائے تو ایک

دیہاتی بہرہ ور گاروں کو روزگار مل سکتا ہے۔ لیکن زمیندار پاشاؤں کو اس پر آمادہ کرنا اور چرانے طریقے کو جوڑنا مشکل کام ہے تاہم اگر مصریوں کی جھوک اور بیادسی دور کرتا ہے تو مخالفت کی پروا نہ کر کے قانون آراضی میں تبدیلیاں کرنا لازم ہے۔ میں لاکھ ایکڑ نئی زمین کو قابل کاشت بناتا ہے۔ یہ آراضی صرف اپنے کاشتکاروں کو دیکھائے گی جن کے پاس اپنی زمین نہیں ہے، اور کسی کو سو ایکڑ سے زیادہ زمین کی ملکیت کا حق نہ ہوگا۔ ترقی پزیر زمین رکھنا غیر بخش ہوگا اور وہ از خود حکومت کے ہاتھ بچ ڈالے گا۔ سو ایکڑ زمین کی آمدنی سے یہ لوگ غار اہل کی زندگی گزار سکیں گے۔ فائز زمین کی حقیقت ان کو حکومت سے ملے گی وہ خاص کر گھریلو انٹرنیٹری میں لگے گی جہاں ملکی ضرورت کا سامان طیار ہوگا۔ کسان جب اپنی آراضی کا خود مالک ہوگا تو اس کی آمدنی میں اضافہ اور زندگی کا معیار اونچا ہوگا، اور وہ گھریلو دستکاریوں کی پیداوار خرید کر استعمال کر سکے گا۔ چونکہ مصری کسان کو اپنی آراضی سے عشق ہے اور اس کی زندگی و مسرت آراضی ہی سے وابستہ ہے، اس لئے پیداوار میں ترقی لازمی ہوگی۔ بلاشبہ اسے آراضی کو بہتر بنانے کی تعلیم دیکھائے گی، یہ محکمہ اسی کام کے لئے قائم ہے۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ غریب کسان بہتر زندگی کا سخت آرزو مند ہے، اس لئے وہ ہماری تعلیم کو لازماً قبول کرے گا۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ ان اصلاحات کو قانون کی صورت دینے کے بعد بھی کثرت آبادی کا مسئلہ باقی رہے گا، اس نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے! لیکن ہم ہر کام ایک ساتھ شروع نہیں کر سکتے۔ میں ڈکٹیٹری کا قائل نہیں اور تدریجی ارتقا کو ماننا ہوں۔ ہمارے فوجوان انقلاب لانے کے لئے بے چین ہیں مگر میں تدریجی ترقی کو مناسب سمجھتا ہوں۔ بگے ہماری تعلیمی ترقی کی اسلیم فلائین کے اخلاقی اصلاحات میں ہماری مدد کرے گی۔ ہم نے اس کی ابتدا کر دی ہے۔ اسکولوں میں پانچ لاکھ بچوں کو دن کا کھانا مفت دیا جاتا ہے۔ دیہات میں کلب اور سوشل سینٹر کھولے جا رہے ہیں۔ گھریلو دستکاریاں پھیلائی جا رہی ہیں۔ سولہ ہزار کوآپریٹو سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں۔ اس طرح ہم دیہات میں سماجی زندگی پیدا کر رہے ہیں اور کرتے جائیں گے۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ: ”نرمی اصلاحات کے قانون کا مسودہ طیار ہو چکا ہے اور وزارت نے اسے منظور بھی کر لیا ہے۔ اصلاحات کی مخالفت کا زور بھی کم ہو رہا ہے۔ اب ہمارے پروگرام کو ”پروٹکٹوم“ نہیں کہا جاتا۔ آخر میں ڈاکٹر حسین نے کہا کہ ”زمیندار یا تو سو ایکڑ زمین کی آمدنی پر قناعت کریں گے یا پھر چند روز اور پیش سنائیں اور اس کے بعد اپنا سر تقیم کر لیں۔“

ڈاکٹر حسین کے اصلاحات میں نے مصر میں اس سے پہلے کسی کی زبان سے نہیں سنے تھے۔

گیارھواں باب

(نیا امتحان)

توریت میں آیا ہے کہ ابراہیمؑ کو خدا نے ترک وطن کی ہدایت کی اور وہ اپنے خاندان کو لیکر عراق سے نکل کر نئی جہاں میں تلاش کریں۔ اس سے ابراہیمؑ کے شیخ قبیلہ ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ توریت کا حوالہ اس زمانہ کے انسان کے لئے قصہ کہانی کا درجہ رکھتا ہے، مگر ۱۹۵۷ء کی دریافت نے ثابت کر دیا ہے کہ قدیم عراق کا مرکز شہر آرتھا جو ایک شاندار تمدن کا حامل تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کا وطن یہی شہر آرتھا، اسوقت کا عراق کلدانی قوم کا گہوارہ تھا اور اس قوم کے کلچر کی کارنامے ہزاروں سال سے اسی سرزمین میں مرفوع تھے جن کو اب کھود کر نکالا جا رہا ہے۔

تین ہزار سال پہلے شہر آرتھا خلیج فارس پر ایک بندرگاہ تھا، مگر آج اس شہر کی زمین ساحل سے کوئی ڈیڑھ سو میل دور جا پڑی ہے۔ سمندر پیچھے ہٹتا رہا ہے۔ والٹر لوڈر ملک نے نتیجہ نکالا ہے کہ پچھلے سات ہزار برس کے اندر سرزمین عراق پر گیارہ مختلف تمدن وجود میں آئے اور فنا ہو گئے۔ ان مختلف تہذیبوں نے آج فنا کی گود میں سو رہی ہیں نوع انسان کی تاریخ کو بعض حرکت میں لانے والے واقعات سے ستھارا اور اس امٹ کارناموں سے قوی بنایا ہے۔

راویوں کی زبان میں دو آئیہ دجلہ و فرات کی حادی انسانی تمدنوں کا گہوارہ ہے، اسی علاقے میں طوفانِ نوع برپا ہوا اور مذہبی عبادت گاہیں قائم کرنے کا خیال سب سے پہلے اسی سرزمین پر پیدا ہوا۔ ایک امریکن مورخ نے جماعتی عبادت گاہ بنانے کا سہرا یہودیوں کے سر باندھا ہے جن کو شاہ بابل بکت نصر قبیعی بنا کر اپنے پایۂ تخت بابل میں لایا تھا۔ قدیم بابل اور آج کا عراق ایک ہی چیز ہیں۔ بابل کے اس سینا گاہ (یہودیوں کی مسجد) نے یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں جماعتی عبادت کی تھیادہائی۔

الف لیلہ کا بغداد، عراق کا مرکز ہے جہاں مسلمانوں نے ایک عظیم الشان اور نہایت طاقتور مملکت قائم کی تھی۔ عباسی خلافت کا مرکز و مستقر بغداد تھا جہاں معروف عام اور مقبول شہنشاہ ہارون رشید حکومت کرتا تھا۔ جس کی طاقت کا جواب اسوقت کی دنیا میں نہ تھا۔

اس وقت کے عراق میں جیسی کاشت ہوتی تھی اس کی زرخیزی کی مثال یورپ اور ایشیا میں کہیں نہ ملتی تھی۔ کہاوت کے طور پر آتا ہے کہ زمین کو یہ دینے سے فصل مسکرنے لگتی تھی۔ ہیروڈوٹس نے اس ملک کی زرخیزی کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ ہیروڈوٹس کے علاوہ اس ملک کی زرخیزی کی شہادتیں دوسرے ذریعوں سے بھی ملتی ہیں، اور تصدیق ہو گئی ہے کہ پورے زمانے کا عراق "نہروں سے چمکتا اور غلے کے انہاروں سے معمور رہتا تھا" آج کے مقابلہ میں قدیم عراق کی پیداوار تین گنی زیادہ تھی۔

خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں شہر بغداد کی آبادی بیس لاکھ تھی، اور خوشحالی اور کلچری ترقی میں دنیا کا کوئی پایہ تخت بغداد کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ سراسر کس سا کس بغداد کا حال سناتے ہوئے لکھتا ہے کہ۔

"شہنشاہی دربار شالیتہ، شاندار اور بے حد متعلیٰ تھا چاروں طرف شہر آباد تھا اور بیچ میں قلعہ تھا جہاں سے نظم و نسق کے احکام ہر وقت جاری ہوتے رہتے تھے۔ ہر چیز کا حکم جودھا اور دفتروں کی باقاعدگی اسوقت کی دنیا میں بے مثال تھی۔ شہر بغداد سب سے بڑی تجارتی منڈی تھا۔ تعلیم کا ہوں کا شمار مشکل تھا۔ جہاں دنیا بھر کے طلبہ، فلسفی، علماء اور شاعر آتے اور کسب علم کرتے تھے۔ دار الخلافہ کی طرح صوبائی مستقروں میں بھی عایشیائیں سرکاری عمارتیں تھیں۔ پوری مملکت میں ڈاک کا انتظام مکمل تھا۔ فوج و قادار، بہادر اور قاعدہ کی پابند تھی۔ گورنر اور وزراء و متدین اہل بردار ہوتے تھے۔ عباسی مملکت عقلمندی سے مدبرانہ طور پر سر سے وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس وسیع مملکت میں نظم و نسق یکساں طور پر مضبوط تھا۔ سرکاری عہدوں پر عیسائی، یہودی، مسلم اور سنی دیں سبھی فائز ہوتے تھے۔ اس حکومت کے زمانہ میں جودے پیغمبر باطنی پریشانی اور فاضل عمال کیسر موقوف ہو گئے تھے بکارت کی وسعت اور دولت کے فراوانی نے تھوڑے عرصہ میں سے نکال دیا تھا۔ دیار اور اراضی کی ملک عوام کے لئے سرکاری اسپتال اور شاہی مسلک تھے۔"

عباسی خلافت کے دور میں علم و فن اور فلسفہ و غریب اگر کہیں پہلا سہولت و توجہ مسلمانوں کی حکمرانی کے بعد باقی دنیا میں ان چیزوں کا وجود نہ تھا۔ لیکن یہی دلیل لکھتا ہے کہ "سامانی طریقوں کو اپنانے اور استعمال کرنے میں یہ آسان کہ اگر آپ کا دوسرا حاصل تھا تو عربوں کو مٹھ بولا آپ اپنے چاہئے

جدید زمانے کو علم کی روشنی لاٹھیلی ذریعے سے نہیں، عربوں کے قوسل سے ملی ہے۔ عربوں نے دوسرے کچھوں کو خاص کر یونانی اور یونانی کچھوں کو اپنی چیز بنایا تھا۔ عربوں سے خوابیدہ عرب دماغ کو اسلامی تعلیمات سے ہمیز ملی اور عرب بیدار و تجسس ہو کر دنیا میں بکے کیا وہ تخلیقی دماغ ثابت ہوا۔ عرب اہرین ریاضی کے ہم کو صفر اور الجبرا دیا، علم مثلث میں قابل قدر اضافے کئے، علم ہیئت کو نہایت بلند کر دیا اور زبردست طبیب اور سرجن پیدا کئے، صدیاں گزر جانے کے بعد ان کا علم خواص الادویہ آج بھی ناقص نہیں کہا جاسکتا۔ عربوں نے چینیوں سے کاغذ بنانا سیکھ کر علم و ادب کی زبردست اشاعت کی اور یورپ کے لوگوں کو کاغذ بنانا سکھا کر موجودہ ترقی کی خاطر اس وقت جس وقت یورپ کے لوگ جہالت کی تاریکی اور بد نظمی کے گڑھے میں پڑے تھے، عرب لوگ اس وقت ساری دنیا کی ذہنی رہنمائی کا منصب ادا کر رہے تھے اور چار سو برس تک کرتے رہے۔

بعد ازاں ذکر جاتے ہوئے ہوائی جہاز میں میرے ساتھ ایک عراقی ماہر تعلیم بھی تھا۔ اس نے کہا کہ۔

”یورپ کا (نشاة اثنیہ) مسلمان عربوں نے شروع کیا۔ افلاطون، ارسطو اور اقلیدس

ہم نے یورپ کو دئے، ہمیں نے ان کو ریاضی، طب، ہیئت اور دوسرے علم کھل کر دئے

اور یورپ کو ایک تمدن پر اعظم بنادیا“

یہ عراقی بھی وہی کہہ رہا تھا جس کا یورپ کے تاریخ نویسوں نے اعتراف کیا ہے، البتہ اس کے بیان میں زور زیادہ تھا، بلاشبہ یورپ عرب کچھ کا مرجع منہ ہے۔ میری اسلامی ملکوں کی سیاحت میں میں نے عراقیوں کو اس بات کو بار بار دہراتے سنا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ عرب شہنشاہی کے کارناموں کو دہرا کر پُرانی عظمت و شان کو دوبارہ حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہے ہوں۔ عراقیوں کو ایسے خوابوں کی صحیح اور حسب مراد تعبیر دینے کی مخالفت نہ تو علم الحیات کرتا ہے اور تاریخی دلائل سے ہوتی ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہوگی کہ عرب دنیا عہد نبوی کی طرح ایک بار پھر حرکت میں آجائے اور اسی طرح مستحکم بھی ہو جائے! عرب قوم نے جس اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں اور قوتوں کا ثبوت اُس زمانے میں عطا وہ صلاحیتیں اور قوتیں عرب دماغ میں آج بھی چھپی ہوئی ہیں۔ آج عرب دنیا سوئی ہوئی ہے اسے کسی محمد کی ضرورت ہے جو اسے نیا ابہام دیکر حرکت میں لے آئے!

اسلام نے ذہن انسانی کو کس قدر آگے بڑھا دیا اس کا اندازہ اصفیاء اور کاشغریہ میں مساجد و مقابر، باغات و محلات کے فن تعمیر سے ہو سکتا ہے۔

ہلاکو کے حملے نے بغداد کو تباہ کیا، ترکی حکومت نے قدیم نظام ایشیائی کو برباد کر دیا اور

عراق کی قدیم شان و عظمت آج زیر زمین مدفون ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کے بعض علمی ادارے اس شان و عظمت کے نشان و علامات زمین سے نکال کر اس کے کارنامے پیش کر رہے ہیں کہ عراقی کیا کچھ رہ چکا ہے۔ ۱۹۱۵ء میں برطانوی فوجوں نے عراق کو ترکوں کی حکمرانی سے آزاد کر لیا لیکن آف نیشنز نے اس کی سیادت برٹش کے سپرد کر دی، اس عرصے میں عراقیوں اور برطانیہ سے کئی سخت معرکے ہوئے اور اسلحہ میں انھوں نے اپنے ملک کو آزاد و خود مختار بنالیا۔ عراقیوں کی جنگی اسپرٹ اس حکومت کی بالادستی کو بھی گوارا نہیں کر سکتی، جس نے اسے چار سو برس کی غلامی سے نجات دلائی۔ لیکن آزاد و خود مختار عراق کی ہنوز ایک قوم بننے کے درمیانی منزل سے گزر رہا ہے۔ وسطی مشرق کی تمام مسلم قوموں میں عراق سب سے زیادہ بچپن ہے وہ انتہائی جدوجہد کر رہا ہے کہ قدامت سے باہر نکل آئے وہ قدیم روایات اور جدید علوم کی کشاکش میں مبتلا ہے، اس کا ایک پاؤں پرانی دنیا میں ہے اور دوسرا نئی دنیا میں۔ پہلی کی علامت صحرائی بروہی ہے جو آج بھی زمانہ ابراہیم کی طرح خانہ بدوش ہے اور دوسری فصیح و تیز انگریزی بولنے والا طالب علم ہے۔ آج عراق نہ قدیم ہے نہ جدید۔ ذہنی اور جغرافیائی، دونوں اعتبار سے وہ ایک چیل ہے پتہ کھڑا ہے۔

وسطی مشرق کی تمام قوموں میں عراقی سب سے زیادہ ہذاقی اور بے چین ہو جانے والی قوم ہے اندرون ملک کے معاملات یا بیرونی حالات میں کوئی قوم اتنی سریع العمل نہیں ہے جتنی عراقی قوم ہے۔ پچھلے چھبیس برس میں عراق کی حکومت! دن مرتبہ تبدیل ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں نازی طرفداروں کا جتنا شدید اور کامیاب مظاہرہ اسلحہ میں رشید اگیلانی نے کیا ویسا کسی ملک میں نہیں ہوا۔

حال میں ایک اور بغاوت ہوئی جو برطانیہ اور عراقی حکومت دونوں کے خلاف تھی۔ اسلحہ میں وزیر اعظم صلاح جبر اور اس کی حکومت نے برطانیہ سے ایک معاہدہ کیا۔ بغداد کے لوگوں نے اس معاہدے کی زبردست مخالفت کی۔ قتل و غول بھی ہوا۔ جبر کی حکومت گر بھی گئی مگر عوام کی بے چینی اور باغیانہ اسپرٹ ختم نہیں ہوئی۔ بظاہر سکون ہے مگر یہ بے چینی موجزن ہے۔ ملک کے اندرونی حالات اس لمحے میں اضافہ کرتے رہے ہیں۔ گرانی بے حد بڑھ گئی ہے اور فقر درجے کی ضرورت زندگی کی فراہمی بھی مشکل ہے۔ بغداد کا ہوائی اڈا بہترین اڈوں میں سے ایک ہے جہاں جدید تمدن کا ہر سامان عشرت بہم ہے۔ اس پر عراقی فخر کرتے ہیں لیکن اس سے اس کی تسکین نہیں ہوتی، عراقی مرد اور عورت، بوڑھا اور بچہ، روٹی اور بھجور کے لئے پریشان ہے۔

عراق میں زمینداری نظام نہیں تھا۔ ترکوں کے پنجے سے آزاد ہوتے وقت اگر زمین کو سرکاری ملکیت قرار دیدیا جاتا تو عراقی عوام اس بدحالی میں نہ ہوتے۔ لیکن اس وقت قبیلوں کے شیخ نے قبائلی علاقے کی زمین پر اپنا حق ثابت کیا اور وہ مان بھی لیا گیا۔ اس وقت سے زمینداری کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے اور منجملہ دوسرے اسباب کے خلاصین کی فاقہ کشی کا ایک سبب زمینداری بھی ہے۔ جس طرح سیاسی ناچنگی عراقی حکومتوں کے جلد جلد گر جانے کی وجہ ہے اسی طرح زمینداری نظام فلاح کی اقتصادی بدحالی کا ذمہ دار ہے۔

صدیوں کے جمود و تعطل کے باوجود احیائے ثانی کا جتنا روشن مستقبل عراق کا ہے اتنا کسی اسلامی ملک کا نہیں ہے۔ شرط یہ ہے کہ عراق اس کام کے لئے دل و جان سے مستعد ہو جائے۔ مصر کے لئے ایک دریائے نیل غذا بہم پہنچاتا ہے، عراق کے پاس دو نیل ہیں، دجلہ و فرات، عراق میں تو مصر کی طرح بارش کی کمی ہے اور نہ آبادی کا اتنا دباؤ ہے۔ عراق کی مردم شاری مصر کے مقابلہ میں ایک چوتھائی ہے اور قابل کاشت زمین مصر سے چوگنی ہے۔ اس کے علاوہ عراق کے پاس تیل کے چٹے بھی ہیں۔ عراق کی آب و ہوا گرم ہے لیکن میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ دن بھر کام کرنے کے بعد عراقی مزدور پڑ مردہ و مضمحل نہیں ہو جاتا۔ عراقی مزدور کو سمست اور کاہل سمجھنا غلط ہے اس میں سستی اگر ہے تو نا کافی تغذیہ کا نتیجہ ہے۔ یا پھر دوسری بات یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے مزدوروں کے سامنے کوئی وجہ تحریک نہیں ہے۔

زمانہ قدیم کی طرح عراق کی اہم پیداوار آج بھی غلہ ہے۔ وہ تمباکو اور روئی کی کاشت بھی کر سکتا ہے۔ غلہ کے علاوہ اس کے کھجور ہیں جو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ عراق میں کھجور کے درختوں کی گنتی تین کروڑ ہے۔ ۱۹۳۸ء میں ایک لاکھ چھیالیس ہزار ٹن کھجور برآمد ہوئی تھی۔ ترکی حکمرانی کے مقابلے میں عراقی حکومت نے زراعت میں نمایاں ترقی کی ہے۔ آبپاشی چوگنی ہو گئی ہے کہیں کہیں کاشت میں مشینوں کا استعمال بھی ہونے لگا ہے۔

عراق کو یہ موقعہ حاصل تھا کہ زمینوں کو سرکاری بنائے دوسرے اسلامی ملکوں کے لئے زرعی قانون میں اصلاحات کا دروازہ کھول دیتا، مگر اس نے وہ زمینیں موقعہ کھو دیا اور آج زمیندار بالادست ہے عراق میں کاشت بٹائی پر ہوتی ہے۔ اکثر مالٹوں میں کسان کو تیس فیصدی ورنہ چالیس فیصدی غلہ ملتا ہے۔ اس میں سے اسے نہری ٹیکس وغیرہ بھی دینا پڑتا ہے، نقد کی صورت میں اس کے پاس شمالی علاقے میں چوبیس سے چالیس امریکن ڈالر اور جنوبی علاقے میں اسے ڈیڑھ چار سو پونڈ ملتا ہے۔

عراقی کسان کا افلاس جلی حروف میں لکھا ہے۔ اوسط اموات مصر کی طرح یہاں بھی زیادہ ہے۔ ۱۹۶۰ء فی ہزار تھی۔ بچوں کی موت کا اوسط بھی ڈراؤنا ہے ۱۹۶۰ء میں ۲۲۰ دو سو ستائیس فی ہزار تھا۔ ہر سال سات آٹھ لاکھ انسان لمیر یا کاشکار ہوتے ہیں۔ عراق میں بھی وہی بیماریاں عام ہیں جو مصر میں ہیں۔ بغداد میں اندھوں کی گنتی ساڑھے سات ہزار ہے اور اوسط زندگی چھپیس سال ہے۔

افلاس اور بیماریوں کی اس شدت میں برطانیہ و امریکہ کی مدد بھی کہا کام دیکھتی ہے پینتالیس لاکھ کی مردم شماری میں پینتیس لاکھ غلامین کی تعداد ہے۔ زمین سے نہ فلاح کی محبت ہے نہ زمیندار کو۔ زمیندار چاہے تو فلاح کو ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری زمین پر بھیج دیتا ہے اور فلاح بھی بہتر آراضی پاسکتا ہے تو پرانی کو چھوڑ دیتا ہے۔

عراق سے بہتر جہاں دنیا میں کہیں نہیں ہیں گریویشی کا اوسط عراق میں بہت کم ہے۔ قوت پیداوار کے لحاظ سے عراق سب سے زیادہ دولت مند ملک ہو سکتا ہے مگر سب سے زیادہ مفلس ہے۔ یہ نوزائیدہ قوم شدید قسم کی سیاسی قوم ہے مگر استحکام سے محروم ہے۔ عراق کا تعلیم یافتہ طبقہ آس پاس کے ملکوں میں لبنانیوں کے علاوہ سب سے زیادہ نچمٹے مغز ہے لیکن عراق کا زمیندار سب جگہ کے زمینداروں سے زیادہ ناسمجھ اور ضدی ہے۔

عراقی لوگ عرب بھی ہیں اور مسلم بھی مگر محمد کے یہ الفاظ بھلا چکے ہیں کہ ”میں نے تمہیں زمین دے کر برکت دی ہے! کھاؤ اور پیو اور ضایع مت کرد!“

”شکار“ کے مکمل فائل

از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۵۷ء مکمل فائل بلا جلد قیمت چھ روپے	از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۵۷ء مکمل فائل بلا جلد قیمت سات روپے
از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۵۸ء مکمل فائل بلا جلد قیمت چھ روپے	از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۵۸ء مکمل فائل بلا جلد قیمت سات روپے
از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۵۹ء مکمل فائل بلا جلد قیمت چھ روپے	از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۵۹ء مکمل فائل بلا جلد قیمت سات روپے
از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۶۰ء مکمل فائل بلا جلد قیمت چھ روپے	از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۶۰ء مکمل فائل بلا جلد قیمت سات روپے
از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۶۱ء مکمل فائل بلا جلد قیمت چھ روپے	از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۶۱ء مکمل فائل بلا جلد قیمت سات روپے
از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۶۲ء مکمل فائل بلا جلد قیمت چھ روپے	از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۶۲ء مکمل فائل بلا جلد قیمت سات روپے

موصول ڈاک بذمہ خریدار۔ پتہ: — س — ذ — معرفت شکار۔ لکھنؤ

بارہواں باب

(تلِ عقیق)

فلسطین کے ہوائی اڈے سے ایک امریکن ہوا باز نے مجھے اپنی کار میں شہر پہنچایا۔ راستے میں اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں پہلی دفعہ تلِ عقیق آیا ہوں۔ میرے بتانے پر کہ یہ میری پہلی سیاحت تھی اُس نے کہا:-

”یہ شہر ایسا ہے جہاں امریکن اہمیت محسوس نہیں کرتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ وہ امریکہ ہی میں ہیں۔ اکثر

امریکن چھٹیاں منانے یہیں آتے ہیں۔“

تلِ عقیق کی تعریفیں میں نے اکثر سنی تھیں، اور عقیق کا نظارہ میرے لئے حیرت انگیز نہ ہونا چاہئے تھا، لیکن جب میں شہر کے اندر داخل ہوا تو میری حیرت کی حد نہ تھی۔ دن ڈھل رہا تھا، ہماری موٹر آہستہ خرامی سے کشادہ بازاروں سے گزر رہی تھی، اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں جسمانی و روحانی دونوں اعتبار سے کسی معجزہ شہر میں پہنچا دیا گیا ہوں۔

شہر زندگی اور زندگی کے ہنگامہ سے معمور تھا۔ ہر ٹرک پر موٹروں کی قطاریں دکھائی دیتی تھیں۔ پٹریاں پیدل چلنے والوں سے بھری تھیں، اور دوکانیں مال اسباب سے۔ دوکانوں کی رونق و نمائش دیکھنے کے قابل تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی حرکت زیادہ اور شہر جیوٹا ہے، جیسے کسی نوجوان کو اس کے بچپن کے کپڑے پہنا دئے جائیں۔

یہاں نہ تو کثیر دولت کی علامت تھی اور نہ شدید افلاس کی۔ نہ تعیش کے نشان تھے نہ احتیاج کے۔ مقررہ ایران کی طرح یہ دو انتہائی صورتیں تلِ عقیق میں کہیں نظر نہ آتی تھیں۔ گداگروں کی قطاریں اور گلیوں میں بے والی وارث جو کمرے مفقود تھے۔ بار بار داری کے اونٹوں اور گدھوں کے قافلے نظر نہ آتے تھے، بلکہ مال و اسباب کی ڈھلائی موٹر ٹرک سے ہوتی ہے، انجن نے انسانی مشقت کو ہلکا کر دیا ہے

ہوا کے ساتھ گرد کا اڑنا البتہ ثابت کرتا تھا کہ صحرا قریب ہے، یا پھر لاڈلے اسپیکر عبرانی زبان کی وجہ سے بنانا تھا کہ یہ امریکہ نہیں ہے۔

مجھے اسلامی ملکوں میں سفر کرتے چھ مہینے ہو چکے تھے اور ہر موقع پر یورپیوں و انگریزوں سے یہی سنا تھا کہ کھانے پینے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایک مرتبہ بس میں سفر کرتے ہوئے ایرانی ساتھیوں کے ساتھ میں نے بھی تازہ و خوش رنگ انگو خربہ کر کھائے تھے اور اس کے چرمانے میں معدے کی شکایت میں مبتلا رہ چکا تھا، لیکن تل عقیق پہنچ کر میں نے تل کا پانی نہایت آزادی کے ساتھ پیا اور ہونٹ کی خلو سے سوال کرنے کی ضرورت نہ ہوئی کہ پانی اُہل نیا گیا ہے یا نہیں۔ اس قسم کی احتیاط کرنا میرے اوپر لازم ہو گیا تھا، لیکن یہاں کے بازار میں تازہ پھل اتنے اچھے معلوم ہوئے کہ میں نے ایک تھیلہ بھر خریدے اور ان کو کھاتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ میں قضا سے بچے اڑا رہا ہوں۔

بازار بقتہ فور بنے ہوئے تھے۔ عمارتیں یک منزل ہیں اور بالعموم سفید۔ اونچی عمارت بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ قاہرہ کی طرح یہاں بھی کیفے اور ریستوران بکثرت ہیں۔ چائے اعلیٰ قسم کی سہرنگہ پینے کو ملتی ہے۔ قہوہ، امریکن مذاق نہیں بلکہ یورپین ڈھنگ پر طیارہ کی جاتی ہے۔ ہیرے خدمت گار جنڈر اور مستعد ہیں۔

تل عقیق اگرچہ ریگزار پر آباد ہے مگر وہاں ہرگز ارک کی کثرت ہے۔ چار میل لانے ساحل کے ساتھ ساتھ خوشنما پارک ہیں جن میں خوبصورت صحرائی سرد اور دوسرے درختوں کی قطاریں دل کو بھاتی ہیں تل عقیق آباد کر کے یہودی قوم نے فطرت کے ساتھ اپنی محبت کا ثبوت دیدیا ہے، یاغ و راغ کی کثرت سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ریگستان سے جنگ کرنے میں یہودیوں نے پوری طرح معلوم کر لیا ہے کہ وہاں کس قسم کے درخت نشوونما پاسکتے ہیں۔ یہ شہر جدید تعمیر ہے مگر اس میں عمارتی شان و عظمت کا نہیں بلکہ نفاست و آرام کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ صرف ایک کالج کی عمارت ہے جس پر گنبد نظر آتا ہے وہ سب جدید وضع کی عمارتیں ہیں۔ یہ بات صاف محسوس ہوتی ہے کہ شہر کی تعمیر میں عہد انجیلی کا کوئی خیال درمیان نہیں آیا۔ اور مقصود ایران کے برخلاف اس شہر کی کوئی چیز قدامت کی یاد نہیں دلاتی بڑوں اور بازاروں کے نام البتہ انجیل سے لئے گئے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان لوگوں کے نام پر بھی بازار آباد کئے گئے ہیں جنہوں نے مسیحی تحریک سے ہندردی کی ہے۔

پوری دنیا میں تل عقیق ہی خالصاً یہودی شہر ہے، جسے یہودی ہاتھوں نے بنایا اور جس میں یہودی ہی آباد ہیں، یہاں یہودیوں کی حکمرانی ہے اور جس کی دولت و ناموری یہودیوں ہی کے باعث ہے

جہاں عبرانی سرکاری زبان ہے۔ (البتہ انگریزی زبان کو ثانوی زبان کا درجہ حاصل ہے اور بڑے بچے کیلکس ڈرائیور اور پولیس میں بھی انگریزی بولی جاسکتے ہیں) سڑکوں کے نام کی تختیاں عبرانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہیں۔ اسکولوں میں عربی بھی لازمی مضمون ہے۔

فلسطینی یہودی کی نئی نسل جو نفرت کی آب و ہوا میں پیدا ہوئی اور محاذوں کے ماحول میں بڑھاپا طے کر رہی ہے نہایت مضبوط و جفاکش ہے اور جتنی جفاکش ہے اتنی ہی خوش و خرم بھی ہے۔ یہودی نوجوان جس انہنگ سے کتابوں پر جھکے دکھائی دیں گے، اسی ولولے سے ہل بھی چلاتے نظر آئیں گے۔ اس نسل کے دل میں داخلی یا خارجی قسم کا کوئی خورج جگہ نہیں پاسکا ہے۔ وہ بڑی بے خوف نسل ہے، اور اپنے ماضی یا مستقبل کو جذبات کی عینک سے دیکھنا نہیں جانتی۔ وہ تحقیر و تذلیل کو برداشت کرنا نہیں جانتی، کیونکہ اس نئی نسل میں خود اعتمادی اتنی ہی وسیع ہے جتنا تل حیف کا آسمان وسیع ہے۔ ایک انیس سال کے لڑکے کے الفاظ ہیں:

”آنسو بہانا ہم بھول چکے اور رحم کی انتہا کرنا چھوڑ چکے ہیں! ہمارے باپ دادا کے طریقے اب ہمارے کام کے نہیں، ہم یا تو جیئیں گے یا مر جائیں گے!“

یہ لڑکا جس وقت یہ بات کہہ رہا تھا تو اس میں جوش و جذبہ مطلق نہ تھا بلکہ نہایت سکون و سنجیدگی کے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ جو خیال و احساس لڑکوں میں ہیں وہی لڑکیوں میں بھی پائے جاتے ہیں، لڑکیاں نیکر پہنتی، بال ترشوائی اور غارہ لگاتی ہیں۔ مگر ان میں مہر و ایروائی کی جدید لڑکیوں کی سی نزاکت آبیان نہیں ہیں بلکہ وہ بیسویں صدی کی بچیاں ہونے کے اعتبار سے اس نظریہ کی قابل نہیں کہ مردان سے زیادہ مضبوط اور زیادہ اہل ہوتے ہیں۔ وہ آنسو بہانے اور ٹھنڈی سانسیں سہرنے کو نہایت کارپور نہیں سمجھتی ہیں۔ ہوٹل میں میری ملاقات ایک یہودی لڑکی سے ہو گئی، میں نے اس سے سوال کیا کہ کیا وہ لڑکیوں کا ڈسٹ انگریز جماعت میں شامل ہونا پسند کرتی ہے۔ تو اس نے جواب دیا کہ:

”میں ہر اس بات کو پسند کر سکتی ہوں جو ہمیں ہمارے وطن کو آزاد رکھنے کے لئے ضروری ہو۔“

۱۹۶۸ء میں جافہ کے ساتھ یہودیوں کی جماعت نے، جافہ کے مضامات میں تل حیف کی بنیاد ڈالی تھی اس وقت تل حیف کا دعوہ ایک واحد و خیال کا درجہ رکھتا تھا اور آج کا شہر ایک ٹھوس حقیقت ہے شبنوں کی مدد کے بغیر صرف ہاتھوں کے اوزاروں سے کام لیکر جافہ کی ایک نئی مضاماتی آبادی قائم کرنا اس جماعت کا مقصد تھا۔ ریگزار سے مقابلہ کرنا یقیناً حوصلے پرست کر دینے والا تھا، لیکن اس چھوٹی سی جماعت کا جوش اور جذبہ کسی وقت کمزور نہیں پڑا۔ ابتدا میں صرف تین سو آدمی وہاں آباد ہوئے تھے۔ اچانک پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی اور ترک حکمرانوں نے ان یہودیوں کو وہاں سے ہمیشہ کے لئے جلا وطن کر دیا۔ لیکن

۱۹۷۷ء میں جب اتحادیوں کی فتح ہوئی تو وہ یہودی پھر وہاں جا کر آباد ہو گئے اور آبادی اٹھارہ سو ہو گئی۔ پھر دنیا کے مختلف حصوں میں ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ یہودی ترک وطن کر کے تل عقیف میں آباد ہوتے رہے، ۱۹۷۷ء میں بارہ ہزار، ۱۹۷۷ء میں ایک لاکھ میں بڑا اور آج دو لاکھ کی آبادی ہے۔ شہر کی تعمیر جاری ہے، تل عقیف کے ”ٹاؤن کلاک“ مسٹرندیوی نے مجھے بتایا کہ ”ان کا مقصد یہ ہے کہ ہر کنبے کے پاس اپنا ذاتی مکان ہو۔“

فلسطین کو وطن بنانے والوں میں بہت سے قابل اور ماسرین فن بھی شامل تھے جنہوں نے شہر کی تعمیر میں حصہ لیا۔ آج کچھ بوڑھی عورتوں کے علاوہ وہاں کوئی بے پڑھا لکھا نہیں ہے۔ ۱۹۷۷ء کے ایک کروڑ ڈالر کے بجٹ میں سے سٹی کونسل نے تیس لاکھ ڈالر صحت تعلیم پر خرچ کئے تھے۔ بچوں کی تربیت اور تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دیا جاتی ہے۔ اسپورٹس کی بڑی قدر ہے۔ نشر و اشاعت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے، دو لاکھ کے شہر میں بارہ روزانہ اخبار نکلتے ہیں۔ دس عبرانی زبان میں اور دو جرمن زبان میں، کیونکہ جرمنی سے آئے ہوئے یہودی عبرانی زبان کے ماسرین نہیں ہو سکے ہیں۔ اس وقت بہت زیادہ کام دوسری زبانوں کے کلاسکس کو عبرانی میں منتقل کرنے پر ہو رہا ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں کتب فروشوں کی دوکانوں کی کثرت ہے اور پانچ لاکھ ڈالر کی کتابیں دوسرے ملکوں سے درآمد کی جاتی ہیں۔ اسی طرح تین لاکھ ڈالر سالانہ کے اخبار رسالے دوسرے ملکوں سے آتے ہیں۔ شہر میں پانچ بڑی لائبریری ہیں۔ اصفہان میں میں نے دو لائبریریاں دیکھیں جہاں کتابوں کی تعداد سیکڑوں تک محدود ہے۔ تل عقیف میں موسیقی کو بھی بہت اوسنچا درجہ دیا گیا ہے۔ تھیٹر روز افزوں ترقی پر ہے اور دنیا کے بہترین ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔

تل عقیف میں ایک کلچری ادارہ ایسا ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ہے وہاں کی پریس ایسوسی ایشن ہر سہ ماہیوں دن ایک ادبی اجتماع کرتی ہے جس میں اڈیٹر، اخبار نویس، ادیب و شاعر جمع ہوتے اور اپنا تازہ کلام پیش کرتے ہیں۔ اس شہر میں اظہار خیال کی کامل آزادی ہے اور یہاں کا ادب کسی سیاسی نظریے کے سانچے میں ڈھل کر نہیں نکلتا، حالانکہ تل عقیف کلچری اعتبار سے اس وقت گڑھاؤ میں گرا رہا ہے۔ یہاں شہر سے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکیاں (بلونڈز) اس کثرت سے ہیں جتنی آپ نیو یارک یا پیراگ میں دیکھیں گے۔ میں نے جب اس حقیقت پر حسرت ظاہر کی تو ایک ممتاز اہل قلم نے کہا کہ:-

”شاید خدا کی مرضی یہی ہے!“

باقی کے عرب باشندے بھی سامی نسل ہیں مگر ان میں اور فلسطین کے یہودیوں میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ زبان اور عادات و اطوار سے قطع نظر جغرافیائی ساخت میں بھی فرق ہے اور ذہنی انداز بھی مختلف

ہے۔ تل عقیف کے یہودی خود بھی پچاس مختلف قوموں کا مجموعہ ہیں۔ عجیب بات ہے کہ وہ بچے بھی جو فلسطینی میں پیدا ہوئے ہیں، سامی نسل کے نہیں معلوم ہوتے۔ ان میں یہودیت کی کوئی علامت نظر نہیں آتی اس پہلو سے بھی فلسطینی ایک اونٹنا ہوا کڑھاؤ ہے۔

تل عقیف کے لوگ بالعموم یورپین وضع کا لباس پہنتے ہیں جو یورپین کم اور امریکن زیادہ ہے۔ میں نے لوگوں کو اتنا خوش پوش دیکھا تو سوال کیا کہ کیا یہاں کوئی شخص غریب نہیں ہے۔ تو میرے ایک دوست نے جواب دیا:-

”بلاشبہ یہاں غریب بھی ہیں۔ لیکن سبیا متمدن ہیں“

الغرض تل عقیف اتنا مصروف و منہمک شہر ہے اور وہاں اس قدر حرکت و عمل ہے کہ دولاکھ کی آبادی پانچ لاکھ کی معلوم ہوتی ہے۔ کوئی شخص نکما اور بیکار نہیں، تجارت و صنعت، طباعت و اشاعت ادب و علم، موسیقی و رقص، سبھی پر کام ہو رہا ہے اور بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ پورے مشرق وسطیٰ میں تل عقیف ہی ایسا شہر ہے جہاں چودہ سال سے کم عمر بچے سے کام لینا جرم ہے اور یہ قانون نافذ العمل بھی ہے۔ تل عقیف اب ہیرا تراشی کا خاص مرکز بن گیا ہے۔ سلاخ میں اس کی ہیرے کی پرآمد سوا دو کروڑ ڈالر کے قریب تھی۔ اس شہر میں شان و شوکت کی نمائش کا سراغ نہیں ملتا اور محنت و مشقت کے علامات ہر جگہ نمایاں ہیں۔

دوران گفتگو میں ایک جرمن یہودی نے مجھ سے کہا:-

”ہم نے اگر ریگستان پر فتح پا کر اسے باغوں سے ڈھک دیا ہے تو ایک دن ہم عربوں سے معاملہ

کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔“

ان الفاظ میں سمجھنے کے لئے بہت کچھ ہے۔

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو دھبہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ادبیت میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ادبیتوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت چار روپیہ (اللہ ر) علاوہ محصول۔

مینجر نگار لکھنؤ

تیرھواں باب

(ایک نیا سماج)

جس روز میں نے فلسطین کی سرزمین پر قدم رکھا اُس کے دوسرے ہی دن سے سخت قسم کی بارشیں شروع ہو گئی۔ چونکہ فلسطین پہونچ کر (قاہرہ و طہران کی جمہودی حالت دیکھنے کے بعد) مجھے حرکت و عمل کے دیکھنے کا پہلا موقع ملا تھا، اس لئے مجھے فلسطینی دیہات سے بڑی توقع ہو گئی تھی۔ بارش کی کثرت یقیناً میری دیہاتی سیاحت میں مارج ہوتی اگر فلسطین کی بہترین سرطکیں میری مدد نہ کرتیں۔

پہلے میں اس گاؤں میں پہونچا جس کا نام غوات برنیر ہے۔ اس کے متعلق مجھ سے بڑی تعریفیں کی گئی تھیں اور بتایا گیا تھا کہ یہ محض مثالی اور نمونے کا گاؤں نہیں ہے جیسا عام طور سے تقریباً ہر ملک میں ہو رہا ہے بلکہ پورے فلسطین میں سب سے زیادہ سائنسی طریق پر منظم اور پوری دنیا میں ایک نئے سماج کی حیرتناک لہارٹری (محل) بھی ہے۔ گاؤں کی پوری آبادی جمہوری اصول خود مختاری پر ادا دہائی کے طریقوں پر کاشت کرتی اور زندگی گزارتی ہے۔ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے، نہیں کہا جاسکتا مگر بحالت موجودہ اس میں شک نہیں یہودیوں نے نہ صرف طریق کاشتکاری بلکہ طرز زندگی کو بدل کر معجزہ پیش کیا ہے۔

اپنی سیاحت میں میں نے زراعت کے ترقی پسند طریقوں کا خاص طور پر معائنہ کیا ہے، اور کتاؤا میں رہ کر وہ گاؤں میں نے دیکھے ہیں جہاں DUKHBOR جماعت کے لوگ زار روس کے جبر و تشدد سے بھاگ کر آباد ہوئے تھے اور مذہبی عقیدے کی طرح نجی ملکیت کے خیال کو تیاگ کر مشترک زراعت پر منظم ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کی جفاکشی نے ان کو اپنے مقصد میں کامل طور پر کامیاب کیا، مگر چونکہ جدید تعلیم اور کلچری ترقی سے متاثر ہے اس لئے یہ جماعت اپنے لیڈر کی محکوم بن کر رہ گئی۔ جن دنوں میں وہاں گیا تھا، انکا لیڈر پیٹروویر گیٹن تھا جو کسی طرح روسی زار سے کم نہ تھا۔ بجز اپنے لیڈر کی حکمرانی کے یہ جماعت کسی

ور کے حکم سے واقع بھی رہتی۔ اس کی ہر خواہش کو پورا کرنا ان کا فرض ہے۔ پیر جب سفر کرتا ہے تو دو دو جان لڑکیاں اس کے ساتھ رہتی ہیں۔ بلاشبہ ان لوگوں نے مشترک کاشت میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو۔ لہذا ان کے بڈرنے ان کو جو سماجی درجہ دیا ہے، اگر ٹالسٹائی اس کو دیکھتا یا تصور میں لاسکتا تو رو پڑتا۔ یہ روسی کاشتکار ٹالسٹائی کے مدد سے روس سے نکل کر کنا ڈا میں آباد ہوئے تھے۔

اسی طرح میں نے روس میں مشترک کھیتی کا قانون جاری ہونے سے پہلے شمالی تھقار کی دو آبادیاں دیکھی تھیں جہاں مشترک زراعت قائم ہو چکی تھی۔ ایک آبادی روسیوں کی تھی دوسری فنیتوں کی اور یہ سب امریکہ میں اچھی کاشتکاری کر کے خوشحالی سے لہر کرتے تھے۔ مگر جب روس میں انقلاب کامیاب ہو گیا تو یہ لوگ اپنا سامان اور زمینیں فروخت کر کے روس چلے آئے اور مشترک سرمائے سے مشترک زراعت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ امریکہ سے بہترین قسم کے آلات زراعت ساتھ لائے تھے اور امریکن کاشت کے جدید طریقوں سے واقف تھے۔ ان دونوں بستیوں نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ نمونہ و نمائش کی چیز بن گئیں ان کا کلچری اور زندگی معیار آس پاس کے دیہات سے بلاشبہ بہت اونچا تھا۔ لیکن جب روس میں مشترک کھیتی کی اسکیم پر عمل درآمد ہوا تو یہ دونوں بستیاں بھی اس میں مدغم کر دی گئیں۔

چونکہ یہ خالیں میرے تجربے میں آچکی تھیں اسلئے فلسطین کے اس گاؤں کو دیکھنے کا اشتیاق بڑھ گیا تھا مشترک کاشت و زراعت کے تجربے اکثر کئے گئے، کہیں ناکام رہے اور کہیں تھوڑی بہت کامیابی ہوئی یا ایک پہلو سے پوری کامیابی ہوئی اور دوسرے پہلو سے تشنہ رہے۔ لیکن فلسطین میں یہ تجربہ بہم وجہ کامیاب ہے۔ یہ مشترک کاشت و مشترک سماج کسی سیاسی نظر سے بوجھل نہیں ہے اور اس کو کامیاب بنانے والے یہودی نوآبادکاروں نے اپنے لئے ایک معزز مقام حاصل کر لیا ہے۔ شکستہ میں فلسطین میں ایسی نوآبادیوں کی تعداد ایک سو چھیٹھ تھیں اور اب برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔

یہودی دماغ نے اس اشتراک عمل اور امداد باہمی کا جو کارنامہ پیش کیا ہے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کرنے کے لئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ وہاں ابھی تک اس قسم کی تنظیم کے لئے کوئی قانون جاری نہیں ہے۔ زیادہ زرخیز اور نفع بخش علاقے اس وقت بھی نجی ملکیت ہیں جن میں حکومت یا سماج کسی طرح مداخلت نہیں ہو سکتی۔

اس صدی کے اوائل میں جب یہودیوں نے زمینیں خریدنا شروع کیں تو ان کے وہی تیور تھے جو عرب زمینداروں کے ہیں۔ یہودی زمیندار بھی ایک نیا آفندی بن گیا تھا۔ چنانچہ یہودی زمیندار اور یہودی مزدوروں میں مزدوری کی کشمکش ضروری ہو گئی، اور بالآخر مزدور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس بلا سے

نجات صرف امداد باہمی کے اصول پر عمل کرنے سے مل سکتی ہے، اس خیال و تصور کو تعلیم یافتہ طبقے کی ہمدردی سے بھی تقویت پہنچی جس میں صیہونی تحریک کے لیڈر بھی شامل تھے۔ جو زن بنیسیل نے جو دغانیہ نوآبادی کے ڈائریکٹروں میں سے ایک ہے، لکھا تھا کہ:-

”کاروبار زراعت میں ہم امن کے خواہشمند ہیں، ہم نے کھیتوں میں مزدوری کی ہے اور اس تجربے نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں“

فلسطین میں امداد باہمی کے اصول پر آباد ہونے والے لوگوں کو ”یہودی قومی فنڈ“ سے زمین خرید کر بلا قیمت دیدی جاتی ہے۔ البتہ دو فیصدی سالانہ بطور لگان کے وصول کیا جاتا ہے شرط صرف یہ ہوتی ہے کہ زمین لینے والے مزدور کے ذریعہ سے نہیں بلکہ خود کاشت کریں گے۔ اس شرط کی خلاف ورزی کرنے پر زمین سے بیدخل کئے جاسکتے ہیں ورنہ اسچاس برس کا پٹہ ہی عملاً دائمی پٹہ ہوتا ہے اور وہ زمین کاشتکار کی اولاد میں وراثتاً بغیر جبرطری کے منتقل ہوتی رہتی ہے۔ فصل خراب ہو جانے کی صورت میں لگان کی رقم بتدریج وصول کی جاتی یا معاف ہو جاتی ہے۔ ان شرائط کی وجہ سے کسان اپنی زمینوں کو بہترین حالت میں رکھنے کی متواتر کوشش کرتے ہیں۔ اور کاشتکار کے یہ حقوق صرف یہودیوں کے لئے نہیں بلکہ عربوں کے لئے بھی ہیں۔

اس حقیقت کا اندازہ کر لیا گیا ہے کہ اصول اشتراک پر کاشت کرنا اور سوشلزم کے اصول پر دیہاتی نظام بنانا مخصوص طبع مزاج کے لوگوں کے لئے ہی مناسب ہو سکتا ہے، سب کے لئے نہیں۔ اس لئے ایسے گاؤں الگ آباد کئے گئے ہیں جن کو چھوٹے کاشتکاروں کی آبادیاں کہا جاتا ہے۔ اس تنظیم میں ایک کنبہ کو اکائی بنایا گیا ہے اور اس لئے کہ چھوٹے بیوپاری کا مال نسبتاً کم قیمت پاتا ہے، ایسے ہر گاؤں کی ایک کوآپریٹو بھی بنادی گئی ہے، اور بڑی مشینیں جنہیں ایک کاشتکار نہیں خرید سکتا، مشترک سرٹے سے خریدی جاتی ہیں۔ یہ کوآپریٹو گاؤں کی ضرورت کی ساری چیزیں اکٹھا خرید کرتی اور اسکی ساری پیداوار اکٹھا کر کے فروخت کرتی ہے کوئی بیمار پڑتا ہے تو پڑوسی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس کی کاشت پر جا کر کام کریں۔ گاؤں کے اجتماعی کام گاؤں پنچایت طے کرتی ہے۔ سہ ماہ تک ایسے تراسی گاؤں آباد ہو چکے تھے۔

جن لوگوں کی انفرادیت پسندی کو اتنا بھی گوارا نہیں، ان کے لئے ایک اور اسکیم جاری کی گئی ہے جسے درمیانہ کاشتکاری گاؤں نام دیا گیا ہے۔ ایسی آبادیوں کے لوگ جتنا ان کی پونجی ساتھ دیتی ہے، زمینیں خرید لیتے اور اس پر خود کاشت کرتے ہیں اور مزدور بھی لگا سکتے ہیں۔ سہ ماہ تک ایسی

نوآبادیوں کی تعداد بڑھتی تھی۔

ان نوآبادیوں میں یورپ سے آئے ہوئے وہ یہودی زیادہ کامیاب ثابت ہوئے جو تعلیم یافتہ

ہیں یا شہر دل سے آئے ہیں۔ یورپی دیہات کا آدمی اتنا زیادہ کامیاب نہیں ہے۔

غرض، جب ہم موٹر سے غواہ بریئر جا رہے تھے تو راستے میں بہت سے گاؤں پڑے اور پھر پہاڑی کے ڈھلان پر چڑھ کر ہم غواہ بریئر پہنچے۔ اس گاؤں میں بارہ سو پچاس آدمیوں کی آبادی ہے۔ چھ سو پچاس بچے ہیں اور چھ سو مرد عورت ہیں۔ ہر چند یہ سب یہودی ہیں مگر مختلف آب و ہوا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے ہیں، جنہیں کاشتکاری کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اور ایسے بھی تھے جو اپنے آپ کو یہودی بھی نہیں سمجھتے۔ اُٹلی کے یہودی اپنے تئیں یہودی مذہب کے اٹالوی کہتے اور سمجھتے تھے، ایسے ہی عیسائی اپنے تئیں اٹالوی کہتے ہوئے سمجھتے تھے۔ قومیت سب سے بالا تر تھی لیکن جب مسوئینی پر ہٹلر کا سایہ پڑا تو ان یہودیوں کو بھی سامی دشمنی کا تجربہ ہوا۔ اور یہ لوگ وطن میں غریب لوٹن بن گئے، وطن بہر حال تلاش کرنا تھا اور وہ انھوں نے فلسطین کو بنایا، اور غواہ بریئر میں بس گئے۔

یہ گاؤں ۱۹۳۷ء میں آباد کیا گیا۔ پہلی جماعت جب اس مقام پر پہنچی تو کوئی گاؤں یا مکان نہ تھا صرف زمین تھی۔ ڈیروں میں سکونت اختیار کر کے یہ لوگ کام میں جٹ گئے۔ شروع میں صرف کچیں ایکڑ زمین جوتی گئی۔ جب آبادی بڑھی تو زمین بھی اور مل گئی۔ اب یہ چھ سو کاشتکار بونے نو سو ایکڑ زمین پر کاشت کرتے ہیں۔

ایک ایک مکان کے اندر جا کر اور کھیتوں پر پہنچ کر ان کی سلیقہ شعاری دیکھی تو حیران رہ گیا کسی جگہ جنگلی جڑی بوٹی بھی تو نظر نہیں آئی۔ البتہ حال کی بارش سے کچھ کچھ پھوٹ آئے تھے۔ پیتھالیس ایکڑ زمین پر باغ ہی باغ ہیں، جہاں سیب، نارنگی، انگور، لیمو اور دوسرے پھل اتنے ہی اچھے ہوتے ہیں جتنے کیلیفورنیا کے۔ بعض چیزوں کی تو چار چار فصلیں اترتی ہیں۔

پورے رقبے میں ڈھائی سو ایکڑ نہری زمین ہے باقی بارانی۔ بارانی زمین پر غلہ بویا جاتا ہے۔ ہر چند یہ زمین غلہ پیدا کرنے کے لئے مناسب نہیں اور اوسط پیداوار بہت کم ہے لیکن فلسطین کے لوگوں کو کھانے کے لئے غلہ بھی تو چاہئے، نہری زمین گاؤں کی آبادی کے لئے بے حد فیض رساں ہے۔ پچھتر ایکڑ زمین پر چارہ کی غرض سے مکئی اور سورج مکھی کی کاشت کی جاتی ہے جس کے بیج سے کھانے کا تیل بھی نکل آتا ہے۔ مزید قیس ایکڑ ترکاریوں کے لئے وقف ہے اور تین فصلیں اترتی ہیں جو غواہ اور تل غصیف میں صرف جوتی

ہیں۔ ساتھ ہی پھولوں کی کاشت بھی ہوتی ہے جو بہت نفع بخش ہے۔ باغات کے علاوہ ایک بڑا رقبہ پاکستان کا ہے۔

کاشت کرنے کے طریقے اتنے عمدہ ہیں کہ مجھے گاؤں سکریٹری سے پوچھنا پڑا کہ یہ لوگ اتنے ماہر کاشتکار کیسے بن گئے۔ اس نے زرا سوچ کر جواب دیا کہ :-

”ہم اس پر مجبور تھے! اور چونکہ سب تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے سیکھ بھی جلدی لیا!“

سب سے زیادہ حیرت مجھے گاؤں کی ڈیری دیکھ کر ہوئی۔ مقررہ ایران میں دو ایک جگہ کے علاوہ مجھے دودھ دینے والے اچھے جانوروں کے دیکھنے کی آرزو ہی رہی۔ غواٹ کی ڈیری جدید مشینوں سے آراستہ اور سفید ٹائل کی بنی ہوئی تھی، جس میں کہیں ایک دھبہ بھی نہ تھا۔ ڈیری سوسے اوپر موشی تھے۔ میں نے انھیں ہولسٹائن نسل کے سمجھا مگر سکریٹری نے بتایا کہ وہ سب فلسطینی نسل کے ہیں۔ دودھ کا سالانہ اوسط فی گائے ننانوے ہزار پونڈ تھا۔ دودھ بھی مشین سے دوا جاتا ہے۔ اتنی چھوٹی سی آبادی نے ایک برتن خانہ بھی کھول رکھا ہے۔ حفظانِ صحت کے اصول اور ریفریجریٹر مسلمان ملکوں میں اہم مسئلے سمجھے جاتے ہیں مگر غواٹ میں بالکل معمولی باتیں ہیں۔ مختلف مشینوں کی مرمت کے لئے گاؤں کا لومہارا ناقص تھا اور تلِ عقیق سے ستری بلانا طول اٹل تھا اس لئے اس آبادی نے ایک ورکشاپ بھی قائم کر لیا ہے جو صرف مرمت اور پُر زے ہی بنانے کا کام نہیں کرتی بلکہ پوری مشین بنالیتی ہے۔ گھریلو دستکاریوں کو وسعت دینے میں اس ورکشاپ کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہاں لوہے کی ڈھلانی کا کارخانہ بھی چل رہا ہے ایک فیکٹری فرنیچر اور دوسرے لکڑی کے کام کے لئے جازی ہے اور ایک اور حشرات الارض مارنے والی دوائیں تیار کرتی ہے۔ مشین ہی سے کپڑے دھلتے، روٹی پکتی، کپڑے سننے اور جوتوں کی مرمت ہوتی ہے۔ عمارتیں بنانے والا ادارہ الگ قائم ہے اور پہاڑی کی چوٹی پر ایک ویکٹورین ہوٹل اور گاؤں والوں کی راحت گاہ ہے جہاں ایک سو بیس آدمی ٹھہر سکتے ہیں۔ پھلوں کو محفوظ کرنے کی ایک اور فیکٹری چل رہی ہے اور اس کا مال بیشتر انگلستان کو جاتا ہے۔ میں نے سکریٹری سے ایک مشین کے بارے میں پوچھا کہ کس کام کی ہے تو اس نے بتایا کہ :

”ایسینشیل آئل نکالتی ہے اور ہم نے خود ہی بنائی ہے، اب اس کی بہت مانگ ہے۔“

مزدوروں کا بیکار وقت گھریلو دستکاریوں میں صرف ہوتا ہے اور کوئی شخص کسی وقت بیکار نہیں بیٹھتا۔ میں نے سکریٹری سے پوچھا کہ گزشتہ سال پورے گاؤں کی کل آمدنی کیا تھی تو اس نے بتایا :-

”ملک میں ہماری کل آمدنی چار لاکھ پونڈ تھی۔ اس میں ایک لاکھ کاشت کا منافع تھا

اور تین لاکھ گھریلو انڈسٹری کا۔

یعنی کام کرنے والے ہر آدمی نے دو ہزار چھ سو امریکن ڈالر کمائے۔ مشرق وسطیٰ میں یہ اوسط آمدنی بہت بڑی دولت ہے۔ میں نے پھر سوال کیا کہ ہر آدمی کو نقد کتنا ملتا ہے تو اس نے کہا کچھ نہیں یا برائے نام۔

میں نے پوچھا: ”فرض کرو وہ کوئی کتاب ہی خریدنا چاہتا ہے؟“
اس نے جواب دیا کہ: ”کتاب کے لئے وہ لائبریری کو اطلاع دیدیگا اور کتاب آجائے گی۔“
میں نے پوچھا: ”اچھا اگر کوئی نوجوان چاہتا ہے کہ اپنی کسی دوست لڑکی کو تفریح کرانے لے جائے؟“
جواب ملا کہ: ”اس صورت میں وہ خزانچی کے پاس جائے گا اور اسے مناسب رقم ملجائے گی لیکن وہ اگر اپنی بہن کو تفریح کرانا چاہتا ہے تو رقم کم ہو جائے گی۔“

یہودی قوم کی اس کو اپریٹو کاشتکاری کی کامیابی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا، لیکن آج تو زراعتی اور سماجک طریقے برتنے میں یہ کامیا بیاں اپنا ثانی کہیں نہیں رکھتیں۔

جن لوگوں نے یہ سماجی انقلاب کر دکھایا ہے وہ بلاشبہ طاسٹائی، روسو اور کروٹکین کے فلسفے سے متاثر تھے لیکن ان کی مشقت وجاہٹ کا ہی دراصل حالات کے تقاضے کا نتیجہ تھی۔ ان کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا۔ فلسطین کی پہلی مشترک کھیتی اور سوشلسٹ سماج ۱۹۰۹ء میں دغانیہ بستی آباد کرنے سے شروع ہوئی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ غواط میں اگر انفرادی کاشت کا طریقہ جاری ہوتا تو موجودہ صورت کاغواط کبھی وجود میں نہ آتا۔

اس بستی میں ہر میاں بیوی کے لئے ایک کشادہ اور آرام دہ کمرے کا مکان ہے۔ باورچی خانہ منبر ہے کیونکہ سارے گاؤں کا کھانا ایک جگہ پکنا اور ایک جگہ کھایا جاتا ہے۔ بچے، بچوں کے گاؤں میں رہتے ہیں۔ شام کو جب والدین اپنے اپنے کاموں سے فرصت پاتے ہیں تو بچے گھر آکر ان سے ملجاتے ہیں۔ چھٹی کا دن بھی بچے والدین کے ساتھ گزارتے ہیں۔ ماں باپ اگر پرتفریح کے لئے تل عقیف جائیں تو بچوں کو بھی لے جاتے ہیں۔ سال میں ماں باپ کو دو ہفتے کی چھٹی ہوتی ہے، بچے ان چھٹیوں میں کبھی ماں باپ کے ساتھ جاتے بھی ہیں اور کبھی نہیں جاتے۔

بچہ پیدا ہونے کے چھ ہفتے بعد تک زچہ اسپتال میں رکھی جاتی ہے اور پھر حج منہ تک آدھے ملا

کام لیا جاتا ہے۔ باقی آدمے دن وہ نرسری میں اپنے اور دوسرے بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ چھ مہینے کا ہو جانے کے بعد کچھ نرسری سے بچوں کے گاؤں بھیجا جاتا ہے۔ بچوں کی غذا، صحت، کھیل کود وغیرہ پر سخت توجہ دیکھائی جاتی ہے۔ غواٹا میں بچوں کی اموات کا اوسط چھبیس فی ہزار ہے جو دنیا میں سب ملکوں سے کم ہے، خود پورے فلسطین کا اوسط چوالیس فی ہزار ہے۔ غواٹا کا طبی انتظام بھی اپنا ہے، اسپتال میں پندرہ بڑے اور تیرہ بچوں کے بلیک ہیں۔

غواٹا میں اٹھارہ سال کی عمر تک تعلیم لازمی ہے۔ ثانوی تعلیم کو ناقابل ترک سمجھا جاتا ہے۔ مگر چودہ سال کی عمر ہونے پر لڑکے لڑکیاں کھیت یا فیکٹری میں بھی کچھ وقت صرف کرتے اور دیکھتے ہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر ہونے پر لڑکا یا لڑکی خود طے کرتے ہیں کہ ان کو وہاں رہنا ہے یا کہیں اور۔ ماں باپ مشورہ دے سکتے ہیں مگر جبر نہیں کر سکتے، جا کر پھر آ جانا ممنوع نہیں ہے۔ نئے آنے والے کو ایک سال تک جانچا جاتا ہے کہ وہ مشترک زندگی کے لئے بنا بھی ہے یا نہیں اور اگر وہ موزوں سمجھا جاتا ہے تو گاؤں سماج کا ممبر بنالیا جاتا ہے۔ سب سے بڑی جانچ اس بات کی کی جاتی ہے کہ نئے ممبر میں ”سمجھوتہ“ کرنے کی اسپرٹ ہے یا نہیں۔

سکرٹری نے بتایا کہ:-

”یہ نظام ہماری زندگی کی ساری سہولتیں فراہم کر دیتا ہے۔ ہمارا مستقبل محفوظ اور یقینی

ہے، رہنے کو مکان ہے، کھانے کو ہر چیز ہے، پہننے کو کپڑے ہیں اور جوتا، بچوں کی تربیت،

تعلیم اور معاشی کی ہمیں فکر نہیں، اور بے روزگاری کا اندیشہ نہیں اور چونکہ ہمارے کاندھوں

سے سارا بوجھ اتار لیا ہے، ہمارے پاس کلچری مشاغل کے لئے بھی وقت رہتا ہے۔“

ایک دوسرے منظم نے کہا کہ:-

”ہم عمارتوں وغیرہ پر جتنا زیادہ خرچ کرتے ہیں اسی مناسبت سے ہماری آمدنی بڑھتی

اور کلچری معیار اونچا ہوتا ہے۔“

یقیناً غواٹا کے لوگوں کا کلچری معیار دنیا بھر کے دیہات سے بہت اونچا ہے۔ بارہ سو پچاس آدمیوں

کی بستی کے لئے ایک لائبریری ہے جس میں بیس ہزار کتابیں ہیں، لائبریری کی عمارت میں بڑوں اور بچوں

کے مطالعے کے چھ کمرے ہیں، جن میں اخبار اور رسالے بھی رکھے رہتے ہیں۔ ہال میں چھ سو آدمی بیٹھ

سکتے ہیں جس میں ایک اسٹیج بھی ہے۔ اور تل عقیف سے ڈراما کہنی اکثر آتی رہتی ہے۔ ڈانس اکثر

ہوتے ہیں، خود گاؤں والوں نے چوبیس آدمی کا ایک اکیڈمیا قائم کر رکھا ہے۔ ایک گاؤں والے نے

مجھے فخر یہ کہا کہ ”ہمارے تو بوڑھے بھی رقص کے بغیر نہیں رہتے!“ اجتماعی رقص کی بھی مشق کھرائی جاتی ہے، بوڑھوں اور بچوں، سب کے لئے کھیلوں کا انتظام ہے۔ تیراکی بہت زیادہ مقبول ہے۔ انٹرنس غواٹا شہری و دیہی زندگی کا بڑا دلکش امتزاج ہے۔

شادیاں گاؤں سے باہر بھی ہوتی ہیں۔ لڑکی شادی کر کے شوہر کے ساتھ چلی جاتی ہے اور لڑکے اپنی بیویوں کو غواٹا لے آتے ہیں۔

اس گاؤں کا سماجی نظام اس لئے کامیاب ہے کہ جمہوریت کے اصول پر پورا پورا عمل کیا جاتا ہے۔ اس سوسائٹی پر اگر کسی کا تحکم ہے تو خود ان کا اپنا۔ ساری طاقت جنرل اسمبلی یا ٹاؤن میٹنگ کے ہاتھ میں ہے جو حسب ضرورت اجلاس کرتی رہتی ہے ہر سال ایک ایکڑ میٹروپولیٹن لیا جاتا ہے، وہ سال بھر کا پلاؤ بنا کر پیش کرتا ہے اس پلان پر اسمبلی میں بحث ہو کر ترمیم و اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور پھر اس کی تعمیل شروع ہو جاتی ہے۔ ہر کام کے لئے ایک کمیٹی بن جاتی ہے۔

اس نئے سماج میں جس موضوع پر مطلق توبہ نہیں دی جاتی وہ سیاست ہے۔ چونکہ یہ تنظیم کسی سماجی عقیدے کی تحت نہیں ہوئی بلکہ سماجی و اقتصادی بہبودی اس کا مقصد ہے جسے وہ حاصل کر چکی ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں، کوئی کسی کے سیاسی خیالات میں مزاحم نہیں ہوتا۔

غیر ملکی اخبار نویسوں نے غواٹا کی اس زندگی کو شہد کے چھتے کی زندگی سے تشبیہ دی ہے جہاں انفرادی خواہش کا وجود نہیں ہے۔ اس کا جواب غواٹا کے ایک بوڑھے کے ان لفظوں میں ملتا ہے۔
میں اگر دو چار ایکڑ زمین نجی طور پر کاشت کرتا ہوتا تو مجھے ڈراما دیکھنے یا ریکیٹر اسٹریٹس میں غلط جانا پڑتا، مگر چونکہ میں مشترک سماج اور زراعت کا ممبر ہوں ڈراما دیکھنے اور ریکیٹر

میرے یہاں چلے آتے ہیں۔“

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے سوشلسٹ نظام کا جس میں کامل طور پر امداد باہمی کے اصول پر کام ہوتا ہے ملک کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب نطن و تخمین ہی سے دیا جاسکتا ہے میرا سچہ خیال ہے کہ بستیاں بسانے میں اگر روپیہ کی افراط ہو تو یہ کامیابی ہرگز نہ ہوگی، غواٹا کی کامیابی لوگوں کی محنت و مشقت کا نتیجہ ہے۔ غواٹا کی اسکیم تجربے کی حد سے باہر نکل چکی، اور محنت و قربانی کی سنرل برآجکی ہے۔ آج غواٹا جس منزل میں ہے وہاں پہنچ کر یہ سوال ہونے لگتا ہے کہ انسان صرف روٹی کی کٹے نہیں جیتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے دلوں میں یہ آرزو بھی پیدا ہو گئی۔ کہ مکان بہتر ہو اس کی آرائش اچھی ہو، اپنا ریڈیو اور ریفریجریٹر ہو، وہ لوگوں کی دعوتیں کریں اور

خود دعوئوں میں جابئیں ایسی ایسی چھوٹی چھوٹی بہت سی خواہشیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس وقت میرے خیال کے مطابق تقسیم نقد کی ضرورت کا وقت ضرور آئے گا۔ میرے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ فلسطینی لیڈروں نے غالباً یہی اندازہ کر کے ایک نئی قسم کے گاؤں بسانا شروع کر دیا ہے ایسے گاؤں میں کاشت تو مشترک محنت سے ہوتی ہے مگر حاصل افراد میں بٹ جاتا ہے تاکہ حسب منشاء و مرضی اسے خرچ کر سکیں۔

غواط سے تل عقیق پٹتے ہوئے میں سوچتا رہا کہ مصر و ایران اس اسکیم پر عمل کر کے کس قدر نفع اٹھا سکتے ہیں، ان ملکوں کا کسان اشتراکی محنت کو ہر چند پسند نہیں کرے گا مگر اسے اس کی کتنی شدید ضرورت ہے، مولشی کی نسل سدھارنے کی ضرورت ہے، اچھے بچوں کے انتظام کی ضرورت ہے، کھیتی اور انسانوں کی بیماریوں سے جنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم پھیلانے کی ضرورت ہے اور گھریلو دستکاریوں کے نفع کا پورا احساس کرنے کی ضرورت ہے!

ہمارے چند مطبوعات

علامہ شبلی :-	خطاب چھ آنے	حب وطن دو آنے
سفر نامہ مصر و شام - دور روپیہ	عبداللہ الحق :-	مسدس تنگ خدمت دو آنے
اسلامی مدارس چھ آنے	اساس التعليم تین روپے	عبدالماجد دریا بادی :-
اسلامی حکومت پانچ آنے	اختر جو ناگدھی :-	زود پشیمان بارہ آنے
زیب النساء تین آنے	اسلامی کتب خانے چھ آنے	شوق قدوائی :-
امیر احمد علوی :-	حیات نظامی آٹھ آنے	عالم خیال بارہ آنے
تاریخ اندور ایک روپیہ	مہدی بھو مالی :-	قاسم وزہرا :- بارہ آنہ و ایک روپیہ
سفر سعادت ایک روپیہ آٹھ آنہ	انسان دس آنے	مرزا رسوا بی، اسے :-
احمد علی :-	رموز فطرت دو روپے	ثنوی امید و بیم چھ آنے
شباب لکھنؤ دو روپیہ آٹھ آنے	علامہ حالی :-	نوبہار دو آنے
مرقع ادوہ بارہ آنے	دیوان حالی دو روپے	غلام اسیر بدایونی :-
نذر بود و حاموی :-	الناظر کب اکھینسی لکھنؤ	بہترین غزل گو چار آنے
انتخاب نقیب آٹھ آنے		اسامی دہانندگی لایٹ - ایک روپیہ

چودھواں باب

(زمین کی حیات نو)

یہ خیال عام ہے کہ شہری لوگ جسمانی مشقت پسند نہیں کرتے۔ اپنے پُرانے تجربے کی بناء پر میں بھی اسی خیال کا تھا۔ لیکن غواط برنیر کے تقریباً سارے باشندے شہروں کے رہنے والے تھے، فلسطین پہنچنے سے پہلے انھیں کدال پھاؤٹے کا فرق بھی شاید معلوم نہ ہو۔ لیکن بیس سال کی مدت میں انھیں لوگوں نے محنت کا معجزہ کر دکھایا۔ بظاہر غواط کی بستی ایک معما نظر آتی ہے، لیکن حقیقت میں ایسا ہے نہیں پڑھا لکھا آدمی اگر ارادہ کر کے دیہاتی زندگی اختیار کر لے تو سائنسی طریقوں پر عمل کرنے میں اسے تکلف نہیں ہوگا اور اس کی ذہانت اسے ایک بہتر کاشتکار بنا سکتی ہے۔ چنانچہ غواط کے ان کاشتکاروں کے ایک ہاتھ میں کھربا اور دوسرے میں کتاب تھی۔ جس سرزمین پر وہ آپڑے تھے، قدرتا انھیں اس سے گہرا لگاؤ ہونا چاہئے۔ اپنی زمینگیوں کو نیا جنم دینے کا عزم بھی ان کے اندر لازمی تھا۔ سائنس کے ماہرین کے مشورے انھیں حاصل تھے۔ باہر سے مالی امداد بھی ان کے دست رس میں تھی۔ یہ تمام باتیں انکا قیمتی سرمایہ تھیں۔ بایں ہمہ ان کے پاس اگر جدید ترین مشینیں نہ ہوتیں تو ان کی کامیابی اتنی مکمل نہ ہوتی ظاہر ہے کہ ان کے عرب ہمسائے خود تاریخ کے مجروح تھے اور ان کو کچھ سکھانا نہ سکتے تھے۔ دیسی مویشی دیسے ہی خراب حالت میں تھے۔ جیسی فلسطین کی زمین، دودھ کا سالانہ اوسط فی مویشی تقریباً ساڑھے پندرہ سو پونڈ تھا (امریکہ کی گائے کا اوسط ساڑھے آٹھ ہزار پونڈ ہے اور ڈیرے کا مالک ایسی گائے کو اپنے گائے سے نکال دیتا ہے جو سال میں ساڑھے تین سو پونڈ مکھن نہ دیتی ہو) فلسطین کے نوآبادکاروں کے لئے بھی کم دودھ والے مویشی بے کار تھے۔ شام و لبنان کے مویشی بہتر ضرور تھے مگر تجارتی نقطہ نظر سے وہ بھی کارآمد نہ ہو سکتے تھے۔ یورپ سے عمدہ نسل کے مویشی آسانی سے منگائے جاسکتے تھے مگر تبدیل آب و ہوا کی وجہ سے وہ زیادہ مفید ثابت نہ ہو سکتے، ولندیزی گائے کچھ مناسب ثابت ہوئی

مگر کثیر تعداد میں لاکھ بھائی نہ جاسکتی تھی۔ ان حالات میں یہودی سائنسدانوں کو طے کرنا پڑا کہ فلسطین کے لئے انھیں ایک مناسب مویشی پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ ولندیزی سائنڈ او۔ شامی گائے سے جو نسل طید ہوئی وہ قابل اطمینان نکلی۔ اس کے دودھ کا اوسط نو ہزار پونڈ ہے اور اس وجہ سے فلسطین میں ڈیری کی صنعت نہایت کامیاب ہے۔ فلسطینی عرب بھی اگر اپنے مویشیوں کی نسل اسی طرح بنالیں تو بلاشبہ فلسطین میں دودھ کی نہریں بہنے لگیں۔ دوران جنگ میں عربوں نے کچھ حوصلہ دکھایا اور نئی قسم کے مویشی فراہم کئے مگر بالآخر چھوڑ بیٹھے۔ بڑے مویشی کی طرح یہودی نوآباد کاروں نے بھیڑ بکری کی نسلیں بھی سدھاری ہیں۔ لیکن بکری جو نہ صرف کھیتی بلکہ جنگل کو بھی نقصان پہنچاتی ہے، مقبول نہیں ہوئی۔

ان یہودی نوآباد کاروں نے ترقی کی کوئی صورت نظر انداز نہیں ہونے دی۔ مرغی پالنے کے کام کو بھی بہت کامیاب بنالیا اور ڈیری فارم کی طرح یہ بھی بہت نفع بخش ثابت ہوا ہے۔

مویشی کی نسل کو بہتر بنانے کا کام اتنا مشکل نہیں تھا جتنا فلسطین کی زمین کو نئی زندگی دے کر زرخیز بنانا، زمین کی سطح صدیوں تک بارش سے دھل دھل کر طاقات کھوتی رہی اور قوی بنانے کی کسی صورت پر عمل ہوا انھیں اس لئے بخر ہو کر رہ گئی۔ اس کے لئے عربوں کو ملزم بھی نہیں گردانا جاسکتا۔ صلیبی جنگوں کے زمانے سے یہ ملک تباہ برباد ہوتا رہا ہے۔ مغلوں کی یلغار نے بے شمار عرب کاشتکاروں کو خانہ بدوشی کی زندگی پر مجبور کر دیا اور زمینیں بے وارث پڑی رہیں۔ ترکوں نے چار سو برس حکومت کی مگر عرب کاشتکار کی ہمت افزائی نہیں ہوئی۔ بلکہ آفندی (زمیندار) اس کا خون چوستا رہا۔ ترکی حکومت کے حالات نے بھی آراضی کی تباہی کے سارے اسباب پیدا کر دیئے۔ ۱۹۰۹ء میں ٹی اے لارنس نے عرب ملکوں کا سفر کیا اور ان ملکوں کی بربادی دیکھ کر خون زدہ ہو گیا۔ لیکن یہودیوں کی نوآبادیاں دیکھ کر اسے نجات کی صورت دکھائی پڑی۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

”ان کی (یہودیوں کی) کامیابیاں لامعاذ عہد کو بھی ایک دن اسی جگہ لے آئیں گی۔ اور

اس وقت عرب دنیا کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی۔ یہودیوں سے عربوں کو تکنیکی مدد مل سکتی

ہے اور وہ اس طرح صنعتی یورپ سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان ملکوں کی ایک

کنفڈریشن وجود میں آکر ایکروز ”ورلڈ پاور“ بن جائے“

ملیریا ایک عام وبا کی صورت رکھتا تھا۔ یہودی نوآباد کاروں نے آتے ہی دلدلوں کو خشک کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کام کو انجام دینے میں خود بھی ملیریا کا شکار ہوئے مگر سمجھتے تھے کہ اس بلا کو دفع کئے بغیر جینا محال ہے گا۔ چنانچہ جنگ ساٹھ سال تک لڑی جاتی رہی۔ آج ایک آدھ علاقے کو چھوڑ کر باقی

تمام دلدلیں خشک کر کے میرا کے مچھر کو ختم کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں میرا نے بائیس فیصدی آبادی کو متاثر کیا تھا اور سلاکے میں صرف دو فیصدی اس بخار میں مبتلا ہوئے۔

یہودیوں کو اس فتح سے جتنا فائدہ پہونچا اتنا ہی عربوں کو پہونچا۔ فلسطین کے کسان اب مصر، عراق اور ایران کے کسانوں کی طرح میرا کا شکار نہیں ہوتے۔

دلدلیں خشک کر دینے سے یہی فائدہ نہیں ہوا کہ میرا دفع ہو سکا بلکہ ایسا کرنے سے کافی بڑا رقبہ کاشت کے لئے دستیاب ہو گیا۔ جھوٹے سے ملک میں سوا لاکھ ایکڑ زمین کا اس طرح آبادی بہت بڑی بات ہے جس علاقے میں دلدلیں ابھی تک خشک نہیں کی گئی ہیں وہ حصہ کا علاقہ ہے اور ان دلدلوں کا رقبہ اٹھارہ ہزار میل کا ہے۔ حصہ جمیل کا علاقہ اور شاداب ہے کیونکہ بارش کافی ہوتی ہے۔ اب اس جمیل میں مچھلیاں پرورش کرنے کی اسکیم جاری کی جانے والی ہے۔ اس علاقے کی آبادی پندرہ ہزار ہے جس میں پانچ ہزار یہودی اور دس ہزار عرب ہیں۔

فلسطین میں زمین سے متعلق سارے کام تقریباً انجام پا چکے ہیں۔ چٹانوں کو کھود کر نکال پھینک دیا گیا ہے ڈھلان مسطح کر دئے گئے ہیں۔ روخامہ کے علاقے کی زمین کو اب بارش کا پانی بہا کر نہیں لے جائے گا۔ کھار والی زمینوں کو پاک کر کے قابل زراعت بنا لیا گیا ہے۔

تمام زمینوں کو قابل زراعت بنانے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ پانی کی تلاش بھی جاری تھی۔ ان نوآبادکاروں سے پہلے آبپاشی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ جمیلوں، ندیوں اور چشموں سے معقول کام لیا ہی نہ جاتا تھا۔ اٹھلے کنوؤں سے کچھ آبپاشی ہوتی تھی مگر زمین کی نہ کا پانی ان میں سے بھی نہیں نکالا گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ”یہودی نیشنل فنڈ“ نے پمپیشن کر کے بتایا کہ زیر زمین بہت کافی مقدار میں پانی موجود ہے، اور آسانی چار لاکھ ایکڑ کی زمین کی آبپاشی ہو سکتی ہے۔ اس وقت تک صرف سوا لاکھ ایکڑ زمین پر آبپاشی ہوتی ہو اور ان زمینوں پر ایک سے زیادہ فصلیں بوئی جاتی ہیں۔ بدل بدل کے فصل پیدا کرتا جدید دریافت ہے، فلسطین میں اس پر عمل کر کے زمین کی طاقت اور زرخیزی کو بڑھایا جا رہا ہے۔ تاریکی فلسطین کی پرانی پیداوار ہے مگر یہودی نوآبادکاروں سے پہلے تاریکی کی کاشت کے امکانات کا اندازہ نہیں کیا گیا تھا کہ چٹان میں سونا چھپا ہوا ہے۔

تاریکی کو فلسطین میں شہوتی کہتے ہیں، شکل اور ذائقہ دونوں طرح سے نہایت اچھا پھل ہے اور دنیا بھر میں اس کی مانگ ہو سکتی ہے۔ سلاکے میں ساڑھے سات ہزار ایکڑ پر تاریکی کی کاشت ہوتی تھی، سلاکے میں دس لکھ تھی۔ عرب کے لوگ پھلوں کا ”گرڈنگ“ ان کا پیکنگ اور شہنگ نہیں جانتے تھے،

فلسطین کی زمین غلے کی کاشت کے لئے غیر موزوں ہے مگر یہودی کی طرح عرب کو بھی پیٹ تو بھڑا لیکن وہ اس میں بھی ترقی نہیں کر سکتا کیونکہ تو گہرا ہل چلاتا ہے نہ اچھا بیج میسر ہے اور نہ کھاد دینا چونکہ یہودی کاشتکار کے ذہن و دماغ پر قدیم روایات کا بوجھ نہ تھا، وہ وسیع پیمانے پر شیشہ کا استعمال کر کے، بدل بدل کر فصلیں پیدا کر کے، عمدہ بیج ڈال کر اور کھاد کے استعمال سے چھوٹے رقبے میں زیادہ پیداوار کر لیتا ہے۔ ان دونوں میں فرق ظاہر ہے، ایک لکڑی کا دقیا نویں ہل چلاتا — دوسرا فولادی ہل استعمال کرتا ہے، ایک بیل سے کام لیتا ہے دوسرا ٹریکٹر سے!

عہد توراتہ و انجیل میں فلسطین کی سر زمین پر شہد کی نہریں بہتی تھیں مگر درمیان کی صدیوں میں سوتے سوتے گئے، آج اس زمانے کو پھر سے زندہ کیا جا رہا ہے، ششہ میں یہودی کاشتکار نے چھبیس ہزار چھتے ہل کر ساڑھے بارہ لاکھ پونڈ شہد پیدا کیا تھا۔ قوم اسرائیل نے تہیہ کر لیا ہے کہ سر زمین فلسطین کے ہر ذریعے کو ترقی دیکر پورا فائدہ اٹھایا جا۔ اسی مقصد سے اب وہاں مچھلی کی پیداوار بھی بڑھائی جا رہی ہے۔ جیل کے سمندر میں ششہ سے مچھا کی پرورش شروع ہوئی، مگر اب بحر روم سے بھی مچھلی پکڑی جا رہی ہے۔ اندرون ملک کی مچھلیوں مچھلیاں پرورش پا رہی ہیں۔

ایک نسل کی مدت میں یہودی جاگیرین نے ارض مقدس کو پورے مشرق وسطیٰ میں سب سے زرخیز علاقہ بنا دیا ہے، ہجر زمینوں سے دو دو تین تین فصلیں لے رہے ہیں۔ زمین کو یہ نئی زندگی ملی ہے جب ان نوآبادکاروں نے اپنی جانیں کھپا دی ہیں، وباؤں سے جنگ کرنے میں جانوں کی قربانی دی ہیں۔

عربوں اور یہودیوں میں کیسی بھی عداوت ہو مگر یہودی نوآبادکاروں کا زوں کا یہ کارنامہ ایک حقیقت ہے، مشرق وسطیٰ میں ان لوگوں نے تاریخ کو پلٹ دیا ہے! ان کے اس کارنامہ سے عربوں کو کم پہونچا ہے۔ اور یہ کارنامہ انھوں نے فلسطین میں کر دکھایا ہے، وہی عراق، سعودی عرب، ایران اور بھی دکھایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ کوئی طاقت رونما ہو کہ مسلمانوں کی کابی اور جہالت کی دیوار کو ڈھا اور مسلم فلاح کی تخلیقی قوت برسر عمل ہو جائے!

میں عرب طلبہ سے امریکہ اور دوسرے ملکوں میں ملا ہوں، میں نے مسلم ملکوں میں سیاحت کر کے جوانوں کی باتیں سنی ہیں اور ان کے دلوں اور آرزوؤں سے متاثر ہوا ہوں۔ عرب طالب علم غیر ملکی فارغ التحصیل ہو کر جب اپنے وطن پہنچیں تو ان کو ”درکان نمک“ ہو جانے سے بچانے کی ضرورت

نوجوان علم و فن کی آرزو رکھتے ہیں ان کو حصول فن کے لئے غیر ملکوں میں بھیجنے کی ضرورت ہے، اور جو ملک یا یورپ نہیں جاسکتے انھیں فلسطین بھیجا جاسکتا ہے جہاں سے واپسی پر یہ نوجوان اپنے ملکوں کو فلسطین کی طرح شاداب و زرخیز بنا سکیں گے، اپنے عوام کی تخلیقی قوتوں کو ہمیز دے سکیں گے عرب ملکوں کی نئی نسل کے لئے بہترین تعلیم و تجربہ گاہ ثابت ہو سکتی ہے، وہ وہاں نظریاتی اور عملی طور پر سائنسی ایتھوں سے زمین کو زرخیز بنانا سیکھ سکیں گے۔ فلسطین کی امداد باہمی کے اصول پر بنی ہوئی بستیاں یورپ کے تعلیم یافتہ یہودیوں کو اگر ماہر کاشتکار بنا سکتی ہیں تو عرب نوجوانوں کو بھی بنا سکتی ہیں۔

میں دقتوں سے بے خبر نہیں ہوں، اس میں عملی مشکلیں ہیں، کلچری رکاوٹیں ہیں، اور ڈپلومیٹک دشواریاں۔ لیکن یہ دشواریاں دور ہو سکتی ہیں بشرطیکہ دونوں طرف کے لیڈر انھیں دور کرنے کا ارادہ کر لیں۔ ان دشواریوں کو دور کرنے میں غیر ملکی ڈپلومیٹ اگر یہود و عرب کی عداوت کو بڑھانے کے بدلے سے کم کرنے میں لگ جائیں تو فلسطین میں مسلم نوجوانوں کو تعلیم کی بڑی آسانیاں مل سکتی ہیں۔ اور تمام علم مالک کی اقتصادی و معاشی دشواریاں دور ہو سکتی ہیں۔

یہود و عرب کی باہمی کشاکش کے متعلق برطانوی رائل کمیشن کی رپورٹ کا مندرجہ ذیل اقتباس روتوجہ سے پڑھنے کے قابل ہے:-

(۱) "فلسطین میں یہودی سرمایے کی درآمد نے پورے ملک کی بحالی پر اثر ڈالا ہے۔

(۲) عربوں کی سٹرس پیداوار میں جو غیر معمولی ترقی ہوئی اس کا باعث یہودی سرمایے کی درآمد ہے۔

(۳) یہودی کاشت کی ترقی عرب کاشت کو اور خاص کر سٹرس کی کاشت کو ہمیز دے رہی ہے

(۴) یہودیوں کی صنعتی و زرعی ترقی نے بہت سے عرب مزدوروں کو روزگار فراہم کیا اور شہروں بالخصوص پندرگاہوں کی ترقی کا باعث ہوئی۔

(۵) ہجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے اور بیماریوں کو دفع کرنے میں کامیاب ہو کر یہودی نوآبادکاروں نے عربوں کو بھی فائدہ پہنچایا ہے۔

(۶) "نیشنل (یہودی) ہوم" کے فنڈ نے رفاہ عام کے لئے جو ادارے قائم کئے وہ اداروں

نے عرب آبادی کی بھی اتنی ہی خدمت کی جتنی یہودیوں کی۔ عداوت کے اسپتال میں

عرب مریضوں کا علاج بھی پوری دانت کے ساتھ ہوتا ہے، صفادے دق کے اسپتال

میں اور ریڈ کراس لاجی اسٹی ٹیوٹ میں عرب مریض بھی بھرتی کئے جاتے ہیں۔ وہاں بیماریوں

پندرھواں باب

(مشکلات کا لشکر)

تل عقیق پہنچنے سے پہلے ہستادروت کا نام میں نے سنا بھی نہ تھا۔ یہ نام ہے فلسطین کی یہودی ٹریڈ یونین) کا۔ لیکن یہ ایک ایسی جماعت کا نام ہے کہ تل عقیق پہنچ کر ناممکن ہے کہ کوئی اس سے بغیر رہے۔ اس سے بے خبر رہنا گویا بحرِ روم کے وجود سے بے خبر رہنا ہے۔ میں جہاں جاتا تھا ہستادروت کی علامتیں اس طرح سامنے آتی تھیں جیسے بحرِ روم کی لہریں۔

مزدور تنظیم کی یہ نوعیت دیکھنا کیا تصور میں آنے والی بات بھی نہ تھی۔ اس مزدور تنظیم نے اپنے سر جس قدر ذمہ داریاں لی ہیں اور جو تخلیقی اسپرٹ دکھائی ہے اور اس اسپرٹ کا جو کامیاب عمل ہوا ہے اس کی مثال کہیں دنیا میں نہیں ملتی۔

یہ جماعت جس کا نام ہستادروت ہے مزدور جماعت بھی ہے اور سرمایہ داری ادارہ بھی۔ یہ یقوت دونوں کی نمائندہ ہے۔ وہ فلسطین میں سب سے زیادہ مزدوروں سے کام لینے والا کارخانہ دار ہے مگر مزدور مفاد کا محافظ بھی ہے۔ اس ادارے کی بہت سی فیکٹریاں اور کارخانے چل رہے ہیں اور تجارت و صنعت کی ترقی کے خیال سے بہت سی فیکٹریوں اور ملوں میں حصہ دار بھی ہے۔ دوسرے کارخانہ داروں سے تعاون کر کے ہستادروت نے شہر بیر شیبہ کی تعلیم کے لئے ایک فنڈ اکٹھا کر لیا ہے جہاں دس ہزار کی آبادی ہے۔ سینٹرل ٹریڈ اینڈ انوسٹمنٹ کمپنی کی شرکت میں، ہستادروت نے جتد کے اندر ایک سینٹ فیکٹری قائم کی ہے۔ فنی شن کانچ کا کارخانہ فیل ہو چکا تھا، ہستادروت نے اس کے مالک سے خرید لیا اور مزید سرمایہ لگا کر اسے بالکل جدید سائنسی طریقے پر پہلایا۔ آج شیشے کی چادریں بنانے کا یہ بہترین کارخانہ ہے۔ تعمیرات کا کام بھی بہت بڑے پیمانے پر جاری ہے اور مشینوں سے جوتا، اینٹ، صابن، تیل اور کاسمیٹک وغیرہ بنانے کی فیکٹریاں بھی کام کر رہی ہیں۔

استاد روت، نجی ملکیت کے حق میں بھی ہے وہ پیداوار بڑھاتا ہے تو اس کی تقسیم بھی صحیح کرتا ہے، خدمت کرتا ہے تو جذبہ مسابقت بھی پیدا کرتا ہے، وہ عام تاجروں کی طرح اپنے حریف تاجر کو نقصان بھی پہنچا دیتا ہے اور اسے گمراہ کر کے نکل بھی جاتا ہے۔ اس نے کارخانہ دار اور تاجر کی حیثیت سے جو وقار و رسوخ حاصل کیا ہے وہ حقیقتاً ستارہ قری فراست اور ہوش مندی کا بہترین مظاہرہ ہے، سامان طیار کرنے اور اس کی تقسیم کرنے والے کی حیثیت سے استاد روت کی طاقت بے حد بڑھ گئی ہے، اسی وجہ سے اس کے حرکت و عمل کی بھی حد نہیں رہی ہے۔ وہ مہاجن اور بینکر بھی ہے اور بچت کرا کے ڈیپازٹ کرنے اور قرضے دینے کی متعدد سوسائٹیاں بھی اس نے جاری کر رکھی ہیں۔ اس کے کئی چھاپے خانے بھی ہیں اور اسکے متعدد اخبار، رسالے اور پمفلٹ بھی ہیں۔ چھوٹے بچوں کے لئے، لڑکوں کے لئے اور بالغوں کے لئے اسکول کھول رکھے ہیں، تکنیکی تعلیم کا بھی انسٹیٹیوٹ جاری ہے۔ تل عقیق میں اس کا اپنا تعمیر ہے جہاں ہر قسم کے ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔ وہ اسپورٹس (کھیل) کی بھی ہمت افزائی کرتا ہے۔ ”یہودی ایجنسی“ کے تعاون سے اس نے ایک ٹریننگ اسکول جہازیوں کی تعلیم کے لئے کھول رکھا ہے۔ دوسرا ہوا بازی کا اسکول چلا رہی ہے۔ ایک کارخانہ جہاز بنانے اور مرمت کرنے کا بھی چلا رہی ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کے لئے اس نے چھوٹے چھوٹے جہاز خود بنوائے ہیں۔ کاشت کی مشینیں بنانے، چمڑہ رنگنے، ربڑ کا سامان طیار کرنے اور کپڑے کی انڈسٹری میں اسے خاص امتیاز حاصل ہے۔ چوری، آگ، زلزلہ، زندگی اور حادثہ وغیرہ کا بیمہ بھی کرتا ہے فلسطین کے بائیس فیصدی مزدور، استاد روت کے کارخانوں اور فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں۔ فلسطین میں جتنا سا تجارت بتا ہے اس کا پانچواں حصہ استاد روت کی فیکٹریوں کا بنا ہوتا ہے۔

دنیا کے اور ملکوں میں ایسی مزدوروں کے داخلے پر پابندیاں ہیں، مزدور تحریکیں اس کی مخالفت کرتی ہیں، مگر یہ مزدور تنظیم ایسی ہے جو نئے آنے والوں کا خیر مقدم کرتی ہے۔ نئے مزدوروں کے فلسطین میں آنے سے نہ تو وہاں کے پُرانے مزدوروں کی شرح مزدوری میں کمی آتی ہے، نہ ان کی اجتماعی طاقت میں کمزوری ہوتی ہے نہ بیروزگاری بھیلتی ہے۔

دنیا بھر کی ٹریڈ یونینیں کیونزیم کی طاقت ہیں اور اس طرح طبقاتی جنگ بھیلتی بڑھتی ہے مگر استاد روت ایک ایسی مزدور تنظیم ہے جو کیونزیم کی موت ہے! استاد روت کے سب سے بڑے اور زیادہ کھٹنے والے اخبار کا موٹو ”آزادی خیال و اتحاد عمل“ ہے۔ اس طرح تنظیم مغربی ملکوں کی مزدور تحریکوں سے بھی مختلف ہے استاد روت اپنے مقصد و مدعا کے تحت اپنی ذمہ داری بڑھانے سے گھبراتا نہیں، اسی طرح وہ اپنے ممبر بڑھانے میں بھی حوصلہ مند ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ ”تمام لوگ اپنی محنت کی کمائی سے پورا نایاب اٹھائیں

اور کوئی شخص دوسرے کی محنت سے فائدہ اٹھانے نہ پائے؟

اسی لئے ہستادروت کی ممبری سب کے لئے کھلی ہوئی ہے۔ ہات پاؤں کے مزدور، پولس میں، کسان، کلاڑی، ڈاکٹر، وکیل اور صنایع سب اس کے ممبر ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ البتہ جو کسان مزدور لگا کر کاشت کرتا ہے وہ اس کا ممبر نہیں بن سکتا۔

یہ ادارہ سلسلہ میں قائم ہوا اس وقت اس کے ممبر ساڑھے چار ہزار سے بھی کم تھے مگر بڑھتے بڑھتے آج پورے دو لاکھ سے کچھ زیادہ ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے اس کے ممبروں کے اعداد و شمار یہ ہیں:-

اپنی زمین پر کاشت کرنے والے ۲۴ فیصدی

کھیت مزدور ۳

ٹیچر، ڈاکٹر، وکیل وغیرہ ۶

پولس میں ۳

یہ ایسے مختلف و متضاد پیشے کے لوگوں کا اجتماع ہے کہ اس کو نہ پروتھار یہ جماعت کہا جاسکتا ہے نہ درمیانی طبقے کا ادارہ۔ وہ ان دونوں کا مجموعہ ہے۔ الغرض ہستادروت سب کچھ ہے، بیگرے، سلیس مین ہے، اسپورٹر و امپورٹر ہے، تھوک فروش، خوردہ فروش ہے، سرمایہ دار و مزدور ہے، اس کی حرکت و عمل کا دائرہ سرچکرا دیتا ہے اور اس کی طاقت اور شوکت کو دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔

فلسطین میں حالات کچھ ایسے عجیب و غریب تھے کہ ہستادروت کے وجود میں آئے بغیر کام بھی نہ چلتا۔ یہی وجہ ہے کہ مزدور تنظیم ہونے کے باوجود ہستادروت دنیا کے اور تمام مزدور اداروں سے مختلف ہے اس تنظیم کا کام مزدوروں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دینا ہی نہ تھا، اس کا مقصد یہودی شخصیت کو نئے سانچے میں ڈھالتا بھی تھا۔ یہودیوں میں وہ اوصاف پیدا کرنا تھا جو دو ہزار سال کی آوارہ گردی میں وہ کھو چکے تھے۔ ہستادروت کے ساتھ دوسرے یہودی اداروں نے بھی ہاتھ بٹایا۔ اس ادارے کے ایک ذریعہ آدمی سے میں نے سوال کیا کہ کیا وہ ایک فقرے میں ہستادروت کے مقاصد بیان کر سکتا ہے تو اس نے اقرار کیا اور بتایا:-

یہودیوں میں فلسطینیت *Palestination* پیدا کرنا:-

اس کا یہ لفظ میرے لئے ویسا ہی ناقابل فہم تھا جیسا لفظ ہستادروت۔ میرے لئے یہ اصطلاح *Tudism* اور *zionism* سے زیادہ دلچسپ تھی۔

فلسطین میں متعدد یہودی ادارے کام کر رہے ہیں جن کا مقصد و مدعا ایک نئی قومی تعمیر ہے ہستادروت

بھی اسی مقصد کے لئے وقت ہے، مگر اس کا دائرہ عمل وسیع ہے اس کے کارگزاروں نے سمجھ لیا ہے کہ مختلف ملکوں کے یہودیوں کو فلسطین میں پناہ دینا اور بسا دینا کافی ہوگا بلکہ خطرناک بھی ہوگا! یہ نیا یہودی سماج اگر درمیانی طبقے کے لوگوں سے بنتا ہے جس میں دوکاندار، وکیل اور دوسرے پیشوں کے آدمی ہوں تو یہودی وطن (HOMELAND) کی توہین ہوگا۔ ہٹلر وروت اس لئے یہودی قوم کے اندر سے GHETTO ذہنیت کو فنا کر دینا چاہتا ہے، اس سماجی متغیر اور گھمنڈ کو مٹا دینا چاہتا ہے جو مختلف ملکوں کے یہودیوں میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کا منشاء و مقصد یہ ہے کہ اس قوم کے اندر فطرت اور آرائشی سے وہی لگن پیدا ہو جائے جو ان کے آباء و اجداد میں اس وقت تک پائی جاتی تھی جب فلسطین کے پاکستان آباد تھے اور زراعت شاداب تھی۔ آر وٹ، ڈبوڈ، گارڈن یہودی احمائے ثانی کا بڑا مبلغ تھا، لکھتا ہے :-

”وہ قوم جو فطری یعنی خود شعوری، خود کفنی زندگی کے علاوہ کسی دوسرے قسم کی زندگی کی مادی پہچان ہے، ایسی قوم کبھی جفاکش نہیں بن سکتی اور قہراً وہ اپنے ارادے اور عزم کو اسی مقصد کے لئے وقف کر دے! محنت و مشقت بعض سبب نہیں ہے جو انسان اور زمین کے درمیان رابطہ اور حق قائم کرتا ہے بلکہ وہ سب سے بڑی قوت ہے جو ایک تمدن کو بچانے کے لئے درکار ہوتی ہے، محنت انسانی مستقبل کے لئے بدترین تصویر اور عقیدہ ہے، ایسی عینیت ہے جیسے آفتاب کی معالجہ نوعیت!“

فلسطین کے مہاجر یہودی جس ملک کے بھی ہوں، جو مادی مشقت کو سماجی کمتری کی دلیل سمجھتے تھے، محنت کا لفظ سماجی تحقیر کا مفہوم ادا کرتا تھا۔ اس لئے ان کو محنت و مشقت کا اعزاز و مرتبہ سمجھانے کے لئے کمرہ تعلیم کی ضرورت تھی۔ کتاب و قلم ہی تنہا تہذیب و تمدن کی علامت نہیں، بلکہ کدال، ہتھوڑا، پھاؤڑا اور ہل بھی اسی طرح تہذیب و تمدن کے نشانات ہیں۔ یہ سارے مہاجر یہودی اگر دوکاندار، ڈاکٹر اور وکیل بن گئے اور کچھ زمیندار پیدا ہو گئے تو یہودی وطن کا کوئی مستقبل نہ ہوگا۔ ہٹلر وروت زمینداری کے اداسے کو سامنت شاہی کی علامت سمجھتا اور اس سے سخت بیزار ہے۔ وہ کہتے عرب مزدوروں پر یہودی کاشت کو منحصر کرنے کے سخت خلاف ہے اس کا مقصد ہے کہ یہودی اپنی زمینوں پر خود کاشت کریں۔ یہودی دوکاندار یہودی وکیل، یہودی پروفیسر، یہودی ڈاکٹر، یہودی کارخانہ دار، یہودی ماں باپ سب محنت پسند نجائیں وہ فلسطین کو صنایع و سائنسداں تاجروں مالک، کالک نہیں بلکہ مستر یوں، مچھیروں، کسانوں، مزدوروں اور بوجہ اٹھانے والوں اور ایشیٹیں تھوپنے والوں کا ملک بنانا چاہتا ہے۔ لگاؤ کے ساتھ زمین پر محنت

کر کے اور ہرا گئے اور کچے والی چیز سے محبت کر کے اسے ایسا مقدس و معزز بنا دیا جائے جیسی وہ عہد قدیم میں تھی۔ ہتساروت جنگلیں کسان پیدا کرنا نہیں چاہتا بلکہ مسکین اور ادنیٰ کسان بنانا چاہتا ہے اور یہ کوئی انجیل کا اہام نہیں بلکہ وقت کی وہ فوری ضرورت ہے جو انجیل کے الفاظ کو نیا مفہوم دیتی ہے۔ ان وجوہ پر ہتساروت سمجھتا ہے کہ اس کا فرض یہی نہیں ہے کہ مزدوروں کی معمولی اور راہی مانگوں کی حمایت کر کے انہیں پروا کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ غیر شقتی یہودی کو محنت کش بنادے۔ محنت سے محبت کرنا سکھائے۔ ہتساروت کا بہت سا لٹریچر جب میں نے مطالعہ کیا تو مجھ پر ”محنت کی فتح“ کا مفہوم واضح ہوا۔ اور میں سمجھا کہ ”فلسطینیت“ یہودیوں نے ذہن و مزاج کو کس طرح بدل رہی ہے۔

برطانیہ کی ابتدائی حکومت اٹھائیس سال فلسطین میں قائم رہی، اس مدت میں اگر وہ وہاں کی سماجی اصلاح مخلصانہ طور پر اتنی بھی کرنا چاہتی جتنی خود انگلینڈ میں کنسر ویٹو حکومت نے کی تو ہتساروت ایسا زبردست ادارہ کہنی نہ بن سکتا جیسا کہ وہ آج ہے۔ برطانیہ کا سامراجی داغ فلسطین میں بھی اتنا ہی غیر جواب دہ تھا جتنا دوسرے مقبوضات میں۔ سماجی رجحانات سے متعلق اس نے ہر جگہ دیسی حکمرانوں کو کم سے کم زحمت دی اور محنت کش عوام کی کم سے کم مدد کی ہے۔ فلسطین میں ابتدائی حکومت نے جو ”لیبرل“ بنایا وہ کسی ایسے تحفظی قانون سے تو بہت بہتر تھا جس سے عرب مزدور و اتھ تھے مگر اس بدرجہا ادنیٰ تھا جو کنسر ویٹو حکومت خود انگلستان میں جاری کر سکی تھی۔ اس حکومت نے فلسطین میں یہ حکم تو بلا تامل جاری کر دیا کہ دیا سلائی بنانے میں سفید فاسفورس استعمال نہ کیا جائے مگر عرب لوگ اپنی کم عمر بچیوں کو ادنیٰ قسم کی خدمت پر نوکر کرنے کے جو معاہدے کر کے کچھ رقم وصول کر لیا کرتے تھے اس رواج کو موقوف نہ کیا۔ بڑی اصلاح یہ کی تھی کہ سال بھر سے زیادہ کا معاہدہ غیر قانونی ہوگا۔

ہتساروت نے اگر مزدور کے حقوق کی حفاظت کے لئے جدوجہد نہ کی ہوتی تو فلسطین ہمیشہ سستی مزدوری کی منڈی بنا رہتا۔ اس نے ایک طرف مزدور کے حقوق قائم کرائے اور دوسری طرف عہدہ مزدوروں کو محنت پسند بنایا۔ اس طرح اس نے وہ ذمہ داریاں اپنے سر لیں جو حکومتوں کو لینا چاہئے تھیں اور فلسطین کی ابتدائی حکومت اسے پورا نہیں کر رہی تھی۔ مزدور کو پسند نصیبت کرنا بے نتیجہ ہے۔ اگر اسے یقین نہ دلایا جائے کہ اس کی محنت کا مناسب معاوضہ بھی ملے گا۔ اس نظریہ کے تحت ہتساروت نے رفاہ و اصلاح کا ایک ایسا پروگرام بنایا جو مغربی ملکوں میں بھی جاری نہ کیا جاسکا تھا۔ ہتساروت اپنے تمام مزدوروں کی جان، تندرستی، حادثہ، بیماری، ضعیفی اور بے روزگاری کا بیمہ کرتی ہے اور بیواؤں، یتیموں کو پیشین بھی دیتی ہے۔ زچہ کی حفاظت اور بچے کی خبر گیری اس بیمے کا خاص پہلو ہے۔ اس کا سب سے

”ہتم ہاشان کام“ ”بیار فٹڈ“ ہے، جس کی شاخیں اور ادارے سارے فلسطین میں پھیلے ہوئے ہیں جہاں جہاں یہودی کاٹت کی نوآبادی ہے وہاں ہتادروت کا طبی امداد کا انتظام بھی ضرور ہے اس نے جو ادارے قائم کئے ہیں، ان کی تعداد ذیل میں درج ہے :-

۶	اسپتال
۴	بعد صحت آرام گاہیں
۸	مرکزی دوا خانے
۳۱۵	دیہاتی ڈسپنسریاں
۷	ایکمرے انسی ٹیوٹ
۱	مرکزی فارماسیوٹیکل ڈپو
۱۶۱	فارمیسیاں
۲۷	دانت کے کلینک
۳۰	الکٹرو تمیرانی انسی ٹیوٹ
۱	بچوں کی خبر گیری کا سینٹر ڈیٹا کنٹ آف ہائی میں

ان تمام ممبروں کے علاوہ ہتادروت غیر ممبروں کو بھی طبی امداد پہنچاتا ہے اور زچہ کی خبر گیری کا خاص انتظام ہے۔ اس کام کے لئے اس نے تمام کارخانہ داروں سے وہ جتنی مزدوری سال بھر میں ادا کرتے تھے اس کا تین فیصد وصول کیا اور اسے اپنے ممبروں سے سات بلکہ گیارہ فیصد تک وصول کیا اور یہ سارے کام جاری کئے۔ اس فٹڈ میں انتدابی حکومت اور دوسرے یہودی اداروں نے بھی چند دیا۔ بعض طبی اسکیموں میں عرب مزدور بھی شامل ہیں۔ عرب مزدوروں کو ہتادروت پوری طرح شامل کر لیتا مگر باہمی مفاد بڑا مانع تھا۔ اس لئے اس نے فلسطین لیبر لیگ قائم کرائی جس میں دونوں قوموں کے مزدور اپنی آزاد مزدور جماعتوں کو خود مختار رکھتے ہوئے بعض مفاد کے لئے ایک پلیٹ فام پر جمع ہو سکیں۔ اس لیگ کا کام عربی و عبرانی دونوں زبانوں میں ہو سکتا تھا۔ اس لیگ کے پانچ ہزار سے زیادہ ممبر بنے اور سیاسی نزاکتوں کی بنا پر اپنا مقصد حاصل نہ کر سکی۔

دنیا بھر میں کوئی انسان طبی امداد سے اتنا محروم نہیں جتنا وہ عرب کسان جو شہر وں سے فاصلے پر آباد ہے۔ ہتادروت کی طبی تنظیم ان عرب کسانوں کی خدمت کرتی ہے۔ دو ہزار پانچ سو سے کچھ زیادہ ڈاکٹر وکریں۔ ان میں دو سو سے اوپر عرب ہیں اور سوسو غیر عرب عیسائی باقی سب یہودی ہیں۔ لیبر لیگ

اپنے عرب ممبروں کو طبی امداد پہنچاتی ہے۔ وسیع پیمانے پر طبی امداد کا انتظام ہسپتالوں کی حرکت و عمل کا صرف ایک پہلو ہے، ورنہ اس کی خدمات مختلف نوعیت کی ہیں۔ جسمانی اور کلچری ترقی و بہبود کی خاطر متعدد تجارتی ادارے قائم ہیں۔ تعلیم گاہوں کے علاوہ کھیل کے میدان، تھیٹر اور اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں۔

ہسپتالوں کی امداد نہ ہوتی تو غواط برنیر آباد نہ ہو سکتا اور آہ و سہی ہو جاتا تو اتنا خوشحال و کامیاب نہ ہوتا۔

ہسپتالوں کے مہاجری ادارے تنہا اور غور و فکر کی کوآپریٹو سوسائٹیاں اور فیکٹریاں سب نوآبادکاروں کی بحالی و ترقی کے لئے اور ہر وقت ان کی خدمت کے لئے آمادہ ہیں۔ فلسطینی ساخت کے اوتار آلات۔ درآمد کی ہوئی مشینیں، فنی جراید، ہوشیار مستری، کاشت کے ماہر، اور دوسری بہت سی چیزیں نوآبادکاروں کی خدمت کے لئے اسی طرح قابل حصول ہیں جس طرح طبی امداد۔ فلسطین میں دوسو کے قریب امداد باہمی اور چھوٹے کاشتکاری کے گاؤں ایسے ہیں جو ہسپتالوں کی امداد کے بغیر آباد نہ ہو سکتے تھے۔

یہودی قوم میں مخصوص ذہن و دماغ کا کاشتکار طبقہ پیدا کر دینا اسی عظیم انسان ادارے کا کام تھا۔ اس کے تمام کام پہلے سے سوچے سمجھے پلان کے مطابق انجام پاتے ہیں اور ان اسکیموں اور پلانوں کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کاشتکار کاشت کو کامیاب بنانے کی فکر کے سوا ہر فکر سے آزاد ہو۔ چنانچہ اس ادارے کی مدد اور ہدایت کے بموجب نو جوان یہودی مرد اور عورتوں کی ایک جماعت بحر مردہ کے ساحل پر پہنچی جہاں صدیوں سے کسی قسم کی روئیدگی کا وجود نہ تھا کیونکہ زمین میں تیزابی مادہ تھا، ان نو جوانوں نے بالآخر اس زمین کو کار آمد بنالیا اور وہاں بیت حارہ کے نام سے ایک خوشحال گاؤں آباد ہو گیا۔ لیکن ۱۹۴۷ء کی جنگ میں وہ گاؤں عرب فوجوں نے پامال کر دیا۔

یہ ادارہ مسلسل و متواتر نئی زمینیں دستیاب کرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اسے نفیث کے علاقہ پر توجہ کی۔ یہ علاقہ جنوبی فلسطین میں کوئی تیس لاکھ ایکڑ زمین کا ایک مثلث ٹکڑا ہے۔ پانی کی قلت تھی اور روئیدگی کا صرف ایک کنارے پر وجود تھا وہاں بدوسی لوگ سیاہ ڈیرے جائے اپنے گھروں کو چراتے تھے اور اگر پانی برس جاتا تو گڑبھوں میں پانی جمع کر کے کچھ کاشت بھی کر لیتے تھے۔ حالانکہ کسی وقت یہ علاقہ ایک تھکن کا مرکز رہ چکا تھا۔ اس علاقے کو شاداب بنانے کے لئے ہسپتالوں نے تین ہمیں جدا جدا روانہ کیے تاکہ زمین، آب و ہوا اور پانی کی تلاش کر کے رپورٹ دیں۔ ۱۹۴۷ء تک اس علاقہ میں چودہ گاؤں آباد ہو گئے۔

اکیس اور آباد کرنے کی اسکیم تھی۔ ۱۹۴۸ء میں یہ علاقہ جنگ کا میدان بنا رہا۔ کاشت کی ترقی کے ساتھ ہستادروٹ نے گھریلو صنعتوں کو بڑھانے میں بھی بہت بڑا کام کیا ہے۔ شکل

سے کوئی کاشتکار آبادی ایسی ہوگی جہاں اچھے بڑے پیانے پر گھریلو صنعتیں نہ چل رہی ہوں۔ مواد باہمی کے اصول پر پورے فلسطین میں عمل کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہستادروٹ نے کسی سیاسی نظریے کو قبول نہیں کیا ہے۔ اور یہی بات اس کی طاقت و اثر کا راز ہے۔ من حیث الجماعت ہستادروٹ کا بچان سوشلسٹ ہے لیکن وہ کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں اس کی چھٹی جنرل کنونشن ہوئی تو فلسطین کی بچپن سیاسی پارٹیوں میں سے دس پارٹیوں کے لوگ اس کنونشن میں شریک تھے۔ سرچند ہستادروٹ یا لیبر پارٹی اس ادارے میں اکثریت رکھتی ہے مگر ادارے کے کاموں میں سیاسی عقاید کا اختلاف کبھی محفل نہیں ہوا۔ یہ ادارہ سوشل ڈیا کریٹ سے بہت قریب ہے۔

روس کی حالیہ پالیسی نے کیونسٹوں کو فلسطین میں نامقبول بنا دیا ہے، لیکن سخت اختلاف کے باوجود وہاں باہمی عناد نہیں پایا جاتا۔

ہستادروٹ کی بڑی خصوصیت اس کی کاروباری ذہنیت رکھنا اور اس کا عملی ہونا ہے۔ ممبروں کی تعداد بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کی مالی طاقت اور سماجی وقار اتنا بڑھا ہوا ہے کہ انتدابی حکومت کے زمانہ میں اسے ”ریاست کے اندر ریاست“ سے تعبیر کیا جاتا تھا اور اس وقت یہ بات غلط بھی نہ تھی اس لئے کہ ہستادروٹ بہت سے ایسے کام کرتا ہے جو حکومت کو کرنے چاہئیں۔ اب چونکہ اسرائیلی ریاست قائم ہو گئی ہے۔ اس لئے ہستادروٹ اب بھی ریاست کے اندر ایک ریاست ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔ اور وہ اس لئے کہ خود اسرائیل کے مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا، ایک چھوٹی سی ریاست کے اندر بچپن مختلف عقاید کی سیاسی پارٹیاں کوئی نیک شگون نہیں کہا جاسکتا اسرائیل کے انتہا پسند جو انتدابی زمانے میں دہشت انگیزی پھیلاتے رہے، اب اکھنڈ فلسطین چاہتے ہیں۔ اور ان کی طاقت و اثر سے افکار نہیں کیا جاسکتا۔ میرے خیال کے مطابق یہ جماعت یہودی قومی اتحاد کے لئے خطرہ ہے۔ کیونکہ اکھنڈ فلسطین کے تصور میں اگر اس جماعت کو کامیابی نہیں ہوئی تو وہ خود اسرائیل کے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے جو اسرائیل کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں اس ذیل میں ہستادروٹ کا اثر و رسوخ ہی توازن کی برقرار رکھ سکتا ہے۔

سولھواں باب

(بیداری یا تباہی)

بالآخر میں واپس سوئٹزرلینڈ پہنچ گیا۔ جینوا کا موسم گندہ تھا مگر اس کی سٹھرائی اور صفائی چمکتی معلوم ہوتی تھی، مشرق وسطیٰ کے شہروں کے مقابلہ میں جینوا ایک نئی چیز معلوم ہو رہا تھا۔ اسل میں یہاں تمدن اپنی ابتدائی منزلیں طے کر رہا ہے اور اینٹ پر اینٹ جن کر ایک ذیشان عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ جینوا میں قاہرہ کی سی شان و شوکت اور افلاس و اراض کی انتہا دونوں مفقود ہیں۔

خیالات کو ایک مرکز پر لانے کے لئے جینوا بہت مناسب مقام ہے۔ میں نے اپنی یادداشتیں نکالیں اور وہ سب کتابیں بھی جو میں نے دورانِ سیاحت میں خریدی تھیں اور وہ لٹریچر بھی جو مجھے وزارت خارجہ کے دفاتروں سے ملا تھا۔ میں ان سب پر غور کرنے لگا۔

جسوقت میں اپنی نوٹ بک کو پڑھ رہا تھا تو ان میں لطفت و رافت، ترحم و ہمدردی کی تمام باتیں ڈیوٹ جوتوں کی منہ کی نہیں بلکہ مشنری پادریوں کی کہی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ولیم لام اور ڈاکٹر ولیم شارب سے میری ملاقاتیں مہول جانے والی چیز تھیں، یہ دونوں تصنیع سے پاک اور اپنے حلقہ عمل کی ممتاز ہستیاں تھیں، ایران کے لوگوں سے ان کے تعلقات جس نوعیت کے تھے وہ بلاشبہ بڑے محرک و سبق آموز تھے۔ ڈیوٹ جوتے اور پاور پالیٹکس سے یہ دونوں انسان بہت اونچے اور ارفع تھے۔ ان کا کام نوع انسان کی خدمت ہو ان پادریوں نے ایران میں سوال انسانیت کی اہمیت کا جیسا اندازہ کیا ہے کسی ڈیوٹ جوت یا سائنس کے ماہر نے نہیں کیا ہے۔ ان پادریوں نے کوئی اصل قوم پرست نہیں کیا لیکن بہتری کی امید منور ظاہر کی ہے۔ بہتری کس طرف سے آئے گی؟ یہ نہ ان کو معلوم ہے نہ کسی اور کو۔

جو لٹریچر میں نے دورانِ سیاحت میں خریدا اس میں لاؤڈر ملک کی کتاب

PELASINE: LAND OF PROMISE بھی تھی۔ اس میں بہت سی ایسی باتیں درج ہیں جو میرے

بدنے کی ہے۔ جن بیماریوں کو آسانی سے دفع کیا جاسکتا ہے ان سے ہمیں لاکھ بھڑپیں سہ سال مر جاتی ہیں۔
حشرات الارض کھیتی کا تقریباً تین کروڑ ڈالر سالانہ کا نقصان کر دیتے ہیں۔ حالانکہ پانچ ڈالر فی کس سالانہ
کے خرچ سے تین سال میں لمیر یا کو بالکل ختم کیا جاسکتا ہے، لیکن کوئی پروا نہیں کرتا۔

خیر تناک ماجرا ہے کہ جو ملک تیل کی پیداوار میں چوتھے نمبر پر ہو وہ قیمتی جنگل اور اس سے زیادہ
قیمتی کھاد کو ایندھن کی طرح جلا ڈالے! ایسی قوم کے متعلق کوئی کہا کر سکتا ہے!

”مصر“ باغ عالم“ کہلاتا ہے مگر تین چوتھائی آبادی جو دیہات میں رہتی ہے آنکھوں کے مرض کا اور
خارش و داد کا شکار ہے۔

شام کی تیس لاکھ کی مردم شماری میں دو تہائی کاشت کرتی ہے مگر قابل زراعت آراضی کا ساٹھ فیصد
رقبہ ایسے زمینداروں کی ملکیت ہے جو دیہات کو جھانک کر بھی نہیں دیکھتے۔ شام میں ساڑھے بارہ لاکھ
ایکڑ پر کاشت کی جاسکتی ہے مگر زیر کاشت آراضی اس کا تیسرا حصہ ہے۔ کاشتکار آب آسانی بے دخل کیا
جاسکتا ہے، اس لئے وہ زمین پر محنت کیوں کرے؟

عراق پنڈتالیس لاکھ انسانوں کا ملک ہے۔ وہاں بھی قابل کاشت زمین پر صرف بیس فیصدی
زراعت ہوتی ہے۔ برطانوی سائنسدانوں نے عراق کی کاشت اور آبرسانی کو کافی ترقی دی ہے لیکن
کاشت چونکہ بٹائی پر ہوتی ہے اس لئے کوئی معقول فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔

سورال کے قریب ہوئے جب روسی طنز نگار سالتی کوٹ شجیدہ بین نے روسی کسان کی ہر باد
حالت پر غصہ کرتے ہوئے لکھا تھا:-

”ہمارے کسان چمڑے کے بدلے لکڑی لے جاتے کیوں پہنتے ہیں؟ گوشت کی غذا انکے لئے

نامکن کیوں ہے؟ انھیں مکھن یا چربی کیوں میسر نہیں؟ وہ فقیر پرست کیوں ہیں؟ اور

ان کا ضمیر کیوں مردہ ہو گیا ہے؟ وہ کیوں کپڑوں کی طرح پیدا ہوتے اور کیوں کھیدوں کی طرح

مر جاتے ہیں؟“

یہی سوال عرب ملکوں میں، ان کے فلاح کے متعلق دہرائے جاسکتے ہیں۔ روس میں زراعتی غلامی رائج
رہی تو روس کو اس کی قیمت بدترین ٹھونس انقلاب سے دینا پڑی۔ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کی موجودہ حالت
دیکھنے اور سمجھنے والا بھی کچھ اس طرح کا قیاس قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

میرے سامنے مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے قوم پرست نہیں بلکہ وہاں کے فلاح ہیں۔ اس کی تندرستی کی
مکالمی سب سے مقدم ہے، کیونکہ وہ موثر طریق پر فوج میں خدمت ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔

فلسطینی معرکے میں عرب سب سے بہترین اسلحہ کے باوجود ٹکنا ثابت ہوا، حالانکہ برطانوی کمانڈر کا دعویٰ تھا کہ عرب فوجیں دس دن کے اندر پورے فلسطین کو روند ڈالیں گی۔

ان ملکوں میں فوجی طاقت اس لئے مفقود ہے کہ تندرستی غائب ہے، انسانوں کا یہ جم غفیر ادنیٰ قسم کی خوشی سے بھی محروم ہے۔

ان ملکوں کا فلاح کا شکار نہیں بلکہ کھیت مزدور ہے کیونکہ زمین اس کی اپنی نہیں ہے۔ اور بے زمین والا کسان ایسا ہی ہے جیسے بغیر پانی کا پودا وہ عناصر فطرت کے تہر اور انسان کی حرص و طمع کا شکار ہے۔ وہ نہ ڈیا کریٹ ہے نہ سٹیزن، قانون بنانے میں اسے کوئی دخل نہیں مگر اس کی تعمیل پر مجبور ہے۔ وہ نہ خریدا رہے نہ تعمیر کرانے والا، کیونکہ اس کی کوئی

قوت خریداری نہیں ہے۔ اسی لئے رہ ملک کی صنعت و تجارت میں کسی قسم کی مدد نہیں پہنچا سکتا اور اس طرح قوم ملک کے اقتصاد اور کلچر پر بار ہے۔ اس کی زندگی ایسی باتوں سے خالی ہے جو ولولہ پیدا کر سکیں جو اس کی قابلیتوں کو ہر سر عمل لاسکیں۔ فلاح نہ تو زندگی میں اپنے اولاد کو کچھ دے سکتا ہے اور نہ مرنے کے بعد کوئی ورثہ چھوڑتا ہے۔ سید ضیاء الدین سابق وزیر اعظم ایران کے الفاظ ہیں :-

”بھوکے انسان کا نہ خدا ہے نہ وطن!“ ان ملکوں میں عروج قوم پرستی نے وہاں کے فلاح کو کچھ نہیں دیا۔ روٹی کی بھوک آراضی کی بھوک کا نتیجہ ہے اور اس بھوک نے دنیا میں خونیں انقلاب کر دئے ہیں۔

آئرلینڈ اور میکسیکو میں بار بار خون کی ندیاں بھی ہیں۔ چین آج بھی خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ جنوبی امریکہ کے ملکوں میں آج کل بھی انقلاب برپا ہوتے رہتے ہیں، انقلاب ہوتا ہے، ڈکٹیٹر کا قایم ہوتی ہے پھر انقلاب ہوتا ہے۔ یہ سارے انقلاب صرف اس لئے ہیں کہ زمین کو جو تنے والا زمین کا خود مالک نہیں ہے۔ اور جب تک ایسا ہے، بھوکا رہتا رہے گا۔ میرے عقیدہ ہے کہ زار روس اگر زرعی غلامی کو ختم کرنے کا حکم جاری کر دیتا تو روس میں پولشویک انقلاب ہرگز برپا نہ ہوتا۔

جان براؤٹ ایک برطانوی لبرل نے سو سال پہلے لکھا تھا کہ :-

”قانون جب اپنا فرض ادا کرنے سے انکار کر دے، حکومت جب عوام کے حقوق ادا کرنے میں

قاصر رہے، زمیندار جب آراضی کے چھوٹے ٹکڑوں پر کاشتکاروں میں ضد اور مقابلہ پیدا کر کے

نفع اٹھائے، وہاں لوگ قانون سے سرگردانی کرنے لگتے ہیں، تہذیب و تمدن کے اصول ترک

ہو جاتے ہیں اور نظری بلکہ انتقامی قانون کام کرنے لگتا ہے!“

۱۹۷۹ء میں جو تاقص سوئٹس نے آئرلینڈ کے متعلق لکھا تھا :-

”ایک تجربہ ہے کہ زمین کے ایک اپنے کاشتکاروں پر کم سے کم یہ رقم ضرور لکریں کہ ان کے بچوں کو لے لیا کریں۔ ان بچوں کا گوشت دس ٹنڈنگ

کو ضرور مل سکتا ہے، اس میں سے آٹھ ٹنڈنگ ماں کو دیا کریں تاکہ وہ سولہ بچے ہونے تک وہ اس رقم سے اپنے آپ کو کام کے قابل رکھ سکے۔“

تبع مشرق وسطیٰ کے زمیندار اسوقت کے آئرش مالکان زمین سے پیٹے نہیں ہیں۔۔۔ امریکہ اور ڈنمارک وغیرہ کی ترقیاں جہاں زمین اسکے جوتے ہوئے والے کو دیدی گئی ہے، اسی پالیسی کا نتیجہ ہیں، اور وہاں بعض خرابیاں اسی وجہ سے نہیں ہیں کہ اسان اپنی زمین کا ایک ہے۔ فلسطین کے یہودیوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ زمین خراب ہونے کے باوجود اور کسان کی کمزوری کے ہوتے ہوئے بھی ان دونوں میں لئی جان ڈالی جاسکتی ہے، اس میں شک نہیں کہ عرب فلاح کے مقابلہ میں یہودی کاشتکار کو صد قسم کی سہولتیں حاصل ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسے کاشت کو کامیاب بنانے کے سوا کوئی کام نہ تھا، ان کو عرب فلاح کی مصیبتیں برداشت نہیں کرنا پڑیں، نہ اسے باہمی مجاہدہ میں مبتلا ہونا پڑا نہ اپنے لیڈروں سے نئے طریقے اور اوزار استعمال کرنے کے لئے کشاکش کرنا پڑی۔ تاہم فلسطین کا یہودی اگر یہ سب کچھ نہ دکھاتا تو عرب دایرائی لیڈروں اور غیر ملکی ڈپلومیٹ کو ایسے یہودی پیدا کرنا پڑتے تاکہ عربوں کو بتایا جاتا کہ ”اپنی مدد آپ“ کے معنی کیا ہو سکتے ہیں! یہود و عرب کی عداوت کیسی ہی شدید ہو، یہودی آبادکاروں کے کارنامے عرب کی نجات کا موجب بن سکتے ہیں۔

بڑش ڈپلومیسی نے مشرق وسطیٰ میں جس ناروا پالیسی پر عمل کیا وہ عربوں اور یہودیوں کی بلصیبتی دشمنی ہی، برطانیہ اور دنیا کی شرمناک حماقت کا بھی ثبوت ہے۔ یہود و عرب آج ایک دوسرے کے دشمن ہیں، ان کو دوست بنانے کے لئے عقل سلیمان کی درکار تھی مگر برطانیہ کے پرے ریکارڈ میں کسی ایک کوشش کا ثبوت بھی موجود نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب میونخ کی شطرنج کھیلی جا چکی اور جمہوریتوں نے ”ہماری زندگی میں امن“ کا اعلان کیا تو میں اور دوسرے صحافی جو اس وقت پرانگ میں موجود تھے اس ڈپلومیسی کو مطلق سمجھ سکے۔ لیکن جس پاور پالیٹکس نے برطانیہ کی فلسطینی پالیسی بنوائی وہ بھی میونخ کی طرح کوتاہ اندیشی کی پالیسی تھی۔ اسرائیل آج ایک خود مختار ریاست ہے، بیرونی دنیا کے اثرات اور ریشہ دوانیوں کے باوجود اس کا فرض یہ ہے کہ عرب دنیا کا اچھا پڑوسی بنے۔ اس یہودی ریاست کے سامنے اس سے زیادہ اہم اور تاریخی کام دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہودی ریاست یہ نہیں کرتی ہے تو نہ وہ خود چین پاسے کی نہ عرب دنیا کو چین ملے گا۔ اپنے وطن امریکہ واپس پہنچ کر میں نے وہ غیر معمولی تابناکی اور فراوانی دیکھی جیسی کسی ملک میں نہ دیکھی تھی۔ باتیں اونچی آوازوں میں کی جا رہی تھیں۔ زندگی کے ہر شعبے اور میدان میں ہمارے قومی لیڈر دنیا کی جانچ کر رہے تھے، سائنسدان اسے ایٹمی بحران بتاتے ہیں سوشلسٹس کے ماہر کہتے ہیں کہ انسانی علم میں بحران آگیا ہوا ہے۔ اقتصاد کے ماہر اسے اقتصادی بحران کہہ رہے ہیں، علم النفس کے ماہر کہتے ہیں کہ ایک عالمگیر اعصابی اختلال ہے، سیاسی مدبر اسے روس کے حملہ سے تعبیر کرتے ہیں، کمیونسٹوں کا خیال ہے کہ نئے عقاید اور سرائی واری کے مابین ایک بین الاقوامی معرکہ ہے، فلسفی سمجھ رہے ہیں کہ کچھ نہیں بس خیال کے اندر بحران ہے، مذہبی پیشوا اُسے ایٹمی بحران سمجھتے ہیں، مگر ارضیات کے سمجھنے والے زمین اور آبادی کا بحران مانتے ہیں۔

ان تمام آوازوں میں سے یہ آخری پکار میرے لئے کشش رکھتی ہے۔ فیر فیلڈ آسپورن مصنف
OUR PLUNDERED PLANET اور ولیم دوگٹ ROAD TO SURVIVAL کی آوازوں
لے مجھے بہت مسحور کیا۔ یہ اور ایسے دوسرے لوگ پاور پالیٹکس سے بہت بلند ہیں۔ وہ بتا رہے ہیں کہ اگر زمین کی
گمشدگی ہوئی تو ت کا علاج نہیں کیا گیا تو انسان کے مقدر پر مہر لگی سمجھو!

مغربی ملکوں کے کاشتکار نے ان ”پیغمبروں“ کی آواز پر دھیان دینا شروع کر دیا ہے، مگر فلسطین کو
چھوڑ کر مشرق وسطیٰ کے تمام زمیندار اور لیڈر ہنوز غواب خرگوش میں ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ زمین کی نجات کسان
کی مدد ہی سے ممکن ہے، اور کسان کی مدد اسی وقت حاصل ہوگی جب اس کا معیار دھڑکی اٹکچا ہوگا۔

ایں ہمہ دنیا کے سیاست داں اور مدیر ”روسپیٹلے“ کے خلات جدوجہد کر رہے ہیں۔ کمیونزم کے پھیلاؤ
کو روکنے کی تدبیروں میں لگے ہیں، ایشیا و افریقہ کی بغاوتوں پر دماغ سوزی کر رہے ہیں، تیل اور ہوائی اڈوں کے
جنگلوں میں پھنسے ہوئے ہیں، فوجی ماہر جنگ کے نقشوں پر جھکے ہوئے ہیں۔ طبقات الارض کے ماہر، اور انجینیر
اور بینکر اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں تیل کے ذخیروں کا حساب لگا رہے ہیں، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن
ایک غریب فلاح ہے جسے کوئی نہیں پوچھتا، گویا اس کا کوئی وجود ہی نہیں، حالانکہ یہ اٹھارھویں انیسویں صدی
نہیں، بیسویں صدی ہے! ہوا بازی اور اٹھنی توانائی کی صدی ہے! ہوائی جہاز ہی نہیں پرواز خیال کی صدی
ہے! بغاوت کے خیالات کی پروانہ کی صدی ہے! وہ نہیں دیکھتے کہ دنیا کا کسان کس سائے لگا ہے۔ حرکت میں
آ رہا ہے! وہ کارل مارکس کی زبان تو نہیں سمجھتا لیکن اس سے آراضی کی بات کی جائے تو فوراً سمجھ لیتا ہے۔ اسکو
اگر کوئی صحیح حل نہیں بنایا گیا تو غلط حل کو قبول کرے گا۔ وہ ہر اس آدمی کی بات مان لے گا جو زمین ویرنے کا
وعدہ کرے، کیونکہ زمین اس کی جان ہے۔ اس کی مدد کرنے کو مغربی طاقتیں کھڑی نہیں ہوتیں نو مشرقی کسان کی مدد
کرنے کے چیلنج کو قبول نہیں کرتی تو کمیونزم کی فتح یقینی ہے، کل جو ریٹس میں ہوا، آج جو پیسے میں ہو۔ ہا ہے، وہی کل
وسطی مشرق اور دوسرے ملکوں میں ہوگا۔

مغربی طاقتوں کا مشرقی ملکوں کو قرضے دینا ایسا ہی ہے جیسے سلطان والے رخسار پر غارہ ملا جائے،
بیمار گالوں پر تندرستی کا غارہ نہیں چڑھ سکتا۔

دمشق، بیروت، بغداد، کھ، طہران، قاہرہ اور ان کے ساتھ لندن و واشنگٹن بھی ایک پیغمبر کے انتظار
میں ہیں جو سماجی مقصد و اصلاح کا جھنڈا لئے ہوئے پیسے کی طرح کاشتکار کو صون یہ بھکر ہوش میں لائے کہ:
”جاگ! جاگ!! اور طاقت کا مظاہرہ کر!“

جنگ عظیم کے بعد اسلامی سلطنتوں کا انقلاب

آپ نے مارس ہنڈس کی زبان سے ایران اور مشرق وسطیٰ کے بعض اسلامی ممالک کی موجودہ اقتصادی حالت کی خبریں سنی ہیں، جس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر ان حکومتوں نے مزارعین کی حالت کو درست نہ کیا اور پیشہ ورانہ کو صنعت و حرفت کے صحیح راستہ پر ڈال کر، ان کے مطالبات کو پورا نہ کیا تو ایک ایک دن کسانوں اور مزدوروں کے جذبات کا ناقابل ضبط ہو جانا ضروری ہے۔ ہنڈس اسے ”مستقبل کی تلاش“ کہتا ہے، لیکن میرے نزدیک اسے ”مستقبل کا سایہ“ کہنا زیادہ موزوں ہوگا، جو مادی حقیقت میں تبدیل ہونے کے لئے نہایت تیزی سے آگے بڑھتا آ رہا ہے۔

اسلامی ممالک میں جو ذہنی انقلاب اس وقت پایا جاتا ہے، وہ آج کی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد پہلی جنگ عظیم کے وقت ہی پڑ گئی تھی لیکن قریبی مستقبل سے اس پر آج تک کوئی عمارت قائم نہیں کی گئی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ کچھ زمانہ اور اسی طرح گزر جائے، لیکن یہ یقین کرنا کہ ہمیشہ یہی حالت رہے گی درست نہیں۔ کوہ آتش فشاں بعض اوقات بغیر دھواں دئے ہوئے بھی پھوٹ پڑتا ہے اور یہاں تو دھواں بھی عرصہ سے اُٹھ رہا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس وقت اُبل پڑے۔ اس کتاب کے قارئین، چودھویں اور پندرھویں باب خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کے قابل ہیں، کیونکہ وہ دھواں صرف عربوں بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے بڑا زبردست درس عمل اپنے اندر رکھتے ہیں، آج فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے اختلافات نے جو صورت اختیار کر لی ہے اس سے ہر شخص باخبر ہے اور عربوں کے ان جذبات سے ہر مسلمان کو ہمدردی ہے کہ ارض فلسطین سے انھیں محروم نہ کیا جائے لیکن سوال یہ ہو کہ کیا عربوں کی یہ خواہش اور مسلمانوں کی یہ تمنا پوری ہو سکتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کو بسانے کے ذمہ دار برطانیہ و امریکہ ہیں، تو یہ بھی غلط نہیں کہ برطانیہ و امریکہ کا یہ طرز عمل کسی مذہبی یا انسانی ہمدردی کی بنا پر نہ تھا بلکہ نتیجہ تھا یہودیوں کے علمی و اقتصادی اقتدار کا جو جنگ کے دوران ہی میں قائم ہو چکا تھا اور جس نے بعد از جنگ ایسی جذباتی روی کی شکل اختیار کر لی کہ اس کا مقابلہ امریکہ و برطانیہ کے بس کی بات بھی نہ تھی۔

عربوں کو بہت پہلے سے معلوم تھا کہ یہودی ارض فلسطین کو اپنا قدیم وطن سمجھ کر وہاں آباد ہو رہا ہے، لیکن

انھوں نے اس سیلاب کے روکنے کی جتنا بڑا بیہ اختیار کیا، وہ یکسر سفیہانہ اور غیر فطری تھیں، سفیہانہ اس لئے کہ انھوں نے امریکہ و برطانیہ پر اعتماد کیا اور غیر فطری اس لئے کہ وہ خود اپنے آپ کو اس سیلاب کے روکنے کا اپنا بڑا یہودی ارض فلسطین میں اس شاق کے ساتھ داخل ہوئے کہ ان کے پاس علم تھا، دولت تھی، غیر معمولی فراست و دانائی تھی، فوج تھی، اسلحہ تھے اور اسی کے ساتھ عزم راسخ۔ اس کا مقابلہ میں عربوں کے پاس کیا تھا؟

جہل، افلاس، فقر و فاقہ، تشقت و انتشار، خود غرضی، کم مہمتی اور لامرکزیت! پھر ان دونوں کے تصادم کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا اور اسے کوئی قوت نہ روک سکتی تھی۔ اس لئے عربوں کو اب اس حکم میں اپنا وقت نہ ضائع کرنا چاہئے کہ وہ یہودیوں کو فلسطین سے نکال دیں، بلکہ یہ سوچنا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو یہودی فلسطین سے آگے بڑھ کر سارے عربستان پر چھا جائیں، کیونکہ جس تیزی کے ساتھ وہ ترقی کر رہے ہیں، اور جن اصول پر وہ اپنی حکومت کی بنیاد قائم کر رہے ہیں، وہ تمام عربستان کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ عرب ممالک کے لئے یہ بڑا خطہ خطر ہے۔

پھر اس خطرہ کے دور کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے، بالکل وہی جس سے یہ خطرہ پیدا ہوا ہے یعنی اصلاح و ترقی کے وہی اصول جو یہود نے اختیار کئے ہیں اور اقتصاد کی مدد سے گرنے کے وہی طریقے جنھوں نے فلسطین کے ریگزاروں کو چند دن کے اندر ”جنت عدن“ میں تبدیل کر دیا۔ پھر حیرت کی بات یہ نہیں ہے کہ جن اصول کو مشین نظر رکھ کر آج یہود فلسطین پر چھائے جا رہے ہیں، وہ اسلام ہی کے متعین کئے ہوئے اصول ہیں، بلکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جس ”ہادی اکبر“ نے یہ اصول بتائے تھے اسی کے متبعین آج اس سے منحرف نظر آتے ہیں اور اس خدائی فیصلہ کو بالکل فراموش کر چکے ہیں کہ

”اِنَّ الْمَآرِضَ بِرِشَاءِ عِبَادِی الصَّالِحِیْنَ“

جنڈس نے اپنی کتاب میں مسلم حکومتوں کے صرف اقتصادیات سے بحث کی ہے اور سیاسی پہلو کو نظر انداز کر دیا جو غالباً اس لئے کہ یہ اس کے مطالعہ سباحت کا مقصود نہ تھا، لیکن جب تک تصویر کا دوسرا رخ (سیاست) سامنے نہ آئے، ان حقیقی اسباب کا پتہ نہیں چل سکتا جنھوں نے اسلامی ممالک میں یہ بچل پیدا کی اور نہ یورپ کے سرمایہ دارانہ ملکوں کی اُن ریشہ دوانیوں کا علم ہو سکتا ہے، جن کا مقصود ہی اسلامی ممالک کو ہمیشہ زہوں حال بنائے رکھنا ہے تاکہ وہ اعلیٰ گرفت سے باہر نہ ہونے پائیں۔ اس لئے ہم سالنامہ کے دوسرے حصہ میں تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتے ہیں کہ پہلی جنگ کے وقت اور اس کے بعد اسلامی ممالک میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں ان کے اسباب کیا تھے اور بعد کو انھوں نے رفتہ رفتہ کیا صورتیں اختیار کیں، اس مقالہ کی ترتیب میں ہم نے ہیریڈن جیکسن کی کتاب پوسٹ وار ورلڈ سے مدد لی ہے، کیونکہ اس موضوع پر لکھنے والے مغربی مورخین میں جیکسن ہی تنہا وہ شخص ہے جس نے کافی دیرانت سے کام لیا ہے اور جس کے مضامین

جمہوریت ترکی

اسلام اور عیسویت کی تاریخ میں ایک مماثلت بہت عجیب پائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ جس طرح چودھویں صدی عیسوی میں مسیحوں نے پوپ اور مقدس سلطنت روم کا جو اگردن سے آمار کر اپنی اپنی قومی سلطنتیں علاوہ بنالیں، اسی طرح چودھویں صدی ہجری میں، خلافت کی زنجیر ٹوٹنے کے بعد مسلمانوں کی بھی متعدد حکومتیں قائم ہو گئیں۔

اس سے قبل ترکوں کی حکومت بہت وسیع تھی جس میں عربستان کی مسلم آبادی کے علاوہ یورپ کے بعض حصوں کی عیسوی آبادی بھی شامل تھی، لیکن انیسویں صدی عیسوی میں وہ انحطاط کی آخری منزل سے گزر رہی تھی۔ اور اس کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ نہ ہم اسے صحیح معنے میں مسلم حکومت کہہ سکتے تھے، نہ ترکی حکومت بلکہ سچ پوچھئے تو اسے خود مختار سلطنت بھی نہ کہہ سکتے تھے۔

مسلم حکومت تو وہ اس لئے نہ تھی کہ مسلمانوں کی کثیر آبادی اس کے قلمرو سے باہر رہتی تھی، ترکی حکومت اس کو اس لئے نہ کہہ سکتے تھے کہ اس کی زبان عربی تھی، قوانین عربی تھے اور مذہبی علماء ہر جگہ ذخیل تھے، خود مختار حکومت نہ کہہ سکتے کا سبب یہ تھا کہ اپنے ملک کی غیر مسلم قوموں پر اسے کوئی اقتدار حاصل نہ تھا، ان کی عدالتیں الگ تھیں، ان کے قوانین علاوہ تھے اور حکومت کی طرف سے ان کو اجازت تھی کہ وہ اپنے تمام معاملات بالا بالا اپنے اپنے سفارت خانوں ہی کے ذریعہ سے طے کریں۔

سلطان عبدالحمید خاں ثانی (۱۲۹۵ھ تا ۱۳۰۹ھ) نے ایک بار اس کی کوشش بھی کی کہ وہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے روحانی دینی و پیشوا تسلیم کر لئے جائیں اور اسی کوشش کے سلسلہ میں انھوں نے مسلمانوں کو متاثر کرنے کے لئے قسطنطنیہ سے مدینہ تک ریل کا سلسلہ بھی قائم کر دیا، لیکن ان کے اس اقدام کو صرف سیاسی چال جان کر ایک طرف مہدی سودانی نے بغاوت کر دی، دوسری طرف عرب میں وہابی تحریک شروع ہو گئی۔ اور ترکی حکومت مرکزی مسلم حکومت نہ بن سکی۔

جب ترکی کو روحانی پیشوائی حاصل کرنے کی امید ختم ہو گئی تو پھر اس نے یہ کوشش کی کہ اگر وہ مذہبی

حیثیت سے تمام دنیا کے مسلمانوں کا مرکز امید نہیں بن سکتی تو شاہنشاہیت ہی کے حیثیت سے اس کو استوار کیا جائے۔ چنانچہ نوجوان ترکوں کی ایک جماعت نے جو پیرس میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے سوچا کہ کپڑے نہ فرانسیسی حکومت کے اصول کو سامنے رکھ کر ایک ڈاکٹر ٹیک قسم کی حکومت قائم کی جائے جس میں مسلم، عیسائی، یہودی، ترک، عرب وغیرہ سب کو نمایندگی حاصل ہو، چنانچہ ۱۹۰۸ء میں ”انجمن اتحاد و ترقی“ کے نام سے سالونیکا میں سلطان ترکی کے خلاف نعرہ انقلاب بلند کیا گیا اور جدید کانٹری ٹیوشن کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ خیال تھا کہ سلطان سختی سے اس تحریک کو دبا دے گا، لیکن حالات دیکھ کر اس نے اس مطالبہ کو تسلیم کر لیا اور ”انجمن اتحاد و ترقی“ برسرِ اقتدار آگئی۔ اس میں شک نہیں کہ جماعتی تحریک کی یہ کامیابی بڑی کامیابی تھی، لیکن ”انجمن اتحاد و ترقی“ کے اس اقتدار کو بلقانی ریاستوں نے پسند نہ کیا اور ترکی کے خلاف جنگ شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلغاریہ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا، یونان نے کریٹ پر قبضہ کر لیا، آسٹریا نے بوسینا اور سہرز کو نیا لے لیا اور آٹلی، طرابلس کو دبا بیٹھا۔

ان کے دیکھا دیکھی عربوں نے بھی ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ بغداد میں عراقی افسروں نے ایک خفیہ سوسائٹی آزادی عراق کے لئے بنائی، دمشق میں بھی اسی طرح کی سوسائٹیاں شام کی خود مختاری کے لئے بننے لگیں، مکہ میں شریف حسین اپنی حکومت کا خواب دیکھنے لگا اور نجد میں ابن سعود نے دہائی حکومت کی طرح ڈال دی۔ اس میں شک نہیں کہ عربستان کی یہ تحریک آزادی برسوں تک کامیاب نہ ہوتی اور ترکی کی نئی حکومت اس کو بہ آسانی دبا دیتی، لیکن بدقسمتی سے اسی دوران میں جنگ شروع ہو گئی (۱۹۱۴ء) اور ترکی نے اپنی قسمت جبرتی کے ساتھ وابستہ کر دی۔

ترکی کی حکومت نے اس جنگ کو بڑی خدا ساز بات سمجھا۔ اس نے سوچا کہ جبرتی کے روپیہ سے وہ اپنی فوج کو مضبوط و آراستہ کر کے اپنے قدیم دشمن روس سے بھی انتقام لے سکے گی اور عرب حکومتوں کے سرے بھی آزاد کا سودا نکال دے گی لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا، اور عربوں نے سوچا کہ حصول آزادی کا یہی بہترین موقع ہے، چنانچہ جس وقت برطانیہ کی طرف سے ہندوستانی فوج نے عراق پر حملہ کیا تو یہاں کی فوج نے کوئی مقابلہ نہیں کیا، اسی طرح دمشق میں بھی اہل شام نے کوئی مدد ترکی کی نہیں کی، نجد میں ابن سعود انگریزوں سے رشوت لیکر بالکل غیر جانبدار بنا رہا اور مکہ میں شریف حسین نے برطانیہ کے ہائی کمشنر متعینہ مصر سے گفتگو کر کے یہ طے کر لیا کہ اگر اس نے قبائل عرب کو ترکی کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا تو عرب کا فرمانروا اسے تسلیم کر لیا جائے گا۔

اول اول برطانیہ نے حسین کے وعدہ امداد کو چنداں اہمیت نہ دی تھی کیونکہ درہ و انزال کی طرف سے

اس نے خود قسطنطنیہ پر حملہ کرنا طے کر لیا تھا، لیکن انگریز اس میں کامیاب نہیں ہوئے اور ترکی فوج نے بڑی ہاموئی سے مقابلہ کر کے دے دانہ مال سے انگریزوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ اسی آئندہ میں شریف حسین نے بغاوت کر دی اور ترکوں نے اس کے خلاف مدینہ میں قلعہ بندی کر کے مکہ پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس واقعہ سے عربوں میں غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا اور حسین کے تیسرے بیٹے فیصل اور ٹی۔ اسی۔ لارنس کی قیادت میں تمام عرب قبائل نے مل کر حجاز کی طرف سے ترکوں کے خلاف فلیج سنائی پر دھاوا بول دیا۔

اسی کے ساتھ انگریزوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مصر کی طرف سے براہِ شام، ترکی پر حملہ کریں۔ مقابلہ کے لئے مصطفیٰ کمال کو بھیجا گیا، لیکن چونکہ ترکی فوجوں پر دو طرف سے دباؤ پڑ رہا تھا اور عراق کی طرف سے بھی برطانوی فوجیں بڑھتی آرہی تھیں، اس لئے ترکی کو مجبوراً نومبر ۱۹۱۷ء میں صلح کرنا پڑی اور معاہدہ مدروس (MUDROS) کی رو سے، مصر اور عربستان کے علاقوں سے اسے دست بردار ہونا پڑا۔

ترکی کو ذیہبی حکومت بنانے میں پہلے ہی ناکامی ہو چکی تھی، سلطان عبدالحمید نے ترکی کو مرکزی مسلم حکومت بنانے کی کوشش کی اور ناکام رہا، انجمن اتحاد و ترقی نے اس کو شاہنشاہیت بنا نا چاہا اور کامیابی نہ ہوئی، اس لئے اب صرف ایک صورت باقی رہ گئی کہ ترکی کو محض ترکی حکومت بنایا جائے، لیکن اس کی تکمیل کیونکر ہو اور کون اس اہم خدمت کو انجام دے، اس کا کسی کو علم نہ تھا۔

سلطان وحید الدین اپنی جگہ ڈر رہے تھے کہ اگر اب ترکی میں کوئی قومی تحریک شروع ہوئی تو اتحادین اس بہانے سے اناطولیا کو بھی ہتھیلیں گے، اسی طرح انجمن اتحاد و ترقی بھی اپنی جگہ خایف تھی اور اس کے ارکان حلب کی شکست کے بعد ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے اب صرف ایک ہی شخص رہ گیا تھا جسے بھروسہ تھا کہ قومی روح پہنوک کر اب بھی ترکی کو بچایا جاسکتا ہے اور وہ مصطفیٰ کمال تھا، لیکن اس وقت وہ بھی قسطنطنیہ کے مضافات میں چھپا ہوا تھا، کیونکہ انگریز اس فکر میں تھے کہ اسے گرفتار کر کے مالتا بھیج دیں۔

مصطفیٰ کمال بھی دوسرے لیڈروں کی طرح خود اس جماعت سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا جس کو اسے آزاد کرانا تھا، اس کا باپ الہامی تھا اور ماں مقدونیہ کی۔ وہ ۱۸۷۷ء میں بمقام سالونیکا پیدا ہوا اور درمے حمیہ میں تعلیم پائی، ۱۹۰۵ء میں اس کو فوج میں کمیشن ملا اور اس کے بعد سے اس کی زندگی لڑائی میں بسر ہوئی۔ درویشوں کو اس نے شکست دی، بلغاریہ سے اس نے جنگ کی، طرابلس میں اطالوی فوجوں کا اس نے مقابلہ کیا، قفقاز میں روسی افواج کے سامنے وہ سینہ سپر رہا اور گیلی پول میں اس نے برطانوی فوج کو

ناکوں چنے چو ادئے۔ الغرض ایک محارب کی حیثیت سے اس کی قابلیت و اہلیت مسلم تھی اور ترک کی سپاہ اس پر جان دیتی تھی، لیکن سیاسی حلقوں میں وہ اپنی صافگوئی اور سخت کلامی کی وجہ سے مقبول نہ تھا اور انجمن قضاہ قسطنطنیہ کے ارکان سے اس کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ خلیفہ اس سے مرعوب تھا لیکن دربار خلافت میں اس کے مخالف اتنے تھے کہ وہاں اس کے لئے کوئی جگہ نہ نکل سکتی تھی، اس لئے خلیفہ نے اسے ٹالنے کے لئے قسطنطنیہ سے باہر مشرقی اناطولیہ کی طرف اس کی پیش کش کا افسر بنا کر بھیج دیا جو مشرقی اناطولیہ کی سپاہ و آبادی کو غیر مسلح کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن مصطفیٰ کمال نے یہاں کی سپاہ و آبادی کو غیر مسلح کرنے کے بجائے اسے اور مسلح کرنا شروع کر دیا اور جب اس کی اطلاع سلطان وحید الدین کو ملی اور انھوں نے مصطفیٰ کمال کو واپس بلانا چاہا تو اس نے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ میں آزادی اور خود مختاری حاصل کئے بغیر واپس نہ آؤں گا۔

مصطفیٰ کمال کا یہ خیال بظاہر ناممکن العمل تھا، کیونکہ سلطان اور ترک حکومت اس کے خلاف تھی، اتحادیوں بھی اس کے دشمن تھے، چنانچہ سلطان نے کردوں کو اس کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا اور ۱۹۱۹ء میں اتحادیوں کی مدد سے یونان نے سمرنا میں اپنی فوجیں آمار دیں، لیکن مصطفیٰ کمال نے انھیں واقعات سے فائدہ اٹھایا اور ترک آبادی کو یہ یقین دلا کر کہ سلطان اور اتحادیوں ترک قوم کو غلام بنانا چاہتے ہیں، عوام کی ہمدردی حاصل کر لیں اور وہ جوق در جوق اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔

مصطفیٰ کمال نے ہوا کا یہ رخ دیکھ کر نیشنل اسمبلی کے قیام کا اعلان کر دیا اور جون ۱۹۲۰ء میں بمقام ارض روم اس کا پہلا جلسہ طلب کیا۔ اس جلسہ میں مصطفیٰ کمال کو پریسیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ ستمبر میں بمقام سیواس اس نے پھر اسمبلی کا جلسہ طلب کیا اور ایک مجلس عاملہ مرتب کر کے انگوراکو صدر مقام بنالیا۔

مصطفیٰ کمال نے یہ سوچ کر کہ عرب ریاستوں پر توجہ نہ ہونے کی وجہ سے قسطنطنیہ کی حکومت اس کی مدد کے لئے طیار نہیں، یہ فیصلہ کیا کہ ترک قوم کا بقا صرف اس طرح ممکن ہے کہ اس علاقہ میں جہاں ترک مسلمانوں کی اکثریت ہے خالص ترک حکومت قائم کی جائے اور اس کا اعلان کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ترکی کی نئی حکومت کے قیام کا یہ اعلان ایسا تھا جس کو نہ خلیفہ پسند کرتا تھا نہ اتحادیوں اور بالکل ممکن ہے کہ قوم پرست ترکوں کی جو جماعت اس کے ساتھ جو گئی تھی، وہ بھی تازہ جوش و خروش ہٹا دینے کے بعد اس کا ساتھ چھوڑ دیتی، لیکن اتحادیوں نے ۱۹۲۰ء میں تین ایسی غلطیاں کیں کہ ترک قوم کے جذبات حد درجہ مشتعل ہو گئے اور مصطفیٰ کمال کی قائم کی ہوئی حکومت زیادہ مستحکم ہو گئی۔

پہلی غلطی یہ تھی کہ انگوراکے نیشنل پکٹ کے اعلان کے بعد اتحادیوں نے کہلا بھیجا کہ ترکوں کی نئی حکومت کو وہ تسلیم کرنے کے لئے طیار ہیں اگر قسطنطنیہ میں نیشنل اسمبلی کا جلسہ کر کے اس کا اعلان کیا جائے، انگوراکے

ڈبلی گیسٹ اس خبر کو سنکر خوش ہو گئے اور اس نوید پر قسطنطنیہ جاکر انھوں نے پارلیمنٹ کے پورے اجلاس میں نیشنل پیکیٹ کو منظور کرایا، لیکن اس کے دو چھپنے بعد ہی اتحادی سپاہ نے قسطنطنیہ کی بہت سی سرکاری عمارتوں پر قبضہ کر کے چالیس نیشنلسٹ لیڈر مارے اور گرفتار کر لیا اور اٹا سمجھ دیا۔ اس برعہدی سے اتحادیوں کے خلاف ترکوں میں عام بدظنی پیدا ہو گئی۔

دوسری غلطی معاہدہ سیورس تھا۔ جسکی رُو سے تھریس کا علاقہ اور سمترنا یونانیوں کو دیدیا گیا، عدلیہ اٹلی کو اور صرف کوہستانی علاقہ ترکوں کو ملا، اس تقسیم نے ترکوں کو بالکل یقین دلادیا کہ اتحادیوں انھیں تباہ کر دینے پر تکتے ہوئے ہیں اور ان کی قومی اسپرٹ پوری قوت کے ساتھ اُبھر آئی۔

تیسری غلطی یہ تھی کہ اتحادیوں (فرانس، برطانیہ، اٹلی) نے یونان کو ترکی پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ترکی پر دباؤ ڈال کر معاہدہ کی شرائط تسلیم کرائی جائیں۔ یہ لڑائی تین سال ۱۹۷۴ء تک جاری رہی اور اتحادیوں نے یونان کی پوری مدد کی، لیکن آخر کار ترکوں کو فتح ہوئی اور معاہدہ میسر نہ ہوا۔ مصطفیٰ کمال کی یہ فتح معجزہ سمجھی جاتی ہے کہ اس نے صرف تیرہ ہزار ترک سپاہیوں سے جو پوری طرح مسلح بھی نہ تھے اور فنون جنگ سے بھی واقف نہ تھے، یونانیوں کی ۸۰ ہزار باقاعدہ آراستہ فوج کو باہر نکال دیا اور اپنا سارا علاقہ واپس لے لیا۔

(ترکوں کی اس کامیابی کے بعد معاہدہ لائسن (۱۹۷۳ء) وجود میں آیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کو پورا اناطولیا، مشرقی تھریس اور قسطنطنیہ مل گیا اسی کے ساتھ غیر ملکیوں کو جو غیر معمولی حقوق حاصل تھے وہ بھی ختم کر دئے گئے، - الا کہ یہودی آبادی مشرقی اناطولیا سے یونان منتقل کی گئی اور اس طرح تاریخ میں بالکل پہلی مرتبہ ترکی کی قومی حکومت قائم ہوئی۔

لیکن اب مصطفیٰ کمال کے سامنے بڑا مشکل مسئلہ یہ تھا کہ اس حکومت کی بنیاد کو کیونکر استوار کیا جائے خود ترکوں کی کثیر آبادی سیاست سے بالکل ناواقف تھی اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی کہ کس قسم کی حکومت قائم کی جائے۔ بعض کا خیال تھا کہ سوویت یونین میں شامل ہو جانا چاہئے۔ بعض خالص اسلامی حکومت کے قیام کی طرف مائل تھے اور بعض اسے مغربی انداز کی جمہوریت بنانا چاہتے تھے، لیکن مصطفیٰ کمال نے اسی سب کی مخالفت کی کیونکہ سوویت یونین میں شامل ہونا اس کے نزدیک اپنی آزادی کو ہاتھ سے کھودینا تھا، اسلامی حکومت میں پھر قدامت پسند طبقہ کے درغور کا اندیشہ تھا اور جمہوریت کا وہ اس نے خلاف تھا کہ ترکی آبادی ابھی اس قابل نہ تھی کہ انتخاب اور رائے دہندگی کی اہمیت کو سمجھ سکے، اس نے اس نے فیصلہ کیا کہ فی الحال ملک کو کچھ شپ بھی موزوں ہے۔

چنانچہ جب معاہدہ لائین کے بعد نیشنل اسمبلی کا اجلاس ہوا تو مصطفیٰ کمال اور عصمت بے نے ایک بل پیش کیا کہ ترکی کو جمہوری حکومت قرار دیا جائے اور کسی نہ کسی طرح اسے منظور کر کے مصطفیٰ کمال نئی جمہوریت ترکی کا صدر ہو گیا، اب مصطفیٰ کمال نئی جمہوریت ترکی کا صدر ہو گیا، اور اس کے اختیارات غیر معمولی وسیع ہو گئے۔ صدر کی حیثیت سے کامینہ پر اسے اقتدار حاصل ہو گیا، پارٹی کا لیڈ ہونے کی حیثیت سے سیاسی پالیسی پر پورا اختیار مل گیا اور کمانڈر انچیف کی حیثیت سے تمام فوجی نظام اس کے ہاتھ آ گیا۔

مصطفیٰ کمال کو صرف ایک ہی دھن تھی وہ یہ کہ ترکی قوم میں کسی طرح قوم پرستی کا صحیح جذبہ پیدا کیا جائے اور غیر ترکی عناصر کو نکال باہر کیا جائے اور صدر جمہوریہ ہونے کے بعد اس نے یہ کوشش شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں کئی باتیں اس کے سامنے تھیں، سب سے پہلے تو یہ کہ خلافت کے قصہ کو ختم کیا جائے، دوسرے یہ کہ ترکوں میں جو عربوں کی سی مذہبی ذہنیت پیدا ہو گئی ہے اسے دور کیا جائے اور تیسرے یہ کہ قدیم قوانین کو منسوخ کر کے جدید قوانین نافذ کئے جائیں۔ چنانچہ اپنے انتخاب کے چند مہینے بعد ہی اس نے سب سے پہلے منصب خلافت کے منسوخ کرنے کی تدابیر شروع کر دیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ کام آسان نہیں اور مسلمانوں کے دلوں میں جو روایتی احترام منصب خلافت کا صدیوں سے جاگزیں چلا آ رہا ہے اس کو دور کرنا مشکل ہے، تاہم وہ ہر وقت اسی فکر میں سرگرداں رہتا تھا۔ اتفاق سے اس دوران میں سر آغا خاں نے منصب خلافت کے احترام کے بقا کے متعلق ترکی جمہوریت سے پر زور اپیل کی اور یہ اپیل مصطفیٰ کمال کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس نے ترکی قوم کے سامنے اس مسئلہ کو اس صورت سے پیش کیا کہ سر آغا خاں نے یہ اپیل برطانیہ کے اشارہ سے کی ہے اور اس کا مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ ترکی جمہوریت کو فنا کر دیا جائے۔

ترکوں پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا اور نیشنل اسمبلی نے باتفاق رائے منصب خلافت کی تینخ کا فیصلہ کر دیا۔ اس وقت عبدالحمید خلیفہ تھے۔ ان کو معزول کر کے معاہدہ کے متعلقین کے یورپ بھیج دیا گیا۔ نیشنل اسمبلی نے اسی کے ساتھ یہ بھی طے کر دیا کہ موجودہ قوانین بھی منسوخ کر کے جدید قوانین مغربی اصول پر تیار کر لئے جائیں اور اس پر بھی فوراً عملدرآمد شروع ہو گیا۔ لیکن چونکہ مذہبی خیالات یوں دفعتاً ختم نہیں ہو سکتے، اس لئے نیشنل اسمبلی کے حزب مخالف نے مصطفیٰ کمال کی مخالفت شروع کی اور کردستان میں بغاوت کرادی۔ جب تین مہینے کے بعد مشکل سے یہ بغاوت فرو ہوئی تو مصطفیٰ کمال نے سوچا کہ کام یوں نرمی سے نہیں چلے گا، اس لئے اس نے پہلے تو اسمبلی سے حزب مخالف کے افراد کو نکالا اور پھر پوری سختی کے ساتھ اس نے ملاؤں اور مذہبی اداروں کو ختم کیا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ اقتصادی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن وہ سمجھتا تھا کہ جب تک ترکوں کی ذہنیت کو بدلایا جائے اس میں کامیابی ممکن نہیں، اس لئے اس نے سب سے پہلے تعلیمی نصاب کو بدلا اور تمام

نہیں یہی مکاتب و مدارس بند کر کے جدید مدارس مغربی اصول پر قائم کئے۔

وہ سمجھتا تھا کہ ذہنیت بدلنے کے لئے ظاہری وضع قطع کا بدلنا بھی ضروری ہے، اس لئے اس نے ترکی ٹوپی کی جگہ چمچے دار ٹوپی کو حکماً رائج کیا، برقع استعمال کرنا ممنوع قرار دیا اور رسم خط لاطینی کر دیا۔ ٹوپی اور رسم خط کا مسئلہ تو خیر اتنا سخت نہ تھا، لیکن پردہ کی ممانعت نے قصبات و دیہات میں کافی بے چینی پیدا کر دی کیونکہ وہاں کی عورتیں قدیم اسلامی روایات کی سختی سے پابند تھیں اور وہ بے پردگی کو برداشت نہ کر سکتی تھیں، تاہم رفتہ رفتہ تمام مزاحمت دور ہوتی گئی اور ۶ سال کے عرصہ میں ترکی جمہوریت مغربی اصول پر قائم ہو گئی۔

اب مصطفیٰ کمال کے سامنے دوسرا اہم سوال اقتصادی اصلاحات کا تھا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ ترکی اپنی آب و ہوا، زرخیز وادیوں اور صحرائی و معدنی پیداوار کے لحاظ سے ہر قسم کی زرعی و صنعتی ترقی کر سکتا ہے، لیکن ان قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھانے میں ایک سبب بڑا مانع حایل تھا یعنی یہ کہ حکومت بالکل مفلس تھی اور وہ نہ دوسرے ملکوں سے قرض لینا چاہتا تھا نہ یہ پسند کرتا تھا کہ وہاں کے سرمایہ دار یہاں آکر صنعت کو ترقی دیں۔ اس لئے اس نے سب سے پہلے زراعت کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور پہلے خود ایک فارم طیار کیا جس میں جدید آلات کشتا و زرعی سے کام ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ اس نے آٹھ زراعتی کالج قائم کئے اور زراعتی بینک قائم کر کے کسانوں کو قرض اور زراعتی مشینری کی فراہمی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ کسانوں میں جدید آلات کے ذریعہ سے زراعت کرنے کا رواج عام ہونے لگا اور رفتہ رفتہ وہاں کے تمام کسانوں نے اسے قبول کر لیا۔

اسی کے ساتھ دوسرا سوال صنعت و تجارت کی ترقی کا تھا۔ تجارتی نقطہ نظر سے ترکی کی جغرافیائی پوزیشن نہایت اچھی ہے کیونکہ ایشیا اور یورپ کے درمیان وہ ایک چوراہے کی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح پیداوار کے لحاظ سے بھی ترقی کے اسباب اس کے پاس موجود ہیں۔ سمرا کا انجیر، ترکی کا تاکو، روئی اور زیتون وہاں کی خاص اشیاء ہیں جن کی مانگ دنیا میں بہت ہے۔ ہر چند جنگ کے بعد بین الاقوامی تجارت کے لئے اسباب مساعد نہ تھے لیکن مصطفیٰ کمال نے روس، آٹلی، یوگوسلیویا، رومانیہ اور یونان سے تجارتی معاہدات کر کے حالات میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر لی تھی اور عمل و نقل کے لئے ہر سال ۵۰ میل ریلوے لائن بھی طیار کی جانے لگی۔

قیام جمہوریت سے قبل ترکی ہر قسم کی صنعت سے محروم تھا، اور گو قیام جمہوریت کے بعد متعدد فیکٹریاں قائم ہوئیں جن میں سگریٹ بنانے والیں بننے اور فوج کی وردی کے لئے پارچے باقی کی فیکٹریاں خاص اہمیت رکھتی ہیں تاہم کوئی قابل ذکر ترقی اس میں نہ ہو سکی، ان حالات کو دیکھ کر وہاں کے کارخانہ داروں نے احتجاج کیا کہ حکومت آمدنی کا زیادہ حصہ فوج پر صرف کر رہی ہے اور صنعتی اداروں کی ہمت افزائی بہت کم ہوتی ہے، اس لئے یا تو وہ یہ باہر سے قرض لیا جائے یا قرض بھٹ کو کم کیا جائے۔

مصطفیٰ کمال نے اس احتجاج سے یہ نتیجہ نکالا کہ ترکی قوم میں غالباً اب اتنی بیداری پیدا ہو گئی ہے کہ وہ ملک کے اہلیات اور اقتصادی مسائل کو سمجھ سکے، اس لئے اس نے مصمت پاشا کی قیادت میں حزب مخالف کے لئے بھی اسمبلی میں جگہ نکالی تاکہ ترکی قوم ایک ذمہ دار جمہوری حکومت کے صحیح اصول سے واقف ہو سکے۔ اس سے قبل وہاں ایک ہی پارٹی کی حکومت تھی اور حکومت کی تقریروں اور تجویزوں پر اظہار رائے بالکل ممنوع تھا اور کوئی اس کی مخالفت نہ کر سکتا تھا، لیکن اب حزب مخالف قائم کر کے آزادی کے ساتھ اظہار خیال کی عام اجازت دیدی گئی۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں فحشی پاشا کی سرکردگی میں ایک لبرل جمہوریت پسند پارٹی قائم کی گئی جو حکومت کی تجویزوں پر کھلی ہوئی تنقید کرے۔ لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلا۔

حکمرانوں کی قدیم ذہنیت اس بات کو سمجھ ہی نہ سکتی تھی کہ حکمران جماعت کی مخالفت بھی کوئی معقول بات ہو سکتی ہے، اس لئے انھوں نے مصطفیٰ کمال کے اس طرز عمل سے یہ سمجھا کہ اب وہ ضعیف ہو گیا ہے اور حکومت سنبھالنے کی طاقت اس میں نہیں رہی۔ اس خیال کا پیدا ہونا تھا کہ مختلف سمتوں سے قدامت پرست اور باغیانہ عناصر رکھنے والی جماعتوں نے شورش شروع کر دی، ستمنا میں ایک شخص نے ہمدی موعود ہونے کا دعویٰ کر کے لوگوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرنا شروع کیا، گردوں نے پھر حکومت کے خلاف ہتھیار سنبھال لئے اور پھر سر اٹھانے لگے۔ مصطفیٰ کمال نے مجبور ہو کر حزب مخالف کو توڑ دیا اور ان تمام شورشوں کو دبانے میں پوری ہمتی سے کام لیا۔

اس نے کہا کہ ترک قوم ابھی اس قابل نہیں ہے کہ وہ مغربی اصول پر طریق حکمرانی کو سمجھ سکے اس لئے ضرورت آئی کہ میں کم از کم پندرہ سال تک اور آمرانہ حیثیت سے کام کر دوں اور ترک پہلک کو سیاسیات میں حصہ دلینے دوں۔ الغرض ترک جمہوریت کا قیام اس میں شک نہیں کہ محض مصطفیٰ کمال کے غیر معمولی عزم و شہادت کا نتیجہ تھا اور وہ اپنی زندگی ہی میں سیاسی دنیا میں اس کے لئے ایک اہم جگہ پیدا کر گیا۔ مصطفیٰ کمال کے انتقال کے بعد بھی حکومت کی پالیسی قریب قریب وہی رہی جو اس نے قائم کی تھی، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا تو دوسری جنگ عظیم اس کی پالیسی کیا ہوتی۔ تاہم اس جنگ میں ترکی کا غیر جانبدار رہنا اس کے لئے مفید ہی ہوا اور وہ ان تباہیوں سے بچ گیا جو دوسری حکومتوں پر شرکت جنگ کی وجہ سے نازل ہوئیں۔ فی الحال اس نے اپنی قسمت اینگلو امریکی ہلکے وابستہ کر دی ہے اور ایشیائیک پیکٹ میں شامل کئے جانے پر اصرار کر رہا ہے۔ امریکہ نے مارشل پلان کے تحت ترکی کی کافی مدد بھی کی ہے، لیکن اس سے زیادہ ترقی و تنظیم میں کام لیا گیا جو امریکہ کا اصل مقصد تھا اور ملک کے اقتصادی حالات کو درست کرنے میں اسے صرف نہیں کیا گیا۔

فوجی ترتیب و تنظیم اور تمدنی تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے ترکی کا مقابلہ کوئی اسلامی حکومت نہیں کر سکتی اور اس لئے باوجود چھوٹی سلطنت ہونے کے یورپ و امریکہ میں اس کی دھاک اور ساکھ کسی بڑی سلطنت سے کم نہیں

عرب اور اتحادی طاقتیں

یہ بالکل صحیح ہے کہ جمہوریت ترکیبی کبھی قائم نہ ہو سکتی اگر پہلی جنگ کے وقت اتحادی طاقتوں نے عربوں کے علاقہ سے اسے محروم نہ کر دیا ہوتا، لیکن سوال یہ ہے کہ خود اتحادیوں نے عربستان کے متعلق کیا سوچا تھا یہ مسئلہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔

اہل عرب کو یقین تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ گھڑاد ہو جائیں گے جس کا وعدہ ان سے کیا گیا تھا اور اسی لالچ سے انہوں نے حجاز اور شام میں ترکوں کا مقابلہ کیا تھا، سرہنری میکومین (برطانوی رانی کی کشتی متینہ مصر) نے جب کہ کے گورنر حسین کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا تو حسین نے یہ شرط پیش کی کہ جنگ کے بعد راجہ عربستان (بدن کے سوا) آزاد سمجھا جائے گا، میکومین نے بصرہ، بغداد اور حلب بیرون کے بعض علاقوں کے سوا (جن پر برطانیہ و فرانس کو زیر اقتدار رہنا تھا) باقی تمام عربستان کی آزادی کا وعدہ برطانیہ کی طرف سے کر لیا تھا، لیکن جنگ ہونے پر جاری ہی تھی کہ اہل عرب برطانوی وعدوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے، کیونکہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ فرانس اور برطانیہ کے درمیان ایک خطی معاہدہ فرانس اور برطانیہ کے مابین ہو چکا ہے۔ اسی معاہدہ کے بشرط انہیں روسی قزاقوں سے معلوم ہونے لگا کہ عراق اور فلسطین کے وہ ہندو گاہ برطانیہ کے زیرِ مبادت رہیں گے، اور سواصل شام کا علاقہ روسی و قزاقوں کے قزاقوں کے زیرِ اثر رہے گا۔ اسی وقت برطانیہ نے یہودیوں سے یہودیہ وعدہ کیا تھا کہ فلسطین کی تمام زمینیں روسی یا ان کے۔ برطانیہ کی اس غیر ملکی کامیابی کو اور زیادہ انہیں اس واقعہ سے متاثر کیا کہ روس نے عراق میں خود حکومت قائم کر دی اور ہندوستانی افسروں پر شکنجہ تنی۔

[illegible]

بھی اس کانفرنس میں شریک نہیں کئے گئے، صرف عہدہ کی نمائندگی قبول کی گئی اور وہ بھی حسین علی خان کو دیا گیا۔ فیصل کو نمائندہ تجویز کیا گیا کیونکہ اس نے گھڑیا تھا کہ میں دمشق سے زیادہ کسی اور چیز کی تمنا نہیں رکھتا۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ ارکان صلیح کانفرنس کے اے مشرق وسطیٰ کا مسئلہ **سرمین عرب کی تقسیم** اتنا زیادہ اہم د تھا جتنا جرمنی کے ہٹلر کا اور سب اس میں مصروف تھے ہٹلر

اس کے بڑی بڑی طاقتوں کے بعض نمائندے عربستان کے حالات سے زیادہ واقف بھی نہ تھے، وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ جزیرہ نمائے عرب نام ہے ایک بہت بڑے صحرا اور صرف اس کے سوا اصل کاجو اقتصادیں، زرعی اور سیاسی حیثیت سے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، مگر صرف ہر سوئز کی وجہ سے نگاہ میں تھا اور فلسطین، شام و عراق کی اہمیت صرف اس لئے تھی کہ ہندوستان کا راستہ ادر سے بھی جاتا ہے، موصل اور خلیج فارس کی اہمیت البتہ پٹرول کے چشموں کی وجہ سے کچھ زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ ربا عرب کا مرکزی حصہ سو اس سے وہ بالکل ناواقف تھے یہاں تک کہ ابن سعود اور اس کی دہائی تحریک کا بھی انہیں کوئی علم نہ تھا۔ ان کا تنہا مشیر صرف لارنس تھا اور وہ خود بھی ابن سعود اور اس کی تحریک سے زیادہ آگاہ نہ تھا۔

صلح کانفرنس میں کبھی کبھی مشرق وسطیٰ کا بھی ذکر آ جاتا تھا اور دو مختلف طیش اس سلسلہ میں ظاہر کی جاتی تھیں، ایک جماعت تو یہ کہتی تھی کہ عربوں سے جو وعدہ آزادی کا کیا گیا ہے وہ پورا کرنا چاہئے، دوسری جماعت یہ کہتی تھی کہ اگر برطانیہ نے عراق چھوڑ دیا تو ترکی پھر اس پر قابض ہو جائے گا اور ہر سوئز بھی ہاتھ سے نکل جائے گی علاوہ اس کے فرانسن بھی اس پر آمادہ نہ تھا کہ شام سے اس کا اقتدار اٹھ جائے۔

آخر کار سلسلہ میں یہ طے پایا کہ وہ مستعمرات یا ریاستیں جو جنگ کے بعد دوسری حکومتوں **اصول تولیت** کے اثر سے آزاد ہو گئی ہیں مثلاً عرب جو ترکی کی حکومت سے علاحدہ ہو گیا ہے، ترقی یافتہ

حکومتوں کی نگرانی میں دیدی جائیں تاکہ وہاں کی آبادی کو آزاد و خود مختار حکومت قائم کرنے کا اہل بنایا جاسکے دیکھ پڑتی چال جو دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنے کے لئے مغربی حکومتیں ہمیشہ چلتی رہی ہیں، عرب کے مسئلہ میں بھی چلی گئی اس اصول بات کے طے ہونے کے بعد، تجویز پیش کی گئی کہ ایک بین الاقوامی کمیشن خود عربستان ہمارے معلوم کرے کہ وہاں کے لوگوں کی کیا رائے ہے لیکن چونکہ فرانس نے اپنا کوئی نمائندہ اس کمیشن میں مقرر نہیں کیا تھا اس لئے اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا اور اتحادیوں نے خود ہی مسئلہ میں یہ فیصلہ کر دیا کہ:

- ۱۔ عراق، برطانیہ کی تولیت میں رہے گا۔
- ۲۔ شام اور لبنان اور س و صحرائے سینا کا درمیانی علاقہ برطانیہ و فرانس کے درمیان مشترک طور پر تقسیم کیا جائے گا۔
- ۳۔ فلسطین اور مشرق وسطیٰ کی تولیت میں روسی کے اور جرمنی کے مسئلہ میں سو اعلیٰ کورٹ اور دمشق، فرانسن

کی تولیت میں دس کے ساتھ شریعت کے تحت کی جس کی عمر ۷۰ سال کی تھی چار کا فرما تسلیم کیا گیا اور وہ بھی صرف اس لئے کہ چار اقتصاد کی حیثیت سے کوئی رقم چھو نہیں اور صرف چھو ہی اس کی آمدنی کا ذریعہ ہے جس کا ولی عہد اس کا بڑا چھو اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ دوسرے بڑے عہدائے مذکورہ سیادت برطانیہ والی عراق تسلیم کیا گیا اور فیصل کو دمشق دیا گیا۔ بالخصوص اس طرح شریعت کے خلاف حالہ وادوں کا منہ بند کر دیا، لیکن سلطنت عثمانیہ سے جدا ہونے والے دوسرے علاقوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ آرمینیا بدستور ترکوں کے پاس رہا، مصر، برطانیہ کے سیادت سے باہر نکل سکا، اور ابی سمود سرزمین نجد میں چاروں طرف شریفی خاندان والوں سے گھر گیا۔

شام اور فرانس

شام میں فرانس کی تولیت وہاں کے باشعوروں کی مرضی کے بالکل خلاف تھی اور ہر چند شام کی ۳۰ لاکھ کی آبادی میں سے مسلم اکثریت کا شمار دروزی قبائل، لبنانی تاجر شامل ہیں اپنے مختلف اغراض و مقاصد کے لحاظ سے باہدگ متفق نہ تھے، لیکن تولیت کے سب مخالف تھے اس لئے فرانس کو فوجی طاقت سے اپنی تولیت قائم کرنا پڑی اور اگست ۱۹۱۸ء میں فیصل کو دمشق سے نکال کر وہاں فوجی حکومت قائم کر دی اور شام کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے پانچ جدا گانہ ریاستیں قائم کر دیں جن کا نظم و نسق، بجٹ، جینڈا سب علیحدہ تھا۔

اہل شام کو یہ تقسیم سخت ناگوار ہوئی اور عیسوی اقلیت کے ساتھ جو غیر معمولی مراعات روا رکھی گئیں انہوں نے مسلمانوں کو بہت برہم کر دیا۔ دروزی قبائل نے اس کی علی مخالفت شروع کر دی اور جب یہ مخالفت زیادہ سنگین ہو گئی تو ستمبر ۱۹۱۸ء میں فرانسیسی حکومت نے دھوکا دیکر دروزی لیڈروں کو دمشق گفتگو کے لئے بلایا اور انہیں قید کر دیا۔ اس واقعہ سے سخت برہمی پیدا ہو گئی اور دروزیوں نے پوری قوت کے ساتھ بغاوت شروع کر دی۔ فرانسیسیوں نے اس کے جواب میں مسلسل ۴۴ گھنٹے تک دمشق پر گولہ باری کر کے اسے کھنڈر کر دیا۔ پھر اسی پر میں نہیں کیا گیا بلکہ اس کے بعد فرانسیسی افواج کی تعداد یہاں ۵۰ ہزار بڑھا دی گئی اور دیہات بھی کھنڈر سے جلائے۔

اس واقعہ سے تمام دمشق میں سنسنی مچ گئی اور فرانس کو مجبور کیا گیا کہ وہ کوئی سمجھوتہ کرے۔ فرانس نے ایک آزمودہ کار شخص رشیدی کو یہاں لاکر فرما کر کہا اور اس نے بجائے تولیت قائم رکھنے کے لئے اہل شام سے مشق کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی بار اہل شام نے یہ محسوس کیا کہ وہ فرانسیسی حکومت کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔

تولیت کی کوئی بات نہ تھی کہ اس کی جگہ پر رشیدی کے ذریعہ سے لائسنس ڈیٹا اسٹیبلشمنٹ

چنے جائیں اور برطانیہ نے عراق نے بھی اسی اصول پر عمل کیا تھا، اس لئے شام کے فرانسیسی گورنر نے بھی اسی اصول پر عمل کیا اور دو سال کے اندر یہاں اسمبلی قائم ہو گئی۔ اس کے بعد ممبران اسمبلی میں جب گورنر نے اسمبلی کے سامنے شرائط معاہدہ پیش کیں تو کثرت طعنے سے اسے اپنی شام نے رد کر دیا۔ کیونکہ ان شرائط کی روح سے شام کی تقسیم پانچ ریاستوں میں بدستور قائم رکھی گئی تھی اور حکومت فرانس کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ شام میں جتنی فوج چاہے رکھے اور جتنے ہوائی اڈے چاہے قائم کر سکتا ہے۔

برطانیہ اور یہود فرانس کو جو ناکامی شام میں ہوئی اس سے زیادہ برطانیہ کو فلسطین میں ہوئی ہر چند عرب و دونوں سے نفرت کرتے تھے، لیکن فرق یہ تھا کہ شام میں کم از کم انھیں یہ تو معلوم تھا کہ فرانس کا کیا ارادہ ہے، لیکن فلسطین کے معاملہ میں تو برطانیہ کے ارادوں کی خبر ہی نہ تھی اور یہ کہ وہ جا کی کیفیت طاری تھی۔

ایک طرف برطانیہ یہ بھی کہتا جاتا تھا کہ وہ عربوں کا طرفدار ہے اور دوسری طرف ہر سال ہزاروں یہودیوں کو بھی فلسطین میں بساتا جا رہا تھا۔

جو یہودی یہاں آ رہے تھے وہ زیادہ تر صیہونی جماعت کے تھے اور عرب انھیں کی طرف سے بہت مشتبہ تھے۔

برطانیہ نے جنگ سے پہلے یہودیوں کے قومی وطن کے لئے اوکانڈا تجویز کیا تھا لیکن ڈاکٹر ویزمین نے جو صیہونی لیڈر تھا اس تجویز کو رد کر دیا۔ ڈاکٹر ویزمین نے دو رنگ جنگ میں برطانیہ کی بڑی اہم خدمت انجام دی تھی، ایک اس جنگ میں برطانیہ کو بڑی مشکل پیش آئی کہ برطانیہ میں انکس جو پھٹنے والے گولوں کی طیارہ کے فروغی تھا بالکل ختم ہو گیا تھا اور اس کا حصول کسی طرح ممکن نہ تھا اس وقت ڈاکٹر ویزمین نے لکڑی سے انکس طیارہ کے برطانیہ کو اس خطرہ سے بچا لیا تھا اور جب اس سے اس خدمت کا معاوضہ پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ ”میری قوم کے لئے کچھ کیا جائے“

ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ویزمین کی خواہش کو برطانیہ رد نہ کر سکتا تھا اس لئے وزیر خارجہ میں برطانیہ نے اعلان کر دیا (جسے اعلان بالفور کہتے ہیں) کہ ”حکومت برطانیہ فلسطین کو یہودی کا قومی وطن قرار دینے کی طرف راہ ہے

لے صیہونیت کی تحریک ایک یہودی فلسوف ڈاکٹر ہرٹزل نے ۱۸۹۷ء میں شروع کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنایا جائے اور تین سال کے عرصہ میں تقریباً ایک لاکھ یہودی صیہونی یہاں آ کر بس گئے تھے۔

اور اس مقصد کی تکمیل کی پوری کوشش کرے گی۔ لیکن اسی کے ساتھ فلسطین میں جو یہودی آبادی رہتی تھی وہ اس کے حقوق پر دستور قائم رہیں گے اور اسی اصول کے تحت فلسطین برطانیہ کی قریب میں رہے گا۔ اس اعلان سے مقصود یہ تھا کہ فلسطین میں عرب و یہود دونوں کی ملی جلی آبادی کی حکومت قائم کی جائے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ یہود و عرب کے درمیان نفرت و اختلاف اب بہت زیادہ ہو گیا تھا اور ایک ہی پالیسی قائم پر ان دونوں کا اجتماع مشکل تھا۔

بالفور اعلان سے قبل برطانیہ نے یہاں فوجی حکومت قائم کر رکھی تھی جو بہ نسبت یہودیوں کے عربوں کی طرف زیادہ مائل تھی (کیونکہ فلسطین میں انھوں نے برطانیہ کی فوجی مدد کی تھی) لیکن بالفور اعلان کے بعد اس پر عمل کرانے کے لئے سربراہ برٹ سمکول کو فلسطین بھیجا گیا۔ اس نے کوشش کی کہ وہ غیر جانبدارانہ طریقہ سے اس مسئلہ کو طے کرے، لیکن چونکہ وہ خود یہودی تھا۔ اس نے یہودیوں نے اس کی پزیرائی ایک یہودی گورنر کی حیثیت کی اور عربوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم قریب کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے اور یہروشلم اور یافا میں سخت ہراس پید ہو گئی۔ برٹ نے مسئلہ میں ایک عام انتخاب کی کوشش بھی کی، لیکن مسلمانوں نے اس میں مطلق حصہ نہیں لیا۔ اس کے بعد لارڈ کرومر کو ہائی کمشنر بنا کر بھیجا گیا، اتفاق سے اسی وقت کساد باناری شروع ہو گیا جسے بہت سے یہودیوں کا دیوالیہ نکال دیا، مسلمان اس کساد باناری سے بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ اب یہود غریبی فلسطین چھوڑ کر چلے جائیں گے، لیکن عربوں کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی کیونکہ کساد باناری زیادہ عرصہ تک قائم نہ ہو سکی دوسری طرف لارڈ پلومر نے بھی استعفا دیر یا جس سے عرب بہت خوش تھے، اس کا نتیجہ ہوا کہ عربوں میں بھی یہ حسد پیدا ہوئی اور یہروشلم میں یہود و عرب نے ایک دوسرے سے لڑنا اور شہر کے امن و سکون کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔

ان حالات کو دیکھ کر لارڈ پاسفیلڈ کی سرکردگی میں ایک تحقیقاتی کمیشن بھیجا گیا تاکہ وہ فلسطین کے حالات کی تحقیق کر کے رپورٹ مرتب کرے۔ لارڈ پاسفیلڈ نے تحقیقات کر کے اپنی رپورٹ دہرائٹسمیر کے نام سے شائع کی جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کی آمد کو محدود کر دینا مناسب ہوگا۔

اس رپورٹ پر یہودیوں میں ہنگامہ مچا اور کیا وہ آخر کار اس سے موافق آئیں گے اس کے بارے میں شک تھا۔ یہودیوں کا کہنا تھا کہ ہم نے فلسطین کو اپنا قومی وطن بنانے کے لئے کروڑوں پونڈ صرف کئے ہیں، ہم نے یہاں کی سڑکیں، کھیتیں، آب و ہوا، زمینیں، عمارتیں، کھیتیں، درخت لگائے ہیں، دھرم اور شہد کی نہریں بنوائے ہیں، یہودیوں کے لئے یہاں کی ترقی کے اسباب پیدا کر رہے ہیں، یافا کے قریب اپنا نیا شہر بنوا رہے ہیں، لہذا یہودی آبادی بیکر وڈ سے ہم پر تاش

مکمل کی فکر میں ہیں اور اس سے کئی کی قوت پیدا کر رہے ہیں اور ہم نے فلسطین کو اپنا قومی وطن بنا رکھا ہے۔
اس لئے ہم کسی روک ٹوک کو برداشت نہیں کر سکتے۔

عربوں کا کہنا ہے: "فلسطین ہمارا ہے، وہاں ہماری اکثریت ہے، یہاں کی ترقی کی اسکیموں میں
بچاس لاکھ پونڈ برطانیہ ان سے وصول کر چکا ہے، دس لاکھ پونڈ ہندو گاہ جیتہ کی تعمیر میں انھوں نے ادا کئے
ہیں اور یہودیوں کو حق حاصل نہیں کہ وہ فلسطین کو اپنا وطن بنائیں۔"

لیکن انگریزوں نے کسی ایک کی نہیں سنی اور جو کچھ انھیں کرنا تھا کیا، فلسطین کے ساتھ شرق یروں کو
بھی اپنی قومیت میں لے لیا اور عبدالقادر (شریعت حسین کے دوسرے بیٹے) کو یہاں کا برائے نام قرار دیا۔
اس کے بعد شام میں عمان اور عقبہ کو بھی شرق یروں میں شامل کر کے یہاں ہوائی اڈے بنائے۔

یہ تو سب کچھ ہوا اور برطانیہ و فرانس نے اپنی قومیت کے قیام کے لئے بہت کچھ بندوبست کر لیا، لیکن حقیقت
یہ ہے کہ شام و فلسطین دونوں جگہ قومیت ناکام ثابت ہوئی اور اس کا تباہی سبب یہ تھا کہ شام میں فرانسیسیوں
نے عیسائی اقلیت کا اور فلسطین میں برطانیہ نے یہودی اقلیت کا ساتھ دیا۔

انگریزوں نے شریعت حسین اور اس کے خاندان والوں میں عرب کا بطوارہ کر کے یہ سمجھا تھا
کہ چونکہ یہ خاندان نبوت سے ہیں اس لئے اہل عرب مطمئن ہو جائیں گے اور اس خاندان

سعودی عرب

کی وساطت سے وہ ان پر قابو پا سکیں گے، لیکن غیر توقع کے خلاف مکمل ایکہ گہ شریعت حسین قطعاً حکومت کا اہل
ثابت نہیں ہوا اور اس نے اہل حجاز کو سخت برہم کر دیا، اس نے حجاز میں قدیم انداز کی ملکیت قائم کر کے سب کچھ
اپنے ہی لئے مخصوص کر لیا، ملازمین کو تنخواہیں بھی بروقت نہ دیتا تھا، اور آمدنی کا ایک ایک پیسہ اپنے ہاتھ میں
رکھ کر جو چاہتا تھا صرف کرتا تھا، فوج کو پورا راشن بھی دیتا تھا اور بدلتی کا وہ عالم تھا کہ وہاں کسی کی
حکومت ہی نہیں ہے، ان حالات کے تحت حجاز کی رعایا بہت پریشانی محسوس کرتی تھی اور برہمی کے آثار سرگرم نمایاں تھے۔
اس سے قبل عرب کے وسطی حصہ میں وہابی تحریک شروع ہو گئی تھی جو ترکی کی خلافت کو تسلیم نہ کرتی تھی۔

یہ تحریک اس قدر مقبول ہوئی اور عربوں نے اس کا اتنا ساتھ دیا کہ حجاز کے دونوں مقدس مقامات مکہ اور مدینہ
پر بھی وہاںوں کا قبضہ ہو گیا اور عبدالعزیز وہابی بیڑے نے نجد کی فرانزوائی کا اعلان کر دیا۔ لیکن ۱۳۰۲ھ

میں اسے ترکوں نے نکال دیا۔ اس وقت اس کے بچے ابن سعود کی عمر ۱۵ سال کی تھی اور اپنے آپ کے ساتھ
بھی علی غازی میں چلا وطن کی زندگی بسر کر رہا تھا، ۱۵ سال کی عمر میں اس نے علی غازی میں چھوڑا اور صحنہ
سی جماعت کے ساتھ نجد کے باغ تخت پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی جدوجہد مسلسل جاری
رکھی اور دس سال کے اندر اس کی قوت اتنی ہو گئی کہ ترکی حکومت کو تسلیم کرنا پڑا اور اس نے شریعت حسین

کو دوڑے کر ابن سعود کے مقابلہ پر آمادہ کیا۔ شریعتین نے ابن سعود کے بھائی کو گرفتار کر لیا اور اسے مجبور کیا کہ ترکی حکومت کی سیادت کو تسلیم کرے اور ایک ہزار پونڈ سالانہ ادا کرے۔ یہ واقعہ سلسلہ کا ہے اور یہی ابتدا تھی شریعتی خاندان اور وہابی جماعت کی مخالفت کی جواب تک چلی جا رہی ہے۔

ابن سعود کے متبعین زیادہ تر غادر و بدوش قبائلی لوگ تھے جن کی معاش کا انحصار صرف لوٹ مار پر تھا اور وہ کسی ایک جگہ محکمہ درہتے تھے، ابن سعود نے وہابی تحریک کے سلسلہ میں یہ بھی کوشش کی کہ ان قبائلی کی قرآنہ عادت کو ترک کرایا جائے، چنانچہ اس نے ایک ادارہ احوال کے نام سے قائم کر کے ان لوگوں کو اسکا ممبر بنایا اور ملت و فاداری لیکر ان کی فوجی تنظیم شروع کر دی۔ ان لوگوں کو اس پر بھی آمادہ کیا گیا کہ وہ صحرائے عرب کے شاداب مقامات میں مستقل سکونت اختیار کر کے کاشت کی طرف متوجہ ہوں۔ اس تحریک میں ابن سعود کو بہت کامیابی ہوئی اور چند دن میں وہ بیہول کی قوت بہت بڑھ گئی۔

سلسلہ میں ابن سعود نے ترکوں سے بدلہ لینے کے لئے آسا پر قبضہ کر لیا اور وہابی حکومت خلیج فارس تک وسیع ہو گئی۔ اس کے بعد جب سلسلہ میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو اتحادیوں نے پانچ ہزار پونڈ ماہوار کی رشوت دیکر ابن سعود کی فخریہ فاداری خریدی اور شرط یہ قرار پائی کہ شریعتین کو جو مدد دیکر رہا ہے وہ وہابی حکومت کے خلاف استعمال نہ کی جائے۔ لیکن سلسلہ میں شریعتین نے اس عہد کو توڑ کر وہابیوں کے شہر نجا پر قبضہ کر لیا۔ ابن سعود نے چند دن بعد ہی اہامک محلہ کر کے پھر فرما کر چھین لیا اور حسین کے بیٹے عبدالقادر کو بھی گرفتار کر لیا جو بعد میں قید سے بھاگ نکلا۔

سلسلہ میں ابن سعود نے پھر اپنی طاقت کا سلسلہ شروع کیا اور عراق کی حدود تک اپنی حکومت کو وسیع کر لیا۔ اب برطانیہ نے محسوس کیا کہ وہابیوں سے گفتگوئے مصالحت ضروری ہے اور اس غرض سے سے کویت میں کانفرنس طلب کی گئی۔ لیکن اہم کوئی معاہدہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ ابن سعود نے برطانیہ کی اس پالیسی کو پسند نہ کیا کہ عراق، عمان اور شرق ابد کے میں شریعتی خاندان کے افراد کو حکمران بنایا جائے، دوسری طرف برطانیہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ ابن سعود عراق کے متعدد ملک پہنچے جائے۔

سلسلہ میں جب مصطفیٰ کمال نے منصب خلافت کو قبول کیا تو شریعتین نے اپنے بیٹے عبداللہ کے احوال سے اپنے خلیفہ کو اطلاع کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برطانیہ نے ابن سعود اور شریعتین دونوں کو اور دیکھا کہ وہ بھی۔ ابن سعود نے شریعتین کا اعلان خلافت منکرین طرف سے اس پر حملہ کر دیا۔ شرق ابد کے عراق میں ان کے حامی نہ ہوئے اور برطانیہ کی ہوائی فوج نے ہم گرا کر ابن سعود کے شخصاً دوسری طرف ہٹ کر دیکھ کر اس کی طرف کو شکست دیکر اس نے مکہ پر قبضہ کر لیا۔ اس

خج کے بعد جب ابن سعود نے مکہ میں داخل ہوا تو اس کا معاملہ فوج کی حیثیت سے نہ تھا بلکہ ایک عوامی وفد قایم کی حیثیت تھا اس کا اثر لوگوں پر بہت بڑا اور کہا جاتا ہے کہ ساٹھ سال کے بعد پہلی بار لوگوں نے سعودیوں کے زمانہ میں امن و سکون کے ساتھ لوگوں کو جگ کرنا نصیب ہوا۔

اب ابن سعود، نجد و حجاز دونوں کا ایک تھا۔ لیکن ان دونوں مقامات میں دیر سے قبائلی عداوت کو دھڑکاتا تھا۔ وسطی ریگزار عرب کے باشندے جو دینی اصول کے پابند تھے، اول تو یہ بھی حجازیوں کے سن دشمن تھے اور دوسرے وہ دیکھتے تھے کہ مکہ میں ہرجا و مرجا سے بھرا آئے ہیں اور آزادی کے ساتھ وہاں ممنوعات کا استعمال ہوتا ہے جو ان کے مسلک کے خلاف تھا۔ اس نے نجد کے قبائل بیتاب تھے کہ حجاز پر حملہ کر کے وہاں کے قبائل کو محال دیں، لیکن ابن سعود نے اپنے قبائل کے جذبات کو غلطی تدبیروں سے دبا دیا اور اسی دوران میں اس نے جدہ سے مکہ تک ریل اور موٹر سروس جاری کر دی، کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد سلسلہ میں جتنے حجاج مکہ میں جمع ہوئے اس سے قبل کبھی نہ جمع ہوئے تھے۔ لیکن جماعت انجمن اب تک پریم تھی اور ابن سعود کے متعلق کہتی تھی کہ وہ اپنی اصول سے ہٹ گیا ہے اور عرب میں موثرین چلا کر اور فائزین قائم کر کے اصول مذہب سے منحرف ہو گیا ہے۔ ابن سعود نے نجد کے سرداروں کو بلا کر بہت کچھ سمجھایا لیکن وہ ڈانٹے اور بھڑکتے کر کے حدود عراق پر حملہ کر دیا۔

برطانیہ نے عراقیوں کی مدد کے عملہ آوروں کو پسپا کر دیا اور جب یہ نجد واپس آئے تو ابن سعود نے ان کے بہت سے لیڈروں کو قتل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نجد و حجاز ایک ہو گئے اور ابن سعود کی حکومت بجز آخر سے لیکر خلیج فارس تک اور بحر ہند سے صحرائے شام تک قائم ہو گئی۔ اب اس کے لئے خطرہ کی چیر مرچ وہ علاقہ تھا جو شمال میں عراق کے زیر اقتدار تھا۔ اس لئے سلسلہ میں اس نے شرق اوسط اور عراق کے درمیان کا علاقہ بھی لینا چاہا لیکن برطانیہ اسے کسی طرح گھبراہٹا کر رکھنا تھا کیونکہ فلسطین سے خلیج فارس کا راستہ اسی طرح سے تھا اور اس کی پائپ لائن بھی یہیں بھی ہوئی تھی۔ آخر کار ابن سعود کو مجبوراً یہ خیال ترک کرنا پڑا اور اس نے شرق اوسط میں محدود اقتدار اور عراق میں فیصل اور فہصل کے بیچ سے صلح کرنا پڑی۔

اس کے بعد صرف جنوبی حصہ ایسا رہ گیا تھا جہاں وہ کامیاب ہو سکتا تھا اس علاقہ ابن سعود نے سنبھال لیا۔

بحر ہند پر عراق نے بہت کوشش کی کہ سعودی عرب کو اپنی فوجت میں لے لے لیکن وہ اس کا سبب نہ ہوا اور اب سرزمین عرب میں تھا کہ ابن سعود کی حکومت اس سے جدا ہے آپ کی سمجھ میں نہ آئے گی کہ اس کی حکومت ہے اور عراق ملک کے اکثر حصے بالکل پاک ہے۔

ابن سعود کے تعلقات اب امریکہ سے زیادہ وسیع ہو گئے ہیں اور اس نے اپنے ہاں کے پٹرولی چشموں کا ٹھیکہ امریکن کمپنی کو دے رکھا ہے جس سے اس کو لاکھوں پونڈ کی آمدنی ہوتی ہے۔ لیکن امریکہ جن ترکیبوں سے کام لے رہا ہے، وہ بڑی شاطرانہ ہیں وہ آہستہ آہستہ یہاں پوری طرح چھایا جا رہا ہے اور ابن سعود ڈالروں کی لالچ کی وجہ سے اس حقیقت کو نظر انداز کرتا جا رہا ہے کہ سرزمین نجد و حجاز کو امریکہ کے موجودہ درہمور کی وجہ سے ایک نیاک دن امریکہ کی کالونی بن جاتا ہے اور اس کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے سلب ہو جاتا۔

عراق جنگ عظیم سے قبل عراق کو کوئی بین الاقوامی خصوصیت حاصل نہ تھی۔ دوران جنگ میں سب سے پہلا دنیا کی توجہ اس کی طرف اس وقت مبذول ہوئی جب برطانوی جہاز ٹاؤن شند کو ترکوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی اور اس کے بعد اُس وقت جب مارچ ۱۹۱۷ء میں بغداد ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر برطانوی فوج کے ہاتھ آیا۔

اس کے بعد سلسلے میں بصرہ، بغداد اور موصل کے علاقے بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس وقت یہاں کی آبادی ۲۰ لاکھ عراقیوں، ۵۰ لاکھ کردوں اور ڈھائی لاکھ اسیروں پر مشتمل تھی۔ ترکوں کا یہاں اب کوئی اثر باقی نہ رہا تھا اور برطانیہ نے کرنل اسے ٹی ولسن کی تجویز کے مطابق برطانوی افسروں کے ذریعہ سے یہاں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، لیکن چونکہ وائٹ ہال کی پارٹیوں میں عراق کے مستقبل کے متعلق اختلاف تھا، اس لئے کوئی خاص پالیسی اس باب میں متعین نہ ہوئی تھی۔

خود عراقیوں کے ذہن میں بھی اپنے مستقبل کے متعلق کوئی واضح صورت نہ تھی، لیکن وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد وہ کسی اور حکومت کی غلامی میں نہ دیر لے جائیں۔

وٹسن یہ چاہتا تھا کہ عراق، برطانیہ کی تولیت میں آجائے۔ اس نے لکھا تھا کہ ”اگر ہم کو عرب کے متعلق اپنی پالیسی کو کامیاب بنانا ہے تو ہم کو ان سے سیاسی تعلقات استوار کر کے اپنی تجارتی پالیسی کو مضبوط بنانا چاہئے۔“

وٹسن کا مقصود یہ تھا کہ عراق کو ترقی دیکر وہ اقتصادی، تعلیمی اور صنعتی حیثیت سے یورپ کی سطح پر لے آئے، عربوں کے قبائلی نزاعات کو دور کر کے انھیں متحد و متفق کر دے، لیکن یہ کوئی آسان بات نہ تھی، اور اس کے لئے بڑا زمانہ درکار تھا، تاہم اس نے بارہ مہینے تک اس تجویز میں سرکھایا اور اسی قلیل مدت میں برطانیہ کے سرکردہ پونڈ صرف ہو گئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر کار سلسلے وٹسن واپس بلا لیا گیا۔

اس کے بعد جب بغداد میں یہ اعلان کیا گیا کہ عراق برطانیہ کی تولیت میں رہے گا، تو یہاں بغاوت شروع ہو گئی، کیونکہ وہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد کسی اور کی غلامی قبول نہ کر سکتے تھے۔ اس ہنگام میں بہت

برطانوی افسران مارے گئے اور علاقہ فرات کا درمیانی حصہ برطانیہ کے قابض سے باہر ہو گیا۔
کرنل لارنس نے ایک خط کے ذریعہ سے ۲۲ جولائی ۱۹۱۷ء کے ٹائٹس میں ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے
لکھا تھا کہ :-

”دو سال کا انتظار کرنے کے بعد عراقیوں کے پیمانہ صبر کا لبریز ہوجانا تعجب کی بات نہیں۔ جو حکومت ہم نے
یہاں قائم کی ہے وہ انگریزی وضع کی ہے اور انگریزی زبان ہی میں وہ کام کرتی ہے۔ ۴۵۰ افسران
سے ایک بھی عراق کا باشندہ نہیں ترکوں کے زمانہ میں ۷۰ فی صدی افسران عراق ہی کے تھے ہماری ۸۰ ہزار فوج
صرف خرابیوں پولیس ادا کرتی ہے اور سرحد کی حفاظت دنگرانی نہیں کر سکتی۔ ترکوں کے عہد میں یہاں کی فوج
میں عربی افسر ۶۰ فی صدی تھے اور ۹۵ فی صدی دوسرے فوجی عہدہ دار بھی عرب ہی تھے، لیکن انگریزوں
نے ان سب کو نکال دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں اور عراقیوں میں برطانیہ کے خلاف بڑھتی پیدا ہو گئی“

جولائی اور اکتوبر کے درمیان، عراقیوں سے جنگ کرنے میں دو ہزار برطانوی اور ہندوستانی افسران
کام آئے اور ۴۵۰ عرب مارے گئے۔ اس خلفشار اور بد امنی کے دور کرنے کی صرف ایک ہی تدبیر تھی اور یہ
کہ حکومت کا ذمہ دار زیادہ تر عربوں کو قرار دیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اکتوبر میں کرنل ولسن کی جگہ سر پرسی کاکس بھیجے گئے، انھوں نے بغداد میں سربراہ اور وہ عراقیوں کو بلا کر کامیاب
بنانے کی ہدایت کی اور اس طرح تیرہویں صدی کے بعد سب سے پہلے عراقیوں کو ذمہ دار حکومت تفویض ہوئی۔
لیکن سچ پوچھئے تو یہ حکومت پھر بھی برطانیہ ہی کی تھی کیونکہ اہم معاملات کا فیصلہ اس نے خود اپنے ہی ہاتھ
میں رکھا تھا۔

۱۹۱۷ء میں جب قاہرہ کانفرنس منعقد ہوئی تو استعماری سکرٹری ولسٹن چرچیل نے یہ فیصلہ کیا کہ عراق
سے برطانوی فوج ہٹائی جائے اور اس کی جگہ ہوائی فوج رکھی جائے۔ اس سے منشاء یہ تھا کہ فوجی مصارف تو
کم ہو جائیں لیکن دباؤ پہلے سے زیادہ بڑھ جائے، اسی کے ساتھ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ یہاں کوئی بادشاہ مقرر
کیا جائے، اس کے انتخاب میں بھی برطانیہ اور عراق کے درمیان کافی اختلاف رہا، لیکن آخر کار شریف فیصل
کی سیادت عراقیوں نے منظور کرنی۔

شریف فیصل فیصل کی تمام زندگی مصائب ہی میں بسر ہوئی تھی، وہ ابھی نوجوان ہی تھا کہ سلطان عبدالحمید
کے زمانہ میں مقید کر کے قسطنطنیہ بھیجا گیا، اور پھر حجاز میں عرصہ تک مقید رہا۔ اس کے
بعد عرب بغاوت کی قیادت میں سرگرداں رہا اور آخر آخر جب دمشق کی حکومت اسے ملی تو فرانسیسیوں نے اسے
نکال دیا۔ اب عراق کی حکومت ملی تو اس کی پوزیشن اور زیادہ نازک ہو گئی، ایک طرف تو عراقی رعایا اس

بنیں تھی کیونکہ وہ برطانیہ کا نامزد شخص تھا، دوسری طرف شام میں فرانسیسی پڑوسی اس سے برہم تھا کیونکہ دمشق سے اس نے اس کو نکالا تھا، پھر چونکہ وہ سنی تھا اس لئے ایرانی بھی خوش نہ تھے اور اپنے مقامات مقدسہ ایک سنی کے ہاتھ میں دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ شریفی خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے ابن سعود سے اس کی دشمنی پہلے ہی سے تھی، انگریز عراق کا بادشاہ ہونے کے بعد فیصل کی پوزیشن بہت نازک ہو گئی لیکن چونکہ وہ آدمی تھا بڑے صبر و استقلال کا اس لئے اس نے ان تمام مشکلات پر آہستہ آہستہ قابو پایا۔

فیصل کو ہدایت کی گئی تھی کہ جب وہ اپنی حکومت کا اعلان کرے تو اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دے کہ اقتدار اعلیٰ برطانوی ہائی کمشنر کا رہے گا، لیکن فیصل نے اس سے انکار کر دیا اور کہا کہ: ”حسب معاہدہ برطانیہ نے مجھے خود مختار فرمانروا تسلیم کیا ہے اور اس کے خلاف میں کوئی اعلان نہ کروں گا“

آخر کار ۱۹۳۲ء میں ایک مزید معاہدہ کی رو سے برطانیہ نے اسے عراق کا خود مختار فرمانروا تسلیم کر لیا۔ ۱۹۳۲ء میں شام کی فرانسیسی حکومت نے بھی اس کی یہ حیثیت مان لی اور شام و عراق کے درمیان سلسلہ تجارت قائم ہو گیا۔ ایرانیوں کو مطمئن کرنے کے لئے اس نے بغداد سے تہران تک سڑک بنوا دی، اور ایران سے بھی معاہدہ ہو گیا۔

اب صرف ابن سعود رہ گیا تھا جس سے صلح و آشتی کے تعلقات قائم کرنا مشکل تھا، لیکن فیصل برابر اس کوشش میں لگا رہا اور آخر کار ۱۹۳۳ء میں وہ خود ابن سعود سے ملا اور اس طرح آپس کے تعلقات میں جو تخی پائی جاتی تھی وہ بہت کم ہو گئی۔

موصل موصل کی زیادہ تر آبادی کردوں پر مشتمل ہے اور اسی لئے جنگ کے بعد بھی ترکوں کا یہ اصرار باقی رہا کہ موصل کو ترکی حکومت میں شامل رہنا چاہئے۔ جمہوریت ترکی کا ارادہ یہ تھا کہ موصل کے ۵ لاکھ کردوں کو ان ۳۰ لاکھ کردوں کے ساتھ ملا دے جو کہستان زدغا کے شمال میں آباد ہیں اور اس طرح پورے کردستان کو اپنی قلمرو میں شامل کر لے۔ لیکن اتحادیوں نے چاہتے تھے کہ شمالی کردستان کو علاوہ ایک مستقل حکومت بنا دیا جائے اور اگر موصل کے کرد آبادی چاہے تو اس حکومت میں شامل ہو جائے۔ لیکن جب اتحادیوں اس میں کامیاب نہ ہوئے تو انھوں نے اپنی پالیسی بدل کر یہ ظاہر کیا کہ موصل کا عراق کی حکومت میں شامل رہنا ضروری ہے۔ کردوں کو یہ بات بہت ناگوار گزری کیونکہ عراقیوں سے ان کے تعلقات ہمیشہ سے خراب رہے تھے اور انھوں نے اس تحریک کا مصلحہ بھی کیا، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے اور آخر کار موصل، عراق کو دینا طے پا گیا۔

پہلے سال میں یہ صوبہ فرانس کو دینا تجویز ہوا تھا اس لئے شام کی فرانسیسی حکومت نے اس تجویز کی مخالفت کی، لیکن آخر کار اس نے بھی اسے تسلیم کر لیا، اس شرط کے ساتھ کہ یہاں کے پٹرولی چشموں کی آمدنی سے ایک چوتھائی اسے دیا جائے۔

چنانچہ اس کے بعد ایک کروڑ پونڈ کے سرمایہ سے عراقی پٹرول کمپنی وجود میں آئی اور حیفہ سے طرابلس تک پائپ لائن بچھا دی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عراقی حکومت اقتصادی حیثیت سے برطانیہ و فرانس کی دست دھڑ ہو گئی اور اب ہر وقت اس اندیشہ سے دوچار ہے کہ بصورت بد امنی مغربی طاقتیں اپنے اپنے سرمایہ کی حفاظت کے بہانہ سے فوراً اپنی فوجیں یہاں بھیج کر قبضہ کر لیں گی۔

انقلاب حیدرآباد کی داستان پر پہلی کتاب

”مشاہدات“

یعنی
حضرت ہوش بنگرامی

(المخاطب بہ نواب ہوشیار جنگ بہادر)

کے خود نوشتہ سوانح زندگی جو نہ صرف اپنی بلند انشاء بلکہ سیاسیات و مذہبیات پر بھی ایک بے لاگ حکیمانہ تبصرہ کے لحاظ سے اپنے رنگ کی بالکل پہلی کتاب ہے۔ جناب ہوش کی عمر کا بڑا حصہ ریاستوں ہی میں بسر ہوا ہے اور ان کی پائلکس کو شکل ہی سے کسی نے ان سے بہتر سمجھا ہوگا۔ یونہی اس میں رام پور، بھوپال، گوالیار، ادے پور، آگرہ، جے پور وغیرہ متعدد ریاستوں کے دلچسپ حالات نظر آتے ہیں، لیکن کتاب کا وہ حصہ جو ریاست حیدرآباد اور اس کے انقلاب سے تعلق رکھتا ہے، دیکھنے کی چیز ہے، کیونکہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد ہی حیدرآباد کی تاریخ انقلاب پیش کرنا تھا۔

جناب ہوش ایک چوتھائی صدی سے حیدرآباد کی پائلکس اور دربار عثمانی کے رجحانات کا مطالعہ کر رہے تھے اور نظام کے یہاں ہر وقت کی حضوری کی وجہ سے وہاں کی ان تمام اندرونی سازشوں اور ریشہ دواہیوں سے واقف تھے جو کسی دوسرے کے علم میں آ ہی نہ سکتی تھیں۔ رضا کار تحریک، ارباب حکومت کی سازشیں، سچے مشیروں کی مشکلات، دربار عثمانی کے جبر و مالکیت، سیرت نظام کی عجیب غریب خصوصیات، پولیس ایکشن کی داستان، اور اسکے بعد نظام اور اہل ملک پر اس کا رد عمل۔ اگر آپ ان تمام واقعات کی صحیح تصویر دیکھنا چاہتے ہیں تو ”مشاہدات“ ملاحظہ فرمائیے۔

کاغذ: امیتی - حجم: ۶۰ صفحات - ۱۰ تصاویر - نفیس جلد - قیمت: دس روپیہ علاوہ محصول - نیچر پبلشرز - لکھنؤ

مصر

برطانوی شہنشاہیت نے جس چالاکی و ہوشیاری سے مصر میں آہستہ آہستہ اپنے پاؤں جمائے ہیں اس کی مثال دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مصر کے ساتھ برطانیہ کی دلچسپی سب سے پہلے اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب بنوین اول نے برطانیہ کے مشرقی ذرائع آمد و رفت کو دریائے نیل کی طرف سے خطرہ میں ڈال دیا تھا، لیکن جب بنوین سوم کے عہد میں نہر سوئز طیار ہوئی تو یہ دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی۔

ہر چند یہ کہ اپنی فرانس کی تھی لیکن ہر ملک اس کے حصے خرید سکتا تھا اور چونکہ اس کا تعلق سرزمین مصر سے تھا اس لئے اصولاً چاہئے یہ تھا کہ مصر ہی اس میں زیادہ حصہ لیتا، لیکن خدیو مصر کے پاس روپیہ نہ تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ نے نصف سے زیادہ حصے خرید لئے اور اس مالی تعلق کے پیدا ہوجانے کی وجہ سے مصر پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کا خیال اس کے دل میں پیدا ہوا۔ اتفاق سے اس کے بعد ہی عربی پاشا نے شروع کیا اور برطانیہ کو فوجی تسلط قائم کرنے کا بھی بہانہ ہاتھ آگیا۔ لیکن یہ تسلط جس ہوشیاری سے ۲۲ سال تک قائم رکھا گیا وہ برطانوی سیاست دانی کی بڑی زبردست چال ہے۔

مصر، سلطنت عثمانیہ میں شامل تھا اور خدیو مصر اس کا ماتحت تھا، لیکن انگریزوں نے اس تعلق کی اہمیت کو کبھی چیلنج نہیں دیا بلکہ اس کو بدستور قائم رکھنے کی کوشش کی تھے کہ جو انگریز خدیو مصر کی ملازمت میں تھے انہوں نے انگریزی ٹوپی بھی اتار چھین لی اور ترکی ٹوپی پہننا اختیار کیا۔ فوج کی ملازمت میں انہوں نے پاشا کا لقب اختیار کرنا منظور کر لیا اور مصریوں کے ساتھ ایسے کھل مل گئے گویا وہ مصر ہی کے اصل باشندے تھے۔

آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ سلسلہ برابر ۲۲ سال تک جاری رہا یہاں تک کہ سلسلہ کی جنگ شروع ہوئی اور برطانیہ کو اپنا نقاب دوستی اتار چھیننے کا موقعہ ہاتھ آگیا۔ چونکہ اس جنگ میں ترکی، اتحادیوں کے خلاف تھا اس لئے دسمبر ۱۸۸۲ء میں برطانیہ نے اعلان کر دیا کہ ”مصر، ہرجمبش کی حفاظت میں لے لیا گیا ہے اور آئندہ وہ برطانیہ کی تولیت میں رہے گا۔“

لیکن اس کے بعد بھی برطانیہ نے اپنی پالسی کو گول مول ہی رکھا اور ظاہر یہی کیا کہ مصر خود مختار ہے،

چنانچہ عبدالکلیق کا لقب بدل کر سلطان کر دیا اور یہ ظاہر کیا کہ موجودہ تولیت عارضی ہے اور صرف جنگ کے زمانہ تک محدود رہے گی۔

ہر چند مصر کو اتحادیوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کی دعوت نہیں دی گئی اور اس کی حیثیت ایک غیر جانبدار ملک کی سی تھی، لیکن جیسا کہ لارڈ لائیڈ نے ظاہر کیا تھا دراصل وہ نیوٹرل تھا اور نہ لڑائی میں شریک، اس کی حیثیت ایک فوجی کمپ کی سی تھی، جہاں اتحادی فوجوں کا زبردست اجتماع رہتا تھا اور مصریوں کے تمام ذرائع پیداوار و ترقی یا تو اتحادیوں کے تصرف میں تھے یا بالکل معطل اور ان کا مستقبل بالکل برطانیہ کے رحم و کرم پر منحصر تھا۔ اگر مصر واقعی صحیح معنی میں نیوٹرل رہتا تو سبھی غنیمت تھا، لیکن ہوا یہ کہ مصر کو شرکت جنگ میں دعوت نہ دینے کے باوجود اس کے فوجی دستوں کو ترکوں کے خلاف استعمال کیا گیا، وہاں کے ہزاروں غریب کاشتکاروں کو زبردستی بھرتی کر کے میدان جنگ کے طرف بھیجا گیا، اس لئے دریائے نیل کا سارا علاقہ مارشل لاء کے تحت آ گیا، دو لاکھ اتحادی فوجوں کے لئے پانی اور لکڑی لانے کے لئے مصر ہی کے غریب کاشتکاروں کو مجبور کیا گیا، غلہ اور روٹی کی تمام پیداوار نہایت معمولی قیمت دیکر لے لی گئی، اور مصر کے تمام خیر اور اونٹ فوج کے لئے زبردستی حاصل کئے گئے۔

ان حالات میں مصری قوم کی پریشانیوں اور بے چینیوں کا جو عالم رہا ہوگا، ظاہر ہے، اس کے بعد جب لڑائی ختم ہوئی اور دس دن کے شرائط صلح کے لئے اپنے بارہ نکات پیش کئے تو مصر کو کچھ امید قائم ہوئی کہ غالباً وہ آزاد ہو جائے گا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ صلح کانفرنس میں اس کو شرکت کی اجازت نہیں مل سکتی، حالانکہ جیشہ اور حجاز کے نمائندوں کو اس کی اجازت مل گئی تھی۔

اس واقعہ سے مصریوں کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ سمجھ گئے کہ برطانیہ کا ارادہ مصر کے باب میں کیا ہے، چنانچہ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ زاغلول پاشا کی سیادت میں وفد پارٹی قائم ہوئی اور مصر کی مکمل آزادی کا مطالبہ شروع ہوا۔ اس کا جواب برطانیہ نے یہ دیا کہ زاغلول پاشا اور اس کے دو ساتھیوں کو مارچ ۱۹۵۷ء میں جلا وطن کر دیا۔ اس واقعہ سے قوم پرستوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا اور انھوں نے تشدد کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کیا، قاہرہ کے چاروں طرف ریل، تار اور سڑکوں کا سلسلہ تباہ و برباد کر کے، قاہرہ کو گویا ساری دنیا سے تعلق کر دیا۔ سوڈان ریلوے کو بھی متعدد جگہ نقصان پہنچایا۔ گویا اس سلسلہ میں عام عوام نیز بی نہیں ہوئی پھر بھی کہیں کہیں مصریوں کے جذبات زیادہ مشتعل ہو گئے اور اس سلسلہ میں کچھ انگریزوں کی جانیں بھی تلف ہوئیں۔ اب برطانیہ نے محسوس کیا کہ معاملہ زیادہ سنگین ہے اور اس نے لارڈ ایلن بری کو ہنگامہ فرو کرنے کے لئے مامور کیا۔ انھوں نے مصر آکر دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تحریک کسی خاص جماعت سے متعلق نہیں ہے بلکہ ساری

مصری آبادی کے جذبات مشتعل ہو چکے ہیں اور طلبہ و کلاء، اخبار نویس اور چھوٹے بڑے طبقہ کے تمام افراد اس میں شامل ہیں۔ چنانچہ اس نے ان حالات کے پیش نظر مصر کے بیڈروں کو بلا کر ان سے قیام امن ہو سکے کی اپیل کرنا مناسب سمجھا۔ اس مشورہ میں زاغلول پاشا کو بھی بلا کر شریک کیا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تشدد کی پالیسی کو تو مقرر نے منسوخ کر دیا، لیکن اس کی جگہ اسٹریک، ہلٹنگ وغیرہ شروع کر دی۔ برطانیہ نے اب ایک کمیشن لارڈ لنز کی سرکردگی میں مصر کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے امور کیا اور اسے جو رپورٹ پیش کی اس سے برطانیہ کو معلوم ہوا کہ جب تک قیادت نہ اٹھ جائے گی، مصریوں کو اطمینان نصیب نہ ہوگا۔ لیکن قیادت کا اٹھنا لینا اور مصر کا آزاد و خود مختار ہونا دو جدا چیزیں تھیں۔ اور زاغلول کا مطالبہ مکمل آزادی ہی کا تھا، اس لئے زاغلول کو پھر جلا وطن کر دیا گیا اور فروری ۱۹۵۷ء میں برطانیہ اور مصر کے درمیان ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے برطانیہ نے اپنی قیادت کو ختم کر دی، لیکن اور شرطیں ایسی لگا دیں کہ مصر کے ہاتھ بدستور بندھے رہے۔ مثلاً ایک شرط یہ تھی کہ مصر میں غیر ملکیوں کے مفاد اور اقلیتوں کے تحفظ کا مسئلہ برطانیہ کے ہاتھ میں رہے گا، دوسرے یہ کہ مصر پر بیرونی حملہ کی صورت میں برطانیہ مدافعت کرے گا، تیسرے یہ کہ سوڈان کا مسئلہ بالکل علیحدہ متصور ہوگا۔ اور چوتھے یہ کہ برطانیہ کے ذریعے مواصلات جو مصر سے تعلق رکھتے ہیں ان کی حفاظت بھی برطانیہ ہی کرے گا۔

پھر کہنے کو تو یہ معاہدہ ہو گیا، لیکن مقصد برطانیہ کی نزاع اس سے ختم نہیں ہوئی، کیونکہ ان شرائط میں سے بعض کی توضیح و صراحت مصر کو تسلیم نہ تھی۔ مثلاً لارڈ لنز کا کہنا یہ تھا کہ برطانوی ذریعے مواصلات سے صرف نہر سوئز ہی مراد نہیں ہے بلکہ ہندوستان، آسٹریلیا، ایران، عراق اور چین تک پہنچنے والے خشکی، تری اور ہوا کے تمام راستے اور ذریعے مواصلات اس میں شامل ہیں۔

مصر اس کے تسلیم کرنے کے لئے طیارہ تھا کہ ان ذریعے مواصلات کی حفاظت برطانیہ کے لئے ضروری ہو لیکن وہ یہ مانتے کے لئے طیارہ نہ تھا کہ حفاظت کی یہ خدمت مصر سے چھین کر خود برطانیہ اپنے ہاتھ میں لے۔ سوڈان کے معاملہ میں بھی مصر، برطانیہ سے متفق نہ تھا، سوڈان بڑی وسیع سرزمین ہے اور دریائے نیل کا منبع و مخرج ہے، اس لئے مصر کی آبپاشی بالکل سوڈان پر منحصر ہے۔ مصر کا کہنا یہ ہے کہ نہر سوئز پر اقتدار کے باب میں برطانیہ جو دلیل پیش کر سکتا ہے، وہی دلیل سوڈان کے باب میں مصر کی طرف سے پیش کی جاسکتی ہے کیونکہ مصر کی تمام اقتصادیات سوڈان پر منحصر ہیں۔ علاوہ اس کے مصریوں کی ایک دلیل یہی تھی کہ مصر سوڈان کی آبادی ایک ہی مذہب، ایک ہی زبان، ایک ہی کلچر رکھتی ہے اور محمد علی پاشا بانی خیر طوم کے زمانہ میں مصر و سوڈان ایک ہی مملکت میں شامل تھے۔

اس کا جواب برطانیہ یہ دیتا ہے کہ سوڈان کو برطانیہ ہی نے ہمدردیوں سے چھینا تھا، پھر اس کے بعد ریلوں اور بندرگاہوں کی تشکیل و تعمیر اور روٹی کی پیداوار بڑھانے میں برطانیہ نے بہت صرف کیا ہے اس لئے سوڈان پر ان کا بھی مقرر کے برابر حق ہے۔

بہر حال مصر و برطانیہ کا یہ اختلاف ۱۹۳۷ء سے برسرِ جلا آ رہا ہے اور آج تک اس کا فیصلہ نہیں ہوا۔ فواد کی تخت نشینی کے بعد جب مصر کی نئی کابینہ میں زاعنول پھر وزیر اعظم کی حیثیت سے نامور ہوئے تو اکثریت اس کے ساتھ تھی اور اگر برطانیہ، زاعنول پاشا پر اعتماد کر کے اپنا نقطہ نظر دوستانہ انداز میں اس کے سامنے پیش کرتا تو بہت ممکن ہے کہ مصر کا جھگڑا طے ہو جاتا، لیکن برطانیہ نے زاعنول کو ہمیشہ ایک داخلی و انقلابی کی حیثیت سے دیکھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کی قومی تحریک نے زیادہ تشدد آمیز صورت اختیار کر لی اور قتل و خونریزی کے واقعات بھی پیش آنے لگے، یہاں تک کہ ۱۹۵۲ء میں سوڈان کا گورنر جنرل مارٹن لائیو گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زاعنول کو استعفا دینے پر مجبور کیا گیا اور شاہ فواد نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب ۱۹۵۲ء میں عام انتخاب ہوا تو زاعنول کی وفد پارٹی کو اکثریت حاصل ہو گئی۔ لیکن برطانوی بائی کٹس نے پھر زاعنول کی مخالفت کی اور وہ کابینہ میں نہ آ سکا۔ آخر کار ۱۹۵۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور سارے مصر نے اس کا ماتم کیا۔

زاعنول کی وفات کے بعد مصطفیٰ نجاس نے وزارتِ داخلہ کی جو قوم پرست جماعت کے افراد پر مشتمل تھی اس لئے برطانیہ اور مصر کے تعلقات بدستور کشیدہ رہے۔ ۱۹۵۲ء میں برطانیہ کی لیبر حکومت نے مصر سے نیا معاہدہ کیا جس کی رو سے مصر کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی فوج کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ لڑائی کے زمانہ میں برطانیہ، مصر کی سرزمین پر اپنی فوجیں جمع کر سکے گا۔ برطانوی بائی کٹس کا عہدہ بھی منسوخ کر دیا گیا اور سوڈان کی بابت یہ کہا گیا کہ وہ دونوں حکومتوں کے زیر اثر رہے گا لیکن نجاس کی وزارت نے ان شرائط کو رد کر دیا۔ اور شاہ فاروق نے برطانیہ کی تحریک پر وزارت توڑ دی اور عنانِ حکومت خود اپنے ہاتھ میں لیکر تمام اختیارات اسماعیل صدیقی کو دیدئے جس نے ۱۹۵۳ء سے ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ اکتوبر میں ایک نئے کانٹینیٹیشن کا اعلان کیا گیا جس کی رو سے بادشاہ کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جب چاہے پارلیمنٹ کو توڑ کر سینٹ کے ۱۰۰ ممبروں میں سے ۶۰ ممبروں کو نامزد کر دے۔ انتخاب ممبران کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ پہلے ۵۰ سالے دہندوں کے لئے ایک کا انتخاب کرے، لیکن وفد پارٹی کو کوئی موقع انتخاب میں شرکت کا نہیں دیا گیا، اس کے اخبارات



کو بند کر دیا گیا، اس کے لیڈروں کو قید میں ڈال دیا گیا اور انتخاب کے وقت سیکڑوں آدمی زخمی ہوئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدیقی کو اکثریت حاصل ہو گئی۔

لڑائی کے بعد سلاطین اور سلاطین کے درمیان مقرر نے بہت کمایا، روٹی کی قیمت تقریباً ایک ہزار گنا بڑھ گئی اور دس سال تک مصریوں کے پاس اتنی دولت رہی کہ وہ سیاسی اصلاحات کے ہنگامہ کو قائم رکھ سکے، لیکن اس کے بعد جب کساد بازاری شروع ہوئی تو پھر یہاں ڈکٹیٹر شپ کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

۱۹۳۷ء تک مصر کا سوال بدستور اپنی حالت پر رہا، نہ سمیز پر اسے اقتدار حاصل ہوا نہ سوداں پر۔ اور بظاہر اثرات میں کچھ کمی بھی ہوئی تو وہ ایسی نہ تھی کہ مصر اپنے آپ کو ایک خود مختار و آزاد حکومت کر سکے۔

کٹائی کو روکنے
اس سے آگے خطرہ ہے !
• کٹائی کو سمجھنے کے لئے اس کو سمجھنا ہی ہے
بلوئے تو ہے وہ ملک کی ترقی کا رکن ہے اس لئے
کٹائی کا شروع ہونے سے روکنے

سعا لین

کی ایک ٹیبلٹ میں ملتا ہے، بہت سارے یہ دواؤں کی
خون کو روکنے کی کٹائی کو روکنے کی طبیعت کو سکون
پہننے کے لئے، بلکہ اس کی ترقی کو ترقی کے نظام میں
توازن پیدا کرنے کے لئے
کو خوش گوار بنائے گا،
قیمت کی پیشکش میں ملے گی
بہتر دواؤں کا نام ہے



standard

ہندوستان اور پاکستان کی تمام
کتابوں کے لیے
نوٹس رول ایک ڈپو۔ محمد علی
بہت ساری

ایران کی بیداری

ایران، کبھی ترکی سلطنت کا حصہ نہیں رہا۔ لیکن ترکی کی طرح دوسری محققہ اسلامی حکومتوں سے اس کے بھی تعلقات بہت وسیع رہے ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ایران، برطانیہ اور روس کی شاہنشاہیت کا شکار رہا اور اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۷ء میں ایک معاہدہ کی رو سے اس کا جنوبی حصہ برطانیہ کے زیر اثر آگیا اور شمالی حصہ پر روس کا اقتدار قائم ہو گیا۔ جب ۱۹۱۷ء میں زاریت کا خاتمہ ہوا تو روس کی گرفت ڈھیلی پڑی اور برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ کرزن کو موقع مل گیا کہ ایران کو پوری طرح برطانیہ کے زیر اثر لے آئے، لارڈ کرزن کی ایکم پر مبنی کہ خلیج فارس سے بحر کاہین (افخر) تک تمام حصہ برطانیہ کے اقتدار میں لا کر اسے برطانوی ہند کا ایک سرحدی صوبہ قرار دیدے۔ چنانچہ جب ۱۹۱۷ء میں ترکوں کو شکست ہوئی تو برطانیہ نے ایران کے خاص خاص اہم مقامات پر اپنی فوجیں متعین کر دیں اور شاہ ایران کے لئے سوا اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ برطانیہ کے مطالبات کو تسلیم کرے۔ اس طرح ۱۹۱۷ء میں ایران سیاسی و فوجی حیثیت سے برطانیہ کے زیر اثر آگیا۔

لیکن یہ حالت عرصہ تک قائم نہیں رہی، کیونکہ ۱۹۱۷ء میں بالشیو کوں نے شمالی ایرانی رضا شاہ کے صوبہ گیلان پر حملہ کر کے اسے سوویت رہنما میں شامل کر لیا اور مازندران کے زرخیز میدانوں پر بھی دھاوا بول دیا اور ایرانیوں کو شکست ہوئی۔

انہیں ایرانی کاسکوں کی شکست خوردہ افروں میں ایک فوجان افسر ایسا بھی تھا جس کی پرورش مازندران کے ایک قارم میں ہوئی تھی اور جو اپنے ملک کی تباہی کو دیکھ دیکھ کر بہت متاثر ہوا تھا یہی فوجی افسر ۱۹۱۷ء میں تہران آیا اور صرف تین ہزار سپاہیوں کی مدد سے اس نے ایران کے تمام بڑے بڑے محل کو گرفتار کر لیا اور شاہ ایران کو مجبور کیا کہ اسے سب سالار اور وزیر حربیہ مقرر کرے۔ اس فوجان کا نام رضا خان تھا۔ یہ ایران کی کاسک فوج میں جو ڈار کے فوجی افسروں کی گزرائی میں تھی، چند سال سے ملازم تھا۔

گورضا خاں کو نہ پہلک کی اعانت حاصل تھی اور نہ وہ کوئی منظم جماعت رکھتا تھا، لیکن محض اپنی شخصیت اور جذبہ قوم پرستی کی وجہ سے وہ کامیاب ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۰۷ء میں وہ ایران کا وزیر اعظم ہو گیا اور شاہ ایران سیاحت یورپ کے لئے چلے گئے۔ شیک یہی وہ وقت تھا جب مصطفیٰ کمال ترکی جمہوریت قائم کر کے اس کی عنان صدارت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس لئے رضا خاں نے بھی اس کے متبع میں ایران کو جمہوریت میں تبدیل کرنا چاہا، لیکن یہاں کی مذہبی جماعت نے اس کی سخت مخالفت کی اور وہ مصطفیٰ کمال کے نقش قدم پر چل کر ایران میں وہ انقلاب پیدا نہ کر سکا جو ترکی میں رونما ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ایران جمہوریت بن سکی اور نہ شاہنشاہیت رہی، کیونکہ شاہ ایران موجود نہ تھے۔ آخر کار ۱۹۰۷ء میں کانسی ٹیوٹ اسمبلی نے رضا خاں کو بادشاہ بنا دیا اور اس نے شاہ رضا پہلوی کے نام سے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

چار سال کے اندر رضا شاہ نے ایران کے لئے بہت کچھ کیا۔ امن و سکون کے قیام کے ساتھ ہی جاگیردارانہ نظام کو بھی کمزور کر دیا اور برطانوی فوجوں کو بھی جنوبی ایران سے ہٹ جانے پر مجبور کیا۔ یہاں تک شطرنج کے شیخ نے بھی جو برطانیہ کی حمایت میں ایران کے ایک ٹکڑے کا خود مختار فرمانروا بنا ہوا تھا، حکومت تہران کو تسلیم کر لیا۔

اس میں شک نہیں کہ ایران اب آزاد تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ میں آزادی کا قیام مشکل ہے جب تک عہد حاضر کے ذرائع ترقی سے کام نہ لیا جائے۔ اس لئے رضا شاہ کے سامنے بڑا مشکل مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایران کو کس طرح مغربی اصول پر عمل کر کے ترقی کی راہ پر لگائے۔ وہ مغربی ماہرین کی خدمات حاصل کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ اپنے سیاسی اغراض سے خالی الذہن ہو کر آئیں گے نہیں اور خود ایران کے لوگوں میں یہ اہمیت نہ تھی کہ وہ از خود ترقی کی راہیں تلاش کریں، آخر کار مجبور ہو کر نظم و نسق سلطنت میں اسے مغربی ماہرین سے کام لینا ہی پڑا۔ مالیات کا شعبہ ایک امریکی ماہر ڈاکٹر لمپیاگ کے سپرد کیا، کٹمنس کے لئے بلجیم کے ماہرین سے مدد لی اور شعبہ تعلیم میں فرانسیسی ماہرین سے۔ اس حد تک تو کوئی اندیشہ نہ تھا کیونکہ فرانس بلجیم اور امریکہ کی سیاسی اغراض ایران سے وابستہ نہ تھیں۔ لیکن روس اور برطانیہ سے معاملہ کرنے میں اسے بڑا تردد تھا۔ ایک طرف ماوراء قاف اور ماوراء بحر اخصر کا علاقہ سوویت یونین میں شامل ہو گیا تھا اور بالشیوک کوشش کر رہے تھے کہ قاف سے قلع قارس تک ذریعہ آمد و رفت قائم ہو جائے۔ دوسری طرف برطانیہ تھا جو اینگلورشین آئل کمپنی کا اجارہ دار تھا اور جس میں ۲۰ ہزار ایرانی کارکن تھے۔ راموز سے آبادیوں تک پائپ لائن ڈال لی تھی اور یہ کوشش بدور ہی تھی کہ بغداد سے تہران

تک ریل جاری ہو جائے اور ایران و ہندوستان کے درمیان ہوائی تعلق قائم ہو سکے۔
 ایران کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت تھی وہ ذرائع حمل و نقل تھے، سڑکیں کے نہ ہونے کی وجہ سے ایران کے ایک حصہ میں غلہ کی پیداوار پڑی سڑا کرتی تھی اور قحط کی وجہ سے لوگ مرتے رہتے تھے، اسی کے ساتھ ایک دوسرا سوال یہ بھی تھا کہ اگر نقل و حمل کے لئے سڑکیں یا ہوائی راستے بنائے بھی جائیں تو ان پر بیرونی اقتدار نہ ہونا چاہئے۔ رضا شاہ نے بڑی ترکیب سے کام لیا اور وہ یہ کہ برطانیہ اور روس دونوں کو انھوں نے راضی رکھنے کی کوشش کی۔ بغداد سے طہران تک ریل جاری کرنے کی جو اسکیم برطانیہ نے بنائی تھی اس کو تو رضا شاہ نے منظور نہیں کیا لیکن اس کی جگہ سڑک بنانے اور قاہرہ سے کراچی تک ہوائی راستہ قائم کرنے کی اجازت دیدی اس شرط کے ساتھ کہ ہوائی اڈے ایران کی ملکیت متصور ہوں گے، دوسری طرف روس کو اجازت دیدی کہ وہ ماسکو سے طہران تک ہوائی سروس قائم کر سکتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ ایران بحر کاہین سے خلیج فارس تک ریلوے جاری کرے گا۔ اس لائن کا آخری اسٹیشن شمال کی طرف بحر کاہین کے ساحل پر ایسی جگہ مقرر کیا گیا جو روس کے اقتدار سے باہر تھا اور جنوب کی طرف کا آخری اسٹیشن خلیج فارس کا ایک ایسا مقام تجویز کیا گیا جو برطانیہ کے اثر و اقتدار سے باہر تھا۔

رضا شاہ نے اس خطرناک کھیل کو بہت ہوشیاری سے کھیلا اور بغیر اپنی خود مختاری و آزادی کو صدمہ پہنچائے، روس اور برطانیہ کے صرف پر اس نے ایران کے لئے ذرائع حمل و نقل و مواصلات فراہم کر دئے۔

اقتصادی آزادی کا حصول البتہ زیادہ مشکل کام تھا، کیونکہ ایران باوجود اس کے کہ اس کی اقتصاد میں پوزیشن بری نہیں ہے، وہ کفیل بالذات نہیں۔ کپڑا، شکر اور مشینری سب باہر سے آتی ہے۔ کپڑے کے ذخیرہ پانچ کارخانے رضا شاہ نے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں قائم کر رکھے۔ لیکن شکر اور مشینری کے متعلق وہ کچھ نہ کر سکے۔ ایران سے جو چیزیں باہر جاتی ہیں ان میں پٹرول، قالین پھل اور افیون خاص چیزیں ہیں، لیکن وہ پٹرول کے مارکیٹ کے لئے برطانیہ کا دست نگر ہے۔ ایندھن پٹرول آئل کمپنی اسمیں شک نہیں ایران کے ریلوے میں اتنی رقم ادا کرتی ہے کہ اس کا جو تھائی بجٹ اسی سے پورا ہوتا ہے، لیکن آمدنی کی یہ کوئی اطمینان بخش صورت نہیں ہے، علاوہ اس کے اہل ایران جب یہ دیکھتے ہیں کہ کمپنی اپنے سفری حصہ داروں کو ۲۰ لاکھ پونڈ سے زیادہ ہر سال تقسیم کرتی ہے تو ان کو رشک آتا ہے کہ خود ان کے حصہ میں جو کچھ آتا ہے وہ کتنا کم ہے، حالانکہ زمین اور پٹرول دراصل سب انھیں کا ہے۔

قائیں اور پھلوں کی برآمد میں ایران دوسرے ملکوں کے محکمہ کرڈو گیری اور خصوصیت کے ساتھ روس کے رحم و کرم کا محتاج ہے۔ افیون کی برآمد بین الاقوامی میلانات حاصل ہوتے ہیں۔ مجلس اقوام نے ایران سے کہا کہ افیون کے بجائے وہ دوسری اشیا بھیجے، رضا شاہ نے جواب دیا کہ وہ پوست کی کاشت میں کمی کرنے کے لئے طیار ہے، بشرط آنکہ ایران کی دوسری پیداوار محصول کرڈو گیری کم کر دیا جائے، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

رضا خاں نے بین الاقوامی مسائل میں بھی ایران کی خودداری قائم کرنے میں بڑا کام کیا۔ ۱۹۲۱ء سے پہلے شاہ ایران کی حکومت تہران کی چار دیواری کے اندر محدود تھی، لیکن رضا شاہ نے ہر صوبہ پر اقتدار قائم کر کے صحیح معنی میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ رضا شاہ نے پارلیمنٹ بھی قائم کی، لیکن وہ ایسی ہی بیدست و ہاتھی جیسے ترکی اور اطالیہ کی پارلیمنٹ۔ حکومت دراصل فوج کے بل پر کی جاتی تھی جو ستر ہزار تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تھی۔ رضا شاہ نے جبریت فوجی بھرتی کی تحریک شروع کی تو علماء نے اس سے اختلاف کیا لیکن جب رضا شاہ نے ان کو بہت عزت و احترام کے ساتھ ان کے لیڈروں کو پارلیمنٹ میں جگہ دیدی تو یہ مخالفت ختم ہو گئی۔

ایران کے بہترین سپاہی وہاں کے خانہ بدوش قبائل میں ملتے ہیں، لیکن رضا شاہ کے سامنے یہ مسئلہ بڑا مشکل تھا کہ وہ ان کی سپاہیانہ فوج کو بھی قائم رکھے اور ان کی لوٹ مار کی عادت کو بھی ترک کرائے۔ اس نے یہ ترکیب اختیار کی کہ ایسے قبائل کے چند خاندانوں کو تو مولشی پالنے کے لئے مخصوص کر دیا اور باقی خاندانوں کو لاشکار بنانے کی کوشش کی اور انھیں زراعتی علاقوں میں آباد کیا۔ اسی کے ساتھ اس نے قبائلی علاقوں کے چاروں طرف لاشکاروں کو مالکانہ حقوق دیکر بٹا دیا اور ان کی کافی مدد کی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی و ایران کے حالات میں بہت مماثلت نظر آتی ہے مثلاً یہ کہ دونوں جگہ تنہا ایک سپاہی نے قوم میں بیداری پیدا کی غیر ملکی رعایا کو جو مراعات حاصل تھیں وہ دونوں جگہ ختم ہو گئیں، نظم و نسق میں مغربی اصول و دونوں جگہ اختیار کئے گئے، پھر بھی دونوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ ترکی کا انقلاب ایک ایسی قوم کا انقلاب تھا جو اس سے قبل قوم کے مفہوم سے نا آشنا تھی، برضات اس کے ایران کا انقلاب بہت پرانی قوم کا انقلاب تھا جس میں مختلف جماعتیں شامل تھیں اور سب ملک کی آزادی و خود مختاری کے لئے کوشاں تھیں۔ مصطفیٰ کمال نے عزائم پسندی کے قیود کو بہت کے ساتھ دور کیا اور رضا شاہ کو اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ مصطفیٰ کمال نے ترکوں کا روایتی کلچر بدلنا چاہا اور رضا شاہ نے قدیم ایرانی کلچر کو بڑی حد تک بدستور قائم رکھا۔

افغانستان

pisala
gaira miller
Solomon
Miller
D. C. Miller

بیسویں صدی کی ابتدا میں تمام اسلامی ممالک میں مغربی تقلید اور قومیت کا احساس پیدا ہو گیا تھا لیکن اس میں ہر ملک کا مہیا نہیں ہوا۔ اور انھیں ناکامیاب ممالک میں افغانستان بھی تھا۔

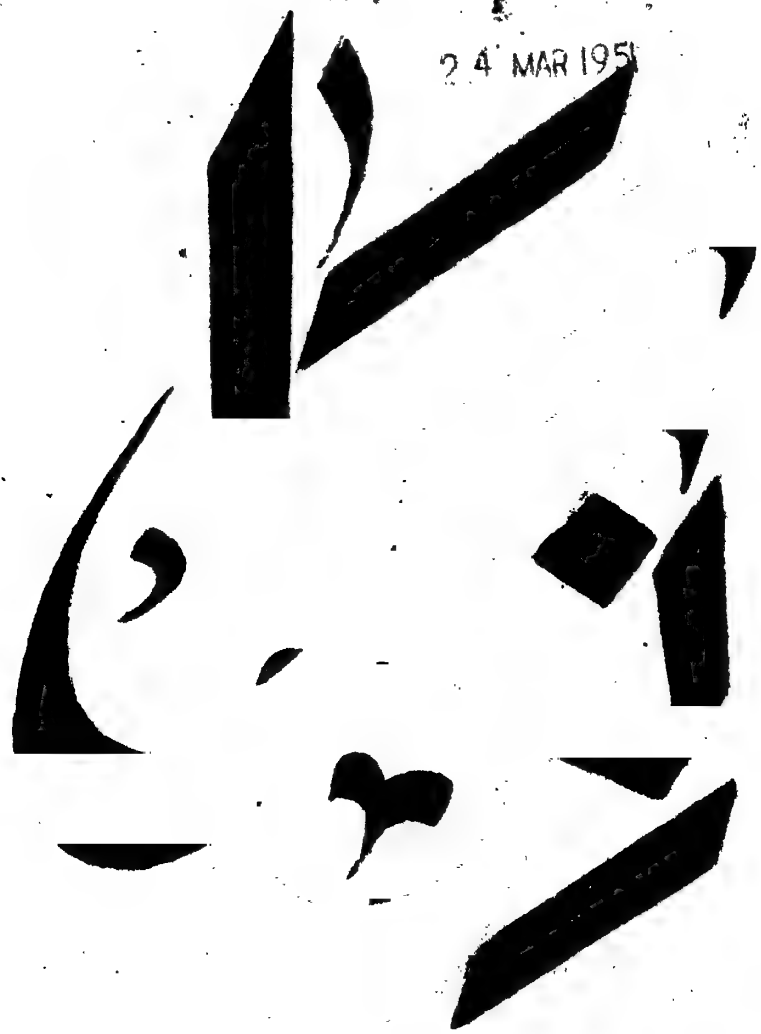
افغانستان عرصہ سے روس و برطانیہ کے درمیان ایک بفر (BUFFER) حکومت کی حیثیت رکھتا تھا اور اس طرح اسے کافی نقصان پہنچ رہا تھا۔ یعنی روس و برطانیہ دونوں یہ چاہتے تھے کہ وہ حد قاصل کی حیثیت سے قائم رہے لیکن اس کو پوری طرح آزاد بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ جب سلسلہ میں انقلاب روس ہوا اور روس کی طرف کا خطرہ دور ہو گیا تو امان اللہ نے سوچا کہ اب برطانیہ کی مدد و حمایت کی ضرورت نہیں ہے اور اس سے بھی اس کے ملک کو آزاد ہونا چاہیے، اسی کے ساتھ چونکہ اس وقت برطانیہ، ترکی کا دشمن تھا اور مذہب خلیفہ کا اثر افغانستان میں کافی تھا، اس لئے امان اللہ نے سلسلہ میں ایک مہم درہ غیر برطانیہ کے خلاف روانہ کی، لیکن افغانی سپاہ جس کے پاس نہ ہوائی جہاز تھے، نہ مشین گنیں، برطانوی فوج کا مقابلہ نہ کر سکے اور آخر کار سلسلہ میں افغانستان کو برطانیہ سے صلح کرنا پڑی۔ اسی کے ساتھ امان اللہ نے روس سے بھی معاہدہ کر لیا اور یہ سمجھ کر اب وہ برطانیہ اور روس دونوں کے دست اندازی کی طرف سے مطمئن ہو گیا ہے، ایران اور ترکی کی تقلید میں مغرب قسم کی اصلاحات شروع کیں۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہوا کیونکہ اول تو وہ خود قومی لیڈر کی حیثیت نہ رکھتا تھا اور دوسرے یہ کہ مذہبی قدامت پرستی افغانستان میں بہت زیادہ تھی اور طاؤں کا اثر لوگوں پر بہت قوی تھا نتیجہ یہ ہوا کہ سلسلہ میں امان اللہ کے خلاف سارے ملک میں خود کش پیدا ہو گئی اور سلسلہ میں اسے معزودا کر دیا گیا۔ اس کے بعد کئی سال تک اضطراب و بیجاں کا دور قائم رہا اور کوئی جمہور حکومت نہ کر سکا۔ آخر کار بادشاہ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیا اور اس نے ۷۰ لاکھ پونڈ نقد، دس ہزار راکٹیں اور ۵۰ لاکھ کارٹر برطانیہ سے قرض لیکر حکومت کو سنبھالا لیکن نومبر ۱۹۷۸ء میں وہ قتل کر دیا گیا اور اس کا بیٹا کاہر شہ ۱۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

5151

رجسٹر نمبر ۴۶۴

پتہ: سید احمد علی شاہ
ہندو نگر (دہلی)

24 MAR 1951



قیمت فی کاپی ۱۰/-

۱۹۵۱

تصانیف نیاز فنجوری

ہندو مسلم زراع کو ہمیشہ یکے اُختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

من ویزدال

مذہبی استفسارات و جوابات

من ویزدال کا دوسرا حصہ

مولانا نیاز فنجوری کی ۴۴ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کا نام جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرنے کے نام انواع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اقوت عا کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت لگئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، خضر کی حقیقت مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں، یونش اور دھا رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تازہ نئی علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

صفحہ ۲، ۴ صفحات، مجلد سات، روپیہ آٹھ آنے
(میر) علاوہ محصول

اس حصہ میں جن سبیل حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کف، معجزہ و کرامت، انسان مجبور ہے یا مختار، مذہب و عقل، طوفان فوج، یونش اور دھا، خضر کی حقیقت مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں، یونش اور دھا، ماہی حسن یوسف کی داستان، قارون، سامری، علم غیب، دعا و توبہ، لقمان، عالم برزخ، یا جوج ماجوج، ہارثہ، حوض کوثر، امام ہندی، نور محمدی اور مل صراط، آتش فرود و ضخامت ۲۴ صفحات، کاغذ سفید و بیز قیمت علاوہ محصول یا پتھر روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

جمالستان

حسن کی عتاریاں

ترغیبات جنسی یا

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور انساؤں کا مجموعہ نگارستان ملک کا دوسرا مجموعہ جس میں بیان قدر بیان میں جو درجہ قبول حاصل کیا اسکا انداز اور بانی کی خیال بہترین شاہکار کے اس سے ہو سکتا ہے اسکے متعدد مضامین علاوہ بہت آجائی و شری سائل کا غیر زبانوں میں نقل کئے گئے ہیں اس میں بھی آپ کو نظر آئے گا ہر افسانہ ادب میں متعدد افسانے دادی اور ہر مقالہ لایبی جگہ معجزہ ادب کی مقالات ایسے افسانہ کئے گئے ہیں شہیت کشا ہر اس ادب میں متعدد جگہ لکھے آئینوں میں نہ تھے اسلئے افسانہ کئے گئے ہیں جو ادب میں ختمات گئی زیادہ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول سے یا پتھر روپیہ آنے علاوہ محصول

اور دوسرے افسانے حضرت نیاز کے افسانوں کا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشا لطیف کا بہترین ہمزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے جھوٹے ادب کی کئی دگش تحقیق پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کے مذہب عالم فراموشی کے واقع میں کہ مدد کی اس کتاب میں آپ کو بہت آجائی و شری سائل کا غیر زبانوں میں نقل کئے گئے ہیں اس میں بھی آپ کو نظر آئے گا ہر افسانہ ادب میں متعدد افسانے دادی اور ہر مقالہ لایبی جگہ معجزہ ادب کی مقالات ایسے افسانہ کئے گئے ہیں شہیت کشا ہر اس ادب میں متعدد جگہ لکھے آئینوں میں نہ تھے اسلئے افسانہ کئے گئے ہیں جو ادب میں ختمات گئی زیادہ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول سے یا پتھر روپیہ آنے علاوہ محصول

شہوانیات مجلد اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری غیر فطری قسموں کی تاریخ افسانہ ہیبت پر دہنا شرح بد کہ حقائق تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا کہ فحاشی نیاں ہیں اور کس طرح لکھیں گئے ہیں کہ مذہب عالم فراموشی کے واقع میں کہ مدد کی اس کتاب میں آپ کو بہت آجائی و شری سائل کا غیر زبانوں میں نقل کئے گئے ہیں اس میں بھی آپ کو نظر آئے گا ہر افسانہ ادب میں متعدد افسانے دادی اور ہر مقالہ لایبی جگہ معجزہ ادب کی مقالات ایسے افسانہ کئے گئے ہیں شہیت کشا ہر اس ادب میں متعدد جگہ لکھے آئینوں میں نہ تھے اسلئے افسانہ کئے گئے ہیں جو ادب میں ختمات گئی زیادہ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول سے یا پتھر روپیہ آنے علاوہ محصول

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پُرانی ہندوستانی جہاز ران کمپنی

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ

ممبئی سے

عدن، جدہ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی
اور محوش اسلوب سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ضرورت پڑنے پر
دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کر سکیں گے

مزید معلومات کے لئے

حسب ذیل پتہ پر لکھئے

طرز مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ بینک اسٹریٹ ممبئی



کھانسی کو روکنے

اس سے آگے خطرہ ہے !

• کھانسی کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہ کیجئے یہی کھانسی اگر
پرہیز نہ جائے تو بہت جلد خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اس سے
کھانسی کے شروع ہونے ہی سے دو گئے

سعالمین

کی ایک ٹیبلٹ میں سکڑ کر آست - پست - یہ صرف منہ کی
غرائض کو روکنے کی کھانسی کو دور کر دینے کی طبیعت کو سکون
پہنچانے کی بلکہ سانس کی نالیوں کو صاف کر کے نظام میں
توازن پیدا کر دینے کی بلکہ سانس
کو خوشگوار بنانے کی یہ
قیمت فی شیٹ صرف پانچ آنے
ہمدرد و خانہ دقہ صوبی



Humdard

اب بھی وقت ہے

کہ آپ "من ویزداں" کے دونوں حصے تیرہ روپے (بیس روپے)
میں مومہ محصول حاصل کر سکیں گے۔ ورنہ
غالباً دو ماہ کے بعد آپ کو یہ کتاب کسی قیمت پر نہ مل سکے گی۔
اب صرف ۱۰۰ نسخے اس کے باقی رہ گئے ہیں اور آئندہ کسی
بڑی کتاب کا چھپنا آسان نہیں "من ویزداں" ایک
صحیفہ انسانیت ہے جن کے مطالعہ کے بغیر آپ مذہب
کی صحیح روح نہیں سمجھ سکتے۔
منیجر نگار

رعایتی قیمت

مجموعہ ستضار و جواب

کی تیسری جلد

ضخامت ۵۰۰ صفحات جس کی قیمت علاوہ محصول تین روپے ہے
لیکن اب آپ کو مومہ محصول صرف دو روپیہ میں مل سکتی ہے منیجر نگار

نگار کی جلدیں

جولائی تا دسمبر ۱۹۵۷ء - ۹ روپے مکمل علاوہ محصول لاگ

۱۹۵۷ء

۱۹۵۷ء تا ۱۹۵۸ء کی مکمل جلدیں فی جلد ۱۰ روپے علاوہ محصول
منیجر نگار لکھنؤ

ادیٹر: نیاز فتحپوری



جلد ۵۹ فہرست مضامین مارچ ۱۹۵۷ء شمارہ ۳

۴	ملاحظات	باب لاسنفسار۔ رحمت ہلال، باؤنچین، زندگی کی تدبیریں۔ ۴۴
۹	ترقی پسند تحریک	دورنہ (نظم)۔۔۔ افسر یوپی احمد گری۔ ۵۰
۲۱	ہندوستان کا اولین ریاضی دان	تخلیق آدم (نظم)۔۔۔ عبدالباقی رفعت۔ ۵۱
۳۵	اردو کا پہلا واسوخت	اسہرن زار (نظم)۔۔۔ فضا بن فیضی۔ ۵۲
۳۴	دنیا کے مہاجرین	منظومات۔۔۔ دانش پرباک گڈھی، صفیہ نسیم، سید شاہ ولی الرحمان، ملک۔ ۵۵
۳۶	آرٹ کی ماہیت اور آغاز	مطبوعات موصولہ۔ ۵۶

ملاحظات

یہ ہے ہندوستان اور یہ ہے چین!

یہ ہے ہندوستان! جس کو آزاد ہوئے تین سال سے ڈاڑھ ہونچکا، لیکن آزادی کی سچی خوشی اس وقت تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ کسی ملک کی آزادی کے ساتھ سچے پہلا تصور جو انسان کے ذہن میں قائم ہوتا ہے وہ اس احساس ہے وابستہ ہے کہ حکومت ہماری ہے، لیکن اس تصور کے ساتھ سچی خوشی پیدا ہوتی ہے اس یقین کے ساتھ کہ ملک کی اقتصادی بے چاری (جس کا سبب غیر ملکی حکومت کے استحصال کو قرار دیا جاتا ہے) ختم ہو جائے گی اور ملک کی آبادی اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرے گی۔

یہ تھا وہ یقین جس نے ہندوستان کے عوام کو آزادی کی جنگ پر آمادہ کیا اور یہ تھی وہ امید جو ملک نے کانگریس حکومت سے قائم کی تھی۔ لیکن تین سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ حکومت اب ملک کو آزاد کرانے کے کام میں نہیں لگ رہی اور اقتصادی و سیاسی روز بروز

بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا اصرار کے بعد سے حکومت کو چند در چند مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے جو داخلی و خارجی سیاست دونوں سے تعلق رکھتی ہیں اور عالمگیر اقتصادی بد حالی کا اثر قدرتنا ہندوستان پر بھی پڑنا چاہئے، لیکن غالباً حکومت کو بھی اعتراض کرنا پڑے گا کہ چند امیرانہ مشکلات کے ازالہ کے لئے اختیار کی جا رہی ہیں، ان میں سے اس وقت تک کوئی کامیاب نہیں ہوئی اور اسی لئے مستقبل کی طرف سے ملک میں عام مایوسی پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ حکومت سرمایہ داروں کی حامی ہے اور اس کی دولت سے مرعوب ہے، حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ جنتا کی طرف اشارہ ہے اور ان کی فلاح و بہبود اس کا اصل مقصد ہے، لیکن کس قدر انفسوس کی بات ہے کہ سرمایہ دار حکومت سے خوش ہے و جنتا بلکہ ہندوستان کا کوئی طبقہ ایسا نہیں جو حکومت کا شاکہ نہ ہو۔

مسلمانوں کو چھوڑنے کو ممکن ہے کہ ان کی مشکلات کا سبب زیادہ تر ذہنی ہو، لیکن آپ ہندوؤں کو کیا کہیں گے جس کی یہاں اکثریت ہے اور جو باہر نظر پر کہہ سکتے ہیں کہ حکومت انھیں کی ہے، لیکن میں نے ہندوؤں کے مختلف طبقات کے خیال معلوم کرنے کی کوشش کی اور مجھے کسی طبقہ کا کوئی انسان ایسا نہیں ملا جس نے حکومت کو اچھے الفاظ سے یاد کیا ہو۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس کا سبب صرف تجارتی و اقتصادی دشواریاں ہیں۔ زمیندار اس لئے برہم ہیں کہ ان کی جاگیریں چھینتی جا رہی ہیں، کاشتکار اس لئے ناخوش ہیں کہ ان سے جبراً غلہ حاصل کیا جاتا ہے اور نئے نئے مطالبات ان پر عائد کئے جاتے ہیں، تجارت پیشہ جماعت اس لئے ناخوش ہیں کہ درآمدی آمد اور حصول لائسنس کی دشواریاں ان کی راہ میں حائل ہیں، مزدوروں کی شکایات یہ ہیں کہ جو مزدوری ان کو ملتی ہے وہ ان کی ضروریات زندگی کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ متوسط طبقہ کو تو خبر پریشان ہونا ہی چاہئے کہ ایک طرف اس غریب کی آمدنی بہت محدود ہے اور دوسری طرف اشیاء کی گزنی ناقابل برداشت حد تک بڑھتی جا رہی ہے ہم سمجھتے ہیں کہ عہد حاضر کی یہ الجھنیں حکومت کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں، لیکن عوام کسی منطق و استدلال کو نوس سنتے، وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ انھیں کھانے کو غلہ، تن ڈھانکنے کو کپڑا ملتا رہے اور جب ان کا یہ مطالبہ پورا نہ ہوگا تو ان میں روتہنا بے چینی پیدا ہوگی۔

اب غور کیجئے کہ حکومت نے اس مسئلہ کا حل کیا سوچا اور وہ کس حد تک اس میں کامیاب ہوئی۔ سچے پہلے غلہ کو لینے کے یہی اولین ضرورت انسان کی ہے۔ چونکہ ہندوستان میں غلہ کی پیداوار اس کی آبادی کے لحاظ سے کم ہے اس لئے حکومت نے زیادہ غلہ آگانے کی اسکیم کو چلایا لیکن لاکھوں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی اس میں کامیابی نہیں ہوئی، یہاں تک کہ طاشن بجائے بڑھنے کے اور کم ہو گیا۔ کپڑے کے کارخانے ہندوستان میں بہت ہیں اور کثیر مقدار میں کپڑا یہاں طیار ہوتا ہے، لیکن غریبوں کی دسترس سے بالکل باہر۔ دودھ گھی وغیرہ کا کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ اول تو حکومت اس کا انتظام نہیں کر سکی کہ یہ چیزیں خالص مل سکیں اور اگر ملیں بھی تو عوام کے سوا کسی اور کو نہیں میسر ہو سکتیں۔ مختلف قسم کے ٹیکسوں کی تعداد بڑھ رہی جا رہی ہے، بیل کا کرایہ پہلے سے دو چند کر دیا گیا ہے اور انصاف حاصل کرنے کے مصارف رشوت ستانی کی وجہ سے بہت زیادہ ہو گئے ہیں، انفرس زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کی طرف سے ملک کا نظریہ ناخوش ہو اور اس لئے حکومت کی طرف سے برقی پمپ جاری ہے۔

حکومت ان حالات سے بخوبی واقف ہے، لیکن چونکہ اسے ڈیپنسٹریشن کا تجربہ حاصل ہے اور اس کے اعمال میں اس کی اہمیت پائی جاتی ہے، اس لئے ہر شعبہ میں تنظیمی پھیل ہوئی ہے اور راعی درعیاء کے درمیان جو رشتہ اعتماد پیدا ہونا چاہئے وہ بالکل مفقود ہے۔

چین ہے! چین کو سامراجی گرفت سے آزاد ہونے کم و بیش صرف ایک سال ہوا ہے، لیکن اسی قلیل مدت میں اس نے جو ترقی و اصلاح کی ہے، حد درجہ حیرتناک ہے۔ ایک سال قبل وہاں کمی پیداوار کی وجہ سے غذا کی قلت کا یہ حال تھا کہ کسی کو پیٹ بھر کھانے کو بھی نہ ملتا تھا، لیکن اب وہاں نہ صرف یہ کمزور و ناقص ختم ہو گیا ہے، بلکہ پہلے سے بہتر غذا ہر شخص کو ملنے لگی ہے۔ پچھلے سال حکومت نے اندازہ کیا تھا کہ چین کا کسان زیادہ سے زیادہ ۵۰ لاکھ ٹن غلہ پیدا کر سکے گا۔ لیکن سال کے اختتام پر معلوم ہوا کہ اس نے ایک کروڑ ٹن سے زیادہ غلہ پیدا کر کے دکھا دیا ہے۔ روٹی کی پیداوار میں بھی اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ وہاں ۴۰ کروڑ ۵۰ لاکھ آبادی کی ضرورتیں اس سے پوری ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح چار، ریشم اور سن وغیرہ کی پیداوار میں بھی غیر معمولی اضافہ نظر آتا ہے۔ لڑائی کے بعد وہاں یہ حالت تھی کہ دیہات میں سناٹا نظر آتا تھا، کھیت ویران، گھر ٹپے ہوئے اور آبپاشی کے ذرائع بالکل درہم برہم ہو چکے تھے۔ بچے کچے کسان جو گھمیں کہیں رہ گئے تھے وہ خود اپنا پیٹ بھی نہ پال سکتے تھے۔ لیکن لڑائی ختم ہونے کے بعد کمیونسٹوں کی حکومت قائم ہونے ہی بالکل رنگ بدل گیا کیونکہ اس نے سب سے پہلے زراعتی اصلاح کی طرف توجہ کی اور امتحاناً اس نے ایک ایچہ رقبہ میں جس کی آبادی دو کروڑ ۶۰ لاکھ تھی، زمینداری و جاگیر داری ختم کر کے کسانوں کو کھیت کا مالک بنا دیا۔ لگان کم کر دیا، زمینداروں نے کسانوں سے جو کچھ وصول کیا تھا وہ بھی انھیں واپس دیدیا۔ ۲۵ فیصدی زراعتی ٹیکس بھی کم کر دیا، ۷ لاکھ ٹن غلہ کی تقاوی بھی تقسیم کی اور پیداوار غلہ کے لحاظ سے بازار کے اشیاء کا نرخ بھی مقرر کر دیا، ٹریڈیٹوں کے ذریعہ سے مزید پیداوار پر کوئی ٹیکس قائم نہیں کیا۔ ذرائع آبپاشی کی مرمت و توسیع کے لئے نہروں اور دریائوں کی صفائی، کھدائی اور بندوں کی مرمت کے لئے ۵۰ لاکھ کسانوں کو امور کیا گیا۔ ان کے کام کا اندازہ یہ کیا گیا تھا کہ وہ ایک سال کے اندر ۵۰ کروڑ کعب میٹر مٹی کھودیں گے اور بندوں کی مرمت کے لئے ۱۶ لاکھ کعب میٹر اینٹ گاڑا لاسکیں گے، لیکن وہاں کے کسانوں نے جس غیر معمولی محنت سے کام کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک سال کے اندر انھوں نے اس سے دو چاند مٹی کھود کر باہر پھینک دی جتنی ۹ سال کے اندر نہر بنانا کی تعمیر کے وقت کھودی گئی تھی۔ ۱۰ لاکھ ایکڑ زمین جو دریائے زرد کی سطحانی کی وجہ سے برباد ہو چکی تھی اور دس سال سے اس میں کاشت نہ ہوئی تھی، پھر کام میں لائی گئی۔ اس کے علاوہ ڈھائی لاکھ ایکڑ زمین جو بنجر ٹپی ہوئی تھی اس میں بھی کاشت کی گئی اور آبپاشی سے غیر معمولی پیداوار حاصل کی گئی۔

حکومت نے سڑک کے لئے ۴۰ کروڑ پودے نصب کرنے کی تجربہ پیش کی تھی، لیکن چینی آبادی نے اسے ۵۰ کروڑ تک پہنچا دیا۔ چینی کاشتکار کی محنت کا صرف ایک پہلو ہے اس نے اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کیا ہے۔ مثلاً وہ

خراب کر دینے والے کپڑوں کا مقابلہ، اچھی کھاد کی فراہمی، طریق زراعت کی اصلاح، نئے آلات کا استعمال، جانوروں کی بھیجی و کشی، تمام باتیں نہایت وسیع پیمانے پر اختیار کی گئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت چین کا گاؤں ایک سال قبل کے گاؤں سے بالکل مختلف حیثیت رکھتا ہے اور اس کا اندازہ اس خط سے ہو سکتا ہے جو ایک لاشکار نے صدر جمہوریہ چین کو حال ہی میں لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ: ”اس سے قبل گاؤں کے بیس خاندانوں میں سے صرف دو گھرنے ایسے تھے جو بیٹ بھر کر کھانا کھا سکتے تھے، آج نہ صرف یہ کہ سارے گاؤں کے لئے غذا کی افراط ہے بلکہ ہزاروں من غلہ کا ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے اور ہماری پیداوار ۵۰ سے ۱۰۰ فی صدی تک زیادہ ہو گئی ہے۔ دودھ دینے والے جانور اور بھیڑوں کی تعداد بھی اب بہت کافی ہے۔“

ایک دوسرے گاؤں کا کسان لکھتا ہے کہ: ”اب سے قبل میرا خاندان گھاس پات پر زندگی بسر کرتا تھا، بدلے پر پیٹھ پٹوں کے سوا کچھ نہ تھا اور گھر بھر کے لئے صرف ایک ہی مکمل تھا، لیکن اس وقت ہم میں سے ہر ایک کے پاس روٹی کی کھان ہے، مکہ کی قرانی ہے اور مکان کے تین کمرے بن گئے ہیں۔“

وہاں کے نوجوانوں کی نئی ڈاکریٹک لیگ نے پچھلے ایک سال میں جتنی ترقی کی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسے ممبروں کی تعداد اس وقت ۳۰ لاکھ ہے۔

مزدوروں اور کسانوں کے لئے تمام ملک میں مختصر مدت تعلیم کے لئے علیحدہ مدارس بہ کثرت قائم کئے گئے ہیں، **تعلیمی ترقیاں** چنانچہ صرف شنگھائی میں ایسے مدارس کی تعداد ۱۱۸ ہے جن میں ۱۳۵۹۴ بچے مزدوروں اور کسانوں کے تعلیم پاتے ہیں اور جن کو حکومت سے وظیفہ ملتا ہے۔ ان کے علاوہ وہاں پندرہ ہسٹیاں بھی قائم کی گئی ہیں جن میں ۶۳ فی صدی کسانوں اور مزدوروں کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔

اس لیگ کے اخبارات بھی نکلتے ہیں جن میں سے ”چائنا پروجس“ کی اشاعت ایک لاکھ ۳۰ ہزار ہے۔ یہ ادارہ کتا ہیں بھی شائع کرتا ہے چنانچہ پہلے سال اس نے ۱۳۷ کتا ہیں شائع کیں جن کی کاپیوں کی تعداد ۶۶ لاکھ تھی۔

اس وقت جمہوریت چین میں ابتدائی مدارس کی تعداد ۵۸ لاکھ ہے جن میں ۳ کروڑ طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ ثانوی مدارس کی تعداد ۳۶۹۰ ہے جن میں دس لاکھ نوے ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔ زیادہ بلند تعلیم کے اداروں کی تعداد ۲۲۷ ہے جن میں طلبہ کی تعداد ایک لاکھ ۲۴ ہزار ہے۔ ان مدارس میں سے ۶۱ فی صدی حکومت کے ہیں باقی پرائیویٹ ہیں۔

چین کی مردم کوہ آبادی کو دیکھتے ہوئے مدارس کی یہ تعداد بھی ناکافی ہے، لیکن سیکڑے کے مقابلہ میں یہ تعداد ۶۰ فی صدی زیادہ ہے۔

ہندوستان کو جب آزادی ملی تو صدیوں سے اس پر کسی ملک نے حملہ نہ کیا تھا اور وہ بالکل منظم حالت میں تھا چین جب آزاد ہوا تو اس حال میں کہ وہ غیر یزیدی و غارتگری کا آماجگاہ بن رہا تھا۔ ہندوستان کو آزادی ملی تو اس طرح جیسے کسی کو ملتی

ہوئی مشین مل جائے، چہن کو آزادی ملی تو اس حال میں چہن کسی کو کھنڈ سوچ دے جائیں لیکن باوجود اس کے ہندوستان میں سال میں بھی کچھ نہ کر سکا اور چہن نے ایک سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو کسی کے دم دگماں میں بھی نہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس فرق کا سبب یہ ہو کہ چہن نے اپنی آزادی اپنا خون بہا کر حاصل کی ہے اور ہندوستان کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

اب سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے کہ **ہندوستان و پاکستان کا تجارتی معاہدہ** پاکستان و ہندوستان کے درمیان ملکوں کی قیمت میں اختلاف پیدا ہو جانے کی وجہ سے دونوں ملکوں کے تجارتی تعلقات ختم ہو گئے تھے اور باہمی اختلافات کا ایک دروانہ اور کھل گیا تھا، لیکن شکر ہے کہ اب ہندوستان نے پاکستانی سکہ کی بڑی سی ہوئی قیمت کو تسلیم کر کے تجارتی تعلق کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔

اول اول جب ہندوستان نے اپنے سکہ کی قیمت کم کی تھی، ہم نے اسی وقت ظاہر کیا تھا کہ یہ پالیسی صحیح نہیں ہے۔ ہندوستان نے سمجھا تھا کہ ایک طرف وہ اپنے یہاں نقد، روٹی اور جوٹے کی پیداوار کو بڑھا کر چیزیں پاکستان سے حاصل کرنے پر مجبور نہ ہوگا اور دوسری طرف اپنی برآمد کو بڑھا کر اپنے مایات میں توازن پیدا کرے گا۔ اسی کے ساتھ اسے یہ خیال بھی تھا کہ پاکستان شاید اپنے سکہ کی قیمت کم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ پھر یہ تو ضرور ہوا کہ ہندوستان کی برآمد کچھ بڑھ گئی، لیکن باقی دو باتیں پوری نہ ہو سکیں، یعنی وہ اپنے یہاں کی پیداوار کو بڑھا سکا اور نہ پاکستان نے اپنے سکہ کی قیمت کم کی کیونکہ گورنر کی بجگے کے چھڑ جانے کی وجہ سے اسے اپنی اشیاء دوسرے ملکوں میں بیچنے کا کافی موقع مل گیا۔ بہر حال اسباب جو کچھ بھی رہے ہوں اب تجارتی نقطہ نظر سے پاکستان و ہندوستان دونوں کو بھر مل جانے کا موقع مل گیا ہے، جو دونوں ملکوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے میں بڑی حد تک معاون ہوگا۔ اور ہو سکتا ہے کہ آئندہ ہندوستان اپنے سکہ کی قیمت کو بڑھا کر پھر اپنی اصلی حالت پر آئے۔ ابھی تک لین دین کی وہ صورتیں پیدا نہیں ہوئیں جو اس سے قبل پائی جاتی تھیں، خاص خاص تاجروں اور بینکوں کو اس کی اعانت ملی ہے، لیکن امید کی جاتی ہے کہ بہت جلد ہندوستان و پاکستان کے درمیان ترسیل زرعی کی وہی صورتیں پیدا ہو جائیں گی جو ڈیڑھ سال قبل پائی جاتی تھیں اور عوام اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

نگار کے پُرانے فائل

۱۹۵۷ء - ۱۹۵۶ء - ۱۹۵۵ء - ۱۹۵۴ء - ۱۹۵۳ء - ۱۹۵۲ء - ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۰ء کے مکمل فائل
قیمت فی مکمل فائل مع محصول دس روپیہ - جولائی تا دسمبر ۱۹۵۷ء قیمت مع محصول پانچ روپیہ -
منیجر نگار لکھنؤ

ترقی پسند تحریک

’ترقی پسند تحریک‘ کے آٹنے والوں کے درمیان ایک طرح کا نظریاتی اختلاف ہے، کچھ لوگ ایسے ہیں جو جذباتی زیادہ ہیں۔ انکا نقطہ نظر غیر متوازن ہے۔ کچھ لوگ ذہنی انتشار کا شکار ہیں اور وہ نہیں جانتے لکھتے کہیں اور کیسے کہیں۔ کچھ لوگ سنجیدہ اور متوازن ذہن بھی رکھتے ہیں۔ ان متوازن اور سنجیدہ لوگوں میں بھی کچھ زرا زیادہ معتدل ہیں اور باقی کم۔ کامل مارکس کا خیال ہے کہ مادی زندگی کا طریقہ پیداوار ہی سماجی، سیاسی اور ذہنی شعبہ ہائے حیات کا تعین کرتا ہے۔ سماجی بقا سے ہم انسانی شعور کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ مارکس کہتا ہے کہ فن کی پرورش میں LABOR کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انسانی سماج سے الگ رہ کر اپنی شخصیت کی تعمیر نہیں کر سکتا۔ فنکار کو چاہئے کہ وہ اپنی روزی کما سکے تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔ بات یہ ہے کہ مارکس تلاش معاش کو تمام انسانی جبلتوں میں اہم ترین جبلت قرار دیتا ہے۔ دوسری جبلتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ اس اولین جبلت سے اشرقیہل کرتی ہیں۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر مارکس ادب اور فن، ادیب اور فنکار کو پرکھتا ہے۔ جب وہ BYRON اور HELLEY کا تجزیہ کرنے لگتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ BYRON چھتیسویں سال مر گیا کیونکہ اگر وہ زندہ رہتا تو ایک رجعت پرست بورژوا ہوتا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ہماری قسمتی ہے کہ HELLEY آئینیسویں برس میں کوچ کر گیا کیونکہ وہ مکمل انقلاب پسند تھا اور وہ اشرک کی محاذ کا ایک سپاہی ہوتا۔ فریڈرک انگلز بھی کم و بیش انہیں خیالات کا حامی ہے۔ وہ ہاننا ہے کہ BALZAC ’شاہیت از روئے قانون‘ کا حامی ہے پھر بھی اسے ایک بڑا ادیب اس لئے سمجھتا ہے کہ اس کی بہتر تصانیف میں اس نازکے برسرِ اقتدار سماج کے زوال پر نوحہ خوانی کی گئی ہے۔ اسے وہ حقیقت پسندی کے مترادف سمجھتا ہے اور اسی لئے تعریف کرتا ہے۔ وہ DANTE کی تعریف اس لئے کرتا ہے کہ جاگیر دارانہ ازمنہ وسطیٰ کے زوال کے زمانہ میں وہ جدید دور کا شاعر تھا۔ اسی لئے تقریباً چھ سو برس بعد انگلز اس تمنا کا اظہار کرتا ہے کہ آج بھی جب ایک نئے تاریخی دور کا آغاز ہو رہا ہے کیا اٹلی ایک نیا DANTE دے گی جو اس پروتاریسی دور کا پہلا نایندہ ہو سکے؟ - GOETHE کی عظمت انگلزر کے نزدیک صرف اس لئے ہے کہ وہ ’خدا سے‘ اہل نظر آتا تھا اور اس لفظ سے اسے سکون حاصل نہیں ہوتا تھا وہ انسانی قدروں کا دلدادہ تھا اور اینگلزر کے خیال میں یہ خصوصیت اسے فیکسیر سے بھی اونچا درجہ دیتی ہے۔ LENIN کا خیال ہے کہ TOLSTOY رجعت پسند ہے اور مثالی تصورات پیش کرتا ہے مگر اس کی عظمت کا راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ اس نے اس انقلاب کی عکاسی کی ہے جو ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک روس میں ظہور پذیر ہوا۔ اس نے روس کے کسانوں، مزدوروں اور عام آدمیوں کی زندگی ہی سے اپنا خام مواد لیا ہے اور یہی اس کی بڑائی کی دلیل ہے۔ روس کے ایک

موسیقار شوشا کو دھچ نے عالمگیر امن کا نفرین منعقدہ نیویارک میں یہ اعلان کیا کہ ہم آرٹ کے میدان میں کام کرنے والے تاریخ کے اس لمحے میں جہد زندگی سے الگ ہو کر رہنے کو اس قریب میں مبتلا نہیں رکھ سکتے کہم دوگی اور اس کی کشمکش سے بلا قریب ہمیں زندگی کے دھچا میں کو دکر اس کا رخ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہمیں امن کے مجاہدوں کی صفت اول میں رہنا چاہئے۔ اور لوئی اراگان نے حکم دیا کہ ”تھوڑی دیر کے لئے مختلف فنون کی پرشور موسیقی بند کر دو کیونکہ اس وقت ایسا زمانہ ہے کہ جو غریب لوگ ہیں وہ نعت کی چھان بین میں رگرواں نہیں رہ سکتے وہ معمولی الفاظ چاہتے ہیں جنہیں سوچتے وقت وہ آہستہ آہستہ دہرائیں گے۔ یہاں جذباتیت غالب ہے۔ کامیڈ ماؤز سے توں اعتدال سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں ”ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ سیاست اور آرٹ یعنی فن اور خیال میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا ہو۔ ہم اس رجحان کے مخالف ہیں کہ ساز و شمال پھر صرف کر دیا جائے اور فن کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور اس طرح ادب اور آرٹ کو سیاسی اشتہار بنادیا جائے۔“ روسی ادب کا جہد PUSHKIN رجعت پرست یا زوال پرست ہیں اور یہی ان کو کھٹتا ہے جو برائی کو ہمیشہ اور ہر جگہ کامیاب و کامراں دکھانا پسند کرتے ہیں اور انسانی دل میں انہیں صرف دو تار دکھائی دیتے ہیں۔ انا اور ٹمبر کے تار۔ جدید ترقی پسند نقاد RALPH کو یہ یقین ہے کہ انقلابی دوسرے جو ماضی کی میراث میں سے زندگی کی بخش اور امید افزا اجزا کو انکار لیتا ہے اور حال کی کسی ایسی شے کو درگزر نہیں کرتا جس سے ہم مستقبل کی تعمیر میں کسی کام میں لاسکیں۔ اُردو میں ترقی پسند نظریات کی وضاحت سب سے پہلے سجاد ظہیر، احمد علی، اختر حسین رائیجی، مجنوں گورکھپوری، عزیز محمد ظہیر نے کی۔ اختر حسین رائے پوری کہتے ہیں ”سماج کی بنیاد افراد کے اقتصادی تعلقات پر منحصر ہے اور ان کے رشتہ داری کے اعتبار ہی سے کسی دور کی ذہنی و روحانی تحریکات کو سمجھا جاسکتا ہے۔ علاوہ بریں ادب اب تک تعلیم یافتہ طبقے کا احاطہ رہا ہے اور اس کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لئے اس طبقے کے رجحانات کو سمجھنا نا ہے ضروری ہے۔“ اسی بنیاد پر اختر حسین رائے پوری ٹیگور کو رجعت پرست اور اقبال کو فاسٹ بتاتے ہیں اور قدیم و جدید ادوار کے ہندوستانی ادب کا صرف ”معاشی“ جذبہ کرتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری ترقی پسند ادب اور فطری ادب میں فرق نہیں سمجھتے۔ اگلا خیال ہے کہ ”ترقی پسند ادب کی بنیاد واقعیت اور جمہوریت پر مبنی ہے اور وہ ماضی کا معترف ہوتا ہے لیکن وہ مستقبل اور اس کے لامحدود امکانات پر صدق دل سے ایمان رکھتا ہے۔“ ان سب کا لب لباب یہ ہے کہ انسانی کی سب سے بڑی ضرورت روٹی ہے اور یہ کہ مادی زندگی میں پیداوار کے طریقے اجتماعی، سیاسی اور ذہنی زندگی کے رجحانات کی تصفیہ کرتے ہیں ان کے یہاں افادیت میں حسن ہے اور بغیر افادیت کے حسن کا تصور ناممکن ہے۔ وہ فن کے سماجی پہلو کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور اگر ادب میں سماج کے ہر پہلو پر نظر نہ رکھی گئی تو وہ صالح ادب نہیں ہو سکتا۔ سماج کو یہ حصوں میں تقسیم کر دینے کا قابل نہیں اس کی اکائی پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ یہ نظریے بے اثر اشتہار پسندی پر مبنی تھے اور رد عمل کے طور پر پیدا ہوئے تھے۔ ایک گروہ اور ہے جو روادھیما ہے اور جذباتیت پر قدرے غالب ہے مگر قسمی سے اسے سرکاری انجن کی منظوری اور تائید حاصل نہیں۔ پریم چند ادب کی وضاحت یوں کرتے ہیں ”ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جو بڑی حقیقت کا اظہار ہو۔ جس کی زبان شستہ، پختہ اور لطیف ہو جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو اور ادب میں یہ صفت کا مل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیکار کئے گئے ہیں۔“ احمد علی انہیں خیالات کو دہرائے ہیں۔

بھولنا چاہئے کہ ادب صرف اس وقت ہی زور و زلف رکھتا ہے جب کہ وہ ذہن و سماجی احساس کو صداقت اور صدقِ دل سے ظاہر کرے بلکہ وہ بحیثیت ادب کے بھی عمدہ اور بلند پایہ ہوتے ہیں۔ فیض احمد فیض زیادہ سلیسے ہوئے انوائس سمجھاتے ہیں "ترقی پسند ادب سے ایسی تحریر مراد ہیں جو سماجی ترقی میں مردوں اور ادب کے فنی معیار پر پوری اتریں۔" وہ شاعری کا مقدمہ تنقید و تفسیر حیات ہی کو دیتے ہیں مگر اس انداز سے کہ پڑھنے والے کو نشاطِ دل و دماغ حاصل ہو۔ عربیہ آئینہ ترقی پسند ادب سے تفصیلی بحث کرتے ہوئے نتیجہ نکالتا ہے کہ ترقی پسند تحریک دو عناصر سے ملکر بنی ہے۔ حقیقت نگاری اور انقلابی تحریک۔ ان کا یہ بھی ایمان ہے کہ انسان کا ہزار سال کا جدِ ثانی تجربہ محض دھوکا نہیں ہو سکتا۔ اور وہ پیشین گوئی کرتے ہیں کہ اشتراکی ملک کا رہنے والا انسان بھی جب تمام معاشی مسئلے حل کرچکے گا تو وہ ایک باطنی اندرونی غلام محسوس کرے گا جس کے لئے دھندلانی احساس کی ضرورت آدگی۔ باقی کچھ لوگ اور بھی ہیں جو جہاں تک اصولی بحثوں کا تعلق ہے ایک فریضہ باقی اور متوازن اصول کا پرچار کرتے ہیں۔ وہ جذباتی نہیں اور توازن کا احساس ان میں موجود ہے۔

Trotsky نے اپنی کتاب (لٹریچر اینڈ ریولوشن) ادب اور انقلاب میں ایک جگہ ادب اور سماج کے فرائض پر روشنی ڈالی ہے، اس نے فن اور پروپیگنڈا کے فرق کو بتلایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ فنکار اگر ایک مقصد پر ایمان رکھتا ہے تو اس مقصد کا اظہار اس کی تخلیقات میں ہی ہوگا جو براہِ راست اس طور پر ہوتا ہے جس طور پر وہ اس عقیدے کا حامل ہے۔ بلکہ اسے چاہئے کہ جس طرح وہ اس عقیدہ کو محسوس کرتا ہے اسی احساس کی عکاسی اور بھلک اس کے فن میں موجود ہو جہاں تک کہ اس کے مواد میں اس کے عقاید پائے جانے کا سوال ہے۔ کرسٹوفر ڈومیل جو جدید ترقی پسند ادیب ہے، نے اپنی کتاب "ایوٹن اینڈ ریٹیلٹی (سراب اور حقیقت) میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "جب ہم جدید کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو عام طور پر اس میں وہ تمام ثقافتی پیچیدگیاں مضمر ہوتی ہیں جو پندرہویں صدی کے بعد سے یورپ و بیرونِ یورپ میں پھیل رہی ہیں۔ ہنری تھیس، چارلس بولڈن کے مقابلے میں میکائیل ایچلو، پوپ، گیتے اور وائٹرز زیادہ جدید ہیں اور ان سے بھی زیادہ جدید ویلیری، سیزان، جیمس جوائس، برگساں اور آئنسٹائن ہیں۔ اس پیچیدگی کا دار و مدار معاشیات پر ہے۔" سپرگے چل کر وہ فن کے متعلق یوں رقمطراز ہے۔ "ہمارا مطالبہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تنہا راقی پروتاری ہونا چاہئے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم فن میں اپنے عقاید اور کسی محاورات کا استعمال کرو۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم واقعتاً اس نئی دنیا میں سانس لو اور ماضی میں اپنی روح نہ چھوڑ رکھو۔ ماضی کو حال میں کھینچ لاؤ اور مستقبل کا احساس رکھو ہم صرف ایک فنکار نہیں بلکہ پروتاری فنکار ہو جاؤ گے۔ کم و بیش کا ڈیبل ہی کے خیالات کا اظہار اردو میں ترقی پسند نقاد احتشام حسین نے بھی کیا ہے "ادب میں ترقی پسندی زندگی میں ترقی پسندی سے الگ کوئی چیز نہیں۔ ہر ترقی پسند کے سامنے ایک مخصوص فلسفہ حیات ہے جس سے زندگی کے ہر شعبہ میں حرکت اور تغیر کو سمجھا جاسکتا ہے۔" ترقی پسند ادیب ادب کو مقصود بالذات نہیں سمجھتا بلکہ زندگی کی ان کشمکشوں کی توضیح، تشریح اور اظہار کا آکر سمجھتا ہے جن سے زندگی کی نشو و نما ہوتی ہے اور اسے ان مقاصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنا تا چاہتا ہے جن سے آزادی اور ترقی عبارت ہے۔ وہ جمہوریت کا انحرافان ہوتا ہے۔ وہ کچھ کہتا ہے انسانوں کی ملک بنانے کے بجائے تمام انسانوں کی چیز بنانا چاہتا ہے جو آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور اتحاد دشمن طاقتوں سے برسرِ پیکار ہیں۔ "ترقی پسند ادب کا زاویہ نظر مواد و ہیئت کے

تعلق کے بارے میں بہت واضح ہے۔ وہ تمام شعراء اور نقاد جو زندگی کو جمہانی مانتے ہیں۔ جو خصوصیتوں سے مقدار کو اور مقدار سے خصوصیتوں کو بڑے کے قابل ہیں، جو شاعری کو زندگی کا مظہر مانتے ہیں، جو ادب کو سماجی ترقی کا ایک آکسمچف ہیں اور جو تمدن کو عام کرنا اور فنون لطیفہ کو عوام کی چیز بنانا چاہتے ہیں وہ کسی حالت میں بھی ہیئت اور اسلوب کو مواد پر اہمیت دینے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتے۔ ترقی پسند شاعر و کاتب خیال ہے کہ دنیا کو ترقی کی راہ دکھانے میں ادب کا بھی ہاتھ ہے اور یہ دنیا ہی ہیئت سے نہیں صحت بخش خیال ہی سے ہو سکتی ہے۔ ”ہیئت اور اظہار کی بھی ایک سماجی حیثیت ہے کیونکہ وہ ایب اور پڑھنے والے کے درمیان ایک رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔“ ترقی پسند قدیم ادب کے سراپہ کو آگ لگا کر ختم نہیں کر دینا چاہتا کیونکہ اس سے زیادہ کوئی اس کا قابل نہیں ہے کہ ایک تہذیب و تمدن کا دوسرا بچہ گزشتہ تہذیب و تمدن کے دور سے بددلیک آگے بڑھتا ہے چاہے وہ مرد و اثبات میں ہو یا نفی میں۔

میں نے ترقی پسند تحریک کے حامیوں کے نظریات بیان کر چکے کے سلسلہ میں انھیں مختلف گروہوں میں تقسیم کیا تھا۔ اسی طور پر ان لوگوں کو بھی چند گروہوں میں بانٹ سکتے ہیں جو ترقی پسند تحریک سے تعلق نہیں ہیں مگر جنہوں نے اس تحریک اور اس کے ادب کے بارے میں اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو شروع شروع اس تحریک میں خاص دلچسپی لے رہے تھے مگر بعد میں انھوں نے چند شکوک کا اظہار کیا اور تحریک کے کارناموں کے غیر شخصی بخش ہونے پر رائے زنی کی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا عبدالحق اور احمد علی ان لوگوں میں سے چند ہیں۔ احمد علی تو اس تحریک کے بانیوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں اور پنڈت نہرو مولانا عبدالحق ابتدائی دور کے اہم مددوں میں۔ پنڈت نہرو اپنی جھجک کا اظہار یوں کرتے ہیں ”ایک بات ہے میں جھجکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایسا ادب لکھتے وقت اکثر لوگ خاص خاص فقرے خاص خاص فقرے دہرانے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انھوں نے ایک زبردست خیال رکھ دیا۔ لیکن معقول لکھنے والے کے لئے یہ زیرانی اور اس میں آٹھ ہے اور نہ کوئی خاص بات اور نہ کوئی خاص پیغام۔ ایسی چیزوں کی جگہ سیاست میں ہے۔“ عبدالحق بھی ان نوجوانوں کے ادب سے مطمئن نہیں، ”معائنہ فرمائیے گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ترقی پسند نوجوان اپنے خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں جو کہیں ہے وہ بیان میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ وہ یہ جواب دیں کہ ہمارے خیالات اس قدر اعلیٰ ہیں کہ عام فہم سے بالاتر ہیں۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ اور ظاہر کوئی بھی اسے تسلیم نہیں کرے گا۔ زبان کیا ہے؟ خیال کے ادا کرنے کا آکا۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ ہمارے زبان میں ہمارے خیالات نہیں سانسکتے لکھنے والوں میں کم ایسے ہیں جو الفاظ کے صحیح استعمال سے واقع ہیں۔ لفظ ایک بڑی قوت ہے اور اس کا بر محل استعمال خیال میں قوت پیدا کرتا ہے جو اس گرسے واقع نہیں اور لفظ کے صحیح اور بر محل استعمال کو نہیں جانتا، اس کا بیان اکثر ناقص، ادھور اور بے جان ہوتا ہے۔“ احمد علی انھیں حقیقتوں کی روشنی میں ادب کی وضاحت یوں کرتے ہیں ”ادب جان بوجہ کہ پروگنڈا نہیں کرتا کم از کم اچھے ادب کو جان بوجہ کہ پروگنڈا نہیں کرنا چاہئے۔ میں اس کو ادب ماننے کے لئے طیار نہیں ہوں جو ایک سیاسی لیڈر کی طرح کھڑا ہو کر دیوانہ وار بچے کو کو تو تم نئے ہو تم پر ظلم ہو رہے ہیں اس لئے تم انقلاب کرو۔ میں مصنف ہوں، میں پروگنڈا سٹ نہیں ہوں۔ میں سوسائٹی کی بغض دیکھتا ہوں لیکن میں ایک انارڈی طبیب کی طرح جو سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر ایک ہی دوا سے سب مریضوں کا علاج کر دیتا ہے، پروگنڈا کی گولی اس کو دھنے کے لئے طیار نہیں ہوں۔ میں حقیقت نگار ہوں کو نہیں بھولتا لیکن میں بیوقوفی کی حرکت کو غیر ادبانہ تصور کرتا ہوں۔“ یہ چلے اس رد عمل

کے طور پر لکھے گئے ہیں جو اس تحریک کی اولین تخلیقات کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے۔ دوسرا گروہ بھی ان لوگوں کا ہے جو اس تحریک کو بے نظر جان دیکھتے تھے یا دیکھتے ہیں مگر جذبہ ضابطگیوں سے تالاں ہیں۔ رشید احمد صدیقی، ممتاز شیریں اور آل احمد سرور کا نام اس سلسلہ میں لیا جاسکتا ہے۔ رشید احمد صدیقی چند بے لاگ باتیں عام مفروضات کے طور پر بیان کر جاتے ہیں ”ادب ملت الہیہ نہیں ہے کہ اس میں تبدیلی ناممکن ہو مشعر و ادب انسانوں کی بنائی ہوئی چیز ہے اور انسانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اسے ڈھاتے ہیں۔ ترقی پسند ادب کو محض اصلاح پر مبنی کر رہنا چاہئے۔ اس کو دوا دین کی تنگنائے سے نکل کر زندگی کی وسعتوں پر محیط ہونا چاہئے۔ ذہنی دنیا میں رہنا یا دماغی شاعری کی آڑ پر نامیرے نزدیک کیسر مہل ہے۔ اگر شاعر اپنے آپ کو قانع سے بے نیاز کرے اور قانع کو توڑنے مروڑنے اور بھگانے سنوارنے میں حوصلہ پسینہ ایک ذکر سے یاد کر سکے“ پھر رشید احمد صدیقی اس تحریک کے پیدا کردہ ادب کے چند عنوانات سے بحث کرتے ہیں جو اس سے مخصوص ہیں اور ادیبوں کو ان موضوعات کی تنگنائے سے نکل کر زندگی کے کھر بیکراں کے موضوعات میں غوطہ زن ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ سہو اس تحریک کے اعلیٰ مقاصد کو سراہتے ہیں۔ اس کے ادب کے ایک حصہ کو بھی وہ بیش قیمت گرواتے ہیں، مگر سب سے پہلے تو وہ اس کے پیروں ہی سے طعن نظر نہیں آتے، ہر تحریک اپنے پیروں سے بچانی جاتی ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس تحریک کو چھلانے والوں میں مبلغ نقیب، نعرہ لگائے والے بہت ہیں۔ ایسے لوگ کم ہیں جو پروگنڈے اور آڑ کے فرق کو جانتے ہوں۔ اس تحریک کے بعض علمبرداروں میں بڑی سطحیت، بڑی عورت، بڑی تنگ نظری، بڑی کلیتیت ہے۔ یہ زندگی کو کاسی فارمولوں اور اقتصادی اصولوں کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ اب سے دس سال پہلے جو کچھ لکھا گیا ہے اسے حرف غلط کی طرح مٹانا چاہتے ہیں۔ ادب ایک اچھے ادیب کے منصب کے خلاف ہے۔ یہ ایک ذہنی غلامی سے نکال کر دوسری ذہنی غلامی میں انسان کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ فن سے مادہ غنیمت کو آڑٹ بچھتے ہیں اور طوائف کو مہر وین۔ یہ مذہب اخلاق اور تہذیب کو آثار قدیمہ کہتے ہیں اور مارکس کو انسانیت کا حرف آخر۔ یہی سبب ہے کہ اس تحریک کو دیوید پیکر اشخاص نصیب نہ ہو سکے جو علی گڑھ تحریک کے نصیب ہو سکے۔ یہ کہ ادب ادبیت کہتا ہے اور اس کے انمول کی شہرہ کی کچھ حرج سے بعد بھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کے پاس جذبات ہیں، فیمن نہیں ہے۔ گرمی ہے۔ روشنی نہیں ہے، دل ہے دماغ نہیں ہے۔ ممتاز شیریں کے گلے اور شکایتیں بھی ان حضرات سے ملی ملی سی ہیں۔ ان تمام حضرات کے خیالات میں خلوص ہے، سچائی ہے اور ایثار ہے۔ ان کے اعتراضات تعمیری ہیں۔ انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ممتاز شیریں تحریک کے علمبرداروں کے احتسابی عمل سے تالاں ہیں، ”مسببت تہہ ہے کہ ایک خاص قسم کے احتساب کے حق میں اور ذہنی آزادی کے خلاف جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں ان میں سرسے سے سمجھا ہی نہیں جاتا کہ ادب کیا ہے اور کیسے پیدا ہوتا ہے۔ وہ ادیب کو ایک طرف یا تو صورت تفریح نکال سمجھتے ہیں یا دوسری طرف محض پرچار کہ جو کسی سیاسی پارٹی کی ہر آن بدلتی ہوئی پالیسی کے مطابق اپنی تحریروں بدل سکتے، جز ادب پیدا نہیں کر سکتا۔ جب تک ادیب بے ساختگی سے آزادی سے نہیں لکھتا ادبی تخلیق ناممکن ہے۔ ادیب کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اس پر سیاسی قوانین نافذ کرنا سیاسی مقصد کے لئے اس کی تخلیق کا گلا گھونٹنا ہے۔“ کلیم الدین احمد سختی سے ترقی پسند تحریک کے اصولوں اور ان کے ادب کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ ان سے بالکل خوش نہیں نظر آتے۔ ان کا خیال ہے کہ اس تحریک کا پیدا کیا ہوا ادب مطلق تشفی بخش نہیں۔ اس ادب کی اہم کمی ہے کہ اس میں اپنی محاسن کا

فقدان ہے۔ "ترقی پسند مصنفین" ادب سے ناجائز کام لیتے ہیں اس لئے وہ اور جو کچھ بھی ہوں ادیب کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے ان کی تحریروں میں اشتراک کی پہلو ادبی پہلو پر غالب ہوتا ہے وہ غور و فکر سے کام نہیں لیتے اور خیالات بالکل اخذ کر لیتے ہیں۔ طرہ ادب بھی ناقص ہے۔ یہی اسباب ہیں کلیم الدین احمد کی خفگی کے علاوہ بریں کلیم ان مفروضات سے بھی مطمئن نہیں جن پر اس تحریک کی بنیاد ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو مفروضوں پر وہ اپنی دلیل کی بنیاد قائم کرتے ہیں ان کی صحت میں بہت کچھ بحث کی گنجائش ہے پھر ان مفروضوں کی بنا پر جو شکاک وہ اخذ کرتے ہیں وہ متنازع مستنبط نہیں ہوتے، لیکن سب سے اہم نقص یہ ہے کہ وہ مبہم و غیر متعین الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ان سے ناجائز مصروف لیتے ہیں۔ پھر کلیم ان اصولوں کے عمارت کی سنگ بنیاد پر ایک ضرب کاری لگاتے ہوئے کہتے ہیں "انسان کی سب سے بڑی ضرورت روٹی نہیں انسان کی سب سے بڑی اہم، قیمتی ضرورت دماغی خواہشات کی تسکین اور دماغی قوتوں کی ترقی ہے" ایک اور گروہ بھی ایسا ہے جو شد و د کے ساتھ ترقی پسند تحریک پر معترض ہے اور "ترقی پسند مصنفین" کی دوجہاں اڑاتا رہتا ہے ان میں حسن سکری پیش پیش ہیں۔ وہ کہتے ہیں "ترقی پسند لفظ بہ لفظ سیمولٹر کے پیورٹین عالم دین کی طرح ہیں" حسن سکری کا خیال ہے کہ فنکار کی حقیقت سیاسی یا معاشی حقیقت سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اس کے لئے توحشیاتی حقیقت سب سے بڑی حقیقت ہے اور اس سے الگ رہ کر وہ فنکار نہیں رہتا۔ "فنکار کے لئے اپنے زمانہ کے مروجہ سیاسی نظریوں اور اس قبیل کی دوسری نظریاتی چیزوں کو اس طرح "سمجھنا" بالکل ضروری نہیں جس طرح سیاسی لیڈر یا اسمبلی کے لئے ووٹ دینے والوں کو یہ باتیں سمجھنی چاہئیں "حسن سکری سمجھتے ہیں کہ "ہیت ہی کل آرٹ ہے اور ہیت ہی فنکار کی حقیقت ہے۔ ہیت کی تلاش ایک اعتلاقی جدوجہد ہے، بلکہ خود زندگی کی تلاش ہے" اسی سلسلہ میں دو مغربی نقاد ایچ۔ اے۔ مین اور ڈیٹن مری کا حوالہ دیتا بجا ہو گا۔ وہ بھی اس تحریک سے متفق نہیں اور اصولی اختلاف رکھتے ہیں۔ مین کہتا ہے "جب مارکس کے پیرو ادب کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی باتوں میں ایک عجیب باسی پن ہوتا ہے۔ پنٹنگی کا تو ذکر ہی کیا۔" کا ڈویل کی کتاب کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ "اس کتاب کو پڑھا نہیں جاسکتا۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے زیادہ تر اس کا اصلی بحث سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے صرف میرٹن کی طور پر مارکسی فلسفے کو ادب پر عاید کرنے کی کوشش کی ہے اور الٹی سیدھی مارکسی اصطلاحوں کی بھرمار کر دی ہے۔ یہ ساری باتیں پوری کتاب کے بچے چھوٹے سے پھٹل میں کہی جاسکتی تھیں" ڈیٹن مری بھی اسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں "اس کتاب میں بڑا جوش ہے، بڑا جذبہ ہے، بڑی نیک دلی ہے۔ کاویل ایک کم کا جدید شبلی ہے اور آرکس اس کا کوڈون ہے۔ شبلی ہی کی طرح وہ کوئی اچھا لکھنے والا نہیں۔ وہ کسی نئی باتیں کہتا ہے۔ یہ اس خوش یقینی اور اندھے اعتقاد کا اظہار ہے جو کمینوزم کی آخری شکل ہے۔ دراصل مارکسیوں کا پروتارہ یہ محض ایک مجرد شکل ہے جس کا ایک مفروضہ کا ڈویل نے پروتارہ ہی آرٹ کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ ستر یا حماقت ہے اس کتاب کی اصلی دلچسپی اس بات میں ہے کہ ایک مخلص مارکسی کی ناکام مہم کی بڑی اچھی مثال ہے۔ یوں تو اس تحریک اور اس کے مصنفین کے غلط بہت کچھ کیا گیا ہے، مگر زیادہ تر اعتراضات انتہا پسندی کی مثالیں ہیں اسی لئے میں نے چند نجدید اور معتدل اور مخلص ادیبوں کی رائیں نقل کر کے یہ کتاب لکھا ہے۔ جو مزید باقی یا رد عمل کے طور پر اس تحریک پر معترض ہیں ان کا حوالہ دینا میں نے قطعاً نامناسب خیال کیا ہے۔ اب انہیں یہ بات کی روشنی میں "ترقی پسند ادب" کا

نے لکھے والوں میں اچھے فکر اور بھرپور ہیں اور ان کی تخلیقات کا ایک حصہ یقینی ایسا ہے جو قابل اعتناء ہے۔ جوش اور احساسِ دانش کی کئی مجموعے، پھر فیض کا ”نقشِ فریادی“، راشد کا ”ادرا“۔ مجاز کا ”آہنگ“ احمد ندیم کی ”دھر گئیں“ جاں نشا اختر کی ”سلاسلِ اختر ایلان“ کا ”گروہاب“ ایسے مجموعے ہیں جو کام کے ہیں۔ اور اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سہر خاں صدیقی، اختر شیرانی، شاعرانی، دوست ظفر، جذبی، اختر انصاری، مطلبی، مخدوم، تاثیر، میراجی، سلام، محمود جالندھری، کیفی ان لوگوں میں سے ہیں جو اس وقت سے آج تک کوشش کے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ ابھام اور جنسی کجروی کے لئے مشہور ہیں اور کچھ اپنی یاسیت کے لئے اور کچھ اپنے ڈھنڈور سب سے لے کر باقی ایسے ہیں جو کوشاں ہیں اور ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ فیض کی ”بول“ اور مخدوم محی الدین کی ”جنگ ہے یا جنگ آزاد“ اس دور کے رجحان کا صاف پتہ دیتی ہیں۔ جوش کی ”فرزندانِ امیٹ انڈیا کہنی کے نام“ اور ”تجددِ اہلین کے نام“ اس دور کی سرسبکی، پریشانی، پرانگی، انتہا اور افراتفری کی منظریں پیش کر رہے ہیں۔ بیدی، منٹو، عصمت، احمد عباس، سہیل، اختر انصاری، اختر زینبی، علی عباس حسینی، ممتاز حسینی، احمد ندیم قاسمی، بلوٹ سنگھ اور رشک کے بیٹے افسانے اردو فران نگاری میں قابلِ قدر افسانے ہیں۔ مقالہ نگاری میں فیض، احتشام، ڈاکٹر عبدالعلیم، سبط حسن، سجاد ظہیر، تاج محمد، عارف، فراق، مجنوں، اکثر سلجھی ہوئی باتیں کہہ جاتے ہیں اور وہ دعوت اور طبیعت نہیں جو پہلے دور میں اختر رائے پوری، احمد علی پوری، پورے وغیرہ کی بیشتر تنقیدوں میں ہے۔ تیسرے دور میں انتہا پسندی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ دور تنقیدوں اور تقریروں کا دور ہے۔ جھلاہٹ اور برکھلاہٹ کی ملی جلی کیفیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ فسانے اور نظمیں ایل بہ زوال ہیں۔ صرف چند نگاروں کے چند فن پارے ایسے ہیں جنہاں اعتناء ہے۔ لوگ باتوں میں چھوڑ رہے ہیں یا چھوڑنے پر مجبور کئے جا رہے ہیں۔ احمد علی، اختر رائے پوری، عزیز احمد، جوش، سافر، احمد عباس، اختر زینبی، سہیل عظیم آبادی، علی عباس حسینی، فیض احمد فیض، بیدی، منٹو، اشک، بلوٹ سنگھ، جذبی، تاثیر، میراجی، راشد وغیرہ وغیرہ یا تو کھالے جا چکے ہیں یا معتبوب ہیں۔ تنقیدی مضامین زور دہر لگے جا رہے ہیں، گزشتہ میں شدید اختلافات ہیں۔ احتشام حسینی جیسے ترقی پسند ادب سمجھتے ہیں وہ کم از کم آج نہیں لکھا جا رہا ہے۔ عبادت بریلوی بھارسے خواہ مخواہ اس تحریک اور اس کے ادب کی شان میں مطلب اللساں ہیں۔ یہ معلوم عصمت کی ڈانٹ کے بعد بھارسے کا کیا حال ہے۔ وہ عرشا دے کئے جاتے ہیں اور دوزخی کی لکھنے والی یہ کہہ کر ڈانٹے جاتی ہے کہ صاف کیوں نہیں کہتے کہ صرف کیونٹ ترقی پسند ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ممتاز حسین بھی سلجھی ہوئی باتیں کہتے ہیں مگر ان کی شٹا کوئی ہے۔ مختلف ادبی انجمنیں قائم ہو رہی ہیں۔ ان کے سکری آگئی بھی ان سے نالوں ہو کر اپنی راہ الگ بنا رہے ہیں آج جو ادب قابلِ اعتناء ہے وہ ان لوگوں کا ہے جو سرکاری طور پر ”CONDEMNED“ ہیں۔ احمد ندیم قاسمی، نقوش کے ایک شمارہ میں اچھے بہت ساری غلطیوں اور انتہا پسندیوں کا احترام کرتے ہیں اور دوسرے ہی شمارہ میں عصمت اسی مستقل عنوان کے تحت ان باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ادبی حکم نافذ کر دیتی ہے، احتشام، عبادت، ممتاز حسین، عصمت، احمد ندیم بھونس کے زاویہ نظروں اختلاف ہی نہیں تضاد ہے، خود معلوم ہوتا ہے کہ کہیں روسی ادب (جنگ عظیم نمبر ۷ سے قبل) جن ادوار سے گزر چکے ہیں انہیں اور دوسرے اردو ادب بھی تو نہیں گزر رہا پھر تو ادبی ڈھنڈور سے باز دل کو اپنے مستقبل سے ہوشیار رہنا چاہئے، وہ فی الحال ایسے مظاہر

بھی نہیں کہ پروٹ کلاٹ یا راپ والوں کی طرح کسی کو دار پر لٹکا دیں، کسی کو ملعون قرار دیدیں اور کسی کو جلا وطنی کی سزا دے ڈالیں۔ روسی ڈراما نگار کے ٹریٹ نے اپنی تصنیف BENOTAFRAIDTO DRE میں لکھا "اسٹالن گراپروڈا سے زیادہ ڈرانے لکھے گئے مگر ان میں سے ایک بھی قائم نہ رہ سکا، اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اچھا مستند ادب نہ تھا وہ کارنامے فنی تھے" ۱۹۳۲ء میں روس کی کیوینٹ پارٹی نے راپ کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس کی شایع کردہ میں ہزار کتابیں ادا ان کے ساتھ راپ کے ۲۰ لاکھ اطلاعات نذر آتش کر دی گئے۔ سرکاری اعلان ہوا کہ اس زمانے (۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۲ء تک) کی تصنیفات کا سچ حصہ قابل اعتناء نہ تھا پھر ملک کے ادیبوں کو ہدایت کی گئی کہ اشتہار بازی کے بجائے وہ "سوشلسٹ واقعیت" کی طرف رجوع کریں۔ کیا انہیں ترقی پسند مصنفین کی موجودہ ادبی ڈکٹیٹری کا بھی یہی انجام ہونے والا ہے ؟

اب نتیجے کے طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ادب ہے کیا۔ اس کا زندگی سے تعلق کیا ہے۔ ادب کی ماہیت کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ سیاست اور ادب یا مقصد اور ادب کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ مواد اور ہیئت میں باہمی کیا تعلق ہے۔ یہ سوالات آج سے ہزاروں سال پہلے سے لوگوں کے ذہن کے گرد چکر لگا رہے ہیں اور مختلف ٹیالٹ کا اظہار اس بارے میں کیا جا رہا ہے۔ ارسطو نے بھی اس معاملہ پر غور کیا تھا اسی لئے اس نے شاعری کو نقالی (IMITATION) سے تعبیر کیا تھا۔ مگر آج تک کسی ایک فیصلہ پر نہیں پہنچا جا سکا ہے۔ پھر بھی چند بنیادی باتیں ایسی ضرور ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں مد نظر رکھتے ہوئے ہم چند عام اہم اور ضروری مفروضات قائم کر سکتے ہیں جس سے شاید ہی کسی مخلص ادیب کو انکار ہو۔ آج "ادب برائے ادب" "ادب برائے تفریح" یا "ادب برائے تعیش" جیسے غرض لائیں ہیں۔ میں نے ادب پر بیان کیا ہے کہ دلی سے دور ہو جانے پر تعبیر بھی شکوہ کرتے ہیں، اور اپنے اوپر خود مختاری کی تہمت لگائی جانے اور بدنام کئے جانے پر یہ کہنے کی ہمت بھی کرتے ہیں کہ کرتے تو آپ وہی ہیں جو چاہتے ہیں۔ مجھے مفت بدنام کرنے سے کیا فائدہ ! چراغ مفلس کے کچھ سے رہنے پر ان کا بھی جی اُداس ہوا ہے اور میں نے بیشتر بڑے شاعروں کے متعلق یہی کہا ہے کہ وہ ان بھی زندگی کے چھینٹے مل جاتے ہیں۔ کمی یا زیادتی یا طریقہ استعمال کا سبب وہ خود نہیں بلکہ ان کا زمانہ، احوال اور ادبی شعور اس کا ذمہ دار ہے۔ ادب کو زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے لئے جس طرح کھانا پینا، روٹی کپڑا سونا اور کام کرنا ضروری ہے ویسے ہی ادب ضروری ہے۔ ادب اور زندگی کا رشتہ بڑا پُرانا ہے۔ مگر زندگی سے میری مراد صرف سیاست نہیں، یا صرف روٹی یا صرف اشتراکیت نہیں، زندگی سے مراد وہی ہے جو بقول خورشید الا سلام "ادب کی نیچی سرنگیں، چھوٹی بڑی دکانیں، جیٹھ کی دھوپ، برسات کی اندھیری بھیاں، مچل جانے والی راتیں، تھوہ خانے، گلابی جاڑوں میں نظریں بچا بچا کر مسکرانے والے بچوں، جواری، پانی کرگلاس چرچر کر دینے والے شرابی، فضا میں خوشبوئیں بکھرنے والے دوپٹے، مرجھائے ہوئے معصوم چہرے، پرانی چیزوں کا نیا پن، سادگی میں بناوٹ، نیکیوں میں چھپی ہوئی کمزوریاں، پندار کی تہیں، افسار، آہا اور طوطی علم لکھا اور سگر مشین" سے مشابہ ہے۔ یعنی ہر وہ شے جس کا تعلق انسانی تمدن کے تاریخی ارتقاء سے ہر زندگی میں داخل ہے۔ سیاست زندگی کا صرف ایک شعبہ ہے لہذا ادب میں بھی اس کی جگہ اسی تناسب ہو سکتی ہے۔ اور پھر اس کا تعلق مواد سے اور مواد کا تعلق ہیئت سے

ہیں بنیادی پتھر جس پر ادب کی عمارت کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ ادب میں زندگی کی صرت مصوری، عکاسی یا نقالی نہیں ہوتی۔ بلکہ شاعر ادیب یا شاعر اگر بڑا اور اچھا شاعر، ادیب اور فنکار ہے تو یقیناً اپنے زمانے سے آگے ہوتا ہے اور زیادہ حساس ہوتا ہے، قیمتی اور انمول تجربات حاصل کرتا ہے انھیں پیش کرتا ہے ایک مصور کی طرح حسین، دیدہ زیب اور دلغریب رنگوں کی آمیزش سے ساتھ ہی ساتھ فنکار کی اپنی تنقید بھی پنہاں ہوتی ہے۔ ان تجربات کا براہ راست بیان نہیں ہوتا بلکہ حسین، مکمل اور موزوں بیان ہوتا ہے۔

مگر مقصد کا براہ راست اظہار ادب ہوتا تو سچر ”کیونٹ مینی فیسٹو“ کیوں نہ دنیا کے بہترین ادبی پاروں میں شمار کیا جاتا؟ اور اگر حقیقت نگاری یا واقعات، تاثرات اور تجربات کا سیدھا سادھا بیان ادب میں شمار کیا جاتا تو سچر دنیا کے سارے اخبارات کیوں نہ ادبی شاہکار تصور کئے جاتے؟ صرت خیالات و تجربات ہی ادب نہیں پیدا کرتے۔ ان خیالات اور تجربات کی نوعیت کیا ہے وہ اچھے ہیں یا برے اور سچر ان کا اظہار کیسا ہے۔ حسین یا سبوتا اسے ٹھوکار کھنا ضروری ہے۔ مواد اور ہیئت دونوں ایک ہیں۔ ایک کو دوسرے سے اسی طرح جدا نہیں کیا جاسکتا جیسے روح کو جسم سے۔ مواد اور ہیئت جسم و روح کے متوازن ہیں یہی سبب ہے کہ انقلاب روس سے قبل کا ادب انقلاب کے بعد کے ادب سے زیادہ گراں قدر ہے اور جاگے دراز دور کے ادب کا ایک کثیر سرمایہ پر و ترقی دور کے ادب کے بیشتر حصہ سے زیادہ بیش قیمت اور زیادہ ترقی پسند ہے۔ خیالات اور ان کا اظہار بہت کچھ ادیب کی شخصیت اور اس کے ماحول اور تاریخ تمدن انسانی سے اثر قبول کرنے کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ اس لئے ادیب کو ماحول سے متاثر ہوتے ہوئے بھی اپنی منفرد آواز ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے ماحول کی ترقی کے ساتھ ساتھ انفرادی ترقی پر اسی لئے زور دیا ہے۔ ادیب ماحول کی پیداوار ضرور ہوتا ہے مگر ماحول کی ترقی اور اس کی نئی نشوونما اور تعمیر میں اس کی شخصیت کا بہت ہاتھ ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب روس میں پروٹریٹیں خیالات کے پرچار کے لئے ایک تنظیم حیر و لٹ کلٹ“ کی بنیاد ڈالی گئی اور جب انھوں نے ادبی *Requiem* شروع کیا تو وہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکے۔ اور ۲۵ء میں کمیونسٹ پارٹی کے اجلاس میں یہ بتایا گیا کہ ”کسی مزدور مصنف کی کتابوں کی مانگ نہیں ہے اور ناشر کو مجبوراً انھیں تراویہ پر تول کر کے ٹیبلوں کے مولا بیچنا پڑتا ہے۔“ سچر پنج سالہ پروگرام کی تبلیغ کرنے کی غرض سے سرکاری انجمن ”راپ“ کی بنیاد ڈالی گئی اور حکومت نے اس جماعت کو ادبی ڈکٹیٹری سوئچ دی۔ تب بھی یہ جماعت کامیاب نہ ہو سکی اور ۳۵ء میں ادبی پارٹی بندیوں کا فیصلہ کرنے کی نوبت آن پہنچی۔ پتوئین، ہٹلر اور مسولینی نے بھی اپنے مقاصد کی ترویج کی غرض سے ادب کو استعمال کرنا چاہا اور نا کامیاب رہے۔ آخر مارکس کو آئیں (۱۸۴۸ء) اور گیتے کیوں زبانی یاد تھے؟ شاید آپ کو واقفیت ہو مارکس نے *Das Kapital* کا مطالعہ یونانی زبان ہی میں کیا۔ مارکس کو ٹیکسیر بہت عزیز تھا اور اس کی لڑکیوں کو بھی ٹیکسیر کی لائیں لٹانی یاد ہو گئی تھیں۔ مارکس بہترین اور مناسب استعمال الفاظ کی تعریف کرتا تھا اور اسی لئے وہ گیتے، لینن، ٹیکسیر، واسے اور سر واسٹیز کو روز پرھتا تھا اسے پوری ڈیڑھ گھنٹہ کی کامیڈی زبانی یاد تھی اور ٹیکسیر کی لائیں اگر وہ معمول جاتا تو اس کی پہچان سے یاد دلاتی۔ ڈارون اور ہمارے سب ناول کے دلداد تھے اور آپ کو یس کرنا یہ تعجب ہو کہ مارکس، ہارنک، فیڈلٹک اور سرواتیر کے ساتھ ساتھ *Paul de Cock* اور *Deus, the Elder* میں بھی کافی دلچسپی لیتا تھا۔ آخر یہ سب

کہوں ہوتا تھا۔ آگس تو اپنے دور کا سب سے بڑا انقلابی تھا۔ بسمارک تو رجعت پرست نہ تھا۔ یہ اس لئے کہ ادب کی اپنی ایک الگ دنیا ہے جو معاشیات، تاریخ، ڈائری اور میونسٹو سے مختلف ہے۔ یہ ساری چیزیں ادب میں پائی جاتی ہیں مگر معاشیات اور تاریخ کی حیثیت سے نہیں ادب کی حیثیت سے۔ کیا وہ انتہا پسند ترقی پسند جو ترقی پسندی کو اشتراکیت کا بدل اور ادب کو سیاست کا ایک شعبہ، ایک نامہ خزانہ تصور کرتے ہیں یہ بتا سکیں گے کہ گیلے، دانٹے، شکسپیر، سروانتیز اور راسین کو ادبی تاریخ میں کون سی جگہ دی جائے؟ عصمت چغتائی، نیا زحید، سلام، فکر تو نسوی اور مخمور جالندھری سے آگے یا پیچھے؟ انھیں چھوڑنے میں بلا جھجک یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا تیر، غالب، انیس، اقبال، حالی، پریم چند، سرشار میں سے کوئی بھی سرواڑہ جھری، ساحر ادھیانوی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، ہمت یا عبادت بریلوی سے کم مرتبہ رکھتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ کسی تصویبی پر ایمان رکھنا اور بات ہے، کسی انقلاب کی رہنمائی کرنا چیز دیگر ہے مگر بڑا فنکار اور ادیب ہونے کے لئے یہ عناصر اسی قدر ضروری نہیں جن قدر ایک سیاسی لیڈر کی پلیٹ فارم تقریر، کسی جلد کے ریزولیوشن اور پھر کسی افسانے یا نظم میں فرق ہے اور اسی فرق سے آج کے بیشتر ترقی پسند فنکار نابلا ہیں۔ یہ تجربات کے فرق کو محسوس نہیں کرتے۔ ان کی مثال لکھنؤ اسکول کے ان شعرا کی سی ہے جن کے تجربے میں صرف پردہ نشین عورت، بو الہوسی اور عیاشی آئی تھی، وہ ہجر، وصل، فراق، رقیب اور بیوفا معشوق کا ردنا بار بار روتے تھے تو آپ سرخ ستاروں، سرخ پرچم، سرخ لب اور سرخ شفق کی شان میں رطب اللساں ہیں۔ طرز بیان ان کا بھی بھونڈا اور عریاں تھا آپ کا بھی ہے۔ عربانی ادب میں بذات خود کوئی بری شے نہیں بشرطیکہ فنی توازن پر قرار رہ سکے۔ عربانی برائے اشتہائے جنس یا لذت اندوزی نہیں، بلکہ کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے؛ جو کچھ زندگی میں واقع ہوتا ہے سب کا ادب میں آجانا ضروری نہیں۔ زندگی آمیز قدروں کا ادب میں وجود ضرور ہے۔ تحلیل جنسی کے لئے ایسے اشخاص کی ضرورت ہے جو خود نفسانی خواہشات کے شکار نہ ہو سکیں۔ کیا جنسی موضوعات سے بحث کرنے والے بیشتر ادیبوں کو خود جنسی تجزیہ کی ضرورت نہیں؟۔ احوال، حالات یا نفسانی خواہشات کا غلام بن کر وہ جانا فنکار تو کیا کسی انسان کے لئے زیبا نہیں اسے تو احوال سے دست و گریباں ہو کر منوں مٹی کے ڈھیر تے دب کر میرا بن کر نکلتا ہے اور اسی آویزش اور جہد و جد کی عکاسی تجربات زندگی کے طور پر حسین اور فنی شکل میں ادب کے ذریعہ کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ترقی پسند فیض اور بیدی جیسے فنکاروں کو نہ سراہ سکے۔ انھیں فن کا احساس ہے۔ انھوں نے چیزوں کو اس طور پر پیش کیا ہے جیسے انھیں محسوس کیا ہے اور جس طور پر انھوں نے ان کے ذہن میں گھر کر لیا ہے، سرکاری ترقی پسند شعرا میں سے بیشتر نے اپنے خیالات اس طور پر پیش کئے ہیں جس طور پر انھوں نے ان خیالات کو سن پالا ہے، اخباروں، پارٹی لٹریچر میں بٹھھایا ہے، کسی ساتھی کو تقریر کرتے سن لیا ہے یا کسی اشتراکی ادب کے خیالات کے بارے میں کسی نے کہہ لیا ہے۔ کیا ترقی پسند انجمن کے سنجیدہ نقاد ہیں یہ بتائیں گے کہ فیض اور بیدی کو وہ ترقی پسندوں کی صف میں کہاں جگہ دیں گے؟

میں احتشام حسین سے پوچھتا ہوں کہ کیا بہت سارے وہ فنکار جو انجمن سے سرکاری طور پر تعلق نہیں مگر آزادی کی حمایت میں رجعت پسندی کی طاقتوں کی مخالفت میں عوام کو علم اور کچھ سے آشنا بنانے کے لئے، انسانیت کو سر بلند کرنے کے لئے، دنیا کو ترقی کی راہ پر لگانے کے لئے، حقیقتوں سے روشناس کرانے اور حالات کے بدلے پر آمادہ

کونے کے لئے کلمہ رہے ہیں تو وہ ترقی پسند نہیں؟ آپ کے بیان کی رو سے تو وہ ترقی پسند ہوئے مگر سرکاری انجمن انھیں ترقی پسند تو کجا
صحت پرست مانتی ہے۔ پھر آپ کو کچھ کہنے کے لئے اس کا اعلان کرنا ہوگا کہ آپ کے خیالات ذاتی ہیں انجمن ترقی پسند مصنفین کے خیالات
سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو انجمن کے سرکاری جلسوں کی تقاریر، تجاویز اور تقریروں اور آپ کے مضامین
کے تضاد کا ذکر کیا جائے۔ میں نے جتنے سوالات کئے ہیں، موضوع کی مناسبت کے خیال سے انکا تفصیلی ذکر مناسب نہیں سمجھتا میں نے
جایجا اشارے کئے ہیں۔ اگر حالات اسی طرح قائم رہے تو تحریک محدود ہو کر صفر پر جا جائے گی۔ ادب، زندگی، مقصد، سیاست، کمیونٹ
پارٹی، مواد اور ہیئت میں تفریق کرنا ہوگا اور ان کے باہمی رشتہ کو صرف واضح کرنا نہیں، عملی طور پر بنانا ہوگا۔

ہر بڑے فنکار کو حیات کے متعلق اپنا زاویہ نگاہ رکھنا ضرور ہے۔ اسے بنیادی انسانی آدرشوں کا پرچار کرنا ہے۔ مگر اسے ہرگز
کاشکار ہو کر نہیں رہ جانا، فن پر بھی توجہ دینا ہے تب وہ بڑا فنکار ہو سکتا ہے۔ عربی اور جنس کو فن کے لئے مقصود بالذات سمجھنا ترقی
پسندی کی علامت نہیں۔ صرف واقعہ نگاری کا دوسرا نام ادب نہیں۔ ادب اور فنکار کو وقتی چیزوں سے اثر ضرور قبول کرنا ہے مگر اسکی
تخلیقات کو وقتی بننے سے بچنا ہے۔ یہاں پر اس کی انفرادیت درکار ہے۔ انفرادیت، خارجیت، ماحول، عصرت اور داخلیت ایک دوسرے
کی ضد نہیں بلکہ یہی وہ چونا، کار اور سمٹ ہے جس پر عمارت ادب کی مستحکم بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ ادب کا مواد ہمیشہ کاغذ اور
ہیئت اس کی تراش ہے جو اسے فریت دستار بناتی ہے۔ مواد خارجی، عصری اور سماجی اثرات ضرور قبول کرتا ہے۔ ہیئت کا تعلق
زیادہ تر فنکار کی اپنی شخصیت اور اس مواد کو پیش کرنے کی صلاحیت سے ہے۔ سنگ مرمر کا ایک بیکار ٹکڑا چاہے وہ سنگ مرمر ہی
کا کیوں نہ ہو، مٹی کے اس ٹکڑے سے یقینی بہتر نہیں جیسے لیونارڈ ڈاؤنچی، رفاک یا مائیکل انجیلو نے ایک صورت، ایک حسین شکل
دے کر لافانی بنا دیا ہو۔ مواد کی حیثیت الہامی نہیں ہونی چاہئے اور نہ فنکار کو ان خیالات کو بار بار دہرانا چاہئے جو متعدد بار دہرا کر
چاہئے ہیں۔ اسے اپنے خیالات کو جس طور پر محسوس کرتا ہے اپنے انفرادی رنگ میں پیش کرنا ہے تاکہ سب اس کی جانب رجوع ہوں
اور پھر اس کا مقصد بر آئے، لہٰذا گویا اس کا اثر دور رس اور دلپذیر ہو، ہنگامی اور وقتی اور جذباتی نہ ہو۔ محض ایک شعبہ حیات
ہند نعرے، چند فقرے اور چند موضوعات پر چپنے کا انجام یہی ہو سکتا ہے جو آج اس انجمن کا ہوا۔ موضوعات ختم ہو گئے اور کلچر بھی
سویکھ گیا۔ انھیں ادیبوں اور فنکاروں نے پانچ سال پہلے جو کچھ لکھا آج وہی اس سے گھٹیا ادب پیدا کر رہے ہیں۔ ان کی دوکان
کی رنگارنگی ختم ہو چکی۔ وہاں تو بے رنگ سامان اور ابالی کچھڑی کا پتہ بھی نہیں۔ ادیبوں کو حالات، واقعات اور اصولوں کا
غلام ہو کر نہیں رہ جانا۔ اپنی بھی کچھ کہنا ہے۔ انھیں صرف اپنا ازم یا ایک موضوع سے واقفیت نہیں پیدا کرنی۔ تمام اصولوں
بلکہ تاریخ تمدن انسانی، نفسیات، معاشیات، سیاسیات اور مختلف زبانوں کے ادب کا بغور، شگنڈے دل سے اور غیر جانبدارانہ
مطالعہ کرنا ہے۔ فنکار کے لئے نہ تو فطرت اور اس کے ذہن کے بیچ کوئی پردہ حائل ہے اور نہ ہی اس کے اور اس کے شعور
کے بیچ کوئی رکاوٹ۔

غلام سرور

ہندوستان کا اولین ریاضی دان

(آریا بھٹ)

آریا بھٹ کے زمانے میں مروجہ زبان جس میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی سنسکرت تھی جس کا اثر ہندوستان پر تقریباً دو ہزار سال تک رہا۔ یہ امر نہایت قابل افسوس ہے کہ آریا بھٹ کے پیش رووں یا اس کے معصروں کی تصانیف باضابطہ طور پر نہیں پائی جاتیں بلکہ منتشر صورت میں بعض بعض جگہ ملتے ہیں، آریا بھٹیہ (Aryabhata) اس کی بہت شہور کتاب ہے۔ شکاگو (امریکہ) کے پروفیسر والٹر کلارک (Walter Clark) آریا بھٹیہ کے مترجم لکھتے ہیں:-

ہندوستانی ریاضی اور علم نجوم سے متعلق سب سے قدیم محفوظ کتاب جس میں سائنٹیفک نقطہ نظر سے علم نجوم اور علم ریاضی کے مسائل نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں آریا بھٹیہ ہے۔

یوں تو بہت سے آریا بھٹ ہوئے ہیں لیکن یہاں میرے مضمون کا تعلق صرف ایک آریا بھٹ سے ہے جو قدیم تاریخ کے مطابق ۴۷۶ء سے ۵۲۹ء تک تھا، اور حالیہ تحقیق کے مطابق اس کا عہد ۴۹۹ء سے ۵۲۹ء تک بیان کیا جاتا ہے۔ آریا بھٹ کے سارے مضامین ایک ہی کتاب میں جمع کر دئے گئے ہیں جس کا نام آریا بھٹیہ ہے اور یہ سنسکرت نظم میں ہے۔ کتاب چار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلا حصہ ”گیتا پد“ (Gitika Pad) ہے۔ دوسرے حصہ کا نام ”گنت پد“ (Ganit Pad) ہے۔ تیسرے حصہ کو کل کر پد (Kal - Krupa Pad) اور چوتھے حصہ کو گل پد (Gol - Pad) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پہلا حصہ خدا کے برتر کی حمد کے ساتھ شروع ہوتا ہے اس کے بعد نصف کا نام، دیباچہ اور آخر میں اس کے حالات زندگی دیے ہیں۔ دوسرے حصہ میں علم ریاضی کا بیان ہے، تیسرے حصہ میں وقت کا اعمازہ لگانے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے اور چوتھے حصہ میں گردی علم مثلث (Spherical Trigonometry) کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کا پہلا مکمل سنسکرت ترجمہ ۱۸۸۱ء میں پہلی بار اچ کرن (H. Kern) کی طرف سے لائپٹز میں لیدن (Leiden) سے شائع ہوا۔ اس کا دوسرا اب جو علم ریاضی پر مشتمل ہے اس کا فرانسیسی ترجمہ ۱۸۸۱ء میں ال۔ روڈٹ (L. Rodet) نے کیا ہے اس کا عنوان (de Calcul d'Aryabhata) کے عنوان سے کیا ہے جس کا نقش ثانی ۱۸۶۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔

اس کے سنسکرت ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن مغلچر (بہار) سے ۱۹۱۹ء میں اودے نرائن سنگھ کی ہندی تشریح کے ساتھ شائع ہوا۔

اس کے آخر کے تینوں *(Sambha Shiva Sastri)* تراوٹڈرم کی طرف سے سنسکرت میں جتہ جتہ شایع کئے جا رہے ہیں۔ دوسرا حصہ گنت پد *(Ganit-Pad)* پر مشتمل ہے، تیسرا حصہ جس میں *(Kall-Kavya)* *(Panch)* کا بیان ہے ۱۹۳۳ء میں شایع ہوئے اور چوتھا حصہ زیر طبع ہے۔

حسب ذیل تین مصنفوں، جی۔ آر۔ کائے *(G. R. Kaye)*، کلکتہ نے قدیم کتابوں کے بہت بڑے دلدادہ ہیں ۱۹۵۸ء میں، پُرودہ چندر سین گپتا *(Rohodh Chandra Sen Gupta)*، کلکتہ نے ۱۹۲۷ء میں اور *(W. E. Clark)*، شکاگو نے ۱۹۳۳ء میں آریا بھٹیہ کا انگریزی ترجمہ کیا۔

کتاب کی اہمیت کے پیش نظر مصنف کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کرنا قطعی طور پر ایک فطری امر ہے جس کا تحریروں نے عالمگیر دلچسپی کا سامان پیدا کر دیا اور جس کی کتاب کے بہت سارے تراجم اور ادنیٰ شیخ طبع ہوئے اور ہنوز اس کا سلسلہ جاری ہے۔

_____ اگر ہم آریا بھٹ کے ابتدائی حالات کی تحقیق و تفتیش کریں جو ہندوستان کا اولین ریاضی دان سمجھا جاتا ہے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ لوگ اس کے سوانح، اس کی پیدائش اور اس کے کارہائے نمایاں کے متعلق صرف آٹھ جانتے ہیں کہ وہ چھٹی صدی عیسوی میں (۳۷۵ء - ۴۷۵ء) پٹنہ میں زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ اس وقت پٹنہ کو "پاٹلی پتر" کہتے تھے، اور یہ گپتا سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ ایک بڑی سلطنت کا پایہ تخت ہونے کی وجہ سے بعضوں نے اسے ہندوستان کا *(Rome)* کہا ہے۔ پٹنہ میں آریا بھٹ نے ریاضی کا ایک اسکول قائم کیا اور طالب علموں کی ایک جماعت کو تعلیم دی اس کی شہرت چاروں انگ عالم میں پھیل گئی۔ یہاں تک کے غیر ملک کے مشہور و معروف اہل علم اور مذہبی رہنما علمی پیاس بجانے کے لئے ہندوستان آئے۔ "پاٹلی پتر" میں مصوری، ادب، سائنس اور مذہب کی اس قدر ترقی ہوئی کہ یہ ہندوستان کا آکسفورڈ *(Oxford)* کہلانے لگا۔

_____ اس سلسلہ میں ہمیں معلوم ہوگا کہ آریا بھٹ نے عدد پڑھنے میں مقامی قیمت *(Place value)* کا اصول اور نشان کے لئے نقطہ کاروائی کس طرح جاری کیا۔ عدد کا نام مثلاً اکائی، دہائی، سیکڑہ اور اعشاریہ کا پیمانہ *(Decimal Scale)* بھی وہ استعمال کرتا تھا، جذر المربع *(Square Root)* اور جذر المکعب *(Cube Root)* کی تفریق کا قاعدہ بھی اس نے ہمیں بتایا اور مثلث کے دریافت کرنے کرہ اور اہرام *(Pyramid)* کا حجم معلوم کرنے کے قاعدے مقرر کئے۔

(اہرام کا حجم = $\frac{1}{3}$ چوڑائی \times اونچائی، کرہ کا حجم = $\frac{4}{3}$ π (نصف قطر) \times اور ثابت کر دیا کہ $\pi = \frac{22}{7}$ = سوچو $\frac{355}{113}$ = ۱۱۴/۱۱۳) الٹ پلٹ کرنے کا طریقہ *(Method of Inversion)* جس کی مثالیں یورپ اور امریکہ میں سولہویں صدی عیسوی میں بہت عام تھیں، آریا بھٹ کا بہت دلچسپ تفویضی مشغلہ تھا۔

آسانی مخلوقات (سیارے وغیرہ) روزانہ طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ زمین کی اس روزانہ گردش سے اس نے علم ریاضی کی ایک نہایت تعجب خیز دریافت یعنی کشش زمین کے نظریہ کو بطور تجربہ اخذ کیا اور اس کی توسیع اشاعت کی۔

یہ امر قابل تعجب نہیں کہ آریابھٹ کی فطری صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں نے تمام دنیا کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا، اس کی کارگزاریوں کے مرتبہ ریکارڈ اور اس کے فتوحات کا صرف سولہویں اور سترھویں صدی کے ماہرین ریاضی سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے، جس وقت خوردبین کی ایجاد عمل میں آئی اور قوانین کپلر (laws of kepler) متعین کئے گئے۔ بہر کیف، اس کا اعتراف کے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ آریابھٹ نے ایک گراں قدر سرمایہ اور ختم نہ ہونے والی منابع بے بہا ریاضی کی تحقیق و ترقی کے لئے چھوڑی ہے۔ اگرچہ آریابھٹ ام میں نہیں ہے لیکن اس کی آریابھٹیہ نے اسکو غیر فانی بنادیا ہے۔ (دراخو)

کلیتم سہسرامی

انقلاب حیدرآباد کی داستان پر پہلی کتاب

”مشاہدات“

حضرت ہوشیار جی بنگرامی

(المخاطب: جناب ہوشیار جنگ بہادر)

کے خود نوشتہ سوانح زندگی جو صرف اپنی بلند انشاء بلکہ سیاسیات و مذہبیات پر بھی ایک بے لاگ حکیمانہ تبصرہ کے لحاظ سے اپنے رنگ کی باطل پہلی کتاب ہے۔ جناب ہوش کی عمر کا بڑا حصہ ریاستوں ہی میں بسر ہوا ہے اور ان کی پائیکس کو مشکل ہی سے کسی نے ان سے بہتر سمجھا ہوگا۔ یوں تو اس میں رامپور، بھوپال، گوالیار، ادے پور، احمد، جے پور وغیرہ متعدد ریاستوں کے دلچسپ حالات نظر آتے ہیں لیکن کتاب کا وہ حصہ جو ”ریاست حیدرآباد اور اس کے انقلاب“ سے تعلق رکھتا ہے، دیکھنے کی چیز ہے کیونکہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد وہاں حیدرآباد کی تاریخ پیش کرنا تھا۔ جناب ہوش ایک چوتھائی صدی سے حیدرآباد کی پائیکس اور دربار عثمانی کے رجحانات کا مطالعہ کر رہے تھے اور نظام کے یہاں ہر وقت کی حضور کی وجہ سے وہاں کی ان تمام اندرونی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے واقف تھے چکے دوسرے کے علم میں آہی نہ سکتی تھیں۔ رضا کار تحریک، ارباب حکومت کی سازشیں، سچے مشیروں کی مشکلات، دربار عثمانی کے حیرتناک حالات، سیرت نظام کی عجیب و غریب خصوصیات، پولس ایکشن کی داستان، اور اس کے بعد نظام اور اہل ملک پر اس کا رد عمل۔ اگر آپ کو ان تمام واقعات کی صحیح تصویر دیکھنا چاہتے ہیں تو ”مشاہدات“ ملاحظہ فرمائیے۔

کاغذ لایتی، حجم ۶۰ صفحات، ۱۰ تصاویر، نفیس جلد، قیمت دس روپے علاوہ محصول۔ مینجر منکار کھنڈو

اردو کا پہلا واسوخت

غالباً حضرت امیر خسرو دہلوی سب سے پہلا مصنف تھے جنہوں نے ”ہندوی“ زبان میں بیتیں سنائیں، گیت لکائے پہیلیاں بھجوائیں، دو سٹخے بیان کئے۔ ان چیزوں نے بقائے دوام اور قبول عام کا خلعت پہن لیا ہے۔ اگرچہ ان تمام چیزوں کی نسبت امیر خسرو کی طرف مشکوک سمجھی گئی ہے تاہم اس قدر یقینی ہے کہ ان میں سے کچھ چیزیں انہی کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں۔ موصوف کی پیدائش کا سال ۶۱۲ھ اور سن وفات ۶۳۲ھ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اردو شاعری کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اردو لٹریچر کی ابتدا کب ہوئی اس بات کی تحقیق مشکل ہے۔ سب سے پہلی کتاب جو نثر میں لکھی گئی اور اب حیدرآباد سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے معراج العاشقین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مذہبی رسالے کے مصنف حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ہیں۔ خواجہ صاحب ۱۰۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۲۲ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ گویا یہ کتاب چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں لکھی گئی تھی۔ یہ کہتے اردو زبان کی پیدائش کو کم از کم ساڑھے چھ سو سال تو ضرور ہوئے۔

لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اردو زبان کی صحیح و مکمل، جامع و مبسوط تاریخ اب تک مرتب نہ ہو سکی۔ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا، یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کی ابتدائی تاریخ تاریکی میں ہے۔ سب سے پہلا تذکرہ تیرہ ۱۱۵۷ھ (۱۷۷۲ء) میں لکھا جس کا نام حکایت الشعراء ہے۔ گردیزی نے بھی اسی سال اپنا تذکرہ مرتب کیا۔ اُس کے بعد متعدد تذکرے لکھے گئے، مثلاً قائم کا مخزن حکایت (۱۱۶۹ھ)، میر حسن کا تذکرہ شعراء (۱۱۷۶ھ)، خلیل عظیم آبادی کا گلزار ابراہیم (۱۱۸۳ھ)، ضعیف کا چغتائی شعراء (۱۱۸۵ھ)، مصطفیٰ کا تذکرہ شعراء ہندی (۱۱۹۰ھ) اور ریاض النضا (۱۱۹۶ھ)، قاسم کا مجموعہ کفر (۱۱۹۸ھ)، شیفتہ کا گلشن بختیار (۱۲۰۵ھ)، طغٹ کا گلشن ہند (۱۲۱۵ھ) وغیرہ وغیرہ۔ تذکروں کی فہرست نہایت طویل ہے اس لئے نظر انداز کرتا ہوں۔ ان تذکروں میں خامیاں بہت ہیں۔ ان میں علمی ترقیب کی بڑی کمی نظر آتی ہے۔ تذکرہ نویس حضرات نے زبان کی ابتدا اور نشوونما سے بحث کرتے ہیں، شعراء کے حالات تفصیل سے لکھتے ہیں، زبان کے ارتقا کے مباحث دیکھاتے ہیں، شعراء کی شخصیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان حضرات کو تحقیق و تنقید سے دور کا بھی لگاؤ نہیں تنقید کا یہ حال ہے کہ اس کو مشاعرے کی واہ واہ اور سبحان اللہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیا جاسکتی۔ جدید اصول پر سچے پہلے آوازوں کے تقریباً ۱۱۵۷ھ میں آجیا تے لکھی، جس میں زبان کی تاریخ سے بھی بحث کی اور شاعری کے مختلف دو مقام کے

تدریجی ارتقا بھی دکھایا، شعرا کے حالات بھی ذرا تفصیل سے بیان کئے اور ان کے کلام پر اپنی سمجھ اور صلاحیت کے مطابق تنقید بھی کی۔ آزاد کی انشا پر دانی مسلم ہے، ان کی تحریر میں تمثیلی کیفیت پائی ہے۔ آیات میں شعرا چلتے پھرتے، شہتے بولتے، مشاعروں میں شرکت کرتے اور شعر پڑھتے نظر آتے ہیں۔ یہ خوبی کسی اور تذکرے میں نہیں پائی جاتی۔ لیکن اس کتاب میں تاریخی ثقافت کی بڑی کمی ہے۔ آزاد کے بہت سے بیانات غیر مستند بلکہ بعض محض بے بنیاد ہیں۔ تذکروں میں ایک بڑی فروگزاشت یا نظر آتی ہے کہ عموماً صرف شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے اور نثر نگاروں کا کچھ ذکر ہی تو اسی قدر جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے، تقریباً پچیس سال کے اندر دکن سے کئی تذکرے شائع ہوئے ہیں مثلاً اردو کے قدیم، دکن میں اردو، اردو شہپارسے، ان کتابوں میں قدیم ادبیات اردو سے بحث کی گئی ہے۔ اربابِ نثر میں ان قدیم اردو مصنفین کا ذکر ہے جن کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے تھا پنجاب میں اردو از محمود شیرانی، اس کتاب میں اس بات کا دعویٰ کیا گیا ہے کہ اردو کی ابتدا پنجاب میں ہوئی۔ اردو شہپارسے میں دکن کے دور تک کی ادبیات سے بحث کی گئی ہے۔ مولوی محمد عیسیٰ تنہا نے سیر المصنفین دو جلدوں میں لکھی لیکن تحقیق سے مطلق کام نہ لیا اور آزاد کی اندھی تقلید میں اردو کی پیدائش کا غلط نظریہ بیان کیا اور قدیم نثر نگاروں کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ یہ کتاب نثر نگاروں سے متعلق ہے لیکن آبِ حیات کے ابتدائی صفحات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ سکینہ کی تاریخ ادب اردو میں نظم و نثر سے بحث کی گئی ہے، لیکن ادب شناسوں کے ذوق کی پوری آسودگی نہیں ہوتی کیونکہ تنقید و تبصرہ میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ مرزا محمد مسکری صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے بہت سی مفید اور قابلِ قدر باتیں اضافہ کی ہیں، پھر بھی قدیم اردو نثر نگار کی تاریخ نامکمل رہ گئی۔ اس سے بہتر کتاب ڈاکٹر بی بی کی تاریخ ادب اردو ہے جس میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی گئی جو افسوس ہے کہ ڈاکٹر بی بی نے بھی متعدد جگہ ٹھوکریں کھائی ہیں اور ان کے بیانات انتہا سے زیادہ مختصر، نامکمل اور تشنہ ہیں۔ مذکورہ بالا پنجابی اور دکنی تذکرے بھی جامع اور مکمل نہیں اور ان کے نام ہی سے ان کی چودھنی شمعیں ہو جاتی ہے۔

غرض کہ میرا نظریہ اپنے ہلکے پر قائم ہے یعنی اردو زبان کی صحیح و مکمل اور جامع و مبسوط تاریخ کسی نے اب تک نہیں لکھی چنانچہ جلد ۱ ہے تو بہت مبسوط تذکرہ جو کئی جلدوں میں تمام ہوا ہے لیکن اس کو شاعروں کی فہرست کہنا زیادہ موزوں ہے۔ اردو کی جامع اور مکمل تاریخ کی ترتیب دہربن میں بہت سی دقتیں سدرام ہیں۔ کچھ مصنفین ہیں جن کے نام سے بھی لوگ آشنا نہیں اور کئی تصنیفیں جو روزِ گزشتہ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں۔ خاص کر سو بڑی بڑی کتاب ادب کی طرف بہت بے توجہی برتی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان تمام قلمی کتابوں کو شائع کر دیا جائے اور ان کے مصنفین کے سین و ولادت و وفات اور ضروری ضروری حالات کی تحقیق کی جائے یہ راہ بڑی دشوار گزار ہے، اس ”مہم خزاں“ کو طے کرنے کے لئے رستماء جرأت کی ضرورت ہے۔ ابھی تک عوام کو اس کا صحیح علم نہیں کہ پہلا غزل گو اور قصیدہ گو کون تھا، سب سے پہلے رباعی اور غنوی کس نے لکھی اور داسوخت کی اولیت کا تاج کس کے سر پہ رکھا جائے۔ جن شعرا و ادبا نے کافی شہرت بھی حاصل کرنی ہے ان میں سے بھی بعض ایسے ہیں جن کی ولادت یا وفات کا صحیح سال معلوم نہیں۔ مثلاً پہلک کو ہنوز معلوم نہیں کہ وہ دکنی کس سال پیدا ہوئے اور کب مرے، میر و سودا، مصطفیٰ و انشا،

تاریخ وائش کا صحیح سال ولادت کیا ہے۔ بعض شعرا کے سال ولادت و وفات کی تعیین کی کوشش بھی ہو چکی تھی ہے وہ محض ظنی و قیاسی ہے۔ اسی لاطینی کائنات پر ہے کہ مضمون نگار حضرات اپنے مضامین میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ایک مجلس ادارہ قائم کی جائے جس کے ارکان اُردو زبان کی تاریخ کا صحیح علم رکھتے ہوں، اُن کی طبیعت میں تحقیق و تنقید کا کافی مادہ ہو، مذاق صحیح اور وجدان سلیم ہو، شعر و ادب کا ذوق بلند ہو اور انشاء پر دازی بھی اچھی خاصی ہو۔ اور یہ مجلس ایک ایسی مبسوط تاریخ مرتب کرے جو جامع و مکمل اور صحیح و معیار سی ہو۔ لیکن اس اہم خدمت کے سرانجام کی اب توقع نہیں۔

تہی سافر حریفان مست خواب انصاف کو ساقی دل ما ذوق صافی دارد اما صاف کو ساقی

اس مقالے میں مجھے واسوخت کی ایجاد سے متعلق کچھ کہنا ہے۔ واسوخت معاملہ بندی کی انتہا ہے، اس میں معشوق سے جلی کٹی باتیں کی جاتی ہیں اور ظلم و ستم سے مجبور ہو کر کسی اور پر ہی پیکر سے دل لگانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ واسوخت کی ابتدا ایران میں ہوئی اور سب سے پہلے وحشی یزدی نے واسوخت لکھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اُردو میں واسوخت کی ایجاد کا سہرا کس کے سر ہے۔ نگار ۱۹۵۷ء کے اگست نمبر میں محمد حسن صاحب ایم، اے نے واسوخت پر ایک مضمون لکھا ہے لیکن انہوں نے اس مضمون میں واسوخت کی ایجاد سے متعلق کوئی تحقیق پیش نہیں کی ہے، محض آزاد کا قول نقل کرنے پر اکتفا کی ہے کہ واسوخت کے موجد تیر ہیں، عظیم آباد کے رسالہ معاصر ۱۹۷۷ء کے ستمبر نمبر میں اُردو زبان کے مشہور محقق قاضی عبدالودود ہار ایٹ لائے ایک تحقیقی مقالہ بعنوان ”اُردو کا پہلا واسوخت“ سپرد قلم کیا ہے جس میں واسوخت کی ایجاد سے بحث کی ہے لیکن حسابات بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ کاش اس مضمون میں کچھ اور کاوش اور تفصیل سے کام لیا جاتا۔ ابھی تک دنیا ہی جانتی تھی کہ اُردو میں سب سے پہلے تیر نے واسوخت لکھا۔ لیکن قاضی صاحب نے تحقیق کا قدم آگے بڑھایا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو میں واسوخت کے موجد شاہ مبارک آبرو تھے جن کا سال وفات قاضی صاحب کی تحقیق کے مطابق ۱۳۵۷ھ ہے۔ تیر کی پیدائش غالباً ۱۳۵۷ھ میں ہوئی، گو تیر صرف گیارہ سال کے تھے کہ آبرو نے وفات پائی۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ جو واسوخت قاضی صاحب نے پیش کیا ہے وہ آبرو ہی کا لکھا ہوا ہے تو ماننا پڑے گا کہ آبرو ہی واسوخت کے موجد تھے۔ قاضی صاحب کے مضمون مذکورہ سے متعلق کچھ اور باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

قاضی صاحب رقم طراز ہیں کہ ”تیر کے کلیات مطبوعہ میں دو واسوخت ہیں۔ ان کے ابتدائی مصرعے یہ ہیں:-

(۱) طرازے رشک چمن اب تری کچھ نازی ہے

(۲) سچ کہو شہر میں صحر میں کہاں رہتے ہو“

لیکن یہ بیان محل نظر ہے کیونکہ جب میں مطبوعہ کلیات پر نظر ڈالتا ہوں تو وہی نہیں بلکہ چار واسوخت لکھے ہیں۔ محمد حسن صاحب علی مل بھی لکھتے ہیں کہ تیر کے چار واسوخت مصرعہ ان کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں بلکہ واسوختوں کے ان تمام مجموعوں میں موجود

ہیں ————— بلکہ واسوختوں کے ان تمام مجموعوں میں بھی شامل ہیں جو اسی دور میں لکھنؤ سے شائع ہوئے تھے۔ میر پاس کلیات میر کا ایک پورا نسخہ ہے جو ”مطبع نامی نمشی نوکشتور“ میں طبع ہوا تھا، سن طباعت دمع نہیں ہے۔ اس میں تیر کے چار واسوخت موجود ہیں۔ میں ہر واسوخت کا پہلا بند نقل کر دیتا ہوں :-

(۱) طرز اسے رشک چمن اب تری کچھ نازی ہے ساتھ فیروں کے مرے حق میں سخن سازی ہے

داغ رکھنے کو مرے اُن ہی سے گل بازی ہے ہمیں ان سے ابھی سب سے ہم آوازی ہے

گوش کر میرے بھی شکوے کی طرف گل کے رنگ

رکتے رکتے روش غنچہ ہوا ہوں دل تنگ

(۲) سچ کہو فہرہیں صحرا میں کہاں رہتے ہو یاں بہت رہتے ہو خوش باش کہ واں رہتے ہو

ان دنوں یاروں کی آنکھوں سے نہاں رہتے ہو خوش رہو تیر مری جان جہاں رہتے ہو

اک طرف بیٹھے ہوئے ہم بھی لہو پیتے ہیں

عشق کی جان کو دیتے ہیں دُعا جیتے ہیں

(۳) یاد ایام کہ غریبی سے خبر تجھ کو نہ تھی سرمد و آئندہ کی اور نظر تجھ کو نہ تھی

فکر آراستگی شام و سحر تجھ کو نہ تھی زلف آشفستہ کی سدھ دود پیر تجھ کو نہ تھی

شانہ سفا نابلد کو چمکے گیسو تیرا،

آئندہ کا ہے کو سفا حیرتی رو تیرا

(۴) ایک دن دے تھے کہ تم کو نہ فریب آتے تھے اولے سولے بھی مرے آگے اٹھا جاتے تھے

مری کا ہیکو مجلس میں جگہ باتے تھے چھوٹے تھے پاؤں تو پھر سر میں دی کھاتے تھے

باتو اب شام و سحر پاس لگے رہتے ہیں

کر کے سرگوشی جو کچھ چاہتے ہیں کہتے ہیں

غالب اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ تیر کے چار واسوخت ہیں :-

آگے چل کر قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ ”ایسے شعرا کے کلام کا جائزہ لینے سے جو زمانہ کے اعتبار سے مقدم ہیں جب

نزل واسوختوں کا پتہ چلتا ہے :-

(۱) سودا (سال ولادت ۱۱۵۵ھ کے گک بھاگ (اور سال وفات ۱۱۹۵ھ) کلیات مطبوعہ (نوکشتوری) میں ایک

واسوخت ہے :-

یا ابھی کہوں اب کس سے میں اپنا احوال زلف غریباں کی مرے دل کو ہوئی ہے جہاں

(۲) حشمت (سال ولادت قریب ۱۱۳۰ھ سال وفات ۱۱۶۳ھ) ایک قدیم بھاض میں جو جناب حکیم سید محمد صالح صاحب ملک ہے اور کچھ کم دو سو سال قبل کی لکھی ہوئی ہے حشمت کا وہ واسونخت ملتا ہے جس کا ذکر تذکرہ میر حسن میں ہے۔

کیوں سے دل جا ہی چنسا میں نہ تجھے کہتا تھا عشق ہے دام بلا میں نہ تجھے کہتا تھا

(۳) تاباں (سال ولادت ۱۱۲۵ھ اور ۱۱۳۰ھ کے درمیان - وفات ۱۱۶۵ھ کے درمیان) دیوان مطبوعہ یں ترکیب بند کے نام سے ایک واسونخت درج ہے:-

ہرین موکے تئیں اپنے دباں کرتا ہوں واطرح غنچ کے اب اپنا دباں کرتا ہوں

(۴) حاتم (سال ولادت ۱۱۳۰ھ سال وفات ۱۱۹۰ھ) دیوان زادہ کے قلمی نسخے میں جو رام پور میں ہے ایسا سونخت وجود ہے غلطی سے میں نے اس کا پہلا شعر لکھ لیا تھا

آزاد نے سودا کے متعلق لکھا ہے کہ ۱۱۹۵ھ میں تقریباً ستر برس کی عمر میں انتقال کیا۔ مگر رفا میں بھی اسی کی تقلید لکھی ہے۔ اس بنا پر سودا کا سال ولادت ۱۱۲۵ھ قرار پاتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر ڈاکٹر پتلی نے بھی سودا کی پیدائش کا سال ۱۱۲۵ھ دم ۱۱۲۵ھ درج کیا ہے۔ لیکن یہ سب ظن و قیاس ہے۔ سودا کی پیدائش کا صحیح سال پر وہ خفا میں ہے معلوم میں کس بنا پر قاضی عبدالودود صاحب کا اصرار ہے کہ سودا ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ مفعول کے حاشیہ میں فحول نے لکھا ہے کہ یہ ان کی اپنی تحقیق ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات کھٹکتی ہے، عام طور پر مشہور ہے کہ سودا نے شاہ حاتم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ آزاد کا بیان ہے کہ حاتم نے دیوان زادہ کے دیباچہ میں اپنے پینتالیس شاگردوں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک سودا بھی ہیں۔ حاتم کا سال ولادت ۱۱۳۰ھ ہے۔ اب اگر سودا کا سال ولادت ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ قرار دیا جائے تو اس حساب سے حاتم سودا سے عمر میں صرف چار سال بڑے ٹھہرتے ہیں اور یہ بات غلط قیاس ہے کہ کسی نے بیل لغات کے باوجود سودا جیسے زبردست شاعر نے حاتم سے اصلاح لی ہو۔ فرض حاتم کی استادی اور سودا کی شاگردی مابین صمیم نہیں معلوم ہوتی۔ پھر بھی یہ بات تحقیق طلب ہے کہ سودا کس سن میں پیدا ہوئے تھے۔ جن حضرات کو اس قبیل کی تحقیقات کا شوق ہو اور موقع حاصل ہو اور قلمی و مطبوعہ اخذ پر دسترس ہو تحقیق کی طرف متوجہ ہو کر قاضی صاحب کے بیان تصدیق یا تردید کریں، یہ ایک مفید کام ہوگا۔

قاضی صاحب نے حشمت کے واسونخت کا ذکر کیا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ قاضی صاحب نہایت اختصار پسند واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنے مضامین میں شعرا کا صرف تخلص درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس سے اکثر غلط فہمی واقع ہو جاتی ہے۔ تخلص کا یہ حال ہے کہ کوئی ماہر الامتیاز چیز نہیں، کیونکہ ایک ایک تخلص کے کئی کئی شاعر ہوتے ہیں مثلاً اکبر الہ آبادی، اکبر دانا پوری، اکبر میرٹھی، شوق قدوائی، شوق فیضی، شوق سہیلوی، نسیم دہلوی، نسیم کھنوسی، نسیم بھٹنوری۔ اس لئے نام کے ساتھ تخلص درج کرنا (تقریباً زیادہ محفوظ و مستقیم ہے کہ اس سے اختباء و التباس واقع نہیں ہو سکتا۔ حاتم کے معاصرین میں حشمت تخلص کے دو شاعر

تھے، ایک محمد علی حشمت جو میر عبدالحی تآباں کے استاد تھے اور دوسرے محشم علی خاں حشمت۔ معلوم نہیں قاضی صاحب کی مراد محمد علی حشمت سے ہے یا محشم علی خاں حشمت سے، اور حکیم صالح صاحب کی بیاض میں جو واسوخت درج ہے وہ اول الذکر کی تصنیف ہے یا ثانی الذکر کی۔ مولانا عبدالسلام ندوی شعر الہند میں لکھتے ہیں کہ ”میر حسن نے بھی محشم علی خاں حشمت کے مشہور واسوخت کا ایک بند جو اسی طرز (سودا کی طرز) میں ہے نقل کیا ہے:-“ حاسداں تم کو جدا بیٹھ کے بہکاتے ہیں؟“ میر حسن کا تذکرہ شعر میر سے پاس موجود نہیں اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے اُس واسوخت کو محمد علی حشمت کی تصنیف بتایا ہے یا محشم علی خاں حشمت کی۔ قائم نے مخزن نکات میں دونوں کا ذکر کیا ہے لیکن محشم علی خاں کی نسبت وہ لکھتے ہیں:-“ از مردمان مشاہیر بود گاہ گاہ دوسرے شعر ریختہ و فارسی با کمال تازگی می گفت:-“ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی کے شاعر تھے اور اردو میں کبھی کبھی دو تین شعر کہہ لیتے تھے۔ لہذا یہ بات تحقیق طلب ہے کہ جو واسوخت تذکرہ میر حسن میں منقول ہے وہ کس حشمت کی ملک ہے۔

قاضی صاحب نے حشمت کا سال وفات ۱۱۶۳ھ لکھا ہے، معلوم نہیں کون حشمت، محمد علی یا محشم علی خاں؟ اگر محمد علی حشمت مراد ہیں تو اُن کا سال وفات ۱۱۶۳ھ نہیں ہے بلکہ ۱۱۷۱ھ ہے۔ ثبوت میں اُن کے شاگرد رشید تآباں کے نوٹہ مخمس کا آخری بند ملاحظہ ہو:-

تیرا تآباں غریب و خستہ بگر فکر تاریخ میں تھا حد مضطر
مصرع آخری پہ کی جو نظر کد سے ہاتھ نے اُسکودی خیر
ہائے حشمت شہید وادلا

۱۱۶۳ × ۱۱۶۱ = ۱۱۷۱ھ

اور اگر حشمت سے محشم علی خاں مراد ہیں تو بھی ان کی تاریخ وفات ۱۱۶۳ھ محل نظر اور محتاج ثبوت ہے۔ قائم نے مخزن نکات ۱۱۶۹ھ میں مرتب کیا دیہی تذکرہ کا تاریخی نام بھی ہے۔ اس کتاب میں درج ہے ”قبل ازیں ہفت سال بہ مرگ و دفعتاً از جہاں رفت او تعالیٰ رحمتش کناد“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انتقال کا تقریبی سال ۱۱۷۱ھ ہے نہ کہ ۱۱۶۳ھ۔ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ تآباں کے مطبوعہ دیوان میں ”ترکیب بند کے نام سے ایک واسوخت درج ہے“ لیکن دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دو نظمیں اور بھی اسی قبیل کی ہیں جو تضمین کے عنوان سے چھپی ہیں اور ان نظموں کا انداز بھی واسوخت ہی کا ہے۔ میں دونوں نظموں کا ایک ایک بند پیش کرتا ہوں:-

(۱) میں تیرے عشق سے از بسکہ کفر میں آیا طرق مسجد و بیت خدا ایک سا بوجھا
تمام خلق نے مشہور لمحوں میں کہا دیا ہے قتل کا قاضی نے بھی مرے فتویٰ
جرم عشق تو امیکشد و فوغائے ست تو نیز بمرام اک خوش ناشائے ست

(۲) نازک اندام تجھے دیکھ ہوا میں مفتوں عقل اور ہوش کو کھو نام رکھا یا مجنوں،
زور کھیتی ہے ترے بریں قبائے گلگوں اس کے تئیں جھوٹ تو مت جان میں سچ کہتا ہوں

شمع کربا تو کند دھوئے نازک بدنی
کشتنی سو فتنی باشد و گردن زدنی

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ ”آزاد کا دھوی ہے کہ اردو میں پہلا واسوخت میر تقی میر نے لکھا ہے۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ جب ایسے شاعروں کے واسوخت موجود ہیں جن کی شاعری کا آغاز میر کی شاعری سے پہلے ہو چکا تھا تو میر کے واسوخت کو زمانی حیثیت سے مقدم سمجھنے کی کیا وجہ ہے۔“

اردو شعرا میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ وہ اپنی نظموں کا سال تصنیف نہیں درج کرتے، اس لئے یہ بات معلوم کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ کون غزل یا کون نظم کس سن میں لکھی گئی۔ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ چونکہ میر کے دوسرے واسوخت کا پہلا شعر (سچ کہو شہر میں) میر حسن کے تذکرے میں نقل کیا گیا ہے اور یہ تذکرہ ۱۸۷۷ء اور ۱۸۷۸ء کے مابین لکھا گیا ہے اس لئے اس واسوخت کے زمانہ تصنیف کی آخری حد متعین ہو جاتی ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اولیں حد تو متعین نہیں ہوئی۔ یہ کیونکر مانا جا سکے کہ واسوخت ۱۸۷۷ء سے کچھ ہی پہلے لکھا گیا۔ میر ایک فطری دوہی شاعر تھے، انھوں نے یقیناً بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا ہوگا۔ اگر میر کی ولادت ۱۸۳۷ء میں ہوئی تو کیا یہ ممکن نہیں کہ انھوں نے بیس کچیس ہی سال کی عمر میں واسوخت لکھا ہو اور دوسرے شعر نے جو میر سے بیس کچیس برس بڑے بھی ہوں ان کی تقلید کی ہو۔ حاتم، حشمت، تاباں اور سودا میر سے عمر میں یقیناً بڑے تھے لیکن اس بات کا امکان موجود ہے کہ پہلے میر نے واسوخت لکھا ہو اور ان شعرا نے ان کی تقلید کی ہو۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں کہ ایک سن شاعر ایک سن شاعر کے متبع میں کوئی نظم لکھے۔ حاتم عمر میں انعام اللہ خاں یقین سے تقریباً بیس کچیس سال بڑے تھے، مگر انھوں نے یقین کی کئی غزلوں پر غزلیں لکھیں۔ لائحہ عظیم آبادی آتش سے سن میں بڑے تھے، لیکن انھوں نے آتش کی ایک غزل پر قصیدے کی۔ حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی سر قابال سے عمر میں بڑے تھے مگر انھوں نے آخر عمر میں اقبال کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور ان کے متبع میں جدید رنگ کی متعدد نظمیں بھی لکھیں۔ لہذا یہ بات کوئی مستبعد یا ناممکن نہیں کہ میر نے واسوخت کی ابتداء کی ہو اور حاتم، حشمت، تاباں اور سودا نے ان کی تقلید کی ہو۔ میں صرف امکان سے بحث کر رہا ہوں، ثبوت نہیں دے سکتا۔ زمانی حیثیت سے طوخر ہونے کی بنا پر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ میر نے حاتم وغیرہ کے بعد واسوخت لکھا جب تک کہ قطعی ثبوت نہ مل جائے۔ اتنی بات تو قاضی صاحب بھی مانتے ہیں کہ ”عجب نہیں کہ میر پہلے شاعر ہوں جس نے واسوخت سدس کی شکل میں لکھا ہے۔“ کیونکہ حاتم وغیرہ کے واسوختوں کے ہر بند میں چھ کے بجائے آٹھ آٹھ مصرعے ہیں۔

اب رہ گئے شاہ مبارک آبرو۔ آبرو کا واسوخت حکیم صالح صاحب کی ایک قلمی بیاض میں پایا جاتا ہے۔ قاضی صاحب کا بیان ہے کہ یہ بیاض کچھ کم دو سو سال کی لکھی ہوئی ہے (غالباً ۱۸۷۷ء اور ۱۸۷۸ء کے مابین لکھی گئی ہوگی) اور اس بیاض

میں ایک اور واسوخت ”سوز و گداز“ کے عنوان سے کسی نامعلوم شاعر کا لکھا ہوا ہے جو حاکم اور آبرو کا معاصر معلوم ہوتا ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے:-

دوستاں شرح مرے حال پریشانی کی گوش کرنا یہ حکایت..... ہجرانی کی

معلوم نہیں یہ واسوخت کس شاعر کا ہے اور یہ شاعر کس زمانہ میں تھا۔ اہل ذوق حضرات اس کی تفتیش کریں تو بہتر ہے۔ بہر کیف آبرو کے واسوخت کے متعلق مزید تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ قاضی صاحب کے قول کے مطابق آبرو کے دیوان کے دو شعروں میں یہ واسوخت موجود نہیں۔ بہر حال اگر یہ واسوخت فی الواقع آبرو ہی کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے تو انہیں کو واسوخت کا موجود ماننا پڑے گا۔ تاہم یہ بات مسلم ہے کہ مسدس کی شکل میں سب سے پہلے میر ہی نے واسوخت لکھا۔

قاضی صاحب آخر میں فرماتے ہیں کہ ”یہ بیاض بابا سے کرم خوردہ ہے اور اس میں اخلطاط کتابت بھی بہ کثرت ہیں مزید یہ کہ صاحب بیاض نے صریحاً واسوخت کو نامکمل نقل کیا ہے۔ آخری شعر کے بعد بیاض میں سادہ جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ دوسری بیاض سے (یہ واسوخت ایک اور قلمی بیاض میں بھی موجود ہے) مقابلے کی کوئی صورت اس وقت نہ نکل سکی۔“

قاضی صاحب کی تحقیق لائق ستائش ہے لیکن ضرورت ہے کہ کوئی صاحب ذوق مزید تحقیق کر کے اس واسوخت پر کچھ روشنی ڈالیں۔ چونکہ معاصر قلیل الاشاعت رسالہ تھا اور اس کی اشاعت عموماً صرف کالجوں تک محدود تھی اور نگار ایک تیار اور کثیر الاشاعت رسالہ ہے اس لئے مناسب اور ضروری سمجھتا ہوں کہ آبرو کے واسوخت کو نقل کر دوں تاکہ لوگوں کو اس کا علم ہو جائے اور مزید تحقیق کی کوئی صورت نکل سکے۔

- | | | |
|-----|---|--------------------------------------|
| (۱) | یار اب حال مرا صبر سے درگزر ہے | دل مرا صبر جو کرنا تھا سو کرگزر ہے |
| | سر کو شمشیر سے ظلم کے دھرگزر ہے | دلی قیامت سوں ترے ہجر کے بھرگزر ہے |
| | جیوتے جان کفن غم سوں پہرگزر ہے | بلکہ سو بار ترے واسطے مرگزر ہے |
| | اب نہیں تاب مجھے اشک سوں چپے بنے کی | ظلم و ستم سہنے کی |
| (۲) | روز اول کہ ترا کوئی خریدار نہ تھا | یہ چرچا شور بہ بازار نہ تھا |
| | کسی کو زلف تری سوں یہ سروکار نہ تھا | کسی کے دل نے اسے یار ترا پیار نہ تھا |
| | تیری فرگس کے کوئی شوق سوں بیمار نہ تھا | |
| | اک ہمیں تھے کہ کبھی تجھ پہ نظر کرتے تھے | گاہ گاہ ترے کو چہ میں گزر کرتے تھے |

- (۳) شوق نے دل کے ہمارے تجھے معشوق کیا،
نار کی طرح پیارے تجھے معشوق کیا
سب طرح تجھ کو سکھائی تجھے معشوق کیا
نہیں اور تجھے کئے خوار پڑے پھرتے تھے
- (۴) دل میں تو بوجھ اول کن نے تجھے پیار کیا
کس کی نظروں کے سبب حسن و انکار کیا
باغباں ہو کے گئے تجھ کو چین زار کیا
اب تجھے شوق ہوا غیر سوں جاسنے کا
- (۵) رات کو دیکھ کے اسے یار ترے طور مجھے
یاد ہے وہ ترے سب ظلم و ستم جو رہے مجھے
جیو میں بھی آیا تھا اُس وقت میں کچھ ادب مجھے
ایسے اک بند کو میں درو زبان کرتا ہوں
- (۶) آہ افسوس مرا یار مجھے بھول گیا
جان اور بوجھ کے اب حال مرا بھول گیا
محنت و رنج کا بستار مرا بھول گیا
جیو میں آتا ہے کہ اُس یار سوں جا کر رہے
- (۷) ہم جو جب پاس تھا اسے اسے سچن آتے تھے
جوں د آتے تھے کبھی آپ بلواتے تھے
بیٹھ کر پاس ہمیں پیار سے پھسلاتے تھے
منتیں کر کے نہیں چھوڑتے تھے راتوں کو
- (۸) اب وہ اخلاص محبت کی طرح بھول گئے
ہم نشینی کی وہ صحبت کی طرح بھول گئے
مہربانی کی وہ شفقت کی طرح بھول گئے
اب وہ انکھیاں ترے لیے بارود اب رو بھی نہیں
- (۹) جان جاتے ہو تم ہم ستمی بے دل جاؤ
گرچہ جانا ہے ضروری تو گئے مل جاؤ

سید شاہ ولی الرحمن دلی ایم۔ اے

دنیا کے مہاجرین

تاریکین وطن کا مسئلہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لئے نیا ہو، لیکن یورپ اور مشرق وسطیٰ یورپ کے لئے نیا نہیں۔ یہودی مقررے مکائے جانے کے بعد آج تک مہاجرین کی حیثیت رکھتے ہیں اور اہل یورپ کی ہجرت کی تاریخ اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب وہاں کی سائنسی دور تہذیب نے غلط راستہ اختیار کر کے استعماریت کی بنیاد ڈالی اور حکومتوں نے ایک دوسرے کو ہاسر نکالنے کی کوشش شروع کی۔ لیکن مہاجرین کا مسئلہ اپنی پوری شدت کے ساتھ پہلی جنگ عظیم کے بعد سامنے آیا کیونکہ اس نے متعدد حکومتوں کا تختہ الٹ دیا اور وہاں کی آبادیوں کو خانہاں برباد ہو کر اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔

ذیل کے نقشے سے آپ کو مختلف ممالک کے مہاجرین کی تعداد کا اندازہ ہو سکے گا۔

روس = ۱۹۲۲ء میں = ۷۱ اور ۷۲ لاکھ کے درمیان

۱۹۳۶ء میں = ۵ اور ساڑھے ۵ لاکھ کے درمیان

۱۹۳۶ء میں = ساڑھے تین لاکھ سے زائد اور اگر اس میں مشرقی بعید کے روسی مہاجرین بھی شامل کئے جائیں

تو ساڑھے چار لاکھ سمجھئے۔

آرمینیا = ۱۹۲۲ء میں = ۲ لاکھ ۵ ہزار

۱۹۳۰ء میں = ۲ لاکھ ۱۰ ہزار

۱۹۳۶ء میں = ۲ لاکھ ۲۵ ہزار۔ ان میں سے تقریباً ایک لاکھ ۴۴ ہزار نے شام اور لبنان میں سکونت اختیار کر لی

اسٹین = ۱۹۳۹ء میں = ۳ لاکھ۔

اطلی = ۱۹۳۹ء میں = ایک لاکھ ۸۰ ہزار۔

جرمنی = ۱۹۳۹ء میں = ۳ لاکھ ۵۰ ہزار

دوسری لڑائی کے بعد دنیا کے تقریباً ۸۰ لاکھ انسانوں کو ترک وطن کرنا پڑا۔

۱۹۴۵ء میں متحدہ اقوام نے مہاجرین کے بسانے کے لئے ایک اسوسی ایشن قائم کی، اس نے مہاجرین کی امداد پر

۳۶۸۳۵۸۳۱۳۹ ڈالر خرچ کئے۔

غذا پر اور دوسری ضروریات پر = ۲۹۷۵۱۳۴۹۹۵ ڈالر

کپڑوں پر = ۳۱۹۰۷۴۰۰۰ ڈالر

دواؤں پر = ۱۱۶۶۲۹ ڈالر

نقل و حمل اور اشاعت = ۵۹۷۷۲۱۰۷۴ ڈالر

۳۰ جولائی ۱۹۵۷ء کو جب یہ اسوسی ایشن ختم ہوئی تو اس کی امداد کا اندازہ یہ تھا:-

جزیرتی میں = ۶۳۰۵۹ ہاجرین

آسٹریلیا میں = ۱۷۹۸۳ "

آئلی میں = ۲۷۷۰۵ "

وسطی مشرقی یورپ میں = ۲۷۷۰۵ "

چین میں = ۱۰۱۴۹ "

پہلی جولائی ۱۹۵۷ء کو اس ادارہ کا انتظام بین الاقوامی تارکین وطن کی انجمن نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جب اس نے امداد کا اعلان کیا تو ہالاکہ درخواستیں اسے موصول ہوئیں۔ پہلی جولائی ۱۹۵۷ء سے ۳۰ ستمبر ۱۹۵۷ء تک اس نے ۷ لاکھ مہاجرین کو دوبارہ بسایا، ۶۷ ہزار کو ان کے وطن واپس کیا، ۱۰ لاکھ سے زیادہ کے عارضی قیام کے ٹکے کمپ بنائے اور ۶۲۲۰۰۰ مہاجرین کو ریل و جہانوں کے ذریعہ سے ۸۰ ملکوں میں پہنچایا۔ لیکن اسی زمانہ میں مہاجرین کی تعداد اور بڑھتی گئی۔ کیونکہ چین میں ۴۰ لاکھ شہر بنائے ہوئے اور وہاں کی ایک کروڑ آبادی خانوں پر باد ہو گئی۔

ہندوستان میں تقسیم کے بعد ہندوستان و پاکستان میں تقریباً ایک کروڑ آدمی حرکت وطن پر مجبور ہوئے۔

یہودیوں کی حکومت اسرائیل فلسطین میں قائم ہوئی تو دس لاکھ عربوں کو ہجرت کرنا پڑی۔

اینگلو امریکن بلاک اور روسی بلاک نے یورپ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ۵ لاکھ آدمیوں کو مشرقی بلاک سے مغربی بلاک کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ برما، ملائیا، انڈونیشیا کے تارکین وطن کی صحیح تعداد کا حال معلوم نہیں، لیکن یہ یقینی ہے کہ وہاں بھی انکی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۹ء تک (۲۷ مہینوں میں) بین الاقوامی تارکین وطن کے ادارہ نے تقریباً ۶۲۲۰۰۰ مہاجرین کی مدد کی۔ ان میں سے ۱۱۸۶۲۰ یوگوسلاویہ میں دوبارہ آباد کئے گئے اور ۱۱۴۱۱۹ یہودی حکومت اسرائیل میں بسائے گئے۔ ۸۲۷۵ برطانیہ میں، ۸۰۷ کتاؤ میں، ۳۶۵۲۵ فرانس میں، ۲۷۲۵۵ ارضائٹن میں، ۲۲۲۰۵ برازیل میں، ۲۲۱۰۶ بلجیم میں، ۱۲۳۴۳ اڈونڈیلا میں اور ۳۷۲۱۴ دوسرے ملکوں میں آباد کئے گئے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۹۵۷ء کے اخیر تک، ۳۵۰۰۰ مہاجرین کو اور آباد کیا جائے گا اور اس طرح پانچ سال میں زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ تارکین وطن کو بسایا جاسکے گا۔ اس میں چین، انڈونیشیا، برما، انڈونیشیا، ہندوستان، پاکستان، فلسطین، یونان اور ان دوسرے ملکوں کے مہاجرین شامل نہیں ہیں جن کا تعلق اس ادارہ سے نہیں ہے۔

آرٹ کی اہمیت اور آغاز

آرٹ زندگی اور کائنات سے متعلق انسانی تجربات کا حسین اظہار ہے۔ زندگی کی جدوجہد میں آرٹ کی ابتدا جمالیاتی احساس کے بڑھتے ہوئے شعور کے ساتھ ہوئی ہے۔ لیکن آرٹ کی دنیا ہماری آپ کی دنیا کا عکس ہوتے ہوئے بھی کچھ نئی معلوم ہوتی ہے۔ ہماری خارجی اور باطنی زندگی کے مراحل سے گزر کر زندگی کے مختلف تقاضوں سے اکتساب حرارت کرتے ہوئے آرٹ ہمیں جن کیفیتوں سے آشنا کرتا ہے وہ ہمارے علم اور تجربے کی حدود میں ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ نئی ہیں۔ اس لئے اگرچہ آرٹ میں ہمیں زندگی کی عام حقیقتوں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن انسانی ذہن کا تخلیقی عمل انہیں تراش کر نئی نئی شکلوں میں ڈھالتا رہتا ہے اور انفرادی تجربے کی تازگی اور گہرائی انہیں نئی معنویت اور توانائی عطا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے فنی تجربہ فطرت سے مستعار ہوتے ہوئے بھی بلند تر معنویت کا حامل ہے اور اسی لئے آرٹ کو عام تنقیدی نقطہ نظر کے مطابق محض زندگی کی تنقید یا تعبیر نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فنی تجربے کی جڑیں زمان و مکان کی گہرائیوں میں بہت ہیں لیکن فنی تخلیق ایک نئی اور بہتر حقیقت کی دریافت ہے۔

زندگی کے اعلیٰ تجربے کی حیثیت سے آرٹ کا وجود فنکار سے سنجیدگی اور گہرائی کا تقاضا کرتا ہے وہ سنجیدگی اور گہرائی جس میں ساری کائنات فنکار کے ذہن کے لئے خام مواد بن جاتی ہے جس سے وہ حیاتی پیکر تراشتا ہے۔ اس لمحہ موضوع کے تاثرات فنکار کے شعور کی گہرائیوں میں جذب ہو جاتے ہیں اور تخلیقی جذبہ بن کر ابھرتے ہیں۔ اسی لئے تخلیق کے اس لمحے میں صدیوں کے تجربات زندگی جھلکنے لگتے ہیں۔

آرٹ کا موضوع بیان ہمیشہ انسان رہا ہے۔ اگرچہ ٹرنر (J.M.W. Turner) کا قلم اور ورڈز ور تھ (Edmund Spenser) کی شاعری اکثر مقامات پر عالم فطرت کو پیش کرتی ہے۔ لیکن اگر ہم فورڈ کریس تو فاضل فطرت کے نظاروں میں بھی ہمیں انسانی تجربہ و حیات کے کسی خاص لمحے یا کسی خاص ذہنی کیفیت کی جھلک مل جائے گی۔ اس لحاظ سے فن غماہ خارجی حقایق کی ترجمانی کرے یا داخلی کیفیات کو پیش کرے، بہر حال انسانی زندگی سے متعلق رہتا ہے اور اس لحاظ سے انسانی انگلیں، آرزؤں اور حسرتوں کا کسی دیکھی جہت سے ترجمان بن جاتا ہے۔ وہ فنکار جو کسی نقطہ نظر کے قابل نہیں ہیں اور زندگی کو جس صورت میں دیکھتے ہیں، پیش کر دینے کے حامی ہیں ان کے یہاں بھی کسی نقطہ نظر کی کارفرمائی لگتی ہے۔ اس لحاظ سے خارجیت نگاری بھی ایک نقطہ نظر بن جاتی ہے جو زندگی کی موجودہ صورت کو بدلنا نہیں چاہتی بلکہ اسے

اسی طرح قائم رکھنے کی قابل ہے۔ لیکن یہ خارجیت نگاری اپنے حدود میں بھی بے لاگ نہیں رہنے باقی اور اس میں جگہ جگہ ذاتی رجحان کی جھلک مل جاتی ہے۔ زرنگی کی ساری داستان سے چند کھڑوں کا انتخاب ہی اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ نگار نے کچھ چیزوں کو بیان کرنے کے قابل پاکر چن لیا ہے اور باقی کو غیر اہم جان کر چھوڑ دیا ہے لیکن جہاں اہمیت کا سوال آجائے وہیں یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ جب تک فنکار کے ذہن میں اہم یا غیر اہم کا کوئی مفہوم متعین نہ ہو یعنی وہ زندگی کی بعض قدروں کو دوسری قدروں کے مقابلہ میں زیادہ عزیز نہ رکھتا ہو اس وقت تک وہ اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ فنکار نے شعوری طور پر ان قدروں کو سمجھا ہو اور اپنے نقطہ نظر سے خود بھی باخبر ہو۔ لیکن دانستہ یا غیر دانستہ اسکا نقطہ نظر اس کی ذہنی تخلیقات پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ ایمل زولا (Emil Zola) اور نظیر اکبر آبادی جیسے بڑے خارجیت نگار بھی اپنے فن پاروں کو ذاتی احساسات سے غیر متعلق نہیں رکھ سکے ہیں۔ ایمل زولا کی خارجیت نگاری کم از کم اس کی دونوںوں "The Dreamers" اور "Le roman expérimental" میں مدہم ہو کر صریح انداز بیان کی حد تک باقی رہ گئی ہے۔ لیکن موضوع کی دل آویزی اور رنگینی میں صاف اس کے نقطہ نظر یا افتاد طبع کی جھلک ملتی ہے۔ اسی طرح نظیر اکبر آبادی کی شاعری کی دنیا میں جو انسان سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی کے تمام ہنگاموں میں شریک ہونے کے باوجود منفرد ذہن رکھتا ہے اور اپنے گرد و پیش کا اسی انفرادی انداز میں حایزہ لیتا ہے۔ اسی داخلی احساس کی شعوری لے کبھی تیز ہو کر فنکار کو خارج سے بے نیلہ بھی کر دیتی ہے۔

مادر پیالہ عکسِ رنجِ یار دیدہ ایم

لے بے خبر ز لذتِ شرابِ مداہم (حافظ)

اس جہاں صیبتِ صنم خانہ پندار من است
جلوہ او گرو دیدہ بیدار من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من،
چہ زمان و چہ مکاں شوخی افکار من است (اقبال)
کہاں کا مینا نہ کس کا ساقی کچھ اور بڑھنے دو بے خودی کو
یہی بنائے گی جام و ساغر و ہی کرے گی شراب پیدا (جگر)
حقیقت یہ ہے کہ فطرت اور خارجی حقایق انسانی ذہن میں بجنسہ منعکس نہیں ہوتے ہیں۔ گزرے ہوئے پچھلے واقعات کے نقوش، مماثل تصورات، حال کی کیفیات اور ملتی جلتی ذہنی تصویروں کے علاوہ زندگی کی طویل راہوں میں آفاقیات سے لے کر حال تک جو نشانات ملتے ہیں وہ بھی فطرت سے حاصل کردہ تاثرات کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ فطرت اور خارجی حقایق سے انکار کر دیا جائے، یا انھیں محض داخلی ذہن کا کرشمہ سمجھ لیا جائے۔ انکا وجود انہی جگہ اٹل حقیقت ہے اور اگر ہم انسان کی تمدنی زندگی کی ابتدا اور فنون لطیفہ کے آغاز پر غور کریں تو ہم پر کھل جائے کہ دراصل ہمارے شعور کی پروان بھی خارجی حقایق اور عالم فطرت کے آغوش میں ہوئی ہے۔ اس لئے آج بھی فطرت کے مظاہر ہمارے جذباتی تصورات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ بلون (Byron) کہتا ہے کہ میں صرف میں

نہیں رہتا ہوں بلکہ اپنے گرد و پیش کا جزو بن جاتا ہوں اور میرے لئے اونچے پہاڑ بھی جذبات کا کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فطرت فنکار کے لئے ہمیشہ ایک اہم اور وسیع موضوع رہی ہے۔ لیکن آرٹ میں فطرت کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس حقیقت کو سمجھ لینا ہے کہ مشاہدہ فطرت میں مشاہدہ کی شخصیت بھی کارفرما ہے جس کے بالواسطہ نظام سے فطرت اثر قبول کرتی ہے۔ اسی حقیقت کو حال کی ایک شاعرہ Alice Meynell نے اپنی ایک نظم "To any poet" میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ وہ شاعر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:-

Sing thy sorrow, sing the gladness
In thy songs must wind and tree
Bear the fictions of thy sadness
Thy humanity

فطرت اور فنکار کی وابستگی بہت قدیم ہے۔ فن محض انفرادی تجربہ نہیں ہے۔ اس میں سماج اور فطرت کی جلوہ گری کے علاوہ ہزار ہا سال کی انسانی زندگی کے نقوش بھی قدم قدم پر ملتے ہیں۔ اس آئینہ خانہ میں انسانوں کی تہذیبی زندگی کلچرل روایات، معاشرتی تعلقات اور معاشی حقیقتیں عکس نگار نظر آتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی تہذیب کی پہلی جھلک بھی ہمیں خونِ لطیفہ کی کرونوں سے منور نظر آتی ہے اور زندگی کے گرد آرٹ کی قوس قزح رنگ و نور کا طوفان لے ہوئے ہے لیکن اس کی ابتدا قبل تاریخ کے دھندلکوں میں کھوئی ہوئی ہے اور اسے سمجھنے کے لئے ہمیں انسانوں کی ابتدائی معاشرت کا جائزہ لے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔

ذہن انسانی اپنے ارتقائی سفر کے دوران میں تہذیب کی بہت سی منزلوں سے گزرا ہے اور اس نے اکثر روایت کی گھنٹی چھاؤں میں دم لے کر آگے بڑھنے کی نئی طاقت کا احساس بھی کیا ہے۔ اس لحاظ سے انسانی زندگی ایک تجربہ ہے مسلسل اور غیر منقطع۔ جس کا رشتہ بقائے حیات کی اولین کوششوں سے قائم کیا جاسکتا ہے۔ دراصل اس کوہ ارض پر انسان کی پیدائش فطرت کی معجزانہ صلاحیتوں کا ثبوت ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا تکمیل کی جانب پہلا قدم بھی ہے اور انسانی زندگی نے زمانہ قبل تاریخ سے آج تک جو منزلیں طے کی ہیں ان کے خوشگوار اُجالے میں ہم صدیوں کی تہذیب کا قصہ دیکھ سکتے ہیں۔ تاریخ کے تال اور آہنگ پر قص کرتے ہوئے اکثر زندگی نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی ہے اور اسکے حسن بے حجاب کی کارفرمایوں نے جس طرح دور وحشت یا قدیم و جدید پتھر اور دھات کے انسانوں کو اپنا دار و شہدا بنایا ہے اسی طرح آج مشینوں کے دھوئیں سے سیہ پوش مغل کو بھی جگمگایا ہے اور تابانی بخشی ہے۔ وہ مقام جہاں زندگی کے چہرے سے نقاب سرک جاتا ہے اور اس کے حسن بے باک کی نور افشانی میں کوئی حجاب مانع نہیں رہتا، آرٹ کی جلوہ گاہ ہے اور یہاں زندگی گرد و شمشم کے اشارے پر زمین اپنی گردنیں سمیٹ لیتی ہے، زمان و مکان کی طنائیں کچن جاتی ہیں اور حیات و

کائنات ایک نقطہ پر سمٹ آتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انسانوں نے پہلی بار جب چند کھینچی ہوئی نگہیروں، جسم کی کچھ مسلسل حرکتوں اور آوازوں کے آثار چڑھاؤ کے مجموعوں میں تناسب اور توازن کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کی کسی محسوس حقیقت کی جھلک دیکھی ہوگی تو دم بخود رہ گئے ہوں گے اور اسے کسی عظیم و پرہیزگار طاقت کا پرتو سمجھ کر سر جھکا دئے ہوں گے۔ اسی لئے قدیم انسان کا احساس جمال ڈونے ڈونے اور جادو کے تصورات و توہمات کا پابند رہا تھا۔ چنانچہ قدیم انسان جہاں ہمیں ایک جانب فطرت کی عظیم طاقتوں کے سامنے سرسجود ملتا ہے وہاں اس کے آرٹ میں بھی ہمیں مافوق الفطرت عناصر سے سابقہ پڑتا ہے جنہیں خیر و شر اور رحم و غضب کے پسیر سمجھ کر وہ کبھی مدد کا خواہاں ہوتا ہے اور کبھی رحم کا طالب۔ اس طرح انسان کے ان فوق الفطری تصورات میں ہمیں اس کے تخیل کی کارفرمائی صاف طور پر نظر آتی ہے۔ دراصل اس کے جسم کی ساخت نے جہاں اسے خطرات سے بھری دنیا میں غیر محفوظ چھوڑ دیا تھا وہاں اسے عقل کا استعمال بھی سکھایا تھا اور اس کے تخیل کی جولانگاہوں کے لئے بھی وسیع میدان فراہم کیا تھا۔ پھر اس کے دونوں ٹانگوں کے بل سیدھے کھڑے ہونے اور ہاتھوں کے آزاد رہنے کی وجہ سے نہ صرف اسے زندگی کی جدوجہد میں مدد ملی بلکہ اس کا ذہن گرویدہ پیش کا جائزہ لے کر مختلف نتائج اخذ کر سکا اور ان نتائج کو بیان کرنے کے لئے ہر لحظہ ترقی پاتی ہوئی آوازوں کا سہارا لیا گیا جس نے آخر کار زبان کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح زبان ایک سماجی ورثہ بن جاتی ہے جو نسلاً بعد نسل نوع انسانی میں منتقل ہوتا اور ترقی پاتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ زبان جہاں سماجی ضرورتوں کی ترجمانی کرتی ہے وہاں قص، موسیقی، مصوری اور بہت گہری کے پہلو پہلو انسان کے جمالیاتی احساس کا اظہار بھی ہے۔ اسی کی مدد سے اس نے اپنی فطرت کی گہمت گائے، فطرت کی وحشی طاقتوں کو رام کرنے کے منصوبے سوچے اور دل کی دھڑکنوں کو وسیع و بے کراں فضاؤں میں منتشر کیا۔

وقت آہستہ آہستہ خرامی سے گزرتا گیا اور رفتہ رفتہ دجلہ و فرات کی وادی اور ہڑپا دھوم جو ڈو کے میدانوں میں دریائے نیل کے کنارے کنارے اور یونان، مصر و بازنطینیہ کی آبادیوں میں شورش حیات کا نغمہ گونج اٹھا۔ ان مغللوں میں زندگی کے معنی نے آرٹ کے جوگیت گائے ہیں ان میں انفرادی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ اس وسیع کائنات کی تھر تھراہٹ بھی شامل ہے۔ اس لئے ان گیتوں میں معاشرت کی سادگی اور احساس کی معصومیت کے ساتھ ساتھ آسمانوں کی بلندی، مرغزاروں کی شادابی اور آبشاروں کا ترنم بھی ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ذہن نے روز آغا نہ ہی سے فطرت کے نرم و نازک جلووں اور اس کے ہیبت ناک و پر عظمت مظاہر سے حسن و جمال کا درس لیا ہے اور اس کا احساس جمال فطرت کی رعنائیوں اور عظمتوں سے وابستہ رہا ہے۔ اس نے بادل کو بدلتے ہوئے رنگوں اور جھیل ہوتی ہوئی حالتوں میں دیکھا ہے، سمندر کے جوش میں آنے کا مشاہدہ کیا ہے اور اسے طوفانوں کے جلال کا اندازہ ہے۔ اسی طرح پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں، ہر سحرے گھاس کے میدانوں اور ریگزاروں کے غیر خطا و رسنائے میں جد ہزار کیفیات پوشیدہ ہیں انسانی ذہن کبھی ان سے بیگانہ نہیں رہ سکا ہے۔ اس لئے یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ہمارا جمالیاتی احساس کلیتہاً ایک نفسی تجربہ ہے یا اس کا دور و نزدیک پہلی ہوئی کائنات سے بھی کوئی علاقہ ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی دلکشی دیکھنے والی نظروں کو ازل سے اپنے دام میں گرفتار کرتی رہی ہے۔ چنانچہ صبح کی زرخیز سحری شام کے سرسلی دھندلکے اور شب کی پراسرار تیرگی نے انسانی ذہن پر ہمیشہ حاوی رہا ہے۔ اکثر تاروں بھری رات کی خوشبوئیں اور چاندی کے سیلاب میں اس نے فضاؤں سے سرگوشیاں کی ہیں۔ ان دھیمی اور مہم سرگوشیوں نے آرٹ کے مختلف روپ بدلے اور اپنے لافانی احساس میں آخر کار دوسروں کو بھی شریک کر لیا۔

اپنی مختلف خارجی شکلوں میں آرٹ نے ایک سماجی حیثیت اختیار کر لی۔ اس طرح تمدن کی ان ابتدائی منزلوں میں جہاں تاریخ کے قدم بھی لڑکھڑانے لگتے ہیں، شکار کے بعد کے جلسوں، کھلیان بھرے جانے کی خوشی میں رقص و سرود کی محفلوں اور رات کو لادو کے گرد جگمگٹوں میں فنون لطیفہ کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن یہ آرٹ تو بہت کے چھائے ہوئے بادلوں کے اوج و کھل فضاؤں اور سورج کی جاں بخش کرنوں کی ضیاؤں سے قریب تر ہے اس لئے اس آرٹ میں فطرت کی ساری دل کشی اور رعنائی گھل جاتی ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رگوں مقدس کے گیتوں اور زہر کے سہانے نغموں کو چکیتے سورج کا سونا اور پتے دریا کی چاندی تابانی بخشی ہے۔

قدیم انسان کے شعور کی پہلی انگڑائی حیرت تھی۔ حال کے فیضی حالات ماضی کی پر صعب راہوں اور مستقبل کے دشوار گزار تصور نے انسان کے ذہن پر تعمیر کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ازل و ابد کے درمیانی وقفے سے گزرتا ہوا وقت بھی اپنے جلو میں ہزاروں مسائل لایا تھا۔ موت اور حیات کی الجھنوں کو بھی انسان کے ماضی تدبیر کو حل کرنا تھا۔ لیکن ابھی تک اس کا ذہن اس قدر خامکار تھا کہ تخلیق کے ماز کو نہ سمجھ سکتا تھا، موسم کی تبدیلیوں کا واضح اور رک نہ رکھتا تھا اور ہر خوشگوار یا ناخوشگوار طبعی و غیر طبعی تبدیلی کو دیوتاؤں کے رحم و غضب سے تعبیر کرتا تھا۔ لیکن زندگی کی تڑپ اور اس کے امکانات نے خارجی حالات کی بے رحم جبریت سے ساز کر کے اپنے جال انسانی ذہن کے گرد بٹنا شروع کر دیئے تھے۔ وقت کا یہیہ برابر گردش کر رہا تھا اور تہذیب و مدنیت کی اولین منزلیں طے ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان کی خواہشوں، امنگوں اور آرزؤں کی جنگ خارجی حالات کے خلاف شدید ہو گئی تھی کہیں اسے سارے عالم میں ایک بے رحم طاقت کا رفرمانظر آتی تھی جو اس کی بہترین آرزؤں کو پامال کر دیتی تھی اور اسے کلشن حیات سے نشاط کی کلیاں نہیں چنے دیتی تھی۔ کبھی اس بے پناہ طاقت کے روبرو اس کا سر عبودیت اور عقیدت کے انداز میں جھک جاتا تھا اور کبھی دالہانہ سرشاری اور وارفتگی کے عالم میں اس کے دل کی گہرائیوں سے جو نغمہ بلند ہوتا تھا وہ اس طاقت کے دل کش مظاہر کی محبت اور تعریف میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا۔ اس طرح انسان نے فطرت کی دلکشی اور رعنائی میں گم ہو کر جمالیاتی حیرت کا جو پہلا درس لیا تھا وہ اسے ذہن کے اس پراسرار دھندلکے کی جانب لے گیا جہاں علم کی راہیں پوری طرح روشن نہیں ہوتی ہیں۔ پھر بھی زندگی کی جدوجہد اور بقائے حیات کی ہر کوشش کے ساتھ جہاں بیت سے نئے مسائل ابھرتے جا رہے تھے وہاں کئی پرانی الجھنیں سلجھ بھی گئی تھیں اور زندگی کی ہر نئی منزل انسانہ علم و تحقیق میں اضافہ کرتی جا رہی تھی۔

غلاموں میں زندگی بسر کرتے تھے انسان نے چھوٹے چھوٹے گروہ بنا کر رہنا سیکھا تھا اور جنگل پھلوں کی تلاش میں رہا جانوروں کے شکار کی خاطر گھومتے پھرتے اسے ایک جگہ مل جل کر معاشرتی زندگی گزارنے کا سلیقہ آیا تھا۔ اب تک انسان کی حیثیت اس وسیع کردہ ارض پر ایسے خیرام حیوان کی تھی جو خوراک کی تلاش میں جگہ جگہ مارا مارا پھرتا ہے اور جسے آسانی سے دوسرے قوی الجذہ جانور اپنی غذا بنا لیتے ہیں لیکن انسان کی مسلسل کاوشوں سے ہانسہ پٹ گیا اور وہ جو اب تک فطرت کی ناز برداری میں مصروف تھا فطرت اس کے ناز اٹھانے لگی۔ اب سے تقریباً چھ سات ہزار سال قبل جب انسان نے مستقلاً ایک جگہ قیام کر کے زرعی زندگی شروع کی تھی تو اس نے گویا منظم اجتماعیت کی جانب پہلا قدم اٹھایا تھا۔ ہماری آج کی تہذیب بہت کچھ اس پہلے قدم کی ہی نشیبت ہے۔ اس وقت پہلی بار انسان کو خیال ہوا تھا کہ خارجی ماحول کے مطابق خود کو ڈھانے کے ساتھ ساتھ خارجی ماحول کو بھی سماجی زندگی کے مطابق بنایا جاسکتا ہے اور یہی خیال تہذیب کی ابتدا ہے یہیں سے معاشرت میں سماجی یکجہتی (مصنفہ ۵۰)

۵۰ (مصنفہ ۵۰) کی بنیاد پر مبنی ہے اور تسمیہ کا نجات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ انسان نے اس معاشرت میں صرف زرعی آلات، پودوں اور جانوروں کی کاشت پر توجہ کی بلکہ موسیقی، رقص، ڈراما اور شاعری بھی کسی نہ کسی شکل میں پروان چڑھتی رہیں۔ اس دور کی ذہنی تخلیقات کو پورے طور سے سمجھنے کے لئے ہمیں اس عہد کے رسم و رواج کا جائزہ لینا پڑے گا۔ اس وقت جب ریاست کسی باقاعدہ شکل میں قائم نہیں تھی یہ ضروری تھا کہ انسانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے تحفظ کی خاطر انھیں رسوم کی کڑی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے تاکہ اجتماعیت کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔ اس لئے انسان نے سماجی ضرورتوں کے تحت اپنے افعال کو رسموں کے سانچے میں ڈھال دیا تھا اور رواج کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا تھا۔ اس طرح اس کی انفرادی آزادی اجتماعی مفاد کی پابند ہو گئی تھی اور اصلیت یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ہی انسان کی انفرادی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ درنہ خانہ بدوشی یا زرعی زندگی کے ابتدائی دور میں انسان بہت کم قبیلے یا خاندان کی زندگی سے غیر متعلق ہو کر سوچتا تھا۔ وہ اپنے قبیلے کی سرداری کی خاطر یا خوبصورت عورتوں کے لئے کشت و خون کر سکتا تھا لیکن وہ ہر حالت میں خود کو قبیلے کی زندگی سے وابستہ سمجھتا تھا اس لئے تہذیب کے ابتدائی دور میں انسانوں کے نفسیاتی اور جمالیاتی محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے ہم ان کی معاشرتی زندگی میں روایات، رسمیات، اور مذہبی یا نیم مذہبی اثرات کی اہمیت کو فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی اجتماعی روح کا ہر تونظر آتا ہو اسی طرح عبادت اور مذہبی رسوم کی بھی ان کی زندگی میں بڑی اہمیت تھی۔ فصلیں ہونی جانے سے پہلے زمین کی شادابی کی خاطر اجتماعی طور پر مذہبی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ اسی طرح فصلیں کاٹے جانے کے بعد خوشیاں منانے میں سب شریک ہوتے تھے اور دیوتاؤں کے حضور میں اپنی شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ دھرتی کے ان بیٹوں کی نظر ہمیشہ آسمان پر رہتی تھی اور بارش کا پہلا چھینٹا ان میں نئی زندگی پیدا کر دیتا اور انھیں نئی امنگ اور سرشاری بخشتا تھا۔ اسی طرح قحط کے دنوں میں یا ناکالی بارش کی وجہ سے ان کے دل کے کنول مرجھا جاتے تھے اور وہ لرزے ہوئے قدموں اور کانپتی ہوئی آوازیں اپنے دیوتاؤں سے رحم کی التجا کرتے تھے۔ ان کی خوشی اور غم کا پیمانہ محدود تھا جو ذرا سی موسم کی تبدیلی سے بھر جاتا اور چھلک اٹھتا تھا لیکن ان کا زندگی

سے قرب جتنی تھا اور انھیں آج کے انسان کی طرح جھوٹی خوشیاں اور موہم غم پریشان نہیں کرتے تھے۔ ان کا تخیل پہلے ہاتھ ہونے لگتا تھا۔ ان کے سامنے میں پر دان چڑھتا اور گہروں کے سہرے خوشوں کی ضیائیں جذب کرتا رہتا تھا۔ ان کے افکار میں ان کی زندگی کی حقیقتیں جھلکتی تھیں۔ قبیلوں کے الگ الگ دیوتاؤں کا وجود اس امر کا شاہد تھا کہ تہذیب ابھی ابتدائی حالت میں تھی، لیکن ایک ہزار سال قبل مسیح جب اسرائیلی تہذیب میں توحید کا عقیدہ آیا تو انسانی سماج نے بڑی حد تک منظم وحدت کی شکل اختیار کر لی تھی اور انسانی تصور رفتہ رفتہ سلبہ کر خدا اور کائنات کے متعلق ایک واضح اور مربوط نظریہ قائم کر رہا تھا۔

آج کے انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ اگر اسے کسی سنان اور غیر آباد جویسے میں رہنا پڑ جائے تو بھی وہ اپنی ذہنی تخلیق جاری رکھ سکے۔ کیونکہ اس کے پاس روایات کا لامحدود ذخیرہ ہے۔ انسانی محسوسات کے متعلق اس کا علم کافی وسیع ہے اور پھر مختلف جذبات و احساسات کا اسے ذہنی تجربہ ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ اسے آرٹ کے واضح طریقہ اظہار سے بھی آگاہی ہے جس کی مدد سے وہ احساس اور اظہار کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں یہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ خاموشی اور تنہائی میں بھی اس کی روح کا کرب یا ذہن کا لاوا کبھی کسی واضح شکل میں پھوٹ نکلے اور آرٹ کے اعلیٰ سانچے میں ڈھل جائے۔ اس کے پرفلان ابتدائی انسان کے متعلق جسے ابھی سماجی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ آرٹ کی تخلیق کا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ (حالانکہ انسانی زندگی میں ایسے وقت کا قیاس بھی شکل نظر آتا ہے)۔ ہاں جب سے انسانوں نے گروہ بنا کر خانہ بدوشی کی زندگی شروع کی تب سے آرٹ کے کسی واضح تصور کا پتہ چل سکتا ہے کیونکہ کائنات کے متعلق انسان کا احساس حیرت یا وہ کیفیتیں جنہیں وہ اس وسیع کردہ ارض پر وقتاً فوقتاً محسوس کرتا رہا ہے، بذات خود آرٹ نہیں ہیں جب تک کوئی مناسب ذریعہ اظہار ڈھونڈ نہ کرے اور اظہار میں نہ آجائیں۔ اور اظہار کی حیثیت ہمیشہ سماجی رہی ہے۔ اس لئے آرٹ سے پہلے ہمیں سماجی زندگی کا وجود فرض کرنا پڑتا ہے جہاں انسان کسی ایسی شکل میں اپنی باتیں دوسروں کو سمجھاتا اور ان کی باتیں خود سمجھتا ہے۔ انسان تو غیر ایسا جانور ہے جسے سلسلہ ارتقاء نے دوسرے حیوانات سے ممتاز کر دیا ہے، وحشی جانوروں کے وہ ریلوڈ بھی جو اکٹھے زندگی گزارتے ہیں اپنی ضرورت کی خاطر چند آوازوں کا تعین کر لیتے ہیں۔ ان بدلتی ہوئی آوازوں کی خصوصیت سے ان کے جنسی جذبہ، رنج اور غصے یا کسی آنے والے خطرے کے اشارے کا احساس ہو سکتا ہے۔ اس لئے جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے ہم بغیر کسی شک کے مان سکتے ہیں کہ اس کی ابتدائی آوازیں بھی اس کے ماحول کے تقاضوں کا بے ساختہ اظہار تھیں اور اعلیٰ مفہوم کو ادا کرنے کی قوت پائی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ انسان کی ضروریات ان آوازوں کو ماحول اور سماج کے مطابق نئی نئی شکلوں میں ڈھالتی رہیں۔ آوازوں کی ان ہی ترقی پاتی ہوئی شکلوں نے باقاعدہ طور پر زبان کا نام پایا جسے انسان کا سب سے بڑا کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ آوازیں جانوروں کی آوازوں سے اس لئے مختلف تھیں کہ ان میں انسان کے شعور کی جھلک تھی اور اس کے احساس و تجربے کے ساتھ ساتھ ان آوازوں میں ہر لحظہ ترقی اور تغیر ہوتا رہتا تھا۔

اس لحاظ سے زبان کی ترقی اور نشوونما میں انسان کی جسمانی ساخت خصوصاً اس کے ہونٹ، دانت، زبان، نالہ، حلق،

گردن کی رگیں اور کچھ پھڑوں کی بناوٹ نے آواز پر قابو پانے میں کافی ساتھ دیا ہے۔ رفتہ رفتہ زبان جس کی ابتدا سماجی زندگی میں خیال کے اشارے کی حیثیت سے ہوئی تھی انسان کے ترقی پاتے ہوئے شعور کا عکس بن گئی۔ انسانی علم کی طرح زبان بھی ہمیشہ ترقی پذیر اور تغیر پسند رہی ہے۔ جب بھی اسے جکڑنے اور محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے سرچون سوتے خشک ہو گئے ہیں زبان کی ارتقاء سے صرف یہی نہیں ہوا کہ تہذیب اور کچھ کراویان آباد ہو گیا بلکہ انسان میں موجودات عالم کی حقیقت اور ماہیت جاننے کی خواہش بھی بیدار ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان انسانی جذبات اور احساسات کا آئینہ بن گئی۔ کارزار حیات میں مرد اور عورت کے بے قید اور بے موسم کے ساتھ نے جنسی طور پر مرد کی فاعلیت اور عورت کی انفعالییت سے سادہ کر کے نیاز و ناز کے ہر اڑلے راگ چھیڑ دئے۔

انسانوں کی تہذیبی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے ہم اس کے دوسرے بڑے کارنامے کو فراموش نہیں کر سکتے۔ یہ کارنامہ تحریر کی ایجاد تھی۔ جس کے بغیر معاشرت کا وجود مستحکم نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں تحریر کی اولین صورتوں سے بحث نہیں، تصویری خطوں کے ذریعہ یا مختلف اشکال کے طور پر جس طرح بھی تحریر کی ابتدا ہوئی ہو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی ایجاد نے نہ صرف روایات، قانون اور ریاست واضح شکل دیدی بلکہ انسانی جذبات کو بھی ایک معین سا پتہ مل گیا جس کی مدد سے وہ ایک حد تک وقت کا چہرہ و تئیل سے آزاد ہو گئے۔ یعنی اب ادب کی مدت حیات انسانی حلقے کی جلد ہی اُلٹ جانے والی بساط نہ رہی تھی بلکہ خود ادب کے حیات بخش عناصر اس کی زندگی متعین کرتے تھے۔ ساہا سال گزر جانے کے باوجود آج بھی یونانی ادب دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے کیونکہ اس میں انسان کے عہد طفلی کی سادگی جھلکتی ہے۔ جیسے کائنات نے شرمیلی دلہن کی طرح پہلی بار اس ادب کے آئینہ میں اپنی آنکھیں کھولی ہوں۔ یونانی ادب حیات کی عشوہ سامانیوں کے متعلق پہلا رچا ہوا احساس جمال ہے۔ جس میں احساس کی تازگی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اسی لئے سوفو کلیس (Sophocles) کی شاعری میں مہل کا نغمہ چھوٹی تھر تھر آہٹوں کا حامل ہے۔

قدیم انسانی سماج میں شاعری کے علاوہ دیگر فنون لطیفہ کا وجود بھی اپنی ابتدائی شکل میں مل جاتا ہے جس میں شاید سب سے زیادہ قدامت رقص کو حاصل ہے۔ کیونکہ شاعری اور موسیقی دونوں زبان کی پیدائش کے بعد کی چیزیں ہیں لیکن رقص میں جسم کی حرکات ہی اظہار کا واحد ذریعہ بن جاتی ہیں۔ رقص اور موسیقی دونوں دنیاؤں سے دیوتاؤں کے حضور میں انسان نے اپنے احساسِ مودیت کا اظہار کیا ہے۔ اسی لئے رقص اور موسیقی عبادت میں شامل رہے ہیں جس کا سلسلہ مندر کی دیوتا سیویں اور طلیسا کی کنواریوں تک جلتا ہے۔ انسانوں کی تہذیبی ترقی کے دور میں مذہبی کرداروں اور دیوتاؤں کو بھی خاص خاص موقعوں پر پیش کیا جانے لگا تھا جسے ہم آئینج کی پہلی منزل کہہ سکتے ہیں جس نے بعد میں ڈراما نگاری کی بنیاد رکھی۔ ابتدا میں موسیقی اور ڈرامہ نگاری بھی شاعری کا۔ بار الیتی رہی ہیں اس لحاظ سے تو بلا لطیفہ میں شاعری کی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔ شاعری کا تعلق ہمیشہ انسانوں کے شعورِ نغمہ سے رہا ہے اور شاعری و غنائیت کا یہ ربط ابھی آج بھی باقی ہے۔

حنیف فوق ام۔ اے

باب الاستفسار

رویت ہلال

(جناب عبدالعلی محسن علی صاحب - مندرجہ)

رویت ہلال پر آپ نے نگار میں اظہار خیال فرمایا ہے یا نہیں، اس کی 'مطلق خبر نہیں' لہذا اسی کے متعلق چند باتیں دریافت کر کے رحمت دے رہا ہوں۔ براہ کرم صحت فرمائیں

پیر و ان اسلام میں: اشتناک فرقہ شیعہ اسماعیلیہ باقی تمام حضرات سال ۱۰۰۰ اور ایام کی تعیین کے لئے عینی مشاہدہ ہلال پر یقین رکھتے ہیں نقطہ مذکورہ بالا فرقہ ہی ایسا ہے جو حساب سے برکت قبل کے چہینے اور تاریخ معلوم کرتے ہیں۔ رویت ہلال کی حاکمیت میں بطور ثبوت جو حدیث نبوی پیش کی جاتی ہے اس سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو تعیین تاریخ ایسے زبردست اور ضروری مسئلہ کا محض چاند کے مشاہدہ پر ہی منحصر ہونا اسلام ایسے مذہب کے لئے جو کہ نوع انسانی کے لئے مضابطہ نظام حیات پیش کرنے کا دعویٰ ہے نہایت جنگ آمیز بات ہے۔ زمانہ موجودہ میں جبکہ سائنس اور فلکیات کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ ہیئت دہاں برسوں قبل دور دراز سیاروں اور ستاروں کی رفتار معلوم کیے ان کے نظر آنے کا وقت بتا دیتے ہیں تو پھر تعیین تاریخ جیسا معاملہ رویت ہلال پر موقوف رکھنا کہاں تک مناسب ہے۔ فرقہ شیعہ اسماعیلیہ (جماعت بوہرہ) کے پاس اتنا مکمل حساب تعیین تاریخ قمری کا ہے جو ہمارے لئے نہایت مفید و کارآمد ہو سکتا ہے تو پھر کیوں تمام مسلمان اس حساب پر اتفاق دکر کے آج بھی اسی صدیوں کے پرانے طریقے اڑے ہوئے ہیں۔

اس مسئلہ پر براہ فہوش مذہبی و سائنسی نقطہ نظر سے بالتفصیل بحث فرما کر اپنے خیالات سے آگاہ فرمائیں۔

(نگار) مذہب کے مسائل پر سائنس کے نقطہ نظر سے غور کرتا، سائنس کی خدمت کو خیر ہو ہی نہیں سکتی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ مذہب کی بھی خدمت نہیں، کیونکہ مذہب کا مقصد و صرف اخلاق کی اصلاح ہے اور سائنس کو اس کی صحت کا معیار قرار دینا کبھی مفید نہیں ہو سکتا جبکہ خود سائنس کے نتائج بھی یقینی نہیں۔

اسلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ سائنس کے مسائل پر روشنی ڈالے آیا ہے لیکن اس نے ہر شخص کو غور و تفکر کی دعوت دیکر

اس کی اجازت ضرور دیدی ہے کہ انفرادی طور پر وہ علوم و فنون حاصل کرے، بشرط آنکہ یہ ترقی اخلاق کو خراب کرنے والی نہ ہو اور اس کے اجتماعی سبیل میں لے سائنس کے درخور کو کبھی پسند نہیں کیا کیونکہ اس طرح اصولی اختلافات اور تشتمت و انتشار کا اندیشہ تھا۔

رویت ہلال کا مسئلہ بھی اجتماعی مسئلہ ہے اور اس میں انھیں پیدا کرنا مناسب نہ تھا، اس لئے اس کو نہایت سادہ طور پر اس طرح طے کر دیا کہ جب ۲۹ کو چاند نظر آجائے تو سمجھ لو کہ ہیڈ ختم ہو گیا اس انھیں میں بڑے کی ضرورت نہیں کہ مطلع ابراؤد تھا یا نہیں یا یہ کرنا نصیحتا فلکی کی رو سے اس کی رویت غلام دن ضرور ہونا چاہئے۔

ایک ہیڈ کا اختتام اور دوسرے ہیڈ کا آغاز متعین کرنے کے لئے یہ اتنا سادہ طریقہ تھا کہ اس کو ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا تھا اور آپس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ رکھتا تھا۔ آپ غالباً یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی تقریبات ساری دنیا میں ایک ہی دن منائی جائیں لیکن یہ ممکن نہیں۔

زمین چونکہ گردی شکل رکھتی ہے اس لئے چاند اور سورج کے طلوع و غروب کے اوقات اس میں ہر جگہ یکساں نہیں ہو سکتے۔ جس وقت آفتاب یہاں غروب ہوتا ہے امریکہ میں طلوع ہوتا ہے اور اس طرح تقریباً ایک دن کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس لئے اگر تاریخ قمری کا آپ کے یہاں کوئی مکمل حساب ہو تو بھی دن کا اختلاف تو ضرور ہوگا اور آپ کا یہ مقصود کہ کسی تقریب کو تمام دنیا کے مسلمان ایک ہی دن منائیں کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں کوئی ضرورت اس کی محسوس نہیں ہوتی کہ رویت ہلال کے مسئلہ میں فلکیات سے کام لیا جائے۔ آج کل رویت ہلال کے باب میں تار اور ریڈیو کی خبروں پر بھی اعتماد کیا جاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ بھی کوئی مناسب طریقہ نہیں کیونکہ اس سے بھی مسئلہ کی سادگی پر اثر پڑتا ہے۔

اگر مختلف مقامات کے تمام مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر عیدین کی نماز ادا نہیں کر سکتے، تو اس میں کیا حرج ہے کہ مختلف مقامات کے مسلمان مختلف دنوں میں اسے ادا کریں جبکہ اس طرح اسلام کے بنائے ہوئے طریقہ کی سادگی بھی قائم رہتی ہے اور غرہ و محاق کے حسابات سمجھنے پر بھی عوام مجبور نہیں ہوتے۔

باؤرے نین

(جناب اکرم دھولیوی)

ہندو میں "باؤرے نین" بڑی کثرت سے مشہور ہے۔ اردو نے فارسی میں اتنی ہی رنگین و بھرپور ترکیب کی مجھے تلاش ہے۔ "متوالی اکٹھ" اور

"چشم خمار آگین" میری نظر سے گزرے مگر تسلی نہ ہو سکی، اگر آپ کی نظروں کوئی اور ترکیب ہو تو مطلع کیجئے۔ عین کرم بھگا۔

(نکار) اردو میں "اکٹھ" سے متعلق محاورات تو سیکڑوں ملتے ہیں لیکن اس کی صفات بہت کم نظر آتی ہیں، اور جو صفات ہیں بھی تو

ان کا تعلق زیادہ تر فارسی سے ہے۔

تین آنکھ کے معنی میں قدماء کے یہاں مستعمل تھا، لیکن بعد کو ترک کر دیا گیا، حالانکہ ایسے سبک لفظ کو ترک ذکر کرنا چاہئے تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ”باورس نین“ بڑی پیاری ترکیب ہے، یہاں تک کہ خود ہندی میں جو چند مخصوص و متعین صفات آنکھ کی مستعمل ہیں، ان میں بھی اس ترکیب کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ ”باورس نین“ کے علاوہ ”دیکھر نین“ اور ”چنچل نین“ بھی ہندی میں بکثرت مستعمل ہیں، لیکن شاید ”باورس نین“ سے بہتر نہیں۔

اردو میں آنکھ کی صفت شریانی، متوالی اور موٹھی بھی استعمال کی گئی ہے جو نسبتاً ہندی سے ترکیبوں سے قریب تر ہے، اردو میں آنکھ کے معنی میں فارسی لفظ چشم بکثرت استعمال کیا گیا ہے، لیکن ہمیشہ ترکیب کے ساتھ۔ تنہا لفظ چشم بغیر کسی ترکیب کے آنکھ کے معنی میں اردو ادب میں کہیں نظر نہ آئے گا۔ یعنی یہ کبھی نہ کہیں گے کہ ”اس کی چشم اچھی ہے“ یا ”اس کی چشم نے مجھے مار ڈالا“ بلکہ ایسے مواقع پر ہمیشہ آنکھ ہی کا لفظ استعمال کیا جائے گا۔ فارسی میں البتہ چشم کے لئے اتنے صفاتی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں کہ شاید ہی کسی اور ادب میں نظر آئیں۔

ان صفات کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اگر ہم ان کی تقسیم کرنا چاہیں تو ”دنائے کیت و کیفیت“ کی شاید ہی کوئی ایسی چیز ہوگی جس سے شعرائے فارسی نے چشم کی صفات متعین کرنے میں کام نہ لیا ہو۔ فارسی میں لفظ چشم، آنکھ اور نگاہ کے علاوہ امید کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ (غالب کا مصرع ہے :- خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم)، لیکن ہمیں اس مفہوم سے بحث نہیں صرف آنکھ اور نگاہ کے مفہوم کو سامنے رکھ کر دیکھنا ہوگا اس کی صفات میں کن کن جدتوں سے کام لیا گیا ہے۔

وہ ترکیبیں جن کا تعلق دنیاۓ حیوانات سے ہے ان میں زیادہ تر آج کو سامنے رکھا گیا ہے مثلاً آہو فریب - آہو گیر - آہو کچہ - آہو انداز - جانوروں میں شیر کو بھی لیا گیا ہے جیسے شیر شکار و شیر گیر لیکن کم۔ اس سلسلہ میں شکاری چڑیوں کی طرف بھی ان کا خیال گیا اور شہباز و تیز جنگ کی ترکیبیں اختراع کی گئیں۔ کیڑے مکوڑوں میں سے انھوں نے صرف زنبور سرخ کو تشبیہ کے لئے منتخب کیا۔

جنگ و قتال اور اسلحہ جنگ کو سامنے رکھ کر انھوں نے البتہ بہت سی صفات (بجا دیکیں مثلاً: تیر انداز - کماندار - ناکو افگن - خونریز - خونخوار - قاتل - ظالم - غارتگر - مردم آزار - مردم کش، یہاں تک کہ نرود، ضحاک اور فرعون بھی - سحر و ساحری کے سلسلہ میں - جادو و دش - جادو فریب - فسوں ساز - ہاروت - چاہ بابل وغیرہ کی ترکیبیں استعمال کی گئیں۔

پھولوں میں البتہ صرف ایک درگس کو لیا اور اس پر خوب خوب طبع آزمائی کی۔ مثلاً: - درگس بیمار - درگس گویا - درگس لار - رنگ - درگس نیم خواب - درگس مستانہ - درگس خواب آلود - درگس فتنہ زار وغیرہ وغیرہ - نیلگوں آنکھوں کے لئے نیلو فر کو سامنے

رکھ کر شعلہ نیلوفر کی ترکیب اشراق کی۔ پھلوں میں بادام کے سوا انھیں کوئی اور چیز نہیں ملی۔ شراب و متعلقات شراب کو سامنے رکھ کر بہت سی صفات پیدا کی گئیں۔ مثلاً:۔ مست۔ سیہ مست۔ نیم مست۔ مخمور۔ غمار آلود۔ بادہ پیمایہ میگوں۔ مے پرست۔ پیمانہ۔ ساغر۔ شیشہ۔

کیفیات تشبیہات بھی فارسی میں بہت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً:۔ شرگیں۔ شرم آلود۔ حجاب آلود۔ خوش نگاہ۔ طلا دین۔ دل آشوب۔ ثنائی شعار۔ سخن گو۔ دلبر۔ دلفریب۔ ناتواں۔ بیمار وغیرہ۔

یہ تو وہ صفات ہیں جن کا تعلق معشوق کی آنکھ سے ہے۔ عاشق کی آنکھ کی جو صفات فارسی میں پائی جاتی ہیں، ان میں زیادہ تنوع نہیں ہے، زیادہ تر اشک و گریہ کو سامنے رکھا گیا ہے:۔

پُر آب، نم زدہ، نزالہ بار، گہر بار، گہر فروش، درفشان، دجلہ بار، خونہار، خونفشان، اشکبار، طوفانی، طوفان بخیز، غریز کیفیات کے لحاظ سے بھی بعض صفات وضع کئے گئے مثلاً:۔

حیران۔ حیرت آلود۔ حسرت نشان۔ گراں خواب وغیرہ۔

اب رہا آپ کا اصل سوال کہ باؤرے نین کے انداز کی کوئی ترکیب اردو فارسی میں کیا ہو سکتی ہے، سو اس کا تعلق زیادہ تر ذوق سے ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اردو میں ”متوالی آنکھ“ اور فارسی میں چشم مخمور، چشم مست، چشم سیہ مست، کی ترکیبیں ”باؤرے نین“ سے زیادہ ملتی جلتی معلوم ہوتی ہیں۔

زندگی کی قدیں

(جناب سید محمد حسنین صاحب فیض آباد)

آجکل لڑکچہ میں اکثر ”اقدار حیات“ کا ذکر سنتے ہیں آتے۔ ازراہ و کرم مطلع فرمائیے کہ یہ کیا چیز ہے اور موجودہ زمانہ میں کون سے

اقدار حیات کام کر رہے ہیں؟

(نگار) نوع انسان کے زندگی کی ضروری قدیں کیا ہیں؟ اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا کیونکہ ہر قوم کی قدیں مختلف ہوتی ہیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، تاہم اچھی غذا، اچھی صحت، زندگی کا تحفظ، اور غن و فکر سے آزادی ضرور ایسی مشترک اغراض ہیں جن پر قریب قریب تمام قوموں کا اتفاق ہے اور اس لئے ان کو زندگی کی ضروری قدیں کہا جاسکتا ہے۔

ایک شخص عود اپنے ہی اغراض میں نہہک رہتا ہے اور دوسرے لوگوں کے اغراض جو اس سے مختلف ہوتے ہیں اسے بہت عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ایک ہی چیز جو ایک قوم کے لئے قیمتی ہے دوسری قوم کے لئے ناقابلِ توجہ ہے۔ اس کے علاوہ یوں بھی جو چیز آج عزیز ہے وہ دس سال کے بعد اپنی قیمت کھو بیٹھتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم ایک چیز کی اسی وقت قدر کرتے ہیں جب تک وہ ہمارے اغراض کا ساتھ دیتی ہے۔

زندگی کی قدروں کے متعلق جو مختلف رائیں اور اصول قائم کئے جاتے ہیں ان کا تعلق مختلف اسباب سے ہے۔ مثلاً موسم کو لیتے گرم ممالک کے رہنے والے اپنے مکانوں کے چاروں طرف سایہ دار درخت نصب کرنا پسند کرتے ہیں اور سرد ملکوں کے باشندے ایسی جگہ پسند کرتے ہیں جہاں دھوپ کا گزر آسانی سے ہو۔ ہمارے ماحول کو بھی اقدار زندگی کے انتخاب میں بڑا دخل ہے، افریقہ اور آسٹریلیا کے جنگلی باشندوں کے لئے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ وہ درندوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں۔ لیکن شہر کے رہنے والوں کے سامنے یہ سوال نہیں ہے۔

قومی روایات اور رسم و رواج کو بھی اقدار زندگی کی تعیین میں بڑا دخل ہے، مثلاً قدیم ہندوستان میں ایک عورت کے لئے یہ امر باعثِ لعنت خیال کیا جاتا تھا کہ وہ شوہر کے لئے زندہ رہے اس لئے شوہر کی وفات کے بعد موت کی جستجو اس کی زندگی کی ایک ضروری قدر تھی لیکن اب یہی رسم جرم خیال کی جاتی ہے۔

یونانی کی اسپارٹا قوم میں سپہ گری زندگی کی نہایت اہم قدر تھی چنانچہ اسی کے یہاں رسم تھی کہ نوجوانوں کو جنہیں فوجی تربیت دی جاتی تھی مامور کیا جاتا تھا کہ رات کے وقت قتل توڑ کر یا نقب لگا کر لوگوں کے مکانوں میں گھسیں اور چوری کریں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی الزام تھا کہ جن مکانوں میں انھیں داخل ہونا ہوتا تھا وہاں کے لوگ پہلے سے ہوشیار کر دئے جاتے تھے۔ اگر یہ نوجوان اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتے تھے اور گرفتار کر لئے جاتے تھے تو وہ نا اہل سمجھے جاتے تھے۔ الغرض وہاں نقب زنی اور چوری زندگی کی نہایت اہم قدر سمجھی جاتی تھی، لیکن اب وہ جرم ہے۔

پیشل سچ ہے کہ ضرورت ایجاد کی مادہ ہے، جب تک ہمارا کام کسی بات سے مکمل رہتا ہے ہم اس کو اپنی زندگی کا اہم مقصد سمجھتے رہتے ہیں لیکن جب اس سے کوئی کام نہیں نکلتا تو اسے ترک کر دیتے ہیں۔

اس زمانہ کے اقدار کا تعلق کمیسر اقتصادیات سے ہے، یعنی اب صرف ایک ہی فکر انسان کے سامنے ہے، یعنی یہ کہ وہ جیسے کمزور گرائی برحق حار ہی ہے، اور حکومتیں اس مسئلہ کو بھی صرف سیاسیات کے نقطہ نظر سے دیکھتی ہیں۔ پھر اگر تمام دنیا کی حکومتوں کا نقطہ ایک ہی ہوتا تو بھی مضائقہ نہ تھا، لیکن مصیبت یہ ہے کہ انسان اس حیثیت سے دو محاذ میں تقسیم ہو گیا ہے، ایک جماعت کہتی ہے کہ دنیا کا امن و سکون اور اقتصادی دشواریوں کا علاج صرف ڈاکریسی میں ہے، دوسرا محض اشتراکیت کو ذریعہ نجات قرار دیتا ہے۔ اس لئے جیب تک اصولاً طے نہ ہو جائے کہ ان دو میں کون صحیح و درست ہے، اس وقت تک اقتصادیاں مشکلات دور نہیں ہو سکتیں۔

اگر دونوں نظریوں کے حامی واقعی خلوص نیت سے غور کرنے پر آمادہ ہوں تو ممکن ہے کوئی درمیانی صورت مفاہمت پاییدا ہو جائے، لیکن وہاں تو صورت حال یہ ہے کہ ایک دوسرے کی سنا ہی نہیں چاہتا۔ اشتراکیت کے محوت سے ڈاکر لسی رفقان کے دورے پڑ رہے ہیں اور اشتراکیت کو چرک اپنی کامیابی کا یقین ہے اس لئے وہ ڈاکر لسی کے اس خوت و ہراس سے نہایت خاموشی کے ساتھ فائدہ اٹھا رہی ہے اور کھلم کھلا تصادم سے گریز کر رہی ہے، کیونکہ اسے یقین ہے کہ ڈاکر لسی ایک ایک دن خود اپنے ہی ہوجہ سے فنا ہو جاتا ہے۔

پھر سچ پوچھئے تو خطرہ یہ نہیں ہے کہ اشتراکیت و جمہوریت میں جنگ کے امکانات قوی ہوتے جا رہے ہیں بلکہ یہ کہ اشتراکیت منگ کر نہ نہیں چاہتی اور لڑائی طعنی ہوتی جا رہی ہے اور یہی وہ بیم ورجا کی کیفیت ہے جس نے انسان کے دل و دماغ کو بیکار کر رکھا ہے، کسی مصیبت کا اندیشہ خود اس مصیبت سے زیادہ تکلیف دہ ہوا کرتا ہے اور آج کل دنیا اسی دور سے زرد رہی ہے۔

ان حالات میں اقدار حیات کے تعین کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ انسان اس سیلاب میں بہا جا رہا ہے اور کچھ یہ نہیں کہ انجام کیا ہونا ہے، کہیں پائیل ٹکیں تو وہ سوچے کہ سیلاب اسے کہاں سے کہاں لے گیا اور ساحل کہیں نظر بھی آتا ہے یا نہیں۔

منکار کے پرانے پرچے

۶۳۷ = سالنامہ (ڈراما صحابہ گفت) عام - مارچ ۶ - اپریل ۷ - مئی ۸ - جون ۶ - جولائی ۸ - اگست ۸
 ۶۳۸ = سالنامہ (فراسات التحریر) عام - جولائی ۶ - اگست ۸ - ستمبر ۷ - اکتوبر ۱۱ - نومبر ۶ - دسمبر ۶ -
 ۶۳۹ = فروری ۸ - مئی ۸ - جولائی ۸ - ستمبر ۸ - ۶۳۳ = فروری ۸ - ۶۳۸ = سالنامہ (تاریخ
 سلامی ہند) عام - اپریل ۸ - مئی ۶ - جون ۶ - جولائی ۶ - اگست ۶ - ستمبر ۶ - اکتوبر ۶ - نومبر ۶ - دسمبر ۶ -
 ۶۳۹ = سالنامہ (صحفی نمبر) عام - فروری ۶ - مارچ ۶ - اپریل ۸ - مئی ۶ - ۶۳۷ = فروری ۶ - مارچ ۶ -
 اپریل ۶ - مئی ۶ - اکتوبر ۶ - ۶۳۷ = جون تا دسمبر ۶ فی پرچہ - ۶۳۷ = مارچ، اپریل، مئی، اگست، ستمبر، اکتوبر،
 نومبر فی پرچہ - ۶۳۷ = سالنامہ ریاض نمبر ۷ - ۶۳۷ = سالنامہ (قرآن نمبر) ۷ - اپریل ۶ - اگست ۶ - ستمبر ۶ -
 اکتوبر ۶ - نومبر ۶ - دسمبر ۱۲ - ۶۳۶ = فروری، مارچ (انتقاد نمبر) ۶ - اپریل ۴ - مئی ۴ - جون ۶ - جولائی ۴ - اگست ۸ - ستمبر ۱۲ -
 اکتوبر ۱۲ - ستمبر ۷ - ۶۳۷ = سالنامہ (ماجدلین نمبر) ۶ - مارچ ۱۲ - اگست ۱۲ - ستمبر ۸ - اکتوبر ۶ - نومبر ۱۲ - ۶۳۸ = سالنامہ
 پاکستان نمبر ۷ - مارچ ۱۲ - مئی ۱۲ - جون ۱۲ - جولائی ۱۲ - اگست ۸ - ستمبر ۱۲ - نومبر ۱۲ - دسمبر ۶ - ۶۳۹ = سالنامہ اضافہ نمبر عام - مارچ
 اپریل ۶ - مئی ۸ - جون ۸ - جولائی ۶ - اگست ۶ - ۶۳۷ = سالنامہ (تقدیر نمبر) عام - مارچ ۱۲ - اپریل ۱۲ - مئی ۱۲ - جون ۱۲ - جولائی ۸ - اکتوبر ۶ - نومبر ۱۲ -

دوزخ

(تیسرے ”دوزخ“ کی یہ ”فردوس نامی“ کتب تک)

چھا گیا کتنے تنگخوئیوں پہ تباہی کا غبار۔
 ذرہ ذرہ ہے یہاں صدق و صفا کا مدفن،
 ابھی برپا ہے وہی انجمنِ اہل کتاب
 دشت بہتر ہے ترے ان چمنستانوں سے
 کھا گئی باغِ خزاں کتنے سمن زاروں کو
 کس قدر چاند اُحمالے کے لئے روتے ہیں
 کب سے خاموش ہیں عرفان و صداقت کے چراغ
 زندگی ہو گئی تبدیل گراں جانی میں،
 امن و اخلاص کو انسان ترستا ہی رہا
 رگِ احساس پہ چلتے رہے ان شراب تک
 بدزدن کے جلو میں ہیں اندھیرے کتنے
 دین و دولت کے صنم، نسل و سیاست کے صنم
 کاروانِ خاک بسرِ شعلہ چکاں راہ گزار
 یہ تمدن کے پجاری، یہ قدامت کے امام
 ہلہلے ہی رہے جہل و قیادت کے علم
 تو نے آدم کو دے غلہ و جہنم کے فریب
 کتنے سورج ہیں زانے میں اندھیرے کا شکار
 حسرتیں پتی پتی پھرتی ہیں فہمیدوں کے کفن
 کار فرما ہیں ابھی میرٹھی و شاہی کے سراب
 باز آیا میں حقیقت کے نہاں خانوں سے
 تیز کرتی ہے اہل یاس کی تلواروں کو،
 اپنے ہر داغ میں ناسور لئے ہوئے ہیں
 عرش پر نقرہ و نیلم کے خداؤں کا داغ
 موت رقصاں ہے کلاہوں کی ذراقتانی میں
 آگ بڑھتی ہی رہی، نہ سہر برستا ہی رہا
 عشق و ادراک کے پیچم ہیں نگوں سراب تک
 بن گئے قافلہ سالار ایڑے کتنے
 یہ فلاکت کے بیابان، یہ امارت کے صنم
 دیکھ ہر موڑ پہ وجدان و بصیرت کے مزار
 یہی دنیا ہے تو یارب ترسی دنیا کو سلام
 بھوک کھاتی رہی بکتی ہوئی عصمت کی قسم
 کبھی تنہا کے دھوکے کبھی زمزم کے فریب

یہ خدائی ہے تو ہندو خدائی کب تک !

افسر سیامی احمد گری

تخلیق آدم

(۱)

فضاؤں میں پیدا ہونی تھر تھراہٹ خلاؤں میں بننے لگے کچھ ہیولے
خدا کے تصور کا شہکار بن کر کوئی خطہ ارض پر مسکرایا
بحریم ملائکہ نے آنکھیں بچپائیں، و فور مسرت سے سجدے لٹائے
ہوئی بارش نور کی زرفشانی، دو عالم نے مستی کا انداز پایا
لیں دستیں تنگنائے زمیں کو، نہی عظمتوں کے دے جگمگائے
افق تاب جنودوں نے خود کو سنبھالا بکھرے لگا حسن عالم پناہی
ہویدا ہوا خود بخود سینہ ارض سے بن کے اک غنچہ ماہتا پی
ہوا آدم کے خوابوں کی تعبیر بن کر بڑھالیکے عالم کی کل بادشاہی
بکھرے لگیں حسن نوکی شعاعیں، جلوئے افق میں سحر مسکرائی
شفق کی صباحت گلوں کی نزاکت نے حسن مجسم کا انعام پایا
نکل آئے دیدار انسان کی خاطرہ و جہ و انجم کی خلوت کردوں سے
اور اس آدم نوکی عظمت نے اک "پیر وانا" کی عظمت کو نیچا دکھایا

(۲)

ارتقا :-

تفوق کی سطوت، غرائم کی صولت، فشارِ تدبیر کا یہ زندہ پیگیر
اٹھا بربہ عقل کی لرزشوں میں حدودِ مسلسل کا اعجاز پاکر
کبھی سبزہ زاروں پہ آنکھیں بچپائیں، کبھی لالہ زاروں کو مسکن بنایا
گزر تار ہا منزل کو بہ نوسے شعور و تخیل کو رہسبر بنا کر

کبھی مہر و مہ سے نکلا ہیں لڑائیں، نکلا ہے جس کے ابواب کھولے،
فردغِ تفکر کی غنائیوں نے ہر اک شے کو پروردہ جبہل پایا
رموزِ جہاں کی حکایات چھیڑیں، طربنا کیوں کے فسانے سنائے
میں زار، حتیٰ کو سیمیں غداروں کے رقبہ مسلسل سے رنگیں بنایا

عروجِ تفکر کے سحر ترنم نے اہلِ حرم کے قدم ڈنگائے
اسی سیرگاہِ تخیل میں پھنسکر بنایا یقیں اپنے حسنِ گماں کو
کیا اذما منکر روح ہو کر، کہ بنیاد ہے مادہ اس جہساں کی
یہ اپنی غلط رسد ہی تھی، جو تسنیم کرتے تھے ہم قدرت بے نشان کو

ہبتار ہا فکر سود و زیاں سے، مصائب کو خود کردہ اعمال سمجھیا
گر مدتوں بعد سرمہٴ رازوں میں پھر ایک حرکت سی پیدا ہوئی ہے
یہ کہتے ہوئے بندہ عقلِ باطل ہے، پھر کیا اعتراضِ مشیت
تفکر کی ناخستگی کی بدولت مری زندگی کتنی رسوا ہوئی ہے

(۳)

یہ انساں۔ یہ انساں کہ جس نے خلاؤں میں افکار کے جال پھینکے
ہزاروں قسیم کے اربابِ لیکر، نئی آرزوؤں کے ساغر اُچھالے
مصائبِ تشدد کی پتھاریوں سے ابھرتا رہا عزم کی آہنج کھا کر
جنوں آشناءِ عزم کی مشعلوں کو باندھ کر نودست تو میں سنبھالے

پہرے کر خراباتِ انکار میں جس نے دیکھی امنگوں کی حسرت نوازی
ستاروں کی دنیا، جسم کی لہریں، فضاؤں کی شوخی بہت مختصر ہے
مگر عشرتوں کی یہ محدود دنیا بھی انساں کی دسترس میں نہیں ہے
اگر ہے تو لیں آرزوؤں کی حسرت و سقوطِ قسیم بہت معتبر ہے

ازل سے یہی سعی یہیم رہی ہے کہ انساں بنے ورزشِ عیش کا ہی
مگر جانے کب آئے وہ دورِ عشرت، نہ معلوم کب وہ سکون لوٹ آئے
کہ جس سے تمنائے خفتہ ہر آئے، باندازِ نوز و مدگی مسکرائے
عبدالہادی رفعت بنگلوری

اہرن زار

العجب، یہ جہانِ تیر و تار
 یہ خراباتِ پُر خراش و خروش
 وقت، تحزیب و قوت کا مناد
 یہ بہشتوں میں سوزِ نارِ جہیم
 متلاطم یہ خون کا دریا،
 موج در موج ابلیس و جنوں
 تہ بہ تہ برق و شعلہ و صرصر
 ریگ زاروں میں برق کے قودے
 آفتابوں پہ ظلمتوں کے غلاف
 تارے ذروں کی بارگہ میں ندیم
 تیرگی، چاندنی کے ڈیروں میں
 تلخ تر زندگی کا نوشینہ،
 پر نیاں کی تہوں میں خشت و خزن
 غم کی پرچھائیاں تبسم ہیں،
 پھول کی خلوتوں میں بادِ سموم
 ہاتھ میں جہل کے خرد کی عنایاں
 نغمے مجروح، ساز و دوت زخمی
 سر کوثر سلگتے جام و سبب
 یہ بہو چاٹتے ہوئے شعلے
 اہرن زار ہے کہ آدم زار؟
 صاعقہ گاہ و دو زخِ خس پوش
 دہر، بازیچہ گاہِ شر و فساد
 ساغرِ لالہ گول میں مارِ حمیم
 یہ سلگتے ہوئے یم و صحرا
 خم شکستہ، صراحیاں پُر غول،
 زہر میں یہ بجھے ہوئے نشتر
 مرغزاروں میں آگ کے خیمے،
 سینہ عیش میں غموں کے شکاف
 صبح روشن دیا رشب میں مقیم
 ماہ و خورشید گھپ اندھیروں میں
 زنگ خور دہ نفس کا آئینہ
 تہی نقد گہر سے مشتِ صدق
 ظلمتیں خواب گاہِ انجسم میں
 آشیانوں میں عندلیب کے بوم
 برن زاروں میں قیدِ برقی تپاں
 سوزِ دل میں نہ روح میں گرمی
 موجِ نمناکِ وقت، صاعقہ خور
 گرتی بجلی، برستے انگارے

قوم کے سر پہ ٹکیتوں کے تاج

علم کی ہستی، جسم کی معراج

طاق و محراب خون سے لبریز یاد گارِ ہلاک و چنگیز ،
 زہر، تریاق کے سیوچوں میں موت ، انسانیت کے کوچوں میں
 بھیس میں آدمی کے چوپائے یہ ہلاکت کے ریٹکتے سائے
 ذہن صدیوں کی دشتوں کا مزار مردہ مردہ ضمیر کی جھکار
 فوں اُگلتے ہوئے بلند و پست نیشتر کٹتے روح میں پیوست
 آدمی شیطنت کے زینوں پر عصمتوں کا لہو جبینوں پر
 بھیڑے متکلف ماحد میں خون کی ہولیاں معاہد میں
 تیز سنگینیں نرم سینوں پر زد چٹانوں کی آگینوں پر
 زندگانی کی اب سحر کیا ہو کھا گئی سیرگی اجالوں کو

اس خرابے میں زندگانی کے

شعبہ گہ میں دہرفانی کے

آدمی کی تلاش ہے مجھ کو

فضا ابن فضی

جہوٹا اشتہار دنیا حرام ہے جس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی
 ثبوت صداقت نہیں ہے ، ماننا نہ ماننا آپ کا فیصلہ ہے
 یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ ولایت تک
 اسکے علاج موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اگر صفت
 ہے جو ان بوڑھے سب کھاتے ہیں اس دوا کے مقابلہ
 میں یکمڑوں قیمتی ادویات اور کثرتِ حیات بیکار ہیں۔ اس سے بھول کر قدرتی ہستی پر
 کہ بعض میں دودھ اور پانی بھر بھی ہم کر سکتے ہیں اس قدر مقوی دماغ پر کہ بچپن کی
 باتیں بھی خود بخود یاد آئے لگتی ہیں اس کو کوشی آبکیات کے تصور فرمائیے، اس کے
 استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک کوشی جہوٹا سیر خون آپ کے جسم
 میں اضافہ کر دے گی۔ اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے بے صلاح ممکن ہے۔ یہ
 یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل گندم کے درخشاں بنادے گی
 یہ دوا انہی نہیں ہے بلکہ بزرگوں کو اس علاج اس کے استعمال سے بامردہ بن کر
 مثل ندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ
 صبر و تحمل نہیں کر سکتے۔ الفصد اس کی صفت تحریر میں نہیں آسکتی۔ پھر بزرگے
 دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی ۴۴ روپے چار روپیہ (دفعہ ۱)
 (نوڈل) فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگائیے۔
 میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکیر کا کام کرتی ہے۔
 نقالوں سے ہوشیار رہئے۔ میری ۴۴ سالہ شہرت پر غور فرمائیے۔

پتہ :- حکیم ثابت علی بیچے زبان خوش کلام

دعالم منوی مولانا کے روم صاحب
 محمود گبر ۳۳ لکھنؤ۔ ایو۔ پی

ہندوستان اور پاکستان کی تمام کتابوں کے لئے

یونیورسٹی لائبریری - محمد علی رورڈ

ہندی نمبر (۳۴)

نازش پر تا بگڑھی :

میں نے تو ڈلکا دئے ہیں جان کر قدم
چاما تھا طول دینا شب انتظار کو
دے رہے ہیں صدائیں وہ مجھ کو
چن نہ پایا الم کے خار تمام
بہتر ہے کہ تم بھی مجھے اُس وقت نہ چھڑو
جب دل کو صدا دیتے ہوں گزبے ہوئے لمحات
کھوئی کھوئی سی خیالوں میں مسرت کی کرن
جائے یہ کیوں ہے کہ اُس نے تو پکارا بھی نہیں
اب اور کتنا ترک تعلق کروں کہ میں
خود سے بھی پیش آتا ہوں بیگانگی کے ساتھ
اکثر ہوا ہے یہ کشمکش کے پاس سے
ترک الفت پر ہوں میں یوں مطمئن
جیسے سب کچھ کھو کے بھی کچھ پا گیا

صفیہ شمیم ملیح آبادی :

یہ کس کے فریب کھا رہے ہیں
رہ رہ کے اُٹھ رہے ہیں آنسو
بیچین ہیں بجلیاں فلک پر
ہو خیر چراغ بزم حسرت
سادن کے شمیم مست بادل
ارمانوں سے دل بھار رہے ہیں
یہ دل سے کسے سبلا رہے ہیں
گشتن ہیں کہ مسکرا رہے ہیں
کیوں شام سے جھلکا رہے ہیں
کیا جانئے کیوں رُلا رہے ہیں

سید شاہ ولی الرحمان ام۔ لے :

آج اُٹھتی نہیں میرے دلِ ناکام سے آگ
ہے فروزاں یہ سطرچراغِ لالہ !
یہ قری برق ٹکا ہی کا افسر ہے کہ ہنوز
تیرے جاتے ہی بجھی آتشِ رونق گھر کی
سرد ہیں قلب و جگر خاک و آبی اب نکلے
آگے ہر سادے فروغِ رخِ کافام سے آگ
یا ہے روشن ترے جلوے کی لبِ بام سے آگ
گوشہ دل میں بھڑکتی ہے تیرے نام سے آگ
تیرے آتے ہی لگی اُٹھنے درو بام سے آگ
نعرۂ کفر سے یا نعرۂ اسلام سے آگ

مطبوعات موصولہ

تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت انجمن ترقی اردو پاکستان کی پہلی قابل ذکر تالیف ہے جو انجمن کے بعد وہاں سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور ۲۱ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں محمد بن قاسم فتح سندھ کے زمانہ سے لیکر عہد اورنگ زیب تک کی تاریخ تمام ان خصوصیات کے ساتھ پیش کی گئی ہے جو ایک اچھی اور مستند تاریخ کی کتاب میں پائی جاتا چاہئے۔

مقدمہ میں ہندوستان کی تاریخ قبل اسلام سے بحث کی گئی ہے جو ایک جامع تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے اور دوسرے باب میں مسلمانوں کی فتوحات سندھ اور وہاں عربی حکومت کے قیام اور ان کے عادات و نظم و نسق کو بڑے سلیقہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، تیسرا باب سلاطین غزنویہ کے لئے وقف ہے، چوتھے باب میں سلطان معز الدین غوری سے لیکر شمس الدین التمش تک کی تاریخ درج ہے، چھٹے اور ساتویں باب میں اس عہد کے نظام حکومت اور ترقی علم و تمدن سے بحث کی گئی ہے، اس کے بعد آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارھویں باب میں عبدغنی و تغلق اور اس کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ بارھویں باب میں ان مختلف آزاد حکومتوں کا ذکر ہے جو صوبہ داروں نے مختلف اقطاع ہند میں قائم کر لی تھیں اور تیرھویں باب سے لیکر بیسویں باب تک سلطنت مغلیہ کی تاریخ ہے جو آبر سے شروع ہو کر اورنگ زیب پر ختم ہوتی ہے، اکیسویں باب میں گیارھویں صدی عجمی کی مذہبی تحریکات اور دوسری عمرانی ترقیوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

مولوی ذکاء اللہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اردو میں ہندوستان کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھی، اور اس کے بعد پھر کوئی اہم کتاب اس موضوع پر شائع نہیں ہوئی۔ ضرورت تھی کہ تاریخ نویسی کے جدید اصول پر کوئی کتاب پیش کی جاتی اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اردو پاکستان نے اس ضرورت کو پورا کیا۔

اس کے مولف مولوی سید ہاشمی فرید آبادی بڑے مشاق لکھنے والے ہیں اور چونکہ تاریخ سے انھیں بہت دلچسپی ہے اس لئے ان کی اس تالیف کو کامیاب ہونے کا محال تھا۔ طباعت و کتابت نہایت دیدہ و زیب ہے اور کاغذ بھی بہت دیر استعمال کیا گیا ہے۔ جلد بھی مضبوط و خوبصورت ہے۔ ضخامت ۴۹۷ صفحات قیمت مچھر۔ نئے کاغذ۔ آخر انجمن ترقی اردو پاکستان ہسپتال وڈا ٹھنڈا گوشت مجموعہ ہے سعادت حسن منٹو کے آٹھ افسانوں کا۔ اور چونکہ پہلے افسانہ کا عنوان ٹھنڈا گوشت ہے۔ اسی کا مجموعہ کا نام یہی قرار دیا گیا۔ یہ افسانہ وہی ہے جو منٹو کی تصنیف کے ساتھ ان کے ادبی شہرت کا بھی بڑا

اس افسانہ کی اشاعت پر مقدمہ چلا یا گیا، سزا ملی اور اپیل سے بری ہوئے۔ الزام یہ تھا کہ افسانہ فحش و عریاں ہے۔ ابتدا میں خود مٹھو نے اس مقدمہ کی تفصیل بیان کی ہے، جبکہ بہت پر لطف ہے اور بجائے خود ایک ادبی شاہکار ہے۔ مٹھو، ہندوستان کے ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہے، جنہوں نے قدیم اسلوب کو بدل کر جدید نمونہ کو رواج دیا اور نگینوں کے ساتھ نہایا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے بعض افسانوں کو مذہب و اخلاقی معیار کے لحاظ سے ناقابل برداشت قرار دیا جائے، لیکن جس حد تک آرٹ کا تعلق ہے ادب میں ان کو خاص جگہ حاصل ہے اور ناک بھول چڑھانے سے ان کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی۔

کتاب بہت اہتمام کے ساتھ نہایت نفیس کاغذ اور بہت پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع کی گئی ہے۔ اور اس باب میں مکتبہ جدید لاہور کے ذوق کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ قیمت تین روپیہ۔

نگار خانہ ترجمہ ہے سنسکرت کی قدیم نظم شتی تم کا جسے میراجی نے غالباً انگریزی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ جنسیات کے سلسلہ کی کتاب ہے جس میں ایک تجربہ کار ناک نے نوجوان طوائف کو اپنے فن کے اسرار و رموز سمجھائے ہیں۔ ابتدا میں مٹھو کا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ اس کتاب کی خصوصیات پر گفتگو کی ہے۔

میراجی کے متعلق مشہور تھا کہ وہ جنسی بھوک کے مرض میں اس لئے قدرتِ انھیں اس کتاب کے ترجمہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ ترجمہ انھوں نے اس خوبی سے کیا ہے کہ یہ خود ان کی تصنیف ہو کر رہ گئی ہے۔

اس کتاب کی دیگر سبھی خصوصیات یہ ہے کہ وہ نہایت نفیس کاغذ پر ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

شک کا پتہ: مکتبہ جدید لاہور۔

بیکار دن، بیکار راتیں مجموعہ ہے عزیز احمد کے سات افسانوں کا، ان میں سے بعض کا پس منظر جنگ ہے اور بعض کا تقسیم ہند کے بعد کا فساد اور جس حد تک افسانوں کی تکنیک کا تعلق ہے، ان کو کامیاب

افسانے کہنے میں کسی کوتاہی نہیں ہو سکتا۔ عزیز احمد صاحب جزئیات کی تفصیل اور واقعات کا تجزیہ بڑی خوبی سے کرتے ہیں اور کہیں کہیں مزاح کی چاشنی سے انرا نہ بیان کو بہت پر لطف بنا دیتے ہیں۔

ان افسانوں کا پلاٹ بھی بہت دلچسپ ہے اور کردار نگاری بھی بڑی حد تک مکمل ہے۔ نتیجہ کے لحاظ سے بھی یہ افسانے بے معنی نہیں ہیں اور ان کے پڑھنے کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اقدار حیات سے اگر جذبہ انسانیت کو علیحدہ کر دیا جائے تو اس کا رگاہ عالم میں انسان کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔

کتابت و طباعت وغیرہ بھی بہت پسندیدہ ہے قیمت ہے اور شے کا پتہ: مکتبہ جدید لاہور۔

۴۹ء کا بہترین ادب اس مجموعہ کو چودھری برکت علی اور میرزا ادیب نے مرتب کیا ہے اور مکتبہ اُردو لاہور نے خاص اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ اس میں نو ادبی مقالے،

۱۰ افسانے و ڈرامے، ۲۵ نظمیں، ۲۵ غزلیں، ۱ گیت اور دو طنزیہ مقالے شایع کئے گئے ہیں جو سب کے سب مشہور و

مستند ادیبوں اور شاعروں کی فکر کا نتیجہ ہے۔

یہ تمام چیزیں پہلے اتنے مختلف رسائل میں شائع ہو چکی ہیں کہ ان کا مطالعہ بہک وقت بہت دشوار ہوتا، اگر انکو اس طرح یکجا نہ کر دیا جاتا۔ اس لئے مکتبہ اُردو کی یہ کوشش یقیناً قابل قدر ہے۔ اس میں تمام مقالے انھیں حضرات کے ہیں جو کسی نہ کسی نہج سے ترقی پسند جماعت کے افراد شمار کئے جاتے ہیں، لیکن شاید اس کے معنی یہ نہ ہوں گے کہ اس جماعت کے لٹریچر سے ہٹ کر کوئی اور چیز قابل ذکر لکھی ہی نہیں گئی۔ بہتر ہوتا اگر خالص لٹریچر سے ہٹ کر دوسرے موضوع کے مقالات کا بھی انتخاب اس میں شامل ہوتا، کیونکہ ادبیات میں شعر و شاعری یا افسانہ و ڈرامہ کے علاوہ تاریخ و تذکرہ بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب بہت اہتمام سے مجلد شائع کی گئی ہے اور ۵۰۰ صفحات کو محیط ہے۔ قیمت چھ روپیہ ہے اور بٹنے کا پتہ:-

مکتبہ اُردو لاہور۔

ترجمہ ہے کرنل میڈوز ٹیلر کی مشہور کتاب کا جس میں امیر علی ٹھگ کی داستان خود اس کی زبان سے بیان کی گئی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کا وہ حصہ جو ٹھگی کی تحریک سے متعلق ہے، بڑا دردناک حصہ ہے، لیکن اس کی تفصیل کسی کو نہ معلوم ہوتی اگر کرنل میڈوز ٹیلر کو خود امیر علی سے ملنے کا موقع نہ ملتا۔

امیر علی جب گرفتار ہونے کے بعد حیدرآباد کے قید خانہ میں بھیجا گیا تو مصنف نے مل کر اس کے تمام واقعات زندگی معلوم کئے اور ایسے دلچسپ اسلوب سے ان کو پیش کیا کہ جب تک ملکہ وکٹوریہ اس کتاب کے پروف کو (جبکہ وہ زیر طبع تھی) روزانہ صبح کو نہ پڑھ لیتیں انھیں چین نہ آتا۔

اسی دلچسپ کتاب کا ترجمہ حسن عابد جعفری نے کیا ہے اور اتنی خوبی سے کیا ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتی۔ کتاب کی صفحہ ۲۶۰ صفحات کی ہے اور خاص اہتمام سے مجلد شائع کی گئی ہے۔ بٹنے کا پتہ:- کراچی کتب خانہ۔ اولڈ لکسنی ہاؤس۔ سائڈ ٹھہریر وڈ لکراچی۔

مسٹر ڈیل کارنگی جدید علمی نفسیات کے بڑے ماہر ہیں علمی نفسیات سے مراد وہ اصول ہیں جن پر عمل کر کے انسان بہت سے جسمانی و ذہنی امراض سے نجات پاسکتا ہے۔ مسٹر کارنگی عرصہ سے اس کے تجربات کر رہے ہیں اور

سالہا سال کی تحقیق و جستجو کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام امراض کا حقیقی سبب (خواہ وہ جسم سے متعلق ہوں یا ذہن و دماغ سے) فکر و پریشانی ہے۔ یعنی اصول ہو میو پیجی کے مطابق وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ بیماری پہلے نفس میں پیدا ہوتی ہے۔ پھر کارنگی نے صرف اسی دریافت پر قناعت نہیں کی بلکہ دماغی افکار اور ذہنی الجھنوں کے عملی طریقے بھی معلوم کئے اور کمال سات سال تک کھلا مسلسل تجربہ کرنے کے بعد انھوں نے ایک کتاب تصنیف کی جس میں ہر قسم کی فکر و پریشانی کو دور کرنے کی تدابیر بتائی ہیں، جن پر عمل کر کے اس وقت تک لاکھوں انسان فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ اس کتاب میں سیکڑوں طریقے غم و الم دور کرنے کے بتائے گئے ہیں اور:-

سب کے سب تجربات پر مبنی ہیں۔

یہ کتاب کارنگی کی اس تصنیف کا ترجمہ ہے جسے حسن عابد جعفری نے نہایت سلیس زبان میں پیش کیا ہے اور اس وقت جبکہ

انسان فکر و پریشانی میں مبتلا ہے اس کا مطالعہ از میں ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جعفری صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ کہے نوع انسانی کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور ضرورت ہے کہ اس کتاب کو مدارس کے نصاب میں شامل کر کے ابتدا ہی سے بچوں کو عملی نفسیات کے ان مصدقہ تجربات کی طرف متوجہ کیا جائے۔ کتاب چونکہ بالکل واقعات پر مبنی ہے اس لئے دلچسپ بھی ہے اور ایک انسان ناول کا سا لطف اس سے اٹھا سکتا ہے۔ ضخامت ۵۶۸ صفحات۔ طباعت، کتابت و کاغذ وغیرہ سب پسندیدہ ہے۔ قیمت پانچ روپیہ بارہ آنہ۔ - ملے کا پتہ :- کراچی کتب خانہ اولڈ کرنسی ہاؤس۔ سوئٹھ نمبر روڈ۔ کراچی۔

مجموعہ ہے جناب عرش مسیانی کی غزلوں اور نظموں کا جس کا نام انھوں نے ہفت رنگ اس لئے رکھا ہے

ہفت رنگ

کہ موضوع کے لحاظ سے اس میں واقعی کافی تلون پایا جاتا ہے۔

پہلے رنگ میں جس کا عنوان انھوں نے ”خونِ آدم“ رکھا ہے ۱۵ نظمیں شامل ہیں اور ان سب کا تعلق مظلوم انسانیت سے رکھنے والے واقعات و حالات سے ہے۔ دوسرا رنگ عشق و محبت سے تعلق رکھتا ہے، تیسرے رنگ میں دار وائی نظمیں ہیں، چوتھا تاثرات سوز و گداز سے تعلق رکھتا ہے، پانچویں کا عنوان متفرقات ہے، چھٹے کا خراباٹھ اور ساتواں رنگ گیت کا ہے۔ عرش صاحب کو شاعری کا ذوق درد میں ملا ہے اور ایک مستحق کی حیثیت سے ملا ہے۔ وہ ان شعراء میں سے نہیں ہیں جو علم سے بے نیاز رہ کر شاعری کرتے ہیں، بلکہ ان کا شمار اُن پڑھے لکھے وسیع المطالعہ شعراء میں سے ہے جو لغت، عروض اور معانی وغیرہ کے نکات سے بھی واقف ہیں۔ وہ ان شعراء میں سے نہیں جو قن کو جذبات پر قربان کر دیتے ہیں یا اپنے جہل کو ”ترقی پسندی“ کے پردہ میں چھپانا چاہتے ہیں، انھوں نے جہاں جہاں فارسی ترکیبیں استعمال کی ہیں، اُن سے ان کی پوری ”کار آگاہی“ ظاہر ہوتی ہے اور اسی لئے ان کے کلام میں وزن ہے اور استادانہ معقولیت!

جناب عرش کی ہمدرد طبیعت کا اندازہ گیتوں کی زبان سے ہوتا ہے جب جناب سے اس قدر درد کی چیز ہونے کے باوجود جناب عرش کے گہوارہ کی چیز نظر آتی ہے۔ کتاب کی کتابت و طباعت بھی بہت پسندیدہ ہے۔ قیمت تین روپیہ۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ - ملے کا پتہ :- رہنمائے تعلیم بک ڈپو مفتی والان۔ دہلی۔

مجموعہ ہے جناب آغا حیدر مرزا کے چند افسانوی و ادبی مقالات کا جن میں سے بعض ٹیکو کے رنگ کے ہیں۔ مصنف نے

سہیل

ظاہر کیا ہے کہ اس مجموعہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ان کے واردات حیات اور ذاتی تاثرات کا نتیجہ ہیں اور کتاب کے مطالعہ سے ان کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

بعض مضامین اس میں ٹیکو کے انداز کے ہیں اور باوجود اس کے کہ یہ رنگ اب متروک ہو چکا ہے، اس میں کافی جوش و ولولہ پایا جاتا ہے، گو قدرت نہ ہو۔

طباعت و کتابت میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور کتاب کو مجلد شایع کیا گیا ہے۔ حجم ۳۴۱ صفحات۔ قیمت ۴۰/-

ملے کا پتہ :- کتب خانہ تاج آفس۔ کراچی۔

رعنائیاں مجموعہ ہے جناب برج لال رعنا کی رباعیوں، غزلیں اور نظموں کا۔ رعنا بھی انھیں ادیبوں اور شاعروں میں سے ہیں، جن کو تقسیم ہند کے بعد پاکستان سے ہندوستان آنا پڑا اور جو باوجود غریب وطن ہونے کے اپنے فطری ذوق کو بھی پرکار کرتے رہتے ہیں۔

رعنا صاحب راولپنڈی کے رہنے والے ہیں اور چونکہ خود انھوں نے اپنے حالات نہیں لکھے ہیں، اس لئے ہمیں نہیں معلوم کہ اردو شاعری کا ذوق کب اور کیونکر ان میں پیدا ہوا اور وہ ماحول کیا تھا جس نے انھیں اتنا اچھا شاعر بنا دیا۔ اس مجموعہ کا بڑا حصہ رباعیوں پر مشتمل ہے جن سے جناب رعنا کی خوش فکری اور کھنگلی عیاں ہے۔ رباعیوں کے بعد غزلیں اور نظمیں درج ہیں، غزلیں کم اور نظمیں زیادہ لیکن ہر چیز اپنی جگہ خوب ہے اور بڑے پاکیزہ ذوق کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ مجموعہ مجلد مجلد شائع ہوا ہے اور مکتبہ شان ہند دہلی سے ڈپڑدہ روپیہ میں مل سکتا ہے۔

سفینہ وسائل مجموعہ ہے عزیز وارثی کی غزلیں کا جسے مکتبہ شان ہند دہلی خاص اہتمام سے مجلد شائع کیا ہے جناب عزیز، حضرت نوح ماروسی کے شاگرد اور اوکھٹ شاہ صاحب وارثی کے مرید ہیں۔ وارثی سلسلہ کے شعرا میں تصوف کی چاشنی بیدم شاہ مرحوم کے کلام میں زیادہ پائی جاتی تھی، لیکن وہ ریاض و خلیل کے دور کے شاعر تھے اور اس لئے ان کے کلام میں تصوف کا وہ رنگ نہیں تھا جو اصغر گوندوی کے یہاں پایا جاتا ہے۔ عزیز وارثی، گو شاگرد حضرت نوح کے ہیں، لیکن ان کا رنگ اپنے استاد سے بالکل علحدہ ہے اور اصغر کا رنگ اس میں زیادہ جھلکتا ہے اور ایسا ہونا چاہئے تھا، کیونکہ عزیز وارثی کی شاعری کی ابتداء اس ماحول میں ہوئی ہے۔ جب سوچتے، سمجھتے اور کہنے کے بہت سے نئے نئے اسلوب پیدا ہو گئے ہیں۔ عزیز کے کلام کی خصوصیت اس کی کیفیت ہے جو غالباً تعریف ہے ان کے پیر و مرشد کا۔ عزیز کا کلام سفاک ہے بالکل پاک ہے اور مشاعروں کی محفل سے ہٹ کر بھی ان کے کلام کو پڑھ کر لطف حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مکتبہ شان ہند شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے یہ مجموعہ شائع کر کے ایک اچھے شاعر کو ملک سے روشناس کرایا۔ قیمت ۲۰ روپے

میں سو گیارہ ایک طنزیہ تبصرہ ہے دنیا کے موجودہ سیاسیات پر جس میں مستقبل کا ایک زمانہ غلط طور پر متعین کیا گیا ہے اور جمہوریت کو کٹا پٹا دبا سے متعلق ہے جہاں کے صدر پوپو پالٹھار نے اپنے تجرباتی قلبند کے ہیں۔ یہ ترجمہ محمد خالد اختر کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کا پہلا باب جو صنف کا پیش لفظ ہے، خاص اہمیت رکھتا ہے۔

جم ۲۲ صفحات قیمت ۱۰ روپے مکتبہ جدید لاہور۔

پوچھائیاں انجمن ترقی اردو (ہند) کی غالباً یہ پہلی کتاب ہے جو پوری کی پوری نہایت خوشنما ٹیپ میں طبع ہوئی ہے۔ یہ کتاب تصنیف ہے آصف علی صاحب کی جو دہلی کے بیرسٹر، کانگریسی خیال کے مشہور لیڈر تھے اور فی الحال آسام کے گورنر ہیں۔ آصف علی صاحب کے جاننے والے واقف ہیں کہ وہ ایک نہایت اچھے ادیب بھی ہیں اور یہ تصنیف ان کی کیسے سادہ دلی سے تعلق رکھتی ہے، جو قلعہ احمد نگر میں محبوس رہنے کے دوران میں انھوں نے لکھی تھی۔

یہ کتاب بقبول ناشر زندگی کے ایک دلچسپ پہلو کا فلسفیانہ مطالعہ ہے، ہو سکتا ہے کہ ناشر کا یہ بیان صحیح ہو، لیکن چونکہ یہ کتاب بالکل ٹیکور کے گیتا بجلی کے لب دہجہ میں لکھی گئی ہے، اور کوشش کی گئی ہے اس مصنوعیت کے پیدا کرنے کی جو ٹیٹے کی کتاب *Meta-metaphysics* میں پائی جاتی ہے، اس لئے افسوس ہے کہ ہم اس کی ادبیت و فلسفیت کے امتزاج کو بالکل نہیں سمجھ سکے اور یہ کتاب ہمارے لئے بالکل ایک عمدہ کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

بنیکوں کا جائزہ آر میک ٹائروٹسن مالیات کا بڑا ماہر ہے، اس نے ایک کتاب لکھی ہے جو مالیات کے اصول اور بنیکوں کے طریق کار پر حرف آخر شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ حسن عابد جعفری بیرسٹر اور سید نظیر حیدر بی اے ال ال بی نے اردو میں کیا ہے۔ اس میں شک نہیں مالیات اور بکاری کے مسائل نہایت پیچیدہ ہیں اور ان کا سمجھنا آسان نہیں، لیکن اس وقت یہ ایسے مسائل ہیں جن کا سمجھنا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ٹکسن نے یہ کتاب لکھی تھی جس میں نہایت آسان پیرایہ میں ان تمام مسائل کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ معمولی سامعین انسان بھی اسے سمجھ سکے۔

یقیناً اس کتاب کا ترجمہ بہت دشوار تھا لیکن خوشی کی بات ہے کہ فاضل مترجمین اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے یہ کتاب کراچی کتب خانہ کراچی سے دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔

کیمرس مجموعہ ہے جناب نازش پرتا بگٹی کی غزلوں کا۔ نازش صاحب کا شمار ادیب شعراء میں ہے جنہوں نے اپنے لئے ملک میں ایک جگہ پیدا کر لی ہے اور ہر بنائے استحقاق پیدا کی ہے۔ ان کا کلام اکثر مشہور رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے اور ملک ان سے ناواقف نہیں ہے۔

خود انھوں نے اپنی غزل گوئی کے متعلق جو اظہار خیال کیا ہے وہ یقیناً صداقت سے خالی نہیں یعنی یہ کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں خود انھیں کے ذاتی تاثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں اور یہ بات ان کے کلام سے بخوبی واضح ہے۔

ان کے تغزل کا معیار کافی بلند ہے اور ان کی غزلوں میں ہم کو بہت سے اشعار ایسے مل جاتے ہیں جن کو ایک صاحب ذوق کبھی نہیں بھلا سکتا۔ مثلاً :-

رگ رگ سے دل کی قوتِ گفتار ملی گئی جب جا کے داستاںِ محبت کہی گئی

اب تک مری رہاں پہ بے لیک کی صدا کیا جانے کس طرح مجھے آواز دی گئی

قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ :- ایس۔ یو۔ واپچ کپنی - کچہری روڈ پرتاب گڑھ (ادودھ)

ہومیو پیتھک دنیا ماہوار رسالہ ہے جو ایک سال سے ڈاکٹر امر پرت کاش اور راکی ادارت میں لکھنؤ سے نکل رہا ہے۔ ہومیو پیتھک علاج بالمثل کا دوسرا نام ہے جس کا موجد جرمنی کا مشہور شاہی ڈاکٹر ہیمن تھا۔ اب اس طریق علاج نے اتنی مقبولیت حاصل کر لی ہے کہ شرق و غرب کا شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جو اس سے واقف نہ ہو۔

اس طریق علاج نے اپنی آسانی، ارزانی اور علمی اصول کے لحاظ سے دنیا میں ایک خاص جگہ پیدا کر لی ہے اور اس کی تعلیم کے بڑے بڑے ادارے شرق و غرب میں قائم ہو چکے ہیں۔

ضرورت تھی کہ اس طریق علاج کو کامیاب بنانے کے لئے ہندوستان سے بھی کوئی مفید رسالہ اردو زبان میں رائج کیا جائے، چنانچہ اس ضرورت کو ڈاکٹر آروا نے پورا کیا اور بوجہ احسن پورا کیا۔

اس رسالہ کا خاص حصہ وہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف خود اپنے تجربات پیش کرتے رہتے ہیں اور ان سے علاج میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ دوسرے مضامین بھی بہت مستند ذرائع سے فراہم کئے جاتے ہیں اور علامات کے لحاظ سے مختلف امراض کے طریق علاج بھی نہایت وضاحت کے ساتھ بتائے جاتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ اس رسالہ کو زندہ رکھا جائے اور لوگ اس کی خریداری کی طرف توجہ کریں۔ سالانہ چندہ چار روپیہ ہے پتہ: ۱۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۶۔ گھنٹو۔

ہو بیٹھی کے ساتھ ساتھ ایک اور طریق علاج ڈاکٹر شمس الدین ایجاوکیا جیسے بارہ نکلیات کا علاج کہتے ہیں اور تجربے سے یہ بھی از بس مفید ثابت ہوا ہے۔ اس میں سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ تمام امراض کا علاج صرف بارہ دواؤں سے ہوتا ہے۔ اس طریق علاج پر بھی بڑی بڑی کتابیں اس وقت تک لکھی جا چکی ہیں۔ ڈاکٹر آروا نے اس کے اصول بیان کئے ہیں اور تمام امراض کا علاج ان دواؤں کے ذریعہ سے نہایت آسان زبان میں بتایا ہے۔ بڑی مفید کتاب ہے اور دو روپیہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف سے پوسٹ بکس نمبر ۳۶ گھنٹو سے مل سکتی ہے۔ مجموعہ ہے ۶۶ روایات کا جنہیں عثمان حیدر مرزا ایم۔ اے نے عربی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ مترجم نے یہ مختصر مجموعہ جو منتخب و مستند روایتوں پر مشتمل ہے، بزرگان سلف کی پاکیزہ زندگی کا ایک دلکش مرقع ہے اور یہ روایات زیادہ تر دوسری قیسری صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہیں۔

اے سکتا ہے کہ ان روایات سے بزرگان سلف کے اخلاق پر روشنی پڑتی ہو، لیکن ان کو مستند کہنا بالکل غلط ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر اساطیری رنگ کی ہیں اور حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ یہ تمام روایات تقریباً دیہی ہیں جو تمام کلم و مظل کی زبان سے سنی جاتی ہیں اور قطعاً اس قابل نہیں کہ پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے پیش کی جائیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عثمان حیدر مرزا صاحب نے ان کا ترجمہ کر کے اسلام کی کوئی خدمت انجام نہیں دی، بلکہ سچ پوچھتے تو اسے اور رسوا کیا ہے۔ جن ماخذوں کا حوالہ دیا گیا ہے، ان میں سے اکثر ناقابل اعتبار ہیں اور ان کی حیثیت بازاری گپ سے زیادہ نہیں۔ کاش وہ وقت جو ان لغو و مہمل روایات کے ترجمہ کرنے میں ضائع کیا گیا ہے، کسی بہتر کام میں صرف کیا جاتا اور اگر روایات اسلامی ہی کو لینا تھا تو انھیں مستند روایات بھی مل سکتی تھیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

لئے کا پتہ دسج نہیں ہے۔

مندرجہ ذیل کتابیں نگار ایک بخشنی مل سکتی ہیں

مستقبل اسلام

پروفیسر دامبری کی معرکہ آراء تصنیف ”مغربی تمدن اور
شکست امپد“ اور ”اس“ کے زیر عنوان محبت کی پرقاریوں
مشرق پر و فیصد امبری کی دلچسپ سوانح عمری بھی درج
ہے۔ صفحات ۲۰۰ سے زائد۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

عورتوں کی انشاؤ

شوق قدوائی کی ایک شاگرد خاتون کے قلم سے۔ جو لڑکیاں
اور مستورات فن خطوط نویسی سے ناواقف ہیں، اس کا مطالعہ
انھیں خطوط نویسی کی تکنیک سے واقف کار بنادے گا قیمت ۵/-

گھر بیٹھے شاعر اور نثر نویس !

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کی درج ذیل کتب آپ کو بلا استاد
فن شاعری اور نثر نگاری میں کامل دستگاہ پہنچائیں گی۔

شاعری کا سٹیم - اصلاح زبان اردو ۶/- اصول اردو ۶/-

مضمون نویسی ۸/- زبان دانی ۶/-

سوانح عمریاں

حیات طیبہ - - - - - غازی الدین علوی - قیمت ۵/-

سیرۃ النعمان - - - - - شبلی - - - - - ۵/-

سیرۃ احمدی - - - - - احمد حسین خاں - - - - - ۵/-

سیرۃ رسول اللہ - - - - - نواب علی - - - - - ۵/-

سیرۃ آل عباس - - - - - عزیز احمد عباسی - - - - - ۵/-

عالم خیال

شوق قدوائی کی مشہور ٹھنوی جس میں عورت کی زبان سے فراق
کے زیر عنوان محبت کی پرقاریوں
مشرق پر و فیصد امبری کی دلچسپ سوانح عمری بھی درج
ہے۔ صفحات ۲۰۰ سے زائد۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

قاسم وزہرا

شوق قدوائی کا مشہور دلکش منظوم ڈرامہ - قیمت بارہ آنے۔

تذکرہ کا طران رام پور

شوق کے مستند اور سحر کار قلم سے ریاست رام پور کی مردم خیز زمین
کے تابندہ ستاروں کے حالات و قیمت پانچ روپیہ -

باغ فردوس (فسانہ عجائب منظوم)

میر انیس کے شاگرد فردوس کے قلم سے - لکھنوی زبان کی پوری
رنگینی و لطافت کے ساتھ - قیمت ایک روپیہ چار آنے -

حقایق اسلام

مصنف مفتی انوار الحق ایم، اے - اسلام کے عقاید و روایات

احمال و عبادت، آداب و معاملات اور رسوم کا بیان نہایت

دلنشین طریقہ سے - قیمت تین روپیہ -

نغمہ حرم

مولفہ محمد احسن وحشی نگرانی - میلاد نبوی کے مستند

حالات پیغمبر اعظم کی صفات قدسیہ کی روشنی میں -

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

تاریخ

تاریخ امریکہ	۱۰	یحییٰ تنخا	قیمت
اندور	۱۰	امیر احمد علوی	۱۰
گجرات اسلامی	۱۰	غلام محمد	۱۰
ہند (انگریزی)	۱۰	"	۱۰

دواوین و ثنویات

باقیات ثانی بدایونی	۱۰	"	۱۰
مجموعہ نظم با نظیر	۱۰	ڈبٹی نذیر احمد	۱۰
مشعل	۱۰	فراق گورکھپوری	۱۰
ظہور رحمت	۱۰	شاد عظیم آبادی	۱۰
شنوی راہ حق	۱۰	"	۱۰
مطلع الانوار	۱۰	برقی دہلوی	۱۰
تذکرہ کامل	۱۰	زین العابدین	۱۰

سفر نامے

صراط الحمید	۱۰	الیاس برنی	۱۰
سفر سعادت	۱۰	امیر احمد علوی	۱۰
سفر نامہ حرمین شریفین	۱۰	مولانا محی الدین	۱۰
" شاہ ایران	۱۰	استاد نواب رامپور	۱۰

ناول

اسرار رنگون	۱۰	برمی سیاح	۱۰
اصرار خانم کی سازش	۱۰	رازدار	۱۰
درد	۱۰	احمد حسین خاں	۱۰
سرخ حرم	۱۰	"	۱۰
نظیر بیگم	۱۰	"	۱۰
واہ	۱۰	"	۱۰

افسانے

ہندوستان ہمارا	۱۰	بلونت سنگھ	۱۰
پلوں میں آنسو	۱۰	صدیقہ بیگم	۱۰
شہر خوشاں موپاساں	۱۰	مترجمہ نصیر حیدر	۱۰
ڈرامے	۱۰	"	۱۰

مقدمات

ذکر طیب محمد عربی	۱۰	مشر حسین قدوائی میلاد پاک	۱۰
ہندو شعراء	۱۰	عبدالرؤف عشرت لکھنوی	۱۰
آپ بقا	۱۰	"	۱۰
لغات مصداق اردو	۱۰	"	۱۰
اساس التعليم	۱۰	مولوی عبدالحق	۱۰
مکاتیب	۱۰	محسن الملک	۱۰
امداد باہمی	۱۰	نفسی اظہر علی علوی	۱۰
معاشیات	۱۰	"	۱۰

<p>گنہ گار نیلہ تین صول میں</p> <p>حضرت نیاز کا وہ عید انظر</p> <p>انسانہ جو لہ دو زبان میں بالکل</p> <p>پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے</p> <p>ان کی ایسی شہرت کی ہے کہ</p> <p>دل بیتاب ہو جاتا ہے اورو</p> <p>میں ہی سب پہلی کتابیں</p> <p>موضوع پر لکھی گئی ہیں ہندی</p> <p>کلام کے بے مثل نمونے نظر</p> <p>آتے ہیں۔</p> <p>قیمت بارہ آنے</p> <p>علاوہ محصول</p>	<p>شہاب کی سرگزشت</p> <p>حضرت نیاز کا وہ عید انظر</p> <p>انسانہ جو لہ دو زبان میں بالکل</p> <p>پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے</p> <p>ان کی ایسی شہرت کی ہے کہ</p> <p>دل بیتاب ہو جاتا ہے اورو</p> <p>میں ہی سب پہلی کتابیں</p> <p>موضوع پر لکھی گئی ہیں ہندی</p> <p>کلام کے بے مثل نمونے نظر</p> <p>آتے ہیں۔</p> <p>قیمت بارہ آنے</p> <p>علاوہ محصول</p>	<p>جذبات بھاشا</p> <p>جانب نیاز نے ایک دلچسپ</p> <p>تمہید کے ساتھ بہترین ہندی</p> <p>شاعری کے نمونے پیش کر کے</p> <p>ان کی ایسی شہرت کی ہے کہ</p> <p>دل بیتاب ہو جاتا ہے اورو</p> <p>میں ہی سب پہلی کتابیں</p> <p>موضوع پر لکھی گئی ہیں ہندی</p> <p>کلام کے بے مثل نمونے نظر</p> <p>آتے ہیں۔</p> <p>قیمت بارہ آنے</p> <p>علاوہ محصول</p>	<p>فلاسفہ قدیم</p> <p>اس مجموعہ میں حضرت نیاز</p> <p>کے دو علمی مضامین شامل</p> <p>ہیں۔</p> <p>۱۔ چند گھنٹے فلاسفہ قدیم</p> <p>۲۔ اویسن کا مذہب</p> <p>نہایت مفید دلچسپ</p> <p>کتاب ہے۔</p> <p>قیمت۔</p> <p>ایک روپیہ</p> <p>علاوہ محصول</p>	<p>شاعر کا انجام</p> <p>جانب نیاز کے عنوان بھاشا</p> <p>لکھا ہوا انسانہ حسن و عشق کی</p> <p>ایک نثر بخش کیفیت اس کے</p> <p>ایک ایک جگہ میں موجود ہیں</p> <p>پہ خانہ اپنے پلاٹ اور انشا</p> <p>کے لحاظ سے اس قدر ملنے جڑے</p> <p>کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں</p> <p>مل سکتی نیازہ اویسن نہایت</p> <p>صحیح و خوش خط سرورق رنگین۔</p> <p>قیمت بارہ آنے</p> <p>علاوہ محصول</p>
<p>فرست الید</p> <p>نیاز فحجوری کے تین افسانوں</p> <p>کا مجموعہ میں بنایا گیا ہے</p> <p>کہ ہائے ملک کے ادیبانِ امت</p> <p>یا وطن کرام کی اندرونی زندگی</p> <p>کیلے اور ان کا وجود ہمارے</p> <p>معاشرت و اجتماعی حیات</p> <p>کیسے اس درجہ قائل ہو نہاں</p> <p>چھٹا انشا کے لحاظ سے جو</p> <p>مردان انسانوں کا ہے وہ</p> <p>میں دیکھنے سے ملنے رکھتا ہے</p> <p>تیسرا انشا</p> <p>علاوہ محصول</p>	<p>نقاب ٹھکانے کے بعد</p> <p>نیاز فحجوری کے تین افسانوں</p> <p>کا مجموعہ میں بنایا گیا ہے</p> <p>کہ ہائے ملک کے ادیبانِ امت</p> <p>یا وطن کرام کی اندرونی زندگی</p> <p>کیلے اور ان کا وجود ہمارے</p> <p>معاشرت و اجتماعی حیات</p> <p>کیسے اس درجہ قائل ہو نہاں</p> <p>چھٹا انشا کے لحاظ سے جو</p> <p>مردان انسانوں کا ہے وہ</p> <p>میں دیکھنے سے ملنے رکھتا ہے</p> <p>تیسرا انشا</p> <p>علاوہ محصول</p>	<p>مذاکرات نیاز</p> <p>یعنی حضرت نیاز کی ڈائری</p> <p>جو ادبیاتِ تنقید عالیہ کا</p> <p>عجیب غریب نمونہ ہے ایک بار</p> <p>اس کو شروع کر دینا اخیر تک</p> <p>پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید</p> <p>ادب میں ہے جس میں محنت اور</p> <p>ادبیت کا اندازہ ملے گا</p> <p>خاص شہر کے کلام پر تنقید کی</p> <p>گئی ہے شاعرانہ نظر غالب</p> <p>مستحقِ نظر ہے۔ جو انظر</p> <p>کا ویر وغیرہ دوسرے حصہ میں عام</p> <p>ادبی انتقادی مباحث ہیں</p> <p>جسکا تعلق شہادت کی تاریخ</p> <p>ہے۔</p> <p>حصہ اولیٰ ختم ہو گیا</p> <p>علاوہ محصول</p>	<p>انتقادات (ادبی)</p> <p>حضرت نیاز فحجوری کے انتقادی</p> <p>آلات و جھوٹے تقسیم کے قلم</p> <p>اپنے مسدودہ نقالات سے نہیں</p> <p>خاص شہر کے کلام پر تنقید کی</p> <p>گئی ہے شاعرانہ نظر غالب</p> <p>مستحقِ نظر ہے۔ جو انظر</p> <p>کا ویر وغیرہ دوسرے حصہ میں عام</p> <p>ادبی انتقادی مباحث ہیں</p> <p>جسکا تعلق شہادت کی تاریخ</p> <p>ہے۔</p> <p>حصہ اولیٰ ختم ہو گیا</p> <p>علاوہ محصول</p>	<p>مذہب</p> <p>حضرت نیاز کا وہ عید انظر</p> <p>انسانہ جو لہ دو زبان میں بالکل</p> <p>پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے</p> <p>ان کی ایسی شہرت کی ہے کہ</p> <p>دل بیتاب ہو جاتا ہے اورو</p> <p>میں ہی سب پہلی کتابیں</p> <p>موضوع پر لکھی گئی ہیں ہندی</p> <p>کلام کے بے مثل نمونے نظر</p> <p>آتے ہیں۔</p> <p>قیمت بارہ آنے</p> <p>علاوہ محصول</p>

برائے کتب خانہ
مکتبہ اسلامیہ

19985

قلا نہولہ ۴۶۶

میٹنگ نہ کامت ولتہ اسلامیہ
ہندوستان

10 APR 1951



ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ کے لئے قیمت فی کلو ۱۰/-

ضروری اعلان

پاکستان کے ایجنٹوں اور خریداران ہنگار کے لئے

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خراج تبادلہ کی تعیین کے باوجود ہنگار کا سالانہ چندہ پرستور دونوں ملکوں (ہندوستان) رہے گا۔ اور دونوں جگہ کے ایجنٹوں کو وہی رقم ادا کرنا ہوگی جو اب تک ادا کرتے رہے ہیں۔
کیونکہ یہ ہندوستان پر مل رہی ہے۔ روپیہ کی قیمت کو اس کی اصلی حالت پر لے آئے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ہنگار
پاکستان کے لئے ہنگار ہندوستان کے چندہ میں اضافہ کرنے پر مجبور ہو جاتا۔
پاکستان کے تمام قوم و نسل کے ہندوستان چاہئے۔ ہنگار ہندوستان میں ۲۲۲ پیر ایجنٹس ملوث ہو کر رہے۔

دہنئی وطن کا صلیبی نشان اطلاع ہے
اس امر کی کہ آپ کا چندہ اس مہینہ میں تم ہو گیا

نگار

سالانہ چندہ ہندوستان و پاکستان کے لئے
چھ روپے
اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۵۹

فہرست مضامین اپریل ۱۹۵۷ء

شمار ۴

۳۲	نفاذی گنجوی۔۔۔۔۔ ل۔ احمد۔۔۔۔۔	۳	ملاحظات۔۔۔۔۔
۴۵	پل لاسفسار (نوحی میڈکار و راج اسلامی دنیا میں)۔۔۔۔۔	۵	آتش اور شاد۔۔۔۔۔ سید شاہ عطاء الرحمن عطا لاکوی۔۔۔۔۔
۴۸	شکوہ (نظم)۔۔۔۔۔ آفریدی احمد نوری۔۔۔۔۔	۱۱	فلسفی اور فطرت۔۔۔۔۔
۴۹	انتخاب کلام تیرا کر آبادی۔۔۔۔۔	۱۲	موجودہ ادیبوں اور شاعروں سے آزاد ہندوستان کا مطالبہ۔۔۔۔۔ اختر علی۔۔۔۔۔
۴۰	غزلیات۔۔۔۔۔ صفیہ شمیم۔۔۔۔۔ دہ سیدی۔۔۔۔۔	۱۴	مرتبہ، تواریخ، استفادہ۔۔۔۔۔ عزیز حسن مراد آبادی۔۔۔۔۔
۴۱	مطبوعات موصولہ۔۔۔۔۔	۲۵	عملی نفسیات کی فتوحات کے چند نمونے۔۔۔۔۔ خواجہ طیل احمد علیگ۔۔۔۔۔
۴۸-۴۷	اشتہارات۔۔۔۔۔	۲۸	میں آسن جہتی۔۔۔۔۔ محمود الحسن ایم۔۔۔۔۔ (علیگ)۔۔۔۔۔

آخری ہوا جس کا اندیشہ تھا

یعنی کاغذ کی گرانی و کم یابی نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ”نگار“ کی ضخامت ایک جزو کم کر دیں، یعنی بجائے ۶۴ صفحات کے ۴۸ صفحات پر شائع کریں۔ اس سے قارئین نگار کو یہ دشواری تو ضرور پیدا ہوگی کہ کتابت کے باریک و گنجان ہو جانے کی وجہ سے مطالعہ کے وقت ان کو نگاہ پر زیادہ زور دینا پڑے گا لیکن اسی کے ساتھ ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ مضامین کے لحاظ سے ۶۴ صفحات کی جگہ ۴۸ صفحات کا مواد ان کو حاصل ہو جائے گا، کیونکہ اب ایک صفحہ میں بہ نسبت پہلے کے تقریباً ڈیڑھ سی عبارت آتی ہے۔ موجودہ کتابت و مسطر کی پابندی صرف اسی وقت تک رہے گی جب تک کاغذ کے لئے میں دشواری ہے۔ اس کے بعد نگار پھر مثل سابق ۶۴ صفحات پر شائع ہوگا۔

منیر

رسالہ نگار

ملاحظات

کویت، ایران یا کشمیر؟ آج کل حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر مستقبل کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ انقلابات پیدا بھی ہوتے تھے اور یقیناً بغیر اسباب کے نہ ہوتے تھے، لیکن وہ اسباب نہ اس قدر جلد پیدا ہوتے تھے نہ ان کے نتائج میں اتنی شدت و تیزی ہوتی تھی۔ پہلے صدیوں کا اندازہ سو سال کے زمانہ ہی کو سامنے رکھ کر کیا جاتا تھا اس لئے غور و عمیق دونوں کے لئے کافی وقت مل جاتا تھا، لیکن اب کہ صدیوں ہفتوں کے اندر گزر جاتی ہیں اور ہلک جھپکائے ہی کا وقت سا لہا سال کے برابر انسان کیا سوچے اور ”اہل تدبیر کی دامن دہی“ کی شکایت کس سے کرے۔ تاہم ایک بات ضرور سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ دنیا کا نقشہ بدلنا ضروری ہے اور یہ تبدیلی ایسی نہ ہوگی کہ مختلف حکومتوں کا علاوہ مختلف رنگوں سے ظاہر کیا جائے بلکہ اس میں سویت، ایک حکومت کا ایک رنگ نظر آئے گا اور اسی ایک حکومت کے قیام کے لئے دنیا کی موجودہ کشمکش کو ایک نہایت زبردست فیصلہ کن جنگ میں تبدیل ہونا ہے۔

اس حقیقت کے پیش نظر جب غور کیا جاتا ہے تو بحالت موجودہ ہم کو اس وقت دو ہی قوتیں (روس و امریکہ) متصادم ہوتی نظر آتی ہیں اور انھیں دونوں سے کسی ایک کا سامنا کرنا پڑنا تسلط ہونا ہے۔ ایک بڑی جماعت جسے عوام کی ہمدردیاں حاصل ہیں، اشتراکیت کی کامیابی کی منتہی ہے اور وہ سری جماعت جو سرمایہ داری اور شخصی تسلط و اقتدار کی حامی ہے، امریکہ کو کامیاب دیکھنا چاہتی ہے۔ لیکن ذہنی حیثیت سے ان دونوں میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ امریکہ سمجھ رہا ہے کہ اشتراکیت چاروں طرف سے اس کو گھیرتی چلی آ رہی ہے اس لئے اس کی طیاریاں زیادہ تر مافضانہ ہیں اور روس سمجھتا ہے کہ مغرب جنگ کے بھی اشتراکیت کو دنیا پر چھا جاتا ہے، اس لئے وہ کوئی جارحانہ اقدام کرنا نہیں چاہتا بلکہ اپنی قوت کو اس وقت کے لئے محفوظ رکھنا چاہتا ہے جب امریکہ خود کوئی جارحانہ قدم اٹھائے اور جب کہ اب امریکہ جارحانہ حدود سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے اس لئے جنگ کا خطرہ بھی بڑھتا جاتا ہے۔

اس وقت ایشیا میں تین مقامات ایسے ہیں جو روس و امریکہ دونوں کو میدان میں لاسکتے ہیں۔ ان میں سے ایک کویت ہے، دوسرا ایران اور تیسرا کشمیر۔ کویت کی پوزیشن اس وقت یہ ہے کہ اتحادی افواج خط ۳۸ کے قریب آ گئی اور چینی افواج ان کے مقابلہ سے ہٹ کر جنوبی ایشیا کی طرف اپنا خط دفاع قائم کر رہی ہیں۔ اس وقت تک روس نے کویت کے مسائل میں بالکل خاموشی اختیار کر رکھی تھی، لیکن اگر یہ جنگ کویت کے حدود سے آگے بڑھ کر چینی حدود تک پہنچ جاتی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ چین کھلم کھلا میدان میں آجائے گا اور حسب معاہدہ روس بھی اس کی مدد کرنے پر مجبور ہوگا، جیسا کہ روس کی آواز فرنگ سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی خطہ سے بچنے کے لئے انگلستان اس کا موافق نہیں کر اتحادی نہیں خط ۳۸ سے آگے بڑھیں اور غالباً امریکہ کی ایک جماعت بھی بوجہ چاہتی ہے، لیکن میک آرتھر ایک بڑی زبردست چال چل رہا ہے۔ اس نے پہلے تو چینی جنرلوں کو گفتگوئے صلح کی دعوت دی اور اسی لئے ساتھ ہی بھی ظاہر کر دیا کہ نہ صرف ایک پہنچنے پر کویت کی جنگ ختم نہیں ہو سکتی۔ وہ سمجھتا تھا کہ صلح کی دعوت دینے کا اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے اور چینی اس دعوت کو ٹھکرا دیں گا اور پھر اس کے بعد وہ اپنی صلح جو پانہ چال کی آڑ میں امریکہ پر ہلک کر متاثر کر کے چین پر حملہ کرنے کا جو ازماعا صل کر سکے گا۔ الغرض کویت کی موجودہ پوزیشن خطرہ سے خالی نہیں اور بالکل ممکن ہے کہ یہ طوائف آگے چل کر روس و امریکہ یا بالفاظ دیگر تمام دنیا کی جنگ بن جائے۔

دوسرا خطرہ جو حال ہی میں پیدا ہوا ہے ایران کا ہے۔ وہاں کے وزیر اعظم رزم آرا کا قتل اور اس کے جانشین حسین علی پر تھانوں حملہ کی سازش، اسی دونوں سے وہاں کے عوام کی ذہنی انقلاب کی بنیادی اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ ایران کی پہلک چاہتی ہے کہ وہاں کے پٹرول کو قومی ملک قرار دیکر انگریزی ٹھیکہ فروش کو کر دیا جائے، جسے انگلستان اور امریکہ دونوں گوارا نہیں کر سکتے، کیونکہ اس طرح نہ صرف یہ ہوگا کہ ان کی کرودیل مدد پر کی آمدنی ختم ہو جائے گی بلکہ یہی ہوگا کہ وہاں کے پٹرول کی ذخائر پر روس کا تسلط قائم ہو جائے گا اور آجکل پٹرول ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے انسان کا زیادہ سے زیادہ دھن دھن ہلایا جاسکتا ہے۔ انگلستان و امریکہ نے وہاں کے پٹرول پر قابض رہنے کے لئے فوجیں روانہ کر دیں، تو اس معاہدہ کی رو سے جو مابین روس و ایران ہو چکا ہے، روس بھی اپنی فوجیں لے آئے گا اور عالمگیر جنگ شروع ہو جائے گی۔ اس وقت تک جتنی خبریں آئی ہیں وہ بہت

توشیٹاک ہیں، کیونکہ وہاں کے عوام کے بڑھتے ہوئے جوش کو دیکھ کر مارشل لا جاری کر دیا گیا ہے اور تقریباً تمام ملک میں فوجی حکومت قائم کر دی گئی ہے۔ خود شاہ ایران یا ان کا مینہ کیا جا چتی ہے، اس کا اب کوئی سوال باقی نہیں رہا، کیونکہ اگر حکومت نے عوام کے مشاوت کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو خود اس کی زندگی خطر میں پڑ جائے گی اور بالکل ممکن ہے کہ ایران اپنے آپ کو سوویت یونین سے وابستہ کر کے اشتراکی حکومت قائم کر دے اور وہاں کی شاہنشاہیت ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ اس لئے ایران کے موجودہ حالات کو امریکن ہلاک اور انجمن اقوام نہایت تشویش کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اگر ایرانی کی پبلک اپنے مطالبہ پر قائم رہی تو امریکن ہلاک اپنی فوجیں وہاں اتار دیگا اور یہ سمجھ کر انارکیا کے دوس سے اسے جنگ کرنا ہے۔ تیسری جگہ خطرہ کی کشمیر ہے۔ فرنٹو کشمیر کا مسئلہ ایسا ہے جس کا تعلق صرف ہندوستان و پاکستان سے ہے اور اصولاً انجمن اقوام کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں، لیکن شمالی و جنوبی کوریا کا اختلاف بھی اسی نوعیت کا تھا اور انجمن نے اس کو بین الاقوامی مسئلہ قرار دیکر اپنی فوجیں وہاں بھیج دیں۔ اس لئے کشمیر کے مسئلہ میں بھی اس اصولی پر اعتقاد نہیں کیا جاسکتا، علاوہ اس کے چونکہ ہندوستان نے خود اس کا فیصلہ مجلس اقوام سے چاہا تھا اس لئے وہ اس سے پورا پورا قایدہ اٹھائے گی اور کشمیر کے مسئلہ پر اس نقطہ نظر سے خود نہ کرے گی کہ وہ صرف پاکستان و ہندوستان کے تعلق رکھتا ہے، بلکہ وہ دیکھے گی کہ یہ صورت جنگ امریکن ہلاک کشمیر کو دوس کے خلاف اپنی مینڈاٹ بنانے میں کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے۔ آیا کشمیر کو ہندوستان کے حوالہ کر دینے کے بعد پاکستان کے سپرد کر دینے کے بعد اس کے رد کر دینے کے بعد اور غالباً اب ملک اس باب میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکی، کیونکہ وہ پاکستان و ہندوستان دونوں میں سے کسی کو اس وقت تک ناخوش کرتا نہیں چاہتی جب کہ خود اس کا مفاد اس کی اجازت نہ دے لیکن اگر کوسٹ و امریکن ہلاک کے درمیان اختلاف بڑھتا گیا جس کے اسباب کوریا اور ایران میں زیادہ قوی ہوتے جا رہے ہیں تو اسے بہت جلد اور دھڑا دھڑا اس کا فیصلہ کرنا پڑے گا اور پھر اس کے سامنے ہندوستان و پاکستان کی خوشی ناخوشی یا عزت و انہدام کا کوئی سوال نہ ہوگا بلکہ صرف اس بات کا کہ اس کی توقعات زیادہ سے زیادہ کس طرح پوری ہو سکتی ہیں۔

لیکن کیا یہ بات اتنی ہی آسان ہے جتنی بظاہر نظر آتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ آئیے اس سلسلہ پر اسب سے پہلے یہ خود کریں کہ موجودہ پوزیشن اس مسئلہ کی کیا ہے۔ یہ بات تو اصولاً دونوں ملکوں نے تسلیم کر لی ہے کہ کشمیر کا فیصلہ عوام کی رائے سے ہوگا، لیکن اسے شکاری کیونکر ہو اس پر دونوں متفق نہیں۔ آزاد رائے شکاری کے لئے یہ ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ دونوں ملکوں کی فوجیں وہاں سے ہٹائی جائیں اور فریقین میں سے کسی کا اثر وہاں نہ رہے۔ ہندوستان کا کہنا ہے کہ چونکہ حکم کی ابتدا پاکستان کی طرف سے ہوئی ہے، اس لئے اس کے خلاف ایک طرف فیصلہ اسی طرح کا ہونا چاہئے جیسا شمالی کوریا کی حکومت کے خلاف کیا گیا تھا اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی فوجیں ہٹانے کے لئے تیار نہیں ہے کیونکہ حفاظت کشمیر کی جو ذمہ داری اس نے اپنے سر لی ہے اس کو اس سے نقصان پہنچ جائے گا۔ اس سے قبل ٹروٹسن کو امور کیا گیا تھا کہ وہ اس باب میں فریقین کو کسی ایک نقطہ اتحاد و اشتراک پر اسے کی کوسٹ سن کریں، لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی اور سیکورٹی کونسل پھر کچھ دلی کے لئے خاموش ہو گئی۔ اس دوران میں کوریا کے مسئلہ نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی اور کشمیر کا مسئلہ متوی ہو گیا، لیکن اب اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ نزاع کو ربا، چین و دوسرے کی جنگ قرار دیا جائے، نیز اس اندیشہ سے کہ مبادا ایران کی شورش روس و برطانیہ میں تصادم پیدا کر دے، کشمیر کی طرف پھر کونسل کو توجہ ہوئی اور اب مذاکعات کے ذریعہ سے ہندوستان و پاکستان کی فوجیں ہٹانے کے مسئلہ کو طے کرنا چاہتی ہے۔ جسے پاکستان نے منظور کر لیا ہے اور ہندوستان نے نامنظور۔ ان دونوں کی منظوری و نامنظوری کے مما سب اب بھی ہیں، لیکن اگر پاکستان یہ توقع کرے کہ فیصلہ بالکل اس کے موافق ہوگا تو یہ بھی بالکل اسی طرح غلط ہے جس طرح ہندوستان کا یہ سمجھنا کہ اپنی فیصلہ سے انکار اس کے پڑ کر کھجکا دیگا۔ اس لئے اس سلسلہ میں یہ سوال بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اگر یہ مسئلہ جلد حل ہو گیا (جو کامیابی ہے) اور وہاں پھر ناخوشی فیصلہ کی تجویز کو قرار رکھا گیا تو پھر ہندوستان کی کیا پوزیشن ہوگی اگر اسے یہ تسلیم کیا تو پھر تسلیم کرنا چاہیگا اور اس وقت ہندوستان کے لئے (اگر وہ اپنے مطالبہ کشمیر پر دست بردار ہو) اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ اس کو اپنے لئے غور و فکر ہو جائے اور اس مسئلہ کی طرف ایک ہی سمت میں اسے دیکھنا ہوگا کہ اسے یہ کہنے کو کہ اس ہلاک سے وابستہ کر دے۔ انھیں اس وقت کو ربا و ایران اور کشمیر پر یہ پڑے ہوئے ہیں جو ہر وقت جنگ عظیم کا سبب بن سکتے ہیں اور یہ کہ یہ شکل ہے کہ میں سے اور یہ کہ فقر کے حاصل ہوگا۔ بہر حال جنگ سے غرض نظر نہیں آتی۔ اور یوں تیسرے۔

دل کا جانا ٹھہر گیا ہے، میری کیا شام ملی

آتش اور شاد

(ایک غزل گو کی حیثیت سے)

عزراں منسوبانِ آتش اور شاد کو ایک غزل گو کی حیثیت سے پیش کرنے سے قبل، غزل کی اہمیت، اس کی ساخت، اس کی افرا فریبی اور اس کی تاریخی ترقیوں پر سیر حاصل بخیر و کیا جائے تاکہ جو کچھ غزل کے اندر ہے اس موضوع پر کافی مضامین مضبوط پر مبنی ہو سکیں اور غزل کی حمایت اور تحفظ میں شتا سر پایہ رجوع نہ کر سکیں۔ اس پر مزید اضافہ کی حلقہ ضرورت نہیں۔ اُسود میں غزل گوئی کے خلاف پہلا پہل اُردو کے ایک غزل گو غزل گوئی نے اُدا کر اٹھائی، لوگوں نے غلطی سے غزل کو غزل گوئی سے بیکار کر دیا اور اس صنعت کو ختم ہی کر دینا چاہے۔ جنھوں نے عالمی پرے دے بھی کر کتنوں نے انھیں ہرا بھی کر دیے۔ دو بول گروہ حقیقت کی تک نہ پہنچ سکے۔ کچھ آج بھی پرتوتوں نہیں اٹکے لڑائی میں بھی علماء کے خلاف آوازیں اٹھائی گئیں مگر ان علماء کے خلاف یہ یقیناً علماء و سواد کے خلاف اس طرح کی غزل گو شاعر اور سب دشمن کیا گیا، یقیناً اس پر جو غزل گو بڑی بنا چکے تھے یا بنا رہے تھے۔ اسلام کی محنت، ضرورت تھی ورنہ عیب بھی ہنر میں جانا اور ایک زبان میں ایسا ہوا بھی۔ لکھنؤ میں ایک طنز زبان کی حیثیت سے شاعری ترقی پذیر ہوئی تھی تو وہ سب ہی حیثیت سے باطل بہ زوال بھی ہو گئی اور اس زبان کی اصلیت کے پیچھے جس نے اپنا قیمتی جناح جو ضائع ہو رہا جو شاعری کی مدد تھی، ہمہ راجح و آتش میں شاعری کی شہید ہوئی، مگر زبان اسی رنگ میں رہا جاتا تھا، لکھنؤ تو لکھنؤ رہی جس اسی لپیٹ میں آگیا اور مضمون اور نقاب جیسا شاعر بھی آج کے کاکل پیاں میں گرفتار ہو گیا۔

غزلاں حرم تک بھی اسی حلقے میں در آئے کہاد رنگ سلسلہ پہنچا ترہ زلف پریشان کا

وہ نغمہ خواہ تھیں اور غائب اپنی اپنی افاد طبع اور رنگ مزاج کی وجہ سے اس دام میں دیر تک ایسر نہ رہے اور اس چھوٹا اکہ جو گئے ورنہ وہ لوگوں میں آج کی طرح غزل کی قلمرو سے باہر رہتے۔ تاریخ اگر غزل کو بڑے تھے تو کوئی شخصیت کی بات تھی، ان پر تو الزام اس کا ہے کہ کتنوں کو خراب کیا۔ اور آج کی قسمتی سے آج کے رنگ کو اپنی نظر آتا ہے تو اس پر انگلیاں اٹھتے لگتی ہیں۔ تاریخ نے اپنے ہم عصر آتش کو بھی خراب کیا، جب آتش کا آقا ہی بگڑا ہوا ہو تو کوئی کیا کرے، اگر آتش اپنی طبیعت کی گرمی اور مزاج کی خود داری سے کام نہ لیتے تو ان کا خاتمہ تھا۔ آتش کی یہ بد نصیبی تھی کہ آتش ان کو تاریخ کا حریف سمجھ کر ان کا مطالعہ کیا گیا۔ دوسری بد نصیبی یہ تھی کہ نقاب کے کلام کی طرح کوئی نقاب دوان ان کا شایع نہ ہوا، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اگر اسے تاباں ترس و فاشا میں دیکھتے رہے اور کسی نے ان کی حقیقی اور داہمی نقد و منقذ نہ کی جس کے وہ مستحق تھے، آتش کا تاریخ کے ساتھ مطالعہ کرنا آتش کی توہین ہے، گریہ بھی ایک ننگا حقیقت ہے کہ ایک گروہ آج بھی تاریخ کو آتش پر ترجیح دیتا ہے مگر سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ:-

زبان میں خدا یا کان دے ان آنکھ والوں کو نہیں خرقہ کیا نگر کہاں مرغ غرض الحماں کا

غزل صرف ایک صنف کا نام نہیں، جس کسی نے بھی شخص طبع، تعلیم اور دین و تقاریر کی پابندی سے چند طرح کے افکار و خیالات منہل کر کے وہ ہرگز غزل کو نہیں کہا جاسکتا، محض حقائق و معانی کا بیان کرنا بھی غزل گئی نہیں، اعلیٰ درجے کے اخلاقی اور صوفیانہ مسائل کا بیان کرنا بھی غزل گوئی نہیں، نفسیاتی کو اہل حسن و عشق کے معاملات کا بیان بھی غزل گئی نہیں، اس منظم پہلو سے قطع نظر اگر شاعری پہلو کی صورت سے کیجئے تو کہا جاسکتا ہے کہ غزل ایک خاص صنف کا نام ہے، عقاب و معانی کا بیان کرنا بھی غزل گئی ہے، اخلاقی مضامین و تصوف کے ہر مسائل کا بیان بھی غزل گوئی ہے، اخلاقی کو اہل حسن و عشق کا ذکر بھی غزل گئی ہے، متفرق گزراں کا دیر بہت نہ رہی ہے اصل محدود بھی، غزل گئی نہ جہت آسان بھی ہے اور بہت مشکل بھی ہے ایک اعلیٰ ترین صنف شاعری بھی ہے اور اعلیٰ ترین بھی، غزل ایک نغمہ شاعرانہ طرز شاعری بھی ہے اور بہت ترین طرز شاعری بھی، قصور غزل کا نہیں نظر آتا ہے

ایک منہاج ہے جو سنگ و شیت سے تاج محل کی تخلیق کرتا ہے، سنگ مرمر میں زندگی کی روح ڈال دیتا ہے وہی دوسرا اناڑی کا دیگر انھیں سامانی ہے ایک کھدائی عمارت بنایا کرتا ہے۔ اردو شاعری میں وہ بل کی وجہ سے بدنام ہے مگر جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ پرلے درجے کے نا فہم ہیں۔ کوئی چیز ذات خود اچھی یا بُری نہیں ہوتی اس کا استعمال اسے اچھا یا بُرا بنا دیتا ہے۔ ایک لکھنوی شاعر گل و بلبل کو اس رنگ میں پیش کرتا ہے:-

باغ جاتے تو ہو پہنچے ہو گلانی قربی
بلبل بے ادب آہٹھے نہ اے جاں سرسبز
تصور کو زراور تیز کر کے دیکھئے اگر واقعی بلبل گلانی قربی کو گل سمجھ کے اس پر چوبچ مارنے لگے تو کتنا مضحکہ خیز منظر لگا ہوں گے سامنے ہو۔ یہی اردو شاعر گل و بلبل کے مفہوم کو اپنی بے ہمتا سے اور احوال کی غلط بینی سے اسی رنگ میں سمجھ سکا۔ ایک دوسرا لکھنوی شاعر غلام قادر دہلی اسکول میں تھا اسی ماحول میں گل و بلبل کو اس رنگ میں پیش کرتا ہے:-

یہ آرزو تھی تجھ گل کے رو برو کھرتے
ہم اور بلبل بیتاب گفت گو کھرتے
یہ عام خیال ہے، نہ ایک نیک و درست بھی کراش ماحول کی پیداوار ہے یعنی وہ میری کہتا ہے جو اپنے گود و پیش دیکھتا ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاعر ماحول آفریں بھی ہوتا ہے لیکن بعض کی فطرت اتنی بند ہوتی ہے کہ ماحول سے متاثر ہونے کے بدلے ماحول کو بدل سکتے ہیں، وہ زمانہ کی رو کے ساتھ ہم نہیں جاتے بلکہ زمانہ کے ہر اوپانی مرضی کے موافق ہرگز اپنی راہ الگ نکالتے ہیں۔ آتش کہتا ہے:-

کرتا ہے مجھ سے اہل ایام شوخیان
پہچانتا نہیں مگر آسن سوار کا
آتش بھی ایسا ہی بند فطرت شاعر تھا۔ ایک طرف ماحول کی اثر آفرینی سے مجبور دوسری طرف ماحول کی زخانی زندگی سے سبزا، اسی کشش میں اس کی ساری زندگی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں ہم دور نئی رنگ متوازن پاتے ہیں، ایک مصنوعی دوسرا حقیقی۔ خود آتش کو بھی اس کا احساس تھا ایک طرف شاعری کو وہ تصنع اور دروغ بانی کا مترادف سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ:-

آتش برانے مانے، حق حق جو پہنچے
شاعر میں ہم دروغ ہمارا کلام ہے،
اور دوسری طرف شاعری کو حقیقت و معرفت کا مرقع جانتا ہے:-

غزل خواجہ ہے مطلب کو پہنچے اسے آتش
تا دلے اثر مرغ نوا سنج نہیں،

شاعر کچھ تو اپنی طبیعت کے تقاضے اور سنگ سے کہتا ہے اور وہی اس کا اصل فطری کلام ہوتا ہے اور پھر ماحول کے تقاضے اور دوسروں کی فرمائش سے جو اکثر غیر فطری ہوتا ہے۔ آتش کے یہاں یہ دو متضاد تقاضے بہم دے کر یہاں نظر آتے ہیں کبھی تو وہ قافیہ سے مضمون پیدا کرتا ہے اور کبھی مضمون سے قافیہ پہلی صورت غیر فطری ہے اور دوسری فطری، جس طرح ایک دو کافر کبھی کبھی سستا اور گھٹیا مال عوام کی پسند کے لالچ اور بازار کی چلن کے مطابق سر دکان لگا دیتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اہل نظر اور شائقین کے لئے کچھ ”الگ، بانہ کے رکھتا ہے جو الگ اچھا ہے“ اب یہ فریاد کی پسند ہے جیسا مال خریدے۔ آتش کی غزل کو لے کے مطلع ہے:-

معرفت میں تیری ذات پاک کے،
اڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے

دوسرا شعر ہے:-
قید رکھتے موسم گل کی نہیں،
دلوں کے حیرے گر یہاں چاک کے،

اب اسی غزل میں لکھنوی ماحول کے تقاضے سے مجبور ہو کر یعنی اس وجہ سے کہ کوئی یہ دیکھ کر مسواک کا قافیہ تقلید کرنے سے طبیعت عاجز اور قاصر رہی:-

شعر بھی لکھتا پڑا:-
نیشکر کی پور اسے شیریں دہن،
پھلکی بہ آگے تری مسواک کے

یہی حال آتش اور غزلوں کا بھی ہے، اب تیار ہا پر یہ قوم داری عاید ہوتی ہے، وہ مصنوعی آتش اور حقیقی آتش میں امتیاز نہ کرے۔

غزل پر بعضوں کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس کے مضامین کبھی متضاد، کبھی بے ربط اور کبھی بے آہنگ ہوتے ہیں یعنی ایک شعر اگلی پر تو دوسرے تحت الشری میں، گھر نہ لاکوئی ان سے پہنچے کہ آپ غزل کو ایک متنہ تصور کرتے ہیں، غزل کا ہر شعر الگ الگ ایک متنہ ہے، مستقل ایک نظم ہے بلکہ نظم کی ایک ارتقائی شکل۔ میں یہاں پر صرف ایک مثال پیش کر کے خاموش ہو جاؤں گا، ابھی جو پیش کی ایک پرکھت نظم پر نظر پڑی۔

غالب عنوان تھا "باغی انسان" ابتداء میں ہوتی ہے۔

مگر ان آج بھی ہے پیر مغال کیا کہنا! وہی دفتر ہے وہی خبر و نشان کیا کہنا!
نظم کافی طویل ہے اور الفاظ کی خوب و بلا اڑاں ہیں مگر مطلب ہر شعر کے وہی ایک، ایک ہی اجمال کی ہے مبالغہ و تخیل۔ اس پر اس پر نہیں لڑتی ہی نظم کی
تفسیر کی ہے، ہر شعر پر تین تین مصرعوں کا اور اضافہ! وضاحت پر وضاحت، فکر پر فکر، بکواس پر بکواس۔ ایک شعر اور بھی سنئے:-

ترفش ہیں محیر و محراب کے لیے کب سے پھر بھی سرشار ہیں دوا، جہان کیا کہنا!
پوری نظم پڑھ لینے کے بعد حافظہ پر دور و دور خیالی آیا کر یہ مضمون کہیں دیکھا جو ہے۔ یکایک آتش کا شعر نگاہوں کے سامنے تڑپ اٹھا حیرت ہوتی ہے
کاتے پڑے مضمون کو اس جہتی اور صفائی اور نور بیان کے ساتھ شاعر نے صرف دو مصرعوں میں ایک غیر فانی نفس بنا دیا۔ شعر ہے:-

ہائے غم مستوں کے جوں کا جو عالم ہے سہے سر مجرہ ہی داغ کا میل ہے کہ جو سہے
اب آپ ہی بتائیے کہ اس ایک کھلے شعر کے بعد کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم غزل کے دوسرے اشعار کے مضمون کی طرف نگاہ اٹھائیں اور خواہ مخواہ ایک کو
دوسرے سے پوسٹ کر کے بے ربطی کا الزام بے جا عاید کریں۔

غزل گوئی کو اکثر اقدیم بہت آسانی سمجھتے ہیں، رویت و قافیہ کے دور پر اشعار کہتے چلے جاتا اگر یہی غزل گوئی ہو تو ان کا خیال درست ہے، مگر ایک حقیقی
اور کامیاب شاعر کے لئے رویت و قافیہ ان کے دل جذبات کے اوکھنے میں سد راہ نہیں ہو سکتے، رویت و قافیہ بھی ان الفاظ ہی کی طرح شاعر کی قدرت کا ایک آئینہ
ہمہ اندھ کھڑے رہتے ہیں ورنہ ہر شاعر یا غیر شاعر بھی "کام کیا، نام کیا" کی زمین میں تیرے کے اشعار نکال دیتا ہر شاہد و شاعر میں تو رویت و قافیہ ہی کی پیدائش
سے غزلیں بھی جاتی ہیں، سیکڑوں شعرا، اگر آپ کو شاعر کہہ سکتے ہوں، شریک بزم ہوتے ہیں غزل کے اشعار حقیقی مضمون میں صرف وہی، جیسے ہیں جو سامعین کے دلوں
میں اثر کریں اور نقش ہو جائیں، باقی سب بکواس، زمانہ خود ایک بڑا نقاد ہے، وہ سب کو کسوٹی پر کس کر کھڑے اور کھٹے کی چیز کر تا ہے اور انہی کو خلعت دوام
بخشتا ہے جن میں صلاحیت ہوتی ہے۔ دلی سے لیکر تاجک ہزاروں ہی نہیں بلکہ کھوں کی تعداد میں غزل گو ہوتے ہیں، اگرچہ غزل گو گو آوازوں میں بھی زیادہ
شاید ہی نکل سکیں، اچھے غزل گو انگلیوں پر گئے جاسکتے ہیں، آئیے گئیں، تبیر، قناب، مومن، آتش، داغ، شاد، انصر، حیدر، اقبال اور آج کے انڈیا کے
فیصلہ صراح، بی، آرو، اکشر عشر ہیں جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ "ملک عشرۃ الکامل" ان کے بعد دوسرے درجے کے غزل گو غزلیں گویا ان کی تعداد دیکھی کم
ہی ہے، البتہ سب قافیہ پر جاتی کرتے تھے، اب بادیہ پیمانی گورے ہیں اور ان کا کوئی نام و نشان نہیں۔

غزل گوئی کا معیار قائم کرنا بڑا مشکل کام ہے، میں نے دس شعر کے نام لٹائے تو گورے دئے اور ان میں کل سرسید تیرے ہیں مگر آپ کو یہ مگر حیرت ہوگی، اور یہ
بات صرف ان میں کہنے کی ہے کہ باوجود کہ تیرے غزل گوئی کے بادشاہ سمجھے جاتے ہیں مگر ان کے اقلیم سخن میں دس غزلیں بھی یکساں، ہموار اور ہم آہنگ نہیں گی۔
اپنی ایک زیر قلم تصنیف "میانہ تغزل" کے سلسلہ میں مجھے تیرے معاملہ میں بڑی وقت پیش آئی اور ابھی تک تیر کی دس غزلیں یکساں رنگ، کی جگہ دستیاب نہیں
ہوئیں۔ شاید حضرت نیاز میری رہنمائی کر سکیں۔ تیر کے منفرد اشعار بے پناہ ہوتے ہیں، مگر یہی غزلیں ہموار نہیں ہوتی، اس حیثیت سے صرف دو شاعر قابل
ذکر ہیں، ایک قناب دوسرے شاد۔ غزل کی فنون معیاری ہوتی ہے اور ایک رنگ کی، مومن کے ایسے شوخ غزل گو کے یہاں بھی یہ ہمواری نہیں ہوتی۔ بہر کیف
کہنے کا مقصد یہ ہے کہ غزل کے اشعار کو تغزل کے معیار پر پرکھنا چاہئے۔ ذوق کا شعور اور غزل کا مطلع ہے

نام منظور ہے توفیق کے اسباب بنا پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا،

انہوں نے کارگیری کی فہرست تو بنادی مگر پھر بھی اس فہرست کو اور طویل کیا جاسکتا ہے مگر ایک دوسرا شاعر اسی مضمون کو کھینچا گزرتی اور گزرتی کے ساتھ ادا کرتے
ہائے دُنیا میں جو غمزدہ یا شاد رہو، ایسا کچھ کر کے چلو میاں کہ بہت یاد رہو،

یہی وہ نازک فرق ہے جو غزل کو اتنا مشکل بنا دیتا ہے۔ غزل میں قسم کے مضامین کی کھپت ہو سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی، اسلوب بیان، الفاظ کا انتخاب
لڑانا ان سب کا غرض اسلوبی کے ساتھ احتراظ ہو تو وہی چیز "دنا سے شاعر چہرہ دگر" ہو جاتی ہے، بعض وجوہات چیز ہے اور ذاتی سبب بھی ہر کچھ
سکتا ہے۔ اسٹی دسجے کے غلط قریا مذہبی مضامین بھی اگر شاعر انہوں میں قبضہ نہیں ہوتے تو تغزل میں ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ داغ کا شعر ہے اور

حقیقت پر غور کرو، وہاں بھی تو زمین تیری، فلک تیرا،
محض اظہارِ عقائد ہے مگر قتاد اس کو یوں کہتے ہیں :-

ہر طرف ہے وہی ہر شے میں ہے جلوہ اس کا
صانع کو دیکھنا ہو تو عالم پہ کر نگاہ
ترکِ نعمت جو کردی ترک ہے گویا اس کا
ایک آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا

اور

اس مضمون میں مجھے اور عزلی کو شعرائے مطلب نہیں، صرف آتش اور شاد کوں گاؤ۔ دونوں کی عزلی گوئی کے رنگ میں ممانت، اور مخالفت کو جان کر کرنے کی
کوشش کروں گا۔ دونوں کے دواؤں کے غایر مطالبہ کے بعد ایک شخص بآسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ دونوں قادرِ الہام شاعر تھے، انداز بیان بھی
بہت ملتا جلتا ہے، مضامین اکثر مشترک ہیں، اکثر غزلیں دونوں کی ایسی ہیں کہ اگر قطع کی وضاحت نہ کی جائے تو ہمتی از شکل ہے۔ دونوں لفظی حیثیت کے لحاظ
کے اور منہج حیثیت سے وہی کے ہیں۔ دونوں کا دبستان ایک ہے۔ خمریات میں وہی گزرائی اور مہریت ہے، بادہ تصوف سے، دونوں سرشارِ اخلاق و
مخلقت کے دونوں مدرس، حقایق و معارف دونوں کے کلام میں جہ نہ تمام موجود اور انداز بیان میں شاعرانہ دلچسپی دونوں کے پہلوں مساوی، غرض یہ کہ یہ
مشترک صفاتی کے دونوں حامل ہیں۔ مگر ایک طرف ممانت ہوتے ہوئے بھی دونوں کا انفرادی رنگ بھی الگ الگ ہے، ہمتی کے یہاں طنز اور تیکھلے ہیں
اس غضب کا ہے کہ آدو شاعری میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ کلام میں گرمی اور انداز بیان میں تڑپ اس ہلکی ہے کہ کوئی دوسرا شعر ان کا سر نہ نہیں، اور
و انبساط، جوش و نیروغ اور نشاط حیات کی جتنی فراوانی ان کے کلام میں ہے کسی دوسرے کے پہلوں نہیں، ان کے غم میں بھی ایک ہلکے ہے، اور ضرورتی میں بھی
ایک جھک۔ "آتش میں بھی ہے وہی چھپا گلستاں کا" شاد کے پہلوں و گلزاری، غم طرازی، فسرہ حالی اور زندگی سے فراق کا غم نہایت زیادہ ہے اور
اس حیثیت سے وہ آتش سے زیادہ تیرے مشابہت رکھتے ہیں، خصوصاً طویل جہوں میں جو دوزگراں، یاس و الم، غم پر وہی اور سینہ کاوی کے جو غم نہایت
کے یہاں پاتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ آتش غم میں سکون ہے یا مگر اندھا غم نہیں کرتے:

جور و جفا سے یار سے رنج و محو دہو،
دل پر بھوم غم جو ہیں پر شکستہ :-

شاد کا غم چھپا کیسا اور تڑپے اور لوٹتے ہیں :-

خوشی سے مصیبت، اور بھی سنگین ہو جاتا ہے
تلاش سے دل تڑپے سے ذرا تسکین ہوتا ہے

یا دوسری جگہ کہتے ہیں :-

یوں ہی راتوں کو تڑپیں گے یوں ہی جاں اپنی کھینچے
تیری مرضی نہیں اب درد دل اچھا سوچئے

ایک دوسرا نمایاں اور قابلِ ذکر فرق جو ان دونوں کے کلام میں پایا جاتا ہے وہ یہ کہ آتش کے کلام میں اجتہاد اور سوچا ترین کی نمایاں کثرت سے طبع کی ایک حد
جو مرقع تو قابلِ نظر انداز بھی نہیں، مگر شاد کے کلام میں اتنی سنجیدگی، وقار، تکنت اور سحر ہے کہ اس حیثیت سے اس دوسرے کی مدد میں وہ امام نظر آتے ہیں۔
یہ سب اگر آبادی اپنی شاعری کے متعلق کہتے ہیں: "سلسلہ شعر مہذب کا مرے گھر سے پہلا" مگر یہ سلسلہ خاندانی ہے، اپنی آنا چھ تیر کے یہاں بھی کثرت
سے اجتہاد ہے اور بقول کسی کے ان کے دواؤں میں "وہی کے کوٹھے بھرے پیسے ہیں" غالب بھی "دعول دیے" پر رات آتے ہیں اور "وقت سفر نکلتا"
نہ دیکھتے ہیں، "موتن رقیب کا ماں داسب کچھ برداشت کرنا ہے اور" شب و وصل غیر بھی کاٹ ہی پیتا ہے، غرض کسی ساہوکار دامنِ فحاشی اور جہالت سے
پاک نہیں۔ مگر شاد کے پہلوں افسوس، غمناک و "بوسہ" کا لفظ بھی محانت کے خلاف نہیں استعمال نہیں ہوا، لکھن کھیلنے کا ذکر، سالانہ شاد پر بھی
جہالت آئی تھی اور ان کو اقرار ہے کہ "جو کیا بھلے جوانی میں وہ سب کرتے ہیں" غالب تو کھلم کھلا "بوسہ بازی" کا تحریک کرنے میں کہ :-

"بوسہ کو بوجھتا ہے بی بی منہ سے مجھے باز یوں"۔ آتش کے یہاں بھی بوسہ بازی، اجتہاد کا رنگ، اختیار کو لیتی ہے۔

بوسہ بازی سے مری ہوتی ہے باز ان کو
منہ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں مہاسے پیدا

شاد کے یہاں "بوسہ" پاکبازانہ رنگ اختیار دیتا ہے۔

بوسہ سنگ آستانِ دل نہ رکھتا ہزار جیفت
آگے قدم نہ بیٹھ سکا بہت سرفراز کا

بہت بڑھتے ہیں تو اس کا ایک رسالہ لکھی آئندہ ہوتی ہے :-

بوسہ لینے کا مری خاک کو بھی ارمان ————— تاب اٹھنے کی کہاں
جامہ زیبی کا بھلا! اسے منہ تلک قبا ————— کچھ تو دامن کو جھکا
یہی پاکیزانہ حسن و عشق کے معاملات کا اظہار شاد کے انفرال کا اصلی رنگ ہے وہ خود کہتے ہیں :-
مراد و ازل تو میرپ ہے جہان پاکبازی کا ————— بڑے کلہ زبان فادس اس ہلکے مجازی کا
غزل میں "معاملات" کی زمین ٹہری مشکل ہے فوہی انفرال میں شاعر کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ آتش کہتے ہیں :-
شب وصال میں کھوئے تھے بارگاہ بند ————— کرے کھینچ کے چٹکے کو ہم نے دسے چکا
ہاتھ منا ہوں جو میں دیکھ کے بے کھار ————— کہتے ہیں تو بے کھار کو یہ وہ نارنج نہیں
داغ کا کیا کہنا، وہ تو اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں :-

یہ لطف ہے کہ دوپٹہ اڑھری ہوا ————— چھوڑے ہیں جو سید کر سیں چھیتی
نصیر ذکر پر بھی دھیان رہے۔ لیجئے بشریت :-

خودوں کا انتظار کہے کوں حشر تک ————— مٹی کی بھی لے تو روا ہے ششیاہیں

انہیں مضامین کی وجہ سے پڑی غزل کوئی بدنام ہوئی، اردو شاعری کا دوسرا نام بھی پڑ گیا، شاعر نے اتنی مٹی پلید کی کہ اس کو زبان حال سے
کہنا پڑا کہ "اری اُتھ جاؤں گی میں صبح سے" اردو کے تقریباً سب شعرا اس حمام میں منگے نظر آتے ہیں، صحت فدا اس سے مشتقی ہیں۔ فراق سے بڑی
اس میں وابستہ تھیں مگر وہ بھی "ہنگام وصال پہنکے" لینے لگے۔ یہ سچ کہ ہیں اور نظر آتا ہے تو انفرال کے یہاں۔ جیوت شاد کی شاعری کا شایب تھا
اس وقت ملک میں داغ چھائے ہوئے تھے۔ داغ غلیظ آباد بھی آئے تھے اور جیسا کہ ایک روایت سے معلوم ہوا شاد سے لے بھی تھے، دوسری طرف منیر کا
زور تھا اور وہ فاتح کے درستان کے طالب علم تھے۔ یہ شاد کا کمال تھا کہ داغ کی "تروامنی" اور "ناخ کی" "شک و امنی" سے ملکہ ایک نیا رنگ شاعری کا
چمکایا۔ انہیں خود اس کا احساس تھا کہ میر تقی میر کو خطوط کے ذریعہ اس مایہ ناز شاعری کی طرف سے باز رکھنے کی تلقین کی مگر یوں فراق کو میں میں جھنگ
پڑی ہوئی تھی، مشتاق تو کون سنتا؟ داغ کا طوطی ہل رہا تھا، آئبر سہا مہذب انسان بھی داغ کے رنگ میں رنگ کر کے کہنے پر مجبور ہو گیا کہ :-

ذرا شام ہوئے تو ہم رنگ لائیں، ————— اندھیرے میں لوٹیں گے جو بن کسی کا

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ :-

کھل گیا جو بن تو عصمت لے گیا سے لوں کہا ————— ایک انگڑائی کیا ہم دونوں کی رسوائی ہوئی

بھلا اس قسم کے اشعار آئبر کے منہ پر زب دیتے ہیں؟

شاعری کی عمر کا دو قسمیں کی جاتی ہیں، داخلی اور خارجی۔ گریب خیال میں ایک دوسرے پہلوئے اگر تقریباً اسی قسم کے تو اس کی شاعری قسمیں ہیں، ایک
دل کی شاعری اور دوسری شاعری قریب قریب شاعری ہیں جن کو انفرال کے سنوئے رنگ سے دیکھ کر کہتے ہیں، قریب قریب انفرال کے سنوئے رنگ سے دیکھ کر کہتے ہیں، اس کو سنوئے رنگ سے دیکھ کر کہتے ہیں۔

زبان کا شعر :- ————— جانتا ہے غلام آپ کو بس بس اچھی ہیں
دل کا شعر :- ————— دہلی اچھوں سے سلام آپ کو بس بس اچھی ہیں

داغ کا شعر :- ————— مری نصیر میں شاعر کی اس صفا خالی کی
دل کا شعر :- ————— تو ہی برقی فریاد کا غول گم دہقان کا

دل کا شعر :- ————— خوشی سے حبیب میر بھی نہیں جوتی ہے
دل کا شعر :- ————— تو ہے دل میں ملنے سے ذرا تسکین جوتی ہے

یہاں دل کی شاعری غزل کی اصل موضوع ہے، غزل کی شاعری ہے جس کے اشعار میں جہان کے تیریاں ہیں۔ آتش اور شاد دونوں کے یہاں اپنے
ہی اشعار کی بہت سے جہاں کا تعلق دل کی کیفیت سے ہے۔ دونوں کے کلام کے لیے کہتے ہیں، آتش کہتے ہیں :-

یہاں دل کے لیے آگ گشتیں ————— کر کے دہلی کی شاعری کے لیے آگ گشتیں

خوش سے اپنی مسروانی گوارا ہو نہیں سکتی
 صبر علی دامنِ غبار، گلِ تر گیس سے
 وعدہ خطراتِ یار سے کہیو پیام بر
 تری ستارِ آنکھوں کی دگر دوش کا اثر دیکھا
 یہ آرزو تھی تجھے گل کے رو برو کرتے
 پڑھ رہے ہم نے بھی قرآنِ قسم، یہ قرآن کی
 کوئی سی شب ہے جو رو بہ کے نہیں کشتی ہے
 فسادِ رنگِ یار کیا کہئے،
 چشمِ دامحرم کو برقی حسن کر دیتی تھی بند،
 اب شاد کے کچھ اشعار سنئے :-

ابھی بہت دل میں ہیں امیدیں تیرے پہلے صبر سے م نہ جائے
 اب اس کا ذکر کیا، قاصد پہ جو گزری غور نے دو
 ہم باغ میں ناحق آئے تھے بیل کی حکایت کیا کہتے
 خزاں میں سو گوار باغ جب فریاد کرتے ہیں
 تنہاؤں میں اچھایا گیا ہوں،
 چشمِ یس میں سرسبز، زلفِ رسا میں شاد کر
 خیالِ وصل کو اب آرزو جھولا جھلاتی ہے
 اب بھی اک عمر چہ جائے انداز آیا
 زمانہ آرزو کا جا چکا اب آرزو کیسی،
 کچھ پہ پہ آٹھ آٹھ کے تیریں تاک رہ گئی سجدہ پہ سجدہ
 جذبِ بیل کھینچنا ہے اک طرف یکسو صبا،
 میں حیرتِ صبر کا ادا قماروش کھڑا ہوں ساحل پر
 مرفانِ قفس کو پھولوں نے اسے شاد کہلا بھیجا ہے

کالی کالی وہ گٹھائیں وہ چہیوں کی پکار
 اب کے سادہ بھی ہمارا بونہیں روئے میں کٹا

دھیمی دھیمی وہ پھوار
 کیا کہیں چپ کے سوا

سید شاہ عطاء الرحمن عطا ماری

(باقی)

علی غازی رنگ سے حاصل رنگ اس طرح پر کیا جاتا ہے "ع"

عہ خضابی سے بیہوش ہیم کران بے شکشہ چہیہ رخ

خداوند نے ہر دے کی وہ لکھتیں رقم "ع"

موجودہ ادیبوں و شاعروں سے آزاد ہندوستان کا مطالبہ

ہمارے ہندوستان جو اپنی حقیقت کے لحاظ سے حیدریت کا مکمل مظاہر ہے۔ دشت دور کی، خونریزی و مفاہ کی اس کی ذات سے لپٹی ہوئی ہے۔ آج کل اور بھی کچھ فرقہ پرستی، جنگ کے اعصاب میں غمراہی، کھنچاؤ پیدا کر رہا ہے۔ اسی لئے جو قومیں اور ملک ایک دوسرے کے خلاف اسلامیت پر لگے ہوئے ہیں، ان کی نفسیات، حیوانی خصلتوں کی حامل بن جاتی ہیں۔ ان کے جذبات میں پسماندہ خشتی پیدا ہو جاتی ہے۔ انھیں غم کی چابی لگ جاتی ہے اور ان کے سر پر سے برہمچاری کا لٹکا لگتی ہے۔ مختصر نظروں میں حرب و حربہ کی آگ بھڑکانے والوں کا اخلاقی مزاج بالکل ہی بگڑ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اس غیر ذمہ دار کے خاتمہ کے بعد بھی ان کا یہ رنگ طبیعت بدلتا نہیں۔ مزاج کا یہ تسکین بخش بھوسوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور سماج کے تعلیمی نظام کو مختلف گوشوں سے خراب کر رہا ہے۔ اس طرح ہمارے چاروں طرف ایک "وائرڈ فیڈ" (Wireless) کا قیام ہو جاتا ہے جس کا توڑنا بہت ہی دشوار ہوتا ہے۔

اگرچہ خوش قسمتی سے ہندوستان براہ راست دوسری آتش بارجنگ عظیم میں شریک نہیں ہوا تھا اور انگریزوں کے جاہل تسلط سے آزاد ہونے کے لئے اسے "برہم اور شانتی" کے مجسمہ جہاں تاناکا دھرم کی رہنمائی میں عرصہ دراز تک جو شاندار کامیاب لڑائی لڑی اس میں بھی اس نے اپنے مخالفوں کے خلاف مادی طور پر جنگ نہیں استعمال کی بلکہ خود رضا کا ذریعہ طور پر زخم کھا کر جیل جا کر بندو قوں کا نشانہ بن کر آزادی کی منزل حاصل کی لیکن اس کے باوجود حیوانیت و دسرت جیت پزیر طاقتوں نے ہم پہلے ہی سے ظالم شہنشاہیت کے ظلم و ستم میں انسانیت کا کلیہ طور پر ٹکڑے کر دیئے والی سازشیں طیار کر رہی تھیں، گاندھی جی کی اتروہ پیم اور فتنہ کی بغض آمیز گردی۔ پیم آزادی پزیرہ اگست ۱۹۴۷ء سے کچھ پہلے ہی انھوں نے فتنوں کی دہلی ہولی چنگاریاں آسمان سے باتیں کرنے والے شعلوں میں جلیجی اور وہ ہاتھ جو آزادی کی جنگ میں حاکموں کے خلاف نہیں اٹھتے تھے وہ نہایت دشمنانہ طور سے اپنے بھائیوں کے حلقوں میں بڑھتے گئے مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے گٹے کاٹے اور ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کی گزریں کاٹیں، ایک دوسرے کے معصوم بچے قتل کر گئے، ایک دوسرے کی بیویاں اور بیٹیاں کی ہتھیاریوں پر ڈکے ڈکے۔ ایک دوسرے کا مال و متاع لوٹا اور ایک دوسرے کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جس سے انسانیت کے دل میں ہزاروں ناسور بڑھ گئے۔ فرقہ پرستی میں غمراہی اور جمہوری طاقتوں نے تباہی کی جنگ کا جو آتش کدہ روشن کیا تھا، اس طرح ہمارے انسانیت کو سہواً دینے والے اس کے چند شے اس میں آتش کی سبز سیڑھی کھینچ گئے۔ اگرچہ پیم اور شانتی کے جہاں تاناکا دھرم جی نے اس غمراہی کی آگ کو بہت کچھ اپنے لئے نہا کر چھینٹ لیا ہے۔ جہاں ایک ایک اس میں بھی شعلہ نہیں کھاتے عرصہ میں اس دشمنانہ فرقہ پرستی کی جنگ نے ہمارے دل بگاڑ دیئے۔ ہمارے دل میں بھی بڑا سا سیخو برادر دریا جاری ہے جس کی تصویر مسخ کر دیا۔ ہمارے بڑے بڑے سیاسی مفکرین کے خیالات بنیادی مسائل میں صاف نہیں رہے، تنگ نظری نے تاریکی کا لہر ان کے ارد گرد پیدا کر دیا۔

ان تمام باتوں کے عمل اور رد عمل کے نتائج کی وجہ سے ہمارے سامنے ہے وہ یہ کہ کوئی کھسوت کا ہر ذوق پہلے جا بجا تھا وہ طبقاتی اور مذہبی نفرتوں کے ساتھ ساتھ ابھر کر سامنے آیا ہے، قریب قریب ہم میں سے ہر شخص کی خواہش ہے کہ کوئی کام مل دے اور اپنی خود غرضی کے دامن میں سمیٹ لے۔ خواہ اس کے لئے ہمارے ہزاروں، دھوت جیوانی فرقہ بندی و غیرہ وغیرہ جیسے قابل نفرت اعمال کا مرکب ہوا پڑے اس کا خیال کے بغیر کہ ان تمام باتوں کے نتیجے میں اصل کی پہلی آزادی کی تعمیر کی ضرورت ہو رہی ہے، ہمارے قومی کردار کا مزاج میں بااہمیت کی غمراہی ہے۔

بالکل واضح بات ہے کہ اگرچہ ہمارے گمراہی کے بعد سے ہماری گزریں بڑھ گئی ہیں، استبداد کے قبضہ میں نہیں رہی ہیں، تمام ہمارے قاتلوں آزادی کی یہ آخری منزل نہیں ہے۔ ہمارے ہر گمراہی کے بعد سے ہمیں جس پرست آگے جانا ہے۔ صرف ہندوستان بلکہ ان کے قومی دینا کی جتنی آزادی میں تبدیل کر دے۔ گوڈ گمشدہ ہمارے لئے ملک و سرزمین کا استبداد کے غیر جہاں کی اور فرقہ پرستانہ اور مختلف شکر پرستی کی قربان

نکل سکے ہیں۔ مختصر مفقود میں انسانیت کے لئے موجودہ ناسازگار حالات کی موجودگی میں اس وقت ادیب و شاعر کے لئے ضرورت ہے ایسے ادب و شعری تخلیق کی جو جاسے ہر عام میں انسانیت کے ساتھ انسانیت کا شعور پیدا کرے جو اس کے ذہنوں میں یہ آواز دے کہ اس کے موجودہ سیاسی و اقتصادی و فکری و اخلاقی و روحانی بیماریوں کی اصلی وجہ انسانی اقدار کا پُر غلو اس احترام ہے۔ اس کے لئے اسے مذہب کی سکون بخش دامن آفریں قدوں پر زور دینا پڑے گا لیکن وہ اپنے حلقہ میں انسانیت کو مختلف خانوں میں بانٹنے والی مذہب ناچار عائد رکھوں گے۔ انسانیت دوست ادیب کبھی یہ نہیں سمجھتا کہ اس کا غور و "وصل" ہے "فصل" نہیں۔ انسانیت دوست ادیب سماج میں اقتصادی و معاشرتی عدل و انصاف پیدا کرنے والے نظام اور اس کی طرف توجہ والے مقدمات کو لگے لگاتے لگاتے ایسی چیزوں سے رشتہ کسی صورت سے نہیں جوڑ سکتا جو انسانی اخلاق سے ریگانہ دار گزر جاتا ہے اپنے لئے طرہ امتیاز سمجھتی ہیں اور جو ادبیت کو اڑھٹا بچھوٹا بنا کر سماج کا جحان "یک رخا" بنائے دے رہے ہیں۔

جاگیر داری و سرمایہ داری کی مجرمانہ بدعنوانیوں اور دوست درازیوں نے اس طرف اپنے رد عمل کے طور پر ہمارے شعرو ادب کا مزاج بہت کچھ "انقلابی" بنا دیا ہے اور اس کا ستم چھوڑنے کے بجائے بیشتر انکار سے اگلے راہ ہے اس نتیجے پر دست و عمل چکان و آتش بردہاں ادیب و شاعر کی بنیاد انتقامی جذبات پر ہے اور ایسے "ادی فلسفہ" پر جو اخلاق و مذہب سے قطع تعلق پر مہر ہے اور جو تمام ادب و شعر کو سرخ سیاسی غرکوں کا نقیب بنا دینا ضروری سمجھتا ہے اب خواہ اس طریقہ سے اُسے خون کے تیز دھارے ہی پر کھول نہ بہنا پڑے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اس "ادی فلسفہ" سے ہمیں ایک قسم کا ایسا مادی شعور تو مل سکتا ہے جو اپنی حدود میں ایک حد تک کامدہ سہی لیکن موجودہ آزاد و ہندوستان میں جو سماجی بیماریاں ابھر آئی ہیں اور جن میں پہلوؤں سے اُن کا پھیلاؤ بڑھتا جا رہا ہے اُن کا اس سے علاج نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں آگ اور غولی پر سنانے والے ادیب کی جگہ جب تک کہ "انسانی شعور" پیدا کرنے والا ادیب نہیں لے لیتا ہمارے قومی کردار کا نقشہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ یہ انسانی شعور حاصل ہو سکتا ہے ادبی و روحانی شعور اور اقتصادی و اخلاقی شعور کے متوازن اجتماع سے یہی متوازن اجتماع ہم دریا ہے عام انسانی خوش حالی اور عام انسانی آسودگی کو۔ اسے سمجھنا نہیں چاہئے کہ ادبیت اور روحانیت جب تک کہ ایک دوسرے میں غلط فہم ہو کر صحت مند مذہبیت کا لباس پہن نہیں لیتے انسانیت کے مقدس صحیفہ کے اوراق تیز و تھکلا پی ہو اؤں گے نہیں سکتے۔ اور ہندوستانی سماج میں صالح رجحانات پیدا نہیں کئے جاسکتے۔ میں اس عقیدے کے تحت موجودہ ناسازگار حالات میں اس خیال کا پلہ بار بار عائد ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ روایتی حسن و عشق کے چھستان ہی کے گل آفت میں محو رہیں اور گلاب کے تنقوی ہی میں اپنے شاعرانہ خوابوں کے رومانوی گنبد بننے کے بیٹھ بیٹھ کیوں کہ اس کی نوعیت میدانی جنگ سے بھائی کر شہستان میں چھپ رہے ہیں۔ روم چل رہا ہو اور نیرو بائسری بجاتا رہے۔ اسے برداشت نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح نہ کوئی دانشمندی کی بات ہے کہ صرف آگ اور خون کی شاعری میں اپنی زندگی کے قیمتی دن ختم کر دے جائیں۔ اس سے زندگی میں عام جوانی کیفیت پیدا ہو کر اجتماعی نفسیات زبردست اور ارتقا کی رفتار ٹیڑھی بیڑھی ہو جاتی ہے۔

دوسرے فظوں میں زیادہ صاف طور پر یوں سمجھئے کہ مختلف ناسازگار حالات کے داؤنے ہمیں جس زہن حالی کے شکنجوں میں گرفتار کر دیا ہے اور ہماری کیرتن جس قدر گھنٹی بنا دی ہیں اُس کا علاج دقہ بہ دقہ کہ نہ دفر سے وہ ادب کی تخلیق ہے اور وہ مقامی حالات کا لگا لگے بیڑہ سوں کی کسی خاص مادی "زم" کو مستعد کرے کہ اس کی آٹھی سیدھی ترخانہ کوئی نہ اور "اس خواہی" کے دھوڑ کے پردے میں جنگ و حرب کی خضا پدا کر دیتا۔ بلاکس صورت حال کا اصلی دربان ایسے انکار و خیالات کو ادبی و شعری فظوں میں ڈھانسا جن پر انسانیت پسندی کا گہرا سٹھا لگا ہوا جو اپنے پس منظر میں صحت بخش مذہب و صحت مند اخلاق کا پُر غلو اس احترام رکھتے ہوں۔ ایسے ہی انسانیت دوست ادب و شعر کے سرخ شہنوں سے پریم اور شاعری آہن اور محبت کی وہ غمخیز پھوٹ کر سکتی ہیں جس سے ایسی رنگا رنگ اور عواموں کی خونریز جنگوں کے آتش کو بجھ جائیں اور دنیا کے قدم عام خلاصہ آسائش کی منزل کی طرف بڑھ سکیں۔

اصل یہ ہے کہ میں طرح مسخیں اور پتھر کی "کلیت پست نامزم" سے انسانیت کو کوئی فیض حاصل نہیں ہوا بلکہ اُن کے جبر و تعدی نے اس کے دل میں گہرے گھاؤ ڈال دیے اس طرح دوسرے موجودہ کیرتن کی جہان دہی کے نظام بھی اس کے زخموں پر مزید نہیں رو سکتے

سرقہ، توار، استفادہ

خودِ حد درجہ تنوع پسند واقع ہوئی ہے اور انسان جو مگر قدرت کا سب سے بڑا شاہکار ہے، اس نے وہ جدت و تنوع کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ جس طرح دو آدمی صورت و شکل میں ایک دوسرے سے نہیں ملتے اسی طرح عادات و خصایل وغیرہ میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ جانوروں کی حالت یہ ہے کہ ایک جنس کے تمام جانور یکساں عادت رکھتے ہیں۔ برعکاس اس کے انسان سب ایک ہی جنس میں گران میں باہمی اس قدر امتزاج ہے کہ کوئی دو آدمی آپس میں ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ جس کا سبب وجدان و ضمیر کا امتزاج ہے اور اسی لئے کہ ہر شخص اپنی مخصوص و منفرد بصیرت یکسر پیدا ہوتا ہے اور اسی کے ذریعہ اثر و فطرت و کائنات کا مطالعہ کرتا ہے۔ جس کی نظر سطحی ہوتی ہے وہ معمولی انسان سمجھا جاتا ہے، جس کی نظر عمیق گہرائی ہے وہ فلسفی، سائنسدان یا حکیم کہلاتا ہے اور اگر وہ اپنے غور و فکر کے نتیجہ کو دلفینین اسلوب اداسے بیان کر دیتے ہر قادر ہے تو وہ شاعر ہے۔ ایک فلسفی یا حکیم سامع کے دماغ کو مخاطب کرتا ہے اور ایک شاعر سامع کے دل یا صحیح تر الفاظ میں جذبات کو مخاطب کرتا ہے۔ لیکن جس طرح ایک سلاطنت و فلسفہ بغیر شاعرانہ انداز بیان کے شعر کی صفت میں جگہ نہیں پاسکتا اسی طرح صرف رنگین بیانی بغیر تخلیق کی گہرائی کے شعر نہیں کہی جاسکتی۔

اسلوب اداسے کا ایسا لازمی جزو ہے کہ شعر کی تمام عمارت اس پر قائم ہے۔ یہ اسلوب اداسے کا اہم کامیالات تھا جس کے باعث تشبیہ و استعارہ کا ایسا مستقل فن بن گیا۔ مولانا عارفی کہتے ہیں:-

بادہ حدیث جانوں دیگر ہمہ حکایت
مولانا جاتی سے سے و شاہد کے معنی سنئے، فرماتے ہیں:-
سے جہیت؟ جذب عشق کہ بدرا و نیک را
دوسری جگہ خرابات کی تفصیل کرتے ہیں:-
خواہی ز سب و کس و خواہی ز سب و کس
جاتی ز خرابات بود بادہ عشقت
اس سے زیادہ واضح الفاظ میں شیخ سعدی فرماتے ہیں:-
دانند کہ نالیدن لمبل کچہ اء
آنا کہ برانند پریشانی عشاق
گویا سعدی نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ شعر میں لمبل کے نالہ سے شعور کا کیا عطا ہوتا ہے۔ اسی بات کو نظیری نے کہا ہے:-
نیرت از بخش نظیری گر شکایت می کنم
مولانا جاتی گل و لمبل کی داستان کی تشریح یوں کرتے ہیں:-
شرح این قصہ ننوشته ز لمبل بشتو
ہر کس از دفتر گل فہم معانی نکند
اس مضمون کو سچہ دہراتے ہیں اور زیادہ زور دار انداز میں:-

ہر دم ز دفتر گل خواہد ببارغ لمبل
حرفے کہ شرح دادن نتوان بصد رسالہ
عبدالکبری کے ملک اشعار فیضی نے ایک قصیدہ میں ”بت“ اور ”برہمن“ کے جو معنی ظاہر کئے ہیں قابل غور ہیں:-
شکر خدا کہ عشق بتاں است رہبرم
بر ملت برہمن و بر دین آرم
بت جہیت؟ رخ گلشنه معنی ہمیں
کاندر کلیسیائے ضمیر سست مضمرم

(فیضی)

استاد برہنہ کہ زہت خاد خیال
در سجدہ حضور فرد آور دسوم
تشیبہ واستعارہ کا استعمال شعر میں کیونکر اثر پیدا کرتا ہے، اس کے متعلق حضرت عانت رومی فرماتے ہیں کہ:-
خوشتر آں باشد کہ ستر دلبران
گفتہ آید در حدیث دیگران
مرزا غالب نے اس کو بالکل صاف صاف کہہ دیا ہے کہ:-

مقصود ہے ناز و غرور کے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشمنہ و خیر کے بغیر
ہر چند ہر مشاہدہ حق کی گفتگو
بقی نہیں ہے باد و ساغر کے بغیر
لیکن مرزا نے اس کی وجہ نہیں بتائی کہ مشاہدہ حق کی گفتگو میں بغیر باد و ساغر کے کام کیوں نہیں چلتا۔ اس کی تشریح علامہ اقبال سے سنئے:-

برہنہ صحت گفتگو کمال گویائی ست
حدیث خلوت ہاں جزو رمز وایا نیست
الغرض شاعر کے لئے زبان و بیان اور اسلوب ادا کو خاص طور پر شکادہ رکھنا بحد ضرورت ہے لیکن تکمیل میں اگر عذرت اور ہمدی موجود نہ ہو تو بیان کی
نگین بالکل بے نتیجہ ہے۔

کائنات کے رموز و غوامض پر غور کرنا فلسفہ کا موضوع ہے، حقیقی شاعر کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ شاعری کا موضوع دراصل یہ ہے کہ انسان
کا تعلق کائنات سے کیا ہے۔ ایک فلسفی فطرت کے خزانوں و ذخائر کھود کر نکالتا ہے اور ایک شاعر ان کو نباتات تازہ عطا کرتا ہے ایک فلسفی اور شاعر کے مطالعہ کا ثمر
میں یہ فرق ہے کہ فلسفی بعض مخصوص اصول و نظریات کو سامنے رکھ کر کائنات کا مطالعہ کرتا ہے اور شاعر صحت اپنے وجدان و ضمیر کو اپنا رہبر بناتا ہے اور یہی وجہ
کہ فلسفی کے بیانات میں اتنا تضاد نہیں ملتا، جتنا تضاد و اختلاف قریب قریب ہر شاعر کے کلام میں ملتا ہے، کیونکہ جذبات میں ہر وقت مختلف قسم کے تغیرات پیدا
ہوتے رہتے ہیں اور اس لئے شاعر کی واردات بھی مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ اسی لئے شیخ سعدی کو کہنا پڑا کہ:-

گنجے بر طارم اسے انشیم ، گنجے بر پشت پائے خود نہ بینم
خواجہ حافظ کا شعر ہے :-

حافظ عشق و صابری ماچند
دوسرے شعر میں خواجہ خود ہی اس کی تردید بھی کرتے ہیں کہ:-
مرا و قلمت سلطان عشق می دادند
نواز دند کہ حافظ خوش باش خوش
اسی طرح نظیری کا شعر ہے کہ:-

آہ کہ عاشق کشد از خامی ست
دود کند دل چو نباشد کباب
پھر خود ہی اس کی تردید کی ہے کہ:-

خاطر بخندہ گل دل دامن شود ، غیر از گریستی غم دل را علاج نیست
پہلے کہ شعرا کے بیانات میں بہت کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہر شاعر کی اپنی مخصوص انفرادیت اس کے پورے کلام میں موجود
دنیائیں ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ شاعر کوئی ایسی انوکھی بات نہیں کہتا جو غیر متعارف ہو کہہ سکتے ہوں، لیکن اس کے باوجود شعر کی برابر اثر کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے اور اس کا
سبب صحت اسلوب بیان ہے اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ کام تشبیہ واستعارہ سے لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر گل و بلبل کی داستان کو لے کر اسکے ذریعہ
سے کتنے مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ بلبل کے ساتھ عشق کی ایک کیفیت وابستہ ہے اور شعر میں صحت ایک بلبل کا ذکر کر دینے سے وہ تمام حالت سامنے آجاتی ہے
جیسا کہ شیخ سعدی نے واضح کیا ہے کہ:-

آہا کہ برانندہ پریشانی عشاق ، دانند کہ نالیدی بلبل بچہ نامد

اسی طرح گل کے ساتھ حسن کی ایک پوری داستان وابستہ ہے۔ خواجہ دیر گھنوی کا مشہور شعر ہے :-

ہوں وہ بیل جو کرسے ذبح خفا تو ہو کر روح میری گل عارض میں رہے بو ہو کر

اس شعر میں جو مضمون گل و بیل کی داستان کے ساتھ ملا کر ظاہر کیا گیا ہے اس کو کسی دوسری طرح کہیں تو وہ لطف باقی نہیں رہ سکتا۔

غالب کا شعر ہے :- ربابیک شیرازہ وحشت ہیں اجزائے بہار سبزہ بیگانہ صبا آوارہ، گل آستانہ

سبزہ کے لئے بیگانگی۔ صبا کے لئے آوارگی۔ گل کے لئے آستانہ محض روایاتی باتیں ہیں، لیکن غالب کے اس شعر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان روایات کو شعر حقیقت سے کیونکر جوڑا کرتے ہیں۔ یعنی بہار کا زمانہ ہی جنوں کے جوش کا زمانہ ہوتا ہے اور بہار کے اجزاء بھی سبزہ و گل اور صبا ہی ہیں اور ان تینوں کے صفات یہی جو جنوں کی خاص کیفیات ہیں یعنی بیگانگی، آوارگی اور آستانہ۔

تشبیہ و استعارہ کے استعمال کے سلسلہ میں سترھویں صدی کا ایک انگریزی شاعر میٹھو پرائر (Matthew Prior) کہتا ہے کہ :-

Similies are like song in love

They much describe, they nothing prove

یعنی تشبیہات ایسی ہی ہوتی ہیں جیسے کہ نعت کے گیت کہ وہ بیان قویہت کچھ کرتے ہیں لیکن ثابت کچھ نہیں کر سکتے۔

تشبیہ و استعارہ نہایت مفید ذریعہ ہے جس سے کلام میں زور اثر دینی اور وسعت پیدا ہوتی ہے اور اس کو ابھی اور زیادہ وسعت دینا پڑے گا اس کو تاہم نظری کا کیا علاج کر ایسی مفید اور ضروری چیز کو سرقہ کی پابندیوں میں جکڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تشبیہ و استعارہ میں سرقہ کرنے کے سلسلہ میں آزادانہ آب حیات میں میر تقی میر اور بقاؤ اللہ خاں بقا کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ بقائے یہ شعر کہے

تھے :- (۱) ان آنکھوں کا نت گریہ دستور ہے دو آہ جہاں میں یہ مشہور ہے

(۲) سیلاب آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں ٹکڑے جو مرے دل کے بٹتے ہیں دو آہ میں

میر صاحب نے بھی اسی دو آہ کے مضمون کو لکھا :-

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی تیاں تھیں سوکھا ہوا پڑا ہے موت سے یہ دو آہ

بقائے اس کو سرقہ سمجھا اور حسب ذیل قطعہ کہا :-

میر نے گرتا مضمون دو آہ کا لیا اے بقا تو بھی دُعا دے جو دعا دینی ہو

یا خدا میر کی آنکھوں کو دو آہ کر دے اور میری کا یہ عالم ہو کہ تر ہینی ہو (آب حیات صفحہ ۲۷۲)

لیکن میر صاحب کی جلالت شان مسلم ہے اور یہ یاد کرنا مشکل ہے کہ اس معمولی سے مضمون کے لئے میر صاحب نے سرقہ کرنے کی جرأت کی ہو تاہم چونکہ ہمارے سامنے ایسا کوئی اصول مسلمہ موجود نہیں ہے جس کی بنا پر ہم میر صاحب کو اس سے بری کر سکیں اس لئے بقا کے خیال کی تردید بھی مشکل ہے مگر جب زیادہ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بقائے اس کو سرقہ کہنے میں سخت غلطی کی اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ میر صاحب نے بقا کا شعر سننے کے بعد ہی اپنا شعر کہا ہے تب بھی اس کو سرقہ کہنا چاہئے۔ علامہ شبلی ظہیر غازی بانی کے اس شعر کو

اندر شہ کہم شود از لطف در ضمیر گردوں یہ راز باکرت در میاں نہاد

کے متعلق فرماتے ہیں کہ :- ”متاخرین نے کر کے قریب میں نہایت دقت آفرینوں کی ہیں یہاں تک کہ کو ایک لطیف خیال۔ ایک باریک مضمون۔ ایک موہم تصویر کہتے ہیں۔ ان سب خیالات کی اصل یہی ظہیر کا شعر ہے“ (شعراجم جلد ۷ ص ۷۸) اگر بقا کے بیان کردہ سرقہ کو تسلیم کر لیا جائے تو ظہیر کے اس تصویر سے تو تمام شعر نے ابعد بقول مولانا شبلی استفادہ کیا ہے اور اس طرح ایک شاعر بھی سرقہ کے الزام سے بچ نہ سکے گا۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہیں

صرف ایک ظہیر کے اس شعر پر کیا منحصر ہے بلکہ ہزاروں تشبیہات ہیں جو اردو و فارسی میں مستعمل ہیں اور سب شعرا ان کی کساں استعمال کرے ہیں پھر کیا وہ سب سرقہ کے مجرم ہیں؟ کیونکہ ان کی ابتدا بھی مختلف زمانوں میں مختلف شعرا ہی کرتے رہے ہیں۔ اس لئے استعاضات۔ تشبیہات اور کثافت

کے بیان میں سرقہ کا سوال کس سے پیدا ہوا نہ ہونا چاہئے اور اس کا سبب یہ ہے کہ شعر میں اصل مضمون کو دوسرا ہی ہوتا ہے استعارات و تشبیہات وغیرہ
رکھنی ضرور اور تاخیر نہ کر کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ گویا شعر کے لئے توجہ بھی ہنر و الفاظ کے ہیں۔ جس طرح الفاظ میں سرقہ نہیں ہو سکتی اسی طرح
استعارات و تشبیہات و کنایات میں سرقہ کا خیال ہی غلط ہے۔ شعرا نے زلف کے لئے مار۔ پیشانی کے لئے لوح سیمیں۔ ابرو کے لئے خنجر مرگالی کے لئے تیر۔
چشم کے لئے نرگس۔ دھماکے کے لئے گل۔ دہن کے لئے نقطہ۔ دندان کے لئے موتی وغیرہ کی تشبیہات استعمال کی ہیں۔ پھر کہ اس کو سرقہ کہا جا سکتا تو حافظ
ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جو کسی شاعر پر بذلیہ وحی آسان سے نازل ہوئی ہو بلکہ انسانی دماغ ہی نے ان کو پیدا کیا اور ایک سے دوسرے
نے اخذ کر لیا۔ اگر دو آہ کا مضمون تیسرے صاحب نے قصداً و اراداً بھی بقائے شعر لیا ہو، تب بھی اس کو سرقہ کہنا چاہئے کیونکہ اصل مقصد دو آہ کا ذکر
نہیں ہے بلکہ فرق محبوب میں اپنی ویرانی کا ایک احوال پیش کرنا ہے۔ خواجہ حافظ کا شعر ہے :-

آئینہ سکندر جام جم است بشکر
تذییر تو عرضه دارد احوال ملک دارا

اس شعر میں ”میتھ سکندر“۔ ”جام جم“ اور ”حک دارا“ کا بیان خود مقصود ہاؤت اشیا نہیں ہیں بلکہ شاعر جو بات ذہن نشین کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ان استعارات سے کام لیکر مضمون کو زیادہ پراثر، زیادہ دلگین و لطیف بنایا گیا ہے۔ خواہ عاقل ہی کا ایک اور شعر ہے :-

چندال بود در شمع و ناز سہی قدای
کایہ بجلوه سر و صنوبر خرام

اپنے محبوب کے لئے ”نرد صنوبر خرام“ اور دیگر جیغیاں جہاں کے لئے ”سبھی قدان“ کے جو الفاظ اس شعر میں آئے ہیں ان کا بیان اصل مقصد نہیں ہے بلکہ اصلی مقصد اپنے محبوب کا تمام دیگر حسینوں پر تفوق ظاہر کرنا ہے۔ ان الفاظ نے کلام میں شگفتگی و تاثیر ضرور بر بھادی۔ خواجہ نصیری کا شعر یہ:

ابرو در کشتش ہمارہ مڑگاں در زدن تہ کے بر دل خورد ایس دشمنہ ہائے تیز را

محبوب کے ابرو و شہ گال کو ”دشنہ ہائے تیز“ سے جوشیم اس شعر میں دی گئی ہے اس کا استعمال خود کوئی چیز نہیں ہے بلکہ محبوب کے دیکھنے سے چھوڑ دینا
پیدا ہوتا ہے اس کے لئے یہ ایک موثر کراہ بیان ہے۔ خواجہ نصیری ہی کا ایک اور شعر ہے:-

بل در امید مریم و دل آهوان مست ریزند بر جراحات ماشک سوده را

کیا کوئی پرستگار ہے کہ نظیرِ ی کا اصل مقصد آدمیوں میں "اور" مشکِ سرور کے الفاظ کا استعمال تھا لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان الفاظ نے کلام میں زور پیدا کر دیا۔

ان مثالوں سے یہ امر ظاہر کرنا مقصود ہے کہ تشبیہ و استعارات چونکہ خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں ہیں اس لئے ان میں سرکہ کا خیال ہی سرے سے غلط ہے اور جب یہ تشبیہات و استعارات خود مقصود بالذات بن جاتے ہیں تو اصل شاعری ہی ہو جاتی ہے جو محال آریخ اور اس کے کاغذ و رہ متبعین کا ہوا۔ وہ شاعری نہیں صرف لفظی ہے۔ وہ ایک بے جان مجسمہ شعر ہے جس سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا و خود آریخ کی کوئی خدمت انجام پاتی ہے۔

تنبیہ و استعارہ میں سرتہ کے لئے شمس الدیہ فقیر دہلوی حواشی البلاغۃ میں لکھتے ہیں کہ: "باید دانست کہ اتفاق قائلین عموماً داغ و خراہ از
افراض مثل آنکہ شخصے را بشیاعت یا سنیات یا غیر آئی ستایش نمایند یا بضد این صفات مذمت کنند داخل و درود و سرتہ نیست چه این معنی در مقول و عادات
کاذا تا سرتہ قرار دو نصیح و غیر نصیح جمع دین امور شریک اند او چہ کہ دلائل بر حق عرض می نماید مانند تنبیہ و استعارہ و کنایہ و نظائر بکن سرتہ و دلالی
و چہ داخل می نماید پروردگار بجز از تنبیہات و استعارات کہ از غایت شہرت در مقول و عادات استقرار یافت باشند و علم غرض مذکور پیدا کر دہ مثل تنبیہ شجاع
اسد و چہ از بد و یا شاہد آن" حواشی البلاغۃ صفحہ ۱۶۱ اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ جو کچھ خصائل کو عام طور پر قابلِ مدح یا ملامت مذمت تصور کیا جائے
و چہ انکی مدح یا بجز اگر ایک شاعر نے کی ہے اور کبھی کسی دوسرے نے بھی کی تو وہ سرتہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص کوئی تنبیہ یا استعارہ وضع کرے اور
کبھی اس کو استعمال کرے تو وہ سرتہ میں شمار کیا جائے گا لیکن اس میں وہ تنبیہات و استعارات شامل نہیں ہیں جو عام طور پر فلاح
نہیں ہیں۔

کوئی تشبیہ یا استعارہ کسی شاعر پر آسمانی سے نازل نہیں ہوا ہے بلکہ سب انسانی و ماضی ہی نے پیدا کیا ہے اور ان کی اشاعت و رواج بھی اس طرح ہوا ہے کہ ایک کے بعد دوسرے نے ان کو استعمال کیا اور کثرت استعمال کے باعث ہی ان کی یہ حالت ہو گئی کہ ان کاغایت شہریت و عقل معادلات استقرار یافتہ باشند۔ اگر یہ صحیح ہے تو نئے استعارات و تشبیہات پر پابندی عاید کر دینے کی کوئی معقول وجہ ہونا ضروری ہے۔ جو کچھ پچھلوں نے کیا ہے بعد کے آنے والوں کے لئے اس پر امتناع کے سلسلہ میں اصولی طور پر دلیل و برہان کی حاجت ہے۔

میرٹس الکرین فقیر جو کچھ فرماتے ہیں ہمیں اس کی اتباع سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ اصولاً درست ہے بھی یا نہیں۔ جو خیال مدایق البلاغت کی سند و عبارت میں پیش کیا گیا ہے وہ اصول پر مبنی ہے کہ تشبیہ و استعارہ و کنایہ ہی وہ چیزیں ہیں جن سے کسی شعر میں شعریت پیدا کی جاتی ہے اور اس لئے کسی ایک شاعر کی ایسی کاوش کو جو صرف اس کے اپنے دماغ سے پیدا ہوئی ہے کسی دوسرے کو استعمال کا حق نہیں ہے اگر کوئی ایسا کرے تو وہ سرقہ ہے لیکن اگر اسی قصہ کو اور وسعت دی جائے تو معلوم ہوگا کہ جس چیز کو سرقہ کہا گیا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔

(۱) تشبیہ و استعارہ ایک شاعر جس مضمون کے ساتھ بیان کرتا ہے دوسرے شاعر بھی اس کو اسی مضمون کے ساتھ بیان کرے، چاہے الفاظ کا رد و بدل ہو جائے (ب) تشبیہ و استعارہ کو ایک شاعر جس مضمون کے ساتھ بیان کرتا ہے دوسرے شاعر بھی اس تشبیہ کو کسی دوسرے مضمون سے متعلق کر کے بیان کرے۔

پہلی صورت میں سرقہ تشبیہ و استعارہ کا نہیں بلکہ اصل مضمون کا جو اس کی بحث آگے آگے کی۔ اور دوسری صورت میں وہ سرقہ ہی نہیں بلکہ ایک دوسری ہی جدت ہوئی جو خود قائلین و ناقدین کی نظر میں بھی مصیوب نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ مثال کے طور پر اس بقا اور تیسرے واقعہ ہی کو دیکھ لیجئے کہ بقا بقا غلاقہ دو آب کی تری سے یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ میری دونوں آنکھوں سے بھی اسی طرح ہمہ وقت آتش نکل کر رہے ہیں جو حالت دو آب کی ہے پہلا شعر تو ایسا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف دو آب کی تشبیہ بیان کرنے کے لئے ہی شعر کہا گیا ہے لیکن دوسرے شعر میں یہ نقص تو نہیں ہے تاہم مضمون اس کا بھی وہی ہے جو پہلے شعر کا ہے اس کے بعد میر صاحب کے شعر کو دیکھنا چاہئے۔ اولاً تو میر صاحب نے دو آب کا لفظ مجرد استعمال نہیں کیا ہے پہلے مصرعہ میں ”دیا“ کا لفظ لانے سے مضمون صاف ہو گیا۔ جو بقا کے یہاں نہ تھا۔ یہ تو اضافہ ہوا بقا کے مضمون میں۔ دوسرے میر صاحب کا مضمون بھی بقا سے علیحدہ ہے کیونکہ بقا تو صرف ”دو آب“ کا لفظ لانے کے لئے روئے کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور میر صاحب عشق کے ایک مخصوص احوال کا ذکر کر رہے ہیں جبکہ الساق پر کل ویرانی طاری ہو جاتی ہے۔ بقا کے اشعار میں ”دو آب“ کا ذکر کس قدر نمایاں ہے۔ میر صاحب کے یہاں یہ بھی مضمون کا ایک معمولی جزو ہے۔ دو آب اپنی تری کے لئے مشہور ہے اور اسی کو بقا نے اختیار کیا ہے۔ لیکن میر صاحب اس میں بھی غلطی پیدا کئے دیتے ہیں۔

متقدمین نے جو تشبیہات وضع کیں ان میں سے بعض کو تو زمانہ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اکثر کو قبول عام کی سند عطا کر دی۔ یہی تشبیہات ہیں جو عام زبانوں پر جاری ہیں۔ لیکن اگر مدایق البلاغت کے بانی کو شروع ہی سے اختیار کیا گیا ہوتا تو آج وہ تمام تشبیہات بھی عام نہ ہوتیں۔ دوسرے مقدمین نے صرف معمولی تشبیہات وضع کی تھیں۔ متاخرین نے ان میں سے اکثر پر پوری پوری عمارتیں قائم کر دیں۔ مثلاً جذبہ شوق میں ایک سرور ہوتا ہے اس کے لئے مقدمین نے شراب کا لفظ استعمال کیا تھا لیکن متاخرین نے اس لفظ سے جو کلام لائے ہیں ان کی تفصیل کے لئے ایک علیحدہ تصنیف و کار ہے مرن خواجہ حافظ ہی نے جس مخصوص فلسفہ کی اشاعت میں اپنی ساری عمر صرف کر دی اس کی بنیاد ہی شراب کی تشبیہ ہے جس شخص نے سب سے پہلے اس کو اختیار کیا تھا اس کو اس کی اطلاع دینی کہ آئندہ اس سے کیا کیا کام لائے جائیں گے اور خواجہ حافظ کے فلسفہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے لئے اس سے زیادہ موزوں لفظ ملنا مشکل تھا لیکن اگر شروع سے مدایق البلاغت کے اصول کو اختیار کیا جاتا تو یہ سب نواید کبیر مفقود ہوتے۔ اس ضمن میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن تشبیہات۔ استعارات۔ کنایات یا ترکیبوں میں قبول عام حاصل کر لینے کی صلاحیت ہوتی ہے ان کے لئے قائلین یا ناقدین کوئی اصول وضع کریں نہ ان کا پابندی نہیں ہے وہ شاید اس واسطے ہو کر رہتی ہیں اور جن میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی وہ شعرائے ابدی کے لئے بوجہ بھی زمرہ غریب رہ سکتیں۔ مرزا غالب نے اپنے اس شعر میں:

میں نے کہا کہ ہر دم از چاہے خبر سے تھی

سے مستم طریق نے مجھ کو اٹھا دیا کیوں

(ظاہراً) سب سے پہلے ”مستم طریق“ کی ترکیب استعمال کی ہے لیکن آئی ہے کہ وہ میں ایک عام شایعہ و لاجی ترکیب ہے۔ حالانکہ جہاں تک میں معلوم ہے

مرزا کے بعد اس کو کسی نے شعری استعمال نہیں کیا۔ مگر اس کے باوجود عام طور پر رائی ہو گئی۔ یہی حال تشبیہات و کنایات یا ترکیبوں کا ہے۔ اس وجہ سے ان کے لئے کوئی ایسا اصول وضع کرنا جو زمانہ کے عام اصول کے مطابق نہ ہو وقت اور زمانہ سے جنگ کرنا پسند نہ خود اپنی روش کا پابند نہ تائیں کے اصول و روایات کا پابند نہیں ہے۔ اس لئے تشبیہات و استعارات میں سرقت کو تسلیم کرنا دشوار ہے۔

اس سلسلہ میں اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ بعض تشبیہات یا ترکیبیں اس سے استفادہ کر کے شعرا نے بعد کے دوسری بھی تشبیہات یا ترکیبیں وضع کر لی ہیں مگر ان قائلین نے اس کو بھی سرقت غیر ظاہر قرار دے کر اس کا بھی سد باب کرنا چاہا ہے۔ لیکن اگر اس پر عملدرآمد کیا جائے تو شعری کی تمام ترقی و ترقی رک جائے گی مگر شعرا نے قائلین کے اس اصول کو عملدرآمد نہ کیا اور شروع سے آج تک برا بر یہی ہوتا چلا آیا ہے اور پیشہ ہوتا رہے گا۔

سب سے زیادہ انہوں نے اس امر پر کہ قائلین نے سرقت کے عنوان کو اس قدر وسعت دیدی ہے کہ اگر بظن غور دیکھا جائے تو متاخرین کی تمام کاوشیں سرقت کے ذیل ہی میں آجاتی ہیں۔ سرقت کو دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سرقت ظاہر اور سرقت غیر ظاہر۔ اور پھر ہر ایک کی مختلف قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ سرقت ظاہر کی پہلی قسم انتقال ہے جس کے لئے رسالہ عبدالواسع میں تحریر ہے کہ: "انتقال عبارت است از آنکہ کلام دیگرے را بآئینہ و لفظ و اختلاف مضمون و کلام خود آورد و بحد اقتباس باوجود علم یا کما کراں کلام دیگر است"۔ اور اس کی اکثر مثالیں مجمع الصنائع اور حدائق البلاغت میں درج ہیں۔ بلاشبہ یہ سرقت ہے اور سخت موصوفہ قسم کا سرقت۔ لیکن ہمارے نزدیک سرقت کی اس قسم کو ادبیات سے کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔ صاحب حدائق البلاغت نے خود بھی اس کو محسوس کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ: "و این قسم را شعرا صاحب قدرت و عہد ارتکاب نمی نمایند مگر بسبب توار و خاطر"۔ اور اس کے بعد خواجہ حافظ اور علی حسینی کے دو اشعار نقل کئے ہیں۔ خواجہ حافظ کا شعر ہے:

ز باغ وصل تو یا بہ ریاض رضوان آب ز تاب بجز تو وار و نثار دوزخ تاب
پورا شعر بالکل ای ہی الفاظ میں اور اسی ترتیب سے سلمان ساؤجی کے یہاں موجود ہے۔ دونوں بلند پایہ شاعر ہیں اس لئے یہ کہنا دشوار ہے کہ ایک نے دوسرے کا سرقت کر لیا ہے۔ تزیں کا شعر ہے:-
زلفت بدو گار بجائی آں لب نکی چند ہامشک بزم کرد و بدائع دل مار سخت
یہ شعر لعینہ نقی اودھی کے یہاں موجود ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ جو صاحب قدرت شعرا ہیں وہ اس قسم کا سرقت کرنے کے مرکب نہیں ہو سکتے۔
انتقال کی دوسری صورت یہ ہے کہ "معنی را بتمام اخذ نمایند و جمیع الفاظ را بعض الفاظ را مترادف بیاورند" اس کے بعد تیسرا قسم یہ ہے "معنی را با جمیع الفاظ بعض الفاظ اخذ نمایند و ترتیب نظم را بغیر دہند و این قسم را غار و نسخ نامند و دریں قسم اگر شعر اخذ از ماخوذ نہ ایلج باشد مقبول و مدوح است"۔ چوتھی قسم سرقت کی یہ ہے کہ "معنی را تمام اخذ نمایند و کلمات الفاظ دیگر ادا سازند و دریں قسم نیز اگر شعر ثنائی فیج ترا اول باشد مقبول و مدوح است"۔

جس طرح سرقت ظاہر کی چار اقسام ہیں۔ اسی طرح سرقت غیر ظاہر کی پانچ اقسام قرار دی گئی ہیں جو مختصراً حسب ذیل ہیں:- "اولی آنکہ ہر دو شعر و معنی تشابہ داشتہ باشد و شاعر ماہر آنست کہ در اخذ تشابہ کوشد۔ دوم۔ "آنست کہ معنی شعرائی حاضر و شاعر از اول باشد۔ سوم۔ "آنکہ معنی را از احوال بجا نقل کنند۔ چہارم۔ "معنی شعرائی ضد معنی شعرا اول باشد۔ پنجم۔ "سبب از معانی شعر و کلمہ را اخذ نمایند و چیزے را کہ صورت مزید حسن کلام باشد بر آرد بغیر ایند"۔ آخری قسم کے لئے رسالہ عبدالواسع میں حسب ذیل عبارت موجود ہے "معنی کلام دیگرے را بکلمہ بکلمہ تعارض و کلمات تعارضات حسن بکار برد کہ ہر کلمہ کلام جدید برسد و این از سرقات شعری نیست بلکہ حسن است و این ماوراء اصطلاح ۱۶۱ پہلے ابرار گویند"

سرق اور توار میں فرق یہ بتایا جاتا ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے مضمون کو جب قصداً اخذ کر لیا جائے تو وہ سرق ہے اور اگر اتفاقاً یا سہو سے خود توار دے جیسا کہ صاحبِ حدائق البلاغت سرق کی بحث ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں "باید دانست کہ حکم سرق دہنے ہی تو ان کرد کہ حکم یا خود شاعر حاصل باشد و این اشعار اساتذہ کہ بطریق امثال ذکر شد ممکن است کہ ہمیں ملے تو اسے خاطر باشد" (کتاب ذکر صفحہ ۱۹۸) اس سے بھی زیادہ واضح اور شدید الفاظ صاحبِ مجمع الصنائع لکھتے ہیں کہ "حکم یا خود سرق یا بدینود تا معلوم نبود کہ شاعر وہیم شاعر اعلیٰ بردہ در ہنگام انشاء شعر اور ابتلاواشتہ والامی توان بود کہ از قبیل توار مد خاطر باشد یعنی انجہ بہ ذہن شاعر اعلیٰ خطور کردہ بحسب اتفاق بہ ذہن این ہم خطور نمودہ باشد کمال اسمیں گوید۔"

نکاح توار و خاطر کہ در مجاہدے آں،

نکاح است کہ کس معترض شود ہر دے

دو ماہ رو کہ ہر ایک سمت

عجب نباشد اگر افتد دے ہر دے

و این ابیات امثالہ کہ راقم الحروف جیت اقسام سرق نمودہ کلا و حاشا کہ سرق باشد بلکہ جمیع توار و خاطر است " (مجمع الصنائع نقض غلطی) گوئے سرق کے متعلق سراسر احتمال کے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر قطعی حکم لگایا جاسکے کہ نہ کسی شخص کے قصداً و ارادہ کو دوسرے شخص کے جان سکے ہیں اور اس طرح ہر سرق توار ہو سکتا ہے اور ہر توار سرق۔ کیونکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ جب ہم کسی شاعر کے ایک شعر کو سرق سمجھیں وہ اصل توار ہو اور جس کو ہم اپنی خوش فہمی سے توار سمجھ رہے ہوں وہ دراصل سرق ہو۔ علاوہ انہی یہ فرض کر لینے کی کیا دلیل ہے کہ شخص شخص معلوم کر رہا ہے اس کی نظر سے اپنے پیشروں کے دواؤں نہیں گزرے۔ لیکن یہ امر تسلیم کر لینے کے بعد کہ فلاں مضمون پر فلاں شاعر کا مطلع تھا اور اس کے باوجود اس نے وہ مضمون کہا ہے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ شعر کتے وقت بھی پہلے شاعر کا مضمون پیش نظر نہ تھا یا نہیں۔ اس امر کو ایک اگرچہ جہت نظر (Stearne) نے واضح کیا ہے کہ لوگ علمی کام کرتے رہتے ہیں ان کے لئے اپنے پیشروں سے توار دہنا کس طرح ممکن ہے وہ کہتا ہے:-

It is almost impossible for any one who reads much, + reflects a good deal, to be able on every occasion to determine whether a thought was another's or his own.

(ترجمہ) جن کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے اور جو کافی غور و فکر کرتے رہتے ہیں ان کے لئے ہر موقع پر اس امر کو متعین کر لینا تقریباً ناممکن ہوتا ہے کہ خیال خود کا یا کسی دوسرے کا۔ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے آپ حیات میں حکیم آغا جان عیش اور ذوق کے توار و کا واقعہ لکھا ہے کہ دونوں نے ایک ہی مشاعرہ میں غزلیں پڑھیں اور دونوں کے یہاں ایک ہی مضمون موجود تھا۔

اے شمع صبح ہوتی ہے رعتی ہے کس لئے

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات

تھوڑی سی رو گئی ہے اسے بھی گزار دے (عیش)

رو کر گزارا اسے ہنس کر گزار دے (ذوق)

مجمع الصنائع میں خلاصہ الاخبار سے حسب ذیل واقع نقل کیا ہے کہ میر نظام الدین نے سلطان احمد مرقدی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور بظرا اصلاح میر نظام الدین علی شاہ کے پاس لے گئے۔ موصوف نے فرمایا کہ جس شعر میں مدوح کا نام آیا ہے اس کے بعد ایک شعر اور اضافہ کرنا چاہئے تاکہ کلام زیادہ مربوط ہو جائے لہذا میر نظام الدین نے موصوف ہی سے درخواست کی کہ وہ شعر آپ ہی کہیں انھوں نے فرمایا کہ تم بھی فکر کرو اور میں بھی غور کرتا ہوں۔ غرض دونوں نے علاوہ علوہ شعر لکھنے کے بعد ایک دوسرے کو دکھایا تو دونوں کے شعروں میں ایک حرف کا بھی فرق نہ تھا وہ شعر یہ ہے:-

بہار باغ جوانی تہاں گلشنِ عدل

گلن ریاض کرم سرو جو بہارِ دوار

اس کے علاوہ بھی اور چند واقعات صاحبِ مجمع الصنائع نے نقل کئے ہیں۔

اس تمام بحث سے قطع نظر سرق و غلطی ہر کی تمام اقسام کے لئے خود ان قائلین کی بھی جواز ہے اس کے لئے حدائق البلاغت میں تحریر ہے:-

"اقسام غیر ظاہر سرق کہ ذکر شدہ نزد بلغا مقبول و مدوح مست بلکہ اطلاع برآں سرق روانیت چنانکہ صاحبِ غنچہ گفتہ ہے"

و اکثر ذہ الافواع و نحوہا مقبولہ و منہا ما اخرجہ
حسن القصص من قبیل الاتباع الی نیز الاتباع و کل ما
کان اشده خفا و لکان اقرب الی القبول (صفحہ ۱۹۸)

اور ان اقسام میں سے اکثر ایسے ہیں جنکی مثالیں بہتر اور قابل قبول ہوتی
ہیں اور وہ ہیں جن کو حسن قصص نے قبیل اتباع عیسین اتباع کما نبی کہ
کیا ہے اور وہ قسم عیسین خفا زیادہ ہوتا ہے اقرب الی القبول ہوتی ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ سرقہ غیر ظاہر کو مرقہ کہنے کے باوجود یہ قائلین خود بھی سرقہ تسلیم نہیں کرتے اور اس لئے اس پر کوئی مزید بحث کرنا مقبول ہے سرقہ ظاہر
کی اقسام میں سے بھی قسم سوم و چہارم نے ان قائلین نے جو کچھ لکھا ہے ادب گزر چکا ہے کہ اس میں بھی دوسم و میسب صرف ایک صورت ہے کہ شعر ثانی شعر
اصل سے کم رتبہ ہو ورنہ وہ بھی محبوب نہیں اور سرقہ ظاہر کی پہلی قسم یعنی انتقال کے متعلق ہم اپنی رائے پہلے لکھ چکے ہیں۔

سرقہ یا تو ادباً شعرائے سابق سے استفادہ کرنے کی بحث میں ابھی مزید تشریح کی ضرورت ہے اور جو کہ مضامین کی نوعیت مختلف ہوتی ہے اس لئے
سرقہ یا تو اس کو اسی لحاظ سے متعین کرنا چاہئے اس کی تفصیل یہ ہے کہ:-

تمام اقسام شاعری رزمیہ - عشقیہ - مدحیہ - فخریہ - صوفیانہ - رذائے - اخلاقی - غمبی - تاریخی - قومی - مرثیہ وغیرہ اگر فائز نظر ڈالی جائے تو اسکو
دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ جو شاعر کی ذاتی واردات ہوتی ہے اور دوسری وہ جو تصور و تخیل کا نتیجہ ہوتی ہے۔

(۱) وارداتی شاعری کے ذیل میں عشقیہ شاعری تو آہی جاتی ہے کیونکہ وہ شاعر کا ذاتی احوال ہونا ہی چاہئے لیکن اس کے علاوہ بھی شعر کی ہر صنف میں
وارداتی شاعری موجود ملتی ہے کیونکہ شاعر نظرًا احساس دل اور باریک بین نظر لیکر پیدا ہوتا ہے اس لئے وہ ہر واقعہ و مشاہدہ سے خود متاثر ہوتا ہے اور
اپنے تاثرات و دوسروں کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ایک ایسا واقعہ جس سے بذاتہ شاعر کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا اکثر اس کی زبان سے اس طرح ادا ہوتا ہے
جیسے خود اس کا ذاتی واقعہ ہے اور اس میں وہ ایک ایسی تاثیر پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ہر شخص کے ذہن کی ذاتی واردات بن جاتی ہے۔

(۲) تخیلی شاعری وہ ہے جس میں شاعر علم و فلسفہ اور تخیل و تصور کی مدد سے کوئی مضمون پیش کرے۔ تصوف - اخلاق - رزم - فلسفہ فخریہ وغیرہ
سب تخیلی شاعری ہے۔

ذیل میں اس کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہو سکے کہ دونوں اقسام شاعری میں کیا فرق ہے۔

(۱) اقبال کی بے ثباتی پر کسی کا شعر مشہور ہے:

پروردہ دار می کند بر تھر کسرے عنکبوت چرخ نوبت می زند بر گنبد افرا سیاب

اس شعر میں کوئی جزو ایسا نہیں ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ جس چیز کو شاعر پیش کرنا چاہتا ہے خود بھی اس سے متاثر ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر
صرف ایک فلسفہ بیان کر رہا ہے۔ اس کے برعکس خانقاہی جب مائیں کے کھنڈروں سے گزرا تو وہاں کی حالت اور دیرانی کو دیکھ کر اس نے جو قصیدہ لکھا
ہے وہ سرتاپا جذبات میں لوبا ہوا ہے کھنڈروں کی زبان سے کہتا ہے:

ماہار گئے وادیم این رفت ستم پر ماہر تھر سنگاراں آیا چہ رسد خدلاں

جو کہ مائیں کسرے تو خیر وال کا پائے تخت تھا اور وہ مدلل گسری کے مشہور ہے اس لئے اس کے کسرے کھنڈروں کا مال کرنا اصل تو خود ہی
ایک موشہیرا ہے پھر ان کی زبان سے یہ مقابلہ کرنا کہ ہم بارگاہ مدلتے تھے جب ہمارے اوپر یہ تباہی آئی ہے تو سنگاروں کے محلول پر کیا کچھ بہاوی
نہ آتی ہوگی اور زیادہ تاثیر پیدا کرنے کا باعث ہے اور اس تقابل میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ جو تباہی ہمارے اوپر آئی ہے باوجود بارگاہ مدلتے ہونے کے
آئی ہے اس کے سزاوار تو سنگاروں کے تھر ہیں۔ جو تباہی کی داستان پہلے شعر میں ہے وہی دوسرے میں ہے لیکن دوسرے شعر میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ
اب معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی ذاتی واردات ہے۔

غزلیہ حسن مراد آبادی

(باقی)

علمی نفسیات کی فتوحات کے چند نمونے ”توجہ اور مرکز توجہ میں تبدیلی“

یہ شخص جانتا ہے کہ ہم ہر وقت اپنے گرد پیش سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک مخصوص وقت میں ہم ایک اور صفت ایک ہی چیز کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ گو دوسری چیزیں بھی ہمارے احساس کے پس منظر میں موجود رہتی ہیں اور ہم کسی خارجی اثر کی بنا پر ان کی طرف بھی متوجہ ہو سکتے ہیں۔ مفہم کی وضاحت کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ کسی گروہ میں آدمی کو کسی پرستار کے کمرے کوئی کتاب دیکھ رہے ہوں اور اس میں اس طرح کے کئے ہوں کہ باہر پہنچے ہوئے دوستوں کی گفتگو، نزدیک کے چین میں بیٹھی ہوئی فافنہ کی کوکو، موٹر اور دوسری سواروں کے گزرنے کا شور اور خود ہمارے جسم پر کڑی کے دباؤ وغیرہ کا احساس ہے۔ لیکن اس کا قطعی طور ہمارا کام ہے کہ کسی چیز کے پرول کی پچھٹا ہٹ ہم کو اس خیالی دنیا سے علاوہ کر کے اپنی طرف متوجہ کر لے۔ اس موقع پر ایک بات کا خیال رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم ایک مخصوص وقت تک ہم اپنی کتاب ہی کے مطالعہ میں غرق تھے لیکن اور دوسری چیزیں بھی ہمارے احساس کو متاثر کر رہی تھیں۔ گو وہ ہمارے شعور سے عارضی طور پر باہر تھیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کو ان تمام باتوں کا جو ہمارے دائرہ احساس سے باہر تھیں، علم ہی کیونکر ہوا، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر فی الفور ان کا علم ہمیں نہیں ہوا لیکن بعد میں جب وہ کیفیات و احساسات شعوری سرحدیں آگے تو ہم ان کی موجودگی کو محسوس کرنے لگے۔ مثلاً ٹرین کے سفر کو لیجئے۔ انجی کی سیٹی، سپروں کی گونگناہٹ، مسافروں کی میچ دیکار ٹرین کے چلتے وقت ہمارے لئے بے معنی تھیں لیکن جب ہی گاڑی اسٹیشن پر آکر رکی تو ہمیں ان تمام باتوں کا احساس ہو گیا حالانکہ جس وقت ہمارے حسیات ان آوازوں سے متاثر ہو رہے تھے ہم کو ان کا علم نہ تھا، اس کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہم ان کی طرف متوجہ نہ تھے، لیکن ہم متوجہ کن چیزوں کی طرف ہوتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چیزیں یا خیالات ہمارے لئے فوری دلچسپی کا سامان ہوتا ہے۔ ہم ان کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اگر اس طرح ہم اس نتیجے پہنچتے ہیں کہ ہماری ”مرکز توجہ“ صرف دہی چیزیں یا خیالات بن سکتے ہیں جو ہمارے شعور کے نزدیک منتخب حیثیت رکھتے ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت پرستور اپنا جگہ ہے کہ عموماً ہم کو ایک مخصوص لمحہ میں ایک ہی چیز کا احساس ہوتا ہے خواہ اس سے زیادہ دلچسپ چیزیں کیوں نہ موجود ہوں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اختیارات یا خیالات سے ہماری مراد کیا ہے۔ اختیارات یا خیالات مفرد بھی ہو سکتے ہیں اور مرکب بھی۔ ”مرکز توجہ“ میں پورے مرکب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یا مفرد کی طرف۔ اس کا جواب ناہر جی نفسیات نے یہ دیا ہے کہ مفرد اور مرکب کی بحث ہی فضول ہے۔ دراصل ہم ایک مخصوص امکان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ خواہ وہ مفرد ہو یا مرکب اس کو مل سکتے کہ ہمارے سامنے ہمارا قلم موجود ہے اب اگر ہم اس نقطہ نظر سے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ صرف اس کی تپ کو بغور دیکھیں تو یقیناً ہم صرف تپ ہی کو دیکھیں گے اور قلم کا باقی حصہ اگرچہ وہ ہماری قوت باہر کے متاثر کر رہا ہے، ہمارے دائرہ احساس سے خارج ہو گا۔ لیکن اگر ہمارا مقصد ہے کہ قلم کو سرسری طور پر دیکھنا ہے تو پورا قلم ہمارے شعور میں آجائے گا۔ اگر اول الذکر صورت میں قلم کا تپ ایک امکان تھا اور دوسری صورت میں پورا قلم۔ اس حقیقت کو ہمارا تجارت کی ایک حکایت جس میں ایک استاد نے اپنے شاگرد سے کہا کہ اس کو دیکھو کہ قلم کا تپ تو صرف تپ ہی دیکھنا دیتا ہے جسے جیسے نشاۃِ جانا ہے بخوبی واضح کرتا ہے۔ دراصل اس کی (جو ہمیں پیش نظر نہ آتا تھا) توجہ اتنی شدت سے اپنے نشاۃ پر مرکوز تھی کہ پورا قلم اور اس پر چڑا ہوا جسم

اس کے لاشعور میں آگیا تھا۔ لیکن اور شہزادہ سے پورے مددیت کو (معجزہ) اس وجہ سے دیکھ رہے تھے کہ ان کی عمر میں پورا مددیت لکھا گیا تھا جس پر وہ اپنی توجہ مرکوز کر رہے تھے۔

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ اگر سکندریہ کے سو سو حصہ (1/100) یا پانچویں حصہ تک کے لئے کوئی عدد ہماری نظر کے سامنے سے گزرا اور اہل تہم ایک نظر عموماً چار پانچ ہندسوں سے زیادہ ذہن میں محفوظ نہیں کر سکتے۔ بعد میں تجربہ اور عقل کی پہنچ کے ساتھ ساتھ بعض لوگ چشم ندوں میں ۱۰ یا ۱۰۰ ہندسے تک ذہن میں محفوظ کر لیتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ ان کا دائرہ فہم "عمر کے ساتھ ساتھ ذہن تر ہوتا چلا جاتا ہے" درحقیقت یہ تفریق اکائیوں کی تبدیلی کے باعث رونما ہوتی ہے اولاً دیکھنے والا ایک عدد کو ایک اکائی فرض کرتا تھا لیکن بعد میں وہ چار یا پانچ ہندسوں کو اکائی فرض کر کے سارے اعداد کو ذہن میں محفوظ کرنے لگا۔ دراصل "دائرہ توجہ" بھی ذہانت کی طرح ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے جس کو جتنا دل گیا اس کی خوش نصیبی ہے۔ اس سلسلہ میں ہزار ہا تجربات کئے گئے ہیں اور ماہرین کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اس شخص کا دائرہ توجہ وسیع ہوتا ہے جو ذہن میں خیالی تصاویر کو زیادہ دیر تک محفوظ رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ جس شخص کے خیالات جتنی دیرم تصاویر کی صورت میں اس کے دماغ میں پیدا ہوں گے اتنا ہی اس کا دائرہ فہم تنگ ہوتا چلا جائے گا۔ اس لئے طلباء اور اساتذہ کا فرض ہے کہ اگر وہ کسی کے "دائرہ توجہ" کے متعلق تجربہ کر کے کا اڑدہ رکھنے ہوں تو سب سے پہلے اس بات کا امتحان لیں کہ وہ خیالی تصاویر کو کتنی دیر تک ذہن میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔

"دائرہ توجہ" (Span of attention) کو تپنے کے لئے ماہرین تجسٹا سکوپ (Tachistoscope) نام کا ایک آلہ استعمال کرتے ہیں اس آئینہ ایک کھٹکے کی مدد سے مختلف کارڈز میں پر اعداد (۲، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲) لکھے ہوتے ہیں ہری ہری پٹی سکینٹ کے وقفہ کے لئے دکھلائے جاتے ہیں اور اس کے بعد اس سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ "جو کارڈ تم نے ابھی دیکھا اس پر کتنے اعداد تھے؟" اور اس کا جواب لوٹ کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح آٹھ یا دس مرتبہ یہ کارڈ علحدہ علحدہ دکھلائے جاتے ہیں اور غلط یا صحیح جواب کے اعتبار سے اس کے "دائرہ توجہ" کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ بالعموم لوگ چار پانچ سے لیکر سات اعداد تک صحیح جواب دیتے ہیں لیکن بعض حضرات جین کو ریاضی سے شغف ہوتا ہے اس سے اچھے نتائج پیش کرتے ہیں مثال کے لئے ہم برلن یونیورسٹی کے ایک مشہور پروفیسر ریاضیات کو لے سکتے ہیں جس کا دائرہ توجہ ۴۰ اعداد تک تھا۔ لیکن دراصل یہ دائرہ توجہ کی درست نہیں تھی بلکہ وہ اعداد سے انتہائی ناؤس ہونے کے باعث چھوٹے، سادہ، است اعداد کو ایک اکائی تصور کر کے فی الفور چالیس ہندسے تک یاد رکھتا تھا۔ اسی تجربہ کو ہم بجائے اعداد کے نقاط کی مدد سے بھی کر سکتے ہیں۔ یہ طریقہ زیادہ بہتر اس وجہ سے ہے کہ نقاط کو تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ دونوں ہی فہم کے لوگ سمجھ سکتے ہیں۔

اسی مسئلہ سے متا جلتا ایک مسئلہ "دھماکے کے فٹے" یا توجہ کے ہٹ جانے کا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اس ذہنی کیفیت سے واقف ہے کہ وہ زیادہ دیر تک کسی مخصوص چیز کی طرف متوجہ نہیں رہ سکتا تجربات شاہد ہیں کہ ہر چہ تھے اور پانچویں سکینٹ چار "مرکز توجہ" بدلا کر تپا اگرچہ ایسے لوگ بھی دیکھے گئے ہیں جو ۱۵ سکینٹ تک اپنی توجہ کو ایک خاص چیز پر مرکوز کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں توجہ کی بیرونی سرحد ۱۵ سکینٹ سے شروع ہو کر ۳ سکینٹ تک ہے۔ ان مختلف نتائج کی مدد سے ہم بخوبی یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کسی کا وقفہ توجہ کتنا وسیع ہے اور کتنا تنگ۔ دراصل توجہ کو مرکوز کرنے کے لئے سکوت کی انتہائی ضرورت ہے۔ ایسی جگہ جہاں شور وغل ہو یا توجہ کا دائرہ گھٹ جاتا ہے "مرکز توجہ کی تبدیلی" پر قوت سامعہ اور باصرہ دونوں ہی کی مدد سے تجربات کئے جاسکتے ہیں۔ اگر قوت سامعہ کے ذریعہ تجربہ مقصود ہو تو ہم "آڈیو ٹیپ" (Tape) نامی ایک آلہ استعمال کرتے ہیں۔ (کسی بھی گھڑی کی ایک ٹپ سے بھی یہی کام لیا جاسکتا ہے) جاتے جاتے ہر دکھا جاتا ہے کہ اس کی آواز کے مشکل سناؤ دے چنانچہ موجب دایت وہ اپنی نپسل کو آواز دیتے ہی میرے پاس آتا ہے اور اتنے وقفہ تک خاموش رہتا ہے جب تک کہ میرا آواز دوبارہ ٹپ ٹپ کی آواز نہ پیدا کرے۔ اس تجربے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک شخص اکثر آواز دینے سے غافل کرنا ہے اور بالعموم

بہت کم عمر کی طرف سے ایک خاص شخص کے لئے یہ سب ضروری ہے۔ یہ سب ضروری ہے کہ اس کا دل لگا جاسکے۔

ہر وہ باجمہ مسئلہ بعض اس کی توجہ آغاز سے رکھ جاتی ہے اور وہ مطلق سے مشمل سے آواز پیدا کرتا ہے۔

دائرہ توجہ کو قوت بصارت کی مدد سے بھی پایا جاتا ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک گولی دستی جس پر مرکز سے محیط کی طرف تقریباً آٹھ نشانات لگے ہوتے ہیں پہلی کے پچھلے کی مدد سے تیزی سے گھمائی جاتی ہے اور دیکھنے والے کو حیرت کی جاتی ہے کہ وہ محیط سے نزدیک ترین سرکل کو درستی کے گھومنے سے متنبی ہے) بخیر دیکھتا ہے اور جب سرکل کا نشان چھوڑے اور جھلکے ہوئے تو ایک کھٹکے پر خاموشی سے اٹھتی جاسے ہے لیکن جیوں ہی سرکل پہنچتا ہے وہ کھٹکے کو دبا دے۔ یہ کھٹکا ایک ڈھول (Drum) پر سیاہی مائل کاغذ سے ملفوف ہوتی ہے گرات بنانا رہتا ہے اور اس طرح "توجہ کے ٹپے" کا اس گرات سے بخوبی پتہ لگ جاتا ہے۔ اس تجربہ کے دوران میں دیکھنے والے کو اپنا سر دستی کی سیدھی میں رکھنا ضروری ہے اور اس تجربہ کو کم سے کم دس دفعہ دہرانا چاہئے تب جا کر ہم کہیں صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں گے، علاوہ انہیں اس عمل میں چونکہ آنکھوں پر کافی نور پڑتا ہے اور سیدھے پیچھے رہنے سے مکان محسوس ہونے لگتی ہے اس لئے ڈھول کے ہر جھکے کے خاتمہ پر اس کو تھوڑا سا آرام کرنے کی نصیحت دینا ضروری ہے۔

مرکز توجہ کی متواتر اور دم بدم تبدیلی کی مختلف ماسہرین نے مختلف طریقے سے توجہ کی ہے بعض کا خیال ہے کہ کسی چیز کی طرف تھوڑی دیر تک دیکھنے سے آنکھ کے بعض حصوں کو تھکن محسوس ہوتی ہے۔ اس تھکن کو تھکن کا ازالہ کرنے کے لئے نگاہ خود بخود اپنی مرکز توجہ کو تبدیل کر دیتی ہے دیگر نظریات کے متبعین نے اس مسئلہ کو عمل کرنے کے لئے ایک مخصوص قسم کی لہر کا وجود ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو ہر پانچ سائنڈ کے بعد ہمارے جسم سے گزرتی رہتی ہے۔ کچھ ماسہرین نے دھیان کے بننے کے مسئلہ کو چھوٹی کے سکڑنے اور پھیلنے سے متعلق کرنے کی کوشش کی ہے، بعض نے سانس کے آثار پر خاصاً اور بعض کی رفتار وغیرہ کو اس کا باعث قرار دیا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ تجربات اس کے خلاف شہادت پیش کرتے ہیں۔ میرٹ خیال میں سب سے بہتر نظریہ "توجہ کی لہروں" کا ہے۔ کیونکہ یہ لہریں (Ray waves) بعض نفس موکرات آنے کی دوسرے پہلوؤں جی جی ہیں۔ عضلات یا پٹھوں کے پھیلنے اور سکڑنے کا خیال بھی کسی قدر صحیح معلوم ہوتا ہے، ہر حال یہ مسئلہ ہنوز زیر بحث ہی ہے کہ توجہ کن اسباب کی بناء پر ہوتی ہے۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ شیر شاہ سوری میں بغیر معمولی قوت موج دستی کہ وہ بیک وقت دو یا دو سے زیادہ مسئلوں کی طرف متوجہ ہو سکتا تھا چنانچہ اس کا ثبوت موجود ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں کئی آدمیوں سے گفتگو کر سکتا تھا اور ایک زیر بحث مسئلہ کا رشتہ دوسرے مسئلہ کی موجودگی کے باوجود ذہن سے گھوم نہیں ہوتا تھا۔ ماسہرین نفسیات کے تجربات شاہد ہیں کہ ایسا ناممکن ہے کیونکہ اگر کوئی شخص دو مسائل کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش کرے گا تو دونوں ہی کام خراب ہو جائیں گے لیکن اگر اس طبعیاتی وقت کے باوجود کوئی شخص ایسا کرے تو یقیناً ایک کام کو کرتے ہوئے دوسرا کام از خود (مشق کی بناء پر) ہوتا رہے گا۔

"توجہ" کے بیان میں شور و غل اور دوسرے پریشانی کن اثرات کا ذکر جو مرکز توجہ کی تبدیلی کا باعث ہوتے ہیں، ناگزیر ہے، ماسہرین نفسیات کا خیال ہے کہ ذہنی انتشار دو قسم کا ہوتا ہے، ایک اندرونی دوسرا بیرونی۔ اندرونی انتشار عام کے اندر کے نظام میں کسی تبدیلی کے باعث پیدا ہوتا ہے اور بیرونی انتشار شور و غل اور دیگر بیرونی واقعات و حالات کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ دارالعمل میں دونوں قسم کے مصنوعی حالات پیدا کئے گئے۔ مثلاً بعض لوگوں کے ساتھ پر "دوران کاغذ" میں بار بار کپڑے کے پٹے صدقات پہنچائے گئے، اس کے باوجود بھی کام کی مقدار کافی منط میں کوئی مخصوص تبدیلی نہیں ہوئی، اس طرح باوجود شور و غل کی موجودگی کے بعض معمولی پرستند کام کرتے رہے۔ ایسا تجرباتی واقعات کی بناء پر کچھ لوگوں نے نتیجہ قائم کیا کہ شور و غل اور پریشانیوں خواہ وہ بیرونی ہیں یا اندرونی کام کی مقدار پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔

خواجہ حلیہ احمد (مدظلہ)

نہیں ہوتے توحذرتی کی شاعری کا لب و لہجہ ایسا ہی یا اسی کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ جذباتی ذہنی اتاد اور ان کا فطری میلان تھا جو انہیں
فانی کی طرف لے گیا۔

میں نے ان میں جذباتی ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستہ ہوئے۔ ان کے یہاں اب تک صرف انفرادی غم کی جھلک تھی لیکن اب ان کا
کاظم دیگران سے بھی ہوا جسکی بنا پر ان کی شاعری میں وسعت اور ہمگیری پیدا ہوئی۔ اب جذباتی کی شاعری میں نہ صرف ایک دل کے درد
دالم بلکہ پوری انسانیت کے غم کی داستانیں چھلنے لگی۔ لیکن ترقی پسند ادب کی تحریک جذباتی کو وہ رعایت دے سکی جو ہمیں دوسرے ترقی پسند
شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ اس کا ایک سبب تو ان کی طبعی یاس پرستی تھی اور دوسرا سبب جنگ عالم گیر کی ہولناکیاں تھیں۔ اس جنگ نے
زندگی کی رہی سہی سرقوں کو کس طرح ڈال دیا اور اس کی زبوں حالی میں کتنا اضافہ کیا یہ خود جذباتی کی زبانی سنئے۔

اور یہ شور مگر جتنے ہوئے طوفانوں کا

ایک سیلاب سسکتے ہوئے انسانوں کا

ہر طرف سیکڑوں بل کھاتی دھویں کی لہریں

ہر طرف ڈھیر چھلتے ہوئے اربانوں کا

زندگی اور بھی کچھ خوار ہوئی جاتی ہے

اب توجہ سانس ہے آزار ہوئی جاتی ہے

(آزار)

اس آزار کا احساس براہِ بڑھتاد۔ جنگ میں کاشستی طاقتوں نے جمہوری اور عوامی طاقتوں سے شکست کھائی لیکن اسکے
بعد کیا زندگی کے اخت پر امن و راحت کا ستارہ چمکا؟ کیا حسن و صداقت کی کرنیں فضا کی تاریکیوں کو اُجالے سے بدل سکیں؟ کیا انسانیت کے
اتنے پر کسی نے کوئی دمک محسوس کی؟ آفتاب حیات اس تیر و تار کا نثار کو کب روشن کرے گا کسی کو معلوم نہیں۔ ہمیں جذباتی کے ساتھ
کہنا پڑتا ہے:-

کیا جانے کب یہ باپ کے کیا جانے کب وہ دن آئے

جس دن کے لئے ہم اسے جذباتی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

مستقبل سے آس لگانا اچھی چیز ہے لیکن آئندہ کے متعلق کوئی بات قطعیت سے کہی جاسکتی ہے اس میں شبہ ہے اور یہی وہ شبہ ہے
جو جذباتی کی شاعری میں رجحانی عناصر پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اس وقت دنیا کی جو حالت ہے وہ یہ ہے:-

ہر طرف کاؤر دھرم میں اُٹھتا ہے دھواں

ہر طرف موت کے آثار تباہی کے نشان

سرد اجسام بتاتے نہیں منزل کا پتہ

راہیں دیران ہیں ملتے نہیں راہیں کے نشان

(میری شاعری اور نقاد)

لیکن اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کبھی کبھی امید کے دئے جل اُٹھتے ہیں اور راہیں روشن ہو جاتی ہیں مگر اجالے کا یہ آثار مشتعل نہیں ہوتا
تھوڑی دیر بعد دئے بجھ جاتے ہیں۔ چاند چھپ جاتا ہے اور زندگی کے صفحے میں تاریکیوں کے سوا کچھ نہیں آتا۔

ایک ایک آنہ حیاں اُٹھنے لگیں ہر جانب سے

آنہ کی آنہ میں گل ہوئے احکمت کے دئے

آنہ کی آنہ میں گھٹا گھٹا امید کا چہانہ

نہ تو دیوانہ کا داغ نہ دریا کی سلا

ذوقے غوار کو اک قطرہ صہبہ ہی ملا
کلیاں کہنے بھی نہ پائی تھیں کہ مرجھانے لگیں

میری شاعری اور نقاد

جذباتی کی اس سبب سے نتیجہ نکالنا غلط ہو گا کہ ان کا رجحان غزلیت کی طرف ہے۔ ایسا بالکل نہیں۔ وہ زندگی کی تصویر پر مبنی شاعری کے کئی پہلوؤں پر مبنی ہیں اور بس۔ اس مایوسی کی بنیاد صداقت پر ہے۔ اس لئے ان کی شاعری میں رجحانی عناصر اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتے جب تک کہ خود زندگی میں اس قسم کا کوئی موڑ پیدا ہو جائے۔

جذباتی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت داخلیت اور تغزل ہے۔ ان کی شاعری میں جو افسردگی، دردمندی اور تروم ہے وہ مجرماً طور پر ان کی شاعری کو زیادہ حسین اور مہذب بنا دیتا ہے۔ یہی تغزل ان کا سب سے بڑا شاعرانہ اکتساب ہے۔ جذباتی کے داخلی رنگ کی سب سے اچھی مثالیں ’موت‘، ’بیزار رنگاں‘، ’تو ہم در طواف‘، اور ’احساس‘ ہیں۔ جذباتی نے کبھی کبھی خارجیت کا سہارا بھی لینا چاہا ہے لیکن اس وقت ان کی آواز میں بے کیفی پیدا ہو جاتی ہے۔ ’نیا سورج‘ میں یہی پھیکا پن محسوس ہوتا ہے اور یہ پھیکا پن اس وقت اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے، جب ہم اسی موضوع پر تھیں کی نظم چڑی کا سیاب ہے اور داخلی رنگ کا بڑا اچھا نمونہ ہے سانسے رکھتے ہیں۔ جذباتی کی اس غزل کی ناکامیابی کا راز جس کا مطلع ہے:-

زمیں آسمان چاند سورج ستارے

ہمارے ہیں لیکن نہیں ہیں ہمارے

یہی خارجیت ہے۔ بڑا اچھا ہوتا اگر جذباتی صرف داخلی رنگ سے لگاؤ رکھتے۔

جذباتی کا شاعرانہ فن ان کا اشاروں اور کنایوں میں بات کہنے کا ڈھنگ ہے۔ شاعر اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار براہ راست نہیں کرتا۔ وہ لطیف اور نازک سہارے ڈھونڈتا ہے اور سہارے تشبیہ، استعارے، اشارے اور کنائے ہوتے ہیں۔ وہ ایسا نازک کراس کی تخلیق میں حسن اور دل کشی نہ پیدا ہو۔ غالب کا اشارہ اسی حقیقت کی تھا:-
ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفت گو
بہی نہیں ہے باوہ و ساغر کے بغیر

شاعر ’مشاہدہ حق کی گفتگو‘ کے لئے ’باوہ و ساغر‘ کا وسیلہ اس لئے اور بھی ڈھونڈتا ہے کہ انسانی ذہن حقیقت کا ادراک اشاروں کے ذریعہ زیادہ اچھی طرح کر سکتا ہے۔ اشاروں اور کنایوں میں ابہام ہوتا ہے، ابہام میں استعجاب اور استعجاب میں حسن۔ اشارے اور کنائے اسی لئے ہمیں زیادہ حسین معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اشاروں اور کنایوں کا اس حد تک مبہم ہونا کہ شعر کا مفہوم واضح نہ ہو سکے بہت بڑا نقص ہے اور شاعر کو اس نقص سے بچنا چاہئے۔ جہاں ابہام کی سرحد ختم ہوتی ہے ابہام کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ شاعر جھٹکا اسٹل ہے کہ وہ ابہام اور ابہام میں تمیز نہیں کرتا۔ میراجی اور اردو کے اکثر دوسرے ترقی پسند شعراء اشاریت کی اسی رو میں بہہ ہیں لیکن جذباتی کے اشاروں اور کنایوں کے استعمال کا طریقہ بڑا فن کا مان ہے۔ اسے کاشف، ’طواف‘، اور ’احساس‘ جیسی تخلیق جذباتی کے اس فنی کمال کی نظر ہیں۔ ’میری شاعری اور نقاد‘ میں انھوں نے دنیا کی موجودہ حالت کی جو تصویر اشاروں اور کنایوں کے رنگوں سے بنائی ہے وہ حسین و دلکش بھی اور واضح بھی۔

آخر میں میں جذباتی کی ترقی پسندی یا رجعت پسندی کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ بعض نقاد ’جذباتی کو رجعت پسند بتاتے ہیں‘ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جذباتی کو رجعت پسند کہنا ادبی ترقی پسندی کے صحیح مفہوم سے واقف نہ ہونے کی دلیل ہے۔ جذباتی کو رجعت پسند کہنے کی بنیاد یہ باتیں ہو سکتی ہیں۔ جذباتی کا اس زدہ شاعری میں حیات کی جھلک رسانی نہیں دیتی۔ اور اس میں ہمیں وہ پیغام ملتا ہے جس سے زندگی کو

سنوارنے اور اسے خوشگوار بنانے میں کوئی مدد مل سکے۔ اور یہ کہ جذباتی مضموعات کو چاہے وہ کتنا ہی اہم ہوں کبھی نہیں اپناتے اور اہمیت کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔ جذباتی کی شاعری کی یا سمیت اہم انسان کے جواز میں ان کی مایوسی پر لکھتے ہوئے بتایا جا چکا ہے کہ ان کی شاعری، ماحول اور زندگی کی سچی ترجمانی کرتی ہے۔ جب خود زندگی کینت و سرسختی سے خالی ہو پھر اس کے آئینے یعنی شعروادب میں مسرت کی روح کیسے اور کہاں سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل ضروری نہیں کہ ترقی پسند شاعر اپنی نگہوں میں رجائیت کا پیو بھی لگائے۔ جہاں تک زندگی کے پیغام اور ماحول کی راہوں کے تعین کا سوال ہے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ دائرہ عمل شاعر کا نہیں بلکہ سیاسی قیاد اور قوم کے مصالح کا ہے۔ ترقی پسند ادب سڑک کے سماج اور بدبودار ماحول سے نفرت اور بیزاری پیدا کرتا ہے اور زندگی کی تخیلوں کا احساس دلاتا ہے اور بس۔ وہ راہیں نہیں بتاتا اس لئے کہ وہ سہم حال میں ادب ہوتا ہے۔ شاعر میں مقصد کا انگہا۔ جامع طور پر کرنا فن کا غرض کرنا ہے۔ یہیں وقتی اور ابدی مضموعات کی باتیں سوچا رہا خیال ہے کہ جذباتی کا تفریق ان کی شعریت اور اشاریت یعنی ان کا مخصوص آرٹ ہنگامی مضمون کا ہونا نہیں اٹھا سکتا۔

ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ جذباتی ترقی پسند شاعر جو ملے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں اردو کے کچھ شاعر ہیں جن میں یہ دونوں باتیں بہ یک وقت پائی جاتی ہیں۔
محمود حسن دیم۔ اسے (ملنگ)

تصانیف نیاز فچوری

من ویر ذوال حصہ اول۔ سات روپیہ آٹھ آنے ملاوہ محصول	من ویر ذوال حصہ دوم۔ پانچ روپیہ آٹھ آنے
نگارستان۔ چار روپیہ	فلاسفہ ستیم۔ ایک روپیہ
جاستان۔ پانچ روپیہ آٹھ آنے	شاعر کا انتخاب۔ بارہ آنے
حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے۔ دو روپیہ	فراست السید۔ ایک روپیہ
ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد۔ چار روپیہ	نقاب ٹھٹھ جانے کے بعد۔ آٹھ آنے
مکتوبات نیاز فچوری میں قیمت ہر حصہ کی چار روپے	مذکرات نیاز۔ ایک روپیہ آٹھ آنے
شہاب کی سرگزشت۔ ایک روپیہ آٹھ آنے	انتقادیات (حصہ دوم) چار روپیہ
الہ و اعلیٰ۔ دو روپیہ ملاوہ محصول	مذہب۔ ایک روپیہ
غیر منظر کشی	ایکستان نمبر ۱۱ دو روپیہ ملاوہ محصول

نظامی گنجوی

(ایک روسی ادیب کی نظر میں)

”مگر لائے تھو توں، موجودہ سوویٹ ادیبوں میں بڑے پائے کا شعور و مصنف سمجھا جاتا ہے۔ پچھلے سال وہ پوری ایلٹرا نظم سوویٹ پر بین الاقوامی طور پر چکا ہے۔ ذیل کا مضمون اسی مقالہ کا ترجمہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوویٹ عوام اور ادیب نظامی کو کتنا بلند مرتبہ دیتے ہیں۔“

آذربائیجان کے شاعر اعظم نظامی گنجوی کی آٹھ سوویں سالگرہ کے جلسہ سے اٹھ کر میں ایک دوست سے ملنے چلا گیا۔ اس کا کوئی مختصر اور ہلکا سا تھا، شاید اس کمرے کی طرح مختصر جس میں بیٹھ کر نظامی اپنے غیر فانی شاہکار لکھا کرتا تھا۔ اس کمرے میں مجھے دو چیزیں ایشیائی مذاق کی نظر آئیں ایک قاپٹین اور ایک دوات جو اوٹ کی وضع کی تھی۔ میرے دوست کا نام کروکیوف ہے۔ ادبی مذاق کے اعتبار سے وہ ایک مستشرق اور فارسی زبان کا ماہر و عاشق ہے۔ اس کی الماری میں جو کتابیں چنی ہوئی تھیں وہ زیادہ تر ایرانی اور گروڈا کوو تھیں۔ شہر لیٹن گراڈ کے ایک معمولی کمرے میں اس کا فارسی شعر لگائے رہنا مجھے ایک ذرا انوکھی سی بات محسوس ہوئی۔

کروکیوف فوج میں لفٹنٹ تھا اور اس وقت وردی کا فوجی کوٹ پہنے تھا، جب وہ میرے لئے چائے بنانے کے لئے آگیا تھی میں اخبار کے ورق چلانے لگا تو اس کی مدد میں کالمیر فوجی انٹرسی کے دو امتیازی نشان لگے نظر آئے۔ چائے طیارہ چوٹی اور ہم دونوں مختلف قسم کی باتیں کرتے رہے، نظامی کے متعلق گفتگو ہوئی، نئی سوویٹ نسل کے بارے میں تبادلہ خیال ہوا جس نے اپنے مطالعہ کے کردل کو سرنگوں اور خند قوئل سے بدل لیا ہے، نازی دشمنوں کا ذکر آیا جنھوں نے انسانیت اور کلچر کو طلاق دیدی ہے، پھر آذربائیجان اور نظامی کے فن و کمال پر بات چیت ہوئی رہی۔ کروکیوف نے سردی سے بھرائی مہٹی اٹھا دی کہا۔

”نظامی کا زندگی بڑی عری غرابہ کا داد تھا، جیسا ہمارا ہے، لیکن نظامی کو اپنی قوم کی قوت و طاقت اور اس کے مقصد کے برحق ہونے پر کامل عقیدہ تھا، اس عقیدے میں کسی وقت انحراف و کمزوری نہیں آئی۔“

”ہمارا بھی یہی عقیدہ ہے اور ہم بھی اس پر متکرم ہیں!“ میں نے کہا

”ہاں، نظامی کو لڑنے یقین تھا کہ دنیا کو حرکت میں رکھنے والی قوت یہی ہے اور انسانیت پرستی کی قوت ہے، جی اور پرستی کی نہیں، اور یہ اس کی اس حکایت سے ثابت ہے۔“

”ساسانی بادشاہ اور شیر و ال شکار میں اپنے ساتھیوں سے بچ کر گیا اس کے ساتھ میں اس کا وزیر تھا۔ اسی کا ایک ایک ویران گاؤں کی طرف جہاں کوئی انسان کا معنی جاننا نہ تھی، البتہ ایک شکستہ دیوار پر دو آؤ بیٹھے بڑے زور سے ”گھو گھو“

کر رہے تھے۔ وزیر نے اور سائے میں آؤں کی آواز سن کر اور شیر و ال کے دل میں خون ساہوا ہو گیا۔ اس نے دوڑ کر بھاگا اور چھوڑ کر تم کوہ زردوں کی زبان جاننے ہوا، آؤ کیا باتیں کر رہے ہیں؟ وزیر نے کہا ایک آؤ دوسرے سے اپنی بیٹی کی شادی کر دینے کی عرض گاؤں کا وزیر اور اپنے ہی دادا کا تھا۔ دوسرا آؤ نے کہا کہ یہ تو وہ نہیں ہے جو سرور کے گھر شرف ہے کہ آؤ کیوں کو حکومت و عہدے تک قائم رہے، کیونکہ اس کی مگرانی طلحی طلحی اور تہا و عالی کی شان ہے۔“

کروٹیوں نے حکمت ختم کر کے اپنی بات جاری رکھی :-

”نظامی کی شاعری میں، صدیوں کے فاصلہ کو طے کر کے نعت و مدح کی سانسیں اور تباہی و بربادی کی گردِ مہم تک پہنچتی ہے۔“

نظامی نے حکایت کو ان لفظوں پر ختم کیا ہے کہ ”نظامی قصہ متحرک، تیز رفتاری سے چلتا ہے۔“

یہ کہہ کر میرا دوست زراچھپ ہو گیا اور کھڑکی میں سے بیٹو آنوی کو دیکھتا رہا، جہاں پت جھڑکے موسم کا دھند لگا چھایا ہوا اور میٹروں کے متوال اور چمنیاں دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ پھر اچانک مجھ سے مخاطب ہوا۔

”آج کا انوشیرواں، نظامی کے انوشیرواں سے زیادہ ظالم و سفاک ہے جو ایک روسی کو نہیں ساری دنیا کو بڑا بنا دینے کے

لئے نکلا ہے۔ ایسی کہتا ہوں کہ ہماری ادبی صنعت اتنی مکمل نہیں جو اس جدید خوشنود کو اس کے اصلی رنگ روپ میں

نقش کر سکتی جس طرح نظامی کی صنعت نے اس وقت کے خوشنود کو نقش کیا ہے؟ تم ادبی کارناموں کا ذکر کر رہے تھے مگر نظامی کا

سا ادبی کارنامہ کہاں پیدا کر سکتے ہیں؟“

اس کے جواب میں میں نے اسے بتایا کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب دنیا بھر کے شاعر و صنعتا جرمی کے انوشیرواں اور اس کے خوشنود جیسے کو

کو سرا کریں گے اور اس کے بعد وہ زمانہ بھی ضرور آئے گا جب دنیا اس کو بالکل بھلا دے گی۔

”نظامی کے کچھ شعر سنو، میں اصل زبان میں اس کے شعر پڑھتا ہوں؟ کروٹیوں نے کہا۔

”مگر میں سمجھوں گا کیا؟“

”میں اس کا ترجمہ سناؤں گا؟“

یہ کہہ کر اس نے زرا اونچی آواز اور لمبے میں ایرانی ترنم کے ساتھ شعر پڑھے۔ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی اور کرسے کی تار کی میں ان لفظوں

کے ترنم جذبات کی لہر، ایک ہیجان سے بھری ہوئی پھر یہی پیدا کر دی تھی، اور میں ان لفظوں کے اندر جنگی ہتھیاروں کی جھنکار سننے لگا تھا۔

خضر کی رطابی میں ایک میدانی زمی کی آہستہ خرمی محسوس ہوتی تھی جیسے اونچائی سے پتھر پر پورے گڑے پٹکتے جا رہے ہوں۔ کروٹیوں نے اپنے

ہاتھ لفظوں میں دبا رکھے تھے اور آہستہ آہستہ ہٹا جاتا میری پشت کی جانب دو برابر ایک خوش رنگ اور خوش وضع قالین لٹکا ہوا تھا، اس نے

قالین پر ایک نظر ڈالی اور پھر مصرعہ پڑھنے لگا :-

زمین شمش شد و آسمان گشت ہشت

اس شعر میں نظامی نے لڑائی کی شدت بیان کی ہے اور کہتا ہے کہ اس بلا کا رن پڑا کہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین کا ایک طبقہ گڑھ ہو کر اڑا اور

آٹھواں آسمان بن گیا۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے اس نے بتایا کہ نظامی کے رنگ میں خود اس کے تاثرات جنگ کیا تھے :-

”سورج نے جنگ کے دھندوں کے پیچھے سے سر نکالا تھا کہ لڑائی شروع ہو گئی۔ وہ پہلے کے سورج کا چہرہ لڑائی کے گرد و خرابی میں چھپ گیا تھا۔“

لڑائی جاری تھی کہ رات نے دنیا کو اندھیرے کی چادر ڈھکادی، شاہی قہر و باغات اندھیرے میں چھپنے لگے۔ جب محل کا گنبد گرا تو اسے درجہ کیا

میرا دل خون ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔ لیکن وہ آنسو میرے چہرے پر نہ لگا، دھند نے جذب کر لے۔ دشمنوں کو کم سے کم ہی بدلتی

علاقہ کیا۔ میرے سر پر ہتھیار، دھند تھا، مگر دشمنوں کے پیچھے سے سورج نکلتا تھا۔ میری فطرت بھری ہوئی تھی کہ ان کی شکلیں کالی دکھائی دے رہی تھیں

تھیں اور انھی سیاہی میں کہ ابھی چلی آپ کھا رہی تھیں۔ دشمن زخم کا گرگڑتا اور زمین کو مٹا تھا۔ مارنے مارنے ہمارے بازو خن ہو گئے تھے

ایک بڑی بڑی فوج تھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ بڑا ہی دشمنی کے شعلیں روشن کر دی گئی تھیں، اس روشنی میں میں نے اپنے فوجی

سے گفتگو ہوتا تھا دیکھئے۔ دشمنوں نے اپنے ہاتھ بندھ دیے، دشمن کے فوجی بے ”سرخ“ تھے، تجا جس نے میرے وطن کی مٹی میں

کا پتہ ہمارے ہاتھ کیا تھا۔ دشمن کی فوج کو کھینچ کر اس طرح پکڑا تھا، گویا ان کو اپنے فوجی ہاتھ سے پکڑ کر پکڑ کر

باب الاستفسار

فوجی بینڈ کا رواج اسلامی دنیا میں

(جناب سید اطہر علی صاحب - مان بھوم)

ازراہ کرم مطلق فرمائیے کہ فوجی بینڈ کا رواج اسلامی حکومتوں میں کبھی ہوا تھا یا نہیں اور اگر ہوا تھا تو اس کی کیا نوعیت تھی۔ کیا اس کو بھی موسیقی کی شاخ سمجھ کر، ممنوع قرار دیا گیا تھا ؟

(نگار) آپ نے یہ مشہور شکل سنی ہوگی کہ: ”نقار خانہ میں طوطی کی آواز کو سن کر متناہی“ لیکن ٹراپیڈ بات آپ کے علم میں نہ ہو کہ اسلامی دنیا میں نقار خانہ سے مراد وہی جگہ تھی جہاں فوجی بینڈ بجا یا جاتا تھا اس کو طبل خانہ بھی کہتے تھے اور نوبت خانہ بھی، لیکن مفہوم کے لحاظ سے نقارہ و نوبت میں بہت فرق ہے۔

عام طور پر لوگ نقارہ اور نوبت کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ نقارہ نام ہے اس پیالہ نما بڑے ظون کا جس پر کھال منڈھی ہوتی ہے اور ضرب لگا کر آواز پیدا کرتے ہیں۔ نوبت نام ہے ایک خاص لحن یا آواز کا جو متعین وقتوں کے ساتھ نقارہ سے پیدا کی جاتی ہے۔

قدیم زمانہ میں اہل مشرق، فوجی مظاہرہ کے وقت جو ساز استعمال کرتے تھے وہ زیادہ تر ایسے ہی ہوتے تھے جن سے رگڑا یا ضرب کے بعد آواز پیدا ہوتی تھی۔ یونانیوں کی ترقی کے عہد میں جنگ کے وقت قرنا اور بانسری کی طرح کے ساز لگے تھے، لیکن عہد وحشت میں وہاں بھی رگڑ والے سازوں ہی کا استعمال ہوتا تھا۔ یونانیوں میں سے پہلے سکندر اعظم نے فوج میں طبل یا نقارہ کا استعمال کیا۔ عربی میں قبل کو دہدہ اور دیاب بھی کہتے ہیں (جیسے : دیابیب) اور ہو سکتا ہے کہ وہ دیابیب سکندری سے مراد ہی ہو۔

اسرائیل (جس کا زمانہ ایک صدی قبل مسیح کا تھا) کا بیان ہے کہ ایران میں فوجوں کو مسلح ہونے کا حکم پہنچی سازوں، (جہاںجھ وغیرہ) کے ذریعہ سے دیا جاتا تھا، لیکن فردوسی نے شاہنامہ میں مختلف سازوں کا ذکر کیا ہے، مثلاً قرنائے، شہپور، بوق (بگل کے قسم کے ساز) نے، روئیں نے (بانسری کے قسم کے ساز)، تیرا، کوس (طبل کی قسم کے ساز)، رنگ، سنخ (جہاںجھ کی قسم کے ساز) عربوں کے عہد جاہلیت کے متعلق بعض یونانی مؤرخین نے ظاہر کیا ہے کہ اہل عرب لڑائی کے وقت جلاجل (جہاںجھ) بجاتے تھے، لیکن

عربی میں تقریباً معنی کھونٹے اور سارے کے ہیں اور نقارہ اسی سے مشتق ہے۔ چونکہ کو بھی شکار اسی لئے کہتے ہیں کہ چڑیاں اس کی مدد سے پھسکاؤں کو کھینچتا ہے۔ یہ عرب آپ نے مشاہد کیا۔ ”چند نوبت می زندہ بکند المر سیاب“۔ یہاں نوبت سے مراد انوکھی آواز ہے، بلکہ نقارہ بجاتا۔ نوبت کے معنی مقرر اور برسر ہے۔ ”مقرر“ مقرر یعنی نوبت و نوبت راست“ یعنی جہنوں کا دوا ختم ہو گیا، اب ہماری باری ہے۔ چونکہ نقارہ کی آواز بھی ٹھہر کر متعین وقتوں کے ساتھ بجاتی ہے اس لئے اس کا نام بھی نوبت رکھ دیا گیا۔

سب سے دھات کی بنی ہوئی ہے یا بانسری۔

عرب موفین کا بیان ہے کہ ان کے پہلے صرف دُش کا رواج تھا۔ چنانچہ جنگ اُحد و بدر میں دُش کا استعمال کیا گیا تھا۔
اولیٰ چلیبی (ترکی مورخ) لکھتا ہے کہ عہد نبوی میں لڑائی کے وقت صرف نقارہ بجا جاتا تھا، لیکن ابن خلدون کے بیان سے ظہر
ہوتا ہے کہ عہد اسلام میں لڑائی کے وقت نہ بوق (قرنا) بجا جاتا تھا نہ طبل یا نقارہ، بلکہ دوسری تقریبات میں بیشک بوق کا استعمال
راج تھا۔

سب سے پہلے ہندو آرمیہ کے زمانہ میں طبل و نقارہ فوجی باجوں میں شامل کیا گیا جو بہ نسبت دُش کے مزاحیر (منہ سے بجائے جانے والے ساز)
کا ساتھ اچھا دیتے تھے، بعد کے عہد عباسیہ میں جب ایرانی اثرات بڑھے تو سُرناے (بانسری) بھی فوجی بیڑ میں شامل کی گئی جو ایرانیوں
کے یہاں نقارہ کے ساتھ بجاتی جاتی تھی۔ ہندوستان میں شہنائی اسی کی یادگار ہے۔

دسویں صدی تک مسلمانوں میں "طبل المربک" کا رواج بھی ہو گیا یعنی اونٹ یا گھوڑے کی گردن کے دونوں طرف دو طبل یا نقارے
لٹکائے جاتے تھے اور سواران دونوں کو بجاتا تھا۔ کبھی کبھی کوس (بڑا نقارہ) بھی استعمال ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ بوق (قرنا) بھی بجا جاتا تھا۔
دسویں صدی تک طبل خانہ یا نقارخانہ کا استعمال (جس میں طبل، نقارہ، قرنا اور بانسری وغیرہ سب کچھ شامل تھا) خلیفہ وقت کے لئے
مخصوص تھا۔ اس کے بعد جب خلافت کا اثر کم ہوا اور مختلف اقوام کے گورنران اپنی حکومتیں علحدہ قائم کرنے لگے تو انھوں نے اپنے لئے نقارخانہ
رکھنے کی اجازت بھی طلب کی، چنانچہ بعد کو یہ دستور ہو گیا کہ جب خلیفہ کسی امیر کو حکومت کے اختیارات تفویض کرتا تو سند حکومت اور پرچم کے ساتھ
ساتھ نقارہ بھی دیتا۔ لیکن نقارہ و نوبت دونوں کی تعداد متعین کر دیتا۔ بعض امیروں کی اس درخواست کو رد بھی کر دیا جاتا۔ چنانچہ ہندو امیر
معزالدولہ کو نقارخانہ رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ کہا جاتا تھا کہ سب سے پہلے امیر جس کو نقارخانہ رکھنے کی اجازت دی گئی معزالدولہ تھا، لیکن
وہ صرف تین وقت (ظہر، عصر اور مغرب) نوبت بجا سکتا تھا۔ پانچویں نازوں کے وقت نوبت کا بجا یا جانا صرف خلیفہ کے لئے مخصوص تھا۔

سلطنتی امراء کو یہ مراعات بہت زیادہ حاصل تھیں اور ان میں سے بعض (اہل ارسال اور قزل ارسال) کو نوبت کی اجازت حاصل تھی۔
فاطمی خلفاء بھی اپنے اقتدار کو طبل و علم عطا کرتے تھے چنانچہ جب العزیز نے شام کی طرف کوچ کیا تو ۵۰۰ بوق (قرنا) اس کے ساتھ
تھے۔ تاتار سردوں نے لکھا ہے کہ فاطمیوں کے فوجی بیڑ میں بوق، سُرناے، طبل، کوس اور جلاجل تمام ساز شامل تھے۔

ملوک سلطانین کے زمانہ میں فوجی بیڑ اور زیادہ شاندار ہو گیا تھا، چنانچہ سلطان بیرس اول کا بیڑ ۴۰۰ کوس، ۴۰۰ طبل، ۴۰۰ بانسری اور
۲۰۰ نفیر بوق پر مشتمل تھا۔

ایٹھانی مغلوں کے زمانہ میں شاہزادوں، وزیروں اور فوجی کمانڈروں کو حسب مراتب نقارخانہ رکھنے کی اجازت تھی۔ خود
ایمان ابو سعید کے نقارخانہ کا طبل بہت بڑا تھا جسے ابن بطوطہ نے "طبل الکبیر" لکھا ہے، مغلوں میں اس کا نام کورکا تھا اور ایمان کی وفات
کے بعد توڑ دیا گیا۔ جب کوئی غمی ہو جاتی تھی تو نوبت کا بجانا روک دیا جاتا تھا اور یہ رسم خلیفہ مقتدی کے وقت سے چلی آرہی تھی جس نے اپنے غمی محمد
کی وفات پر پنج وقتہ نوبت کو روک دیا تھا۔ صلاح الدین ایوبی کو جب حروب صلیب جنگ میں پہلی بار اس کو شکست ہوئی تو اس نے بھی نوبت خانہ
بند کر دیا تھا اور جب تک اس کو فتح حاصل نہیں ہوئی بند ہی رکھا۔

تیموری مغلوں میں بھی امراء و وزراء کو حسب مراتب نقارخانہ رکھنے کی اجازت تھی۔ مغلوں کے ہندوستان آنے کے بعد بھی نقارخانہ

لے اس کا قیام عام طور پر دُش (ربیع طالع) کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں۔ فارسی میں گولائی کے لحاظ سے اس کو حاکمہ بھی کہتے ہیں۔ ہندوستان میں دُش بجانے والا تھا
ہوتا ہے۔ یہ حافظ کہتے ہیں۔ "بلک کوس ہی ختم" یعنی شراب میں ڈنک کی چوٹ پیتا ہوں۔ یہ بوق اصل اصل مرثیہ کا ہے، بعد کے عہد
کا بھی بنے لگا جس کی ترقی یافتہ شکل آجکل کا بجل ہے۔ اولیٰ چلیبی کا بیان ہے کہ ہر بوق سب سے پہلے اہل ارسال بوق نے راج کیا اور پھر دوسرے
بوق کہتے تھے۔ نفیر کے معنی جماعت کے ہیں۔ ہندوستان کی تقریری یہاں سے جے شہنائی بھی کہتے ہیں۔

ان کی عظمت کا نشانہ تھا اور بادشاہ کے سوا کسی کی قبر پر بھی قبرت نہ لگتی تھی۔ صاحب سالک الالبصار شاہنشاہ دہلی کی پنج وقتہ نوبت کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ کا نقارخانہ دو سو نقار بولے، ۸۰ کوس، ۲۰ قزاقانہ دس جوڑ جھانچہ پر مشتمل تھا۔ شاہنشاہ اکبر کا نقارخانہ (صاحب مراثی آئین اکبری) ۱۸ جوڑ کوٹنگا (پڑس بیل) ۲۰ جوڑ نقار بول، ۳۰ ڈبل، ۹ شتر تانے، ۴ بڑے قزاق اور ۳ جوڑ جھانچہ پر مشتمل تھا۔ بڑے بڑے امراء اور عہدہ داروں کو بھی نقار خانے رکھنے کی اجازت دی جاتی تھی اور جن امراء کو اس کی اجازت ملتی تھی وہ اپنے گھر میں جھوٹے جھوٹے ڈھونڈے ڈالے رکھتے تھے۔ ترکی میں بھی بادشاہ اور امراء کے یہاں نوبت خانے پائے جاتے تھے۔ سلطان ترکی کے فوجی میڈمیں ۹۲ آدمی تھے اور میڈم اسٹر کو ہاں "میر تہر طبل و العلم" کہتے تھے۔

یورپ کے عہد وسطیٰ میں میڈم کا تصور اسلامی حکومتوں ہی کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا اور ڈھول وغیرہ کا استعمال اس نے ترکی سے سیکھا، بلکہ میڈم کی موسیقی بھی ترکی ہی سے لی، چنانچہ عرصہ تک یورپ میں میڈم کی موسیقی کو ترکی موسیقی ہی کہتے تھے۔ مغلوں کا تخت سے قبل بھی مشرق وسطیٰ میں نقارخانہ اور نوبت کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ غیاث الدین غوری نقارے یا کوس خالص سونے کے بنوائے تھے جو گاڑیوں میں رکھ کر لہاے جاتے تھے۔ خواہ شاہی خاندان کے آخری فرمانروا کے نقارخانہ میں ۲۴ بیل تھے جو سب کے سب سونے کے تھے اور ان میں جواہرات بڑے ہوتے تھے۔

الفرض تمام اسلامی حکومتوں میں نقارخانہ کو قری اہمیت حاصل تھی اور فوجی میڈم کا اطلاق اسی پر ہوتا ہے۔

نگار کے پڑانے پرچے

۳۷ء - سالنامہ (ڈرامہ اصحاب کہن) - مارچ ۶ - اپریل ۷ء - مئی ۸ - جون ۶ - جولائی ۸ - اگست ۸
 ۳۸ء - سالنامہ (فراست التحریر) - مارچ ۶ - جولائی ۶ - اگست ۸ - ستمبر ۷ - اکتوبر ۱۲ - نومبر ۶ - دسمبر ۶ -
 ۳۹ء - فروری ۸ - مئی ۸ - جولائی ۸ - ستمبر ۸ - ۳۹ء - فروری ۸ - سالنامہ (تاریخ اسلامی ہند) -
 اپریل ۸ - مئی ۶ - جون ۶ - جولائی ۶ - اگست ۶ - ستمبر ۶ - اکتوبر ۶ - نومبر ۶ - دسمبر ۶ - ۳۹ء - سالنامہ (صحیفہ شریعت)
 فروری ۶ - مارچ ۶ - اپریل ۸ - مئی ۶ - ۳۹ء - فروری ۶ - مارچ ۶ - اپریل ۶ - مئی ۶ - اکتوبر ۶ -
 ۴۰ء - جون ۶ - دسمبر ۶ - فی فرج ۶ - ۳۹ء - مارچ ۶ - اپریل ۶ - مئی ۶ - اگست ۶ - ستمبر ۶ - اکتوبر ۶ - نومبر ۶ - فی فرج ۶ -
 ۴۱ء - سالنامہ (مضامین شریعت) - ۳۹ء - سالنامہ (قرآن نمبر) - ۳۹ء - اپریل ۶ - اگست ۶ - ستمبر ۶ - اکتوبر ۶ -
 نومبر ۶ - دسمبر ۱۲ - ۳۹ء - فروری ۶ - مارچ ۶ - اگست ۶ - اپریل ۶ - مئی ۶ - جون ۶ - جولائی ۶ - اگست ۶ -
 ستمبر ۱۲ - اکتوبر ۱۲ - دسمبر ۶ - ۳۹ء - سالنامہ (اصولین نمبر) - ۱۲ - مارچ ۱۲ - اگست ۱۲ - ستمبر ۱۲ - اکتوبر ۱۲ - نومبر ۱۲ -
 ۴۰ء - سالنامہ (پاکستان نمبر) - ۳۹ء - مارچ ۱۲ - مئی ۱۲ - جون ۱۲ - جولائی ۱۲ - اگست ۱۲ - ستمبر ۱۲ - نومبر ۱۲ - دسمبر ۱۲ -
 ۴۱ء - سالنامہ (افسانہ نمبر) - مارچ ۱۲ - اپریل ۱۲ - مئی ۱۲ - جون ۱۲ - جولائی ۱۲ - اگست ۱۲ - ۳۹ء - سالنامہ
 (تقدیر نمبر) - مارچ ۱۲ - اپریل ۱۲ - مئی ۱۲ - جون ۱۲ - جولائی ۱۲ - اکتوبر ۱۲ - نومبر ۱۲ - دسمبر ۱۲ -

پیشہ نگار کھنڈ

شکوہ

ترے جہاں میں وہ انساں بھی پائے جاتے ہیں

حقیقتوں پہ بھی جن کو گمانِ خواب رہا
جو فصلِ گل کو سمجھتے رہے سرابِ نظر
خرابِ یورشِ مقررِ مدام جن کے چمن
ازل سے جن کے نشین میں رقصِ برق و شرر
وہ جن کے پیر ہنوں میں بوجہر بے نوری
کبھی ہوا نہ فردِ زان چراغِ قلب و نظر
جہیں پہ وہم کے بادل، غمِ خیال آواہ
نہ دل میں نورِ تمنا نہ خال و خط میں سحر
ہنوز اشکِ مسلسل ہے زندگی جن کی
ہنوز جن کی دُعاؤں کو ہے تلاشِ اثر
نہیں ہے تابشِ ادراک جن کی دنیا میں
جو ظلمتوں میں لٹاتے رہے متاعِ نظر
وہ تیرہ بخت کہ جن کے غریبِ خانوں تک
پہنچ سکی کہیں روشنیِ مہر و قمر
جو غفلتوں کے پجاری ہیں، بے حسی کے غلام
جو ڈھونڈتے ہیں تہی سیپوں میں جوشِ گہر
انہی پہ صرغ ہوئی تیری قوتِ تخلیق !
انہی پہ ختم ہے تیرا کمالِ علم و ہنر !
ہر ایک چیز کو ہے انتظارِ آدمِ نو،
بخوم چشمِ براہ و عینِ نگارِ سحر
یہ صبح و شامِ جہن ! یہ بہارِ تو بہ شکن !
حسین ہے تری فرسودہ کائنات - اگر
یہاں اداس بیاباں بھی پائے جاتے ہیں !!

انتخاب کلام تیر اکبر آبادی

حضرت تیر اکبر آبادی جس دور کے شاعر ہیں وہ گزریا، لیکن اس کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جس کو نادیکہ نہیں
 سہلا سکتا۔ جناب تیر اکبر آبادی انہیں خصوصیات کا تذکرہ کر لیا کہ وہ خصوصیات کیا ہیں، ان کو الفاظ سے ظاہر نہیں
 کیا جاسکتا بلکہ صرف وہاں سے سمجھا جاسکتا ہے۔

نیاز

مرنا تو مقدر تھا صیاد نے غمگت کی جیتے نہ چمن والے جب دورِ خزاں ہوتا
 غلط فہمی نہ ہو جائے کسی کو میری جانب سے خدا کے واسطے دیوانہ کہدو ایک بار اپنا
 وہ ایک تم تمہیں پھولوں پہ بھی نہ آئی منید وہ ایک میں مجھے کانٹوں پر اضطراب نہ تھا
 یہ بھی ہو سکتا ہے کیوں اس چمن آرائے بہار میں ادھر قید سے چھوٹوں او دھر آجائے بہار
 فصل گل یاد خزاں میں مجھے یوں آتی ہے جب کوئی خار چہا۔ میں نے کہا ہائے بہار
 چمن کو کون یوں بر باد ہوتے دیکھ سکتا ہے ٹھہراتا کہ ہند ٹھہیں ہم اس دورِ خزاں کر لیں
 دیا ہوا ہے غم اُن کا۔ چھپائے جاتے ہیں گریہ آنکھوں سے آنسو جو آئے جاتے ہیں
 مایوسیاں پہونچ گئیں حدِ کمال تک جب خاک ہم ہوئے تو ادھر کی ہوا نہیں
 نہ دل بدلا ہمارا اور نہ دل کی آرزو بدلی ہمیں پھر اعتبار انقلاب آسمان کیوں ہو
 اسی دُنیا کی اکثر تینوں نے مجھ کو سمجھا یا کہ ہمت ہو تو پھر بے زہر بھی اک چیز کھانے کی
 امید و بیم میں تیرا بھی اک جنگ بر پاسے مری کشتی لٹ آتی ہے مگر کھانے کا ساحل سے
 نہیں ہے کچھ اور یا مجھ کو ہے یاد اتنا مگر کہ جسک اسیر ہو کر میں جا رہا تھا بہارِ گلشن میں آ رہی تھی
 وہ بھی بچے خواب میں آئے کا وعدہ بھی درست شک گریہم کو شبِ غم مند کے آنے میں ہے
 آؤ ذرا سکون کی دنیا بھی دیکھ لو تم کو شکایتیں تھیں مرے اضطراب کی
 کچھ اس کے آنے سے تسکین سی ہوتی ہے تیر کہاں سے آتی ہے اِدوسرا خدا جانے
 کچھ ایسا ڈوبنے کا نہ ہوتا مجھے طال مشکل یہ آپڑی تھی کہ ساحلِ نظر میں تھا
 صحرایِ وحشتوں میں بھی، پہلا نہ میرا، ہی اب میں یہ کیا کہوں کہ پریشان گھر میں تھا
 پر بھی ہے قلب کی دھڑکن تھا بس وہاں سے امیدوار کہ چلا، اضطراب نہ سنا
 خموش ہو گیا تیر۔ اجل سے کیا ہوتا، شفی وہ بات کہ میں کا کوئی چاہ نہ سنا

اُس نے یوں دیکھا مجھے گویا کہ دیکھا ہی نہیں
 فیضِ ساقی کے لئے تیر نہیں قید و حدود
 پھر بھی مجھ تک اک پیامِ تمام آ ہی گیا
 دور تھا میں، پھر بھی مجھ تک دو پیام آ ہی گیا
 دردِ سخی طلب سے گزر گیا ہوں میں
 وہ بل گئے ہیں۔ مگر اُن کو ڈھونڈتا ہوں میں
 پسینہ پھولوں کو تیر جیسا میں آتا ہے
 نگاہِ سبر کے جو کانٹوں کو دیکھتا ہوں میں
 کروں گا شیب میں انجامِ عشق پر بھی نظر
 ابھی شباب ہے، فرصت مجھے بہت کم ہے
 نہیں کہ درد نہیں۔ میرے دل میں اسے تیر
 گم ہے کہ اب احساسِ درد کچھ کم ہے
 جسے کارِ داں چھوڑ کر بڑھ گیا تھا،
 وہی گردِ اب کارِ واں ہو رہی ہے
 دل سے گرم و سرد کا احساس تک جاتا رہا
 زندگی یہ ہے تو خیر موت کس کا نام ہے

صفیہ شمیم طبع آبادی :-

باغباں کو کوئی اسے کاشِ خبر کر دیتا
 لادِ گل سے شراب بھی شکر سکتے ہیں
 وہ تصور میں یکایک آ گئے
 تجسّر کی صورت بدل کر رہ گئی
 یہ کس کے اتک تھے جو بن گئے و قسیم گل
 یہ کس کے دل کی تمنا بہار ہو کے رہی
 جل بھی شمعِ آرزو لیکن،
 اک دھواں سا ضرور اُٹھتا ہے
 کیا قیامت تھی پر وہ داری غم
 مسکراتے ہی آ گئے آنسو،
 مدت ہوئی گریں تھیں یہاں بجلیاں ہنوز
 وہ رہ کے اُٹھ رہا ہے چین سے دھواں ہنوز
 بیخبر منزلِ مقصود نہیں دور، مگر
 عالمِ ہوش سے ہستی کو گزر جانے دے
 اُن کی نظر کو جرات پرش نہ ہو سکی
 دل غم پر اس قدر ہوا تازاں کبھی کبھی

دردِ سعیدی :-

کر گئی کتنے چاکِ گریباں
 یونہی سی اک جنبشِ دامن
 اہلِ نشین ! سوئے قفس بھی
 جاتی ہے اک راہِ نشین
 لڑاں ہے دیوارِ زنداں
 کوئی رہی ہے برقِ نشین
 یوں بھی گرمی ہے برقِ حادث
 جاک اُٹھی قصدِ نشین
 پھول ہیں، کوئی خار نہیں ہیں
 ایسی بھی کب تنگیِ دامن
 جانے کس منزل پر چھوٹا
 شوقِ طلب میں اُن کا دامن
 درد وہی اُجڑا اُجڑا سا
 یاد آتا ہے اپنا نشین

مطبوعات موصولہ

ستاروں سے ذروں تک مجموعہ ہے جس میں ناطقہ آزاد کی نظموں، رباعیوں اور غزلوں کا جو مجموعہ کے آخری چند مہینوں اور چند ہفتوں کے ابتدائی چند مہینوں میں انھوں نے کہی ہیں۔ انکی نظموں کا ایک مجموعہ ”بیکراں“ جو اس سے قبل شایع ہو چکا ہے، وہ شعریہ و محاورے کے افکار سے تعلق رکھتا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد فساد اور فساد کے بعد ذہنیاتوں میں انقلاب ضروری تھا اور اس انقلاب سے ہمارا ادب بھی کافی متاثر ہوا۔ وہ ادب جو ہندوستان سے پاکستان گئے، ان میں کتنے ایسے ہیں جو وطن کی یاد اپنے ساتھ لے گئے، اس کا صحیح علم ہم کو حاصل نہیں، لیکن پنجاب سے آنے والے بعض ایسے چند و ادیب ہیں اور شاعرانہ کا حال ہی میں معلوم ہے جو ہندو اپنی خانہ بدی پر آنسو بہاتے ہیں اور وطن کی یاد انھیں اب بھی ستاتی ہے۔

ایسے ادیبوں اور شاعروں میں جگن ناتھ آزاد کے تاثرات بہت زیادہ گہرے ہیں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی شاعری کی ابتداء ہی اس وقت سے شروع ہوئی ہے جب وہ ہندوستانی پر مجبور ہو کر پاکستان سے ہندوستان آئے۔

جگن ناتھ آزاد کی محبت سرحد اور وطن پرست طبیعت کا اندازہ کرنے کے لئے ان کی صرف ایک نظم ”سیر پاکستان“ کا مطالعہ کافی ہے جس میں انھوں نے اپنا دل چیر کر سامنے رکھ دیا ہے اور جس کے ایک ایک لفظ سے ان کی شغف کی وطن خون جگر جیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب وہ پاکستان جانے کے لئے ہوائی جہاز پر سوار ہوئے ہیں تو پیار سے خطاب کرتے ہوئے وہ سب کچھ کہ جاتے ہیں جو شاید مجنوں نے محفل ملی کو دیکھ کر کسی وقت کہا ہوگا:-

گزرے ہوئے دور کو بلانے والے	بچھڑی ہوئی دنیا سے ملانے والے
اشد تجھے اور سبک بال کرے	اب مجھ کو وطن میں لے کے جانے والے
آہوئے مریدہ کو حق میں لے جا	بچھڑے ہوئے بلب کو چین میں لے جا
آزاد کے مقرر ہیں یا رانِ وطن	آزاد کو یا رانِ وطن میں لے جا

اس کے بعد جب وہ لاہور پہنچتے ہیں تو وہ اپنے جذبات مسرت سے مغلوب ہو کر کہہ اٹھتے ہیں:-

چھوڑی ہوئی انجمن میں واپس آیا	مجبور وطن، وطن میں واپس آیا
اے اہل چین، چین میں اعلانِ کھرد	خبرائے چین، چین میں واپس آیا

اس کے بعد جب لوٹتے ہیں تو ان کا دل بھر آتا ہے اور بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ:-

دل میں نہ غمِ تازہ بسا لاتا میں	اے کاش نیوں جلد ہیٹ آتا میں،
اشجارِ وطن کی چھاؤں میں دم لینے	اے کاش ذرا اور ٹھہر جاتا میں،

ان اشعار سے جس پر خلوص و الہانہ کیفیت کا اظہار ہوتا ہے، وہ کوئی مستعار چیز نہیں ہو سکتی، اس کا تعلق یکسر صداقت احساس سے ہے اور جس شاعر میں فطرت ایسی پاکیزہ میں ہو اس کے کلام میں جوش و صداقت و محبت سمجھی کچھ ہوتا چاہئے۔

تقسیم ہند کے بعد فساد و غور نری نے جگن ناتھ آزاد کے دل میں جذبہ انتہام پیدا نہیں کیا، بلکہ ان جذبات محبت و انسانیت کو بیدار

کر دیا جو اس وقت تک ان کے دل میں سو رہے تھے اور وہ دفعتاً شاعری کی اس منزل پر پہنچ گئے جہاں تک بہت کم شاعروں کی رسائی ہوتی ہے آزاد ملک کی آزادی کو جس نقطہ نظر سے دیکھتا ہے وہ سیاسی نہیں بلکہ اخلاقی ہے اور اس لئے وہ اس پر آنسو بہاتا ہے اور ایسی آزادی پر جو گوشت سے ناخن جدا کر دینے والی ہو اس کا دل ہر وقت دکھتا رہتا ہے، چنانچہ جس وقت جشن آزادی کی شرکت کے لئے اسے دعوت دی جاتی ہے تو وہ اس کا جواب الہ الفاظ میں دیتا ہے،

مجھے کیا پھر نوید جشن آزادی سنا ہے ہو

نہیں بھولا ابھی تک میں چین زاروں پر کیا گری

گرا پھر کی صورت خاک پر ہر قطرہ باران،

نہیں جل اٹھے شافیں گری اشجار سے کٹ کر

خلیص و صدق پر تھی بزم ارباب چین قائم،

دو مینا دیں نہیں یکسر وہ محفل جل گئی گویا

پیش لفظ میں خود آزاد نے اپنی شاعری کے متعلق یہ لکھ لکھا ہے کہ ”چونکہ دیکھتا ہوں، سنتا ہوں، اور محسوس کرتا ہوں اسی سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہوں“ اور چونکہ ان کا یہ دیکھنا، سنانا اور محسوس کرنا ایسے زمانہ میں ہوا جب ”ادھر کی دنیا ادھر“ ہو رہی تھی، اس لئے یہی رنگ ان کی شاعری کا بھی ہے اور ان کو گراہ ان کے ہر شعر میں بھی ہوتی ہے۔ خواہ وہ شعر نظم کا ہو یا غزل کا اور اس لئے ان کی غزلیں بھی تسلسل بیان کی وجہ سے نظم ہی کا انداز رکھتی ہیں اور اکثر غیر موزون ہیں۔ مثلاً:-

تری نو اسے شکایت ہے مجھ کو مرغ چین

قصص نصیب پر ندوں کو سازگار نہیں

نصیب سبزہ خواہید کا: جاگ رہا

خرام گردش دوران ذرا تو ہلت دے

ترسے ہی ساتھ مجھے بھی سفر پہ جانا ہے

کوئی نہ ہم کو ہے نہ ہے رفیق کہیں

وطن سے دوری منزل کا یہ سوال نہیں

کنا رہ سندھ پہ ہم جس کو چھوڑ آئے ہیں

وہ تجھ میں بات کہاں آئے دیا رنگ و چین

اس مجموعہ میں جا بجا ان کی رباعیاں بھی نظر آتی ہیں، لیکن زندگی و سرسری کی جگہ ان میں بھی وہی درد و سوز پایا جاتا ہے جو آزاد کی شاعری کی جان ہے مثلاً:-

نیکے جو چین سے نغمہ سنجان چین

پہلوؤں کا کہیں نشان نہ تھا گلشن میں

اسے منظر بقیار دم بھر تو ٹھہر

جی بھر کے میں اکبار تجھے دیکھ تو لوں

اس مجموعہ کی سب سے پہلی نظم ”میرامو ضوع سخن“ بہت اہم ہے۔ جس میں انھوں نے اپنی فکر کے تمام پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے گویا

ایک ”شہر آشوب انسانیت“ پیش کیا ہے۔

آزاد کے کلام کی ایک اور خصوصیت جو اولین نگاہ میں سامنے آ جاتی ہے، اس کا بڑی حد تک بے عیب پر ہے۔ آزاد کا رسمی تراکیب

استعمال کرتے ہیں لیکن مقلد نہیں بلکہ "کار آگاہانہ" جس سے اُن کے وسیع وصالِ مطالعہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان کی شاعری کا پس منظر دیگر روایاتِ ماضی سے علحدہ نہیں ہے، اس لئے اس میں ترمیم بھی پوری طرح پایا جاتا ہے اور ذہنِ سامع اس سے کافی متاثر ہوتا ہے ایک وہ نظمیں انھوں نے "آزاد شاعری" کے انداز کی بھی لکھی ہیں، لیکن وہ کامیاب نہیں ہیں۔ کیونکہ اس آرٹ کے لئے ان کا مزاج موزوں نہیں ہے۔ ان کے متفرق اشعار میں سے بعض اشعار قطعاً غیر فانی ہیں مثلاً:-

میں نے پوچھا کہ زندگی کیا ہے ہاتھ سے گرے جام ٹوٹ گیا
تو کہاں ہے بادختران کہ پھر چین کو تیری جی تجو وہ فضا میں رنگ بکھر گیا وہ زمیں پہ پھول ٹھکرائے

یہ مجموعہ اچھی طباعت و کتابت کے ساتھ جلد شائع ہوا ہے اور دورِ روپیہ بارہ آٹے میں کتبہ شاہراہ دہلی سے مل سکتا ہے۔

مجموعہ ہے فکر تو نسوی کے چند مقالات کا جو تقسیم ہند کے بعد دو سال کے اندر لکھے گئے تھے۔ فکر تو نسوی طنز نگار ادیب ہیں اور طنز نگار انداز ہی میں انھوں نے تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والے مسائل پر ان مقالات میں اظہارِ خیال کیا ہے۔

ادب میں مزاح نگاری اور طنز نگاری دو علحدہ علحدہ چیزیں سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان دونوں کا بعد گرتا گرتا تعلق ہے کہ کوئی مزاح نگار اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ طنز نگاری پر قادر نہ ہو، اسی طرح اگر طنز نگار میں مہم (Humour) نہ ہو تو وہ قطعاً ناکام رہے گا۔

فکر تو نسوی کی طنز نگاری میں خرافات کا عنصر ضرور پایا جاتا ہے، لیکن اس میں بجائے بے ساختگی کے تکلف و آوری ہے اور اسی لئے بہت اگلا اگلا سا نظر آتا ہے۔

طنز نگار نقاد سے زیادہ محاسب ہوتا ہے، اس لئے اس کے یہاں تنقید زیادہ ہوتی ہے، لیکن یہ تنقید زیادہ فلسفیانہ انداز کی ہوتی ہے، فکر تو نسوی کے یہاں یہ تنقید زیادہ تر شخصی و عامیانہ ہے اور اس میں وہ شاید ایک حد تک معذور بھی تھے، کیونکہ یہ بھی انھیں لوگوں میں سے ہیں جن کو فساد کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان آنا پڑا اور یہاں ان کو عوام ہی سے واسطہ پڑا جو اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکتے تھے۔

اس مجموعہ میں چودہ مضامین ہیں اور ان سب کا تعلق ان ذہنی انقلابات سے ہے جن کا تقسیم ہند کے بعد ہندک اور افراد حکومت میں پیدا ہوا گزیر تھا بعض مضامین میں ان کا طنز کامیاب ہے اور بعض میں ان کا احتساب ادب کے حدود سے آگے گزر گیا ہے۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ فکر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس میں خلوص و صداقت کا عنصر ضرور پایا جاتا ہے اور ان کا مقصد تحریک نہیں تعمیر ہے۔

مصنف نے دریا چہ میں طنز پر رنگ اختیار کرنے کا یہ سبب بیان کیا ہے کہ:-

"جب سامراجیوں نے ملک بانٹا، تو میں نے ایک فٹ محسوس کیا کہ لوگوں کی باتوں کا ایک خاص روپ کچھ زیادہ ہی تیز ہوتا جا رہا ہے اور

یہ روپ تھا۔ طنز۔ چنانچہ لوگ ایسی باتیں کرنے لگے جیسے وہ کروٹ کیلے گھونٹ پینے پر مجبور کر دئے گئے ہوں اور پھر پینے کے بعد یہ کہ

سہ ہوں کہ "جی ہاں بالکل شہد ہے شہد" باتوں کا یہ انداز میرے لئے ایک ہمیز سے کم نہ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے طنز کا کوئی آتش نشان

پہاڑ ٹھٹ گیا ہے اور لکھنؤ، بازاروں، محلوں، میڑوں اور دروازہ پر نہر پر گرم گرم لاوے کی طرح رہا ہے۔

چنانچہ لوگوں کی باتوں کے اس تیکھے روپ نے مجھے ایک فٹ طنز نگار بنا دیا۔"

اس میں شک نہیں ایک ادیب کے لئے جس میں طنز نگاری کی اہلیت موجود ہو، یہ حالات ضرور ایسے تھے کہ اس کی طنز نگاری بروئے کار آجاتی لیکن چونکہ جذبات شدید اور احساس زیادہ تیز تھا اس لئے ایک "حار مرض" کی سی ہے چینی اس میں پیدا ہو گئی اور مصنف کو یہ سمجھنے کا کم موقع ملا کہ اگر وہ ان حالات سے زیادہ فائز ہو جائے تو ان کا رنگ بخیر کیا ہوتا۔

ان مضامین میں بھی انداز کی انھیں مسائل کو لیا گیا ہے جو موجودہ "بحرانی دور" میں ہمارے شاعروں کے پیشِ نظر ہیں اور انھیں عوامی

گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے جو فرقہ پرستی، رجعت پسندی اور حکومت کی نااہلی کی وجہ سے اور زیادہ الجھتی جا رہی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بعض مقالات میں وہ خاصی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں، اس قسم کے مضمین میں جو راہ، شراب قمار، والگہ کی ہنر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ آسانی کتاب ان کا ایک طویل مضمون ممکن ہے بعض کے نزدیک صحیح طنز نگاری کے حدود میں آتا ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہی مضمون ایسا ہے جو اس مجموعہ میں شامل نہ ہونا چاہئے تھا۔ اس میں ضرورت سے زیادہ تکلف و تصنع پیدا ہو گیا اور طنز و مزاح دونوں سے خالی معلوم ہوتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے فکر و تنقیدی کا یہ ادبی تجربہ سراسر جانے کے قابل ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اگر انھوں نے یہ رنگ چھوڑ کر دوسرا رنگ نہ اختیار کیا تو چند دن کے بعد وہ اچھے طنز نگار بن سکیں گے اور زبان و بیان کی الجھن دنا ہماری بھی بڑی حد تک دور ہو جائے گی۔ یہ مجموعہ جلد شائع کیا گیا ہے اور ۲۰ صفحات کو محیط ہے۔ قیمت دو روپیہ بارہ آنے اور پتے کا پتہ: مکتبہ شاہراہ دہلی۔

میراث مجموعہ ہے پرکاش پنڈت کے تیرہ افسانوں اور ایک پیش لفظ کا حصہ ممتاز حسین صاحب (کراچی) نے تحریر کیا ہے۔ کتاب کے گرد پوش پر کرشن چندر، احتشام حسین اور کھنیا لال کچور کی رائیں درج ہیں جن میں سے دو مشہور فسانہ نگار اور ایک مشہور نقاد ہیں۔

کرشن چندر کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ:- ”پرکاش پنڈت نے اپنے سماجی تجربے، احوال اور زندگی کا دوش سے اس سماجی شعور کو پایا ہے جس کے بغیر موجودہ سماج کے تکلیف دہ سوال کسی طرح حل نہیں ہوسکتے، اس لئے ان کے افسانے حیات افروز ہیں۔“

کھنیا لال کچور کے نزدیک پرکاش پنڈت ”ذہن انسانی کے آزمودہ (آزمودہ کار ۹) اور ہوشیار سیاح ہیں، انھیں علم نفسیات سے شغف ہی نہیں بلکہ اس پر پورا عبور حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کرداروں سے روشناس ہو کر قاری سوچتا ہے کہ افسانہ نگار کی نگاہ دور رس“

”دلی وجوہ“ کو چیرتی ہوئی جا رہی ہے۔“

احتشام حسین کا خیال ہے کہ ”پرکاش پنڈت کے افسانے زندگی کے افسانے ہیں، سادہ اور سچے۔ فن زندگی کے تعلق کو انھوں نے سمجھا ہے اور یہی افسانہ نگاری کی حیثیت سے ان کا کامیابی کی شاہراہ ہے۔“

پیش لفظ میں ممتاز حسین نے زیادہ شرح و بسط کے ساتھ فسانہ نگاری کی فنی خصوصیات پر تبصرہ کیا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ”اللہ میں فسانہ لکھنے کی صلاحیت فطری ہے۔ ان کو انسانی نفسیات کی پُر پیچ راہوں میں اترنے کا بڑا اچھا سلیقہ حاصل ہے۔“

ان راہوں کے ساتھ یہ کتاب شائع ہوئی ہے اور جب مجھے کسی کتاب کے پڑھنے کی فرصت نہیں ہوتی تو میں ہمیشہ ایسی راہوں پر اعتماد کر لیا کرتا ہوں، چنانچہ اس کتاب کے باب میں بھی میرا کچھ ایسا ہی ارادہ تھا، لیکن رفتی گردانی کے سلسلہ میں ایک افسانہ میں نے پڑھ ہی لیا اور اسکے پڑھنے کے بعد میرا یہ اعتماد دل چاہا کہ باقی افسانے بھی دیکھ ڈالوں اور آخر کار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ نفسیاتی نقطہ نظر سے ہمارے یہاں کم کسی نے اتنے اچھے افسانے لکھے ہوں جتنے پرکاش پنڈت نے لکھے ہیں۔ اردو میں افسانہ نگاری کا موجودہ رنگ وہی ہے جو کسی وقت روس میں پایا جاتا تھا اور چیخوف جس کا علمبردار تھا۔

ادب کی ترقی کا پہلا دور تقلید اور دوسرا اجتہاد ہوا کرتا ہے، ہم ابھی تک غالب پہلے ہی دور میں ہیں اور اسی لئے ہمارے موجودہ افسانہ نگار زیادہ تر روسی افسانہ نگاروں کی تقلید کرتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ آئندہ چل کر کوئی اجتہاد ہی صورت بھی پیدا ہو جائے۔

پرکاش پنڈت کے افسانے زیادہ چیخوف کے رنگ کے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بڑی کامیابی کے ساتھ انھوں نے اس رنگ کو نبھایا ہے۔

طباعت و کتابت وغیرہ کے لحاظ سے یہ کتاب مکتبہ شاہراہ دہلی نے بہت اچھی شائع کی ہے۔ قیمت تین روپیہ - حجم ۲۲۲ صفحات -

ناول کیا ہے یہ کتاب لکھنؤ یونیورسٹی کے دو استادوں کی متحدہ کوشش کا نتیجہ ہے ان میں سے ایک ڈاکٹر محمد آسن فاروقی انگریزی کے استاد ہیں اور دوسرے ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اردو کے، اس نے مفہم و عبارت دونوں شعبوں میں

اس کو مکمل ہونا چاہیے۔

یہ کتاب دس ابواب میں منقسم ہے۔ سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ ناول کے عناصر ترکیبی کیا ہیں، اس کے بعد ناول اور زندگی کے تعلق پر گفتگو کر کے اس کی ہیئت اور اس کے اقسام سے بحث کی گئی ہے۔ اخیر کے چند ابواب میں ناول کی اہمیت، اس کے ارتقاء اور مستقبل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

اب سے تیس چالیس سال قبل چمنہ ہمارے یہاں زیادہ تر لوگوں کو ناول ہی پڑھنے کا شوق تھا اس لئے اس وقت بہت سے انگریزی ناولوں کا ترجمہ ہوا اور خود ہمارے یہاں بھی چند مشہور ناول نگار پیدا ہوئے جن میں رسوا، شرر، حکیم محمد علی اور احمد حسین نے خاص شہرت حاصل کی۔ اس کے بعد لوگوں کو افسانوں کے پڑھنے کا شوق ہوا اور ناولوں کی مانگ کم ہو گئی۔ لیکن اب پھر ان لوگوں کا رجحان ناول کی طرف ہوا ہے اور اس لئے اس کتاب کی اشاعت یقیناً بر محل ہوئی ہے۔

تاریخی و فنی حیثیت سے اس کتاب میں زیادہ تر مغربی ناول نگاروں کو سامنے رکھ کر گفتگو کی گئی ہے اور کافی تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ناول کی وہ کیا خصوصیات ہیں جو مغربی ادیبوں کے یہاں پائی جاتی ہیں اور ہمارے یہاں اس وقت تک پٹنے ناول لکھے گئے ہیں انکی نوعیت کیا تھی۔

اس کتاب کا آٹھواں باب جس میں اردو ناول نویسی پر تاریخی و فنی تبصرہ کیا گیا ہے بہت اہم ہے۔ فاضل مصنفین نے اس باب میں سب سے پہلے اندر سے قبل کی قصوں کہانیوں کا مختصر سا ذکر کیا ہے اور پھر آرائش محفل، توتا کہانی، چہار درویش، فساد عجائب، داستان امیر حمزہ اور طلسم پوش ربا وغیرہ کا اجمالی ذکر کرتے ہوئے ۱۹۵۷ء کے بعد کے اس دور کو لیا ہے جو ڈپٹی نذیر احمد اور شرر و سرشار کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے اور اس پر کافی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے، اخیر میں انھوں نے عہد حاضر کے ناول نگاروں کا ذکر کر کے ان کے خصوصیات پر بھی اچھی روشنی ڈالی ہے۔ الغرض یہ کتاب ان تمام حضرات کے لئے جو ناول کا ذوق رکھتے ہیں یا ناول نگاری کرنا چاہتے ہیں، بہت مفید و کار آمد ہے۔

کتابت و طباعت بہت روشن ہے اور کاغذ بھی اچھا استعمال کیا گیا ہے۔ قیمت بجا، حجم ۲۰ صفحات۔ نئے کا پتہ:۔ دانش محل لکھنؤ۔
ذکر غالب دوسرا اڈیشن ہے، مالک آرام صاحب ام۔ اس کی تالیف کا جو اس سے قبل شایع ہو کر ملک میں کافی مشہور و مقبول ہو چکا ہے۔ اس اڈیشن میں فاضل مولف نے بہت سی نئی باتوں کا اضافہ کیا ہے جو پہلا اڈیشن کی اشاعت کے بعد ان کے علم میں آئیں، حالی کی یادگار غالب کے بعد غالب پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا گیا ہے اور متعدد کتابیں اس موضوع پر شایع ہو چکی ہیں، لیکن ان میں دو ہی چار ایسی ہیں جو سیاری حیثیت رکھتی ہیں، اول انھیں میں سے ایک ذکر غالب بھی ہے۔

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں غالب کے سوانح حیات پیش کئے گئے ہیں، دوسرے باب میں ان کی تصانیف کا ذکر ہے اور تیسرے میں ان کے عادات و اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ہر بحث میں تمام جزئیات کا احاطہ کرتے ہوئے صحت و تحقیق کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ اردو تذکرہ نگاری کا قدیم رنگ سب سے پہلے حالی اور آزاد نے بدلا۔ ایک نے یادگار غالب لکھ کر اور دوسرے نے آپ حیات۔ لیکن جس حد تک مورخ کاوش و جستجو کا تعلق ہے ہم اس سلسلہ میں مرتن حالی اور یادگار غالب ہی کا ذکر کر سکتے ہیں، کیونکہ آپ حیات اپنی طرز تحریر کے لحاظ سے خواہ کچھ ہو، لیکن صحت و اطمینان کے لحاظ سے وہ کچھ نہیں ہے۔ ان کتابوں کی اشاعت کے بعد ہمارے ادیبوں میں صحیح تذکرہ نگاری کا احساس پیدا ہوا اور جس حد تک غالب کا تعلق ہے سب سے پہلے ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے اس طرح کام کیا، گو انھوں نے بھی مقدمہ میں زیادہ تر شعری سے کام لیا ہے۔

اس کے بعد غالب پر دیر چ کرنے کی طرف لوگوں کو توجہ ہوئی اور اس سلسلہ میں جو کتابیں شایع ہوئیں، ان میں علاوہ ان کتابوں کے جو کتب خانہ رامپور کے ناظم سلاطین حشری نے مرتب کی ہیں، غلام رسول جبر کی کتاب غالب، محمد اکرم صاحب کا غالب نامہ اور۔

نگار کے پُرانے فائل

..... ۶۳۱ - ۶۳۲ - ۶۳۵
 ۶۳۶ - ۶۳۷ - ۶۳۸ - ۶۳۹ - ۶۴۰ - ۶۴۱
 ۶۴۲ - ۶۴۳ - ۶۴۴ - ۶۴۵ - ۶۴۶ - ۶۴۷
 اور ۱۵۰ کے مکمل فائل۔ قیمت فی مکمل فائل مع محصول دس روپے
 جلائی نمبر ۳۲ = قیمت مع محصول پانچ روپے۔
 منیجر نگار۔ لکھنؤ

رعایتی قیمت

مجموعہ ستفسار وجواب

کی تیسری جلد


ضخامت ۷۰ صفحات۔ جس کی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ ہے، لیکن
 اب آپ کو مع محصول صرف دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

مرزا شوق لکھنوی کا تنقیدی مطالعہ

(از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

مرزا شوق، جاں عالم و اجداد علی شاہ کے لکھنؤ کے شاعر تھے۔ ان کی لکھنوی
 کا تنقیدی مطالعہ عصر ادب کے محرکات اور میلانات کو سمجھنے کے لئے
 ضروری ہے بلکہ اس تہذیبی ماحول کو جاننے کے لئے بھی جب یہ معلوم
 ہوتا تھا کہ حکم قضا کو جام شراب کی گردش سے پیر دیا گیا ہے۔
 قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

خونِ صبا کرکھی فُتد رتی دوا فی



قیمت فی شیشی صرا یک روپیہ ہر جگہ بکتی ہے
 ہمدرد دوا خانہ وقف دہلی

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب پرانی ہندوستانی جہازیں

بکرا اور ریشم

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مالی لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ

مبئی سے

عدن، جدہ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان چارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی
اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ضرورت پڑنے پر
دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کر سکیں گے

مزید معلومات کے لئے

حسب ذیل پتہ پر لکھیں

ٹرنر مارین انڈیا کمپنی لمیٹڈ

۱۶، بنگلہ سٹریٹ ممبئی

۵/۹۱
 جہڑ ڈنبرک ۱۳۹۹
 پونجی ڈاؤن لایڈ سیکرٹری
 ملی سٹریٹ

14 MAY 1951



ہندوستان و پاکستان ووزن بک
 قیمت فی کاپی ۱۰/-
 سارا دیکھو پاکستان و ہندوستان
 ۱۰/-

پونجی ڈاؤن لایڈ سیکرٹری
 ملی سٹریٹ

تصانیف نیاز فنیچوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

من ویزدال

بڑھی استفسارات و جوابات
یعنی

من ویزوال کا دو ستر حصہ

اس حصہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے :- اصحاب کعبہ - معجزہ کرامت -

انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفانِ نوح۔
خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاسع کی روشنی میں۔ یونس اور

سمن یوسف لی داستان - قاضی - سامری علی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

مولانا تیار فچوری کی ۴۴ سالہ دور تصنیف صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ حسین اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو ”انسانیت کبریٰ“ و اخوتِ عامہ کے ایک شتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور حسین مذاہب کی تخلیق دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند افشار اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

صفحہ ۶۲، صفحات۔ مجلہ سات روپیہ اکٹھا آنے پر

علاوہ محصول

بنگمارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور

افسانوں کا مجموعہ، بنگلہ دیش میں

جو درج قبول حاصل کیا اس کا اندازہ ہے

ہو سکتا ہے کہ اسکے سوا مضامین غیر بائوس

مقتل کیے گئے۔ اس ڈیشن میں متعدد

افسانے نوابی مقالات ایسے اضافہ کیے

کے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔

اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہو

جمستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور ادیب نگار کے افسانوں اور مقالہ ادبی کا

افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں دوسرا مجموعہ جس میں حسین بیگ خدیو کی داستان

جود و جہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ ہے اور پاکیزگی خیال کو بہترین شہادت کے

ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر ناپسندیدہ ہوں گے۔ علاوہ بہت سے جماعتی و محافضی مسائل کا حل

متصل کیے گئے۔ اس ڈیشن میں متعدد بھی فطرت کے احکا۔ ہر فسانہ اور ہر متعال

افسانے اپنی مقالات ایسے افسانہ کی اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

لکے میں جو پچھلے ایڈیشنز میں نہ تھے۔ اس ایڈیشن میں متعدد نئے مضامین

اس لیے صفحات بھی زیادہ ہو گئے ہیں جو پہلے اسیٹون میں تھے

حسن کی عیاریاں

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور اظہارِ فکر کے افسانوں، رشتہٴ ادبی کا اور دوسرے افسانے

افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں دیراجموبہ حبیب حسن بٹان محمد بٹان حضور نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ

جود و قبول حاصل کیا اس کا اندازہ ہے اور بگڑی خیال کو بہترین چکاؤس کہ جس میں تہذیب اور انشا و لطیف کا بہترین

ہندوستان ہر کس کے متعدد مضامین غیر قابل
علاوہ بہت سے جماعتی و معاشرتی مسائل
احراج آپ کو نظر آیا اور ان مسائل کو حل

قتل کی گئی۔ اس ڈین میں متعدد بھی نظر آئے گا۔ ہر فساد اور ہر مقالہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ کون کون سے بھولے

افسانہ ادبی مقالات ایسے افسانہ کیے اپنی جگہ ہجو ادب کی تثلیث کہتا ہے جو اوراق میر تقی میر کی کوشش حقیقتیں پر مشیہ

کے جس جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس ایڈیشن میں متعدد نئے مضامین

اس لیے صفحات بھی زیادہ ہو گئے۔ اُن کے اِس جوہر سے آئینوں میں سے زیادہ دلش بنادیا ہو۔

ترغیبات جنسی یا

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور ادیب نگار کے افسانوں اور مقالہ ادبی کا اور دوسرے افسانے شہوانیات مجلد

افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں دوسرا مجموعہ حسین بیجان قدرت بیان حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ اس کتاب میں فیاضی کی تمام فطری

جود و جہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ ہے کہ اور پاکیزگی خیال کو بہترین شاہکاروں کے جیسے مسیح اور انشاء اللہ علیہ السلام کا بہترین غیر فطری تمسک کہ ملائی یا ایسی نفسیاتی

ہو سکتا ہو کہ اس کے متغیر مضامین غیر ثابت ہیں۔ علاوہ اس کے تمام ہی معارف میں اس کا صلہ اجزائے ایک نظر سے دیکھا اور ان مسائل کو اس کے بغیر نہایت شرح و بسط کے ساتھ تصدیق کرتے

قتل کی گئی۔ اس ڈین میں متعدد بھی فطرت کا گما ہر فساد اور تعالٰی سے آپ بڑا وضع ہو گا کہ اللہ کے بھوت کیا گیا ہو کہ فی حاشیہ دنیا میں گنہگار ہو

افسانہ دینی مقالات ایسا افسانہ ہے اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو ادق میں کتنی کوشش حقیقتیں پیش کرتا ہے۔

کے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس ایڈیشن میں متعدد نئے اضافہ
 تھے جن میں حضرت یاز کی انٹارنس اور میں لکھتی ہوئی اس کتاب میں ایک اور

اس لیے صفحہ مت بھی زیادہ ہو گئے ہیں جو پہلے دستوں میں سے زیادہ دلش بنادیا ہو۔

ضروری اعلان

پاکستان کے خریدار اور ایجنٹ صاحبان کے لئے

پاکستان کے بعض حضرات کا مطالبہ ہے کہ نگار اور مکتبہ نگار کی کتابوں کی قیمت بھی اسی شرح تبادلہ کو سامنے رکھ کر متعین کی جائے جسے دونوں حکومتوں نے تسلیم کر لیا ہے، لیکن وہ اس حقیقت کو سامنے نہیں رکھتے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو مفاہمت ہوئی ہے اس کا تعلق زیادہ تر مال کے تبادلہ سے ہے یعنی جس قیمت کا مال پاکستان سے ہندوستان آئے گا اتنی ہی قیمت کا مال ہندوستان سے پاکستان جائے گا، نقد نہ ادا کرے گا، نہ وہ۔ اسی طرح بعض بڑے بڑے تاجروں کے لئے بھی یہ آسانی پیدا کی گئی ہے کہ وہ بلکول کے ذریعہ سے مال ادا کر دے بھیج سکیں، لیکن عام پبلک کے لئے اس وقت تک کچھ نہیں کیا گیا۔ پبلک شرح تبادلہ سے اسی وقت نایاب ہوا ٹھاسکتی ہے جب چھوٹی سی چھوٹی رقم بھی یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں بھیجی جاسکے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک منی آرڈر کی آمد و رفت شروع نہ ہو جائے۔ اس لئے ہم اپنے تمام کرمفران پاکستان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس باب میں تدریجاً صبر و تحمل سے کام لیں۔ ہم قطعاً ان سے کوئی زائد رقم لینا نہیں چاہتے اور جس چیز کی جو قیمت ہمیں یہاں ملتی ہے، وہی اتنے بھی چاہتے ہیں۔ منجر

نگار کا آئندہ سالنامہ

ایک ایسی معرکہ الآرا تصنیف ہوگی جسکی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت،

یعنی

اردو زبان کی لسانی تاریخ

(پروفیسر شوکت سبزواری کے قلم سے)

جس میں اردو زبان کے آخذ کا کھوج کیا گیا ہے اور اس کے تمام صوتی، صرفی، نحوی سرایہ کی مفصل و جامع تاریخ پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب نتیجہ ہے ساہا سال کے غایر مطالعہ کا اور علاوہ طلبہ کے ہر اس شخص کے لئے بھی جو اردو زبان سے دلچسپی رکھتا ہے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ یہ کتاب نگار کے سائز پر نہیں بلکہ کتابی سائز پر شائع ہوگی اور تقریباً ۵۰۰ صفحات کو محیط ہوگی۔ اس کی قیمت چار روپیہ ہوگی، لیکن نگار کے مستقل خریداروں کو صرف ڈیڑھ روپیہ میں مل سکے گی۔

اس لئے وہ حضرات جسے کاچندہ دسمبر ۱۹۵۷ء میں ختم ہو رہا ہے ابھی سے نوٹ کریں کہ ان کے نام سالانہ دیوی ساتھ پتہ تیرہ آنے میں بھیجا جائے گا۔ جن کاچندہ ۱۹۵۷ء کے کسی فیچر میں ختم ہوتا ہے ان کے نام سالنامہ کا دیوی اپنی ایک روپیہ تیرہ آنے میں روانہ ہوگا۔

پیش کی چندہ بھیجنے والے پانچ آنے زائد مصارف و جہتوں کے لئے ضرور روانہ فرمائیں۔ منجر نگار

دنیا میں اپنی نوعیت کی سب سے پہلی کتاب

پچھن سال کے بعد

یہ کتاب آئندہ جولائی ۱۹۵۷ء کے نگار میں تمام دو کمال کتابی سائز پر شائع ہو رہی ہو "نفعیات علمی" کے حیرت ناک نتائج پر یہ بالکل پہلی کتاب ہے۔ ادب و انشاء کے لحاظ سے بھی اپنا جواب نہیں دیتی۔ دیکھیں اتنی ہو کہ آپ اس میں لکھ جائیں۔ مفید و مستند کہ آپ اپنے آپ کو حقیقی معنی میں پالیں۔ مفصل اشتہار آئندہ اشاعت میں ملاحظہ ہو۔
خیر خیر اراک نگار کے لیے جیت دو دو پیسہ
میخبر نگار

شمار ۵

فہرست مضامین مئی ۱۹۵۷ء

جلد ۵۹

۲۸	ادبیات ملایا پر فارسی کا اثر	۲	ملاحظات
۲۹	غیر متوقعات	۵	آتش اور شاد
۳۱	مختصرات	۱۳	سرقہ، توار، استفادہ
۳۳	مئی کی ایک دوپہر (نظم)	۲۲	تاریخ یونان کا ایک پوشیدہ ورق
۳۵	صبح نشور (نظم)	۲۵	توت بخند اور روحانی تصورات
۳۶	غزلیات	۲۸	امیر وراثت کا تقابلی مطالعہ
۳۷	اشتہارات	۳۶	باب الاستفسار

ملاحظات

کوریا کی جنگ عالمگیر جنگ کی تمہید ہے جب سے کوریا کی لڑائی شروع ہوئی ہے، سب سے زیادہ اہم واقعہ جس نے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، جنرل میک آر تھر کی معزولی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زانہ سانس لینے کے لئے شاید کچھ دیر کو ٹھہر گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ آئندہ اس کے انتہاب و اشتعال میں کچھ کمی ہو جائے، لیکن وقت کے بغض شناس جانتے ہیں کہ اس وقفہ مسکون کی کیا حقیقت ہے اور جنگ کے بحر اوق میں اس سے کسی کمی کی توقع رکھنا عجیب ہے۔

اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک مریض شدید تپ میں مبتلا ہو اور کسی وقت جب اس کا ذہن کم ہو جائے تو اسکے بیمار وار بھیگ کر خوش ہو جائیں کہ اب بیمار اچھا ہو چلا ہے، حالانکہ طبیب جانتا ہے کہ تب اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک اس کا حقیقی سبب خالی ہو بالکل ہی حال کوریا کی لڑائی کا ہے کہ اس کا تعلق جنرل میک آر تھر کی ذات سے ہے نہ ٹرومین کی شخصیت سے، بلکہ اس عالم خون و جنوں سے ہے، جو اشتراکیت کے اندیشہ سے اس وقت تمام سراپا پرست حکومتوں پر طاری ہے اور جس کے دور چمکنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

گوکہ میں امریکہ کا اپنی نوعیت کا انار میک آر تھر کے گھٹک کرنے کے لئے ٹرومین کا امریکہ سے ایسا ہے اور میک آر تھر کا معزل کرنا

جانا، سب کی سب مذہبی حرکات نہیں، جو بالکل بے اختیارانہ طور پر سرزد ہوئیں اور جن سے بجائے صحت و سکون کے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں عالمِ احتضار تو قریب نہیں آگیا؟

امریکہ اور اس کے تمام حواریین کہتے تو یہی ہیں کہ وہ دنیا میں امن و سکون قائم کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں، لیکن دل کی جو بات ہے وہ زبان پر نہیں لاتے اور اس قارون کا ذکر نہیں کرتے جو ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے اور جس نے جملہ انسانی و اخلاقی اساسات کو محو کر دیا ہے۔

ان کو سچے بڑے شکایت یہ ہے کہ روس کے پاس ۲۰۰ ڈویژن فوج کیوں موجود ہے وہ کیوں اپنی بکری قوت کو نہایت تیزی سے بڑھاتا جا رہا ہے، اس کے ہوائی جہازوں کی تعداد کیوں روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی ہے، آخر ہم اس نے کیوں طیارہ کر لیا، مختلف قسم کی جنگلہ گیس اس نے کیوں دریافت کر لیں، اس کے پاس ذخائر حرب کی کمی کیوں نہیں، اس نے یہ اندیشہ کیوں پیدا کر دیا ہے کہ معلوم نہیں وہ کس وقت مغربی یورپ پر حملہ کر دے اور بحر الکاہل پر چھا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو کیا یہ اشتراکی نظام کی برتری کا ثبوت نہیں ہے اور اگر آہستہ آہستہ یہی نظام دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے، تو امریکہ کو اس سے کیوں تکلیف پہنچتی ہے اور وہ کیوں اس کی مخالفت میں ایٹمی چوکی کا زور لگا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سرمایہ دار حکومت امریکہ کی ہے اور وہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے وسعت اشتراکیت کے بعید ترین امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ہر چند اس کے حدود حکومت روس کے حدود سے بہت دور ہیں، لیکن اس اندیشہ سے کہ جس طرح وہ وسطی یورپ میں پھیلا ہے اسی طرح وہ مغربی یورپ میں بھی پھیل سکتا ہے اور مغربی یورپ کا اشتراکی ہو جانا امریکہ کی موت ہے، وہ مارشل پلان اور اٹلانٹک پیکٹ کے ذریعہ سے روس کے خلاف محاذ طیارہ کر رہا ہے۔

اس کا مقصد مغربی یورپ کی حکومتوں کی مدد کرنا ظاہر کیا جاتا ہے، حالانکہ امریکہ کا اصل مدعا یہ ہے کہ اشتراکیت پران حکومتوں کی بھینٹ چڑھا کر خود زیادہ سے زیادہ محفوظ رہ سکے۔

ان مغربی حکومتوں میں سب سے زیادہ اہم برطانیہ ہے اور گو اس وقت وہ امریکہ کے اشارہ پر چل رہا ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اگر روس کو جنگ کے لئے مجبور کر دیا گیا تو سب سے پہلے اسی کو اشتراکی ہوں کا نشانہ بننا ہے اور اسی اندیشہ سے وہ چین کی اشتراکی حکومت کو تسلیم کر کے سکوریٹی کونسل میں اس کے شامل کئے جانے پر تھرہ، جسے امریکہ نے اب تک تسلیم نہیں کیا۔

برطانیہ و امریکہ کی پالیسی میں یہ اختلافات بظاہر بہت غیر اہم نظر آتے ہیں، لیکن حقیقتاً اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور یہ اختلافات ٹرومین اور میک آر تھر دونوں کے لئے کافی درد سبب بنا ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جو بات میک آر تھر نے علی الاعلان کہی ہے وہی ٹرومین کے دل میں بھی ہے، اور دونوں ہی چاہتے ہیں کہ نہ صرف شمالی کوریا، بلکہ فارس، منچوریا اور مکن ہو تو خود چین کے بعض علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا جائے، لیکن ان دونوں کی تدابیر میں فرق ہے۔ میک آر تھر یہ سمجھتا ہے کہ روس ابھی تک جنگ کا خطرہ مول لینے کے لئے طیارہ نہیں اس لئے اشتراکی چین کو ختم کر دینے کا وقت یہی ہے، ٹرومین، روس کی طرف سے اتنا مطمئن نہیں ہے اور اس کا خیال ہے کہ جب تک جاپان اور مغربی جرمنی کو پوری طرح مسلح نہ کر لیا جائے، روس کو جنگ کی دعوت دینا بڑے خطرہ کی بات ہے۔ اس لئے سوال لڑائی کے ختم کر دینے کا نہیں بلکہ اسکو پوری کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کا ہے اور اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر، برطانیہ اور دوسری بڑی بڑی سلطنتیں، طیارے لیا کر رہی ہیں اور دنیا کی تمام صنعت گاہیں پھر اسلحہ جنگ اور ذخائر حرب کی طیاری و فراہمی میں مصروف نظر آتی ہیں۔

بہر حال یہ خیال کرنا کہ کوریا کی لڑائی جلد ختم ہو جائے گی یا یہ کہ وہ صرف کوریا تک محدود رہے گی بالکل غلط ہے کیونکہ امریکہ جنگ سے دست کش ہو کر اپنے اقتدار کو مدد پہنچا سکتا ہے اور چین یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اس کے ملک پر کسی سرمایہ دار حکومت کا اقتدار قائم ہو۔

امریکہ کو سب سے زیادہ اعتماد آٹم بم پر ہے اور سمجھتا ہے کہ ہر کوشش کی یاد تازہ کر کے وہ جاپان کی طرح چین کو بھی مفتوح و مغلوب کر سکتا ہے، لیکن اس کو سمجھنا چاہئے کہ پچھلے دس سال کے زمانہ میں دوسری قومیں بھی بیکار نہیں بیٹھی رہی ہیں اور اگر چین امریکہ کے مقابلہ میں آئے گا تو یہ سمجھ کر آئے گا کہ اسے جو ہری کم کی تباہ کاریوں کا مقابلہ کرنا ہے۔

بہر حال جنرل میک آر تھر کی معزولی کا سبب یہ قرار دینا کہ کوریائے کے باب میں امریکہ کی پالیسی بدل جائے گی، قطعاً غلط ہے، بلکہ اس میں اور زیادہ پیچیدگی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے، کیونکہ جنرل میک آر تھر کے امریکہ پہنچ جانے سے ریلنگن پارٹی کو اور زیادہ تقویت پہنچ جائے گی اور ہوسکتا ہے کہ ٹرومین کو اپنی اور اپنی ڈاکٹر ٹیک پارٹی کی سادھ قائم رکھنے کے لئے، میک آر تھر کے ہاتھ میں دوبارہ جنگ کوریائے کی کمان دینا پڑے۔

تازہ خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ کوریائے کی اشتراکی فوجوں نے، لاکھ کی سپاہ سے سپر حملہ شروع کر دیا ہے اور اتحادی فوجوں کو کچھے ہٹنا پڑ رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دباؤ زیادہ بڑھ کر اتحادی افواج کو پھر اسی خطہ دفاع تک پہنچا دے جہاں سے ان کا جارجیا اور اتحادی شروع ہوا تھا، لیکن اشتراکی فوجوں کی یہ کامیابی بھی کوئی فیصلہ کن چیز ثابت نہ ہوگی۔ اس سے قبل یہ مدوجز گئی بار دیکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی یہی سلسلہ برابر جاری رہے گا تا آنکہ امریکہ کی پالیسی نہ بدلے اور اتحادی افواج کوریائے سے واپس نہ آجائیں یا یہ کہ چین کی اشتراکی فوجوں کی قوت بالکل نہ ٹوٹ جائے اور یہ دونوں باتیں بظاہر ناممکن العمل نظر آتی ہیں۔

اس وقت تک جنگ صرف شمالی و جنوبی کوریائے کی جنگ سمجھی جاتی ہے جس میں نہ اتحادیوں کی طرف سے چین کو الٹی میٹم دیا گیا ہے اور نہ چین نے اپنی شرکت کا اعلان کیا ہے، لیکن اس میں کلام نہیں کہ شمالی کوریائے کی فوج بڑی حد تک چینی رضا کاروں پر مشتمل ہے اور اسلحہ وغیرہ کی مدد بھی چین اور روس کی طرف سے پہنچ رہی ہے، اس لئے اس جنگ کا پس منظر بہت بھیاںک ہے اور اتحادی افواج یا تو چین کی زراستی غلطی سے یہ تیسری عالمگیر جنگ کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔

چینی حکومت کا ایک مطالبہ تو یہ ہے کہ اسے مجلس اقوام میں جگہ دی جائے، جس کی موافقت ہندوستان و برطانیہ نے بھی کی ہے، دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ جزیرہ فارموسا جو دراصل چین ہی کی ملکیت ہے خالی کر دیا جائے اور تیسرے یہ کہ اتحادی افواج کوریائے سے ہٹا لیا جائے لیکن امریکہ ان تینوں میں سے کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہیں اور اس ضد کا نتیجہ ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ چین بھی میدان میں آجائے اور اس کے ساتھ روس بھی۔

بہر حال اس جنگ کے وسیع ہوجانے کے تمام امکانات قوی ہوتے جا رہے ہیں اور بظاہر کوئی صورت مفاہمت کی ایسی نظر نہیں آتی جو اس خطرہ کو دور کر دینے والی ہو۔

دستور میں تبدیلی اس میں شک نہیں ہندوستان کی موجودہ حکومت بڑے صبر آزما دور سے گزر رہی ہے اور اس وقت تک اس نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دستور کی بعض دفعات میں ترمیم کر کے اپنی اس بلند خصوصیت کو ہاتھ سے دینا چاہتی ہے۔

کسی قوم و ملک کا دستور ایسی بنیاد پر ہے کہ اگر اس کی طرف سے لوگوں کا اعتماد و یقین اٹھ جائے تو حکومت کے وجود کا مرکز بن جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر جیکار نے جو ہندوستان کے بہت بڑے محقق و قانون ساز سمجھے جاتے ہیں، حال ہی میں ایک کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ حکومت نے یہ سلسلہ ترمیم ان اصولی حقوق کو ہاتھ لگایا جو دستور نے ملک کے باشندوں کو عطا کئے ہیں تو اسکی سخت مخالفت کی جائے گی اور اس سے ملک امن و سکون کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ دستور کی حیثیت ایک پردے کی سی ہے جس کو زمین پر اپنی جگہ پکڑنے کے لئے کچھ زمانہ درکار ہوتا ہے اور جب تک ایک پردے کو مضبوط کرنے کے بعد کٹری گٹری اٹھا ڈکریہ دیکھا کہ اسکی جڑیں پھیل چکی ہیں یا نہیں، غلط طریقہ ہے، اسی طرح دستور میں ترمیم و تبدیلی بھی اسکو ہٹانے سے روکتی ہے۔ دستور کو کٹھنڈا نہیں کٹاجی بنایا کل توڑ دیا، وہ بنیاد ہے تعمیر حکومت کی اور جیسا کہ چھوٹا ہندوستان کی حکومت کو کھڑا کر دینا ہے۔

آتش اور شاد

(سلسلہ ماسبق)

آتش اور شاد کی کیرنگی اور ہم آہنگی کا پتہ اس وقت زیادہ چلتا ہے جب دونوں کی ہم طرحی غزلیں ساتھ ساتھ بڑھی جائیں۔ شاد نے آتش کی طرحوں میں بہت سی غزلیں لکھی ہیں، دونوں کے دواوہیں سے چند غزلیں تاثرین کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ مجھے ایسا کرتا اس لئے تاکہ یہ تھا کہ بغیر اس کے دونوں شعراء کی غزل گونی کا فرق، ان کے اسلوب بیان اور انداز طبیعت کا رنگ ظاہر ہوتا۔ میں نے چاہا ہے کہ آتش اور شاد کے متعلق کافی مواد اس مضمون میں جمع کر دوں تاکہ آئندہ کوئی صاحب اس پر مزید روشنی ڈالنا چاہیں تو ان کے لئے سہولت ہو۔ ہم طرحی غزلوں کے موازنہ کے بعد میں نے متحد التیالی مضامین کے اشعار کا موازنہ پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ایک ہی مضمون کو دونوں نے کس کس طریقہ سے لکھا ہے۔ میں نے جا بجا اپنی رائے کا بھی اظہار کر دیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اپنی اپنی پسند کا اختلاف ہو۔ پھر غزل طوالت کے خیال سے ایک ہی مضمون کے تحت دونوں کے ہم خیال اشعار لکھ دئے گئے ہیں اور آگے چل کر مزید اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک طرف آتش کے اشعار اور دوسری طرف شاد کے اشعار نقل کر دئے ہیں، آپ خود پڑھ کر فیصلہ کریں کہ کوئی لائق ترجیح ہے۔ انداز بیان اور اسلوب ادب کا فرق ہو تو ہو مگر اجمالی طور پر میں یہ کہنے میں تامل نہیں کرتا کہ شاد کو آتش پر ترجیح ہے۔ ظاہری اور معنوی دونوں حیثیت سے شاد کو آتش پر فوقیت حاصل ہے، اور غالب کے بعد شاد جیسا کوئی زبردست غزل گو پیدا نہیں ہوا۔ میں آتش کا پرستار ہوں، ان کے کلام کی تڑپ، تیور، اور ٹیکھا پن پر جانی دیتا ہوں، ان کے طنز کے طرز کو سراہتا ہوں، مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ شاد کے یہاں کی بند آہنگی، علوئے تخیل، پاکیزہ انداز بیان کا جواب نہیں ہو سکتا۔

شاد

آتش

زہے شرف ترے در پر بسر زمانہ ہوا
خوشا نصیب کہ میں خاک آستانہ ہوا
سیاہ بختوں کا آغاز جب فسانہ ہوا
خوشیوں اول شب سے چراغ خانہ ہوا
خدا برا کرے اس فائدہ کا یہ کیسی میند
کھلی کب آنکھ کہ جب کارواں روانہ ہوا
چھپی نہیں ہے کوئی شے نگاہ والوں سے
وہ بے بھرے جسے عشق غائبانہ ہوا
تمام رات جو گزری تھی سے پرستی میں
خلوص دل سے ادا صبح کا یگانہ ہوا

وہ نازیں یہ نزاکت میں کچھ یگانہ ہوا
جو پہنی پھولوں کی بدھی تو درد شانہ ہوا
شب اس کے انھی گیسو کا جو فسانہ ہوا
ہوا کچھ ایسی بندھی گل چراغ خانہ ہوا
نہ پوچھ حال مرا جب خفک صحرا ہوا
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا
اثر کیا بخش دل نے آخر اس کو بھی
رقیب سے بھی مرا ذکر غائبانہ ہوا
گناہگار ہیں مگر اب تیغ کے ساجد
جھکا سر تو ادا غرض پنجگانہ ہوا

آتش

بھرا ہے سینہ دل کوئے محبت سے
خدا کا گھر تھا جہاں داں شراب خانہ ہوا
ہمیشہ شام سے ہمسائے مر رہے آتش
ہمارا دل گوشش کو فنا نہ ہوا
پامال کیجئے انھیں رفتار ناز کا
طاؤس دیکھ رکھے ہیں دعویٰ نیاز کا
ہو جائے حسن معنی بے صورت آشکار
روئے حقیقت اٹے جو پردہ مجاز کا
عمر خضر سے اس کی زیادہ ہو زندگی
دھوون پہ جو یار کی زلف دراز کا
ساقی نکال و دروچہ توفیق ہو سودے
مستوں کو تیرے ہوش سہاں امتیاز کا
ہر جگہ کو ظہور کا رہتا ہوں نقطہ
مشتاق ہوں امام کے پیچھے نماز کا
اللہ کے صفائے بیان حدیث دوست
دم بند ہے فصاحت اہل حجاز کا
نیرنگ حسن و عشق کی اللہ کے بہار
بے کار کوئی فعل نہیں کار ساز کا
کیونکر وہ تازیں نہ کرے بے نیازیاں
انرا سے بھی حوصلہ عالی ہے ناز کا
قلموں سے خاک کے یہ گڑھے بھر چکیں کہیں
دھبے زمیں کے نشیب و فراز کا
آتش جگہ نہ دل میں ہوا دھوس کو دو
کم زہر سے اثر نہیں اس شہر آرد کا
تازہ پیرہن میں بس گئی ہے دوست
مثل تصویر نہالی تیا ہوں باپوسے دوست
چہرہ رنگیں کوئی دیوانی رنگیں ہے مگر
حسن مطلع ہیں میں مطلع ہے صان ابرہہ دوست
یاد کر کے اپنی برادری کو رو دیتے ہیں ہم
جب آگاہی ہے ہوائے تندر خاک کوئے دوست

شاد

غضب کیا ترے جانے نے ہم میں ساقی
بند چار طون شور عامیہ ہوا
بہت ضعیف ہو اے شاد رہ نہاؤ کہیں
پڑھاؤ تم بھی قدم کار واں روانہ ہوا
جانے بھی دے محل نہیں یہ کبر و ناز کا
آخر ہے رات وقت ہے راز و نیاز کا
ان کی نگاہ ناز جو پیش تو دیکھنا
منہ دیکھتی رہے گی حقیقت مجاز کا
جکڑے ہوئے ہیں دونوں جہاں قیدیوں کی طرح
اللہ کے سلسلہ تری زلف دراز کا
دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جہاں
لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا
اسے رند قصہ سجدہ خم کا رہے ضرور
داخل نماز میں ہے تہیہ نماز کا
اللہ کے بندی ہم شناسے دوست
ہے پست حوصلہ قلم سرفراز کا
صانع کو دیکھنا ہو تو عالم پر کر نگاہ
آئینہ آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا
کس طرح دل پہ فتنہ محشر کا ہو اثر
ہنگامہ یاد ہے تری رفتار ناز کا
عالم کو خود پسند ہیں نیرنگ سازیاں
اس میں قصور کیا نگہ فتنہ ساز کا
شاید صعب تعالٰیٰ میں تھوڑی سی جائے
اے شاد ہم بھی رکھتے ہیں دعویٰ نیاز کا
محو ہیں اپنی جگہ آسودگان کوئے دوست
آرزو دل میں ہے دل آکھوں میں آنکھیں سوسے دوست
ہونو گی تا چند محراب دعا میں کاسٹے
لاش اک دل ذبح کر چھوٹے خم ابروئے دوست
لاشرہ عربین عاشق کا کوئی دیکھے دستار
ڈھانکتی ہے اٹھ کر کس الفت سے خالی کس صفت

داغ دل پر خیر گزری تو غنیمت جانے
 دشمن جانی ہیں جو آنکھیں دیکھتی ہیں سوئے دکت
 دوسرے کے زخم کاری سے تو حسرت سے سزا
 چار تواروں میں مثل ہو جائیگا بازوئے دوست
 فرش گل بستر تھا اپنا خاک پر سوتے ہیں اب
 خشت زیر سر نہیں یا مکیہ تھا زانوئے دوست
 ہجر کی شب ہو گئی رو بہ قیامت سے دراز
 دوش سے نیچے نہیں اترے ابھی گیسوئے دوست
 دور کر دل کی کدورت محو ہو دیدار کا
 آئینہ کو سینہ صافی نے دکھایا روئے دوست
 اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر بنے
 دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک غمئے دوست
 دیکھ لیں ہے جو قیامت کا تماشا باقی
 ہو چکے وہ بھی جو ہو صحبت فردا باقی
 فرقت یار میں مردہ سا پڑا رہتا ہوں
 روح قالب میں نہیں جسم ہے تنہا باقی
 اس قدر سینہ غم عشق سے معمور ہوا
 نہ رہی دل میں مرے حسرت دنیا باقی
 گرمیاں ہیں جو یہی آہ شرر افشاں کی
 نہیں رہنے کا مے یار کے پردا باقی
 محفل آباد ہے منہ پر سے نقاب الٹو تو
 دیکھ لیکھا کوئی ہووے گا جو بیٹا باقی
 چھپر بیٹھے جو ہم افسانہ گیسوئے دراز
 صبح ہوگی نہ رہے گی شب یلدا باقی
 جان پر بن گئی دم گئے لگا میں شب بھر
 گئے گئے نہ رہا جب کوئی تارا باقی
 کون دارفتہ ترے گیسوئے پیراں کا نہیں
 کس کو سودا نہیں یہ سلسلہ ہے تا باقی
 یہی آتش کی دغا ہے یہی آتش کی دغا
 مغفرت ہووے مری بعد فنا یا "باقی"

قرب ادا قیل ہے ماحج قوی سمجھا دے مجھے
 کوئی شے رہ رو کے دل کو کھینچتی ہے سوئے دوست
 خط گئے پر پڑ چکا تھا خون دیتی تھیں گیس
 واسے حسرت کس جگہ آکر تھا بازوئے دوست
 کس غوشی سے تہنیت دیوے کے یوں کہتا ہوں دل
 وصل کی شب ہے مبارک دوست کو پہلے دوست
 دہر میں کیا کیا ہوئے ہیں انقلابات عظیم
 آسمان بدلا زمین بدلی نہ بدلی غمئے دوست
 ٹپکے آتے ہیں زمیں سے پھول کس کس رنگ کے
 شعبہ دکھلا رہی ہے نرگس جادوئے دوست
 شاد اہل شک یوں ہی شک میں پڑ رہا ٹپکے
 ہم ان ہی آنکھوں سے اک دن دیکھ لینگے دوست
 سیر کر سیر جو ہے دیدہ بیت باقی
 جب تک گھیں ہیں جہی تک ہے تماشا باقی
 میکہ د میں زدہ سا غم ہے زخم ہے نہ وہ جام
 چل بے یار رہے ہم تیرا تنہا باقی
 کاش جیتے یونہیں مرے کے کئی بار اے دل
 سیکڑوں سال رہے گی ابھی دنیا باقی
 چار دیواری عناصر کو گرایا بھی تو کیا
 وہی دھوکا ہے وہی ہے ابھی پردا باقی
 جلوہ یار ابھی تک وہی عالم ہے ترا
 شجر طور ہی باقی ہے نہ موسیٰ باقی
 نہ سہی چار گرہ کا جو گرمیاں نہ سہی
 مدد اے عشق کہ ہے دامن صحرا باقی
 نت نئے کھیل زمانے کو نظر آئیں گے
 جب تک اس خاک پہ ہے خاک کا پتلا باقی
 مجھ سے دیوس ہزاروں ہی تصدیق تجھ پر
 تو سلامت رہے تجھ سے ہے تنہا باقی
 ہاتھ اٹھا کر جو وہ دے اسکو غنیمت سمجھو
 شاد ساقی یہ تمہارا نہیں آتا باقی

اک حال پر کبھی نہیں اس کو قیام ہے
 دنیا کا کارخانہ طلسمی مقام ہے
 عاشق نواز حسن کی تعریف کیا کروں
 یوسف سے بھی عزیز اسے اپنا غلام ہے
 سوداؤ زلف یار کا جب سے ہوا ہے دل
 قلاب میں مرغ روح کو ازلے دام ہے
 جب تک کرے حلال نہ مجھ بے گناہ کو
 قائل کو دینے ہاتھ کا کھانا حرام ہے
 معشوق ہی نہیں جو وعدہ خلاف ہو
 چاہے جو تجھ سے چنگی عہدِ خام ہے
 ہم جنم تر کو کو سانے کرتے ہیں ابر کے
 تم ہنس پڑو تو برق کا قصہ تام ہے
 دولت کے سانے نہیں کچھ قدر حسن بھی
 محمود کا ایاز سا خوش رو غلام ہے
 صبح بہار ہے مجھے ساتھی پناہ شراب
 سب جانتے ہیں عید کا روزہ حرام ہے
 مطلب ہے دفتر گل دلال میں مختصر
 دو دی کی سیر میں یہ گلستاں تام ہے
 آتش بڑا نہ مانو حق حق جو پوچھئے
 شاعر ہیں ہم دروغ ہمارا کلام ہے

اس چشم رات دن تجھ رونے سے کام ہے
 ملتے ہیں دونوں وقت ذرا تم کر شام ہے
 مستوں پر منحصر ہے ذلیل شعور پر
 ساتھی ترا تمام زمانہ غلام ہے
 اڑ کر چین سے جا نہیں سکتی کہیں غریب
 بلبل ازل کے دن سے گرفتار دام ہے
 اتنا بھی میکشوں کو نہیں نیکی میں ہوش
 حد سے اگر سوا ہو تو پینا حرام ہے
 تیغ نگاہ یار تری کاٹ الا ماں
 فولاد بھی تو آگے ترے موم خام ہے
 دو چار نالے اور کرو صبح ہو پسلی
 ہاں عاشقوں اب شبِ فرقت تام ہے
 کہتے ہیں کس کو حسن کی خدمت گزار یاں
 جس مبتلا کو دیکھئے دل کا غلام ہے
 اک جام کی بساط تو ساتھی بہت نہ تھی
 پانی بھی اب مجھے ترے گھر کا حرام ہے
 برست اپنے حال سے بے حال ہو گیا
 ہم کیا کہ اپ یہ بزم بھی ساتھی تام ہے
 جہاں سر لے تن سے چلی روح کہ کے آہ
 اس گھر میں اب نہ آئیں گے گر شاد نام ہے

میں نے التزام کیا ہے کہ حتی الوسع دونوں کے یہاں قافیہ کی پابندی کے ساتھ موازنہ کیا جائے مگر اکثر و بیشتر شاد و آتش کے قافیہ کو ہاتھ نہیں لگایا اس لئے مجبوراً مقابلہ میں دوسرے قافیہ کا شعر لکھ دینا پڑا۔ بہر حال اندازِ بیاہ اور اسلوب ادا کا پتہ چل جاتا ہے۔ مجبوری طور پر آپ اس نتیجہ پر بھی ضرور پہنچیں گے کہ موازنہ میں شاد کا پتہ اکثر بھاری ہے۔ شاد کے یہاں مضامین کی رفعت، انوارِ بیان کا ادب، الفاظ کا استعارہ آتش سے زیادہ ہے۔ اب آتش اور شاد کے اتحاد خیال اشعار کو لے لے :-

علم احسان پذیر می :-

دب مروں گا میں کہیں ریگِ بیاباں کے تلے
 دیکھا کب منہ دریا ہمارا
 چین ابرو نہیں دیا کی گوارا ہم کو

آتش : دست یارانِ وطن سے نہیں مٹی درکار
 شاد : ب تشنہ رہنا احساں سے بہتر
 خوش ہیں گر تشنہ بھی نے یونہی مارا ہم کو

ملہ غالب کہتا ہے :-

گر گمانِ اندہ بر جوشِ پیشانی مرا "ع"

تشنہ لب بر ساطعِ دیا ز غیرتِ جانِ دہم

نہیں سمجھتے کہ ہے زیر پیرہن مٹی،
 چھوڑا بھی بردی در فکر درونِ غادر
 پاؤں پھیلانے کو ہاتھ آئے زمیں تھوڑی سی
 میں بھی تو آدمی ہوں فراغت پسند ہوں
 اڑنے میں ہوش و حواس ادراک کے
 اسی قدر اُسے حیرت ہے جس قدر سمجھا
 دنیا و آخرت سے کیا بے خبر مجھے
 ہم اپنی چال سے آخر کہیں کے بھی نہ رہے
 نظارہ کے قابل جو تماشا ہے تو یہ ہے
 ہزار آنکھیں ہوں اور سب سے یارم و گیس
 کس کو معلوم ہے فردائے قیامت کب ہے
 کل قیامت جو نہ آئی تو قیامت سمجھو
 دن ہو گیا نقاب جو شب کو اٹھا دیا
 نقاب ان کا اٹھنا رات کا کافور ہو جاتا
 بڑھکر جو لے تو آگے خریدار کی پسند
 قسمت کو پوچھتے ہو تو سونے کی تول ہے
 دن وعدہ وصال کے نزدیک آپکے
 مبارک ہو تضاع و یکے فرماں امان پہنچی
 شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا
 سلیقہ انتہا کا چاہئے موتی پروانے میں
 اس گھر میں آنکھتے ہیں مہاں نئے نئے
 داغ اپنا ہے تازہ محکمہ قانون سازی کا
 دکھلا رہی ہے گردش میل و نہار رنگ
 کھو لو نہ راز گردش میل و نہار کا
 کچھ نہیں معلوم ہم کو روح کس عالم میں ہو
 یہ جوشت خاک زمیں پہ ہے اسے پھینک دو گین ہی
 کشاں کشاں لے جاتا ہے شوق منزل کا
 ہر ہر نفس فراق میں قاصد ہے یار کا
 نزع نے عیسیٰ نے پہچانا مرے آزار کو
 خیر وقت جب آیا چھپے نہ ماز ان کے
 اختصار کے خیال سے اب ایک طرف آتش اور دوسری طرف شاد کے اشعار نقل کرتا ہوں آپ خود ممانعت پر توجہ کریں اور یہ

صفائے باطن - آتش : ہمیشہ جھاڑتے ہیں گرد پیرہن غافل
 شاد : شہنشاہی زبانِ عبث دل میں جھوسیں غاروں
 موت میں راحت - آتش : آسمان مرے تو راحت ہو کہیں تھوڑی سی
 شاد : آرام سے ہوں قبر کے اندر جو بسند ہوں
 باغِ فناک حق معترف - آتش : معرفت میں تیری ذات پاک کے
 شاد : ترے کمال کی حد کب کوئی بے شمار سمجھا
 عشق نے نکما کر دیا - آتش : دونوں جہاں کے کام کا رکھا : عشق نے
 شاد : فلک کا ذکر تو کیا ہے زمیں کے بھی نہ رہے
 شوق دیدار - آتش : مینا ہوں جو آنکھیں تو رخِ یار کو دیکھیں
 شاد : یہ آرزو ہے تری جلوہ گاہ میں جا کر
 خدا جانے قیامت کب ہو - آتش : حشر پر وعدہ دیدار نہ کر عاشق سے
 شاد : نیکہ وعدہ پہ ہے سب چپکے پڑے ہیں خاک
 جمال یار کی تابانی - آتش : ٹھیکر حضور یار نہ ماہ چہار دہ
 شاد : شب بھل اپنی ہی آنکھوں سے یہ اندھیر دیکھا ہو
 دل کا مول - آتش : مول اک شگاہ ہے جو ہو دل یار کی پسند
 شاد : حاضر ہے گر پسند ہے کہا دل کا مول ہے
 پیغام موت مبارک ہے - آتش : ابوتی ہے تن میں روح پیام اجل سے شاد
 شاد : وسعت سہ چکے اس شاد و اب چین سے کاٹو
 شاعری صناعتی ہے - آتش : بندش الفاظ جڑنے سے لگیں کے کہ نہیں
 شاد : درمضمون کوئی یوں اندھ لے اس شاد مشکل ہو
 مضامین تازہ کی تلاش - آتش : رہتی ہے فکر تازہ مضامین کی منظر
 شاد : قلم اپنا مضامین کہن فسونج کرتا ہے
 چشم یار کی نیزنگ سازی - آتش : لاتی ہے ہر نگہ میں نیا چشم یار رنگ
 شاد : پوچھو نہ حال چشمِ دل آویز یار کا
 مقام روح - آتش : قالبِ خالی کو تو سنتے ہیں آتش زیر خاک
 شاد : جسے پاک رکھے کی تھی جوس وہ تو تیب در پہ پہنچائی
 نفس کی آمد و شد - آتش : کھلا یہ ہم کو دم نزع کے تنفس سے
 شاد : پیغام آ رہے ہیں تواتر وصال کے
 افسانے راز عشق - آتش : وقت آخر عشق پہناں یار پر خفا ہر ہوا
 شاد : تجھی کو نزع میں پوچھا ترے غموشوں نے
 اختصار کے خیال سے اب ایک طرف آتش اور دوسری طرف شاد کے اشعار نقل کرتا ہوں آپ خود ممانعت پر توجہ کریں اور یہ

دیکھیں کہ دونوں میں کتنی ہم آہنگی ہے :

آتش :- سس لا حاصل مرا واسے جنوں عشق ہے
تھا مٹا ممکن نہیں گرتی ہوئی دیوار کا
ہاتھ قاتل کا مرے خنجر تک آکر رہ گیا
کہنیوں تک آستینوں کو چڑھا کر رہ گیا
چیر بیٹھے جو ہم افشاء کیسوںے دراز
صبح ہوگی نہ رہے گی شب یلدا باقی
مشکل نزع بھی آسان ہوئی جاتی ہے
نفس چند کی ہے روح کو ایذا باقی
ثبات اس کو نہیں یہ عالم داشتہ دور وزہ ہے
ہنسوتا بھی اسے پنچہ نہ تم کھل کھل گلستاں میں
عدم سے ہستی میں جا کر یہی کہوں گا میں
ہزاروں حسرت زندہ کو کاڑ داب آیا
نہیں دیکھا ہے لیکن تجھ کو پہچانا ہے آتش نے
بکھا ہے اسے صنم جو تھمکے دعویٰ ہے خدائی کا
چنستاں کی گئی نشوونما سہرتی ہے
رت بدلتی ہے کوئی دن میں ہوا سہرتی ہے
عالم سے کچھ غرض نہیں اسے جان جاں ہمیں
دل کو نہیں ہے کوئی تمھارے سوا قبول
کہاں تک آنکھوں میں سرخی شراب خواری سے
سفید مو ہوئے باز آ سیاہ کاری سے
داد دل افشاں ہوا ہے دل کے دیتا ہوں میں
پھوڑ ڈالی آنکھ اگر آنسو نظر آیا مجھے
تا فہمی اپنی پر وہ ہے دیدار کے لئے
ور نہ کوئی نقاب نہیں یار کے لئے
حکایت گل رنگین یار کیا کہتے
چمن کو آگ لگا تا جو باغباں مشتاق
جنوں نے چل عدم کو یاں بھی گھبراتا ہے دم اپنا
کیا ہے تنگ وحشت نے ہماری عرصہ ہموں کا
دومرے گئے زخم کاری سے تو حسرت سے ہزار
چار ہی ہاتھوں میں شل ہو جائیگا بازوئے دوست

شاد :- مرض کی دھیمی دھیمی آچ کی دھوکے میں کتنی ہے
مریض عشق کب چیتا کہ جب نوبت سجاں پہنچی
ہماری جان صدمے فوجوں قاتل کے قصہ پر
کوئی انداز دیکھے آستینوں کے چڑھانے کا
جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے جوئے کوئی تو غلش رہے
یہ فسانہ زلت دراز کا مری زنگی سے دراز ہے
آخر ہے عمر ضیق میں دل بھی ہے جان بھی
مردانہ باش ختم ہے یہ امتحان بھی
یہاں نہ نشوونما کا حامل نہ کوئی شرب رنگ و بو کا
ہنسوںے خود اس چمن پنچہ زمانہ آئے ذرا نمو کا
ابھی بہت دل میں ہیں امیدیں تپ کے حسرت سے مرز جاتے
لو اگر شاد سے عرض نہ تو ذکر کرنا نہ آرزو کا
کچھ قلع نہیں آنکھوں نے اگر مان لیا
دل نے دیکھا نہیں اس پر تجھے پہچان لیا
خزانی میں خشک شاخوں سے لپٹ کر مفت جی کھونا
بھارت کے گی گھبراؤ نہ اسے اُجڑے چمن والو
ہزار مجمع خوابانہ رو ہو گا
نگاہ جس پہ شہر جائے گی وہ تو ہو گا
اب اقتناپ مناسب ہے شاد زندگی سے
سفید آپ کے وار بھی کے بال ہونے لگے
ہجوم اشک سے دیدار میں قلقل نہ پڑے
جواب کے روؤں تو آنکھوں کو میں نے پھوڑ دیا
گلہ جلوے کا تیر کیا کہ عالم آشکارا ہے
ہمیں رونا تو جو کچھ ہے وہ اپنی کم نگاہی کا
جمال یار کا قصہ چمن میں چل کے کہو
گلوں کے کان کھڑے ہوں گے اس حکایت سے
پاؤں کی خاک میں ہیں لاکھ بیاہاں ایسے
ایک صحر کوئے سہرتی ہے وحشت میری
صف آخر میں ہوں میں واسفائے قاتل
خون یہ ہے کہ تھکا جاتا ہے بازو تیرا

خوب رہے حال پر اپنے وطن کا سن کے حال
کوئی غمت میں جو آ نکلا ہمارے شہر سے
ہیشہ فکر سے یاں عاشقانہ شعر ڈھلتے ہیں
زباں کو اپنی بس اک حسن کا افسانہ آتا ہے
کرم کیا جو ستم نے ستم زیاد کیا
شب فراق میں میں نے خدا کو یاد کیا

چمن کو یاد کر کے دیر تک آنسو بہاتا ہوں
کوئی تنکا جوں جوں ہے اُجڑے آشیانے کا
نہ آئینہ کا قصہ اور نہ حال شانہ کہتے ہیں
حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں
کوئی خفا ہو تو ہو امر حق مگر یوں ہے
بتوں کی چال نے سب کو خدا پرست کیا

سب سے روشن اور نمایاں پہلو دونوں کے کلام کا ہے کہ دونوں حافظ شیرازی سے بہت قریب تھیں۔ دونوں مادہ حانفہ کے جرد کش ہیں اور متبادل رنگ بھی دونوں کے یہاں نمایاں ہے مگر چونکہ آتش فضا باغ و بہار تھے ان کے لئے متبادل رنگ زیادہ نگہرا ہوا ہے شاید چونکہ فطری طور پر حسرت و غم کا موقع تھے اس لئے ان کے یہاں یہ رنگ اتنا نمایاں نہیں اور نہ ہونا چاہئے تھا مگر بھر بھی جو ہے وہ ضیعت ہے۔

شاد کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو علاوہ دیگر متبادل مضامین کے جو ان کے ”خاصہ“ کی چیز ہے وہ ان کا ”خمریات“ ہے۔ حیرت
ہے نظریہ صدیقی صاحب کی اس رائے پر کہ ”شاد نے خمریات پر بھی توجہ کی ہے لیکن زیادہ تر رسمی۔ وہی شراب کی زندہ تعریف، وہی زنا کی
علم سے نوشی پر طنز، وہی ساقی کی نشانی آنکھوں کا تذکرہ جو تدا کے عہد سے چلا آ رہا تھا ان کے بیان بھی ہے اور اس میں بھی کین و سرود
اور جوش و مستی کے عناصر بہت کم ہیں۔ لیکن کلام شاد کے آئینہ میں اس تنقید کے خط و خال کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ یہ تنقید شاد کے کلام
پر صادق نہیں آتی۔ اب ایک ایک کر کے ان کو پرکھئے۔

جہاں تک رسمی مضامین کا تعلق ہے، یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ شاد کے یہاں سے خوشی عبادت ہے، میکہ دہ کا احترام فرض ہے، ان کے خمریات کی ایک خاص تکنیک ہے۔ ساقی اور پیر مغال کا خاص مفہم ہے اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ان کے مذہبی خیالات کی ترجمانی بھی انہی خمریاتی شاعری کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ غزل ملاحظہ ہو:-

یہ سچوئے گاہیں اے میکشوا انداز ساقی کا
وہی کچھ جاننا تھا میکشوا اعزاز ساقی کا
بھری محفل میں آخر کوئی تھا دمساز ساقی کا
خدا رسوا کرے اس کو جو ہو غماز ساقی کا

ادواؤں میں کرامت ناز میں اعجاز ساقی کا
بجز پر مغال کے کس نے کی تعظیم ساقی کی
سبھو ہو جام ہو مینا ہو سب منہ دیکھنے والے تھے
تھکے وہ لب نرمت جس سے نکلا ساغر نے کی

پوری غزل کی غزل ایک رنگ میں ہے۔

کیا اس قسم کی شاعری کو سہی کہیں گے۔ ایک دوسری غزل جس کی ردیف ہے ”میں قربان ساقی پر“ اسی ایک رنگ میں ہے :-
خراقی رنگ نہ میں نے قدما کے کلام میں پایا اور نہ شاد کے معاصرین میں، لیکن غزلوں کو جانے دیجئے، منفرد اشعار جو دے دینا کی
اسطلاحی زبان میں آدا ہو گئے ہیں، شاد کے مخصوص رنگ اور انداز بیان کی غمازی کرتے ہیں اور کوئی دوسرا شاعر ان کا حریف نہیں
ہو سکتا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

میشو شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا
پینے والے تجھے پینے کا نہ انداز آیا

۱۔ کے خود پیر مغاں ہاتھ میں مینا آ یا
منجے ہیں متعجب، مقسم ساقی

اسی امید میں باز رہے ہوئے ہیں مٹکی میکش
ایک چھوٹی سی غزل کے چند اشعار سنئے :-

ساغر ہمارا ، مینا ہمارا
داتا کے در سے لیکر پھریں گے
مے پر کسی کو ، خم پر کسی کو

جنت ہماری ، طوبی ہمارا
بھر دے گا اکدن کا سا ہمارا
ساقی پہ اپنے دعویٰ ہمارا

کیا ان اشعار میں کیفیت و سرور ، جوش و مستی اور دلہانہ انداز کا فقدان ہے ؟ - چند اشعار اور اسی رنگ کے ملاحظہ ہوں :-

بجائے بات الگ سے الگ سبھولیتے
حریت بزم میں گستاخ ہو چلے ساقی
ساقی کی چشم مست پہ شکل نہیں نگاہ
کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب لے ساقی
دوسے الزام بدستی کا الگ افتاد تھی ساقی
غضب نگاہ نے ساقی کی بندوبست کیا
دے کے تہی سبھو مجھے صبر کا حوصلہ دیا
مشتاق کب سے ہم ہیں فقط ایک جام کے
دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار
یہ بزم سے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
بیرا اس بزم میں سقا یا سبھلا میں

یہ کیا مجال کہ ساقی کے ہاتھ چھولیتے
ذرا تو کھیل سے آنکھوں کو خشکیں کر لے
مشکل سنبھالنا ہے دل بے قرار کا
خم آئے گا صراحی آئے گی تب جام آئے گا
مرا گونا بھرے ساغر کا چلنا چور ہو جانا
شراب بعد کو دی ، پہلے سب کو مست کیا
جس کی طلب تھی ساقیا اس سے کہیں سوادیا
قربان اپنے ساقی ہوش کے غم کے
جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے
جو بڑھکر خود اٹھائے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
خدا حافظ ہے لے ساقی ! چلا میں ! !

نخاند آتش بھی کچھ کم سرور افزا نہیں ، گرچہ شاد کے میدان کی تندی اور سرشاری نہیں مگر پھر بھی ان کی شراب کو درد آتش

کہنا ہی پڑے گا - مثالیں دیکھیے :

آتش مست جو مل جائے تو اس سے پوچھوں
شکرانہ ساقی ازل کرتا ہے آتش
بوئے سے رکھتی ہے اس میکہ میں کیفیت
ساقی میکہ نے مجھ کو یہ خدمت دی ہے
مگر اس کو فریب نرگس مستاد آتا ہے
نیشے نے نقاب رخ زیبا الٹا
خدا جانے کہ ہوگا حال کیا ہم بادہ نوشوں کا

تو نے کیفیت اٹھائی ہے خرابات میں کیا
لبریزے شوق سے پیمانہ ہے اس کا
محتسب توڑ کے شیشہ کو پیشاں ہوگا
نشہ میں مست جو کرتا ہے اٹھاتا ہوں میں
النتی ہیں صغیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے
ٹھوکر میں کھاتی ان آنکھوں کی حیا پھرتی ہو
لڑا کر جام سے توڑا ہے بدستی میں مینا کو

آتش کے کلام میں جو چہکار اور لپک ہے وہ ان کا خاص طرہ امتیاز ہے۔ اردو میں شاید ہی کوئی شاعر جوش و سرور

متبادل رنگ

سے اتنا لبریز اور سرشار ہو۔ ان کے سارے کلام میں جوش و نشاط اور سرور حیات اتنا رچا ہوا ہے کہ غم آگین مضامین ان کے چہرے پر نہیں کھتے۔ ملاحظہ ہو :

جامہ سے باہر اپنے جو ہوں میں عجب نہیں
ہوائے دور سے خوشگوار راہ میں ہے

کھولے ہیں کس کے بند قبا کچھ نہ پوچھے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار ماہ میں ہے

بہار آئی، مراد چمن خدا نے دی
چنستان کی گئی نشو و نما پھرتی ہے
خوشی سے جاے میں پھولا نہیں سا آہے
کوہ یار میں چلے تو غزل خواں چلے
رنگ بدلا نظر آتا ہے ہوا کا جھسک
اے خم مستوں کے ہوجا جو عالم ہو سوہ
شاد اپنی نظرت کے لحاظ سے لحاظ سے تشاکم واقع ہوئے ہیں اور اس حقیقت سے وہ تیرے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں مگر کہیں
ابیں سرور و شادمانی کی جھلک بھی نمایاں ہو جاتی ہے اور متبادل رنگ ان کے کلام میں بھی جھلکتا ہے۔ مثالیں لائحہ ہوں :-
خزاں میں خشک شاخوں سے لپٹ کر مفت جی کھوتا
دو چار نالے اور کرو صبح ہو چسپی
سدا ہر سی تیر دینجی منزلوں تک چاندنی چھٹکی
ہنسی خوشی سے زمانہ بسر کیا اے شاد
شاو کے عم آشنا اور یاس پرورد دل سے بہت آفریں نغمے نکل ہی نہیں سکتے تھے ان کا دیوان حزن و یاس کا گنجینہ اور غم و الم کا
حفینہ ہے، کیونکہ ان کی ساری عمر ناکامی اور پریشانی حالی میں گزری، عظیم آباد کی فارغ البالی دم توڑ رہی تھی، عزیزوں اور وطن والوں
نے کوئی دقیقہ ان کی رسوائی اور بدنامی کا اٹھانا نہ رکھا، ایچ "کا سارا زور قلم ایک پیارے شاد کے لئے وقف تھا۔ چنانچہ ان کے کلام
میں جا بجا اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے:

حریفوں نے کہا سب کچھ ادھر روئے سخن کر کے
گلوں نے خاروں کے پھیلنے پر کج خوشی کے مژدہ مارا
بتا دیا مجھے بچ بچ کے راستہ چلنا
آتش اور شاد دونوں کے کلام میں "رمزیت" اور "اشاریت" بدرجہ اتم ہیں۔ اور اس حیثیت سے دونوں اردو کے حافظ
کہے جاسکتے ہیں۔ آتش خود کہتے ہیں :-

غزل خواہ ہے، مطلب کو پہونچ اے آتش
اور شاد تو اپنے حافظ وقت ہونے کا دعویٰ اس طرح کرتے ہیں :-

شعر کہتے ہیں کہ بزم میں کھل جائے گا
دونوں کے یہاں ہم کو ایسے اشعار نظر آتے ہیں جو حافظ کے اشعار کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں مثلاً :-

حافظ: غرض زمسجد و میخانہ ام دصال نااست
جز این خیال ندارم خدا گواہ من است
اور پیالہ عکس رخ یا۔ دیدہ ایم
اے بے خبر ذلت شرب مدام ما
در مجلس صبحی، دانی چه خوش نماید
عکس عذار ساقی بر جام سے قتادہ
شاقا بتکدہ ہے کہ خرابات ہے یا مسجد ہے
ہم تو صرغ آپ کے طالب ہیں خدا شاہد ہے
دیر تک میں ٹمٹکی باندھے ہوئے دیکھا کیا
چہرہ ساتی نمایاں صان پیمانے میں تھا
اٹھا و جام کو زند و وبال جاں ہے مے پینا
مجھے ہنستا ہوا ساتی کا چہرہ یاد آتا ہے

سیر شاہ عطا، الرحمن عطا کا کوی

سرقہ، توارد، استفادہ

(بہ سلسلہء سابق)

(۲) حکیم سنائی کا شعر ہے :-

رفتم از ہوش وقت رفتن یار او چنان رفت و من چنین رفتم
وداع محبوب کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اس شعر میں صرف ایک واقعہ کا ذکر کر دینا چاہتا ہے جس میں
کوئی بات بھی جذبات سے اپیل کرنے والی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف حکیم شفقانی نے اسی مضمون کو پیش کیا ہے:
غافل ز خود شدیم بکوشش گہر وداع خود راز اضطراب ہما نجا گزاشتیم
”رفتم از ہوش“ سے کچھ ایسا مفہوم متبادر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اپنے اختیار سے کیا گیا ہے اور شعر میں نے دے کے صرف یہی ایک جملہ ہے
جس میں جذبات کا کوئی جزو ملتا ہے اس کے مقابلہ میں ”غافل ز خود شدیم“ کی بلاغت ظاہر ہے اور دوسرے مصرعہ میں تو سراپا جذبات
ہی ہیں۔ پھر انداز بیان نے اس کو ظاہر کر دیا ہے کہ یہ جذبات نہیں بلکہ واردات ہے اور اس اعتبار سے دونوں شعروں کا فرق ظاہر ہے۔
(۳) غالب کا شعر ہے:

سینہ بکشو دیم و خلقے دید کا نجا آتش ست بعد ازیں گویند آتش را کہ گویا آتش ست
غالب نے اس شعر کے مضمون کو جس طرح ترتیب دیا ہے اس میں گرمی دل کی شدت کا اظہار مقصود ہے وہ صرف یہ امر ظاہر کرنا چاہتا ہے
کہ میرے سینے میں جو آگ دہک رہی ہے وہی حقیقت میں آگ ہے۔ لیکن اس شعر میں جذبات کا کہیں نام و نشان نہیں۔ اس کے
برخلاف اردو میں ایک شعر اسی مفہوم کا غالب نے کہا ہے :-

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوز غمہائے نہانی اور ہے
حالانکہ اس شعر میں سوز غم کا مقابلہ معمولی آگ کے بجائے آتش دوزخ سے ہے مگر اس شعر کا اسلوب بیان بالکل جذباتی ہے
اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنی واردات بیان کر رہا ہے۔ حالانکہ مضمون یکساں ہے مگر اس شعر کی زبان جذباتی ہونے کی وجہ سے
اس میں اثر بہت بڑھ گیا ہے۔

(۴) نظیری کی ایک ہی غزل کے دو شعر ہیں۔ اندازہ کرنا چاہئے کہ دونوں میں کیا فرق ہے :-

(۱) بکنت سوز عشقش گر نہ باشد شود ہر مومن آب کو شر آتش
(۲) نظیری کام دل از سوختن جو، شود پروانہ را بال و پر آتش
پہلے شعر میں معلوم ہوتا ہے کہ فکفہ یا فلسفہ کا کوئی مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے جو بالکل تخیلی یا علم سے متعلق ہے، لیکن دوسرا شعر
سراپا جذباتی ہے اور اس لئے اس میں اثر و گداز بڑھ گیا ہے۔

(۵) خواجہ حافظ نے ذیل کے دونوں شعروں میں ہجر کی ایک مخصوص حالت کو پیش کیا ہے اور دونوں شعروں میں سوز ہجر کا ذکر ہے۔

(۱) تنم از واسطہ دوری دلبر بگذاخت جانم از آتش ہجر رخ جانا نہ بسوخت

(۲) بے روئے دل آرز تو ام شمع دل افروز دل رقص کنان پر سر آتش چہ کیا بخت

پہلے شعر میں جذبات نہیں ہیں بلکہ جان و تن پر جو مختلف اثرات ہجر کے ہیں ان کا بیان ہے لیکن دوسرے شعر میں حال و گداز کا ذکر نہیں ہے

لیکن چونکہ جذبات کی زبان سے سب کچھ کہا گیا ہے اس لئے وہ واردات بن گیا ہے اور دونوں شعروں میں جو زمین و آسمان کا فرق دکھایا ہے ان مثالوں سے اس امر کی تشریح مقصود تھی کہ بعض اتفاقات و رواقی شاعری اور تکنیکی شاعری میں بہت تنوع اور بہت ہی نازک فرق ہوتا ہے اور اس کو نگاہ میں رکھنا بیکہ ضروری ہے۔

تکنیکی شاعری ایسی چیز ہے کہ اس میں توارد ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہیں، اس لئے کہ ایک ملک میں نصاب تعلیم طریق بود و ماند، طرز فکر، آداب معاشرت وغیرہ میں اس طرح کی یکسانیت دیکر لگی ہوتی ہے کہ تکنیک و تصور میں بغیر ارادہ کے اتحاد و یکسانیت پیدا ہو جانا لازم ہے۔ علاوہ اس کے اگر کوئی شاعر اپنے پیشروں کے خیالات کو اپنے رنگ میں پیش کرتا ہے تو اس کو سرقت نہ سمجھنا چاہئے۔ عربی کے دو ضرب الامثال مولانا حالی نے مندرجہ شعروں میں نقل کئے ہیں کہ ”لم تترك الاول الاخر“ اور ”کم تترك الاول الاخر“ یعنی پہلے بچھلوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑ گئے اور پہلوں نے بچھلوں کے لئے بہت کچھ چھوڑ دیا ہے۔ جب ان دونوں ضرب الامثال پر مجموعی طور سے نظر کیجئے تو اس کا مطلب یہی ہو گا کہ کوئی نیا مضمون ایسا نہیں ہے جو پہلوں نے نہ کہہ دیا ہو اس لئے بچھلوں کو نیا مضمون نہ ملے گا اور دوسرے جڑ کا مطلب یہ ہے کہ اگلے بہت کچھ جمع کر کے چھوڑ گئے ہیں جس سے وہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہاں اس کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ عرب اپنے قدام سے استفادہ کرتا معیوب نہ سمجھتے تھے جیسا کہ عربی کے اس دوسرے جلد سے واضح ہوتا ہے۔ حضرت کعب ابن زہیر جو سب سے مقدمہ میں تشریح ہیں اور جاہلیت و اسلام میں یکساں ممتاز شاعر رہے ہیں فرماتے ہیں:

ما رانا نقول الا معانا
او معاداً من قولنا مکروراً

یعنی ہم جو کہتے ہیں وہ انگوں سے مستعار لیا ہوا خیال ہوتا ہے یا اپنے ہی ایک بار کے کہے ہوئے کو دہراتے ہیں۔
شاعر ابو نوّاس نے فضل بن ربیع کی شان میں یہ شعر کہا تھا:

ليس على الله يستنكر
ان يجمع العالم في واحد

یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے یہ کیا دشوار ہے کہ وہ ایک شخص واحد کی ذات میں ایک عالم کو جمع کر دے۔
اس شعر میں چونکہ مضمون نیا تھا اور بلند تھا۔ شعر بلند آدمی گلیوں تک میں ہر شخص کی زبان پر آ گیا کسی نے ابو نوّاس سے دریافت کیا کہ اس مضمون تک رسائی کیونکر ہوئی تو اس نے صاف کہہ دیا کہ جریر کے اس شعر سے میں نے یہ خیال اخذ کیا ہے کہ:

اذا غضبت عليك بنو قحتم
حسبت الناس كلهم غصبا

یعنی جب بنو قحتم تم سے ناراض ہو جائیں تو سمجھ لو کہ تمام ہی آدم ناراض ہو گئے۔

ابو نوّاس کوئی معمولی شاعر نہیں ہے بلکہ نہایت بلند پایہ شاعر گزرا ہے مگر اس نے جریر سے استفادہ کیا اور اس کا صاف الفاظ میں اعتراف بھی کر لیا۔ اس واقعہ سے اندازہ جاتا ہے کہ قدامے متاخرین نے کس طرح ضامین اخذ کئے ہیں۔

مولانا نظامی گنجوی کے غم سے کا جواب لکھے کہ جرأت کوئی شاعر نہ کر سکتا تا آنکہ حضرت امیر خسرو کا زمانہ آ گیا اور موصوف نے سب سے پہلے غم سے نظامی پر غم لکھا اور پہلی ہی غنوی مطلع الا در میں مولانا نظامی سے استفادہ کرنے کا اعتراف کیا ہے فرماتے ہیں:-

گرچہ بلک سخن از پنج گنج
نوبت آں گنج غنم گشت پنج

نوبت خسرو کہ پیش نواست
پنج آں نوبت آں خسرو است

سازم از آن سالی بسراے پنج
پنج گنج

آں خط آرام کہ ہمہ ناقدان
فرق ندان ازین تا بدان

ملک سخن را چو گر قلم تیغ
گوهر خود نیز قلمم جو سینے

آخر کے دو شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نظامی کی روش طرز بیان مضمون وغیرہ کا لفظاً معنایاً اتباع کیا ہے مگر اس کے باوجود

بعض اصحاب نے مولانا نظامی کی پیروی کرنے کے سلسلہ میں حضرت امیر خسروؒ پر اعتراض کیا تو اس کا جواب مثنوی مجنوں ویلیٰ میں اس طرح دیتے ہیں:-

گر ما زہند تہی میا نیم	بارے تو بگوئے "ابدانیم"
از دعوئے این خیال سنجی	ناگفتہ طواف تانہ رنجی
بنود چو قضاؤ تو نای	بیہودہ چہ لانی از نظامی
گفتی دم اوست مردہ رازیت	آں زان وے است زان تو صیت
گر زان قدح آئے آب خوردم	بے گفت تو اعتراف کردم

آخری شعر میں کس طرح بالکل کھلے لفظوں میں مولانا سے استادہ کرنے کا اعتراف کر رہے ہیں۔ حضرت امیر کے بعد خواجہ کرمانی نے اپنا خمسہ مرتب کیا۔ خواجہ کرمانی خسرو کے لئے لکھتے ہیں:-

سوختم این لفظ خسرویی
در طبق موبہبت مولوی

مولوی سے مراد مولانا نظامی ہیں

شمس العلماء، مولوی محمد حسین آزاد نے ذوق کا واقعہ آب حیات میں لکھا ہے کہ موصوف قصیدہ لکھ رہے تھے جس کا مطلع ہے:

زہ نشاط کہ گر کیجئے اُسے تحریر
عیال ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

اس کے اشعار آزاد کو سنارہے تھے، درمیان میں چند بار اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ اس عقیدہ میں خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی تفسیر کرنا
سے دو سالہ و محبوب چارہ سالہ
ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

اس کے چند روز کے بعد جو آزاد وہاں گئے تو ذوق نے حسب ذیل قطعہ سنایا:-

ہوا ہے در سہ بھی در سگاہ عیش و نشاط
کہ شمس بانغ کی جا پڑھیں ہیں بر زمین

اگر ہوا ہے صغیر تو ہے سب کو کبر
نتیجہ یہ ہے کہ سمرت ہیں صغیر و کبیر

اور اس کے بعد آزاد کی (من دیکھ کر فرمایا "اب بھی؟" انھوں نے کہا "سبحان اللہ، اب اس کی کیا ضرورت رہی" آنکھیں بند کر کے فرمایا "اُدھر ہی کافیضان ہے (آب حیات صفحہ ۴۶۴ و ۴۶۵) جو ذوق حافظ کے شعر میں ہے ذوق کے یہاں نہیں ہے مگر حافظ سے استفادہ کرنے کے ذوق خود معترف ہیں، جیسا کہ آزاد کے بیان سے واضح ہوتا ہے۔

(انگلستان کا مشہور و معروف شاعر برٹ براؤننگ Robert Browning) جو انیسویں صدی میں ہوئے صان
الفاظ میں کہتا ہے کہ *And many a thought did I build upon
Thought. As the wild leeches from cell to cell.*

یعنی میں نے بہت سے خیالات دوسرے خیالات سے پیدا کئے ہیں جس طرح شہید کی کھلی ایک خلیہ سے دوسرے خلیہ کی طرف جاتی ہے۔
انگلستان کا ایک دوسرا مشہور مصنف کالٹن (C. C. Colton) جس کا انتقال ۱۸۳۲ء میں ہوا ہے اپنی کتاب

(Sultraet from many modern poets) میں کہتا ہے: *that may be found in Shakespeare, & trash will remain (Ref. N. S. S.)*
گویا دنیا جن لوگوں کی شاعرانہ عظمت کے گیت گارہی ہے ان کے دامن میں کچھ بھی نہیں ہے ان میں سے اکثر شکسپیر کی خوشہ چینی پرستہ آدمی
حاصل کر رہے ہیں۔ تاہم نے ایک جگہ بالکل صاف ہی کہہ دیا ہے کہ

ہیں مکن کہ نئی ساری قول اور ناسخ
باقی دو چار پڑائی ہیں تو دو چار نئی

اسی طرح بالکل صاف اور واضح الفاظ میں انیسویں صدی کے انگریزی شاعر جان کیمل (John Keats) نے کہا ہے: *As fire is kindled by fire, so is a poet's mind kindled by contact with a brother poet* یعنی جس طرح ایک آگ سے دوسری آگ روشن کی جاتی ہے اس طرح ایک شاعر کا دماغ اپنے بھائی دوسرے شاعر کے کلام سے روشن ہوتا ہے۔

الغرض ہر زبان کے شعراء اور مصنفین اپنے پیشروں سے برابر استفادہ کرتے رہے ہیں اور خود ہی اس کا کھلے لفظوں میں اقرار بھی کرتے رہے ہیں اگر قائلین کے متذکرہ اصول کے مطابق متقدمین سے استفادہ کرنا ان بلند پایہ شعراء کے نزدیک بھی معیوب ہوتا تو اس طرح کھلے لفظوں میں اس کا اقرار نہ کرتے۔

علامہ شبلی شاعرِ علم میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”اولیٰ اول ایرانی شاعر عربی شاعری سامنے رکھ کر شعر کہتے تھے مشتق کی ابتداء تھی کہ عربی اشعار کا لفظی ترجمہ کرتے تھے۔ کچھ بہت سے فارسی قطعے۔ فرد بلکہ قصیدے موجود ہیں جن کو عام لوگ ایران کا سراپا سمجھتے ہیں درحقیقت وہ عربی اشعار کے ترجمے ہیں اور مترجموں نے دانستہ ترجمہ کیا ہے کہ شعراء کے لئے نمونے ہاتھ آئیں“ (شعرِ علم جلد چہارم صفحہ ۱۲۳) اسکے بعد ترجمہ کی چند مثالیں پیش کی ہیں اس کے بعد کہتے ہیں ”اس پر وہ میں سرقہ شروع ہو گیا۔ غنصری۔ اسدی۔ گسائی۔ غفاری کے ہاں بہت سے مضامین میں جو قطعاً عرب سے لے ہیں لیکن چونکہ لوگوں کی فطرت کلام عرب پر نہیں ہے اس لئے کسی نے سرقہ یا ترجمہ خیال نہیں کیا۔ مجمع الصنائع وغیرہ میں سرقہ کی مثالیں کثرت سے نقل کی گئی ہیں، لیکن ان اشعار کا ذکر تک نہیں آتا۔ اس قسم کے سرقات میں ہم مثالیں نقل کرتے ہیں۔ یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ مضامین شعراء عرب کے مخصوص اور ممتاز مضامین ہیں جن سے کوئی عربی داں نادانہ نہیں رہ سکتا اس لئے تو اردو کا خیال صحیح نہیں ہو سکتا“ (شعرِ علم جلد چہارم صفحہ ۱۲۳)۔ اس عبارت کے بعد مولانا نے سرقہ کی چند مثالیں درج کیں ہم بخون طوالت ان کو نظم انداز کرتے ہیں صرف آخری مثال پیش کرتے ہیں۔ باقی بھی اسی طرح کی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ”برسات میں جو کھڑے کیوڑ پیدا ہو جاتے ہیں عربی میں ان کو اولد الزنا کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ جب ہمیل ستارہ ملکتا ہے تو یہ حشرات الارض ظاہر ہو جاتے ہیں۔ قنبی نے اس سے یہ مضمون پیدا کیا ہے۔“

و تلمک موہم و انا سہیل طلعت بموت اولد الزنا

”میں سہیل ہوں اور میرے دشمن حشرات الارض ہیں جب میں نمایاں ہوا تو وہ فنا ہو گئے“۔ لفظ آمی نے بعینہ اس مضمون کو لے لیا چنانچہ قصیدہ فخریہ میں فرماتے ہیں:

ولد الزنا ست حاسد منم آنکہ طالع من ولد الزنا کش آمد چو ستارہ سمائی (شعرِ علم جلد چہارم صفحہ ۱۲۳)

مولانا شبلی کے متذکرہ بیان کے متعلق ہم موصوفوں سے بعد ادب اختلاف کرنے پر مجبور ہیں۔ اس تمام بیان میں چند امور غور طلب ہیں:-

- (۱) مولانا کو تسلیم ہے کہ عربی قطعے۔ فرد بلکہ قصیدے تک ترجمہ کئے گئے۔
- (۲) مولانا کو یہ بھی تسلیم ہے کہ یہ سب کچھ حسن نیت سے فارسی شاعری کو ترقی دینے کے لئے کیا گیا۔
- (۳) مولانا یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ جن ترجموں کو وہ سرقہ قرار دے رہے ہیں وہ عربی کے مخصوص و ممتاز مضامین ہیں جن سے کوئی عربی داں نادانہ نہیں رہ سکتا۔

(۴) مولانا اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کرتے کہ کیوں ایک ترجمہ کو وہ ترجمہ ہی قرار دیتے ہیں اور دوسرے کو سرقہ۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ متنبی اور مولانا نظامی کے اشعار کو مولانا شبلی پیش کرتے ہیں اور نظامی کو سرقہ کا جرم قرار دیتے ہیں لیکن مولوی نجمین آزاد نے اس کو ترجمہ کی سند میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ اب حیات میں سودا کے ذکر میں ہے ”ان کا (یعنی سودا کا) ایک شعر طریبا جی بہار ہے سپرد جام و بار بگز رہے ہے نسیم تیر سی سینہ کے پار گزر رہے ہے“

فارسی میں کوئی استاد کہتا ہے:-

بہار ہے سہرام و یار می گزرد نسیم جو خندنگ از کنار می گزرد
مگر اہل تحقیق کا قول ہے کہ ایسی صورت خاص کو سرتق نہیں ترجمہ سمجھنا چاہئے کیونکہ شعر کو شعری میں ترجمہ کرنا بھی ایک دشوار صنعت ہے۔
قطع نظر اس کے اسی مطلع کے بعد در اشعار کو دیکھو کیا موتی پروئے ہیں اور کلیات ایک دریا ہے کہ اقسام جواسر سے بہا ہوا ہے مگر یہ کہتا ہے کہ اس رتبہ کا شاعر ایک مطلع کا محتاج تھا اس لئے چڑایا۔ ابو افضل نے ایک مراسلہ میں لکھا ہے:

ولد الزنا ست حاسد شتم آنکہ طالع من ولد الزنا کش آمد چو ستارہ یانی

یہ شعر قصیدہ نظامی میں موجود ہے اور اسی مضمون کو عربی میں مثنوی کہتا ہے:-

و تکر موتیم وانا سہیل طلعت بموت اولاد الزنا (آب حیات تذکرہ سوداگران)
ہمیں تسلیم ہے کہ عربی شعرا کے کلام کا ترجمہ جس غرض سے شروع کیا گیا تھا وہ غرض مولانا نظامی کے عہد میں باقی نہ تھی اور فارسی شاعری خود اتنی ترقی کر چکی تھی کہ عربی سے نمونے حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی مگر شاعری کی شریعت میں شعرائے سابق کی سنت کی پیروی ایمان کا درجہ رکھتی ہے اور عربی اشعار کے ترجمہ کرنے کا طریقہ ایک ضرورت کے تحت شروع کیا گیا تھا جب وہ ضرورت رفع ہو گئی تب بھی عمدہ خیالوں اور بہتر اشعار کے ترجمہ کا طریقہ برابر جاری رہا اور آج تک جاری ہے۔ مولانا شبلی نے جن اشعار کو سرتق کہا ہے اگر وہ سرتق ہی ہیں تو پھر ترجمہ کس چیز کا نام ہے؟

ہمارے نزدیک تنقیدی شاعری میں سرتق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اول تو قدامت کے یہاں ہر قسم کے مضامین موجود ہیں جیسا کہ عربی کے دوشکرہ جلوں سے ظاہر ہوتا ہے لامحالہ انھیں انہی خیالات کو دہرانے پھر اگر قصداً استفادہ کیا جائے تو بھی چنداں مضائقہ نہیں ہے دوسرے شعر کو مشورہ یہی دیا گیا ہے کہ وہ اپنے پیشروں کے خیالات سے استفادہ کریں جیسا کہ نظامی عروضی سمرقندی چار مقالہ میں کہتا ہے ”اما شاعرین ورجہ نرسد کہ در غفوان شباب دروزگار جوانی بست ہزار شعر از اشعار متقدمین یا دیگر دوہم از کلام آثار متاخرین در پیش چشم کند و بیچستہ دو اوین استادان خواند و عرض بخواند و کرد تصانیف استاد ابو الحسن خراسانی گردانند غایت المعرضین و کنز القافیہ و نقد معانی و نقد الفاظ و سمرقانی و تراجم و الفرائع اس علوم بخواند“ (چهار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی)

نظامی کے خیالات کا حاصل یہ ہے کہ جو روش قدامت نے اختیار کی اور جن خیالات کا انھوں نے اظہار کیا اس پر بالکل عینہ عبور ہونا ایک شاعر کے لئے لازمی ہے اور اپنے عہد کے مقتضیات و داعیات سے بھی باخبر ہونا شاعر کے لئے ضروری ہے۔ گویا خیالات و روش وہی میرانی ہونا چاہئے اور زبان و طرز بیان اپنے زمانہ کے مطابق ہو۔ ایسی حالت میں مفہم صرف یہ ہوا کہ پہلوں کے خیالات سے مستفید ہونا ضروری ہے اور استفادہ کرنا کوئی معیوب چیز نہیں۔

ذیل میں ہم چند مثالیں اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ خیالات میں قدامت سے استفادہ کر کے متاخرین نے کس کس طرح اُن مضامین میں اضافہ کیا ہے۔
(۱) کسی فارسی شاعر کا شعر ہے:-

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں صدرا برآمد کہ مرا خراب کردی تو بسجودہ ریائی

مشہور ہے کہ یہ شعر مولانا عراقی کا ہے مگر ہمارے مطالعہ میں دیوان عراقی کا جو نسخہ ہے اس میں یہ شعر موجود نہیں ہے۔ اس شعر میں شاعر صوفیہ دیا کی خدمت کرتا چاہتا ہے کہ وہ اتنی بری چیز ہے کہ زمین بھی اس سے پناہ مانگتی ہے۔ علامہ اقبال نے غالباً اسی شعر سے ذیل کا مضمون پیدا کیا ہے
کبھی سربسجدہ ہوا جو میں تو زمیں سے کہنے لگی صدا ترا دل تو ہے صنم آستانہ تجھے کیا کے گناہ ز میں

یہی شعر کے پہلے مصرعہ کا ٹھیک لفظی ترجمہ اقبال کے پہلے مصرعہ میں موجود ہے لیکن دوسرا مصرعہ حضرت امیر خسرو کے ایک شعر سے قریب تر ہے
حضرت امیر کا شعر ہے:- مسجد روم چندیں آخر چہ نداشت اس روم بسوئے قبلہ دل جانب اہم رویت

اگر یہ کہا جائے تو ایک حد تک درست ہوگا کہ اقبال کا دوسرا مصرعہ خسرو کے دوسرے مصرعہ کا آزاد ترجمہ ہے :-
(۲) ابوشکور بھٹی کا شعر ہے :-

تا بر آسما رسیدہ دانش من کہ بدانم ہی کہ تا دانم
مشہور ہے کہ کسی نے سقراط سے پوچھا کہ ”آپ کا علم کس حد تک پہنچ چکا ہے؟“ سقراط نے جواب دیا کہ ”مجھے اب یہ علم حاصل
ہوا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا“ معترض نے کہا کہ ”اگر یہ بات ہے تو کسان جو کھیتوں میں مل جلاتے ہیں ای میں اور آپ میں کیا فرق ہے؟“
سقراط نے کہا کہ ”یہ فرق ہے کہ میں اس کو جانتا ہوں کہ میں نہیں جانتا اور یہ کسان اس کو نہیں جانتے کہ یہ نہیں جانتے“
ابوشکور نے جہل کا علم حاصل ہو جانے کو اپنی دانش کی انتہا بتایا مگر واضح الفاظ میں نہیں کہا ہے۔ خواجہ میر درد نے اسی مضمون کو
زیادہ وضاحت سے کہہ دیا ہے :-

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا مانے سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم
اسی مضمون کو قافی نے کہا ہے :-

حاصل علم بشر جہل کا عرفاں ہوتا عمر بحر عقل سے سیکھا کے ناداں ہونا
(۳) خواجہ نظیری کا شعر ہے :-

بنیاد ما خرابی استوار کرد گوی کہ سوداست نظیری زیاں ما
نظیری کا مطلب یہ ہے کہ ہستی ہی نیستی کی بنیاد ہے اور وجود سے ہی عدم پیدا ہوتا ہے اس لئے جس کو تو میرا فائدہ سمجھتا ہے وہ حقیقت میں
میرا نقصان ہے۔ غالب کہتا ہے :-

دخا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
غالب کا مطلب یہ ہے کہ ہستی کے کم عدم سے عالم وجود میں آنے سے پہلے صرف ذات باری تعالیٰ ہی تھی اور بعد میں کائنات کی تخلیق جو کچھ ہوئی وہ
بھی اسی ذات کا جزو ہے۔ مولانا حالی مرحوم یا دیگر غالب میں اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں: ”بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے
اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلا مصرع کے معنی ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرع سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں ہوتا
تو کیا بڑائی ہوتی مگر تھیں کا مقصود یہ ہے کہ میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہئے کہ میں کیا چیز ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہوتا کیونکہ پہلے مصروف میں بیان ہو چکا
ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا“ غالب نے جو تصریح کی ہے اس کی مدد میں نظیری کے شعر کو دیکھنا چاہئے لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ غالب نے
اس مضمون کو اس شعر میں انتہائی بلندی تک پہنچا دیا ہے۔ غالب کا دوسرا شعر اسی مضمون کا ہے جس کو نظیری نے پیش کیا ہے۔

میری تعمیریں مغممہ اک صورت خرابی کی
میں نے برق خرمین کا ہے خد گرم و دھماں کا

غالب کے اس شعر کا پہلا مصرعہ نظیری کے پہلے مصرعہ کا ترجمہ ہے لیکن دوسرے مصرعہ میں دونوں کے درمیان بہت فرق ہے۔

قافی کہتا ہے: تعمیر آسٹیاں کی ہوس کا ہے نام برق
جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی

قافی کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظیری اور غالب دونوں سے استفادہ کیا ہے کیونکہ پہلا مصرعہ غالب کے پہلے مصرعہ سے ماخوذ ہے
اور قافی کا دوسرا مصرعہ نظیری کے طرز پر ہے لیکن قافی کے یہاں شعریت نظیری سے بھی زیادہ ہے یہاں سود و زیاں کے ذکر کے بجائے اُس
شاخ کے جل جانے کا ذکر ہے جو تعمیر آسٹیاں کے لئے منتخب کی جائے۔ اس کے علاوہ نظیری اور غالب کی نسبت قافی کے شعر کے دونوں مصرعے
زیادہ مربوط ہیں نظیری اور غالب کے اشعار میں قافی نے اضافہ کیا ہے۔

(۴) ذہنی کی ایک رباعی ہے: گزند صبر کن کہ ترا صبر بردہ
آہے وہ ولیک بمر درہ
من غرض نیستی، مصدق گزاشتم
عمر درگرباہ ۱۲ صبر بردہ

یعنی یہ جو کہا گیا کہ صبر کا پہل ملتا ہے صحیح تو ہے مگر بات یہ ہے کہ یہ دوسری عمر میں جا کر پہل دیتا ہے کیونکہ میں نے تو ساری عمر صبر میں گزار دی۔ اب صبر کا پہل پانے کے لئے دوسری عمر درکار ہے۔ خواجہ حافظ نے بھی اس مضمون کو کہا ہے۔

گزینہ سنگ لعل شود در مقام صبر آہے شود و لیک بخون جگر شود

خواجہ حافظ نے دقیقہ کے مضمون میں صبر پر توجہ دے کر صبر کا اصل فلسفہ بھی اس کے ساتھ ہی پیش کر دیا ہے یعنی یہ جو کہا گیا کہ صبر کی صفت یہ ہے کہ اس کی بدولت معمولی چہر لعل ہو جاتا ہے ٹھیک ہے مگر مزہ جگر کو خونی کر دینے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

۱۵) شیخ سعدی کا شعر ہے: ہر کہ باز آید ز در پندارم اوست تشنہ مسکین آب پندار و سراب

سعدی نے ایک نفسیاتی اصول کی شاعرانہ وضاحت کی ہے کہ عاشق مسکین دیدار محبوب کے لئے ترس رہا ہے اس لئے جب بھی کوئی دروازہ سے داخل ہوتا ہے اسے اپنے محبوب کا ہی دھوکہ ہوتا ہے۔ مصحف ثانی نے مضمون میں جلا پیداکر دی۔ اسی مضمون سے مولانا جاحی نے دوسری ہی بات پیدا کی ہے وہ اس کو قصوں میں لے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

بس کہ در جان نگار چشم پیدارم توئی ہر کہ پیدار می شود از دور پندارم توئی

مولانا نے اپنے عشق کے اظہار کے ساتھ وحدت شہود کے مسئلہ کو بھی پیش کر دیا ہے اور سعدی کے یہاں جو مضمون شخص عشق مجازی کی شکل میں تھا اس کو مولانا جاحی نے خالص قصوں سے متعلق کر دیا ہے اور سعدی کے مضمون میں یہ ایک عذر اضافہ ہے اس شعر کے متعلق یہ غلط فہمی آتا ہے کہ اب حیات میں لکھا ہے کہ مولانا جاحی حالت وجد میں اپنا یہی شعر بار بار پڑھ رہے تھے کسی نے آہستہ سے کہا کہ ”اگر فریب پا ہی شود“ مولانا نے برجستہ جواب دیا کہ ”پندارم توئی“۔ اس کے بعد آواز دے خواجہ میر درد کا یہ شعر لکھا ہے:-

بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ بندہ گر آئے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ

۱۶) مولانا عراقی کہتے ہیں:- رازیت دریں پردہ گراں را بشناسی دانی کہ حقیقت زہد در بند مجازست

عراقی صریح اتنا بتاتے ہیں کہ کائنات کے اندر کچھ بھی راز ہے وہ وہی ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے ہم مجاز کو ہی دیکھ سکتے ہیں اور اس مجاز ہی میں حقیقت موجود ہے۔ اسی مضمون کو عراقی نے لکھا ہے:-

ہر کس آشنا سسندہ رازست و گراں این باہمہ رازست کہ معلوم عوامست

عراقی نے بات کو اور زیادہ صاف کر دیا کہ جس راز کی جستجو ہے وہ تو عوام تک جانتے ہیں۔ گویا عراقی کی زبان میں ہر مجاز کے اندر حقیقت پوشیدہ ہے، عراقی کہتا ہے کہ اُس حقیقت کو ہر شخص جانتا ہے، لیکن یہ بات سمجھ لینا ہر شخص کے بس میں نہیں ہے کہ کائنات کا اصلی راز یہی ہے۔ عراقی نے حقیقت اور مجاز کے پردہ میں جو بات کہی تھی اس کو عراقی نے صریح معمولی الفاظ میں ادا کر دیا ہے اور مضمون میں بھی ایک قدم آگے بڑھایا ہے اسی مضمون کو مرزا غالب نے کہا ہے: محرم نہیں ہے تو ہی نواہے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اس شعر کی تشریح مولانا حالی یا دیگر غالب میں اس طرح فرماتے ہیں کہ ”راز کے لغوی معنی سے تو خود ہی نا آشنا ہے ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردہ ساز کی طرح بول اور نکدے رہے ہیں اور اسرار انہی ظاہر کر رہے ہیں“ (کتاب مذکور ضلع) غالب کا مطلب یہ ہے کہ ہم جس حجاب کو راز قرار دے رہے ہیں دراصل وہ حجاب ہی اُس راز کی پردہ دہی کرنے کا باعث ہیں وہ پردہ ایک پردہ ساز ہے جس میں نواہے راز کے علاوہ کچھ نہیں ہے اپنے آپ کو محرم بنانے کی کوشش کرنا چاہئے کہ ان نواہے راز سے متاثر ہو سکے۔

۱۷) خواجہ حافظ کا شعر ہے: دروہ عشق نشد کس بقیم محرم راز ہر کے بر حسب فہم گمانے دارد

خواجہ حافظ کا مقصد یہ ہے کہ عشق ایک ایسی پیچیدہ اور لاپتہ چیز ہے کہ کوئی شخص بھی اس کے متعلق درجہ یقین تک نہیں پہنچ سکتا کہ جو رائے وہ رکھتا ہے وہ صحیح ہے جو کچھ بھی کوئی ایک شخص کہتا ہے وہ صریح اس کا گمان ہوتا ہے جو اس کی عقل کے مطابق ہے۔

نظیری کہتا ہے: تاکہ فکر تو ان کرد و سخن تازه نوشت تھہ شوق حدیثے ست کو پائش نیست

خواجہ حافظ نے مسائل و منازل عشق کے متعلق کہا تھا کہ ان کی غایت و کتبہ دریافت نہیں ہو سکتی لیکن نظیری نے اسی مضمون سے دوسری ہی بات پیدا کی ہے کہ شوق کی منازل کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔
 نظیری کا دوسرا شعر ہے:۔ چندیں سخن عشق کو گفتند و شنیدند، کس حق محبت نتوانست ادا کرو
 یہ بالکل وہی مضمون ہے جو خواجہ حافظ نے کہا ہے اور اسی مضمون کو دوسری طرح ادا کیا ہے اور خواجہ کے اجمال کی تفصیل کر دی ہے۔
 جگر راد آبادی کا شعر ہے:۔

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فساد کی سنا تا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے
 یہ شعر خواجہ حافظ اور نظیری کے پہلے شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے مگر حافظ اور نظیری کے دونوں مصرعوں نے لکر اس شعر میں نیا لطف پیدا کر دیا ہے
 (۸) مولانا حالی مرحوم مقدمہ شعر و شاعری میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”ایک روز خواجہ حافظ کا یہ شعر:۔
 شبے تاریک ہم موج و گردا بے جنیں سایل کجا دانند حال ما بسکسا ران ساحلہا
 ایک موقع پر پڑھا گیا۔ ایک صاحب جو شعر کا صحیح مذاق رکھتے تھے یہ شعر سن کر ہنسے ”کاش دوسرے مصرعے میں بھی اسی قسم کی مشکلات اور سختیوں کا بیان ہوتا جیسی کہ پہلے مصرعے میں بیان کی گئی ہیں اور اس بات کا کچھ اظہار نہ کیا جاتا کہ ہیر دونوں کو چارے حال کی کیا خبر ہے تاکہ اپنے حال میں مبتلا رہنے اور غیر کے تصور سے ذہول ہونے کا زیادہ ثبوت دوتا“ میں نے غالب مرحوم کا یہ شعر پڑھا:۔
 ہوا نمنا من و شب تار و بحر طوفان خیر گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست
 وہ یہ شعر سن کر ہنسنے لگے اور کہا کہ ہاں بس یہی میرا مطلب تھا۔
 مولانا حالی نے خواجہ حافظ کے اس شعر کا ماخذ شیخ سعدی کے اس شعر کو قرار دیا ہے کہ:۔

از در طے ما خبر ندارد آسودہ کہ بر کنار ریاست

حقیقت میں حافظ اور سعدی کا مفہوم ایک ہی ہے، لیکن حافظ نے اس مضمون اور تخیل کو انتہا تک پہنچا دیا ہے جس کی ابتدا شیخ سعدی نے کی تھی۔ شیخ کے یہاں صرف ایک لفظ ”و طے“ تھا حافظ نے پہلے مصرعے میں اس کی پوری تشریح کر دی اور شیخ نے صرف ”آسودہ“ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ حافظ نے ”بسکسا ران ساحل“ سے اس کی کمال تفسیل کر دی۔ لیکن غالب کے ”ناخدا خفتست“ نے سعدی و حافظ کے مضمون کو اپنی جگہ قائم رکھنے کے ساتھ ہی معنی میں اتنی وسعت و لطافت پیدا کر دی ہے کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا اسی مضمون کو نظیری نے دوسرے پیرایہ میں ادا کیا ہے:۔

بے زیر شاخ گل افنی گزیدہ ہیں را نواگران بخور وہ گزند را چہ خبر

خواجہ حافظ نے جس بات کو بیشترین پیرایہ میں بیان کیا تھا نظیری اس میں مطلق اضافہ ذکر کرنا۔ حافظ کا شعر اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل صاف ہے اور نظیری کے یہاں اتنی صفائی نہیں ہے جس طرح حافظ کے شعر کی جان ”بسکسا ران ساحل“ کی نادر ترکیب ہے اسی طرح نظیری نے ”نواگران بخور وہ گزند“ کی ترکیب پر اپنے شعر کی عمارت قائم کی ہے مگر دونوں کا تفاوت ظاہر ہے۔ حافظ نے اپنے مصائب کے ذکر کے بعد ساحل کے ہیر و تن آسانوں کو عمومیت کے ساتھ پیش کیا ہے اور نظیری نے ”بخور وہ گزند“ سے اُس لطافت اور عمومیت کو کھو دیا۔ اگر بخور وہ گزند کے بجائے کوئی ایسا لفظ یہاں موجود ہوتا جو لو لگتی کے ساتھ ان کی تن آسانی و غیرہ کو ظاہر کرتا تو شعر زیادہ لطیف ہو جاتا۔

ان مثالوں سے اس امر کو واضح کرتا مقصود تھا کہ تقدیر سے استفادہ کرنے کی وجہ سے ہی متاخرین بعض نازک اور عمدہ مضامین ہیر لکرنے کے اگر تقدیر سے استفادہ کرنا سترہ سمجھ کر ترک کر دیا جائے تو ان تمام قواعد سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

تاریخ یونان کا ایک پوشیدہ ورق

(سکندر اعظم کی تخت نشینی کی خونی داستان)

مسیح سے چار سو سال سے قبل جزیرہ ساؤتواس، یونان کا بڑا مشہور و مقدس جزیرہ سمجھا جاتا تھا، یہاں پہاڑ کی چوٹی پر جو سطح پر سے ہزار فٹ بلند تھی، آموئن یا زیوس دیوتا کا ایک نہایت خوبصورت و شاندار معبد قائم تھا جہاں جنسی اختلاط کی حد درجہ مہیاک و شہوت انگیز رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔

ان مراسم مذہبی کی دو صورتیں تھیں ایک عوام کے لئے مخصوص تھیں دوسری خواص کے لئے۔ طبقہ خواص کے بھی دو درجے تھے جن میں ایک درجہ صرف کاہنوں، شاہزادوں اور شاہزادیوں کے لئے مخصوص تھا۔

ہر شخص جو اس کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا پہلے اس سے حلف لیا جاتا تھا کہ وہ یہاں کے راز کسی پر ظاہر نہ کرے گا اور جب حلف لیکر وہ ایک بار اندر داخل ہو جاتا تھا تو اس کے معنی یہ تھے کہ وہ ایسی دنیا میں پہنچ گیا ہے جہاں شرم و حجاب، عفت و صمت کا کوئی مفہوم نہیں ہے اور انسان جانوروں کی طرح جنسی اختلاط کے لئے آزاد ہے۔

مسجد کے اندر وہی حصہ کے بھی تین درجے تھے، ایک مردوں کے لئے، دوسرا عورتوں کے لئے اور تیسرا نوجوان لڑکوں، لڑکیوں کے لئے اور ٹھیک اس وقت جبکہ فحاشی اپنی انتہائی شہوت انگیز حد تک پہنچ جاتی، سب پردے اٹھا دئے جاتے تھے، پھر تینوں درجے کے مرد و عورت، لڑکوں اور لڑکیوں کو پوری آزادی حاصل تھی کہ جو چاہیں سو کریں۔

مسیح سے ٹھیک ۳۵۸ سال قبل انھیں مراسم شہوت پرستی کے زمانہ میں ایک دن مقدونیہ کا نوجوان بادشاہ فلپس یہاں پہنچا اور ایک نہایت حسین و قاصدہ پر عاشق ہو گیا۔

اس کا نام "اولمپیاس" تھا جس نے اپنا جس وصال، اپنی رعنائی و دلکشی اور روح و جسم سب معبد آموئن کی لذت پرستیوں اور شہوت وانیوں کے لئے وقف کر دیا تھا۔

مسجد آموئن شمعوں اور قندیلوں کی روشنی سے جگمگا رہا ہے اور المپیاس عریاں رقص کے ذریعہ سے اپنے سڑولی اور خوبصورت جسم کے ایک ایک عضو کی شہوت انگیز نمائش میں محو ہے۔ اس کے مرمی جسم کے کوچ اور چمک کا یہ عالم ہے گویا ایک زہیں سورج ہے جو فضا میں چمکے لے کھا رہی ہے وہ اپنے ہاتھ میں ایک عصا لئے ہوئے ہے جو پھولوں سے آراستہ ہے اس پر ایک سانپ پٹا ہوا ہے جو رقص کے دوران میں کبھی اولمپیاس کے سینے کو حلقہ میں لے لیتا ہے اور کبھی اس کی کمر اور گردن کو۔

وہ اپنے رقص کے انتہائی مودعہ پر ہے کہ فلپس اندر داخل ہوتا ہے اور اس کو دیکھتے ہی فریفتہ ہو جاتا ہے۔ فلپس اس کے چپا ہوا شہادہ پر کھانسی کے پاس شادی کا پیغام بھیجتا ہے اور آخر کار دونوں درباروں میں شہ عروسی کی طایاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔

جوں جوں شادی کے طقوس قریب ہوتے جاتے ہیں، خداوند آموئن کی پرستش گاہ میں اس کے رقص کی مستیاں اور رقص کے ساتھ پائے شباب

کی از انبیاں بڑھتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ شادی کی رات آپہنچی اور اس نے ایک خواب دیکھا کہ ہوا طوفانی ہے اور بجلی چم رہی ہے کہ دفعتاً ایک خونخوار گرج کے ساتھ بجلی اس کے جسم سے مس کرتی ہے اور اس کی ہاتھ ایک شعلہ محل کر فضا میں بلند ہوتا ہے اور پھر اس سے بہت سی شاخیں نکل کر چاروں طرف افق میں پھیل جاتی ہیں۔

اُس وقت فلیس بھی شادی کی طیاری میں مصروف ہے اور بے اندازہ دولت صرف ہو رہی ہے۔ پلوٹارک کا بیان ہے کہ فلیس اپنی نفیوں خرچی کے لحاظ سے بہت مشہور تھا اور وہ اپنی آمدنی و خرچ کا حساب بھی کبھی نہ رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے بادشاہ نے اپنی شادی کی طیاری میں کیا کچھ نہ کیا ہوگا، خزانہ کا دروازہ کھول دیا گیا تھا، انٹر فیاں پانی کی طرح بہ رہی تھیں اور اس نے حکم دیا تھا کہ بیش عروسی ایسے غیر معمولی پیمانہ پر منایا جائے کہ تاریخ عالم میں اس کی نظیر نہ مل سکے۔ آخر کار شادی کا دن آپہنچا اور یہ رسم بھی ادا ہو گئی۔

شب زفاف کے ایک روز بعد فلیس نے خواب دیکھا کہ اس نے اپنی وطن کے اندام خاص پر گھر لگا دی اور گھر کا نقش ایک شیر کی صورت کا ہے۔ کامنوں اور جرمیوں نے اولپیاس اور فلیس دونوں کے خواب سامنے لکھ کر تعبیر دی کہ اولپیاس کا بجلی کو خواب میں دیکھنا تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ خداوند آسمان کو اس عقد سے خاص دلچسپی تھی، لیکن شعلہ کا اس کی ہاتھ سے نکل کر چاروں طرف فضا میں پھیل جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اولپیاس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تمام عالم کو فتح کر لے گا۔ فلیس کا خواب میں یہ دیکھنا کہ اس نے اولپیاس کے جسم پر گھر لگا دی ہے، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اولپیاس حاملہ ہو گئی ہے اور اس کے بطن سے شیر کا سادل رکھنے والا لڑکا پیدا ہوگا۔

اس تعبیر کو سنکر سب کو بڑی مسرت ہوئی اور میاں بیوی دونوں بڑے لطف کی زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن ایک خاص واقعہ نے حالات کا رخ بدل دیا اور یہ تمام مسرتیں خاک میں مل گئیں۔

فلیس کو اس کا بالکل علم نہ تھا کہ اولپیاس نے ایک سانپ پال رکھا ہے جس سے وہ بہت مانوس ہے۔ اور سمجھتی ہے کہ خداوند آسمان اسی سانپ کے بھیس میں اس سے اختلاط کرتا رہتا ہے۔

ایک رات فلیس ناگاہ اس کی خواب گاہ میں پہنچا تو دیکھا کہ اولپیاس عریاں لیٹی ہوئی ہے اور سانپ سے محو اختلاط ہے۔ فلیس یہ دیکھ کر سکتے میں رہ گیا اور ہنوز اس کی یہ حالت دور نہ ہوئی تھی کہ اولپیاس اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے عدد درجہ برہمی کے ساتھ فلیس کو ڈانٹا کہ وہ کیوں بغیر اجازت اس کی خواب گاہ میں آگیا اور خداوند آسمان کے اختلاط میں حائل ہوا۔

فلیس کی پردیش بھی چونک پر تان کی اسی اساطیری فضا میں ہوئی تھی اس لئے وہ بھی خد گیا اور واپس چلا آیا، لیکن بعد کچھ ہی گزیر ہی ناشر کم ہوا تو اس نے سوچا کہ خداوند آسمان کا سانپ کے بھیس میں رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور جب اسے اولپیاس کی چستی کا خیال آیا جو سانپ کے ساتھ اختلاط کرنے کے دوران میں اس سے ظاہر ہو رہی تھی تو اس کو یقین ہو گیا کہ یہ سب فریب ہے اور اولپیاس اس کو دھوکا دیتی ہے۔ آخر کار اس نے کہہ دیا کہ اولپیاس کے شکم میں جو بچہ پایا جاتا ہے وہ اس کے لطف سے نہیں ہے بلکہ کسی اور کا ہے جس سے اولپیاس کا خفیہ تعلق ہے۔

فلیس پر ان واقعات کا بہت گہرا اثر ہوا، یہاں تک کہ اسے اولپیاس سے نفرت ہو گئی اور اپنا دل بہلانے کے لئے اپنے فوجی افسروں کے ساتھ وہ زیادہ تر ملک کے دورہ پر باہر پڑنے لگا۔

۱۹۵۷ء ق۔ م میں جبکہ وہ اپنے تخت سے باہر ہی تھا، اسے معلوم ہوا کہ اولپیاس کے لڑکا پیدا ہوا ہے اور اس کا نام اس نے سکندر رکھا ہے، لیکن وہ واپس نہ آیا اور برصغیر و سیاحت میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ دو سال گزر گئے اور فلیس نے سنسنی آمیز رہا، لیکن اولپیاس کو بھی اس کی برادری تھی کہ اس کا سادق سکندر کا گھرواشت میں صرف ہوتا تھا جسے وہ خداوند آسمان کا خلیفہ بھی سمجھتی تھی۔

جب دو سال کے بعد فلپس پائے تخت میں واپس آیا اور اس کی نگاہ اولمپیاس پر پڑی تو اس کا دل پھراس کی طرف کھینچنے لگا اور رفتہ رفتہ وہی انگلا سا جوش محبت پھر چھوڑ کر آیا لیکن چند دن بعد سکندر کے مسئلہ تعلیم و تربیت نے پھر دونوں میں اختلاف پیدا کر دیا۔ اولمپیاس کو تھی تھی کہ اس کی تعلیم بالکل مذہبی ہونا چاہئے تاکہ وہ بڑا ہو کر کاہن بنے اور مہمات مملکت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے، فلپس کا اصرار تھا کہ وہ ایک شاہزادہ کی سی تعلیم حاصل کرے جسے آگے چل کر بادشاہ ہونا اور ملک کا انتظام کرنا ہے چونکہ اولمپیاس کا اثر اپنے بیٹے پر زیادہ تھا اور فلپس سکندر کو اس سے جدا نہ کر سکتا تھا، اس لئے آخر کار وہی ہوا جو اس کی اہل چاہتی تھی اور سکندر کی تعلیم صرف مذہب اور فلسفہ تک محدود رہی۔ لیکن کچھ دن بعد اولمپیاس نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مذہبی تعلیم اسے دنیا و لذائذ دنیا کی طرف سے بالکل منفر کر دے، اس لئے اس نے سکندر کو لطف و نشاط کی جانب مائل کرنے کے لئے کئی صورتیں لیں۔ اس کی صحبت کے لئے متعین کیں جو بہ وقت جلوت و خلوت میں اس کو گھیرے رکھتیں لیکن سکندر زندگی کے ان اسرار سے واقف نہ ہوا جن کا افکاش وہ اپنے بیٹے پر کرنا چاہتی تھی۔ سکندر ہمیشہ لڑکھوں سے الگ الگ رہتا اور جب وہ اس کی خواہش میں پہنچے جاتے تو وہاں سے باہر نکل جاتا۔ گو فلپس کی عمر اس وقت ۴۶ سال کی پہنچ چکی تھی، لیکن اس کی صحت و توانائی میں کوئی فرق نہ آیا تھا اس لئے اب جو وہ نرائیوں سے فارغ ہو کر اطمینان سے بیٹھا اور دربار کی عسرتوں کی طرف متوجہ ہوا تو اس کی تمام وہی خواہشات پھر چھوڑ کر آئیں جو اولمپیاس کے دیکھنے کے بعد غفلت و شباب میں اس کے دل میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس کا یہ میلان دیکھ کر ملک کی جمیل ترین لڑکیاں دربار میں آ کر شریک ہونے لگیں اور آخر کار فلپس ایک سردار کی نہایت خوبصورت لڑکی پر جن کا نام کلیوپٹرا تھا، فریفتہ ہو گیا۔ یہ لڑکی مثنیٰ حسین تھی اتنی ہی جاہ طلب تھی اس لئے اسے کم دیا کہ میں شاید اسی وقت کر دیں گی جب اولمپیاس کو طلاق دیدی جائے۔ اسی کے ساتھ اس نے فلپس سے یہ بھی کہا کہ اولمپیاس کہتی ہے سکندر فلپس کا بیٹا بھی نہیں ہے بلکہ خداوند مومن کا ہے، اور اس صورت میں وہ ولی عہد بھی نہیں قرار پا سکتا۔

فلپس نے ان تمام باتوں کا یقین کر کے اولمپیاس کو طلاق دیدی اور اس کی جگہ کلیوپٹرا کے لکھنے کا اعلان کر دیا۔ اولمپیاس اور سکندر نے بہت کچھ کہا لیکن فلپس نے مانا اور اس نے حکم دیا کہ اولمپیاس اور سکندر بھی شادی کی رسم میں حصہ لیں۔ شب عروسی کا جشن پورے اہتمام کے ساتھ منایا جا رہا تھا، تمام امراء و سردار جمع ہیں، خمر کے خم شراب کے لذت حاصل جا رہے ہیں اور ہر شخص بدست نظر آ رہا ہے۔ اسی عالم میں کلیوپٹرا کے چچا آنتوس، شراب گلاس اٹھایا اور بادشاہ کا جام صحت نوش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ”اب مقدونہ کو ایک حلالی ولی عہد کے لئے کی امید ہو گئی ہے“۔ سکندر بہت برہم ہوا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا کہ ”اے ملک حرام تھے اتنی ہمت ہو گئی کہ میرے ہی سامنے مجھے حوالی کرتا ہے“ اور یہ کہہ کر چاہے وہ اس کے منہ پر کھینچ مارا۔ فلپس یہ دیکھ کر بہت برہم ہوا اور وہ ہاتھ میں تلوار لیکر سکندر کی طرف بڑھا لیکن چونکہ نشہ میں چڑھتا تھا اس لئے لڑکھڑکھ کر کہہ دیا ”سکندر نے یہ دیکھ کر باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ”یہ شخص سارے ایشیا کو فتح کرنا چاہتا ہے اور اس میں اتنی قدرت بھی نہیں کہ اٹھ کر میری میز تک آ سکے۔“ یہ کہہ کر وہ دربار سے نکل گیا اور اپنی ماں کو ساتھ لیکر اولمپیاس کے چچا بادشاہ اسپروٹس کے دربار میں جا کر پناہ لی۔

ایک سال کے بعد فلپس کی دوسری بیوی سے لڑکا پیدا ہوا، لیکن بجائے اس کے کہ امراء و رعایا خوش ہوتے، ان کو فکرمید پیدا ہو گئی کہ اب چاہے اس کا مسئلہ کیونکر طے ہو گا اور ممکن ہے اس اختلاف کی وجہ سے خانہ جنگی شروع ہو جائے اور ملک تباہ ہو۔ لیکن قدرت نے اس کا فیصلہ مائل کر دیا کہ ایک دن فلپس دربار میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص پارسا نیا س نامی نے اس کے قلب میں خنجر پیوست کر دیا اور وہ اسی وقت ہلاک ہو گیا۔ دربار کے امراء نے اولمپیاس کا طرفدار تھا اس واقعہ کی خبر اولمپیاس کو پہونچا دی اور جب تک وہ آئے انتقام سلطنت اپنے ہاتھ میں لیکر رہے پہلے کلیوپٹرا کو گرفتار کر لیا اور اس سے کہا کہ یا تو وہ خودکشی کرے یا ذات کے ساتھ وہ سو لی پر جان دینے کے لئے طیار رہے۔ کلیوپٹرا پر جو ابھی زہر خانہ ہی میں تھی اس درجہ خوف طاری ہوا کہ اسی رات اس نے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا، لیکن اولمپیاس کے انتقام کا جذبہ ٹھنڈا نہ ہوا، اس نے کلیوپٹرا کے نواسیہ کو بچہ کو بھی تم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ معبد مومن میں مجسمہ آسمان کے برابر ہی اس بڑے آتش دان کے گرد جو شب و روز روشن رہتا تھا، جمع ہیں اور مذہبی نمونوں سے نضا گونج رہی ہے کہ اولمپیاس دفعہ تیس کو تھوٹی نمودار ہوتی ہے اور حکم دیتی ہے کہ آسمان کی قربانی سامنے لائی جائے۔ رئیس معبد کلیوپٹرا کے بچہ کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیتا ہے اور اسے آتش دان کے بھرتے ہوئے شعلوں میں پھینک دیتا ہے۔

قوت تخیل اور روحانی تصورات

قوت تخیل کے نتائج ہمیں تقریباً ہر انسانی میں ملتے ہیں کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ جس شخص کے اندر اس قوت کی بہتات ہوتی ہے وہ شاعر، ادیب، سائنسدان یا اعلیٰ درجہ کا مصور بن جاتا ہے اور جس میں اس کی کمی ہوتی ہے وہ تخلیقی کام کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ بہر حال تخلیقی اہلیت کے لئے طاقت ور قوت تخیل کا پایا جانا بہت ضروری ہے۔ لیکن یہ بتانا کہ کس انسانی کے اندر قوت تخیل زیادہ ہے اور کس کا کم، ذرا مشکل کام ہے یوں تو غیر معمولی حالات میں ہم باسانی کہہ سکتے ہیں کہ فلاں فلاں دو اشخاص میں۔ اعتبار قوت تخیل کس کی شخصیت بلند ہے لیکن اگر بیک وقت ہمارے سامنے دس پندرہ آدمی لائے جائیں اور جلد سے جلد یہ فیصلہ کرنا ہو تو بلا انفسائی تجربات کے ہم فیصلہ کرنے میں ناکام رہیں گے۔

قوت تخیل کا اظہار بالعموم اس وقت ہوتا ہے، جب ہمارے ذہن میں ایک کے بعد دوسری تصویر آتی رہتی ہے یہاں تک کہ پورے پورے واقعات داغ کے سامنے اس طرح آجاتے ہیں جیسے سینما کے پردے پر کسی واقعہ کی تصویر سے لیکن یہ کیفیت ہمارے احساسات کے متحرک ہونے کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۱۹۹۵ء میں بروئیسر ہینٹ اور ہنری نے قوت تخیل کے تجربات شروع کئے تھے، لیکن ان تجربات کو معیاری صورت دینے کا کام بروئیسر دھیل (Prof. Whipple) کے ہاتھوں انجام پایا۔ بروئیسر مذکور نے ۲۰ کارڈ ایسے تیار کئے جن پر روشنائی کے چھوٹے بڑے دھبے بڑے ہوئے تھے۔ ان کارڈوں کو استعمال کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص کو یہ سارے کارڈ دے دئے جاتے تھے اور وہ ہر کارڈ کے دھبے کو دیکھ کر جو خیال ذہن میں آتا تھا نوٹ کرتا جاتا تھا اور اس طرح متعدد افراد کے خیالات کا موازنہ کر کے ان کی تفصیل کی رسائی کے متعلق رائے قائم کی جاتی تھی۔ دھار طریقہ یہ تھا کہ سارے کارڈ ایک شخص کے سامنے میز پر رکھے جاتے تھے اور ہدایت کر دی جاتی تھی کہ جوں ہی ایک کارڈ دکھو لایا جائے وہ اس کے متعلق سوچنا شروع کرے اور جس وقت دھبوں کی شکل سے ملتی جلتی کسی تصویر کا اسے احساس ہو وہ میز پر ہاتھ مار کر یا ”یہ ہی“ کہہ کر اس حقیقت کا اعلان کرے۔ ساتھ ہی ساتھ تجربہ کرنے والے کا فرض یہ تھا کہ وہ اسٹاپ واچ ”بند گھڑی“ کی مدد سے کارڈ کے کھلنے اور میز پر ہاتھ مارنے کے درمیانی وقفہ کو نوٹ کرے۔ اسی طرح ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا، غرض کہ جیسوں کارڈ کھولے جاتے تھے اور ہر دفعہ وقت نوٹ کر لیا جاتا تھا۔ اس طرح پہلے طریقے میں قوت تخیل کا اندازہ تصاویر کی زیادتی اور کمی کے اعتبار سے کیا جاتا تھا اور دوسرے طریقے میں وقت کی کمی اور زیادتی پر تخیل کی بلندی اور پستی کا پتہ لگایا جاتا تھا۔

اس طریقہ کے علاوہ بھی قوت تخیل پر اور مختلف طریقوں سے تجربات کئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ایک طریقہ جس کا مرشد سیلن (Masselon) ہے یہ ہے کہ معمول کو تین الفاظ دے دئے جاتے ہیں اور اسکو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ پانچ منٹ کا اندازہ جس قدر باصافی جملے ان تینوں الفاظ سے بن سکے بنائے۔ یہی عمل بیک وقت بہت سے لوگوں پر کر لیا جاتا ہے اور آخر میں جس کے جملے سب سے زیادہ اور باصافی ہوتے ہیں اس کو سب سے زیادہ نمبر دئے جاتے ہیں۔ لیکن اس طریقے میں ایک خرابی یہ ہے کہ قوت تخیل کا معیار یقیناً تو یقیناً جملوں کی طویل قطار سے ہو جاتا ہے لیکن جہاں تک جملوں کی گہرائی اور عمق کا سوال ہے یہ مسئلہ غیر تصفیہ شدہ ہی رہ جاتا ہے بروئیسر ہینٹ (Binet) نے تخیل کی شدت اور گہرائی کا اندازہ لگانے کے لئے اس سے بہتر طریقہ ایجاد کیا، اس ماہر نفسیات کا یہ طریقہ تھا کہ وہ معمول کو ایک جملے کے ابتدائی دو الفاظ دے دیتا تھا اور باقیہ خالی جگہ کو پُر کرنے کی ہدایت کرتا تھا

اور تہذیب خیال جگہ پر کرنے کی صلاحیت کے اعتبار سے مختلف افراد کے جہول سے اس کی داخلی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض زیادہ بڑے گہرے لوگ انھیں دو الفاظ میں سمجھ سکتے ہیں اور فلسفیانہ طرز فکر کا اظہار کرتے تھے اور دوسرے گندہ ذہن اور غبی حضرات بالکل سمجھتے تھے۔ جس طرح جہول پر اکتفا کرتے تھے ان کے انفرادی خصوصیات کا بہت لگ جاتا تھا۔ جہاں تک تخیل کی تیزی کا سوال تھا اس کا قصد اس طرح ہوتا تھا کہ جس وقت بچہ کے الفاظ دئے جاتے تھے صحیح وقت نوٹ کر لیا جاتا تھا اور گھڑی اس وقت تک چلتی رہتی تھی جب تک کہ جہول پرانہ ہو جائے اور اس طرح مختلف لوگوں کے مسائل پر نگاہ کرنے سے ہونے لگتا تھا کہ یہ تہذیب چل رہی ہے۔

ان تجربات کے علاوہ بھی ماہرین نے مختلف تجربات کئے ہیں۔ چنانچہ ایک مشہور ناولر نے یہاں تک پہنچے کہ درجہ اول کے امتحانات میں پڑھا جاتا ہے یہ تھا کہ نثر کا ایک فقرہ جس میں چند الفاظ کی جگہ خالی رہتی ہے لڑکے کو پڑھا جاتا تھا اور بعد ازاں وقت روحانی جگہوں کو پر کرنے میں صرف کرتا تھا۔ نوٹ کر لیا جاتا تھا۔ دوسرے طریقے کی رو سے جو بالکل اس کا عکس تھا صرف چند الفاظ کی مدد سے پوری پوری کہانی بنانے کی ہدایت کی جاتی تھی اور اس طرح وقت کی زیادتی اور کمی کے اعتبار سے قوت تہذیب کی تیزی و سستی کا اندازہ کیا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور دلچسپ کمیل جس سے بڑی حد تک تخیل کی رسائی کا اندازہ ہو سکتا ہے یہ ہے کہ چند حروف کی مدد سے (جن کی تعداد چھ تک ہو سکتی ہے) پانچ منٹ کے اندر جس قدر الفاظ بن سکتے ہوں، بنانے کی ہدایت دی جائے اور اس طرح الفاظ کی تعداد کے لحاظ سے تخیل کی بندی یا پستی کا امتحان لیا جائے۔

تجرباتی نفسیات کی اسی مقروضہ مداخلت نے جہاں کے خلائات فلسفیانہ نے صدائے احتجاج بلند کی ہے ان کے اعتراضات کا حاصل یہ ہے کہ تجرباتی نفسیات کا دائرہ عمل بہت محدود ہے اور صرف مخصوص قسم کی تخیلی خصوصیات کا اندازہ ان تجربات کی مدد سے ہو سکتا ہے کیونکہ جہاں تک بندی نثر اور ما بعد الطبیعیاتی مسائل کا سوال ہے تجرباتی نفسیات ان کی گمراہ راہ کو بھی نہیں پا سکتی۔ میری کولنس (Mary Colless) اور ٹیس ڈیویر (James Drever) نے اس سوال کا بہت جواب دیا ہے ان کا خیال ہے کہ فلاسفہ کی یہ دلیل کہ باندھنے والے جن کا تعلق روح سے ہوتا ہے، بے تصویر (Imageless) ہوتے ہیں قطعی غلط ہے کیونکہ تجربات شاہد ہیں کہ ہم جو کچھ بھی سوچتے ہیں وہ خیالات ہمیشہ بالصور انرازا میں ذاتی کے اندر گزرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے کوئی نفسی کہانی پر دہکے ہیں یہ دکھائی جا رہی ہے۔ اس مسئلہ پر ارسطو و افلاطون ہی کے وقت سے لوگوں نے غور کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ ارسطو نے یہاں تک تسلیم کر لیا تھا کہ روح کی حقیقت اسی وقت تسلیم کی جا سکتی ہے جب ہم یہ ثابت کر دیں کہ وہ بلا جسم کی امداد کے کسی قسم کے خیالات کی پیدائش کا باعث ہو سکتی ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب کہ یہ مسئلہ طے نہ ہو جائے کہ روحانی مسائل پر بغیر تصویر (تخیل) کے بھی کچھ سوچ سکتے ہیں اور یہ بہت مشکل ہے۔ کیونکہ تجربات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ہر خیال مادی وسایل کی امداد کا مرہون منت ہوتا ہے۔

یہاں پر مجھے ایک اور غلط فہمی کا ذکر کرنا مقصود ہے جو بعض قدامت پرست شعراء اور ان کے تبعین کے ذہنوں میں اب تک جاگزیں ہے اور وہ یہ ہے کہ شاعرانہ خیالات عوام کی ذہنی سطح سے بلند ہوتے ہیں اور وہ ایک ایسے مخصوص وجدان کا نتیجہ ہوتے ہیں جن کا اس مادی دنیا سے کوئی علاوہ نہیں۔ لیکن ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ "شاعری جزوے امت از پیغمبری" کا نظریہ اب باطل ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ہماری ہر حرکت خواہ وہ فہمی ہو یا داخلی ایک یا چند اسباب و علل کی پیداوار ہو اگر کرتی ہے اور شعرو کوئی اسی سطحی گرفت سے غلط کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ مجھے اس موضوع کو طوالت دینے کا احساس ہے لیکن میں "حقائق کے انکشاف" کے منظر پر کچھ پر مجبور ہوں کہ بہتر سے بہتر عربی، نظم یا اشعار معرّف، شعور مادی قوانین کے تحت (جو داخلی دنیا میں تسلط پذیر ہیں) عرصہ وجود میں آتے ہیں۔ اگرچہ ان کے ذہنی اور حسی کی کسی شیکش کے متعلق تو نہیں دیکھو کہ مجھے کسی ایسی ایسی شاعری کا علم نہیں) البتہ انگریزی کے ایک شاعر کالریج جو کہ شاعری کے ایک نظم کیلئے (Kulala) کے متعلق (انگریز و امریکی ادیبوں اور نقادوں کا خیال ہے کہ ان کے خیالات ان کے شعروں سے زیادہ اہم ہیں) لیکن یہاں تک کہ ان کے شعروں کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو سکے۔

ہن ایسی نہیں کہانی ہے جس کا ہوا و صفت بالواسطہ کوئی کیے ساتھ شعوری اور غیر شعوری ذہنی پختہ سے تعلق نہ رہا ہو اور اس اثر کو ”عجازی“ رنگ دینا سراسر حقائق کا اظہار تھا پھر شاعر اور شاعرانہ برکیا منحصر ہے، ہر فرد بشر ذہنی اعتبار سے اسباب و علل اور ہن کے نتائج کا پابند ہوتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے حسیاتی تجربات کے حلقہ اثر سے باہر کسی بات کو سوچے یا کہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے ہم خود اپنے (اور دوسرے عام آدمیوں) کے تجربات سے مستفید ہو سکتے ہیں، غائبانہ ہم میں سے ہر شخص اس بات کا مقرر ہوگا کہ بعض اوقات ہمارے ذہن میں دوغٹا ایسے خیالات آتے ہیں جن کا بظاہر ہماری موجودہ ذہنی کیفیت سے کوئی علاقہ نہیں معلوم ہوتا، لیکن اگر ہم غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ان سب خیالات کی کڑیاں ہمارے سابقہ واقعات اور احساسات سے مل جاتی ہیں۔ فریڈ نے اپنی معرکہ آرا تصنیف ”غفلتوں اور عمل کی غلطیوں“ میں اس نقطہ نظر کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ہماری ہر غلطی خواہ زبان سے متعلق ہو یا اور کوئی عضو یا قی غلطی ہو اپنے پیچھے اسباب و علل کی ایک فوج رکھتی ہے۔ جن کی مانت و تاراج کا نتیجہ ان غلطیوں کے ظہور کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ میں نے خود اپنی چند غلطیوں کا جو میری سخت الشعوری کیفیت کی آئینہ دار تھیں تذکرہ کیا تو مجھے اس قانون کی ہمہ گیری کا احساس ہوا۔ میرے تجربات کوئی نثری حقیقت تو نہیں لگتے لیکن پھر بھی ناظرین کی دلچسپی کے لئے حسب ذیل واقعہ پیش کرتا ہوں

ابھی چند ماہ گزرے ماہ رمضان میں میں گرمیوں کی تعطیل کے سلسلہ میں گھر گیا ہوا تھا وہاں پر چونکہ اور لوگ روزہ رکھتے تھے اس لئے مجھے بھی اُن کا اتباع کرنا پڑا لیکن سگریٹ نوشی کی بُری عادت کے باعث ”سحر کرنے“ کے وقت سے افطار تک مجھے ہر وقت یہی انتظار رہتا تھا کہ کب دل غروب ہو اور روزہ افطار کر کے سگریٹ پیا جائے، سگریٹ کی یہ خواہش میرے اوپر ایسی مستقل رہتی تھی کہ اکثر دوران گفتگو میں بجائے ”سحر“ کے ”افطار“ کا لفظ استعمال کر دیتا تھا اور اس غلطی کا احساس مجھے بعد میں ہوتا تھا۔ میں نے جب اس مسئلہ پر غور کیا کہ بالآخر میں ”سحر“ اور ”افطار“ کے الفاظ ہی کے استعمال میں کیوں مجھ سے غلطی ہوتی ہے تو مجھے پتا چلا کہ اس کا سبب میرا سخت الشعور تھا جسے سحر کا لفظ باقی پر لاتا بھی ناگوار سمجھا اور نہ بجاے سحر کے ”افطار“ کا انتظار کرنا تھا۔

میرے ایک اور عزیز تھے جن کو اگر کسی چیز کے خریدنے کے لئے پیسے دئے جاتے تھے تو وہ ہمیشہ اس کی زیادہ قیمت بتاتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ ان کو میں سیر شکر لائے کو پیسے دئے گئے لیکن وہ عادت سے مجبور تھے اس لئے انھوں نے صرت پندرہ سیر شکر لانے پر اکتفا کی اور گھر پر کر کے بکدیا۔ شکری ہی میں سیر یہ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کو وزن کرنے کی کھن رحمت کرے گا مجھے ہمیشہ اُن پر شک رہتا تھا اس لئے میں نے اس سودے کو بھی بے نظر اشتباہ دیکھا لیکن اُن پر اپنی اس ذہنی کیفیت کا اظہار نہیں ہونے دیا اور اُن سے ادھر ادھر کی گفتگو شروع کی جو شکری کے خریدے سے غیر متعلق تھی لیکن چونکہ اُن کا ذہن اپنی اس چالاکی پر سرور تھا یا بول بکھے کہ وہ ابھی تک اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے لا شکو کا طور پر کہ آیا اُن کا دھوکا کامیاب ہو گیا یا نہیں لہذا انھوں نے گفتگو کے دوران میں ایک جگہ پر لفظ ”پندرہ“ (بالکل نادانستہ طور پر) استعمال کر دیا۔ بس پھر کیا تھا مجھے پتہ چل گیا کہ یہ یقیناً صرت پندرہ سیر شکر لائے ہیں اور میں نے آخر کار اُن سے اعتراف کوا لیا۔

ان تمام واقعات سے یہ پتا چلتا ہے کہ ہماری ذہنی کیفیت اسباب و علل کی اسی طرح پابند ہے جس طرح اعدادی اشیاء ہوتی ہیں اس لئے ان کو روحانی حیثیت دینا غلطی ہے اور اگر ہمارے خیالات اعدادی حیثیت رکھتے ہیں تو سوچ یقیناً وہ (خواہ وہ کتنے ہی دو باز کار اور اجہد طبیعیاتی حیثیت کیوں نہ رکھتے ہوں) جانچے اور امتحان کی گرتوں میں آسکتے ہیں۔

جلیل احمد ام۔ اسے

مقدمہ اشارے

پرو فیروز آل احمد سرور کے قلم سے لکھی گئی اس کتاب کا مجموعہ جو فیروز خان کی تصانیف پر مشتمل ہے اس کا نام ہے
 ہر سترہ ۴ :- اُردو ناول کا ارتقا۔ اردو میں فساد نگاری۔ اردو شاعری میں غزل کی ترقی۔ اردو ناول میں غزل کا دور
 اگر کلا رٹ۔ چکاسیت گھنٹی۔ اقبال ابدان کا فلسفہ۔ رتن ناتھ سرشار۔ آغا شہر علی۔ جگر مراد خان۔ فیروز خان۔

تیر و راسخ کا تقابلی مطالعہ

غم عشق جب دل میں گھر کرتا ہے تو ظاہری شکل و صورت پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ کوئی اس راز کو چھپانا بھی چاہے تو کامیاب نہیں ہو سکتا عاشق کی فضا پر صورت اس کے دلی کیفیت کی غمازی کرتی ہے، تیر کے یہاں اکثر اشعار اس مضمون کے پائے جاتے ہیں:-

تیر:- قامت خمیدہ، رنگ سرسبز، بدن نزار
تیر تو میر غم میں عجب حال ہو گیا
حلقے آنکھوں میں پڑ گئے، منہ زرد
ہو گئی مہر سیری کیا صورت
کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں
کیا عشق میں ہوا ہے اسے تیر حال تیرا

راسخ کی بھی ظاہری صورت سے غم عشق آشکار ہے۔ بلکہ دیکھنے والے اس حال ابتر کے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے۔

ہونٹہ ہنس سونگے تیریں آنکھیں نہ دے چہرہ راسخ آہ
بندہ سے صاحب حال تھا راہ نہیں دیکھا جاتا ہے

فطرت کا خاصہ ہے کہ جب کسی واقعہ یا حادثہ ظہور ہوتا ہے تو اس سے پہلے ہی ہزاروں دوسروں اور خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں کسی کا شعر ہے:-

سے کوئی بات آج ہونے کو
دل بہت چاہتا ہے رونے کو

تیر کے دل پر بھی یہی حالت طاری ہوتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ یار کی خبر سننے پر آئے گی:-

آج ہمارا دل تڑپے ہے کوئی دہان سے آدھ گیا
یا کہ نوشتہ آن آنکھوں کا قصہ ہم تک لا دینگا

تیر ہی کا دوسرا شعرلاحظہ ہوا

دیکھئے کیا ہو سانچہ تک احوال ہمارا ابتر ہے
دل اپنا تو بچھا سادیا ہے جان چراغ مضمحل ہے

راسخ کا دل بھی بے تاب ہے، ایک آنکھیں ہے، مگر انتہائے شعرت ہے کہ اس کا اظہار نہیں کیا جاتا کہ آخر اس کا سبب کیا ہے بلکہ ایک حالت طاری کر دی گئی ہے اور انتظار ہے کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

راسخ:- بسج سے ہے بے تابی دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے
دیکھئے کیا ہو شام تک دل آج بہت گھبراتا ہے

حافظ نے پہلے ہی چرنگا دیا تھا کہ ”عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلا“ مگر ”ہر وہاں ہوسے عشق پرستی شعار کی“ اور یہ سمجھا کہ منزل عشق طے کر لوں گا مگر قدم رکھتے ہی معلوم ہوا کہ یہ بڑی کٹھن راہ ہے۔ تیر فرماتے ہیں:

خطر بہت ہیں تیر وہ صعب عشق میں
ایسا نہ ہو کہیں کہ دل و دہن کو کھو رہو،

صحرائے محبت ہے قدم دیکھ کے رکھ تیر
یہ سیر سر کو چڑ و بازار نہ ہو دے

راسخ کو بھی یہی اندیشہ ہے۔ وہ اس طرح متنبہ کرتے ہیں:-

بے دردی سے طے کیو نہ راہ طلب یار
ہاں دیکھو پامال کوئی خار نہ ہو دے

اگر کچھ درد رکھتا ہے تو راہ عشق یوں طے کر
نہ کاٹا کوئی ٹوٹے اور پھوٹے آبلہ پا کا

قدم نہ رکھ رہ مشکل گزرا عشق میں تو
کہ سرسری نہیں طے کرنا ایسی راہوں کا

یہ سردے طے ہونے پر غم عشق
یہ راہ دم تیغ ہے، بر جھکی کیانی ہے

تیر نے کیا خوب کہا ہے:- رہبر راہ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

عشق کی مصیبت میں چنسن کی پیارہ عاشق پہلے ہی قدم پر رونے لگتا ہے!
تیر:- ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا؟ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!!
راسخ کو بھی یہی مصیبت پیش آتی ہے:-

ہنسی سمجھتے تھے راسخ طے صحرائے محبت کو سو میری جان گام اولیں پر رو دیا تم نے
شروع عشق راسخ کہتے ہو جاتا ہے دل ڈوبا کنارے ہی پہ اس دریا کے حال ایسا تمہارا ہے
عشق کی راہ ایک پر خطر راہ ہے۔ پھر اس پر راہ کی ناہمواری اور صعب گزارہ ادھی، عاشق صبر کی تاب نہیں رکھتا اور شکوہ کرنا
لگتا ہے۔ تیر:- منزل پہنچاؤں اک طرف نے صبر نہ ہے سکوں یکسر قدم میں آئے پھر راہ پر خار اس قدر
راسخ:- کرتے ہیں شکوہ آبلہ کا سر قدم پہ ہم طے خاک ہم سے ہوگا بیا بان عشق کا
دم آخر یار کا بالیں پر آنا بہتوں نے لکھا ہے۔ جبکہ عاشق دم توڑ رہا ہو، معشوق آیا بھی تو کیا؟
ع:- صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا؟
غائب نے کیا خوب کہا ہے:-

مذ گئیں کھولتے ہی کھولے انگلیں سے ہے!! یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت؟
حقیقت یہ شعر تیر کے اس شعر سے ماخوذ ہے:-

جیت وے جہ کے وہ اس وقت میں پہنچا جوت اُن کے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا،
تیر کے یہاں الفاظ میں الجھاؤ ہے۔ غائب نے اس شعر کو بلند کر دیا ہے اس پر بلاغت کا یہ پہلو کردہ خود نہیں آیا بلکہ احباب اس کے لئے
معشوق کی شان خود داری کو قائم رکھا ہے۔ اسی مضمون کو راسخ نے اس طرح ادا کیا ہے:-

بیٹھے تب وے مری بالیں پہ کب جیضعف سے میں اُٹھ کے اُن پاؤں پہ سر رکھنے کے قابل نہ رہا،
بیٹھے آئے مری بالیں پہ لیکن اُسے کب جب علاؤ جان کا جسم ناتواں سے اُٹھ گیا
نامراد عشاق کے پاس آہ و تال کے سوا اور کوئی سامستلہ ہے۔ ان کی آہوں کا دھواں کائنات پر چھا جاتا ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ
آسمان ان ہی کے آہوں کا دھواں تو نہیں:-

تیر:- جس کو تم آسمان کہتے ہو سو دلوں کا غیب رہے اپنا
راسخ:- آسمان اس کو نہ جانو یہ جو آتا ہے نظر ہو گیا ہے کچھ دھواں پن اپنے دل کی آہ کا
کچھ دلوں کے بعد غائب نے بھی یہی سمجھا:- دو دو سودائے تنق بست آسمان نامیدش
دل بے دعا ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ جس کو یہ حاصل ہو گیا اس کو یہ قول تیر خدائی ہاتھ آگئی۔

تیر:- سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا مجھ کو وگرنہ میں خدا تھا گر دل بے دعا ہوتا
راسخ بھی دل بے دعا کے حصول کے لئے دست دعا ہونا چاہئے مگر پھر خیال آتا ہے کہ دل بے دعا کا دعا بھی پہر حال دعا
دل ہی ہے پھر دل بے دعا کہلا رہا۔

اگر یاب اجابت تک رسا اپنی دعا ہوتی توجی میں تھا کہ خواہاں دل بے دعا ہوتے
بے دعا ہوں یہ بھی ہے اک دعائے دل اس قید دعا سے نہ کوئی رہا ہوا
عشق ہمیشہ ایک راز ہی رہا۔ سب نے اس کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے بہت سمجھا تو شاید سے زیادہ دیر تک
شیفہ نہ کیا خوب کہا ہے:- شاید اسی کا نام محبت ہے شیفہ ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

حالی نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔

خود بخود دل میں ہے اک شخص سیاہاں،

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ بھی ہے شاید

سودا ہے اختیار بکار اُسٹھے:

دل میں شعلہ سا کچھ لپٹا ہے،

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف

تیرے بھی مختلف اشعار میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے:

سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کر ہے

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن

اک آگ سی ادھی ہے کیا جانے کہ کیسے ہے

چھاتی جلا کر ہے سوزِ دروں بلا ہے

جی خود بخود اسے ہمد کا ہے کوکھیا جاتا

گر عشق نہیں ہے تو پھر کیا ہے بھلا مجھ کو

دھواں سا ہے کچھ اس لنگر کی طرف

محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ

اک آگ سی لگی ہے کہیں کچھ دھواں سا ہے

کیا جانے کہ چھاتی جلتے ہے کہ دل کا داغ

وہی عشق کہیں سینہ میں آگ بن کر شعلہ زن ہے، کہیں ایک "شخص" بن کر مل ہی ساتا ہے، کسی کے دل میں شعلہ سا لپٹا ہے کسی کا دل فنا

کسی کا دل کھپاتا ہے، وہی عشق راج کے جگر میں کاٹا سا کھٹکتا ہے:-

کاٹا سا کچھ جگر میں ہے اپنے چبھا ہوا

لاگ اس پلک کی اتنی ہی معلوم ہے کہ آہ

"تعرف الاشیاء باضدادا" ایک مشہور مقولہ ہے اور حقیقت پر مبنی۔ سفید رنگ سیاہ ہی پر کھلتا ہے۔ اگر گناہ نہ ہوتی تو دن کی

کوئی وقعت نہ تھی۔ قائم نے یہ کہا ہے:-

کچھ کفر بھی ضرور ہے اسلام کے لئے

موتوں ضد ہی پر تو ہے ہر شے کی معرفت

تیرے کفر کو اسلام کی رونق کا سبب بتایا اور اس کی شاعرانہ توجہ کی:-

حسن زنا ہے تسبیحِ سلمانی کا

کفر کچھ چاہئے اسلام کی رونق کے لئے

راسخ نے اسی مضمون کو بول ادا کیا:-

جہنم کے مقابل غلہ جاویداں کیا پیدا

کے اضداد و عا ہر قدر تا معلوم ہونے لگی

مسک تصوف میں ظاہری اور جسمانی تعلقات سے درگزر کیا جاتا ہے یہاں تک کہ اہل تصوف کا کعبہ بھی کوئی اور کعبہ ہے، دل ہی کا

کعبہ مقصود ہے، جہاں معنوق حقیقی جلوہ گر ہے:-

نشاں جو چھپے کوئی مجھ سے یار کے گھر کا

تیر:- بنا کے کعبہ کا راستہ بھلا دوں اسکی راہ

گویا کعبہ کا راستہ بتا کر سالک کو منزل مقصود سے ہٹکا دینا ہے۔ حقیقی منزل تو اور ہی کہیں ہے۔ راسخ کے یہاں کعبہ محض ایک راہ ہے۔

منزل تو ان کی بھی کہیں اور ہے:-

اقامت راہ میں کرتے نہیں مشاقِ منزل کے

عقیم کی طرف سے ہے وہاں کعبہ بھل گئے

کعبہ کہتے ہیں جسے سوراہ ہے منزل نہیں

ظاہر ہے کہ منزل کو غیر از دل نہیں

تو یہ کہیں کی کہیں "منزل" اور حافظ کا "مقرعہ فال" والا شعر بہت عام مضمون ہے۔

اس کو:- نا تو اں اٹھا لایا

یہاں سے کہیں جس ارے گرائی کی،

پہلے شعر کی بلند آہنگی اور جوش و خروش دیکھئے

وہی سہجائے تنہا غم شکن ہم کو پلا دی ہے

وہی سہجائے غم شکن ہم کو پلا دی ہے

افلاک امانت کے ذمہ دار ہوئے راسخ
کیونکر متحمل ہے تو اس بارگراں کا ؟
آسمان پر رانی جس نے کی
بوجہ وہ تیرے ناتواں سے اٹھا
اسی مضمون کو نئے پیرایہ میں شاد عظیم آبادی نے کس خوش اسلوبی سے لکھا ہے :-
امانت غم کے سوپنے کو قضا نے جب آکے فال کھولی
جوسب سے عاجز تھے اس نگلی میں انھیں غریبوں کا نام نکلا
فریاد عظیم آبادی کا ایک فدرسی شعر ہے :-

ہمسایہ زندہ لیدن میں نالہ و گوید
اسی سلسلہ میں خاقانی کا بھی شعر ہے :-

ہمسایہ شہید نالہ ام گفت
خاقانی را دگر شب آمد
مگر ہمسائے ہر طرح کے ہوتے ہیں، غمخوار بھی اور دل آزر بھی۔ مگر جب کوئی رات کی رات آہ و نغلاں کرتا رہے تو ہمسایہ کہل تک اپنی نیند خراب کرے گا۔ سودا نے کہا :-

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
اب آئی سحر ہونے کو ملک تو کہیں مر بھی
تیر اپنے مخصوص لب و لہجہ میں یوں فرماتے ہیں :-

جو اس شور سے تیر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا
کریں خواب ہمسائے کیر نکر کریں
بلا شور و فریاد و زاری رہے
ہمسائے مجھے رات کو روایا ہی کرے ہیں
سوئے نہیں پیارے مری نالہ کشی سے
آسج :- چپ ہو راسخ کب تک یہ نالے یہ آہیں یہ شور
فون ہے مجھ کو کہ ہمسائے نگہ راویں کہیں
مسک برد اختیار اسلامی ادبیات کا ایک خاص مضمون رہا ہے اور ہمارے شعر زیادہ تر ”جبری“ واقع ہوئے ہیں درد فرمانے ہیں :-

جب کہتے ہو کہ ہے وہی یاد ہی مفضل
تو راہ پر ہیں سب کوئی گمراہ ہی نہیں
تیر محبوبانہ شعلے سے یوں رقم طراز ہیں :

ناحق ہم مجبور دل پر بہت سے مختاری کی
جاہیں ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو بحث و نام کیا
راسخ نے بھی اپنی مجبوری کا اظہار کیا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ تیری نے کسی کو نہیں پہنچتے :-
مت کہو مختلف ہم سے جبر و ملکہ کو گتہ
چشم دل پر بھی نہ اپنے اختیار اپنا ہوا
مضمون کی غیر موجودگی میں دل میں جو کچھ بہت ہوتے ہیں اور خواہشات کی ایک دنیا بہت ہے مگر اس کے آتے ہی کچھ ایسی پپ لگ جاتی ہے
کدل کا شور دل ہی میں رہ جاتا ہے اور ایک صحت بھی زباں پر نہیں آتے پاتا۔ داغ کا یہ شعر کس نے نہیں سنا :-

کہنے دیتی نہیں کہ منہ سے محبت تیری
لب پہ رہ جاتی ہے آ آ کے شکایت تیری
نظام رام پوری جو مسالطی شاعری میں مشہور ہیں ان کے بھی دو شعر سن لیجئے :

باتیں تھیں دل میں کیا کہنے کو تھیں نہ کیا کچھ
منہ سے نہ اس کے آگے بھی کلام نکلا
حیران سے رہ جاتے ہیں ہم جاتے ہیں اس کے
ہم سے تو نظام اس کا گلہ ہو نہیں سکتا
ان سب سے بہت پہلے تیر کو بھی یہی معاملہ پیش آ چکا ہے :-

یہ سچے ترے حضور نہیں
کہنے کی تیر میں کچھ سچ نہ کہا جاتا
غرض اور ناظر ہوں :-

دل میں مسودے تھے بہت پر حضور یار نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے
راتخ اسی مضمون کو اس طرح لکھتے ہیں :-

تھا جی میں کہ دشواری ہجر اس سے کہیں گے پر جب لے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا
بھلا کہو، کہیں ایسے سے اپنا کیونکر حال کر جب وہ سانسے ہو طاقب بیاں نہ رہے
لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب کے سب سعدی کے خوان ادب کے زکر رہا نہیں :-

سعدی :- گفتہ بودم چہ بیائی غم دل با تو گویم چہ بگویم ؟ کہ غم از دل برد چوں تو بیائی
عاشق خود معشوق کی طرز دلبری کا شاکی ہوتا ہے کہ میری صورت اتنی پیاری اور دلربا ہے کہ ہم دل دینے پر مجبور ہیں۔ میرا
تصور کیا ہے۔ تجھے آپ اپنا شاکی ہونا چاہئے۔

میر :- پیار کرنے کا جو غوہاں تجھ پہ رکھتے ہیں گناہ ان سے بھی تو پوچھے تم اپنے کیوں پیار ہوئے
راتخ :- دل دیا گر اس کو ہم نے صحت کلامت کو ہمیں ان سے کہنا صحیح کہ اتنے دلربا تم کیوں ہوئے
یہ دونوں اشعار سعدی کے اس شعر سے ماخوذ ہیں :-

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم باید اول بتو گفتن کہ چہیں خوب چرائی ؟
کسی نے کیا خوب کہا ہے :

ان کی نظروں کو کوئی کہتا نہیں دل ہمارا مفت میں بدنام ہے
وحید الد آبادی یوں کہتے ہیں :-

وہ مجھ سے کہتے ہیں تری آہیں غضب کی ہیں اس کی خبر نہیں کہ نکلا ہیں غضب کی ہیں
عاشق کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کرتا۔ اگر پیارہ دیوار یا رنگینچے پڑ رہتا ہے تو لوگ طعنہ زن ہوتے ہیں کہ وہ تو آرام طلب
ہے۔ چین سے سایہ میں سوتا ہے۔ اس کو محبت سے کیا لگاؤ۔ تیر کا مشہور شعر ہے :-

ہوگا کسو دیوار کے سائے کے تلے تیر کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
راتخ نے بھی اسی طرح طعن آمیز اشعار کہے ہیں :-

مست کرو عشق کا دعوے راتخ عشق تم کو نہیں زیبا راتخ
رنج کش عشق کے کب ہو صاحب تم تو آرام طلب ہو صاحب
سایہ ہی ڈھونڈھو ہو سونے کے لئے دل خوش چاہو ہو رونے کے لئے
گرچہ بات تیرے ایک شعر میں اُسی راتخ تین شعر میں بھی وہ ٹیکھا ہوا بیدار کر سکے۔

جو لوگ عشق میں آوارہ و سرگرداں ہیں ان کا پتہ یہی ہے کہ خاک کی طرح پریشاں حال ہیں۔ تیر نے کہا ہے :-
آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشان مشت خبار لے کے صبا نے اڑا دیا
راتخ کہتے ہیں :- لے ایک کھٹ خاک اڑا دیکھو پریشاں گر پوچھے مرا حال وہ اسے باد شمالی

جب کوئی واقعہ خلعت توقع ظہور پذیر ہوتا ہے جس کا سان گمان بھی نہ ہو۔ اور وہ واقعہ جس ذریعہ سے ظہور پذیر ہوا
ہے اس میں یہ ظاہر اس کی محال نہ ہو تو کہتے ہیں کہ "کوئی معشوق ہے اس پر دُ زنگاری میں"

تیر نے کیا خوب کہا ہے :- فلک کا منہ نہیں اس فتنہ کے اٹھانے کا ستم شریک ترانا نہ ہے زمانے کا
راتخ کہتے ہیں :- فلک ایسا ہمارے درپے ایذا نہ تھا پہلے بے میری تمھاری ہے تمھاری ایشاد

عشوق کے در کا گدا ہونا ایک ایسی سعادت ہے جس کی آرزو شاہوں کو بھی ہے۔
 تیر کہتے ہیں :- ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہی سے اگر نصیب ترے کوچے کی گدا لئی ہو
 راتخ اس طرح کہتے ہیں : شاہوں کو کبھی یہ ایسی گدا لئی کی آرزو
 عالم بے خودی میں انسان اپنی ہستی اس طرح فراموش کر دیتا ہے کہ اپنی اس فراموش کاری کو بھی فراموش کر جاتا ہے، غالب کس
 بند آہنگی سے اس مضمون کو ادا کرتے ہیں :-

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی،
 تیر اور راتخ نے بھی اس مضمون کو اپنے اپنے پیرایہ میں ادا کر لیا ہے :-
 تیر :- ہم آپ سے جو گئے ہیں گئے ہیں مدت کے اپنی اپنا ہمیں کب تک انتظار رہے
 ہم آپ سے گئے سو ابھی کہاں گئے مدت ہوئی کہ اپنا ہمیں انتظار ہے
 مدت ہوئی کہ اپنی خبر کچھ نہیں ہیں کیا جانئے کہ تیر گئے ہم کدھر تئیں،
 بے خودی لے گئی تمہارا ہم کو دیر سے انتظار ہے اپنا،
 خدا جانے ہمیں اس بے خودی نے کس طرز پر پیدا کیا جانے لے گئی ہے کدھر بے خودی مجھے کہ مدت ہو گئی ہم کھینچتے ہیں انتظار اپنا
 راتخ :- کیا جانوں لے گئی ہے کدھر بے خودی مجھے برسوں ہوئے کہ آپ ہوں میں انتظار میں
 کیا جانیں کہاں بے خودی تم بہا نہیں لے گئی دشوار ہوا ہے بہت اب آپ میں آنا

عشق ایک روحانی لذت ہے، عاشق اس لذت کے لئے بے قصد و ارادہ کو جذبہ محبوب کا طواں کرتا رہتا ہے۔ یہی اس کی زندگی
 ہے۔ لوگ اس کو کمزور لاتے ہیں مگر پھر موقع پاتے ہی چپکے سے وہ ٹھٹھک کر اہوتا ہے پھر وہی گلی ہے اور اس کا طواں۔
 مصحفی نے کیا خوب کہا :- ترے کوچے اس بہانے مجھے دل سے راتکنا کبھی اس سے بات کرنا بھی اُس سے بات کرنا
 تیر فرماتے ہیں :- چلاؤ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو تیر ابھی میں اس کی گلی سے پکار لایا تھا
 راتخ کہتے ہیں :- صبح ہوتے ہی گیا راتخ گلی میں اس کی پھر کل میں ساری رات اُسے با آنگہ سمجھا تا رہا
 انسان کی ساری کوششوں کے بعد اگر امید اپنا رخ دکھائی ہے تو کس قدر مسرت ہوتی ہے مگر عین اس وقت جبکہ کامیابی بالکل
 قریب ہے اور منزل مقصود سامنے، ناکامی اور حیران نصیبی سے دوچار ہونا پڑے تو کس قدر جائے حسرت و افسوس ہے مصحفی کا مشہور
 شعر ہے : قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کند دوچار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا
 اسی مضمون کو تیر اور راتخ اس طرح لکھتے ہیں :-

تیر :- ملے کیونکر نہ کف افسوس جی جاتا ہے تیر ڈوبتی ہے کشتی درط سے نکل ساحل کے پاس
 راتخ :- کروں کیا شرح محرومی کو راتخ آہ میں وہ ہوں کہ ڈوبی ہے مری کشتی پہونچ کر پاس ساحل کے
 عاشق رو رو کر اپنا حال زار بیان کرتا ہے۔ ایک بات کہتا ہے پھر روتا ہے، پھر کہتا ہے اور روتا جاتا ہے ایسی حالت میں بننے والا
 کیا خاک سمجھے گا۔ تیر کا شعر ہے :-

احوال تیر جی کا مطلق گیا نہ سمجھا، کچھ زیر لب کہا بھی تو دیر دیر رو کر
 مضمون معمولی، اور صاف ہے مگر اسی مضمون کا ایک شعر راتخ کا بھی ہے جو اس سے زیادہ بلند اور معنی خیز ہے۔ حالت یہ ہے کہ عاشق
 مسرتی کے جوہر ستم کا گلہ کرتا ہے اور کہتے کہتے روتا بھی جاتا ہے۔ سننے والا پریشان ہے کہ یہ کس طرح کا گلہ ہے کہ معشوق کا گلہ بھی پھر
 اس کی بخت چھوڑی بھی نہیں جاتی۔ حالانکہ جب گلہ ہی کرنا ہے تو اس کی محبت سے دست بردار ہو جانا چاہئے، مگر عاشق اپنے دل سے

مجبور ہے۔ جب ظلم و جور سے اکتا جاتا ہے تو نگہ طرازی شروع کرتا ہے گسٹاں محبت کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے معشوق سے کنارہ کش بھی نہیں ہو سکتا۔ فرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را بلائے صعبتِ لیلے و فرقتِ لیلے اب راسخ کا شعر سنئے اور لطف اٹھائیے:

تمھاری بات اسے راسخ سمجھ میں کس طرح آئے گد بھی یار کا کرتے ہو اور روتے بھی جاتے ہو یعنی سننے والا یہ کہ رہا ہے کہ جب گد ہی کرتا ہے تو پھر روتے کیوں ہو؟ اس کی محبت کا دم کیوں بھرتے ہو؟ معلوم ہوا کہ تمھاری محبت راسخ نہیں ہے ورنہ نگہ طرازی کیوں کرتے۔ یہ تو کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے اس کی محبت کا یہی وعدہ ہے کہ پھر اسکی شکایت بھی ہے ناصح رونے سے منع کرتا ہے۔ عاشق مجبور کر رہا ہے کہتا ہے کہ میرا اختیار کیا ہے جو میں نہ روؤں۔ رونا اک جذبہ اختیار ہے تیر کا

شعر ہے:- منع گریہ نہ کرتو اسے ناصح اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی لیکن اس سے زیادہ بے اختیار ہی اس کیفیت میں ہے کہ آپ کسی کو رونے سے منع کریں اور وہ اُلٹے اور زیادہ رونے لگے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور آئے دن کا مشاہدہ کہ رونے والے کو جتنا زیادہ چب کرنے کی کوشش کی جائے گی وہ اور زیادہ رونے لگے گا۔ راسخ کا شعور لافظ ہو:- ہونے مانع گریہ راسخ کو ہم سووے اور روئے نصیحت کے بعد

رشد ایک فطری جذبہ ہے۔ خاص کر عشاق کے دل میں یہ جذبہ بہت زیادہ ہوتا ہے وہ نہیں چاہتے کہ رقیب معشوق کے ہاتھ سے کشتہ تیغ ہو۔ تیر کا مشہور شعر ہے:-

جاتا ہے یار تیغ بکفت غیر کی طرف، اسے کشتہ ستم تری غیرت کو کیا ہوا؟
بکھرتے ہیں:- چلا ہے تیغ بکفت یار غیر کی جانب ہوئے ہیں تیر تا شافی غیرت انگو نہیں
راسخ کا بھی ایک شعر اسی مضمون کا سن لیجئے:-

غیر ہوں کشتہ تیغ اس کے بھلا ہم راسخ فرط غیرت سے گلا کاٹیں نہ کیونکر اپنا معشوق کے حسن کی لطافت میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ اپنے اپنے حوصلے کے مطابق سب تعریف کرتے ہیں تیر کے معشوق کے تن نازک کی لطافت کا مقابلہ کسی جان پاک کی لطافت ہی کر سکتی ہے مگر راسخ کے معشوق کی ”جانبِ مجسم“ کی لطافت کا کیا پوچھنا، وہ تو اتنی لطیف ہے کہ آئینہ بھی اس کے عکس کا تحمل نہیں ہو سکتا ہے۔

تیر:- کہئے لطافت اس تن نازک کی تیر کیا، شاید یہ لطف ہوگا کسو جان پاک میں
راسخ:- اس جان مجسم کی بیاں کیا ہو لطافت عکس آئینہ میں جس کا نمودار نہ ہووے
کس صورت اس کے تن سے آئینہ منعکس ہو دو مایہ لطافت جان سے لطیف تر ہے

عاشق غیرت مند ہونے کے ساتھ ہی ساتھ بے حد رشک پسند واقع ہوا ہے، اس کی غیرت اور جذبہ رشک اسے اجازت نہیں دیتا کہ معشوق کے عکس کو آئینہ سے دو چار ہونے دے، معشوق کا آئینہ دیکھنا عاشق کے لئے آئینہ سے بیزاری کا سبب ہو گیا اور آئینہ کی طرف سے دل میں غبار پیدا ہو گیا۔

تیر:- وجہ یہ تھی کہ ترے ساتھ لڑی اسکی آنکھ ہم جو صورت سیتی آئینہ کے بیزار رہے
راسخ:- یوں صاف عکس یار سے وہ ہلکا رہو کس صورت آئینہ سے نہ ہم کو غبار ہو
کیفیت عشق چھپائے نہیں چھپتی، چہرہ اس را کہ کواش کر دیتا ہے اکثر آنسو کے قطرے اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں، حافظ کا مشہور شعر ہے:-

ترا حیا و مرا آبدیدہ شد غماز دگر نہ عاشق و معشوق را ز دار اند

نیر اور راسخ دونوں کے دواوین میں کثرت سے اس مضمون کے اشعار ملتے ہیں ملاحظہ ہو :-

نیر :- کیا پھر نظر چڑھا ہے اسے تیر کوئی خوش رو
یہ زرد زرد چہر تیرا تر رہا ہے
رہتے ہیں تیرے بخود وارفہ اندوڑ
یو چھو کنایتہ کسو سے دل لگا نہ ہو
تیرا زرد ہوتے جاتے ہو
کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق
راسخ :- مگر راسخ نے دل پر کوئی تازہ چوٹ کھائی ہے
شب اس کو میں نے جو دیکھا بہت گریاں و محروں تھا
کچھ چوٹ سی دل پر ہے جو یوں روتے ہیں راسخ
صاحب تمہیں کس مرتبہ پاتے ہیں حنریں ہم
(پر و فیسر) عطاء الرحمن

قابل قدر مجرب نسخوں کے راز کا انکشاف

خدمت خلق کے ساتھ ساتھ عزت، شہرت اور دولت بھی حاصل کیجئے !

حضرات! مندرجہ ذیل نسخے میرے تیس سالہ تجربات کا حاصل ہیں۔ ان میں سے بعض نسخے تو میرے خاندان میں پشت با پشت سے سینہ بسینہ چلے آتے تھے۔ اور بعض میری کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ یہ وہ نادر و نایاب نسخے ہیں جو صحیح تشخیص کے بعد اس مرض کے لئے صرف آخر کا حکم رکھتے ہیں اس وقت تک ان نسخوں کا اظہار کسی قیمت پر بھی نہ کیا گیا۔ مگر اب اس خیال سے کہ دنیا چنرہ درہ ہے ایسے نادر روزگار گزارنا جو اس بات کو سیکھنے میں متغفل رکھنا مناسب نہیں۔ خدا کو حاضر ناظر جان بلا کم و کاست قلیل ہر یہ میں نذر ناظرین کئے جاتے ہیں۔ یہ نسخے سو فیصدی مجرب ہونے کے علاوہ نہایت آسان، کم قیمت اور سہل الحصول ہیں جنہیں ایک عام آدمی بھی بلا تکلف طبکار کر سکتا ہے اور اجزاء ہر جگہ دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ان نسخوں کے منگائے کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ سفر جو میں نے تیس سال کی طویل مدت میں طے کیا تھا۔ آپ اسے ایک دلی میں طے کر سکیں گے یعنی ۷

(۱) تہدیق کا مکمل علاج۔ چار نسخے عرق۔ سفوف۔ لعوق۔ (۲) اکسیر مستورات۔ عورتوں کے لئے بے پناہ نسخہ ہر قسم کی ماہواری خرابیوں

کشتہ ہڑتال و دق با وزن ہر عتہ۔ اور اندرونی نقایص دور ہو جاتے ہیں، ہر یہ صہ۔

(۲) نسخہ پائو یا صرف تین دن میں مرض کو نیست و نابود کر دیتا ہے عتہ۔ (۳) اکسیر اطفال۔ بچوں کے لئے بے نظیر نسخہ۔ ہر پہلے دستوں کا آنا اور دیگر

عوارضات جو ذات بختے وقت بچوں کو ہو جاتے ہیں انکا تریاق صہ۔ (۴) تریاق جربان غلہ۔ (۵) اکسیر نور اک غلہ۔ (۶) اکسیر تشنگ غلہ۔

(۷) خواب آور نسخہ بعض اوقات مریض کو نیند نہیں آتی جس کی وجہ سے کئی دوسرے امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس سے نیند

خوب آتی ہے۔ ہر یہ عتہ۔ (۸) طاق کا ایک بے نظیر نسخہ جس پر صرف چند پیسے لاگت آتی ہے۔ عتہ۔

بیمرونی علاج کے لئے بیٹی ہر یہ عتہ۔ (۹) سانب کائے کا مجرب عمل ہر یہ صہ۔

(۱۰) آٹکھوں کے جملہ امراض کی بے مثل سالی دوا ہر یہ صہ۔ (۱۱) سانب کائے کا مجرب عمل ہر یہ صہ۔

(نوٹ) ان نسخوں کے ذریعہ آپ نہ صرف خدمت خلق کا فریضہ بطریق احسن ادا کر سکتے ہیں بلکہ کسی ایک نسخہ کی تجارت کر کے لازوال

عزت اور دولت کے مالک بھی بن سکتے ہیں۔

حکیم اقبال حسن روبرو دربار داتا گنج بخش لاہور

باب الاستفسار

نصیری اور علی اللہی

(جناب سید کرم حسین صاحب جو نیچو)

غالب نے ایک جگہ اپنے متعلق لکھا ہے :-

ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہیم
کیا اسد اللہی سے مراد مسلک علی اللہی ہے، اور کیا یہ اس کا دوسرا نام نصیری بھی ہے؟ اگر یہ دونوں
ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو وجہ اختلاف کیا ہے؟

(نگار) غالب نے اپنے آپ کو اسد اللہی یعنی پیرِ علی ظاہر کیا ہے۔ اور علی اللہی سے مراد وہ جماعت ہے جو حضرت علی کو خدا کہتی ہے۔ نصیری
اور علی اللہی دونوں جماعتیں غلوئے شیعیت کا نتیجہ ہیں، لیکن ان دونوں کے عقاید و مراسم میں بہت فرق ہے۔
علی اللہی اپنے آپ کو اہل حق بھی کہتے ہیں، یہ مسجدوں میں نہیں جاتے اور نہ کسی ناپاکی کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ طلاق اور ایک سے زیادہ
شادی کرنے کے قابل نہیں یہ سو کا گوشت کھاتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں۔ شادی کی تقریبات میں ان کی بے پردہ عورتیں مردوں کے ہاتھ
میں ہاتھ ڈال کر آزادی سے رقص کرتی ہیں۔

تخلیق و آفرینش کو وہ پانچ مظاہر الہی یا قوتوں کا نتیجہ سمجھتے ہیں، جن کے نام :- پیر یا دشام - پیر بیامین - سر داؤد -
پیر مہر - پیر موسیٰ -

انسان میں وہ دو قوتوں کے قابل ہیں ایک عقل دوسرے نفس (شہوت)۔ ان کے ہاں مذہبی قیادت اسلام بعدِ نسل جلتی ہے اور مذہبی
قائد کو پیر کہتے ہیں۔ اس کے نائبین جمہور کی طرف سے مراسم مذہبی ادا کرتے ہیں دلیل کہلاتے ہیں اور وہ نائب جو حصوں کی تقسیم کرتے ہیں
خلیفہ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

یہ جماعت آٹھ طبقوں میں تقسیم ہے :- ابراہیمی - داؤدی - میری - سلطان باری - خاموشی - یادگاری - شاہ یازی - خان شاہی -
ان کا بیان ہے کہ باطاہر علی، ان کی بہن بی بی فاطمہ اور سید میری بھی انھیں کے جماعت کے افراد تھے۔ ان کی کتابیں کردستانی
زبان میں لکھی ہوئی ہیں، جن میں بڑی خلص و اہم کتاب، کتاب پنجاہ یا کتاب چہار ملک ہے۔

ان کے پیر شعیبہ باز بھی ہوتے ہیں اور ایک شعیبہ دیکتے ہوئے کو لیل پر بیٹھنے کا بھی ہوتا ہے۔

ان کے یہاں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے کا بھی رواج ہے۔ وہ بھیڑ باہل کی قربانی کو بھی سب ساتھ مل کر کھاتے ہیں، بھیڑ کی
قربانی کو قربان کہتے ہیں اور بیل کی قربانی کو گاؤ بران -

بکناش اور قرباناش جماعتیں بھی قریب قریب اسی قسم کی ہیں، عام شیعہ انھیں خروس کش بھی کہتے ہیں، کیونکہ اپنے تین دی کے

غیر متوقعات

ہیندیو ناگوچی

ابھی تک وہ پوری طرح ہوش میں نہ آئی تھی کہ گھر کے بیچ آگئی تھی۔ ”میرے بچہ کو لاؤ، میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں“ ڈاکٹر نے متفکرانہ انداز سے نرس کی طرف دیکھا اور کہا کہ ”کما کیا جائے مجھ پر ہے، جاؤ بچہ کو لا کر اسے دکھا دو“

تھوڑی دیر کے بعد ایک خوبصورت بچہ اس کی آغوش میں تھا۔ وہ اس کے پیارے پیارے چہرہ کو محبت سے جھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کہ دفعتاً اس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ گھبرا گئی کیونکہ جب اس کی لپٹی کی طرف لگاؤ تو دیکھا کہ بچہ کے کان نہ تھے۔

بچہ بڑا ہو کر مدرسہ جانے لگا، وہ بہت ذہین تھا اور کھیل کود، پڑھنے لکھنے میں اپنے تمام ساتھیوں میں اول رہتا تھا، کان نہ تھے لیکن اس کی سماعت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

ایک روز روزنامہ اپنی ماں کے پاس آیا اور بولا ”اے ماں، آج میرے ایک ساتھی لڑکے نے مجھ سے کہا کہ میری پیدائش ناقص ہوئی ہے، میرے باپ کو آتشک تھی اور اسی نے میرے کان غائب ہو گئے ہیں“

ماں نے اس کو تسلی دی اور بولی کہ ”وہ جھوٹ کہتا ہے، تم رنج نہ کرو“

لیکن اُس دن سے اس کے ماں باپ کو بڑی فکر پیدا ہو گئی اور دونوں بہت افسردہ رہنے لگے۔

لڑکا پڑھتا رہا، تعلیم پاتا رہا، یہاں تک کہ وہ مدرسہ کے آخری درجہ تک پہنچ گیا اور امتحان میں کامیاب ہونے پر اسے اول انعام ملا، لیکن والدین کا اضمحلال کسی طرح کم نہ ہوا۔

وہ اسے ٹوکیے لگے اور ایک ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ ”جراحی سے اس کا یہ عیب دور ہو سکتا ہے، بشرطیکہ کوئی شخص اپنے کان دینے پر آمادہ ہو جائے“

ایک ہفتہ کے بعد اس کے والدین نے اس سے کہا کہ ”لو خوش ہو جاؤ، اب تمہارا یہ عیب دور ہو جائے گا، ایک شخص اپنے کان دینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔“

چنانچہ اسی ہفتہ ٹوکیے کے شفا خانے میں عمل جراحی سے دونوں کان اس کے کپٹی پر پیوند کر دیے گئے اور جب وہ وہاں سے شفا یافتہ ہو کر کالج پہنچا تو سب کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔

اس نے اپنے والدین سے دریافت کیا کہ ”وہ کون شخص تھا جس نے اس کے لئے اتنی بڑی قربانی گوارا کر لی۔ لیکن انھوں نے کہا کہ یہ بات ہم نہیں بتا سکتے، کیونکہ ہم نے اس راز کے چھپانے کی قسم کھائی ہے۔“

باپ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ ”تمہاری ماں کی آخری وصیت یہ تھی کہ دفن ہونے سے پہلے تم اس کے چہرہ کو بوسہ دینا۔“
لوہکا اپنی ماں کی میت کے پاس گیا اور آہستہ آہستہ اس کے چہرہ سے چادر ہٹائی تاکہ اس کو آخری بوسہ دے سکے، لیکن اسکی حیرت
کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں کان غائب ہیں۔
لوہکے نے انتہائی تاثر کے ساتھ کہا کہ ”آج مجھے معلوم ہوا کہ میری ماں نے کیوں بالوں میں کنگھی کرنا چھوڑ دی تھی اور اپنے بال شاذ
وگردن تک بکھرائے رکھتی تھی۔“

یہ لوہکا جو بغیر کان کے پیدا ہوا اور جس کی یہ برنائی دو رکرنے کے لئے ماں نے اپنے دونوں کان اس کی نذر کر دیے وہ تھا کہ جب
اس کے ۲۲ سال بعد اس کا انتقال ہوا تو شاہ جاپان نے اس کا نام کیا، اور ملک بھر میں اس کی یادگاریں قائم کی گئیں، کیونکہ یہ وہ
پہلا شخص تھا جس نے زرد بخار کی دوا دریافت کی اور خود اسی مرض میں مبتلا ہو کر جان دی۔
لیکن اس سے زیادہ اہم خدمت اس کی یہ تھی کہ اسی نے سب سے پہلے آتشک کے جوشیم دریافت کئے جس پر اسے فوکل پائز دیا گیا۔
اس لوہکے کا نام ”ہنیدر یو ناگوچی“ تھا جو بیسویں صدی کا بہترین ”اہر جراثیم“ مانا جاتا ہے۔

والیٹر

والیٹر، فرانس کا مشہور فیلسوف و نقاد، سود خواروں میں بھی اول درجہ کا سود خوار سمجھا جاتا تھا اور عجیب ترکیب سے اس نے
سودی روپیہ جمع کیا تھا۔

جب لوگ اس سے روپیہ قرض لینے آتے تو وہ کہتا کہ میں اصل رقم کبھی واپس نہ لوں گا، لیکن جب تک میں زندہ ہوں دس فیصدی
کے حساب سے سود ادا کرتے رہو۔ چونکہ وہ بہت ضعیف، جثہ کا انسان تھا اور بیمار ہی بنا رہتا تھا، اس لئے لوگ اس زیادہ سود کو
بھی گوارا کر لیتے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ تو قریب پاؤں ٹھکانے ہوئے ہے، معلوم نہیں کس دن مر جائے۔
اگر کوئی شخص اتنا سود دینے میں کچھ تامل کرتا نظر آتا تو وہ مصنوعی طور پر کھانسنے اور کراہنے لگتا جس سے قرض خواہ کو یقین
ہو جاتا کہ یہ زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے والا نہیں اور وہ دس فی صدی سود منظور کر لیتا۔

لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہی والیٹر جسے لوگ زندہ دگر سمجھا کرتے تھے۔ ۴۷ سال تک زندہ رہا اور اس نے لاکھوں روپیہ
صرف سود سے حاصل کیا۔

قول فصیل

جس میں ملک مشہور مفکر و بلند خیال شاعر علی اختر اختر حیدر آبادی نے جوش کی مشہور نظم حرف آخر کو سامنے رکھ کر اس کے تمام خیالات کی
تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ تر تری کرے کتنی ہی عقل و فراست سے کام لے، لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کو خدا کے سامنے جھکا
آجائے گا، اس نظم میں ۱۰۰ سے زیادہ اشعار بھی اور شیطان و شاعر کے مکالمہ کے ذریعہ سے صوفی کائنات اور اسرار حیات پر روشنی ڈالی گئی
ہے۔ فنی حیثیت سے اختر کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جسے ان کے شاعرانہ عروج کے ثبوت میں آسانی پیش کیا جاسکتا ہے۔ شروع میں
حضرت نیاز فچوری کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ کاغذ پر پونڈ دیر، گرد و پیش رنگین، قیمت دو روپیہ

میجر نگار گلشن

مخفیات

دنیا کے مختلف ملکوں میں انسانی دانت سے متعلق بعض توہمات اب بھی پائے جاتے ہیں۔ خلا اٹلی میں اب بھی یقین کیا جاتا ہے کہ اگر کسی کے دانت کھٹے کھٹے ہیں تو وہ ضرور اقبال مند ہوگا۔ اگر کوئی بچہ ایسا پیدا ہو جس کے منہ میں کوئی دانت پایا جاتا ہو تو وہ بہت منحوس خیال ہوتا ہے اور افریقہ کے وحشی قبائل ایسے بچہ کو کھات بیریجی سے فوراً ہلاک کر ڈالتے ہیں۔

کرۂ زمین ۲ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو ایک بڑے خطرہ سے بال بال بچ گیا۔ اس تاریخ کے ایک جسم سیاہ چاند کے سامنے مشرق سے مغرب کی طرف ڈیرہ سکندریہ کے اندر گزر گیا۔ یہ جسم بیضی شکل کا تھا اور بغیر دور بین کے بھی نظر آتا تھا۔ منجمین امریکہ نے رات کو ساڑھے نو بجے اس کا مشاہدہ کیا۔ یہ کسی کرۂ الگ کا تھا جو اس سے علاحدہ ہو کر ۲۰ کیلو میٹر فی سکندریہ کے حساب سے حرکت کر رہا تھا اور اگر اتفاقیاً یہیں زمین سے ٹکرا جاتا تو نہایت تباہ ہو جاتی

پرتگال میں ایک قوم ہے جسے یہ قول کہتے ہیں، یہ پرتگال کے بڑے علاقہ پر حاوی ہیں اور اپنی حماقت کے لحاظ سے بہت بدنام ہیں۔ دوسری جنگ عظیم سے ایک دو سال قبل جب لڑائی کا خطرہ پڑھتا جا رہا تھا، حکومت پرتگال نے چاہا کہ فرانس کی ماریٹائم لائن کی طرف خود بھی مدافعت کے لئے ایک جہاز خط دفاع قائم کرے، چنانچہ کام شروع ہو گیا اور بہت سے زمین دونوں قسم کے توپیں ان پر نصب کر دی گئیں۔ لیکن جب پرتگالی حکومت کے فوجی افسران اس کے مشاہدہ کے لئے گئے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، کیونکہ کتنے دھنسنے بنانے کے باوجود ان سب کی توپیں کارخانے خود پرتگال ہی کی طرف تھا اور بجائے اس کے کہ دشمن کے خلاف ان سے کام لیا جاتا، خود دشمن ان سے کام لے کر پرتگال کو تباہ کر سکتا تھا۔ بڑی فکر ہوئی کہ کیا کیا جائے۔ ان دھنسون کو مسمار بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ اعلیٰ طبقات بہت روپیہ خرچ ہوا تھا۔ آخر کار حکومت اسپین سے گفتگو شروع ہوئی اور نصف لاکھ پر یہ تمام قلعہ بندیاں اس کے ہاتھ فروخت کر دی گئیں، کیونکہ وہ ان سے کام لے سکتا تھا۔

امریکہ کے ایک شہر آرکانزاس میں ایک دو شخص شخص گردم کلک کو اپنے مال و متاع کے تصرف سے روک دیا گیا تھا کیونکہ اس کے ہوش و حواس کی درستگی کی طرف سے اشتباہ تھا۔ ایک دن اس نے اپنے دوستوں کو چین میں وکلا ر اور عدالتوں کے جج بھی شامل تھے، دعوت دی کہ وہ اس کی نئی بیوی سے آکر مل جائیں۔

جب یہ سب جمع ہوئے تو وہ ان سب کو اصطبل لے گیا، جہاں اس کی کئی گھوڑیاں بندھی ہوئی تھیں اور ان میں سے ایک گھوڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ میری نئی بیوی ہے۔

امریکہ میں قدیم سے یہ قانون چلا آتا ہے کہ ”مرد ہر ایک زکوہ مادہ سے شادی کر سکتا ہے“ اور اس میں کوئی تخصیص انسان و حیوان کی نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ چونکہ قانوناً بیوی کی تمام دولت مرد کی ملکیت سمجھی جاتی ہے، اس لئے گروم کو حق پہونچتا تھا کہ یہ گھوڑی گھوڑوہ میں جو کچھ جیتے وہ اسے حاصل کرے۔

جب یہ معاملہ عدالت میں آیا تو اس نے اس حکام کو تونا جائز قرار دیا لیکن اسی کے ساتھ اسے اپنے مال و متاع تصرف کی بھی اجازت دیدی کیونکہ جو شخص کسی مرد کی قانون سے فائدہ اٹھانے کی اتنی عقل رکھتا ہے وہ ہوش و حواس سے بیگانہ شمار نہیں کیا جاسکتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ ولایت میں ایک شہری و دیہاتی عورت کی کیا پہچان ہے،۔ شہری عورت جب ہوا تیز چلتی ہے تو فوراً اپنی ٹوٹی کو سنبھالتی ہے اور دیہاتی عورت اپنے دامن کو۔

سان فرانسسکو کا نفرنس میں شرکت کے لئے ایک سرحدینی اخبار نویس بھی گیا تھا۔ جب وہ وہاں سے واپس آنے لگا تو اخباروں کے ناہندوں نے اس سے دریافت کیا کہ ”آپ کو امریکہ میں عجیب چیز کو نسی نظر آئی“۔

اس نے جواب دیا کہ ”اہل امریکہ کی آنکھیں بہت عجیب نظر آئیں جو سیدھی اور بالکل غیر فطری ہیں“

ملکہ ”ادزنی“ نپولین سوم شاہنشاہ فرانس کی بیوی، ایک جوتا کبھی دوبار نہ پہنتی تھی۔

ملکہ اترتیمہ (انگلستان کی بے شوہر ملکہ) لباس کی بہت شائق تھی اور روز نیا لباس پہنتی تھی۔ چنانچہ اپنی ۲۰ سال کی حکومت کے بعد جب اس کا انتقال ہوا تو ۲ ہزار جوڑے اپنے بعد چھوڑ گئی۔

کیتھرائن کبیر (ملکہ روس) ہر وقت اپنا بدن دہلایا کرتی تھی۔

ملکہ وکٹوریہ اس ڈر سے کہ مہاراجا اس کے جاذب (بلا ٹنگ سپر) کے نشانات سے لوگ اس کی خفیہ و سیاسی مراسلت کو پڑھ سکیں، ہمیشہ سیاہ رنگ کا جاذب استعمال کرتی تھی۔

ملکہ ”آن بولین“ ہنری ہیم کی بیوی ہمیشہ اپنے شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر باہر نکلتی تھی تاکہ لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ اس کے ہاتھوں میں جہم اور نگلیاں تھیں۔

”آن“ ملکہ روس نے ایک روز کسی بات پر شاہزادہ سے غفا ہو کر حکم دیا کہ اس کو مرضی بنایا جائے۔ چنانچہ ایک ٹوکب میں گھاس رکھ کر انڈے رکھ دئے گئے اور شاہزادہ کو حکم دیا گیا کہ اس ٹوکب سے میں انڈوں پر بیٹھے اور مرضی کی سزا آواز نکالے۔

مئی کی ایک دوپہر

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کا نہیں
 شامِ شوریز نہیں، صبحِ پُرانوار نہیں سرو آزاد نہیں، نرگسی بیمار نہیں
 رونقِ سخن و جمالِ درو دیوار نہیں دولتِ عشق نہیں، نعمتِ دیدار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کا نہیں
 کل پہاں غلہ سے ہوتا تھا تنگنوں کا نزول آج تکلیفِ نظرِ حدِ نظر تک ہے بھول
 عرصہ دہر ہے پڑ مردہ و بے کیف و لول عیشِ گلزار نہیں، عشرتِ کھسار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کا نہیں
 گوشہ گوشہ ہے یہاں "حلقہ صد کام نہنگ" دل ہر ذرہ میں پیوست ہیں قہر کے خندنگ
 کونسا بھول نہیں نوحہ گرِ رامنش و رنگ کونسی شاخ ہے گلشن میں جو تلوار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کا نہیں
 ہو گئے سے تھی رطلی گراں اسے ساقی اب کہاں وہ مری فردوسِ رواں اسے ساقی
 کوئی سی آنکھ نہیں دجلہ نشاں اسے ساقی کونسا دل غم گیت سے گراں بار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کا نہیں
 اب وہ سو بے فلک افروز نہیں تاروں میں اب وہ پہلا سا ترنم نہیں فواروں میں
 گہرِ شوقِ بھٹکتی ہے سمن زاروں میں اب ہیں کہنے کو سمن زار - سمن زار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کا نہیں
 ہیں صنوبر کے لرزے ہوئے سائے خاموش تتلیاں قص کناں ہیں نہ ہوا بادہ فروش
 زندگی سرگرمیاں ہے، تمنا رو پوشش لذتِ شوق نہیں، مستی بیدار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فسوں کا نہیں

اب نہیں موج نظر حیرتی "سیم سمن"
چار سو یا س کے پرچم ہیں، امیدوں کے کفن
اوس کی بوند پہ رقصاں تو ہے سوچ کی کرن
آہ لیکن یہ کرن زرد ہے گلزار نہیں

اب کوئی چیز دل آویز و فصول کار نہیں
جب توئے گل و بلبل میں پریشاں ہے نسیم
اب یہاں شبنم آوارہ میں روج تسنیم
اب نہ وہ سبزہ نورستہ نہ غنچوں کی شمیم
اب کوئی چیز دل آویز و فصول کار نہیں،
اب وہ موسمِ نغمہ ہے نہ وہ فصلِ شباب

غنچگی رُخ سے اُٹنے بھی نہ پانی تھی نقاب
اڑ گیا قافلہ لالہ و نسیم و گلاب
شعلہ ساز نہیں، ابر گہر بار نہیں
اب کوئی چیز دل آویز و فصول کار نہیں!!

افسریاں

اکرم دھولیوی :-

تری طلب کا تقاضا ہے دل کی بے تابی
جنوں کے جوش میں تجھ کو نہ بھول جاؤں کہیں
اڑا مذاق نہ میری نیازِ مسندی کا
سکون دل کی کہاں اور سچ کوئی صورت
مزدہ تو جب ہے کہ تازہ نیازِ الفت میں
مری نگاہ میں ہیں گردِ شیں زمانے کی
خدا کرے کہ نہ آئے کبھی قرار مجھے
بنا نہ شیفتہ ذوق انتظار مجھے
دلائقین نہ وعدہ کا بار بار مجھے
ترا خیال نہ رکھے جو بے قرار مجھے
کچھ اختیار تجھے ہو کچھ اختیار مجھے
اک انقلاب کا ہر دم ہے انتظار مجھے

بہار ہوں جو میں اپنا غولِ دل اکرم
غم وفا کو بنانا ہے یاد گار مجھے

ملک خطا کے شہزادے

دنیا میں کیا اندھیر ہو رہا ہے، اس کی حد و ناک داستان اگر آپ کو سننا ہے تو دمی احمد بلگرامی قاتلی، اے کی زبان سے سنئے
جو اپنی مخصوص طرزِ تحریر اور ندر بیان کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتے۔ قیمت بارہ آنے۔
منیجر نگار لکھنؤ

صبح نشور

ابھی تو کرتا ہے تکمیل ”دین و فن“ ایدوست
 ہو اگلتا ہے گیتی کے ماہ پاروں کو
 نسیم باغ کو بادِ سموم ہوتا ہے
 ابھی دہنا ہے شبنم فشاں بہاروں کو
 زمیں سے آتشیں سیلاب کو اُبلتا ہے
 لہو میں کھینا ہے اپنا سفینہ لالے کو
 ابھی تو ساغرِ امرت میں زہر بھرتا ہے
 خضر کو موت کے ظلمات سے گزرتا ہے

ابھی بسا ہے آبا دیوں میں دیرانے
 زمیں پہ جھکتا ہے افلاکیانِ خود ہیں کو
 حریمِ غنچہ کو محرابِ برق ہوتا ہے
 مہِ دستارہ کو ہوتا ہے جل کے خاکستر
 ابھی زمین کو جتنا ہے زلزلے، سیلاب
 ”خروشِ زمزمہ“ کو ”بانگِ صور“ ہوتا ہے
 صریرِ پوشوں کو فولاد و سنگ ہوتا ہے

خرد کو جہل کا حلقہ بگوش ہوتا ہے
 یہ دین و عقل و کتاب و ہنر کے آیتے
 ابھی ”رسولوں“ کو ”ایمانِ فروغ“ ہوتا ہے
 ان آئینوں کو ابھی پاش پاش ہوتا ہے

فضا ابن فضا

طلوع ہوتا ہے مشرق سے تیرگی کو ابھی
 ہزاروں سال ترستا ہے روشنی کو ابھی

شفا گواہیاری :-

روا رکھا یہاں تک احترام عاشقی میں نے
 مچی ہے آج تک ہنپل سی دنیا پر تنش میں
 نہیں ایسی بھی راہیں مجھ کو اکثر اہ الفت میں
 ضیائے ماہ و نجوم بھی اب فریب جلوہ ندے سکے گی
 سبق لے ! منظر گورِ غریباں دیکھنے والے
 قفس میں بھی تجھے رہنا کہیں دو بھرنہ ہو جائے
 تو ہے ذرہ سمجھ کر کر رہا ہے پائمال،
 شبِ غم رونے والا روتے روتے سو گیا شاید
 ارے اوبکیسی پہ رونے والے کچھ خبر بھی ہے
 شبِ غم دیکھتا رہتا ہوں، یوں تو سیکڑوں منظر
 ذوقِ سجدہ کا مراں ہونے نہیں دیتا ہمیں
 اک نئی بناؤ ڈالیں گے تجسس کی شفا
 نہ ہوگا پاس رہ کر امتحانِ مشقِ تصور کا
 بھول پہ دم ہے کسی کا، کوئی سر بالیں،
 مطمئن دل ان کی اُلفت سے گمراہ نہیں پر آب
 دھڑکتے دل سے شفا تک راہوں یوں تارے
 ہنسی آئی کبھی تو آنسوؤں کو سو نہ دی بیٹے
 کیا تھا ایک سجدہ ماورائے بندگی میں نے
 کہ خود کو اسے شفا گھر کے خود آواز دی میں نے
 نگاہِ جلوہ طلب کو ہر سو، اپنی ہی روشنی لے گی
 چراغوں کو ترستے ہیں چراغاں دیکھنے والے
 ارے مڑ مڑ کے اوسوئے گلستاں دیکھنے والے
 دیکھ ! اس ذرے کے سینے میں کہیں دنیا نہ ہو
 جبین گل پہ شبنم کی نمی دیکھی نہیں جاتی
 وہی ہے زندگی، جو زندگی دیکھی نہیں جاتی
 مگر کھیلے پہر کی چاندنی دیکھی نہیں جاتی
 اب جبین سے بھی بچا کر آستانِ ڈھونڈھیں گے ہم
 ہر غبارِ کارواں میں کارواں ڈھونڈھیں گے ہم
 وہ جہنا دور ہو سکتا ہوا تنا دور ہو جائے
 شفا حیات کا دامن پکڑ کے آئی ہے
 آہ دیوانے کی دنیا، آہ دیوانے کا خواب
 کسی نے جیسے کہا ہو کہ "آ رہا ہوں میں"

انجم رضوانی :-

ہوتے ہیں بڑے قسمت کے دھنی جو یہ صدے بہ جاتے ہیں
 دو اٹک کسی کے دامن پر ٹپکا کر چپ رہ جاتے ہیں
 اس یاس و الم کی دنیا میں اور اسکے سوا کیا رکھا ہو
 طوفانِ حوادث میں ورنہ اچھے اچھے بہ جاتے ہیں
 یوں بات جو کہنا ہوتی ہے کہنے والے کہہ جاتے ہیں
 کچھ دکھ دینے کو آتے ہیں کچھ رنج و قسب بہ جاتے ہیں

محبتِ دل کا حال یہ ہے انجم کہ نہیں اپنی بھی خبر
 شاید یہ وہی منزل ہے جہاں ہوش اور غورہ جلتے ہیں

رعایتی قیمت

مجموعہ استفسار و جواب

کی تیسری جلد

نہایت ۵۰ صفحات - جسکی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ ہے لیکن اب آپ کو یہ محصول صرت دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔ - منہار منہار

گوہر

جناب نظیر جمیلی ام۔ اس کے قلم سے

یہ کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے صوبہ بہار کا ایک ایسا دردناک واقعہ ہے کہ اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا ایک مسر شہر کی جوان بیوی اور اس کے سوتیلے جوان بیٹے کی داستانِ معاشقہ ہے اور اس قدر دلچسپ انداز بیان میں کہ پڑھنے والے پر محبت طاری ہو جاتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔ - منہار منہار

مرزا شوق اللہ صوفی کا تنقیدی مطالعہ

(ڈاکٹر پروفسر ذراچہ احمد فاروقی)

مرزا شوق، عالمِ دین و ادب علی شاہ کے لکھنے کے شاعر تھے۔ انکی شاعری کا تنقیدی مطالعہ نہ صرف ادب کے محرکات اور میلانات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے بلکہ اس تہذیبی ماحول کو جاننے کے لئے بھی جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکمِ قضا کو جامِ شراب کی گرد دس سے پھر دیا گیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ۔ - منہار منہار

تذکرہ شاعرانہ

ابنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ جس میں تمام ان حضرات کو پیش کیا گیا ہے جو شعرا و فارسی دوا کے کلام پر لکھے گئے ہیں اور اسی کے ساتھ ان حضرات کے زبان میں دئے گئے ہیں اور ان پر محاکر بھی کیا گیا ہے۔ جس طرح ان سب تذکرہ نگاروں کے حالات بھی دیدئے گئے ہیں وہ حضرات جو فنِ شعر کے نکات و دوز سے واقف نہ تھے ان کے لئے یہ کتاب بڑا بیش قیمت ذخیرہ ہے صرف چند جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت محصول چار روپیہ آٹھ آنے کیسٹ نہیں دیا جائیگا۔ - منہار منہار

کیل
چھائیوں
پھوڑے
پھنسیوں
نجانے
پائے
کیلے



فی

استعمال کیجئے

قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ ہر جگہ بکیتی ہے
ہمدرد و اخوانہ وقف دہلی

<p>مکتوبات نیاز بین مصنفین</p> <p>ادب نگار کے تمام وہ خطوط جو جنات نگاری سلاست بیان رنگینی اور لیلیٰ پرکے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی ضروری اور جن کے سامنے خط و غالب بھی معلوم ہوتے ہیں ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دو کیلک گیا ہر اور ۸۸ پونڈ کا غلط پر طباعت ہوئی ہے قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول</p>	<p>شہاب کی سرگزشت</p> <p>حضرت نیاز کا دو علم لفظ انشاء جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سرگرم نگاری کا مہول پر لکھا گیا ہر اس کی زبان و تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی ہندی مصنفوں اور اسکی انشاء حالیہ بحر ہلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔ یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول</p>	<p>جذبات بھاشا</p> <p>جناب نیاز نے ایک عجیب متبذ کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جائے اور دوسری سی سب سے پہلی کتاب اس مضمون پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی کاہکے ہمیشہ نئے نظر آتے ہیں قیمت بارہ آنے علاوہ محصول</p>	<p>فلاسفہ قدیم</p> <p>اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں :- ۱۔ چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ ۲۔ اومین کا مذہب - نہایت مفید و عجیب کتاب ہے قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول</p>	<p>شاعر کا اسنام</p> <p>جناب نیاز کے عنوان شہاب کا لکھا ہوا انشاء حسن و عشق کی تمام بھینش کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ انشاء اپنے بلاط اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ سکا نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ ایڈیشن نہایت صحیح و خوش خط سرور سنی نگین قیمت بارہ آنے علاوہ محصول</p>
<p>فرست الید</p> <p>مولد نیاز فخروری کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی کیوں کو دیکھ کر اپنے دوسرے شخص کے مستقبل بے رت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری شرت و ٹیکٹائی پر مسیح پیش گوئی کر سکتا ہے قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول</p>	<p>نقاب اٹھ جانے کے بعد</p> <p>نیاز فخروری کے تین اناؤں کا مجموعہ ہمیں بتا گیا ہے کہ ہمارے ملک کا دیوانہ فرقت و علم اکرام کی ازدنی زندگی کیام اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لیے کس درجہ سم قائل ہے زبان بلاط و انشاء کے لحاظ سے جو زبان افانوں کا ہے وہ مہرنگ ہے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول</p>	<p>مذاکرات نیاز</p> <p>یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات مفیدہ عالیہ کا عجیب غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کر دینا ہر ترک پڑھ لینا ہو۔ یہ بھی جدید ایڈیشن ہر جہیں صحت اور نقاست کا خدو و طبع کا خاص اہتمام کیا گیا ہے قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول</p>	<p>انتقائیات</p> <p>حضرت نیاز فخروری کی انتقادی مقالہ جوں میں تقسیم کیے گئے تھے جن میں خاص شعرا کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً تو سن ظفر، غالب، معصومی، نظیر، یہاں جوش امیر خسرو، خیر، دو ستر حصہ میں عام ادبی و ثقافتی بحثیں جن کا تعلق شعرو ادب کی دنیا سے ہے۔ حوالہ ختم ہو گیا حصہ دوم علاوہ محصول</p>	<p>مذہب</p> <p>حضرت نیاز کا وہ محرکہ افکار تھا جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں کن کن رائج ہمارے اسکے مطالعہ کے اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کی سنی رکھتی ہے قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول</p>

نگار کے غم منبر

جنوری، فروری ۱۹۵۷ء جنوری ۱۹۵۸ء، فروری، مارچ

ننگار ۲۰ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا پتھر جس میں شہر
 سے لیکر شہر تک کے تمام تنقیدی رجحانات اور انتقادی فوہول
 واضح کیا گیا ہے۔ اس میں بعض ایسے اکابر شعر و کلام کا ذکر و تذکرہ
 کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور
 کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی سہانات اور نئی پسند
 نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں

جنوری ۱۹۴۷ء جنوری، فردری ۱۹۴۸ء جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

اس سال کا نام، مجلین نمبر ہے جس میں ایک پیش
فراموشی اور کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو دو
میں نقل کیا گیا ہے۔ ادب اور جذبات نگاری کے
خاکے سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔
قیمت ایک روپیہ ۱۰۰ عطا ہو۔ علاوہ حصول

د پاکستان نثر نگار کا جو بی خبر حسین دینکے سامنے
اسلام کی عظمت، فتنہ اور تمدن اسلام کے باوجود حقائق
کو پیش کیا گیا ہے کہ اسلام اپنے مستقبل کی تعمیر کو وقت
اسلام کے قدردان اور ان کا رول کرے۔ عموماً جہیز مسلم حکومت
کی کسی کی زیادہ قائم ہوئی قیمت تین روپیہ علاوہ حصول

نگار کا، افسانہ جہیز حسین تقریباً ۱۵۰ افسانے بہترین بل قلم
کے شایع کئے گئے ہیں اس قلم کار کی عظمت یہ ہو کہ
اسکے لکھے آسانی معلوم کیا جا سکے۔ افسانہ نگاری کے
کتے، اصول ہیں اور ہر سکول کا معیاری فضا کیا
ہونا چاہئے قیمت دو روپیہ علاوہ حصول

جنوری ۱۳۵۶ء

اس سال کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں "مارس ہندوس" کی
 کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس
 ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عرب، عراق و فلسطین و غیرہ
 ممالک اسلامی کی بنیاد کے بعد ان کی موجودہ اقتصادی و سیاسی
 اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے جو انور علی کے ساتھ ہی
 کہ ان کا مستقبل کشادہ پیش ہو گا ورنہ ترقی کے لیے راستہ کو مٹا دینا
 سالانہ کا ہر حصہ شریعت کے علم کا جو حصہ ہے اس کے بعد
 مسلم حکومتوں کے انکشاف میں تاحیہ انکشاف کا کوئی اور حصہ نہیں ہے۔

اجرحہ اختیار اور کیش وغیرہ کی تفصیل

پھر "نگار" سے طلب کیے

جون ۱۹۵۱ء

روزنامہ

پنجاب اور پاکستان

12 JUN 1951



ہندوستان و پاکستان دونوں کے

قیمت فی کاپی ۱۰/-

سالانہ چند پاکستان و ہندوستان

۹ روپیہ

پاکستان اور ہندوستان

پاکستان اور ہندوستان

پاکستان اور ہندوستان

تصانیف نیاز فحجوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

من ویزدال

مولانا نیاز فحجوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ صہیں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام ذریعہ انسانی کو "انسانیت کبریٰ" و اخوت عامہ کے ایک شہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور صہیں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند افکار اور پزیر خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

صفحہ ۶۶۲ صفحات - جلد رسالت رویہ آٹھ آنے بھر
علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات

یعنی

من ویزدال کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن سائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی فہم فرست یہ ہے :- اصحاب کہن - مجرہ کرامت - انسان مجبور ہے یا مختار - مذہب و عقل - طوفان نوح - خضر کی حقیقت - بیع علم و تاریخ کی روشنی میں - یونس اور دہان ماہی - حسن یوسف کی داستان - قانون - ساری علم و دعا و توبہ - لقمان عالم برنج - یاجوج ماجوج - ارواح و ارواح حوض کوثر - امام ہدیٰ اور محمدی اور پل طرفہ آتش فرود وغیرہ

صفحہ ۲۲۲ صفحات - کاغذ سفید - دبیر
قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

ہنگارستان

حضرت نیاز کے جبریلانی مقالات اور انسانی کا مجموعہ ہنگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا ہر کسی کے تصور و خیال میں ہرگز نہیں منتقل کیے گئے اس ڈیشن میں متعدد انسانی مقالات ایسا اضافہ کیے گئے ہر وہ کچھ ایڈیشنوں میں تھے اس لیے صفحات بھی زیادہ ہو قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

ادب و نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا مجموعہ جس میں بیان ہندوستان اور پاکستان کے خیال و جبریلانی افکار کے علاوہ ہر قسم کی معاشرتی مسائل سے توجہ فرماتے گئے۔ ہر فضاء اور ہر مقام پر اپنی جگہ پر ادب کی تربیت لکھا ہے اس ڈیشن میں متعدد نئے افکار کے لیے اس جرم میں تھے قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے حضرت نیاز کے انسانی کتب خانہ میں جس میں تمام افسانے کا مجموعہ ہے اور ہر قسم کی معاشرتی مسائل سے توجہ فرماتے گئے۔ ہر فضاء اور ہر مقام پر اپنی جگہ پر ادب کی تربیت لکھا ہے اس ڈیشن میں متعدد نئے افکار کے لیے اس جرم میں تھے قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

ترغیبات حبسی

شہوانیات مجلد اس کتاب میں غلامی کی تمام فہم و غور کی غور و فکر کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور ہر قسم کی معاشرتی مسائل سے توجہ فرماتے گئے۔ ہر فضاء اور ہر مقام پر اپنی جگہ پر ادب کی تربیت لکھا ہے اس ڈیشن میں متعدد نئے افکار کے لیے اس جرم میں تھے قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

آئندہ جولائی کا "نگار" انتہائی اہم و دلچسپ پڑھ ہوگا

یہ گویا سالنامہ ہے
جو کتابی سائنز پر شائع ہو رہا ہے
"۵۵ سال کے بعد"

اس کتاب کا نام ہے

یہ کتاب "نفسیات عملی" پر اتنا مفید و دلچسپ لکھی ہوئی ہے کہ آپ اس کو ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کر لیں۔
یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ

زندہ رہنا بھی ایک فن ہے

اور اگر اس فن کو آپ نے سمجھ لیا تو پھر

- ۱- دنیا کا ہر رنج و الم آپ کے لئے بے معنی ہو جائے گا۔
 - ۲- آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات نو کا آغاز ہوگا۔
 - ۳- آپ کی عمر طبعی کا معیار بالکل بدل جائے گا۔
 - ۴- انحطاطِ عمر اور ضعیفی کا موجودہ مفہوم قطعاً باقی نہ رہے گا۔
 - ۵- شاہراہِ حیات پر چلنے کا وہ نیا طریقہ آپ کو معلوم ہو جائے گا جو اس وقت تک آپ کی آنکھوں سے اوجھل تھا۔
 - ۶- آپ زمانہ کا ساتھ دینے پر مجبور نہ ہوں گے بلکہ زمانہ آپ کا ساتھ دینے پر مجبور ہوگا۔
 - ۷- زمانہ آپ کے اختیار میں ہوگا اور آپ اپنی مرضی کے مطابق وقت کی سوئی کو جتنا چاہیں گے گھٹا سکیں گے۔
- کیونکہ
زندہ رہنا ایک فن ہے
اور یہ کتاب آپ کو اسی فن کا ماہر بنائے گی

ادب و انشاء کے لحاظ سے اس کی بلندی و دلکشی کا اندازہ کرنے کے لئے آپ اس کتاب کا دیباچہ ملاحظہ کیجئے:

”انقلاب کی گرج“

کیسا عجیب منظر ہے !

مشرق و مغرب، شمال و جنوب — چاروں طرف سے گرجتے چلتے بادل ایک ساتھ اٹھتے آرہے ہیں۔

زندگی کی — لہراہ دھوپ چھاؤں سے کھیتی ہوئی دورِ اُفتی تک بھراتی چلی گئی ہے —

وہ سانے — ”۵۵ برس“ کا سنگِ میل دھندلا دھندلا نظر آرہا ہے ! —

اور اس کے قریب — انسانوں کا ایک کارواں !!

ان کے جسم پسینے سے شرابور ہیں، ان کے دماغ خشکی سے بوجھل ہیں، روٹی اور سکوں سے لدی ہوئی خوبصورت مگر وزنی گاڑیوں کو کھینچتے ہوئے یہ لوگ بڑھے جا رہے ہیں، ہر قدم پر رکتے ہیں اور بوجھ میں اضافہ کر لیتے ہیں۔

ان کے لئے ایک پیغام لایا ہوا ہے ! — ان کو پکارنا ہے مجھے !

زندگی کی ۵۵ کامیاب منزلیں عبور کرنے والے محترم انسانو ! — ادھر دیکھئے ! — میری آواز سن رہے ہیں آپ؟ میں کچھ کہ رہا ہوں آپ سے !

ایک عجیب خبر لیکر آیا ہوں میں آپ کے لئے — اس قدر عجیب ہے یہ خبر کہ اخباروں کے صفحات پر آہی نہیں سکتی۔ اخبار صرف واقعات کی اطلاع دیتے ہیں، میری خبر کوئی واقعہ نہیں۔ میری خبر ایک احساس ہے، ایک شعور ہے۔ وقت کی رفتار اور زندگی کے رجحان کا ایک احساس — یہ خبر مجھے مُردہ صدیوں نے ایٹم بم کے دھماکے کی زبانی سنائی تھی۔ سمجھے آپ؟ سنئے ! — زندگی میں چاروں طرف ایک عجیب نئی سی بات چپکے چپکے پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ آسمانوں میں خاموش ستارے دبے پاؤں راستے بدل رہے ہیں۔ زمین کے ذرے اس سے بھی کہیں زیادہ تیزی سے ایک نئی زمین بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ صدیاں مر رہی ہیں۔ صدیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

کچھ معلوم ہے آپ کو کہ آپ کے آگے پیچھے دونوں طرف پوری دُنیا بدل چکی ہے۔ ”۵۵ سال“ کا سنگِ میل تو وہ سانے نظر آرہا ہے آپ کو — اس کے اُس پار جو کچھ کبھی تھا وہ بہت کچھ اب کچھ نہیں رہا۔

۵۵ سال کے بعد ؟

موت ؟

شاید !

یوڑھایا ؟ — انحطاط ؟ — تاریکی ؟

نہیں! — نہیں! — یہ کچھ نہیں!

آنے کو مدت کب نہیں آسکتی — بچپن میں — جوانی میں — جوانی کے بعد — عمر کے دس برس بعد — ۲۵ برس بعد — ۵۵ برس بعد — موت کا دروازہ ہر منزل پر کھلا ہے — زندگی ایک قانون ہے — موت ایک حادثہ — قانون حادثہ کو نہیں روک سکتا — لیکن بوڑھا پا — انحطاط — تاریکی ؟ ؟ ؟

اب ۵۵ سال کے بعد ان کا کوئی وجود نہیں رہا — زندگی کی شاہراہ پر سنگ میل ۵۵ کے بعد سے آپ کے سفر کا بہترین حصہ شروع ہو چکا ہے — میں اس کو زندگی کے ”بہترین سال“ کہتا ہوں — ہندسوں نے آپ کو اتنا بڑا دھوکا کہیں نہیں دیا جتنا کہ سالگرہوں کی گنتی میں — ”یہ گنتی جس قدر بڑھتی جاتی ہے بوڑھا پا قریب آتا جاتا ہے“ — علم حساب کا سب سے بڑا مغالطہ ہے یہ! — کاش انسان اپنی عمر کا شمار ۱۰۰ کے ہندسے سے اُلٹی طرف کرتا!!

عمر کی نصف صدی تک جو زندگی آپ بسر کرتے آئے ہیں وہ آپ کی نہیں تھی — دوسروں کی تھی — سچیے مڑا کر دیکھیے! — وہ بہت دور گہرے کے دھندلے میں — ”۵۰ سال“ کا جو سنگ میل جھلک رہا ہے بس اسی مقام سے آپ کی زندگی کی نئی سرحدیں شروع ہو چکی ہیں — اب یہ زندگی خود آپ کی زندگی ہے — خود اپنی زندگی جینے کی ہمت ہے آپ میں؟ — تو آئیے! — ختم کر دیجئے اب اس پرانی معاشی جدوجہد کو — عمر کے بہترین سال آ رہے ہیں — چلئے اُن کا استقبال کریں!

مگر شاید کچھ پس و پیش ہے آپ کو؟

کیا اس لئے کہ آپ کو روٹی اور سکون کا ڈر ہے؟

کیا اس لئے کہ آپ مصروف ہیں؟

کیا اس لئے کہ آپ ابھی دُنیا کو سمجھنا چاہتے ہیں؟

کیا اس لئے کہ آپ کو اپنی صحت سے اطمینان نہیں؟

کیا اس لئے کہ آپ زندگی کے فرائض سے آزاد نہیں؟

مگر یہ سب کچھ تو آپ کو حاصل ہے!

جانتے ہیں آپ کہ دُنیا بھر کے بینکوں میں جمع کی ہوئی دولت نصف سے بھی زیادہ صرف اُن لوگوں کی ملکیت ہے جن کی عمر ۵۰ سال سے آگے بڑھ چکی ہے؟ — معلوم ہے آپ کو کہ دُنیا میں اپنے بائز حصہ سے کہیں زیادہ مشقت آپ کو چکے ہیں اور اب اس سے زیادہ مصروفیت اپنے لئے خود کشی اور دوسروں کے لئے حق تلفی ہوگی؟ — رہا دُنیا کو سمجھنا سیکھنا تو کیا آپ نے اب تک تنا بھی نہیں سمجھا کہ معاشی زندگی کے ہنگامہ میں دُنیا کو کوئی بھی آج تک سمجھ اور سیکھ نہیں سکا؟ — صحت میں بھی آپ محتاج نہیں — روٹی اور سکون کی بھاری سجرم گاڑی کو کھینچنے والا جسم و دماغ کبھی اپنا بچ نہیں ہو سکتا — اور آج بھی؟ —

آزادی تو ۵ سالہ خوش نصیب انسانوں سے زیادہ کسی بھی جہان کو میسر نہیں۔ آپ کا خاندان جہاں ہو کر اپنے اپنے زندگی کے راستوں پر اطمینان سے رواں دواں ہے۔ اور آپ آزاد۔

تو پھر آئیے! — زندگی کے ”بہترین سال“ آپ کے منتظر ہیں۔

آپ تیار ہیں؟ — معاشی مشقت! — خدا حافظ!! — رخصت!!

مگر ٹھہرئے! — پورا پیغام تو سنا ہی نہیں آپ نے۔

معاشی جدوجہد کی زندگی کو چھوڑ دینے کے بعد کیا کریں گے آپ؟؟ — یقیناً وہی جو آپ نے اپنے سے پیشتر دوسروں

کو کرتے دیکھا ہے۔ کاروباری زندگی سے دست بردار ہونے والے بوڑھے انسانوں کو آپ نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے۔

جوانی میں دیکھا ہے۔ — دیکھا ہے۔ سنا ہے۔ سمجھا ہے۔ اس لئے زندگی کی ”آخری بہاروں“ کے متعلق آپ کے خیالات

بالکل قدیم و فرسودہ ہیں۔ یہ خیالات آپ نے شاید چالیس۔ پچاس یا ساٹھ برس پہلے سیکھے تھے۔ یہ خیالات مژدہ ہیں۔

مژدہ زندگی نہیں دے سکتے۔ ان سب خیالات کو عمر کے پچاسویں سنگ میل کی جڑ میں دفن کر دیجئے۔ اس قدر ہمت رکھتے ہیں آپ؟؟

اچھا تو اس کتاب کو پڑھئے جو میرا پیغام ہے۔

یہ کتاب تمام و کمال آئندہ جولائی ۱۹۷۷ء کے نگار میں تقریباً ۱۴۰ صفحات پر شائع ہو رہی ہے۔

پہلی فرصت میں اپنا چندہ معہ مصارفِ جبرٹری ۷۷۷ ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیے، اور

اپنے احباب سے بھی ذکر کر کے ان کو نگار کی خریداری کی طر مایل کیجئے تاکہ وہ یہ کتاب مفت

حاصل کر سکیں۔ غیر خریداران نگار کیلئے قیمت ڈیڑھ روپیہ اور ایجنٹ صاحبان سے ۴۰

یہ پرچہ دوبارہ مفت روانہ نہ ہو گا اسلئے ۴۰ کے ٹکٹ جبرٹری کے لئے بھیج دیجئے۔ منیجر

پاکستان کے خریداران نگار اور ایجنٹ صاحبان

ازراہ کرم اپنا چندہ اور مطالبہ ذریعہ منی آرڈر ذیل کے کسی پتہ پر روانہ فرما کر ہم کو براہ راست

اطلاع دیدیں۔ کتابوں کی خریداری بھی اسی طریقہ سے ہو سکتی ہے۔

۱۔ ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی ۲۲۲۔ پیر الہی بخش کالونی۔ کراچی۔ ۲۔ حکیم اقبال حسن صاحب متصل دربارہ خانہ کتب خانہ

دہنسی طرف صلیبی نشان اس بات کی
علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہو گیا

منکار

جدید قواعد ڈاک کی رو سے

سہوی پی پی میں اب ڈیڑھ آنہ زیادہ اداکرنا پڑتا ہے اسلئے آئندہ منکار کا
وی پی پی میں جائیگا چندہ ذریعہ وی آر ڈی پی میں آگے لے کر کیپٹ ہوگی۔

جلد ۵۹

فہرست مضامین جون ۱۹۵۷ء

شمار ۲

۴۰	باب الاستفسار	۱	ملاحظات
۴۱	اخبار علمیہ	۵	اردو ادب میں فساد
۴۲	آزاد غلاموں کے نام (نظم)	۱۳	سرقہ، توار، استفادہ
۴۵	تاریک مقبرہ (نظم)	۲۵	امریکہ کا ڈالر اور روس کی جنگی طیاریاں
۴۶	دھارے (نظم)	۲۸	لکھنؤی شاعری کی چند خصوصیتیں
۴۸	استہارات	۳۵	زبان اور رسم خط کا تعلق

ملاحظات

موجودہ بساط سیاست کا ایک ہم تہرا
اس وقت بساط سیاست پر ایران نے ایک نہایت اہم ٹہرے کو حیثیت اختیار
کر لی ہے جس کا سبب اس کی جغرافیائی اہمیت، وہاں کی اقتصادی امکانات
اور حکومت کی کمزوری ہے۔

یوں تو ایران صدیوں سے ادبار و تنزل کا آماجگاہ بنا ہوا ہے اور اگر وہ صفحہ ہستی سے نیست و نابود نہیں ہوا تو اس کا سبب یہ نہ تھا
کہ خود اس میں زمرہ رہنے کی کوئی صلاحیت پائی جاتی ہے بلکہ اس کا سبب صرف روس و برطانیہ کی باہمی رقابت تھی، جو اس نیم بساط شکار کو
اسی حالت میں رکھنا چاہتے تھے اور پوری طرح کسی ایک کا قبضہ گوارا نہ کر سکتے تھے۔ لیکن اس صدی میں ۱۹۵۷ء خصوصیت کے ساتھ ایران
کیلئے بڑا مبارک سال ثابت ہوا جب روس و برطانیہ نے یہ طے کر کے کہ ایران کے شمالی حصہ پر روس کا اقتدار رہے گا اور جنوبی حصہ پر برطانیہ کا، اسکے
مستقبل پر ٹھہر لگا دی اور اسے بے دست و پا کر دیا۔ یہ دو عمل اس کے لئے اور زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی اور آخر کار انتہائی اقتصادی بحالی
نے وہاں کی پہلک کو مجبور کر دیا کہ وہ حکومت سے بے نیاز ہو کر خود ہی زندگی کی کوئی صورت پیدا کریں اور انھوں نے پٹرولی و ذخائر کو جو ایران کی
آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، برطانیہ کے قبضہ سے محال کر، قومی ملکیت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

ایرانی پٹرول پر برطانیہ کا قبضہ موجودہ سرمایہ دار ملکوں کے گروہ فریب کی بڑی عجیب و غریب مثال ہے۔ زمین ایران کی، پٹرولی ختم ایران
کے، مزدور ایران کے، لیکن نفع تقریباً سب کا سب برطانیہ کا! ہر چند جب قرارداد نفع کا ایک حصہ ایران کو دیا جاتا ہے، لیکن اول تو وہ بہت کم
ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ نفع کی تعیین یا جانچ کا ایران کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ حساب کے کاغذات بھی نہیں دیکھ سکتا۔
الغرض برطانیہ جو کچھ ایران کے ساتھ کر رہا ہے وہ وہی ہے جو ایک نہایت طامع و دریلے قسم کا بقال کر سکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ایران کی
دعائے جو فیصلہ اس وقت کیا ہے وہ اس سے بہت قبل کرنا چاہئے تھا اور اس کو اس فیصلہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا چاہئے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا برطانیہ آسانی کے ساتھ ایران کے تمام مطالبات کو تسلیم کرے گا۔ یقیناً نہیں۔ اول تو وہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ یہ تحریر کسی طرح ختم ہو جائے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس نفع کی مقدار کو بھی بڑھا دے جو اس قبل ایران کو ادا کیا جاتا تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ حسابات کی جانچ کی بھی ایران کو اجازت دے اور دوسروں کو خاموش کرنے کے لئے ان کی اجرت میں بھی اضافہ کر دے اور اگر ان میں اس کو کامیابی کی امید نہ ہو تو کسی ثالث کو درمیان ڈال کر کسی طرح ایران کو راضی کرے یا ان تمام تدابیر کے بیکار ثابت ہونے کے بعد قوت سے کام لے۔ اور یہی وہ آخری صورت ہے جس کے پیش نظر کہا جاتا ہے کہ عجیب نہیں ایران بھی دوسرا گویا ثابت ہو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ تشبیہ صحیح نہیں، کیونکہ کوئی ایک جنگ اس وقت تک مقامی حیثیت سے آگے نہ بڑھے گی جب تک روس اس میں حصہ نہ لے اور روس اس وقت یہاں کیا کہیں بھی اپنی خوشی سے لڑائی مول لینے کے لئے طیار نہیں، لیکن اگر ایران کے مسئلہ میں برطانیہ نے فوجی قوت سے کام لیا تو روس خاموش بیٹھا نہ رہے گا اور اس طرح ایران کی جنگ کا ایک عالمگیر جنگ کی صورت اختیار کر لینا بالکل ناگزیر ہے۔

روس، ایران کے معاملہ میں کیوں خاموش نہ رہے گا، اس کے متعدد اسباب ہیں، جن کا اجمالی ذکر ضروری ہے۔ یہ تو روس بھی اپنی جگہ پورا یقین رکھتا ہے کہ کسی دیکسی دن اس کو لڑائی کی آگ میں کودنا ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہ لڑائی اس کی آخری لڑائی ہوگی جس میں اگر وہ کامیاب نہ ہو تو اسے ہمیشہ کے لئے ختم ہونا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اتنے بڑے خطرہ کو اس وقت تک مول نہیں لے سکتا جب تک وہ پوری طرح اس کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار نہ ہو اور اسی طیارے کے سلسلہ میں اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایران کے مسئلہ میں خاموش نہ بیٹھا رہے اور اسی لئے ایران کے جھگڑے کا عالمگیر جنگ میں تبدیل ہو جانا مستعد نہیں۔ آپ نے اس جگہ اس پر غور کریں کہ ایران کے مسئلہ میں روس کیوں دخل دینے پر مجبور ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلا آپ روس کی جغرافیائی پوزیشن اور اس کی موجودہ قوت کو سامنے لیں۔

اس وقت جنگ کی کامیابی کا انحصار تین قوتوں پر ہے۔ بحری، بری، ہوائی اور جب تک یہ تینوں قوتیں متوازن نہ ہوں کوئی ملک لڑائی میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ روس اس میں شک نہیں اپنی بری قوت کے لحاظ سے سارے یورپ و امریکہ پر حاوی ہے۔ اس وقت اس کی مسلح سپاہ کا اندازہ ۵۰ لاکھ ڈویژن کیا جاتا ہے جو ۳۰ ہزار ٹینکوں سے آراستہ ہے اور اس کے مقابلہ میں یورپی محاذ پر زیادہ سے زیادہ ۲۰ ڈویژن فوج کو لایا جاسکتا ہے۔ الغرض روس اپنی بری قوت کی طرف سے بالکل مطمئن ہے۔ فضائی قوت کی طرف سے بھی وہ غیر مطمئن نہیں کیونکہ امریکہ کے بعد سب سے زیادہ ہوائی جہاز اس کے پاس ہیں، لیکن بحری قوت اس کی بہت کمزور ہے۔ روس کا نقشہ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے پاس سمندر کوئی نہیں ہے۔ بحر اسود اور بحر کاسپین ان دونوں ملک کی صرف دو جوبیلیں ہیں جن کا تعلق کسی سمندر سے نہیں ہے اس لئے وہاں بحری قوت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، ایشیا میں کوئی قابل ذکر ساحل اس کے قبضہ میں نہیں ہے اور اگر منچو ریا کو اس کے زیر اثر سمجھ لیا جائے تو یہاں بحر جاپان ہے جس پر امریکہ و جاپان نے زبردست قبضہ جمار کھا ہے۔ لے دیکے صرف بحیرہ بالٹک رہ جاتا ہے جہاں سے اس کے جہاز گزر کر بحر اٹلانٹک میں آسکتے ہیں لیکن اس کا بھی یہ حال ہے کہ اول تو وہ سال میں ۶ مہینے پر فہراری کی وجہ سے منجمد ناقابل گزر رہتا ہے، دوسرے یہ کہ سوئیڈن اور ناروے اس کے راستہ میں حایل ہوتے ہیں اور تیسرے یہ کہ اگر بحر بالٹک سے گزر کر وہ کسی طرح بحر اٹلانٹک میں پہنچے بھی جائے تو بیکار رہے کیونکہ وہاں پہلے ہی سے یورپ و امریکہ کی بڑی زبردست بحری قوت موجود ہے۔

روس کے لئے عرضہ دراز سے بحری قوت کا مسئلہ دوسرا بنا ہوا ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ اپنی بحری قوت بڑھانے میں صرف اسی طرح کامیاب ہو سکتا ہے کہ کسی طرح خلیج فارس اور بحیرہ عرب پر اس کا اقتدار قائم ہو جائے اور اس کی صورت یہی ہے کہ وہ پہلے ایران کو اپنا طرفدار بنائے یا اس پر قبضہ کرے۔ اس اسکیم کی کامیابی سے اور بھی چند در چند فوائد اس کو حاصل ہو سکتے ہیں مثلاً ایک

یہ کہ وہ اس طرح نہ صرف ایران کے پٹرولی ذخائر پر قابض ہو جائے گا بلکہ براہِ خلیج فارس، عراق و شام بلکہ ترکی پر بھی دباؤ ڈال سکے گا جو مشرقِ ادنیٰ میں اس کا سب سے بڑا حریف ہے اور بحرِ اسود سے بحیرہ روم تک جانے کا راستہ اس کو مل جائے گا۔

روس کو ایران کی طرف اپنی کامیابی کا زیادہ یقین اس لئے بھی ہے کہ اسے اس مہم میں صرف برسی و فضائی فوج سے کام لینا پڑے گا اور بحری قوت سے کام لینے کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیونکہ روس سے ایران، ایران سے افغانستان اور افغانستان سے پاکستان و ہندوستان تک سارا راستہ خشکی کا ہے جس پر وہ آسانی سے اپنے بے شمار سپاہ کو آگے بڑھ سکتا ہے اور ان تمام ملکوں پر دباؤ ڈال کر یا انقلاب پیدا کر کے پورے ایشیا کو اشتراک کی اثرات سے متاثر کر سکتا ہے۔ الغرض ایران کا معاملہ کوہِ پارس سے بالکل جدا حیثیت رکھتا ہے اور یہاں کی بے چینی سے روس کا فائدہ اٹھانا اس کی دیرینہ تمنا ہے یہاں تک کہ اگر عالمگیر جنگ کی بنیاد کسی اور جگہ پڑی تو بھی روس ضرور ایران کی طرف بڑھ سکے گا کیونکہ ساری دنیا میں یہی ایک محاذ ایسا ہے جہاں وہ پوری کامیابی کے ساتھ فوجی فنی کوئی بھی پہنچا سکتا ہے اور اسی لئے وہ ایران کی پالیسی کا ہمیشہ نہایت غور سے مطالعہ کرتا چلا آیا ہے اور اب کہ گودا اشتراک کی جماعت وہاں برسرِ اقتدار ہے اس کو اپنے اثرات سے کام لینے کا اور موقع مل گیا ہے۔ چنانچہ آذربائیجان میں قیامِ جمہوریت کا تقاضا، گودا پارٹی کا ایرانی پٹرول کو قومی ملکیت بنانے کا مطالبہ اور اسی کے ساتھ اس کا ایران کو ہر قسم کی اقتصادی امداد پہنچانے کا وعدہ کر لینا، روس کی اسی پالیسی کو نتیجہ ہیں۔ روس، ایران کو مارن کرنے کے لئے جن جن طریقوں سے کام لے رہا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب شاہ ایران حال ہی میں امریکہ گئے اور غذائی سامان کی فراہمی کی خواہش پر امریکہ نے خشک سا جواب دیا تو روس نے فوراً اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایران سے کہہ دیا کہ وہ ہر قسم کا غذائی سامان فراہم کرنے کے لئے طیارے جس کا اثر ایران کی رعایا پر قندنا اچھا پڑنا چاہئے تھا۔ اس سے قبل جب امریکہ سے سلسلہ ملک آذربائیجان پر روس قابض رہ چکا تھا تو اس نے اپنے طرزِ عمل سے وہاں کے لوگوں کا دل موہ لیا تھا۔ اس نے وہاں کثرت سے مدارس و شفا خانے قائم کئے، سرٹیکس بنوائیں، بجلی فراہم کی اور اس کے باوجود جب ایران نے روس سے اصرار کیا کہ وہ آذربائیجان خالی کر دے تو اس نے مطلق کوئی عندیہ نہ کہلے روس کے اس طرزِ عمل سے وہاں کے لوگ بہت متاثر ہیں اور انھیں یقین ہے کہ دوسرے ملکوں کی طرح روس ان کو لوٹنا نہیں چاہتا بلکہ واقعی ان کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور اس کا قدرتی نتیجہ ظاہر ہے کہ جب روس اور برطانیہ میں سے کسی ایک کا ساتھ دینے پر ایران مجبور ہوگا تو وہ یقیناً روس کو ترجیح دے گا۔

اس میں شک نہیں کہ روس کو دوسری قوموں اور ملکوں کے آرام کرنے کا بڑا سلیقہ حاصل ہے، وہ اس فن کا ماہر ہے۔ وہ جس ملک پر تسلط قائم کرنا چاہتا ہے، اسے دین و تنگ کی مدد سے مغلوب نہیں کرتا، بلکہ اپنے اخلاق، اپنے اطوار و کردار سے متاثر کرتا ہے اور یہ خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہی نہیں ہونے دیتا کہ اس کا نقطہ نظر ملک گیری یا دوسری قوموں سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ پالیسی وہ کبھی چھوڑ ہی نہیں سکتا، وہ اپنے کسی مقصد کی تکمیل کے لئے فوجی قوت بھی استعمال کر سکتا ہے اور ایران جغرافی، اقتصادی اور سیاسی ہر حیثیت سے اس مقصد کی تکمیل کا بڑا اہم ذریعہ ہے۔

وہ ایران کو مفتوح کرنا نہیں چاہتا، وہ اس کا سرِ عظیم کی اس قدیم یادگار کو بدستور قائم رکھنا چاہتا ہے لیکن یہ ضرور چاہتا ہے کہ جس طرح چین پر اس کا اثر قائم ہوا ہے اسی طرح ایران پر بھی ہو جائے، جس میں وہ اس وقت تک اس لئے کامیاب نہیں ہو سکا کہ برما، لائیا، شمالی کوریا اور چین کی طرح ایران میں کوئی زبردست انقلاب پسند لیڈر اسے نہیں مل سکا اور خود ایران کی متزلزل پالیسی بھی اس دوران میں غیر یقینی رہی ہے۔ لیکن اب حالات بدل رہے ہیں۔ یعنی ایک طرف جمہوریت کا صحیح احساس بھی پہلے پیدا ہوا ہے اور دوسری طرف ایران نے روس کے ساتھ تجارتی معاہدہ بھی کر لیا ہے۔ تو دہائیوں کے دس بڑے بڑے لیڈر جیل سے باہر آئے ہیں اور ایرانی مجلس نے پٹرول کو قومی ملکیت بنانے کا فیصلہ کر کے وہاں کی سیاسیات کو بالکل بدل دیا ہے، چنانچہ اب وہاں یہ حالت ہے کہ ریڈیو طہران سے امریکہ کی نشریات تقریباً بند ہو گئی ہیں اور برطانیہ کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے، جس کی ذمہ داری خود

برطانیہ پر ہے اور ایک حد تک امریکہ پر بھی جو ایران کے مسئلہ پر برطانیہ کا زیادہ ساتھ دینے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ امریکہ کی بے توجہی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ واشنگٹن کے تحت وہ چاروں طرف دولت کی کھیر کر رہا تھا، ایران کو اس نے بالکل نظر انداز کر دیا اور جب ایران نے اس سے غذائی اشیاء کی فراہمی کی درخواست کی تو اسے بھی رد کر دیا۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر کا قرض ایران کو دینا ضرور امریکہ نے منظور کر لیا تھا لیکن یہ بھی اسے اب تک نہیں مل سکا۔ امریکہ کی بے اعتنائی کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ ایران کے مسئلہ کو غیر اہم سمجھتا ہے، بلکہ زیادہ تر یہ ہے کہ وہ مغربی یورپ کو زیادہ اہم سمجھتا ہے اور اپنی پوری توجہ اسی طرف صرف کرنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر ایران کے مسئلہ میں اس نے برطانیہ کی طرف اصرار کی تو اس کا قایدہ صرف برطانیہ کی پورے گاہ اور وہ دوسروں کے لئے خواہ برطانیہ ہی کیوں نہ ہو کوئی بڑی قربانی نہیں کر سکتا۔

خود برطانیہ کی پالیسی ایران کے باب میں حد درجہ خود غرضانہ رہی ہے۔ ایران کے وجود کو وہ صرف پٹرول کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور اس سے ہٹ کر اسے کوئی ہمدردی ایران سے نہیں ہے، وہ جانتا ہے کہ ایران ہمیشہ تباہ و برباد رہے کیونکہ وہاں کے پٹرول ہمارے قبضہ اسی وقت زیادہ مستحکم رہ سکتا ہے جب ایران اقتصادی حیثیت سے اس کا دست نگر رہے اور پٹرول کی کمائی سے جو قلیل نفع اسے ملتا ہے اس کو غنیمت سمجھتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ برطانیہ اپنی اس پالیسی میں عرصہ تک کامیاب رہا، لیکن کب تک آخر کار وہ وقت آگیا کہ وہاں اقتصادی بد حالی ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئی اور وہاں کی رعایا میں گریباں بچھاڑ گئے اور آجائے کا جذبہ قومی ہو گیا۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ اگر ایران کا مسئلہ یوں آسانی سے طے نہ ہوا اور ایرانی چھپر لگتی تو اس کا اثر ہندوستان و پاکستان پر کیا ہوگا۔ اگر برطانیہ نے سر زمین ایران پر فوجیں اتار دیں تو ایران خاموش نہ رہے گا، یقیناً وہ روس کی مدد چاہے گا اور روس کے لئے بہت آسان ہوگا کہ وہ اپنی ٹڈی دل فوجیں اس طرف روانہ کر دے۔ اس وقت برطانیہ مجبور ہوگا کہ افغانستان، پاکستان اور ہندوستان تینوں کا تعاون حاصل کرے اور ان کو اپنا فوجی مرکز بنا کر روس کا مقابلہ کرے، لیکن جس حد تک افغانستان کا تعلق ہے وہ اس کا رروائی سے پہلے ہی یا تو روس کا طرفدار ہو جائے گا یا نہ ہو چکا ہوگا۔ پاکستان البتہ برطانیہ کا ساتھ دے گا، لیکن برطانیہ اس سے اسی وقت پورا فائدہ اٹھا سکے گا جب ہندوستان بھی اس کا شریک ہو، لیکن ہندوستان کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ہمیں اس کا بہت کم یقین ہے کہ وہ برطانیہ کا ساتھ دے سکے گا، کیونکہ یہاں کی اقتصادی حالت بہت نازک ہے اور اشتراکی اثرات جو بہ نسبت پاکستان کے یہاں بہت زیادہ ہیں، روس کے ساتھ ہمدردی کے جذبات یہاں بہت آسانی کے ساتھ اٹھار سکتے ہیں۔

الغرض ایران کا مسئلہ بہت نازک ہو تا جا رہا ہے اور اگر یہ آسانی سے طے نہ ہوا اور برطانیہ کو اس سلسلہ میں فوجی اقدام کرنا پڑے گا، تو تیسری عالمگیر جنگ کا چھڑ جانا لازم ہے اور پھر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ نوع انسانی کا کیا حشر ہوتا ہے۔

نگار کی مکمل سالانہ جلدیں

۱۹۵۷ء، ۱۹۵۶ء، ۱۹۵۵ء، ۱۹۵۴ء، ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۰ء، ۱۹۴۹ء، ۱۹۴۸ء، ۱۹۴۷ء، ۱۹۴۶ء، ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۴ء، ۱۹۴۳ء، ۱۹۴۲ء، ۱۹۴۱ء، ۱۹۴۰ء، ۱۹۳۹ء، ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۳ء، ۱۹۳۲ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۰ء، ۱۹۲۹ء، ۱۹۲۸ء، ۱۹۲۷ء، ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۵ء، ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۳ء، ۱۹۲۲ء، ۱۹۲۱ء، ۱۹۲۰ء، ۱۹۱۹ء، ۱۹۱۸ء، ۱۹۱۷ء، ۱۹۱۶ء، ۱۹۱۵ء، ۱۹۱۴ء، ۱۹۱۳ء، ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۱ء، ۱۹۱۰ء، ۱۹۰۹ء، ۱۹۰۸ء، ۱۹۰۷ء، ۱۹۰۶ء، ۱۹۰۵ء، ۱۹۰۴ء، ۱۹۰۳ء، ۱۹۰۲ء، ۱۹۰۱ء، ۱۹۰۰ء، ۱۸۹۹ء، ۱۸۹۸ء، ۱۸۹۷ء، ۱۸۹۶ء، ۱۸۹۵ء، ۱۸۹۴ء، ۱۸۹۳ء، ۱۸۹۲ء، ۱۸۹۱ء، ۱۸۹۰ء، ۱۸۸۹ء، ۱۸۸۸ء، ۱۸۸۷ء، ۱۸۸۶ء، ۱۸۸۵ء، ۱۸۸۴ء، ۱۸۸۳ء، ۱۸۸۲ء، ۱۸۸۱ء، ۱۸۸۰ء، ۱۸۷۹ء، ۱۸۷۸ء، ۱۸۷۷ء، ۱۸۷۶ء، ۱۸۷۵ء، ۱۸۷۴ء، ۱۸۷۳ء، ۱۸۷۲ء، ۱۸۷۱ء، ۱۸۷۰ء، ۱۸۶۹ء، ۱۸۶۸ء، ۱۸۶۷ء، ۱۸۶۶ء، ۱۸۶۵ء، ۱۸۶۴ء، ۱۸۶۳ء، ۱۸۶۲ء، ۱۸۶۱ء، ۱۸۶۰ء، ۱۸۵۹ء، ۱۸۵۸ء، ۱۸۵۷ء، ۱۸۵۶ء، ۱۸۵۵ء، ۱۸۵۴ء، ۱۸۵۳ء، ۱۸۵۲ء، ۱۸۵۱ء، ۱۸۵۰ء، ۱۸۴۹ء، ۱۸۴۸ء، ۱۸۴۷ء، ۱۸۴۶ء، ۱۸۴۵ء، ۱۸۴۴ء، ۱۸۴۳ء، ۱۸۴۲ء، ۱۸۴۱ء، ۱۸۴۰ء، ۱۸۳۹ء، ۱۸۳۸ء، ۱۸۳۷ء، ۱۸۳۶ء، ۱۸۳۵ء، ۱۸۳۴ء، ۱۸۳۳ء، ۱۸۳۲ء، ۱۸۳۱ء، ۱۸۳۰ء، ۱۸۲۹ء، ۱۸۲۸ء، ۱۸۲۷ء، ۱۸۲۶ء، ۱۸۲۵ء، ۱۸۲۴ء، ۱۸۲۳ء، ۱۸۲۲ء، ۱۸۲۱ء، ۱۸۲۰ء، ۱۸۱۹ء، ۱۸۱۸ء، ۱۸۱۷ء، ۱۸۱۶ء، ۱۸۱۵ء، ۱۸۱۴ء، ۱۸۱۳ء، ۱۸۱۲ء، ۱۸۱۱ء، ۱۸۱۰ء، ۱۸۰۹ء، ۱۸۰۸ء، ۱۸۰۷ء، ۱۸۰۶ء، ۱۸۰۵ء، ۱۸۰۴ء، ۱۸۰۳ء، ۱۸۰۲ء، ۱۸۰۱ء، ۱۸۰۰ء، ۱۷۹۹ء، ۱۷۹۸ء، ۱۷۹۷ء، ۱۷۹۶ء، ۱۷۹۵ء، ۱۷۹۴ء، ۱۷۹۳ء، ۱۷۹۲ء، ۱۷۹۱ء، ۱۷۹۰ء، ۱۷۸۹ء، ۱۷۸۸ء، ۱۷۸۷ء، ۱۷۸۶ء، ۱۷۸۵ء، ۱۷۸۴ء، ۱۷۸۳ء، ۱۷۸۲ء، ۱۷۸۱ء، ۱۷۸۰ء، ۱۷۷۹ء، ۱۷۷۸ء، ۱۷۷۷ء، ۱۷۷۶ء، ۱۷۷۵ء، ۱۷۷۴ء، ۱۷۷۳ء، ۱۷۷۲ء، ۱۷۷۱ء، ۱۷۷۰ء، ۱۷۶۹ء، ۱۷۶۸ء، ۱۷۶۷ء، ۱۷۶۶ء، ۱۷۶۵ء، ۱۷۶۴ء، ۱۷۶۳ء، ۱۷۶۲ء، ۱۷۶۱ء، ۱۷۶۰ء، ۱۷۵۹ء، ۱۷۵۸ء، ۱۷۵۷ء، ۱۷۵۶ء، ۱۷۵۵ء، ۱۷۵۴ء، ۱۷۵۳ء، ۱۷۵۲ء، ۱۷۵۱ء، ۱۷۵۰ء، ۱۷۴۹ء، ۱۷۴۸ء، ۱۷۴۷ء، ۱۷۴۶ء، ۱۷۴۵ء، ۱۷۴۴ء، ۱۷۴۳ء، ۱۷۴۲ء، ۱۷۴۱ء، ۱۷۴۰ء، ۱۷۳۹ء، ۱۷۳۸ء، ۱۷۳۷ء، ۱۷۳۶ء، ۱۷۳۵ء، ۱۷۳۴ء، ۱۷۳۳ء، ۱۷۳۲ء، ۱۷۳۱ء، ۱۷۳۰ء، ۱۷۲۹ء، ۱۷۲۸ء، ۱۷۲۷ء، ۱۷۲۶ء، ۱۷۲۵ء، ۱۷۲۴ء، ۱۷۲۳ء، ۱۷۲۲ء، ۱۷۲۱ء، ۱۷۲۰ء، ۱۷۱۹ء، ۱۷۱۸ء، ۱۷۱۷ء، ۱۷۱۶ء، ۱۷۱۵ء، ۱۷۱۴ء، ۱۷۱۳ء، ۱۷۱۲ء، ۱۷۱۱ء، ۱۷۱۰ء، ۱۷۰۹ء، ۱۷۰۸ء، ۱۷۰۷ء، ۱۷۰۶ء، ۱۷۰۵ء، ۱۷۰۴ء، ۱۷۰۳ء، ۱۷۰۲ء، ۱۷۰۱ء، ۱۷۰۰ء، ۱۶۹۹ء، ۱۶۹۸ء، ۱۶۹۷ء، ۱۶۹۶ء، ۱۶۹۵ء، ۱۶۹۴ء، ۱۶۹۳ء، ۱۶۹۲ء، ۱۶۹۱ء، ۱۶۹۰ء، ۱۶۸۹ء، ۱۶۸۸ء، ۱۶۸۷ء، ۱۶۸۶ء، ۱۶۸۵ء، ۱۶۸۴ء، ۱۶۸۳ء، ۱۶۸۲ء، ۱۶۸۱ء، ۱۶۸۰ء، ۱۶۷۹ء، ۱۶۷۸ء، ۱۶۷۷ء، ۱۶۷۶ء، ۱۶۷۵ء، ۱۶۷۴ء، ۱۶۷۳ء، ۱۶۷۲ء، ۱۶۷۱ء، ۱۶۷۰ء، ۱۶۶۹ء، ۱۶۶۸ء، ۱۶۶۷ء، ۱۶۶۶ء، ۱۶۶۵ء، ۱۶۶۴ء، ۱۶۶۳ء، ۱۶۶۲ء، ۱۶۶۱ء، ۱۶۶۰ء، ۱۶۵۹ء، ۱۶۵۸ء، ۱۶۵۷ء، ۱۶۵۶ء، ۱۶۵۵ء، ۱۶۵۴ء، ۱۶۵۳ء، ۱۶۵۲ء، ۱۶۵۱ء، ۱۶۵۰ء، ۱۶۴۹ء، ۱۶۴۸ء، ۱۶۴۷ء، ۱۶۴۶ء، ۱۶۴۵ء، ۱۶۴۴ء، ۱۶۴۳ء، ۱۶۴۲ء، ۱۶۴۱ء، ۱۶۴۰ء، ۱۶۳۹ء، ۱۶۳۸ء، ۱۶۳۷ء، ۱۶۳۶ء، ۱۶۳۵ء، ۱۶۳۴ء، ۱۶۳۳ء، ۱۶۳۲ء، ۱۶۳۱ء، ۱۶۳۰ء، ۱۶۲۹ء، ۱۶۲۸ء، ۱۶۲۷ء، ۱۶۲۶ء، ۱۶۲۵ء، ۱۶۲۴ء، ۱۶۲۳ء، ۱۶۲۲ء، ۱۶۲۱ء، ۱۶۲۰ء، ۱۶۱۹ء، ۱۶۱۸ء، ۱۶۱۷ء، ۱۶۱۶ء، ۱۶۱۵ء، ۱۶۱۴ء، ۱۶۱۳ء، ۱۶۱۲ء، ۱۶۱۱ء، ۱۶۱۰ء، ۱۶۰۹ء، ۱۶۰۸ء، ۱۶۰۷ء، ۱۶۰۶ء، ۱۶۰۵ء، ۱۶۰۴ء، ۱۶۰۳ء، ۱۶۰۲ء، ۱۶۰۱ء، ۱۶۰۰ء، ۱۵۹۹ء، ۱۵۹۸ء، ۱۵۹۷ء، ۱۵۹۶ء، ۱۵۹۵ء، ۱۵۹۴ء، ۱۵۹۳ء، ۱۵۹۲ء، ۱۵۹۱ء، ۱۵۹۰ء، ۱۵۸۹ء، ۱۵۸۸ء، ۱۵۸۷ء، ۱۵۸۶ء، ۱۵۸۵ء، ۱۵۸۴ء، ۱۵۸۳ء، ۱۵۸۲ء، ۱۵۸۱ء، ۱۵۸۰ء، ۱۵۷۹ء، ۱۵۷۸ء، ۱۵۷۷ء، ۱۵۷۶ء، ۱۵۷۵ء، ۱۵۷۴ء، ۱۵۷۳ء، ۱۵۷۲ء، ۱۵۷۱ء، ۱۵۷۰ء، ۱۵۶۹ء، ۱۵۶۸ء، ۱۵۶۷ء، ۱۵۶۶ء، ۱۵۶۵ء، ۱۵۶۴ء، ۱۵۶۳ء، ۱۵۶۲ء، ۱۵۶۱ء، ۱۵۶۰ء، ۱۵۵۹ء، ۱۵۵۸ء، ۱۵۵۷ء، ۱۵۵۶ء، ۱۵۵۵ء، ۱۵۵۴ء، ۱۵۵۳ء، ۱۵۵۲ء، ۱۵۵۱ء، ۱۵۵۰ء، ۱۵۴۹ء، ۱۵۴۸ء، ۱۵۴۷ء، ۱۵۴۶ء، ۱۵۴۵ء، ۱۵۴۴ء، ۱۵۴۳ء، ۱۵۴۲ء، ۱۵۴۱ء، ۱۵۴۰ء، ۱۵۳۹ء، ۱۵۳۸ء، ۱۵۳۷ء، ۱۵۳۶ء، ۱۵۳۵ء، ۱۵۳۴ء، ۱۵۳۳ء، ۱۵۳۲ء، ۱۵۳۱ء، ۱۵۳۰ء، ۱۵۲۹ء، ۱۵۲۸ء، ۱۵۲۷ء، ۱۵۲۶ء، ۱۵۲۵ء، ۱۵۲۴ء، ۱۵۲۳ء، ۱۵۲۲ء، ۱۵۲۱ء، ۱۵۲۰ء، ۱۵۱۹ء، ۱۵۱۸ء، ۱۵۱۷ء، ۱۵۱۶ء، ۱۵۱۵ء، ۱۵۱۴ء، ۱۵۱۳ء، ۱۵۱۲ء، ۱۵۱۱ء، ۱۵۱۰ء، ۱۵۰۹ء، ۱۵۰۸ء، ۱۵۰۷ء، ۱۵۰۶ء، ۱۵۰۵ء، ۱۵۰۴ء، ۱۵۰۳ء، ۱۵۰۲ء، ۱۵۰۱ء، ۱۵۰۰ء، ۱۴۹۹ء، ۱۴۹۸ء، ۱۴۹۷ء، ۱۴۹۶ء، ۱۴۹۵ء، ۱۴۹۴ء، ۱۴۹۳ء، ۱۴۹۲ء، ۱۴۹۱ء، ۱۴۹۰ء، ۱۴۸۹ء، ۱۴۸۸ء، ۱۴۸۷ء، ۱۴۸۶ء، ۱۴۸۵ء، ۱۴۸۴ء، ۱۴۸۳ء، ۱۴۸۲ء، ۱۴۸۱ء، ۱۴۸۰ء، ۱۴۷۹ء، ۱۴۷۸ء، ۱۴۷۷ء، ۱۴۷۶ء، ۱۴۷۵ء، ۱۴۷۴ء، ۱۴۷۳ء، ۱۴۷۲ء، ۱۴۷۱ء، ۱۴۷۰ء، ۱۴۶۹ء، ۱۴۶۸ء، ۱۴۶۷ء، ۱۴۶۶ء، ۱۴۶۵ء، ۱۴۶۴ء، ۱۴۶۳ء، ۱۴۶۲ء، ۱۴۶۱ء، ۱۴۶۰ء، ۱۴۵۹ء، ۱۴۵۸ء، ۱۴۵۷ء، ۱۴۵۶ء، ۱۴۵۵ء، ۱۴۵۴ء، ۱۴۵۳ء، ۱۴۵۲ء، ۱۴۵۱ء، ۱۴۵۰ء، ۱۴۴۹ء، ۱۴۴۸ء، ۱۴۴۷ء، ۱۴۴۶ء، ۱۴۴۵ء، ۱۴۴۴ء، ۱۴۴۳ء، ۱۴۴۲ء، ۱۴۴۱ء، ۱۴۴۰ء، ۱۴۳۹ء، ۱۴۳۸ء، ۱۴۳۷ء، ۱۴۳۶ء، ۱۴۳۵ء، ۱۴۳۴ء، ۱۴۳۳ء، ۱۴۳۲ء، ۱۴۳۱ء، ۱۴۳۰ء، ۱۴۲۹ء، ۱۴۲۸ء، ۱۴۲۷ء، ۱۴۲۶ء، ۱۴۲۵ء، ۱۴۲۴ء، ۱۴۲۳ء، ۱۴۲۲ء، ۱۴۲۱ء، ۱۴۲۰ء، ۱۴۱۹ء، ۱۴۱۸ء، ۱۴۱۷ء، ۱۴۱۶ء، ۱۴۱۵ء، ۱۴۱۴ء، ۱۴۱۳ء، ۱۴۱۲ء، ۱۴۱۱ء، ۱۴۱۰ء، ۱۴۰۹ء، ۱۴۰۸ء، ۱۴۰۷ء، ۱۴۰۶ء، ۱۴۰۵ء، ۱۴۰۴ء، ۱۴۰۳ء، ۱۴۰۲ء، ۱۴۰۱ء، ۱۴۰۰ء، ۱۳۹۹ء، ۱۳۹۸ء، ۱۳۹۷ء، ۱۳۹۶ء، ۱۳۹۵ء، ۱۳۹۴ء، ۱۳۹۳ء، ۱۳۹۲ء، ۱۳۹۱ء، ۱۳۹۰ء، ۱۳۸۹ء، ۱۳۸۸ء، ۱۳۸۷ء، ۱۳۸۶ء، ۱۳۸۵ء، ۱۳۸۴ء، ۱۳۸۳ء، ۱۳۸۲ء، ۱۳۸۱ء، ۱۳۸۰ء، ۱۳۷۹ء، ۱۳۷۸ء، ۱۳۷۷ء، ۱۳۷۶ء، ۱۳۷۵ء، ۱۳۷۴ء، ۱۳۷۳ء، ۱۳۷۲ء، ۱۳۷۱ء، ۱۳۷۰ء، ۱۳۶۹ء، ۱۳۶۸ء، ۱۳۶۷ء، ۱۳۶۶ء، ۱۳۶۵ء، ۱۳۶۴ء، ۱۳۶۳ء، ۱۳۶۲ء، ۱۳۶۱ء، ۱۳۶۰ء، ۱۳۵۹ء، ۱۳۵۸ء، ۱۳۵۷ء، ۱۳۵۶ء، ۱۳۵۵ء، ۱۳۵۴ء، ۱۳۵۳ء، ۱۳۵۲ء، ۱۳۵۱ء، ۱۳۵۰ء، ۱۳۴۹ء، ۱۳۴۸ء، ۱۳۴۷ء، ۱۳۴۶ء، ۱۳۴۵ء، ۱۳۴۴ء، ۱۳۴۳ء، ۱۳۴۲ء، ۱۳۴۱ء، ۱۳۴۰ء، ۱۳۳۹ء، ۱۳۳۸ء، ۱۳۳۷ء، ۱۳۳۶ء، ۱۳۳۵ء، ۱۳۳۴ء، ۱۳۳۳ء، ۱۳۳۲ء، ۱۳۳۱ء، ۱۳۳۰ء، ۱۳۲۹ء، ۱۳۲۸ء، ۱۳۲۷ء، ۱۳۲۶ء، ۱۳۲۵ء، ۱۳۲۴ء، ۱۳۲۳ء، ۱۳۲۲ء، ۱۳۲۱ء، ۱۳۲۰ء، ۱۳۱۹ء، ۱۳۱۸ء، ۱۳۱۷ء، ۱۳۱۶ء، ۱۳۱۵ء، ۱۳۱۴ء، ۱۳۱۳ء، ۱۳۱۲ء، ۱۳۱۱ء، ۱۳۱۰ء، ۱۳۰۹ء، ۱۳۰۸ء، ۱۳۰۷ء، ۱۳۰۶ء، ۱۳۰۵ء، ۱۳۰۴ء، ۱۳۰۳ء، ۱۳۰۲ء، ۱۳۰۱ء، ۱۳۰۰ء، ۱۲۹۹ء، ۱۲۹۸ء، ۱۲۹۷ء، ۱۲۹۶ء، ۱۲۹۵ء، ۱۲۹۴ء، ۱۲۹۳ء، ۱۲۹۲ء، ۱۲۹۱ء، ۱۲۹۰ء، ۱۲۸۹ء، ۱۲۸۸ء، ۱۲۸۷ء، ۱۲۸۶ء، ۱۲۸۵ء، ۱۲۸۴ء، ۱۲۸۳ء، ۱۲۸۲ء، ۱۲۸۱ء، ۱۲۸۰ء، ۱۲۷۹ء، ۱۲۷۸ء، ۱۲۷۷ء، ۱۲۷۶ء، ۱۲۷۵ء، ۱۲۷۴ء، ۱۲۷۳ء، ۱۲۷۲ء، ۱۲۷۱ء، ۱۲۷۰ء، ۱۲۶۹ء، ۱۲۶۸ء، ۱۲۶۷ء، ۱۲۶۶ء، ۱۲۶۵ء، ۱۲۶۴ء، ۱۲۶۳ء، ۱۲۶۲ء، ۱۲۶۱ء، ۱۲۶۰ء، ۱۲۵۹ء، ۱۲۵۸ء، ۱۲۵۷ء، ۱۲۵۶ء، ۱۲۵۵ء، ۱۲۵۴ء، ۱۲۵۳ء، ۱۲۵۲ء، ۱۲۵۱ء، ۱۲۵۰ء، ۱۲۴۹ء، ۱۲۴۸ء، ۱۲۴۷ء، ۱۲۴۶ء، ۱۲۴۵ء، ۱۲۴۴ء، ۱۲۴۳ء، ۱۲۴۲ء، ۱۲۴۱ء، ۱۲۴۰ء، ۱۲۳۹ء، ۱۲۳۸ء، ۱۲۳۷ء، ۱۲۳۶ء، ۱۲۳۵ء، ۱۲۳۴ء، ۱۲۳۳ء، ۱۲۳۲ء، ۱۲۳۱ء، ۱۲۳۰ء، ۱۲۲۹ء، ۱۲۲۸ء، ۱۲۲۷ء، ۱۲۲۶ء، ۱۲۲۵ء، ۱۲۲۴ء، ۱۲۲۳ء، ۱۲۲۲ء، ۱۲۲۱ء، ۱۲۲۰ء، ۱۲۱۹ء، ۱۲۱۸ء، ۱۲۱۷ء، ۱۲۱۶ء، ۱۲۱۵ء، ۱۲۱۴ء، ۱۲۱۳ء، ۱۲۱۲ء، ۱۲۱۱ء، ۱۲۱۰ء، ۱۲۰۹ء، ۱۲۰۸ء، ۱۲۰۷ء، ۱۲۰۶ء، ۱۲۰۵ء، ۱۲۰۴ء، ۱۲۰۳ء، ۱۲۰۲ء، ۱۲۰۱ء، ۱۲۰۰ء، ۱۱۹۹ء، ۱۱۹۸ء، ۱۱۹۷ء، ۱۱۹۶ء، ۱۱۹۵ء، ۱۱۹۴ء، ۱۱۹۳ء، ۱۱۹۲ء، ۱۱۹۱ء، ۱۱۹۰ء، ۱۱۸۹ء، ۱۱۸۸ء، ۱۱۸۷ء، ۱۱۸۶ء، ۱۱۸۵ء، ۱۱۸۴ء، ۱۱۸۳ء، ۱۱۸۲ء، ۱۱۸۱ء، ۱۱۸۰ء، ۱۱۷۹ء، ۱۱۷۸ء، ۱۱۷۷ء، ۱۱۷۶ء، ۱۱۷۵ء، ۱۱۷۴ء، ۱۱۷۳ء، ۱۱۷۲ء، ۱۱۷۱ء، ۱۱۷۰ء، ۱۱۶۹ء، ۱۱۶۸ء، ۱۱۶۷ء، ۱۱۶۶ء، ۱۱۶۵ء، ۱۱۶۴ء، ۱۱۶۳ء، ۱۱۶۲ء، ۱۱۶۱ء، ۱۱۶۰ء، ۱۱۵۹ء، ۱۱۵۸ء، ۱۱۵۷ء، ۱۱۵۶ء، ۱۱۵۵ء، ۱۱۵۴ء، ۱۱۵۳ء، ۱۱۵۲ء، ۱۱۵۱ء، ۱۱۵۰ء، ۱۱۴۹ء، ۱۱۴۸ء، ۱۱۴۷ء، ۱۱۴۶ء، ۱۱۴۵ء، ۱۱۴۴ء، ۱۱۴۳ء، ۱۱۴۲ء، ۱۱۴۱ء، ۱۱۴۰ء، ۱۱۳۹ء، ۱۱۳۸ء، ۱۱۳۷ء، ۱۱۳۶ء، ۱۱۳۵ء، ۱۱۳۴ء، ۱۱۳۳ء، ۱۱۳۲ء، ۱۱۳۱ء، ۱۱۳۰ء، ۱۱۲۹ء، ۱۱۲۸ء، ۱۱۲۷ء، ۱۱۲۶ء، ۱۱۲۵ء، ۱۱۲۴ء، ۱۱۲۳ء، ۱۱۲۲ء، ۱۱۲۱ء، ۱۱۲۰ء، ۱۱۱۹ء، ۱۱۱۸ء، ۱۱۱۷ء، ۱۱۱۶ء، ۱۱۱۵ء، ۱۱۱۴ء، ۱۱۱۳ء، ۱۱۱۲ء، ۱۱۱۱ء، ۱۱۱۰ء، ۱۱۰۹ء، ۱۱۰۸ء، ۱۱۰۷ء، ۱۱۰۶ء، ۱۱۰۵ء، ۱۱۰۴ء، ۱۱۰۳ء، ۱۱۰۲ء، ۱۱۰۱ء، ۱۱۰۰ء، ۱۰۹۹ء، ۱۰۹۸ء، ۱۰۹۷ء، ۱۰۹۶ء، ۱۰۹۵ء، ۱۰۹۴ء، ۱۰۹۳ء، ۱۰۹۲ء، ۱۰۹۱ء، ۱۰۹۰ء، ۱۰۸۹ء، ۱۰۸۸ء، ۱۰۸۷ء، ۱۰۸۶ء، ۱۰۸۵ء، ۱۰۸۴ء، ۱۰۸۳ء، ۱۰۸۲ء، ۱۰۸۱ء، ۱۰۸۰ء، ۱۰۷۹ء، ۱۰۷۸ء، ۱۰۷۷ء، ۱۰۷۶ء، ۱۰۷۵ء، ۱۰۷۴ء، ۱۰۷۳ء، ۱۰۷۲ء، ۱۰۷۱ء، ۱۰۷۰ء، ۱۰۶۹ء، ۱۰۶۸ء، ۱۰۶۷ء، ۱۰۶۶ء، ۱۰۶۵ء، ۱۰۶۴ء، ۱۰۶۳ء، ۱۰۶۲ء، ۱۰۶۱ء، ۱۰۶۰ء، ۱۰۵۹ء، ۱۰۵۸ء، ۱۰۵۷ء، ۱۰۵۶ء، ۱۰۵۵ء، ۱۰۵۴ء، ۱۰۵۳ء، ۱۰۵۲ء، ۱۰۵۱ء، ۱۰۵۰ء، ۱۰۴۹ء، ۱۰۴۸ء، ۱۰۴۷ء، ۱۰۴۶ء، ۱۰۴۵ء، ۱۰۴۴ء، ۱۰۴۳ء، ۱۰۴۲ء، ۱۰۴۱ء، ۱۰۴۰ء، ۱۰۳۹ء، ۱۰۳۸ء، ۱۰۳۷ء، ۱۰۳۶ء، ۱۰۳۵ء، ۱۰۳۴ء، ۱۰۳۳ء، ۱۰۳۲ء، ۱۰۳۱ء، ۱۰۳۰ء، ۱۰۲۹ء، ۱۰۲۸ء، ۱۰۲۷ء، ۱۰۲۶ء، ۱۰۲۵ء، ۱۰۲۴ء، ۱۰۲۳ء، ۱۰۲۲ء، ۱۰۲۱ء، ۱۰۲۰ء، ۱۰۱۹ء، ۱۰۱۸ء، ۱۰۱۷ء، ۱۰۱۶ء، ۱۰۱۵ء، ۱۰۱۴ء، ۱۰۱۳ء، ۱۰۱۲ء، ۱۰۱۱ء، ۱۰۱۰ء، ۱۰۰۹ء، ۱۰۰۸ء، ۱۰۰۷ء، ۱۰۰۶ء، ۱۰۰۵ء، ۱۰۰۴ء، ۱۰۰۳ء، ۱۰۰۲ء، ۱۰۰۱ء، ۱۰۰۰ء، ۹۹۹ء، ۹۹۸ء، ۹۹۷ء، ۹۹۶ء، ۹۹۵ء، ۹۹۴ء، ۹۹۳ء، ۹۹۲ء، ۹۹۱ء، ۹۹۰ء، ۹۸۹ء، ۹۸۸ء، ۹۸۷ء، ۹۸۶ء، ۹۸۵ء، ۹۸۴ء، ۹۸۳ء، ۹۸۲ء، ۹۸۱ء، ۹۸۰ء، ۹۷۹ء، ۹۷۸ء، ۹۷۷ء، ۹۷۶ء، ۹۷۵ء، ۹۷۴ء، ۹۷۳ء، ۹۷۲ء، ۹۷۱ء، ۹۷۰ء، ۹۶۹ء، ۹۶۸ء، ۹۶۷ء، ۹۶۶ء، ۹۶۵ء، ۹۶۴ء، ۹۶۳ء، ۹۶۲ء، ۹۶۱ء، ۹۶۰ء، ۹۵۹ء، ۹۵۸ء، ۹۵۷ء، ۹۵۶ء، ۹۵۵ء، ۹۵۴ء، ۹۵۳ء، ۹۵۲ء، ۹۵۱ء، ۹۵۰ء، ۹۴۹ء، ۹۴

اُردو ادب فساد میں

فکار زندگی کے ساتھ چلتا ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے تاریخی ماحول سے دور نہیں جا سکتا۔ اس کی ہر تخلیق سماجی حالات کی سچی تصویر ہوتی ہے اس لئے کہ فکار کوئی جوتی نہیں ہوتا کہ اس کی تخلیق اس کی تپسیا کی وجہ سے وجود میں آتی ہو۔ ادب کوئی مافواں شے نہیں، اس کا راہ راست زندگی سے تعلق ہے اور وہ زندگی اور انسانیت کا صرف عکاس نہیں اس کا نقاد بھی ہے۔ وہ وجود کو توڑتا ہے، زندگی کو جدو جہد و تڑپ دیتا ہے۔ اس کی چڑھ چلی ہوئی کمان سے ایسے تیر چلتے ہیں جو سکون ستائے اور وجود کے جگر کو پاش پاش کر دیتے ہیں، اس سے انسانیت کی تاریکی دوہتی ہے، وہ زندگی کے ساتھ دوڑتا ہے اور اس دوڑ میں اسے بہت سے نشیب و فراز ملتے ہیں، وہ دوڑتا رہتا ہے، زندگی کے ساتھ، ایک مستقل بہاؤ کے ساتھ زندگی اور انسانیت کی عکاسی اور تنقید کے بعد وہ ان کی راہنمائی بھی کرتا ہے۔ انہیں تباہی کے گرداب سے بھی نکالتا ہے۔ اس کا مقصد اجتماعی ہے۔ — خفقہ کو وہ ان خیالات اور جذبات کا ترجمان ہے جو انسانیت کو سفید راہ پر گامزن کرتے ہیں۔

ہمیں اس وقت زندگی کا ایک نظام بگھلاتا اور ایک اُبھرتا نظر آ رہا ہے، یا یوں کہئے کہ دو نئے نظام: بالکل ابھرتا اور اشتراکیت نے روس اور چین میں ایک نئی دنیا پیدا کر دی ہے اور دنیا کے دوسرے گوشے انہیں دیکھ کر اپنے سینے سے بھی لگانے کے لئے بچپن ہیں۔ انہیں اشتراکیت اسی مادی دنیا کا نظام معلوم ہوتی ہے، بہت ہی وسیع اور حسین نظام جس کی کشش ہماری زندگی کو اس کی طرف کھینچ رہی ہے، کروڑوں فاقہ کشوں اور بے گناہوں نے اس کا انتظار کیا ہے، وہ نظام ایک ایسی زندگی کا مطالبہ کر رہا ہے جس میں دنیا کے سارے انسانوں کے لئے برابر آسانیاں ہوں، ذاتی ملکیت کا کوئی سوال نہ ہو، فرقہ بندی نہ ہو، نفاق نہ ہو انسان ہوں اور زندگی ہو!

اور ایسی فضا میں سانس لینے والا فکار یقیناً اپنے فح کو ان جذبات اور خیالات کا ترجمان بنائے گا جس سے انسانیت کو نئے اقدار ملتے ہوں وہ اپنی داخلی دنیا میں سمٹ جاتا ہرگز نہ چاہے گا، وہ خارجی دنیا میں اجتماعی تعلقات کو حسن دینے کے لئے دفاعیت کے اندھیرے سے نکل آئے گا اُس کی تخلیق میں مقصد ہوگا، وہ حیات کی تخلیق کرے گا، پھر ماضی اور اقداریت پرستی ختم ہو جائے گی اور نیا عہد خانہ کے دروازے ابھی تام ویرانیوں کے ساتھ کھٹ جائے گا، اشتراک کی حقیقت نگاری کے سامنے لاشعور، روح اور جنسی و مذہبی جذبے کو حقیقت بتانے والے اپنے ہنگاموں میں گم ہو جائیں گے اس لئے کہ ادب تفریح کی شے نہیں رہ جائے گا بلکہ اجتماعی زندگی کے حسین ابھری گلیوں اور صحت مند چہرے کا عکاس ہوگا، غرض زندگی اور ادب کا تعلق بڑا گہرا ہے اور زندگی کی تلاش میں ادب نہ تو ستاروں کی دنیا میں جاتا ہے اور نہ پاتال میں، وہ اسی دھرتی پر رہتا ہے اس لئے کہ اسی دھرتی کی ہوتی دھرتی پر زندگی ناچتی، دوڑتی اور تھکتی ہے۔

چونکہ فکار کی تخلیق میں صرف داخلی زندگی کی گلیوں پر تڑپتی نظر آتی ہیں بلکہ اس میں انسانیت کا دل بھی دھڑکتا ہے اس لئے سماج سے اس کا تعلق اس کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیتا ہے اور اسی وسعت کی وجہ سے نگار سیاست سے غلطہ نہیں ہو سکتا، سیاست سے الگ ہونا سماجی تعلقات سے غلطہ ہونا ہے اور نسطاتی قوتوں کو ابھرنے اور پھٹنے میں ہر ممکن مدد کرتا ہے۔ وہ لوگ جو ادب کو سیاست سے الگ دیکھنا چاہتے ہیں لاشعور کے دل سے ابھی تک باہر نہیں آ سکتے ہیں، غلامی کی زنجیر ان کے جسم سے لپٹ کر رہ گئی ہے، وہ احساس کمتری، روحانی بے چارگی اور رومنیت کو اس دور میں بھی چھوڑنا پسند نہیں کرتے، ادب کی بنیادوں میں سیاست کی دھڑکنوں کو محسوس کرتے ہوئے انہیں غلطہ معلوم ہوتا

ہے اس لئے کہ وہ جاگیر دارانہ نظام سے اپنی زندگی وابستہ کر چکے ہیں۔ تاریکی میں زندگی گزار دینے کے بعد نئی سیاست کی تیز روشنی انھیں کیسی بھلی معلوم ہو؟ ان کی زندگی فرسودہ نظام زندگی کی غلیظ سیاست میں الجھ کر رہ گئی ہے، وہ اپنے گندے نظام کو پیار کرتے ہیں اور اسی پیار کا نتیجہ ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ فنکار کے پیش کردہ نئے عناصر میں سیاسی عناصر زندگی پیدا کر دیتے ہیں، اقتصادیات اور سیاست کا تعلق ہی بہت ہی گہرا ہے۔ فنکار بین الاقوامی سیاست سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا، وہ ادب کو سیاست سے علیحدہ کر دینے کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ اور میرے خیال میں یہ نعرہ صرف اس لئے ہے کہ جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے فرسودہ عناصر کی پردہ پوشی ہو اور اشتراکی حقیقت نگاری کی کمان سے چلے ہوئے تیرائی عناصر کے جگر میں پیوست نہ ہو جائیں جنہیں وہ پیار کرتے ہیں اس لئے کہ انے ابھی تک ان کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں، اگر فنکار کے دل میں غم جاناں کے ساتھ غم دوران کے نشانات بھی ہوں تو وہ اپنے دامن کو سیاست سے نہیں بچا سکتا۔ خارجی زندگی میں رُبل آنے کے بعد اسے حقیقت داہلی نہیں بلکہ خارجی نظر آئے گی، وہ دنیا کی تاریکی دیکھ کر ستاروں کے مدھم روشنی میں جذب ہونے کی کوشش نہ کرے گا، بلکہ اس تاریکی کو دور کرنے کے لئے اپنی تخلیق سے کام لے گا اس لئے کہ ادب زندگی میں آہنگ پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس سے احوال کے انداز بدل جاتے ہیں، اس سے دنیا بدل جاتی ہے۔

اگر ادب اور زندگی کا ساتھ چلی اور دامن کا ہے اور زندگی کا تعلق حکومت سے ہے تو پھر ادب اور حکومت کے تعلق کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے؟ ادیب سیاست کے ان عناصر کو اپنے یہاں کیوں جگہ نہ دیں جن سے عوام کی زندگی میں آہنگ پیدا ہو جائے اور انسانیت کے کبھوتے شیرازوں کا ایک سنگم بن جائے؟ ادب سیاست کے ان عناصر کا عکاس کیوں نہ ہو جن سے جتنا کی زندگی اور موت وابستہ ہے؟ انفرادیت کی کشتی سمندر کے طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتی، وہ ادب یقیناً زندگی کو مہل جھٹکائیں دے گا جو اپنے ماحول کی ترجمانی سے گریز کرے گا۔ آج زندگی اور دے شکر کا اساطیری ناچ اور گوتم یا گاندھی کا مجسمہ نہیں، یا اس کا دائرہ رومان اور جنس تک محدود نہیں ہو سکتا۔ زندگی ایک نامیاتی حقیقت ہے جس کا حصہ میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے، دو عناصر ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوتے ہیں اور قہری چیز وجود میں آجاتی ہے اس تیسرے عنصر سے دوسرا عنصر جگ کر تا ہے، کشاکش ہوتی ہے اور پھر ایک تضاد ختم لیتا ہے اسی طرح ایک نظام کے بعد دوسرا نظام عالم وجود میں آتا رہتا ہے اور ہر نظام زندگی کو کچھ نئے انداز بخش دیتا ہے، زندگی حسین ہوتی جاتی ہے اور اس طرح مستقبل سے ہماری بہت سی امیدیں وابستہ ہو جاتی ہیں۔ نظام زندگی میں ہمیشہ تغیر اور انقلاب آتے رہتے ہیں، تغیر بتدریج اور انقلاب کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا، نئی چیزیں ہمیشہ ابھرتی، اور بڑھتی، بنتی ہیں اور تاریک گیریں ٹوٹتی، بکھرتی اور فنا ہوتی رہتی ہیں ابھرتے ہوئی عناصر اور پکھلتے ہوئے عناصر ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوتے ہیں، ابھرتے ہوئے نقوش ابھر کر رہتے ہیں اور ————— پرانی چیزوں کی جگہ نئی چیزیں لیتی ہیں اور اس طرح زندگی کے پردہ پر حسین نئے ابھرتے رہتے ہیں (اس کے ساتھ یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ زندگی کو ہر نظام سے صرف عناصر ہی نہیں ملے یا سماجی زندگی صرف خوبصورت راہوں سے ہو کر چلتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام نے جو تاریک اشارے ہم دئے ہیں اسے تاریخ انسانی فراموش کب کر سکتی ہے؟) ہماری زندگی میں وسعت ہے، حسن ہے اور آہنگ ہے، مارکس (Marx) نے اپنی زندگی کو گہرائیاں، نئی گونجیں اور نئے انداز دئے ہیں۔ ہیگل (Hegel) نے کہا تھا کہ دنیا کی ہر چیز اپنی ضد پر قائم ہے، زندگی کا ارتقا تضاد ہی کی جگہ پر منحصر کرتا ہے۔ ہیگل کے فلسفہ تضاد (Contradiction) میں جو سب سے بڑی خامی تھی وہ یہ کہ اس نے یہاں صرف تصور عبادیاتی عمل (Ideas and Concepts) سے متاثر ہوتا ہے، تصور اور فکر (Ideas and Concepts) کی کائنات سے آگے تضاد کی کوئی جگہ نہیں۔ دنیا میں انقلاب آتے رہتے ہیں اور ان انقلابات کی وجہ تصورات (Ideas) کی جنگ ہے کائنات میں رونق پیدا کرنے کے لئے تصور اپنا حریف مقابل بناتا ہے تاکہ اس سے آادہ پیکار رہ کر اپنے فوق جدو جہد کی تسکین کر سکے، دنیا میں رونق صرف تصورات کی جدو جہد اور ان کے آپس کی کشاکش سے ہوتی ہے۔ ہر تصور کی ایک ضد پیدا ہو جاتی ہے،

دووں کی جنگ ایک نئے تصور کو جنم دیتی ہے جس سے پہلے تصور کا حسن جاتا رہتا ہے۔ ہر تصور میں کچھ نہ کچھ خامی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ نئے تصور کی تخلیق ہوتی رہتی ہے، ہیگل (Hegel) کے نزدیک دنیا میں مادہ کی کوئی خاص جگہ نہیں۔ مادہ بھی تصور کی تخلیق کا عکس (کارت) ہے، مارکس (Marx) ہیگل کی طرح خارجی دنیا کو تصور اور فکر کی تصویر نہیں سمجھتا۔ جنگ افساد کا وہ بھی قایل ہے لیکن تصورات کی دنیا سے الگ ایک ٹھوس مادی دنیا میں اس جنگ کو قبول کرتا ہے۔ وہ داخلی دنیا میں فکر اور تصورات سے اُلجھنا پسند نہیں کرتا، خارجی دنیا ہی اس کے لئے سب کچھ ہے۔ وہ تصور کو نہیں مادہ (Matter) کو کائنات کی بنیاد سمجھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ مادہ (Matter) سے تصور کا جنم ہوتا ہے یعنی مارکس نے ہیگل کے جدلی تصور (Dialectical Materialism) کو جدلی ادیت (Dialectical Materialism) سے بدل دیا۔ جنگیں تصورات کی ہیں نظام کی ہوتی ہیں۔ کائنات کو حسن دینے کے لئے ایک معاشی نظام کے سامنے دوسرا معاشی نظام آجاتا ہے تاکہ ایک کشاکش پیدا ہو سکے اور دونوں کی کشاکش اور تصادم سے تیسرا معاشی نظام پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح زندگی میں ہمیشہ انقلابات آتے رہتے ہیں۔ ان انقلابات کی وجہ صرت (Hinterland Reason) اور کچھ نہیں۔ لیکن نے ایک جگہ مارکس کے نظریہ ادیت کو یوں صاف کر دیا ہے:-
The world picture is a picture how matter moves and how matter thinks
(Lenin)

ہیگل کا تصور جدلیات کائنات اور اس کے قانون کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس کے برعکس، مارکس کا خیال ہے کہ کائنات اور اس کے قانون کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ مارکس فضاؤں میں پرواز نہیں کرتا، اس کی آواز کائنات کی آواز ہے، ہم اس کی آواز کی تصویر بنا رہے ہیں اور آہنگ کو محسوس کرتے ہیں۔

نئی سماجی زندگی کو نئی قدروں کو اُردو ادب نے اپنے سینے سے لگایا ہے۔ زندگی اپنے دور کے معاشی نظام پر کھڑی ہوتی ہے کسی دور کے معاشرتی، تمدنی، اخلاقی اور مذہبی حالات کا اندازہ اُسی دور کے معاشی نظام سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ معاشی نظام سے جب زندگی الگ نہیں ہو سکتی تو وہ ادب کیونکر دور ہو سکتا ہے جو اس زندگی کے ساتھ دوڑتا رہتا ہے؟ اس طرح معاشی نظام کی سیاست بھی ادب سے دور نہیں رہ سکتی۔ وہ ادب کو نئی گونجیں عطا کرتی رہے گی!

جہاں تک اُردو ادب کا تعلق ہے سیاست سے ہمیشہ وابستہ رہا ہے۔ سیاسی عناصر صاف بھی نظر آتے ہیں اور بعض وقت محبت بھی رہے ہیں لیکن کسی دیکھی صورت میں اُردو ادب سے ان کا تعلق رہا ہے۔ اُردو شعرا کے کلام کے تجزیے میں ایسے عناصر بھی ملتے ہیں جن میں زندگی کی تڑپ ہے، جو زندگی کے ہر رخ کو سمجھنے اور اُلجھنے ہوئے مسئلوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس وقت جبکہ سیاست اور ادب کا تعلق بہت ہی گہرا ہو گیا ہے، ادب کو سیاست سے آزاد کرنے کا مطالبہ بڑا ہی مضحکہ خیز ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ سرمایہ داری ختم ہو رہی ہے، اشتراکیت سماج کو لیکر ایک نیا جہاں بنانے کی خاطر آگے بڑھ رہی ہے، سماج کی طبقاتی تقسیم ختم ہو رہی ہے اور اشتراکیت سماج کی تعمیر کا خواب عوام دیکھ رہے ہیں، سیاسی ماحول سے دور رہ کر ادیب کس زندگی کی عکاسی کرے گا؟ اس کی کسی تخلیق میں اس طرح کوئی حسرت بھی پیدا ہونے لگے گا؟ ماحول کی ان نئی قدروں سے دور جانے والوں کو مستقبل اسی طرح بھول جائے گا جس طرح نازشاہی ماحول کے اُن فنکاروں کو بھول گیا جنہوں نے آنے والی سوشلسٹ کے خلاف آواز بلند کی تھی اور شہنشاہیت کو سراہا تھا، سلیم گوہر کی (سلیم گوہر کی شہنشاہت) نے نظام کو سلام کیا تھا اور اسی نظام کی ترقی کا ہمیشہ خواہاں رہا اس نے وہ آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ غرض عصری ماحول سے کوئی فنکار دور میں جاسکتا، عصری ماحول سے رشتہ توڑنا انسانیت پر ظلم کرتا ہے۔ جس ادبی تخلیق میں

روحِ عمر نہ ہوگی، ادبی نظام میں اس کی کوئی جگہ نہیں اور زندگی کے لئے اس کی حیثیت ایک سٹی ہوئی لکیر کی ہے اس لئے کہ زندگی کی تنظیم اسے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ تاریخ کا کوئی دور اسے کوئی اہمیت نہیں دے سکتا ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ سماج کی مادی زندگی کے حالات میں انسانی آبادی کو ایک خاص مقام حاصل ہے اس لئے کہ انہماکِ سوسائٹی کی مادی زندگی میں کوئی حسن پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن انسان کے سماجی نظام کو صرف انسان کی بڑھتی ہوئی آبادی زندگی نہیں دیکھتی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کی بڑھتی ہوئی آبادی سماج کو وسیع کرتی ہے اور زندگی کے خوبصورت اشاروں کو جنم دیتی ہے لیکن یہ آبادی سماج کو حسن دینے کا سب سے بڑا ذریعہ نہیں اس لئے کہ وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ کیوں ایک خاص نظام کو مضبوط کر رکھ دینے کے لئے ایک مخصوص نظام جنم لیتا ہے۔ اس مخصوص نظام کی جگہ کوئی اور نظام اس کام کو انجام نہیں دے سکتا، اس ماحول میں نگاہیں ڈالنے پر محسوس ہوتا ہے کہ صرف بڑھتی ہوئی آبادی سوسائٹی کو زندگی نہیں دے سکتی۔ سوویت روس، چین، امریکہ اور انجیم کی مثالیں سامنے ہیں۔ مادی اور سماجی زندگی کو حسن دینے کا سب سے بڑا ذریعہ وہ طریقے ہیں جن سے انسانی زندگی کی ضروریات کا ماحول کے ساتھ بانی جاسکیں اور اس کے ساتھ مادی قدروں کی پیداوار کوئے انداز دینے کے طریقے بھی شامل ہیں، زندگی کی خاطر انسانی کو کھانا، کپڑا اور مکان وغیرہ کی ضرورت ہے، انھیں حاصل کرنے کے لئے انسان کو اُن چیزوں کی ضرورت ہوگی جن سے یہ چیزیں تخلیق کی جاسکیں۔ ضروریاتِ زندگی کی خاطر انسان کو کھانا، کپڑا، اور مکان وغیرہ کی ضرورت ہوگی جن سے یہ چیزیں تخلیق کی جاسکیں۔ ضروریاتِ زندگی کی خاطر انسان نئی چیزوں کی تخلیق کرے گا۔ نئے نئے اور مشینیں بنائے گا تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔ وہ لوگ جو ان اوزاروں اور مشینوں سے اپنی زندگی قائم رکھیں گے وہ یقیناً اُن لوگوں سے اچھے تعلقات پیدا کریں گے جنہوں نے اپنی جسامتی اور زمینی طاقت سے پیداوار کی خاطر ایسی مشینیں اور اوزار بنائے ہیں اور یہ ساری چیزیں مجموعی طور پر سماج کو زندگی دیں گی۔

زندگی کی ضروریات کو حاصل کرنے کے طریقے ایک انسان سے دوسرے انسان کے اچھے تعلق پیدا کرتے ہیں اور یہ تعلق یا رشتے بہت ہی گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں انسان فطرتی طور پر زندگی میں جدوجہد کرتا ہے اور دنیا کی چیزوں کو پیداوار کی خاطر استعمال کرتا ہے ایسے وقت میں ہر آدمی انفرادی طور پر اس کام کو انجام نہیں دیتا بلکہ ایک کو دوسرے کا سہارا لینا پڑتا ہے سب ایک ساتھ جدوجہد کرتے ہیں اور یہ پھر اجتماعی اور سماجی جدوجہد ہو جاتی ہے۔ زندگی کی خاطر جو کچھ بھی پیدا کیا جاتا ہے وہ کسی کی انفرادی ملکیت نہیں بلکہ وہ ہر حالت میں سماج کی چیز ہوتی ہے۔ اور انسان کا ایک دوسرے سے ایسا گہرا رشتہ سماج کو زندگی بخشتا ہے۔

آفرینشِ دولت کے طریقے کبھی ایک نقطہ پر نہیں ٹھہر سکتے، یہ ہمیشہ بدلتے ہی رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ ترقی بھی کرتے رہتے ہیں اور انکی تبدیلی اور ترقی کے ساتھ سماج کے سارے عناصر میں تبدیلی اور ترقی ہوتی رہتی ہے۔ خواہ وہ سیاسی تصورات ہوں یا سماجی، سیاسی ادھی ہوں یا سماجی ادارے، تبدیلی ضرور ہوگی، سارے سماجی اور سیاسی گوشوں میں نئی تعمیریں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح جب ہماری نگاہیں تاریخِ انسانی پر جاتی ہیں تو ہر نئے نظام میں زندگی بسر کرنے کے نئے طریقے نظر آتے ہیں۔ آفرینشِ دولت کے طریقے بھی بدلے نظر آتے ہیں معاشی نظام (Society) کے ساتھ سماج کے ہر گوشہ میں تبدیلیاں آ جاتی ہیں سوسائٹی کے آفرینشِ دولت کے جو بھی طریقے ہوں، اصل عنصر خود سوسائٹی ہے۔ سوسائٹی کے تصورات ہیں، اس کے سیاسی خیالات اور سیاسی ادارے ہیں۔ سماجی ترقی کی تاریخ مادی قدروں کی تخلیق کرنے والوں کی تاریخ ہو جاتی ہے، یعنی محنت کشوں اور مزدوروں کی تاریخ، وہ محنت کش اور مزدور جو آفرینشِ دولت کے طریقے لاتے ہیں، ان طریقوں کو زندگی بخشتے ہیں اور سماج کی زندگی کی خاطر ملکر کام کر رہے ہیں۔

سماج کے ذریعہ انسان انفرادی طور پر نظامِ زندگی میں جدوجہد کیا کرتا ہے۔ مافردوں کا شمار کرتے تھے اپنے نئے مکانات کی تعمیر کی خاطر جنگل کے پہلوں کو بچا کرنے اور پھلپھلوں کو کچرٹنے کی خاطر انسان ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ اس لئے کہ وہ خود جانوروں یا

نظم کے شکار نہ ہو جائیں اور یہ سماجی طریقے اتنے اچھے تھے کہ پیداوار کے ذرائع کسی ایک طبقہ کی خاص ملکیت نہ ہو سکی، ذاتی ملکیت کا وجود نہ تھا۔ ہاں چند تھیں راہیں تھے جنہیں بعض بعض لوگ ذاتی طور پر رکھتے تھے اور جن سے جنگی خونخاک جانوروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود نہ تو طبقات کا وجود تھا اور نہ انفرادی محنت اور مشقت کا۔ دوبر غلامی میں غلام رہنے والے ہی ساری پیداوار کے مالک تھے اور آفرینش دولت کے طریقے جانتے والے غلاموں کے بھی مالک تھے وہ غلاموں کو فروخت بھی کرتے، خرید بھی لیتے اور موت کے گھاٹ بھی اتار دیتے۔ ضروریات زندگی کی چیزیں حاصل کرنے کے لئے نئے ہتھیار اور اوزار بنائے گئے، دولت اقلیت کے ہاتھوں میں تھی، اکثریت غلاموں کی تھی۔ پیداوار بڑھانے اور پیدا کرنے میں پورے سطح کی محنت صرف نہ ہوتی تھی صرف غلام محنت کرتے تھے اس دور میں سماجی طریقے انفرادی اور ذاتی طریقوں میں تبدیل ہو گئے۔ آقا سرخیز کے آقا تھے اور غلام ہر وقت غلام ہی تھا۔ دولت مزدور بد کرتے تھے، غریب برباد ہوتے تھے، ایک نفعہ طبقہ زندہ رہ سکتا تھا، اسے زندہ رہنے کا حق تھا اور ایک بڑا طبقہ صرف محنت کرنے اور مرے کے لئے پیدا ہوا تھا، اسے انسان کی طرح زندہ رہنے کا کوئی حق نہ تھا۔ سامنتی دور میں پیداوار کے مالک جاگیر دار ہو جاتے ہیں لیکن اسکے ساتھ وہ دوبر غلامی کے آقاؤں کی طرح مزدوروں اور کسانوں کے مالک نہیں ہوتے، جاگیر داروں اور سامنتوں کے ساتھ ساتھ کسانوں کا وہ طبقہ بھی ابھرنے لگا جو پیداوار پیدا کرنے اور بڑھانے کے ہتھیاروں اور اوزاروں کے مالک تھے۔ اپنی ذاتی محنت اور مشقت سے اس طبقہ نے اپنی دنیا الگ بنا رکھی تھی، مزدوروں اور کسانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ بھی پیداوار پیدا کرنے اور بڑھانے میں جاگیر داروں کے ساتھ رہیں گے، جاگیر دار انھیں غلام سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ مزدور ہیں اور انھیں صرف مزدور اور غلام کی طرح کام کرنا چاہئے۔ اس دور میں ذاتی ملکیت کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہو گیا اور طبقاتی جنگ کی بنیاد پڑ گئی۔ سرمایہ دارانہ دور میں ذرائع پیداوار کا سب سے اہم حصہ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں رہنے لگا۔ یہاں مزدوروں کو دوبر غلامی کے آقاؤں کی طرح نہ تو وہ جاب سے مار سکتے تھے اور نہ انھیں غلاموں کی طرح فروخت کر سکتے تھے۔ اگرچہ مزدوروں کا طبقہ آزاد ہے پھر بھی سرمایہ دار انھیں لوٹ کر رکھ دیتے ہیں ذرائع پیداوار سے خود کو محروم دیکھ کر یہ طبقہ اپنی محنت فروخت کرتے ہیں۔ معاشی زندگی میں سرمایہ داروں کا علامہ کوئی مسکراتا نظر نہیں آتا، صرف صنعتوں کی نہیں بلکہ حکومت کی بھی پالیسی کی تخلیق کر کے سرمایہ دار انسانی زندگی پر چھائے ہیں اور حکومت کی وجہ سے وہ ہر اس آواز کو کچل دینا چاہتے ہیں جن میں انقلابی عناصر ہوں، سرمایہ داری ترقی کرتی رہی اور ساتھ ساتھ تضاد بھی بڑھتا رہا۔ پیداوار بے مخصوص طبقہ کی ذاتی ملکیت نے خود سرمایہ داروں کے درمیان طوفان برپا کر دیا ہے، وہ آپس میں سرمایہ دارانہ مقابلے (competitions) جھگڑے، لڑائیاں اور عظیم جنگوں کی شکلیں میں نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک طرف پیداوار بڑھانے کی آواز بلند ہوئی، پیداوار بڑھتی گئی، دوسری طرف حماہ کی زندگی پر تاریکیاں چھانے لگیں، ان کی زندگی کا معیار

Standard of Living ڈھلنا لگا۔ مزدوروں میں بے روزگاری بڑھنے لگی، اور یہ بے روزگاری سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے گہرا زخم ہے جو خراب ہو گیا ہے اور جس میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔ اس نظام میں اخلاق کی کوئی جگہ نہ تھی، عوام کھانے کو ترس رہے ہیں، مزدوروں اور کسانوں کی بہت بڑی تعداد زرعی کی تاریک گودے سے پھٹ کر رہ گئی ہے۔

منافع کی ہوس نے اخلاقی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سرمایہ داروں کی جنگوں نے نہریلے لگیں اور کم کو جنم دیا ہے۔ خونخاک بیماریوں کو پیدا کیا ہے، سائنس کی ترقی روک دی گئی۔ اور ایسی تاریک لکیروں کو جنم دیا مجھے دیکھ کر انسانیت کا نب اٹھی ہے۔

نکاروں نے سماج کے ہر نظام کی عکاسی کی، قبائلی ادب بھی اپنے وقت کا ترقی پسند ادب تھا، جاگیر دارانہ ادب اور پھر سرمایہ دارانہ ادب بھی اپنے وقت کے نئے اور ترقی پسند ادب تھے، اب جبکہ زندگی نے ایک نئی کروٹ لی ہے ایک نیا نظام وجود میں آ گیا ہے ادب بھی اس نئے نظام کی عکاسی کے لئے آگے بڑھا ہے، اس وقت ادیب تاریخی قوتوں کا ساتھ کیوں نہیں؟

آج عوام سرمایہ دارانہ نظام ختم کر کے ایک ایسے نظام کو لانا چاہتے ہیں جہاں پیداوار کا موجودہ طریقہ بالکل فنا ہو جائے گا، طبقات

ختم ہو جائیں گے، انسان محنت کشوں کی سوسائٹی بنائیں گے، اجتماعی محبت اور طاقت پیدا ہوگی انسان کو کوئی ٹوٹ نہ سکے گا، تمام ذرائع پیداوار سماج کی ملکیت ہونگے قحط، بیماری، بے روزگاری، منافع کی ہوس اور وہ سبے سارے تاریک عناصر ختم ہو جائیں گے، زندگی کا مسدود بند ہوگا۔ بسھوں کے حقوق برابر ہوں گے، جسمانی اور دماغی محنت کشوں کی کشش ختم ہو جائے گی، غلامی ختم ہوگی، اسٹیٹ کلونی وجود نہ ہوگا، مادی فلسفہ سے انسان بے اثر اور کائنات کی صحیح حقیقت سمجھ سکے گا۔ عوام کی صلاحیتوں کو زندہ کیے گی، انسان، انسان کے خلاف جنگ نہ کرے گا، پیداواری قوتوں کی ترقی کوئی روک نہ سکے گا، عوام تعلیم یافتہ ہوں گے، شہر اور دیہات کا فرق مٹ جائے گا، سائنس کی ترقی رک نہ سکے گی، تمدن اور تہذیب کو حسن دینے کی جدوجہد ہوگی — سماج کتنا حسین ہو جائے گا!

اس دور کا ادب سرمایہ داری کی گندی سیاست کے خلاف ایک آواز ہے جس کے پس پردہ تعمیر کی حسین برہمیاں بھی موجود ہیں۔ ہرنے ہنگامے، انقلاب اور تغیر و سیاست سے نکار متاثر ہوتے ہیں، جس طرح دوسری جنگ عظیم کے طوفان عظیم نے فکاردوں کو متاثر کیا تھا اسی طرح اس جنگ کے دوران میں بنگال کے قحط نے ایک نیا ہنگامہ پیدا کر کے ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ فکاردوں کو زندگی کے اس ہنگامہ سے متاثر ہونا تھا۔ وہ اپنے معاشرتی اور سیاسی و اقتصادی ماحول سے مجبور تھے۔ چونکہ اس وقت ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اس لئے ہندوستان کی زندگی کے لئے یہ جنگ کوئی کشش نہ رکھتی تھی، حکومت جنگ میں شریک تھی، عوام نہیں، عوام کی نگاہوں میں انگریزی شہنشاہیت کی وہی حیثیت تھی جو نازیوں اور فاشسٹیوں کی تھی۔ جتنا سرمایہ داری کی سیاہ گلیروں کو خوفناک ساہیوں کی طرح دیکھ رہی تھی، ہندوستانی انگریزی حکومت سے نجات چاہتے تھے، ان کی حکومت انھیں براہِ ذکر رہی تھی اور اس جذبہ نے ایک عجیب صورت اختیار کر لی، نازیوں نے انگریزوں اور ان کے ساتھیوں کو جہاں شکست دی، وہ خوشی سے پھولے نہ سہائے، وہ سمجھتے تھے کہ ان کے دشمن کو شکست ہوئی۔ اور ایسی فضا میں فکاردوں نے جب سماج کی تصویریں پیش کیں تو وہ تصویریں ہو بہو یہی تھیں جو عوام کے جذبات تھے اور ہندوستان کے اس طبقہ کے یہی جذبات اور خیالات تھے جو بین الاقوامی محبت اور دوستی چاہتے تھے یا چین کا نظریہ انسان تھا۔ کرشن چندر نے ”بھوت“ اور ”خوبی“ کی تخلیق کی، علی سردار جعفری نے ”جنگ اور انقلاب“ لکھا، احمد عظیم قاسمی نے ”ہیر و شیا سے پہلے اور ہیر و شیا کے بعد“ میں ماحول کی حسین عکاسی کی۔ اور جوش ملیح آبادی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے فردزوں کے نام ”میں انگریزی شہنشاہیت کی ساری تاریخی تاریخ ایک گلیریں صحت کر دکھا دیں ان فکاردوں کا کارواں تھا جو مجبورِ جوش زندگی اور اس کے نصب العین کی جھلکیاں پیش کر رہا تھا۔

ہمارا گت بڑا ہی دلچسپ خواب تھا، جسے دیکھ کر ہمارے ادب خوشی سے بیتاب ہونے لگے اور اس مسرت میں جوش، جعفری، جذبی، نویم، مجاز، پریم دھون اور جہاں نثار آخر سبھی شریک تھے۔

لیکن زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ زندگی کی وہ رانیاں اسی طرح ہیں، کارخانوں کی مشینوں سے مزدور کی زندگی اُسی طرح لیٹی ہوئی ہے اور انھوں نے محسوس کیا کہ عوام کو آزادی نہیں ملی ہے، سرمایہ داروں کی آزادی کو زندگی دی گئی ہے، مزدوروں کی آزادی نہیں ملی، ان کی عورتیں، ان کے بچے ابھی تک غلام اور قیدی ہیں، فکاردوں کی زبان اور قلم کو آزادی نہیں ملی، برلا اور مصطفائی کی آزادی آئی تھی، کسانوں اور ادیبوں کی نہیں۔ انھیں اس کا احساس ہو گیا کہ جسے وہ نئی زندگی سمجھ رہے تھے وہ نئی زندگی نہ تھی۔

اُردو کے ادیب ابھی اس پر غور ہی کر رہے تھے کہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات اُبل پڑے۔ ہندوستان اور پاکستان میں خون کی ندیاں بہ گئیں، بزمِ عورتوں کے جلوس نکالے گئے، نئے بچوں کو قتل کیا گیا، بنگال جل گیا۔ ٹیکو اور نذر اللہ اسلام کے گیتوں کو آگ لگ گئی بہار بھولان ہو گیا۔ گوتم بدھ کا سفید حصہ ٹوٹ کر انسان کے خون میں لت پت ہو گیا۔ پنجاب براہِ بود ہو گیا۔ عمون اور تہذیب کو قباہ کر دیا گیا۔ ایسے وقت میں فکار خاموشی اختیار نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ وہ آگے بڑھے اور انھوں نے آزادی کے اس مدخل پر کھانی مام

دوا دیا گیا۔

جوش ملیح آبادی اپنے مخصوص طنز کے ساتھ بڑھے :-

جب تک کہ دم ہے مندو مسلم کے درمیاں ،
ہاں ہاں چھڑی رہے گی پورنہی جنگ بے اماں
اُٹھیں رہیں گی شام و سحر زیر آسمان
یہ چوٹیاں سروں کی یہ چہرے کی دائیہاں
ہاں ہوش میں قتال کا جتنی نہ آئے گا
جس وقت تک پلٹ کے فرنگی نہ آئے گا

کرشن چندر نے ”ہم وحشی ہیں“ کی تخلیق کی۔ یہ مجموعہ کرشن چندر کی زہری طنزوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں مظالم کی حقیقی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔

کرشن چندر اسی سلسلہ میں ایک ایسے کردار کی بھی تخلیق کرتا ہے جس کا نقطہ نظر انسان ہے، اس کا آرٹ اس میں بہت ہی بلند نظر آتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ فسادات کا سیلاب ہندو مسلمان اور سکھ بھون کو بہا لے جاسکتا ہے لیکن اللہ کے ساتھ انسانیت نہیں ہو سکتی کرشن چندر ایسے نازک موقع پر نہیں بہت، حوصلے اور ہندی دیتا ہے۔ ہمیں کامیابی نہیں نہیں مٹی مستقبل کی تصویر اس کے یہاں بڑی حسین ہے۔

خواجہ احمد عباس نے ”میں کون ہوں“ ”سردار جی“ اور ”اجنتا“ کی تخلیق کی۔ ”میں کون ہوں“ میں مرتد مشعل ہیں جن سے قریب کی امید زیادہ ہوتی ہے اور تمہارے کم !

”سردار جی“ میں عباس نے حیوانیت میں انسانیت ڈھونڈ نکالی ہے۔ متعصب مسلمانوں کے خیالات کا صحیح تجزیہ کیا ہے۔ عباس نے سکھوں اور مسلمانوں کو انسانیت کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ طنز کی نزاکتیں دیکھ کر عباس کے فن کی گہرائی کا احساس ہوتا ہے سردار جی فرقہ وارانہ فسادات میں زندگی کے حسین داستانوں کو روشن کر رہا ہے ایسے انسان کو دیکھ کر فسطائی قوتیں گھٹاتی نظر آتی ہیں ”اجنتا“ میں بھی اُسے بڑی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس کہانی میں عباس کا فن بڑی ہندی حاصل کر لیتا ہے۔

علی سردار جعفری، ”ہندوستان کے خزانہ قہیوں اور“ پاکستان کے مہاجرین“ کے نام ایک پیغام لیکر آیا اور ایک حسین نصاب حسین کی تصویر بھی لیکر عوام سے مخاطب ہوا۔

جعفری کو انسان کی عظمت کا پورا احساس ہے وہ انسان سے ایسے نہیں، وہ سمجھتا ہے کہ اس مخصوص مقام پر اگر انسان زندگی میں حسن پائے گا اور اسی وقت انسانیت مسکرائے گی۔

اس کے یہاں طنز کے ساتھ مل بھی ہے، جدوجہد بھی ہے، وہ سرمایہ داری کے چہرے کا نقاب اُتار دیتا ہے۔ ”اک عوام فسادات کی اصلیت سمجھ کر نصیب حسین کے لئے جدوجہد کریں۔ جعفری ایسے وقت میں عوام میں محبت پھیلانے آیا، نفرت نہیں اور یہ عنصر اُس کے آرٹ کو بڑی زندگی بخشی دیتا ہے۔

کیفی افسلی نے ملاحد جگہ کی تخلیق کی۔ اس شوقی میں ماحول کی سچی تصویر پیش کرنے کے بعد کیفی نے انسانیت کو ایک نئی راہ بھی دکھائی ہے۔ اس کی اس شوقی اگر ایک طرف فسادات کی تصویر ہے، تو دوسری طرف زندگی کو حسن دینے کے حسین ادا ہے بھی ہیں۔ کیفی کے پاس اتحاد و امن ہے، وہ جذبات کی دھم پیٹا نہیں۔ انسان کے مستقبل سے اُسے ایسی نہیں، وہ سمجھتا ہے کہ لکھ نیا نقاب طلوع ہو گا جو انسانیت کو آزادی کی روشنی سے لکے گا۔ کیفی عالمگیر قدمیں پیش کرنا چاہتا ہے۔

سرقہ، توارو، استفادہ

(مسلل)

اب تک تمام بحث صرف تخلیقی شاعری کے متعلق تھی جذباتی شاعری کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ فلسفہ علمی مسائل اور دیگر تخلیقی مضامین میں تو تمام شعرا کم و بیش یکساں ہیں لیکن وجدانیت اور واردات کا جہاں ایک تعلق ہے اس میں سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چونکہ شاعر خود فلسفہ اور وجدان دونوں سے کام لیتا ہے، اس لئے اس کے انکار بھی دو طرح کے ہوتے ہیں تخلیقی اور وارداتی تخلیقی شاعری کی بحث گزرنے والی ہے وارداتی شاعری شاعری ذاتی چیز ہے اس لئے اس سے استفادہ جائز نہیں ہے وہ سرقہ ہے اور انتہائی مذموم۔ ہمیں تسلیم ہے کہ دو آدمیوں کے حالات و فکرات میں بھی اتفاقاً توارو ہو جائے ممکن نہیں ہے مگر صرف اس امکان عقلی پر شاعری میں اس کو اتفاقاً توارو قرار دینا انصاف سے بعید ہے۔ سرچند اکثر مستند اور مسلم الثبوت اساتذہ فن کے یہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ جذباتی اور وارداتی مضامین میں دوسروں سے توارو ہوا ہے مگر ان مثالوں کو بھی اگر نظر غائر دیکھا جائے تو ان میں بھی قدرے اختلاف ضرور ملے گا۔ وارداتی شاعری میں یکسانی مضامین کے جو اشعار مختلف شعراء کے یہاں ملتے ہیں ان میں اکثر کوئی نہ کوئی مخصوص فرق ضرور ہے اور ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ صرف اسلوب بیان کی قدرت یا برجستگی کے باعث کسی شاعر نے دوسرے شاعر کا کوئی مصرعہ ترجمہ کر دیا یا اس سے صرف اس کے اسلوب کو لے لیا لیکن مضمون کے لحاظ سے ترجمہ بہت ہی کم کیا گیا ہے اور اگر کیا بھی گیا ہے تو اس میں کوئی ایسی دوسری خوبی ضرور موجود ہے جو اصل شعر میں نہ تھی اور اس کی وجہ یہی ہے کہ شعرا خود اس چیز کو محسوس کرتے تھے کہ کچھ واردات سے متعلق ہے اس میں ترجمہ یا استفادہ سرقہ ہے کیونکہ ہر شاعر کی انفرادیت قطعاً اس کے وجدان پر منحصر ہے۔ اگر وہ وجدانیت و جذبات میں بھی دوسرے سے استفادہ کرنے لگے تو اس کی انفرادیت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک ایسی چیز کے صحیح خط و خال واضح کر سکے جس کو اُس نے کبھی ایک بار محسوس نہ کیا ہو۔ اور ایک شاعر محض نادانستہ طور پر کسی جذبہ کو پیش کر کے اس میں اصلی جوش و اثر کو گمراہ کر سکتا ہے۔ اکثر بعض صوفیاء کے کلام میں جو غیر معمولی جوش اثر پایا جاتا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ وہ صاحب کیفیت و حال تھے اور کچھ کہتے تھے وہ ان کی اپنی روئداد ہوتی تھی۔ شیخ بوعلی سینا نے بعض دقیق فلسفی مسائل حضرت سلطان ابوسعید انصاری کے سامنے بیان کئے تو حضرت سلطان نے فرمایا ”اچھا میرا فی حق یہیم“ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن بزرگوں کے کلام میں اثر ہونے کی وجہ کیا ہے۔

شاعر مختلف احوال و کیفیات کی جو تصویریں پیش کرتا ہے وہ دراصل اس کے اپنے احساسات و تصورات کے خاکے ہوتے ہیں اور ان خاکوں کو وہ شاعرانہ صنعت کے ذریعہ سے اس طرح منظم و پھیلاتا ہے کہ وہ تمام شعبے والوں کی اپنی روئداد بن جاتی ہے۔ خالقانی جب مدائن کے گھنڈوں سے گزرتا تو خود اس کے قلب و دماغ پر اُس تباہی، بربادی اور ویرانی کے عجائبات مرتب ہوئے اُس نے ان کو خود گھنڈوں کی زبان سے

کہا ہوا ایک :-
 نہ تو صبح چند الحق ماہم بد دوسر
 از دیدہ گلاب کن و در دوسرا نشان
 آہے چہ صبح دلای کا نہ دیر چہ گیتی
 چند ست ہے قبل نومست ہے امان
 ماہم کہ ماہم این رخت ستم بر ما
 بر صر ستار اں آیا چہ رسد خذلان

اسی طرح میر تقی میر کے اس قطعہ میں صرف ایک بے جان کا سہ سر کی زبان سے جو کچھ کہلایا گیا ہے وہ دراصل تیر کے اپنے احساس و تصور کا ایک خاکہ ہے :-

کل پاؤں ایک کا سہ سر پہ جو آگیا یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل رہا ہے خبر میں بھی کبھو کبھو کا سر پر عذر تھا

شاعر چکر زیادہ حساس ہوتا ہے اس لئے وہ زیادہ گہرائی میں جا کر مطالعہ کرتا ہے اور اسی کو بیان کر دیتا ہے لیکن اس کا یہ بیان اس وقت کا ہوتا ہے جب وہ تاثر گزر چکا ہو اور وہ حافضہ کی مدد سے اپنے اس تصور کو پھر سامنے لا کر کھڑا کرے کیونکہ علم النفس میں اس مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا گیا ہے کہ کسی شخص کے لئے بھی مطالعہ باطنی (Intuitive) ممکن نہیں ہے یعنی جو حالت تاثر کسی انسان کی ایک واقعہ کے وقوع کے وقت ہوتی ہے وہ اس کو شعوری طور پر محسوس نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ اس کے تاثر سے اتنا متغلب ہوتا ہے کہ اس کو سوچنا اس وقت اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے اور اس تاثر کے گزر جانے کے بعد وہ اس تاثر کا تجزیہ کرنے پر قادر ہو سکتا ہے بلکہ یاد ماضی (Reminiscence) کہتے ہیں، اس لئے جذباتی شاعری کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جس جذبہ کی عکاسی شاعر کرتا ہے وہ تاثر عقل و حافضہ کی مدد سے ہوتی ہے۔ اگر نثری شاعر در دس درجہ ہوتا ہے: *Recall to emotion* بلکہ نثری شاعر *Recall to emotion* شعرائے ہند کو کہتے ہیں جن کو بکثرت سکون و خاموشی میں دوبارہ تازہ کیا جائے اس اعتبار سے شاعری خالص عکاسی کا نام ہے لیکن دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ عکاسی کرنے والے کے پاس قلب و دماغ کتنا بلند و حساس ہے اس لحاظ سے اگر کوئی شاعر دوسرے کے احساسات کو خود بیان کرنے لگے تو گویا خود ہی اعتراف کر رہا ہے کہ وہ اس تمام صلاحیت سے قطعاً عاری ہے جو شاعر کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ یعنی ایک منظر دیکھ کر اس سے متاثر ہونے کی قابلیت - کسی تاثر سے گزر جانے کے بعد اس کو اپنے حافضہ میں بیدار کر کے بیان کرنے کی اہلیت اور جو کچھ اس کو صرف تصور میں نظر آ رہا ہے اس کو الفاظ کی محسوس شکل میں بیان کر دینے کی قوت۔ لیکن یہ زیادہ بیان صرف اُس وقت اور اُس حالت کے لئے ہے جب کوئی شاعر اپنے قصد و ارادہ سے شعر کہتا ہے لیکن اس حالت کے علاوہ اور اس سے بہت زیادہ بلند اور ارفع و اعلا وہ حالت ہے جب ایک شخص بالکل جذبات سے متغلب ہو اور اس کے اپنے احساسات بے اختیار شعری شکل اختیار کر لیں۔ اس وقت بالکل غیر شعوری طور پر اس کا وہ اندرونی اور پوشیدہ شاعر بیدار ہو جاتا ہے جو اس کو اپنے ہی پیچھے دوسرے انسانوں سے ممتاز کر دینے کا ضامن ہوتا ہے اور اس حالت میں وہ شعر کہتا ہے جو قطعاً اس کی اپنی واردات ہوتی ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہوتا کسی سے سرقہ یا استفادہ کا سوال پیدا ہوتا ہے، یہی ہے وہ شاعری جو دل کی زبان اور جذبات کی صحیح اور سچی ترجمانی کہی جاتی ہے۔ یہی ہے ہماری شاعری کا وہ جزو جو انسانوں کے نہیں قوموں کے مزاج اور اخلاق میں انقلاب پیدا کر دیا کرتا ہے۔ اس قسم کی شاعری کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے مصنوعی مٹکانے سے پاک ہوتی ہے۔ اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ شعر کے لئے 'آہ' اور 'آورد' کی دو خصوصیات کے اعتبار سے جو تقسیم کی گئی ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے اور سرقہ اور استفادہ کی بحث میں اس کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ تخلیقی شاعری میں آدم کا سوال صرف اس حد تک قابل غور ہے کہ شعری بندش میں ایسی غیر معمولی برستگی ہو کہ سننے والے کی طبیعت کو اپنی طرف کھینچ لے۔ مثلاً فردوسی شاہنامہ میں رستم اور سپہرب کی داستان شروع کرتے ہوئے کہتا ہے کہ :-

کنول جنگ سہراب و رستم شنو دگر با شنیدستی این ہم شنو

دوسرا مصرعہ معلوم ہوتا ہے کہ یک دم شاعر کے قلب پر نازل ہوا ہے یا مولانا نظامی سکندر نامہ میں وہ خط پیش کرتے ہیں جو سکندر نے دارا کو لکھا ہے اور اس میں اپنی فتوحات وغیرہ کا بیان کیا ہے کہ،

بیک تا محنت تا کجا تا خستم چہ گرد دل کشاں را سرا تا خستم

کے ایک دماغی و ذہنی تکیاں موجود ہوتی ہے اور کہیں احساس غم و فکر میں بھی ذہنی ظہور دماغی عظمت ضائع نہیں ہوتی۔ اسی طرح تمام دوسرے جذبات کیفیات اور احساسات کی حالت ہے۔ خوشی کا کام دماغی انبساط پیدا کرتا ہے اور غم و فکر کا ذہنی انحصار پیدا کرتا ہے۔ ان بلاشبہ غم و فساد والی اپنے مقررہ فرائض ضرور انجام دیتے ہیں لیکن اللہ بیرونی محرکات کے علاوہ ایک کیفیت خود دماغ کی بھی ہوتی ہے کہ وہ خود کسی بیرونی محرک یا عمل سے کتنا اور کس حد تک متاثر ہونے کے لئے آمادہ ہے۔ علمائے نفسیات میں سے اکثر اصحاب اس امر پر متفق ہیں کہ خوشی کا وجود بغیر غم کے یا لذت کا وجود بغیر الم کے ناممکن ہے کیونکہ لذت و خوشی اور تہاج و شاد دماغی اعصاب میں ایک طرح کے یکجان کا ہی دوسرا نام ہے اور اس یکجان واضطراب کے بعد تکیاں کا محسوس ہونا لازمی ہے اور اسی کا نام نفسیات کی اصطلاح میں غم و انحصار ہے اس وجہ سے تمام جذبات کے وجود کو صرف اعتدالی سمجھنا چاہئے کہ ان کا حقیقی وجود اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ایک انسان دماغ کسی ایک حالت سے متاثر ہونے کے لئے کس حد تک طیار ہے۔ تمام ذہنی تغیرات ہر شخص پر طاری ہوتے رہتے ہیں اور کوئی انسان اس سے بری نہیں ہو سکتا۔ شاعر بھی آخر انسان ہی ہوتے ہیں ان کے دماغ پر بھی علو و سفلت، جوش و انحصار کے وہ تمام مراح و احوال گزرتے رہتے ہیں جو دوسرے انسانوں پر گزرتے ہیں اور جب دماغ علو و عظمت کی طرف مائل ہوتا ہے تو مضنون میں ہمت۔ بندش میں جستی اور مجموعی طور پر شعریں جوش پیدا ہو جاتا ہے اور ایک پامال سے پامال مضنون میں بھی شاعر کوئی نہ کوئی ایسی چیز ضرور کہہ جاتا ہے جو اس کی اس دماغی حالت کا پتہ دیتی ہے۔ اس کے برعکس جب دماغ میں تکیاں موجود ہوں تو صاحب قدرت شعر بھی جو اشعار کہتے ہیں وہ محض کثرت مشق و مزاحمت کا نتیجہ ہوتے ہیں جس میں صرت تنوع نظر آتا ہے اور اس۔ ان اشعار میں مضامین بھی دیہی ہوتے ہیں جو پہلے لوگ کہہ گئے ہیں۔

جب یہ اثر تسلیم ہے کہ شاعر جو کچھ بھی کہتا ہے وہ اپنی اس روئداد کو جو اس پر گزر گئی ہے از سر نو دماغ میں قائم کرنے کے بعد کہتا ہے اور وہ اُس واقعہ کے وقت کے تمام و کمال تاثرات نہیں ہوتے بلکہ ایک گزری ہوئی حالت کو دماغ جس قدر بھی یاد کر سکتا ہے وہ ہوتی ہے تو یہ ظاہر ہے کہ ایک واقعہ کے ورود کے وقت ممکن ہے کہ انسان بالکل بہت مضمحل۔ افسردہ اور دل شکستہ ہو کر رہ گیا ہو مگر جس وقت وہ شعر کو کہہ رہا ہے اس وقت اس حالت کا باقی رہنا لازمی اور ضروری نہیں ہے اور اسی طرح اس کے برعکس حالت ہے کہ خوشی و شاد دماغی میں ممکن ہے کہ ایک شخص نہایت جوش و خروش اپنے اندر پاتا ہو مگر اس حالت کے گزر جانے کے بعد جب وہ اس کو یاد کر کے بیان کرنا چاہے تو وہ تمام ذہنی انبساط ختم ہو چکا ہو۔ یہ تلقی تیرے بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کی ایک صاحبزادی تھیں اور ان کی شادی میں میر صاحب نے بارہ دماغی مشکلات کے کافی حوصلہ مندی سے کام لیا۔ لیکن وہ شادی کے فوراً ہی بعد طویل ہوئیں اور تھکا کر گئیں۔ میر صاحب کو اس سے جو کچھ بھی صدرہ ہوا ہو گا تخلیق بیان نہیں۔ اُسی حالت میں شعر کہتے ہیں کہ:

اب آیا یاد اسے آرام جان اس نامرادی میں کفن دینا تمہیں بھولے تھے ہم اسباب شادی میں

یہ شعر درد اثر اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے اور مضنون بھی نہایت درد خیزہ مگر دماغی دہم میں جو ذہنی انحصار پیدا ہو جاتا ضروری ہے اس کے بجائے جوش نظر آ رہا ہے۔ فیضی کا ایک خود سال بچہ مر گیا اور اس کو اس کا جدِ سرخ تھا۔ اس کا مرقبہ پڑا ہی درد خیز لکھا ہے۔ تین شعر حسنِ قیاس، غزل، غزل

اسے روشنی دیدہ روشن چلوئے مس ہے تو تیرہ روز تو بے مس چلوئے

ماتم سراست خانہ مس در فراق تو تو زیر خاک ساختہ مسکن چلوئے

برخار و خس کہ بسترو بالیں خواب تست اسے یاسمین عذار سخن تن چلوئے

کیا ان اشعار میں شاعر کے دماغی انحصار کا کہیں پتہ چلتا ہے؟ اس کے برعکس وہ جوش صاف نظر آ رہا ہے جو ہر تخلیق ہو کر کرتا ہے۔ سخن خان نے اپنی مجموعہ کا ایک بہت ہی طویل طویل مرقبہ لکھا ہے جو ان کی کہانیاں میں موجود ہے۔ یہ شاعری کے پیش کرتے ہیں جو سکر ہے اور کم از کم اردو شاعری میں تو اس کا جواب شکل ہی سے مل سکے گا۔ تقریباً ہر شعر میں غم و غصہ کی جھلک نمایاں ہے مگر کہیں بھی وہ ذہنی انحصار و افسردگی نظر نہیں آتی جو غم و الم کے باعث پیدا ہو جاتا ضروری تھی۔ بلکہ اس کے بجائے

نیاں ہے وحدت اور تخلیق کے لئے ضروری ہے۔ حادث سے غائب مہذب کو کس قدر اغت تھی اور عین عالم جلیلی میں الی کے انتقال کر جانے سے غائب کو نکال کر جو امتحان الی کے تمام سوانح نگار اس کو بیان کر رہے ہیں مگر جب غائب نے حادث کا ریشہ لکھا تو اس میں باوجود تمام غم و الم کے ذہنی جوش اور دماغی پیداویں ہی کا ثبوت ملتا ہے۔

تیرہ فیصدی۔ موقوف اور غائب پر الی واقعات کے پیش آنے کے وقت ضرور وہ حالت طاری ہوئی ہوگی جس سے دماغی اضمحلال پیدا ہو جائے مگر جب وہ اپنے اپنے مرثیے لکھنے بیٹھے تو دماغ کی حالت بالکل دوسری ہو چکی تھی اور وہ ایک بالکل دوسرے قسم کے احساس میں گھر چکے تھے۔ جس طرح مضامین غم و الم کے بیان کرتے وقت بھی الی شعرا کا دماغی جوش موجود تھا اسی طرح خود جوش کے مضامین بیان کرتے وقت ممکن ہے کہ دماغ میں اضمحلال پیدا ہو چکا ہو اور شعراء رسم قدیم کی پابندی و اتباع سے آگے کچھ بھی نہ ہو سکے۔ کیونکہ دماغی نکات کے ساتھ وہ ذہنی فہم و جوش جمع نہیں ہو سکتے جو مضمون میں حاجت اور بندگی پیدا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ہماری شاعری کا جس قدر حصہ بھی اس رسمی شاعری کے طرز پر ہے اس میں مضامین کی یکسانیت کے باعث قارئین اکثر وحسوک میں پڑ گئے۔ حالانکہ اس حصہ میں وہ حقیقی شاعر خود ہی سرے سے مفقود ہوتا ہے جو اس کو اپنے دوسرے ہم مشرب انسانوں سے ممتاز کرنے کا ضامن ہوتا ہے۔ اس رسمی شاعر کا ایک حصہ تو وہ ہوتا ہے جس میں چند مباحث ہیں جو شعراء سابق سے ورثہ اور ترک کے طور پر شعراء مابعد کے حصہ میں آتے ہیں اور ان کو مختلف نوعیتوں اور ترکیبوں سے شعراء مابعد نے اپنے اپنے طور پر کہا ہے۔ مثلاً حسن۔ عشق۔ ہجر۔ وصال۔ جدائی۔ دواغ محبوب۔ فنا۔ بقا وغیرہ وغیرہ۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں حقیقتاً شعراء سابق سے کسی مخصوص حصہ میں استفادہ کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ کی حالت یہ ہے کہ الی میں سے کسی مبحث پر شعر کہتے وقت لکھ دماغ نکال سے آزاد نہیں ہے تو شعر میں جدت اور بندگی ہرگز نہیں ہو سکتی اور چونکہ الی میں سے ہر مضمون پر لکھوں کی تعدادیں اشعار کچھ جا چکے ہیں اس لئے دانستہ یا نادانستہ کسی پہلے شعر سے تھوڑا بہت قوارد ضرور بند چائے گا۔

اس کے برعکس، دوسری حالت وہ ہے جب دماغ وقت و عظمت کی طرف مائل ہو اور ذہنی جوش موجود ہو اس حالت میں کوئی نہ کوئی جزو ضرور شعر میں ایسا ہو گا جو شعر کو سرقہ کی حد سے نکال کر ادراع کے ذیل میں لے آئے۔ دوسرے حصہ کی حالت اس سے مختلف ہے کیونکہ شعراء سابق کے اشعار میں سے جن مخصوص اشعار کو سامنے رکھ کر شعراء مابعد نے طبع آزمائی کی ہے ان کی یہ حالت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ان مضامین میں ان شعراء کے لئے ایسی کشش موجود تھی کہ انھیں شعر کہنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے اور جب اس طرح کا جذبہ کسی پر طاری ہو جائے تو اس کی ناقذانہ صلاحیت بہت کچھ گروہ و ہوجاتی ہے اور اس کے لئے یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ جو کچھ کہ رہا ہے وہ پہلے شعر سے بڑھ گیا یا نہیں۔ حضرت امیر خسرو کا شعر ہے:-

گر شمع چند گنی بر من آخر این جان ست نمی دوز زمین و ” صبا نمی آرد“

حضرت امیر کے تین سو برس بعد ابی شیرازی نے اس شعر میں اصلاح دینے کی کوشش کی ہے کہ:-

گر شمع چند گنی بر من آخر این جان ست نمی دوز زمین ” آسمان نمی باد“

وہ حضرت امیر نے جو ” صبا نمی آرد“ کہا ہے تو اس سے ان کا معنی ہے کہ وہ گھاس کوٹا، پتہ وغیرہ ہوتے ہیں جن کی کوئی قدر کسی طرح ہوتی ہذا رہی اور ہوا ان کو ہر طرف اڑائے اڑائے پھرتی ہے تو میری جان کو بھی جان بوجھ نہ یہ خود رو گھاس ہو نہ وہ گرد و اوبہ جتن کو ہوا اڑا کر ایک بڑیرہ تمام فکری جگہ پہنچا دے اور اس سے ان کا مطلب اپنے لئے محبوب کی انتہائی بے اتفاقی کا اظہار ہے کہ وہ ادا داتا زوانانہ کے وقت اسکو میں علم نفس یہ کہنا ہے کہ میرے دل و جان کی کیا حالت ہوئی جاتی ہے۔ اس مضمون میں ابی شیرازی نے جو تبدیلی کی کہ ” آسمان نمی باد“ تو اس سے بہت مضبوطی اور ہوسکا۔ سوائے اس کے کہ زمین کے مقابلہ میں آسمان آگیا لیکن حضرت امیر نے جان بوجھ کر اس کی قدری دکھائی ہے وہ الی احساس پیدا ہو گا کہ اس قدر شدت سے نظر آ رہی ہے اور ” آسمان نمی باد“ میں اس کے عشر عشیر بھی نہیں، ابی صاحب طرز شعرا میں سے ہے اور ضبط تحریر میں لا بہت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر حضرت امیر کا شعر ٹھہر کر اس کا ذہن صرف زمین و آسمان کے مقابلہ میں الجھ کر

روگیا اور پوری ناقوانہ بصیرت سے وہ اُس مضمون کا احاطہ کر سکا جو حضرت امیر نے کہا ہے۔ ورنہ اس کو ایک مبتدی بھی محسوس کر سکتا ہے کہ ”آسمان بھی بارد“ کے مقابلہ میں ”صبا بھی آرد“ میں کہیں زیادہ حسرت ہے۔ اس ایک مثال ہی سے داغ کی اُس کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں، مولانا جاتی کا شعر ہے :-

میل خم ابروئے توام پشت دوتا کرد
در شہر چو ماہ نوم انگشت نما کرد
حزین نے مولانا کو اصلاح دینا پایا ہے کہ :-

”بارغم عشق“ تو مرا پشت دوتا کرد
در شہر چو ماہ نوم انگشت نما کرد

مولانا جاتی نے ”میل خم ابرو“ کا لفظ کہا ہے اُس سے مراد خود ”بارغم عشق“ ہے اور اس میں اگلے شعر کے ”ماہ نوم“ کی رعایت بھی موجود ہے۔ جس سے شعر میں ایک شکستگی پیدا ہو گئی ہے۔ حزیں کا ذہن اس طرف گیا کہ کمر کے خم ہو جانے کے لئے کسی بار کی ضرورت ہے اور وہ واضح الفاظ میں ہونا چاہئے۔ حالانکہ مولانا جاتی کے ”میل“ میں بھی الفاظ ”بارغم عشق“ پر ہی موجود ہے مگر حزیں اس اطلاق سے مطمئن نہیں ہوتا اور مولانا کے شعر میں اصلاح دیتا ہے حالانکہ مولانا کے شعر میں جو ”ماہ نو“ کی رعایت تھی وہ بالکل ظاہر ہے مگر حزیں ایک تصور میں اتنا ڈوب گیا کہ مولانا کے خیال اور تصور کو بالکل نظر انداز کرنے پر مجبور ہو گیا اگر زیادہ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حزیں مولانا کے اصل مفہوم ہی کا احاطہ نہ کر سکا۔ کیونکہ مولانا کا مقصد یہ ہے کہ ”میل خم ابرو“ میری ذات میں اس طرح سما گیا کہ خود میرے اندر وہی صفت پیدا ہو گئی اور اس کو ہر شخص محسوس کرتا ہے اب حزیں کے شعر کو دیکھئے تو بارغم عشق کو ماہ نو سے کوئی مناسبت نہیں ہے اور الفاظ کے اس معمولی سے تغیر سے مولانا کا اصل مفہوم ہی فوت ہو گیا۔ صرف کمر کے خم ہونے کے لئے ایک ”بار“ تو ضرور مل گیا، مگر شعر آسمان سے زمین پر آ رہا حزیں کی شاعرانہ عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے مگر وہ بھی شاعر ہونے کے ساتھ ہی انسان بھی تھا اور انسانی داغ کی جو مختلف حالتیں مختلف اوقات میں ہوتی ہیں وہی اس پر بھی گزرتی تھیں۔

ایک مصنف یا شاعر کے لئے سب سے زیادہ مشکل کام خود اپنے کلام کی تنقید ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ داغ ایک مسئلہ میں صرف ایک پہلو کو سوچ سکتا ہے۔ کسی مسئلہ کے تمام اور مختلف زاویے ہائے فکر و نظر کا احاطہ کر لیتا بیک وقت کسی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے اور اس کا سبب تا مگر یہی ہے کہ اپنے خیال اور دماغی رجحان کے لئے اس کے اندر ایک طرح کا غیر شعوری تعصب پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی قوت تنقید کو بڑی حد تک ضعیف کر دیتا ہے جو حال الہی شیرازی اور شیخ علی حزیں کا تذکرہ اشعار کہتے وقت ہوا شیخ بوعلی سینا جیسا فلسفی اور حکیم بھی اسی چیز کا شکار ہو گیا جب حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر سے طاعت و معصیت کی گفتگو کرتے ہوئے حسب ذیل راجی اس نے پڑھی :-

ما یم بعفو تو تولّا کردہ
وز طاعت و معصیت تبرّا کردہ

آنجا کہ عنایت تو باشد باشد
نا کردہ چو کردہ چوں نا کردہ

مگر حضرت سلطان نے فوراً اس کا جواب دیا کہ :-

اے نیک نہ کردہ وہ پہا کردہ
و انکا ہ بعفو حق تولّا کردہ

بر عفو کن تمکین کہ ہرگز نہ بود
نا کردہ چو کردہ چوں نا کردہ

بالکل ظاہر ہے کہ راجی کہتے وقت بوعلی سینا کے داغ پر صحت و اثر تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و کرم پر بھروسہ کر لینا ہی بالکل کافی ہے غم ہمارے اعمال حسنہ و سیئہ سب بے اثر ہیں۔ بوعلی سینا کے مرتبہ کے فلسفی سے ہرگز یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس قدر غیر فلسفی بات کہتا اور انسان اور اس کے اعمال کو اس قدر یکساں بے اثر اور بیچ تصور کرنے کی جرأت کرتا مگر وہ اس وقت رحمت الہی کے تصور میں غرق تھا اور اسکے مقابلہ میں اُسے ہر چیز بیچ اور بے حقیقت نظر آئے گی۔ اور وہی مضمون بے اختیار اس کی زبان سے ٹپک پڑا۔ ایک

تصور میں غرق ہو جانے کے بعد قوت تنقید کے ضمنت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت درکار ہے۔

غالب نے وہ کام کیا ہے جو لاکھوں شعرا میں صرف چند کر سکتے ہیں کہ خود اپنے اشعار کو دیوان سے چھانٹ کر کم کر دیا اور اس کے لئے جس قسم کی صلاحیت۔ قابلیت اور بہت کی ضرورت ہے وہ بہت کم لوگوں میں ہوا کرتی ہے۔ اس سے غالب کی قوت تنقید کا ایک گراں قدر ثبوت ملتا ہے، نیز مولانا حالی نے یادگار غالب میں ذوق، سوز اور حتیٰ کہ داغ کے وہ اشعار لکھے ہیں جن پر غالب مرحوم وجد کیا کرتے تھے یہ ان کی بے تعصبی اور قوت تنقید کا دوسرا اہم ثبوت ہے مگر شہزادہ جواں جنت کا سہرا لکھنے بیٹھے تو اپنے سہرے کے اشعار سے خود اتنے متاثر ہوئے کہ مقطع میں بے اختیار پکار اٹھے کہ:-

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں، دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا
کس قدر عجیب بات ہے کہ اپنے ہم عصر شعرا کو دوسرے مصرعہ میں کتنی جرأت سے دعوے متبادلہ دی ہے۔ حالانکہ دنیا کا کوئی انسان کسی قوت بھی یہ دعوے کرنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ ہمہ جہت مکمل ہے یا اس پر اضافہ کی اب کوئی گنجائش نہیں ہے اور غالب جیسا فلسفی اور فکر سرگز اس معمولی سی بات سے ناواقف نہیں ہو سکتا مگر اپنے سہرے کے اشعار سے خود اتنا متاثر ہو گیا کہ قوت تنقید بالکل غیر شعوری طور پر اس حد تک ضعیف ہو گئی کہ وہ ایسا دعوے کر گیا اور پھر ذوق کے سہرے کے جواب میں معذرت لکھنا چاہی ان مثالوں سے قوت تنقید کا ضمنت ظاہر ہے اور اس پر ادب کچھ اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان اشعار کے علاوہ ایک دوسری قسم وہ ہے جس میں شعرا نے سابق کے مضامین میں شعرا نے ماہر نے اضافہ کیا ہے۔ ان کو اکثر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان اشعار کے کہنے والے شعرا اپنے سے پہلے شاعر کے مضمون سے متاثر نہیں ہوئے ہیں بلکہ انھوں نے اس کی خامی کو محسوس کر کے اس کو دفع کرنے کی کوشش کی ہے اور ان دونوں حالتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسکی مثالیں 'اضافہ' اور 'اختلاف' کے ذیل میں ہم آگے درج کریں گے۔

شعر کہتے وقت شاعر پر جو اور جس قسم کے حالات و جذبات طاری ہوتے ہیں ان کو لوگوں نے بالکل نظر انداز کر دیا اور صرف اس دھوکہ میں پڑ گئے کہ یہ مضمون سرقہ کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ سوج کی روشنی، بھول کی جھلک اور سوز کی آواز کا کوئی کیسے سرقہ کر سکتا ہے جو شعری نے کہہ دیا اور وہ مشہور ہو گیا اب اس کا سرقہ کرنا کس طرح ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص قدامت کے کلام سے "الرجح کا سرقہ کرے تو دھچپ کیونکر سکتا ہے اور یہ سرقہ ایسا ہی ہوگا جس کے لئے خواجہ حافظ کہ گئے ہیں کہ: "چہ دلا اور است دزدے کہ بہت چہ داغ دارد" علامہ شبلی اور میر تقی میر فقیر نے جو مثالیں سرقہ کی پیش کی ہیں وہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں اگر ان کو سرقہ سمجھ لیا جائے تو یہ ظاہر ہے کہ وہ سرقہ کرنے والے سخت احمق تھے کہ عربی اور فارسی شعرا کا کلام شایع ہو چکا ہے اور پھر اس میں سے مضمون چرا رہے ہیں گویا ایسی چوری کر رہے ہیں جولا محالہ ظاہر ہو کر رہے گی اور ہم ان بزرگوں کو عقل و اخلاق سے اتنا عاری تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

سطور بالا میں شاعر کی اس ذہنی کیفیت کا ایک محل خاک موجود ہے جو اس پر شعر کہتے وقت طاری ہوتی ہے لیکن ہمارے ناقدین نے اس تمام کیفیت اور حالت کی نفسیاتی تحلیل اجراء کرنے کی زحمت گوارا نہ کی اور جب کوئی متوارد مضمون ان کی نظر پڑا اس کو انھوں نے سرقہ کے ضمن میں شمار کر لیا۔ یہ غلطی پونہی رواج پاتی تھی اور کسی نے اس کی تصحیح نہ کی۔ ان کے اس تسامح کا سبب بڑا ثبوت یہ ہے کہ متوارد مضامین و اشعار کی انکے یہاں صرف دو ہی اقسام ہیں بالقد سرقہ یا اتفاقیہ توارد۔ لیکن صاحب قدرت شعرا نے جب محو کھلے لفظوں میں دوسروں سے استفادہ کرنے کا اعتراف کیا تو اس کی یہ کوئی توجیہ نہ کر سکے۔ نہ اس کے لئے کوئی علیحدہ قسم تسلیم کی ہم سرقہ کی تمام اقسام حدائق البلاغت سے نقل کر چکے ہیں۔ ان کی تمام تعریفیں خود ان ہی کے الفاظ میں پڑھ جائیے، کہیں بھی نفسیات کو کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے صرف لفظ معنی کی بحث میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ شاعری میں مختلف قسم کے مباحث میں سے سرقہ توارد وغیرہ کی بحث اس اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ہے کہ شاعر کی دماغی کیفیت اور نفسیاتی حالت کا اندازہ کرنے کا موقع سب سے زیادہ

مصرعہ میں اختصار کلام کو اختیار کرتا پڑا۔ غالب کو جو اعتراض ہے اس کے ثبوت میں وہ ایک اصول عام پیش کرتا ہے اور اپنی ذات کے علاوہ بھی صحیح اصول کا نفاذ کائنات میں محسوس کرتا ہے کہ: ”دیتے ہیں بارہ غزل قندے خوار دیکھ کر یہ۔“ فانی یا سیات کا اہم ہے اس لئے اس میں قنوطیت بدرجہ اتم موجود ہے اور وہ کسی اصول عام کو محسوس نہیں کرتا۔ اس کی قنوطیت اس مضمون کو اس کی ذات سے متعلق کر کے اس میں بھی اس کا پہلو نمایاں کر دیتی ہے کہ۔ ”دل ہی مگاہ ناز کا ایک اداسناں ستا۔“ غالب کا انداز بیان ایسا ہے کہ اس کو اپنے خیال کی صحت اور سچائی پر یقین معلوم ہوتا ہے مگر فانی کے جہاں اس یقین کے بجائے شک سا نظر آ رہا ہے جو اس و قنوطیت کا لازمی اثر ہے۔ فانی چونکہ غالب کے صرف پہلے مصرعہ کے مضمون سے ہی متاثر ہوا ہے اس لئے اسی کی تفصیل و تشریح کرنے لگا۔ دوسرے مصرعہ کے مضمون کی نزاکت اور افادیت اس ناثر نے اس کی نظروں سے چھپا دی۔ غالب کا یہی شعر جب جگر کے سامنے آتا ہے تو اس پر فانی سے بالکل مختلف اثر پیدا کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ:-

جس کا جتنا نظرت ہے اس سے سوا ملتا نہیں جلدو ساقی بقدر رحمت مراد ہے

جگر غالب کے شعر کے صرف دوسرے مصرعہ سے متاثر ہوئے اور جس طرح فانی نے غالب کے پہلے مصرعہ کی تفصیل کر ڈالی تھی، جگر دوسرے مصرعہ کی تشریح کی طرف متوجہ ہو گیا۔ غالب کو اعتراض تھا کہ برق تجلی ہمیدہ کرنے کے بجائے طور پر کیوں کر لائی گئی۔

جگر طور اور تجلی طور کا ذکر بالکل حذت کر دیتا ہے اور بارہ دظرت قدح خوار سے اس کا ذہن جلدو ساقی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ غالب نے اس اصول کو تسلیم کر لیا تھا کہ اس دنیا میں شراب ظن قدح خوار کا لحاظ کر کے دی جاتی ہے۔ جگر اس اصول کو پہلے مصرعہ میں غالب کی نسبت واضح تر اپنا ظاہر کہہ دینے کے بعد صاحب تجلی پر اعتراض کے بجائے اس میں بھی اسی اصول کو نافذ دیکھتا ہے کہ ساقی کی تجلیات تو وہی ہیں مگر ہر شخص اپنی ہمت اور استعداد کے مطابق اس سے مستفید ہوتا ہے۔

شیخ علی حزیں کا شعر ہے:-

از دوست بگوین نگر دیم تسلی، این ہر دو بدست دگفت افسوس ہماں ست

یہ مسئلہ ہے کہ یہ کل کائنات انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے مگر انسان کی تسلی خاطر کے لئے یہ بھی کافی نہیں ہے۔ انسان کے بلند حوصلہ کو حزیں بیان کرتا چاہتا ہے اور اس سے زیادہ بلند طریقہ اس بیان کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے۔ مصرعہ ثانی کو غور کرتا چاہئے کہ:-

”این ہر دو بدست دگفت افسوس ہماں است“ مولوی رضا علی صاحب وحشت نے حزیں کے اس شعر کو غالب کے اس شعر کے ساتھ ارج کیا ہے کہ:-

دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا یاں آپڑی یہ شرم کہ نگرار کیا کریں

غالب کے اس شعر کے لئے مولانا حالی یا دگا غالب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”اپنی فراخوصلگی اور اس کے ساتھ شرافت نفس کا اظہار کیا ہے یعنی میرا جو دونوں جہاں پاکر خاموش ہو رہا تو اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں اس پر قانع ہو گیا بلکہ مجھ کو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے کا شرم آئی اس لئے خاموشی اختیار کی۔“ غالب کا مضمون حالانکہ بلند ہے مگر حزیں کا شعر جس پایہ کا ہے غالب وہاں تک نہیں پہنچ سکا۔ حزیں کے دوسرے مصرعہ کی بلندی اور بندش کی غیر معمولی چستی تو خاص طور پر قابل غور ہے۔ ”دگفت افسوس ہماں است“ کا شرم سے تکرار نہ کرنے، میرا بہت فرق ہے۔ حزیں نے اسی مضمون کو ایک اور شعر میں دوسرے پیرائے سے کہا ہے:-

در عشق دل از کوثر و رضواں چہ کشاید از دوست تسلی متوال گشت بہ اینہا

بلکہ مضمون پہلے شعر میں ہے یہ اس تک نہیں پہنچتا۔ جو مضمون اس شعر میں کہا گیا ہے وہ پہلے شعر کے صرف مصرعہ اوّل میں آگیا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ یہاں صرف جنت اور اس کے لوازم کا ذکر ہے اور پہلے شعر میں ”کوثرین“ کا لفظ ہے۔ آخری شعر کا لفظ ”مصرعہ“ اور پہلے شعر کے پہلے مصرعہ کے الفاظ کی یکسانیت سے خیال ہوتا ہے کہ حزیں نے دوسرے شعر پہلے کہا ہے اور اس سے

پہلے شعر کا مضمون پیدا کیا ہے۔ یہ گویا خود اپنے مضمون سابق میں اضافہ کرنے کی ایک مثال سمجھی جاسکتی ہے۔ ہر چیز کہ اس کا کوئی یقینی ثبوت موجود نہیں ہے کہ ہمارا یہ خیال صحیح ہو لیکن حزن کی نزاکت طبع کے لحاظ سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ دوسرے شعر میں جو مضمون سست ہندش کے ساتھ لکھا گیا تھا اس کو پھر کہا ہے اور ہندش کی جیتی کے ساتھ مضمون میں بھی اضافہ ہو گیا۔ غالب کے شعر کو اگر حزن کے دوسرے شعر کے مقابلہ میں لکھا جائے تو غالب کا مضمون نثر پر جھکا ہوا نظر آئے گا۔ کیونکہ غالب کا مدعا یہ ہے کہ وہ دونوں جہان پالنے کے اہل مطمئن نہیں ہے اور اس میں اس امر کا اد بھی اضافہ موجود ہے کہ زیادہ مانگتے ہوئے شرم دامنگیر ہوئی۔ گویا اپنے بلند حوصلہ کا ذکر ساتھ ہی کر دیا ہے۔ فانی نے اس مضمون کے بالکل مخالف مضمون کہا ہے۔

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا
فانی نے جو کچھ کہا ہے اس میں نعیم قدرت کی قیمت متعین کرنا اور ان کا تعلق انسان کے ساتھ واضح کرنا مقصود ہے۔ یعنی عیش دو عالم تو انسان کی ہوس کی غذا ہے اور دل درد آتش جس کو نصیب ہو وہ قدرت کا کرم ہے کیونکہ یہ نعمت دو عالم سے گراں تر ہے مگر حزن اور غالب نے جو مضمون کہا ہے کہ دونوں جہان میرے لئے ہونے کے باوجود میں مطمئن نہیں ہوں۔ عمومی طور پر انسانی حوصلہ کی بلندی سے عبارت ہے اور فانی اسی بلندی و وسعت ہمت کو مصائب عشق میں صبر و ضبط کے ساتھ محدود کر دیتا ہے۔ فانی نے اپنے اس مضمون کو ایک دوسرے شعر میں کہا ہے:-

مجھ کو مرے نصیب نے روز ازل نہ کیا دیا دولت دو جہان نہ دی اک دل مبتلا دیا
لیکن اس شعر میں مضمون پہلے کی نسبت فرد تر ہے۔ فانی کے دونوں شعر باقیات میں ہیں اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کونسا شعر پہلے لکھا ہے۔ فانی کے کلام سے اس قسم کی چند مثالیں کسی دوسری جگہ درج ہیں۔ فانی نے پہلے شعر میں جو بات کہی ہے کہ سہ
”تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا“ اس کے ساتھ علامہ اقبال کا یہ شعر یاد رکھنا چاہئے جو اس موضوع پر اصولی حیثیت رکھتا ہے کہ
خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرت پر دین خدا کی دین ہے سہرا یہ قسم فرما دو
قیاس یہ ہے کہ غالب کے سامنے حزن کا دوسرا شعر تھا اور اس پر اس نے اپنا شعر انشا کیا کیونکہ غالب خود ایک مفکر اور فلسفی شاعر ہے اور یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ حزن کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ کو وہ بالکل نظر انداز کر جائے۔ حزن کے دوسرے شعر میں انسانی حوصلہ کی بلندی کو جس طرح پیش کر رہا ہے۔ غالب نے اس کو انداز بدل کر حزن سے بہتر طریقہ پر کہہ دیا ہے۔ فانی کی یاس نے اس کو یہاں بھی نہ چھوڑا۔ جن مضمون میں یاس و نو میدی کا کوئی پہلو نہ تھا فانی کی مخصوص انفرادیت اس میں بھی وہی رنگ، پید کر گئی جو دوسرے عام مشامین میں کرتی تھی۔ وہ شاعری میں خالص فلسفہ کو قبول نہیں کرتا بلکہ ہر جگہ جذبات کو شامل کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اس مضمون میں بھی اس نے جذبات کو شامل کر کے بحث کی صورت تبدیل کر دی ہے۔ جو حزن، غالب اور فانی کی انفرادیت کس طرح نمایاں ہو رہی ہے۔

غالب کا شعر ہے:-
لما ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
غالب نے بڑی نازک بات کہی ہے کہ اگر حیراننا دشوار ہوتا تو یہ بات میرے لئے آسان ہو جاتی کہ ایک امر دشوار ہے اس کے لئے اُسی مناسبت سے کوشش و جدوجہد بھی کر لینی طبعیت راقب ہوتی مگر میرے سامنے سب سے بڑی دشواری یہ پیش آگئی ہے کہ: امر خود دشوار نہیں ہے مگر تو مجھے پھر بھی نہیں مل سکتا۔ غالب کا ذہن دشواری اور آسانی کے فلسفہ کو انسانی ہمت اور جوش عمل کی نسبت سے دیکھ رہا ہے اور جس انداز اور اسلوب سے اس دقیق ترین مضمون کو اس شعر میں کہا گیا ہے اس سے زیادہ خیال میں نہیں آیا۔ غالب کا یہ شعر سہل متنع ہے۔ فانی نے اس مضمون کو غالب سے لیا ہے:-
خال افزائی مشکل ہے ہر آسانی کار میری شکل کو مہارک نہیں آساں ہونا

فانی صرغ غالب کے مضمون سے متاثر ہوا مگر اس پر اس کی نظر بالکل دبڑی کہ غالب کا طرز بیان اور طریق اداس کس قدر شگفتہ ہے اور ایک اصول کا افزائے کار و بار عاشقی میں کس طرح محسوس کیا ہے اور غالب کے شعر کی کامیابی کا راز بھی یہی ہے فانی اس سب کا احاطہ نہ کر سکا۔ اسی مضمون کو ایک جگہ پھر کہتا ہے:-

مشکل ہو تو آسان ہو مشکل ہی نہیں شاید آسان ہی نہیں ہوتی افتد میری مشکل
اس شعر کی حالت بھی وہی ہے جو پہلے کی ہے اور غالب کے طرز بیان کو محسوس نہ کر سکنے کی وجہ سے فانی دونوں اشعار میں غالب سے پیچھے رہ گیا۔ فانی نے دونوں جگہ صرغ ”مری شکل“ کہا ہے اور عشق کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اسی مضمون کو بلکمر اور آبادی نے کہا ہے اور آسانی اور مشکل کے اس فلسفہ میں عشق کی نسبت سے ایک لطیف اضافہ کیا ہے وہ کہتا ہے کہ:-

وہ دشواریاں عشق کی حل ہوں کیونکر جو دشواریاں ہیں نہ آسانیاں ہیں
ہمارا تصور دشواری کو محسوس کر سکتا ہے یا اس کے مقابلہ میں آسانی کو۔ مگر عشق کی کیفیت اس سے جداگانہ ہے۔ اس کی اپنی ایک علامہ حالت ہے جس پر نہ دشواری کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ آسانی کا۔ اور یہ بجائے خود ایک ایسی دشواری ہے کہ اس کے حل ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ گویا ایک لاینحل مسئلہ ہے اور صرغ اسی سبب سے اس کو دشواری کہتا ہے ورنہ حقیقتاً وہ نہ دشواری ہے نہ آسانی۔ بلکہ نے بھی غالب کے متذکرہ شعر سے استفادہ کیا ہے مگر اُس فلسفہ پر پوری طرح غور کر لیا ہے جس کو غالب نے بیان کیا تھا۔ اور اسمیں بڑا ہی لطیف اضافہ کیا ہے۔ فانی غالب کے طرز و فکر و نظر کو بڑی طرح احاطہ نہ کر سکا۔ بلکہ نے اس کا احاطہ کاں طور پر کر لیا اور اسی لئے اس کا شعر فانی سے بہت بڑھ گیا۔

اس سلسلہ میں اس حقیقت کو فراموش نہ کر دیا جانا ہے کہ جس طرح تمام افراد قوم وقت کے تقاضوں اور اپنے عہد کی تہذیب سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح شاعر بھی متاثر ہوا کرتا ہے۔ ہر تہذیب صحیح ہے کہ شاعر قوموں کی تعمیر کرتے ہیں لیکن خود شاعر کی تعمیر کا اپنا عہد کرتا ہے اور ہر شاعر اپنے عہد کی مقتضیات اور قوم کی نفسیات سے اس حد تک متاثر ہونے پر مجبور ہے۔ تہذیب و تمدن میں تغیر کی رفتار جس قدر سست ہے اُس سے کہیں زیادہ سست اور مضمحل رفتار ادبیات میں انقلاب و تغیر کی ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ادبیات میں تغیر کرنے والے خود ہر انقلاب تہذیب و تمدن کو اس وقت تک با شعور طور پر محسوس نہیں کرتے جب تک وہ اپنا کامل نتیجہ پیدا نہ کر لے۔

ہر عہد کی تہذیب مختلف نظریات و عقاید اور خیالات و مراسم کی حامل ہوتی ہے مگر اس میں دور گزشتہ کے اثرات ضرور شامل رہتے ہیں اور ایک شاعر یا مصنف کی تعمیر میں چونکہ ایک قوی ترین عنصر و عقاید ماضی سے پوری واقفیت بھی ہے اس لئے اس کے یہاں ان افکار و خیالات کا اعادہ نہ ہونا ضرور تعجب انگیز ہوگا جو اس کے پیش روں نے پیش کئے ہیں۔ لیکن ہر زمانہ کی تہذیب میں دوسرے زمانوں سے جو فرق ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک نظریہ کافی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اُس نظریہ کے بعض دیگر اطراف تعلیم و عمل محض ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ زمانہ بدل جاتا ہے قوم کی تہذیب اور خیالات میں تغیر رونما ہو جاتا ہے جو نظریات کل تک صرغ ضمنی اور سطحی تھے آج اہمیت حاصل کر کے مستقل مباحث بن جاتے ہیں اور

جن نظریات کو واقعی اہمیت حاصل تھی وہ صرغ ضمنی اور سطحی بن کر رہ جاتے ہیں اور یہی انقلاب شعرا کے کلام میں بھی ہوتا ہے مگر اس تمام تغیر و انقلاب کی رفتار بہت ہی سست ہوتی ہے۔ نیز ایک اصول یا نظریہ کی حکمرانی ایک قوم کے دل و دماغ پر اتنی دیر تک باقی رہتی ہے کہ وہ اُس قوم کے خصائص میں شمار کیا جانے لگتا ہے اور اُس نظریہ کی عملی اہمیت ختم ہو جانے کے بعد بھی افراد قوم اسکو ایک مسلمہ حقیقت کی طرح تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس انقلاب سے شعرا کا متاثر ہونا ضروری ہے اور ان کے کلام میں شعرا نے سابق کے مضامین اُسی ترتیب سے ملنا لازمی ہیں جس ترتیب سے زمانہ خیالات میں تغیر کرتا چلا آ رہا ہے اور یہ بالکل فطری بات ہے جس کے لئے

کوئی شاعر بھی قابلِ ملامت نہیں سمجھا جاسکتا۔ اگر اس مسئلہ پر ذرا وسعت اور گہرائی کے ساتھ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے تمام علم میں یہی حال ہے کہ بعد کے آنے والے اپنے پیشروں سے استفادہ کرتے چلے آئے ہیں اور تمام علوم و فنون کی ترقی کا انحصار صرف اسی پر ہے اگر تمام کے افکار و دنیاویات سے استفادہ کیا جائے تو تمام علمی ترقیات و فنکارانہ کامیں کی۔

شیخ سعدی کے عہد میں عشق و محبت، تصوف اور اخلاق و موعظت کی طرقت رغبت قومی خصوصیات تھیں۔ سعدی اپنے عہد کی روح ہیں اور انھوں نے قومی اخلاق کے ہر نہ عنصر کو اپنے کلام سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ لیکن قومی اخلاق میں تبدیلی شروع ہو جاتی ہے اور بعد کے شعراء کے کلام میں وہ چیزیں مجموعی حیثیت سے نظر نہیں آتیں۔ خواجہ حافظ عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور قصو بھی اگر پیش کرتے ہیں تو اسی رنگ میں اور اخلاق و موعظت و پند و نصائح کے لئے بھی اسی کو دو سرا پیرایہ پہنا نہیں ملت۔ قوم کے اخلاق میں جو تبدیلی ہو چکی تھی اُس سے ان کا متاثرہ ہونا تعجب انگیز تھا ساری قوم پر ایک خم راستی چھایا ہوا تھا۔ خواجہ حافظ کی زبان سے ادا ہو رہا تھا اگر اس کے باوجود خواجہ کے یہاں سیکڑوں مضامین وہی ہیں جو شیخ نے کہے ہیں ان میں سے اکثر اشعار علامہ شبلی نے شعرِ نظم مذکورہ خواجہ حافظ میں نقل کئے ہیں۔ سعدی و حافظ کے زمانوں کے مقتضیات دونوں کے کلام میں علحدہ علحدہ موجود ہیں لیکن علاوہ ان کے دونوں کے زمانوں کے مشترک مقتضیات بھی تقریباً یکساں الفاظ میں ان کے یہاں نظر آتے ہیں۔

حضرت امیر خسرو کے بعض اعتراضات پر ہم گذشتہ صفحات میں گفتگو کر چکے ہیں۔ غزل میں وہ شیخ سعدی کے پیرو اور متبع ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-
خسرو سرمست اندر ساغر معنی برینیت
شیرہ از خمیازہ مستی کو در شیراز بود
دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:-
در غزلت یاد جوانی دہد
در خوشی طبع نشانی دہد
تق زل از ان ہم کہ کسان گفته اند
ہر چہ تو کوئی بہ ازاں گفته اند
نوبت سعدی کہ مباد کہیں
شدم نداری کہ گوئی سخن

مسلمان سادگی کے لئے مولانا جامی بہارِ تان میں لکھتے ہیں کہ:-
”مسلمان کے اکثر مضامین اساتذہ قدیم خصوصاً کمال اسماعیل سے ماخوذ ہیں لیکن مسلمان نے ان کو اس قدر ترقی دی کہ جائے اعتراض نہیں۔“ خواجہ حافظ کے کمال فن نے ایک زمانہ کو مسخر کر لیا اور تمام شعراء ابد کے کوشش کر کے خواجہ کے اتباع میں جدوجہد کی اور اس کا اعتراف بھی کرتے رہے، عربی کے مزاج میں حد درجہ استغناء ہے وہ کسی کو خاطر نہیں لاتا کہ خواجہ حافظ کیلئے پھر بھی کہتا ہے کہ:-
بر آن تبع حافظ را دست چوں عربی
کہ دل بکار دو داد سخن وری ماند
صائب کہتے ہیں:-
رواست صائب اگر نیست از رہ دعوت
تبع غزل خواجہ کرچہ بے ادبی سے
سلیم کہتا ہے:-
سلیم معتقد نظم خواجہ حافظ شد
کہ نشہ بیش بود در شیراب شیرازی
اور خود خواجہ حافظ کا کیا حال ہے وہ انہی سے دریافت کیجئے۔ مولانا نظامی کے لئے فرماتے ہیں کہ:-

چو سلب در جو شایست شعر نظم تو حافظ
کہ گاہ لطف سبق می برد نظم نظامی
ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:-
چہ جائے گفتہ خواجہ و شعر سلیمان
کہ شعر حافظ شیراز بہ شعر ظہیر
گویا ظہیر فارابی کے کلام کو معیاری چیز قرار دیکر اپنے کلام کو اُس سے بھی بہتر قرار دیتے ہیں۔ خواجہ کرمانی کے لئے فرماتے ہیں۔
استاد غزل سعدی پیش ہم کس آتا
دار و سخن حافظ طرز سخن خواجہ

یہ صریح عقیدہ قندازہ اعتراف ہی نہیں ہے بلکہ خواجہ حافظ نے اپنی شاعری کا سنگ بنیاد ہی خواجہ کے طرز سخن پر رکھا ہے۔ علامہ شبلی شعرِ نظم میں تذکرہ خواجہ حافظ میں لکھتے ہیں ”خواجہ صاحب نے غزل کوئی شروع کی تو خواجہ کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا“
اس نوع کے اعترافات ہر شاعر کے یہاں ضرور مل جائیں گے جن کا تعلق استفادہ سے ہے نہ کہ سرقد سے۔

امریکہ کا ڈالر اور روس کی جنگی طیاریاں

امریکہ اور روس کے موجودہ کشیدہ تعلقات کو دیکھتے ہوئے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ خود امریکہ نے روس کی جنگی طیاروں میں اس کی مدد کی ہے تو اس کا کسی کو یقین نہ آئے گا، لیکن واقعہ یہی ہے کہ امریکہ کے ڈالر اور وہاں کی مکمل قابلیت نے روس کی فوجی آراستگی کو زیادہ آسان کر دیا۔

ہر چند براہ راست امریکہ نے روس کو نہ ڈالر دیے ہیں اور نہ اپنی صنعتی ترقیوں کے باز بتائے ہیں، لیکن امریکہ کی بہت سی ایسی مقامی پیداوار جو سامانی حرب کی طیاروں کے لئے ضروری ہے اور مشینری کے بہت سے نازک اوزار دوسرے ملکوں سے بہ کثرت روس تک پہنچ رہے ہیں۔

سلسلہ سے سلسلہ تک تو امریکہ نے براہ راست ایک ارب دس کروڑ ڈالر مالیت کی چیزیں ادھار بیٹے کے سلسلہ میں روس کو دیں، اس کے علاوہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں آباد کاری کے لئے ۷ کروڑ ڈالر دیے — اس کے بعد جب مارشل پلان کے تحت امریکہ نے دوسرے ملکوں کو ڈالر دینے شروع کئے تو روس کو اس فہرست سے نکال دیا لیکن جن سولہ ملکوں کو مارشل پلان کے تحت امداد دی گئی تھی ان کی وساطت سے روس کو بہت کچھ مل گیا۔ اور تقریباً ساڑھے بیس کروڑ ڈالر کی خام پیداوار اور مشینری کے اوزار جو سامان حرب کی طیاروں کے لئے ضروری تھے روس کو پہنچ گئے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ جو خام اشیاء مغربی یورپ کے ممالک کو امریکہ کی طرف سے پہنچتی تھیں وہاں ان سے وہ چیزیں طیاروں کی جاتی تھیں جن کی روس کو ضرورت تھی اور روس اپنا گہروں، روٹی، تاکو اور سمور وغیرہ دیکر ان اشیاء کو وہاں سے حاصل کر لیتا تھا، چنانچہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ پچھلے دس سال میں ایک ارب ۶۰ کروڑ ڈالر کا مال ان ممالک سے روس نے حاصل کیا۔

۱۹۴۶ء میں مغربی جرمنی اور چین کے متعلق امریکہ نے جو پالیسی اختیار کی اس سے بھی روس کو بہت فائدہ پہنچا۔ جنگ کے بعد مغربی جرمنی میں اربوں ڈالر کی صنعتی مشینیں اور اوزار وغیرہ موجود تھے، لیکن امریکہ نے ان سب کو روس کے علاقہ میں منتقل ہو جانے دیا جس کے ساتھ بہت سے اچھے کاریگر بھی روس پہنچ گئے۔ اس طرح چین کی طرف وہاں کی قومی حکومت کی امداد بند کر کے روس کو اس کا موقعہ دیدیا گیا کہ وہ منجھوڑیا کی تمام صنعتی ذرائع اپنے یہاں منتقل کر دے۔

الغرض منجھوڑیا اور مغربی جرمنی کی طرف سے صنعتی فعالیت کا روس میں منتقل ہو جانا اور مارشل پلان سے فائدہ اٹھانے والے مغربی یورپ کے ممالک اور روس کے درمیان آزاد تجارت، ان دو باتوں نے روس کو اس کی فوجی تنظیم میں بہت مدد پہنچائی، اس کے علاوہ اور بھی بعض باتیں ایسی ہیں جو روس کی مساویں ہوئیں، مثلاً ادھار بیٹے کی رعایت کی وجہ سے روس کو امریکی صنعت کے بہت سے راز معلوم ہوئے، بعد پورے کے پورے صنعتی پلانٹ کوہ یورال پہنچ گئے۔ ان پلانٹ میں عین پلانٹ پٹرول صاف کرنے کے اور ایک طیارہ فیکٹری کا بہت اہم تھے۔ ان کے علاوہ ایک برقی قوت کا پروجرام ساڈھے تیرہ کروڑ ڈالر کا، ریلوے روڈ اور توسیع فلواد

سلسلہ کے ابتدائی تین ماہ میں بمطابق سے ہر کروڑ ۲۵ لاکھ ۴۳ ہزار ڈالر کی مشینری گئی، فرانس سے ایک کروڑ ۸۶ لاکھ ۹۴ ہزار ڈالر کا مال گیا، سویت یونین نے ایک کروڑ ۹۶ لاکھ تین ہزار ڈالر کی اشیاء روس کو فراہم کیں۔

کے دو سو گرام ۳۰ کروڑ ڈالر کے روس کو دئے گئے۔

اسی کے ساتھ جب سوویت کا ضروری مشین ۱۵۰۰ افراد پر مشتمل تھا، امریکہ پہونچا تو اس کو اجازت دیدی گئی کہ وہ امریکہ کے صنعتی مرکوز اور نقشوں کے نوٹوں کا حاصل کر سکے۔ آٹم بم بنانے کے لئے جن اشیاء کی ضرورت ہے وہ بھی امریکہ سے متعدد بار روس کو منتقل کی گئیں۔

بجلی کے اور جہاز سازی کے متعدد کارخانوں کے نقشے، مختلف دھاتوں کی سیرجے کے ٹکڑے، بہت سے فوجی راز دستاویزوں اور تصویریں کی صورت میں جن کثرت سے روس کو حاصل ہوئے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب داسی لنکو (جو سویت خریداری مشن کا ممبر تھا) روس واپس گیا تو پورے چھ ہیک انچیں نقشوں اور دستاویزوں سے بھرے ہوئے تھے۔

لوائی کے بعد امریکہ کے محکمہ تجارت نے روس کو اپنی پیٹ مسنوعات کی رسائی تک کا بھی موقعہ دیدیا تھا اور جو علمی و تکنیکی راز مغربی جرمنی کے قبضہ کے بعد امریکہ کو معلوم ہوئے تھے ان کا حال بھی روس سے نہ چھپایا گیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً تیرہ ہزار پیٹ چیزوں کی خوردبینی تصویریں ماسکو پہونچ گئیں۔

ادھار پٹے کے سلسلہ میں امریکہ کی طرف سے روس کو ۳۰ فی صدی چیزیں ملیں جن میں سے چند کی تعداد یہ ہے:-

- (۱) موٹر ٹرک = ۳۷,۰۰۰ - (۲) ٹینک = ۷۰۵۶ - (۳) جیب کار = ۵۱,۵۰۳ - (۴) کپڑے والا مسافر = ۳۴,۵۰۰ ٹن (۵) فوجی جوتے = ۱۷,۰۰۰ جوتے - (۶) مشینری اور اوزار = ایک ارب دس کروڑ ڈالر کی -

مغربی جرمنی میں جتنے صنعتی ادارے پاسے جاتے ہیں وہ بھی مشرقی جرمنی کو جہاں روس کا اقتدار ہے ہر قسم کا مال فراہم کر رہے ہیں جن کی قیمت کا اندازہ ۳۳ کروڑ ڈالر سالانہ ہے۔ ان اشیاء میں لوہے کی چادریں، اوزار، ربر اور ٹانبا بھی شامل ہے اسی طرح ویٹا کی ٹریڈنگ کارپوریشن جو روسیوں کے ہاتھ میں ہے ۴۰ لاکھ ڈالر کی مالیت کا سامان ہر ہفتہ ماسکو پہونچا رہی ہے۔

ڈانٹ پلان کی رو سے امریکہ نے مغربی یوروپ کے ملکوں کو امداد ۷۷ کروڑ ڈالر سے کی، اور ان ملک نے ۷۰ لاکھ ڈالر مالیت کی مشینیں اور اوزار روس کے ہاتھ فروخت کئے، گویا الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ہر وہ ڈالر جو مغربی یوروپ کو امریکہ سے ملتا ہے اس میں سے ۲۲ سٹنٹ روس پہونچ جاتا ہے۔

۲۶ اگست ۱۹۵۷ء کو رسل میک نے ایوان امریکہ میں ادا ہر کیا کہ ”جن مغربی ملک کو ہم اسلحہ فراہم کر رہے ہیں ان کے ذریعہ سے ہر ایک سال ۱۹۵۷ء کے افر ایک ارب ڈالر کا مال روس کو پہونچا“

قابل قدر تجربہ نسخوں کے راز کا انکشاف

- (۱) تہدیق کا مکمل علاج - چار نسخے عرق - سفوف - لعوق - (۲) اکسیر ستورات - عورتوں کے لئے بے بہا نسخہ ہر قسم کی ماہواری خرابیاں اور اندرونی نقایص دور ہو جاتے ہیں، ہدیہ ص ۷
- (۲) نسخہ پائوریا صدف تھہ دماغ میں مرنس کو نیست و نابود کر دیتا ہے ہر عیالہ ص ۷
- (۳) بواسیر کا شافی نسخہ صرف کھانے سے سے مرعہ اگر گرجاتے ہیں ہر عیالہ ص ۷
- (۴) خواہ آب و نسخہ بعض اوقات مرض کو ٹینڈ نہیں آتی جس کی وجہ سے کئی دوسرے امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس سے مینڈ خوب آتی ہے۔ ہدیہ عیالہ ص ۷
- (۵) آنکھوں کے ہلکے امراض کی پاشل سیال دوا ہدیہ ص ۷
- (۶) اکسیر ستورات - عورتوں کے لئے بے بہا نسخہ ہر قسم کی ماہواری خرابیاں اور اندرونی نقایص دور ہو جاتے ہیں، ہدیہ ص ۷
- (۷) اکسیر اطفال - بچوں کے لئے بے نظیر نسخہ - ہر سے پیلے دستوں کا آکا اور ص ۷
- (۸) عوارضات جو حالت شکستہ وقت بچوں کو ہو جاتے ہیں ان کا تریاق ص ۷
- (۹) تریاق جربانی عیالہ (۱۰) اکسیر سوزاکی عیالہ - اکسیر تشنگ عیالہ ص ۷
- (۱۱) طاقت کا ایک بے نظیر نسخہ - جس پہونچ چند پیسے لاگت آتی جو عیالہ ص ۷
- (۱۲) بیرونی علاج کے لئے پٹی ہدیہ عیالہ ص ۷
- (۱۳) سانپ کاٹے کا مجرب عمل ہدیہ ص ۷

لکھنؤی شاعری کی چند خصوصیتیں

پہلے لکھنؤی شاعری کے معنی سن لیجئے۔ ”لکھنؤی شاعری“ سے مراد ناسخ و آتش کی شاعری۔ ان کے پیروں اور شاگردوں کی شاعری۔ ان کے شاگردوں کے شاگردوں کی شاعری ہے ان جملہ حضرات کی شاعری (غزل گوئی) کے متعلق مجموعی طور پر کبھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور انفرادی طور پر بھی تفصیلی تنقیدیں ہو چکی ہیں۔ بالخصوص ان بزرگوں کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کی شاعری کی بعض اہم خصوصیتیں ایسی بھی ہیں جنہیں یا تو ناقدین نے قابلِ اعتناء ہی نہیں سمجھا یا اس طرف ان کی نظر ہی نہیں گئی اور اگر کسی نے ان خصوصیات کے متعلق کچھ لکھا بھی ہے تو اس کی حیثیت اجمالی اشاروں سے زیادہ نہیں۔

دہلی اور لکھنؤ کی شاعری میں جو چیزیں خاص طور پر باہر الامتیاز ہیں ان میں سے ایک محبوب کی جنس کا تفاوت بھی ہے بارہویں صدی ہجری میں شعراء دہلی سے محبوب ”دلی کے کچ کلاہ لڑکے“ تھے لے

بعض بزرگوں نے اس تغ حقیقت پر پردہ ڈالنے کی انتہائی کوشش کی ہے مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ الغرض یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بارہویں صدی ہجری میں سادہ رویوں سے عشق بازی ہماری سوسائٹی کا ایک نہایت محبوب مشغلہ تھی، شعراء بھی آخر اس سوسائٹی کے افراد تھے۔ اپنے دور کے عام رجحان سے کیونکر بچ سکتے تھے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس زمانہ میں ہر شاعر امر دہرست تھا۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے ان کا محبوب اکثر و بیشتر ایک سادہ رویہ کلاہ آہی ہے۔

اس محل پر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان بزرگوں کی عشقیہ شاعری زیادہ تر ”روایت“ پر مبنی ہے جس میں اصلیت کم اور نقالی زیادہ ہے۔ محمد شاہی دور کے شعراء نے اپنی غزلوں میں کہیں آپ بیتی اور کہیں جگ بیتی بیان کی ہے۔ ان کے بعد کے والوں نے روایتی طور پر عموماً اپنے پیشروں کی تقلید کی ہے۔ تو اس طرح گویا ایک طبقہ تو ان شعرا کا ہے جنہوں نے درحقیقت سادہ رویوں سے عشق بازی کی۔ اور دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کی ”امرد پرستی“ تقریباً ۹ فیصدی اپنے پیشروں کی نقالی پر مبنی ہے۔ اصلیت نہیں۔ لکھنؤی شاعری کی پہلی خصوصیت۔ تیسری جماعت ان لکھنؤی شعرا کی ہے جن کی محبوبہ لازمی طور پر صنفِ نازک سے تعلق رکھتی ہے۔ اس محل پر قدرتا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر لکھنؤی شاعر کی محبوبہ صنفِ نازک سے تعلق رکھتی ہے تو پھر وہ ”خطا“ اور ”مُسول“ اور ”ٹوپی“ اور ”دستار“ کا ذکر کیوں کرتا ہے اور کنایت یا صراحتہً ایک سادہ رویہ سے سروکار کیوں رکھتا ہے؟ جواب اسکا یہ ہے کہ اول تو لکھنؤی شعرا کے یہاں اس قسم کے اشعار آئے ہیں نہ کہ درجہ رکھتے ہیں بلکہ اس سے بھی کم۔ اس لئے ان کی کوئی مستقل حقیقت نہیں۔ اس کے علاوہ یہ اشعار عموماً ضلعِ جلّت یا رعایتِ لفظی کے شوق میں کہے گئے ہیں اور یہ حقیقت خود ان اشعار سے

۱۔ اشرف الدین علی خاں پیام :- دلی کے کچ کلاہ لڑکوں نے کام عشاق کا تمام کیا

سوز :- گئے گھر میں جو اپنے ہم سویرے سلام اللہ فاضل صاحب کے ڈیرے

دلی دیکھ کئی طفلِ پری دے اے لے لے لے لے لے لے لے لے لے

تیر :- کیا لڑکے دلی کے ہیں عیار اور خط کھٹ دلی ہیں لڑکے ہرگز ہوتی نہیں ہے آہٹ

ثابت ہے۔ اب رہا یہ امر کہ لکھنؤی شاعر کی محبوبہ عورت ہے تو اس کا ثبوت ضرورت سے زیادہ خود اشعار میں موجود ہے۔ لکھنؤی شاعر کا شعر ادا لفاظی دیگر لکھنؤی کے عشاق میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو کسی پر وہ نشیں ہے محبت کرتے ہیں اور ان کی تعداد نسبت کم ہے۔ دوسرے وہ جو زبان ہزاروں کے دلدادہ ہیں اور اکثریت ان ہی کی ہے۔

”پر وہ نشیں“ کے عشاق نے اپنی محبوبہ کا ذکر کرتے وقت اگرچہ زبان کی ادایات کو برقرار رکھا ہے یعنی اس کے لئے مونث کی بجائے مذکر کے صیغے استعمال کئے ہیں کہ افعال و صفات مذکر کے یہ گہرے پر دے حقیقت کا چہرہ نہیں چھپا سکتے۔ آئیے ان عشاق کو ان پر وہ نشیں کی ایک جھلک آپ بھی دیکھ لیجئے:-

آج آئیں نظر روزن دیوار کی آنکھیں	شاید کہ کوئی پر وہ نشیں جھاگ رہا ہے
لگی ہی رہتی ہے اس بت مری کو اڑ میں آنکھ	نظر پڑی ہے تری جب سے پٹ کی آنکھیں آنکھ
در پر وہ دکھاتا ہے وہ رشک چمن آنکھیں	ہم آئے تو طبع میں لگائے گل نرگس
مشتاق ہیں اب جلوہ دیدار کی آنکھیں	لندھمہ رکوں سے دکھا جائے صورت
لاکھ لکھو گھٹ کو کرے یار حصار عارض	نگہ عاشق مشتاق پہنچ جاتی ہے
عرش اعلیٰ سے بھی اونچا ہو ہمارا شانہ	ہم سے کاغذ چو بدل میں تری ڈولی کے کبار

یہ پر وہ اور چمن اور کوڑکی ادٹ سے تاک جھاگ یہ روزن دیوار اور جھروکوں سے نظر بازیاں اور یہ ڈولی کی سواہی کسی تاویل کی محتاج نہیں۔

دوسری خصوصیت، سامان آرائش :- زلف، کاکل، گیسو، جوڑا، چوٹی، کنگھی اور مشاطہ کے علاوہ لکھنؤی شاعر کے یہاں نسوانی آرائش کی پوری تفصیل موجود ہے اور تھوڑی سی کوشش اور تلاش سے سرمہ، مستی، غازہ، منہدی، فندقی، افشال پھول، سیندور، پان، عطر، غرض ہر چیز کے متعلق بکثرت اشعار جمع کئے جاسکتے ہیں۔ نمونے کے طور پر ہم یہاں صرف ایک شعر ہر چیز کے متعلق نقل کرتے ہیں :-

پان عطر آئینہ، منہدی، مسی، سرمہ، شانہ	۱- ہفتے بھر میں انھیں فرصت نہیں ان ساقوں سے
لو مستی دیکھو دھڑی ہاتھ میں	۲- ہتھیلی صفائی سے آئینہ ہے
خط نہیں سیندور کا اے جان جاں بالاسر	۳- کہکشاں دکھلاتی ہے جلوہ شب تار یک میں
گلدستہ جہاں چمن قرعے اسے نگار ہاتھ	۴- گل فندقی ہیں وز و خاموتیا کے پھول
افشال چنی تو چاندنی کا کھیت کٹ گیا	۵- غازے سے لالہ زار شفق کو محبت کیا

تیسری خصوصیت - زیورات :- مستورات کے دوسرے سامان آرائش کے علاوہ لکھنؤی شاعری میں زیورات کی اتنی تفصیل ملتی ہے کہ اور کہیں نہیں مل سکتی۔ لکھنؤی شاعری کو اگر زیورات کا صندوق بلکہ جہری کی دوکان یا جوہر خانہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہیں، جہاں ہر قسم کا زیور آپ کو بکثرت اور بے آسانی دستیاب ہو سکتا ہے۔

مطالعہ کے دوران میں (۱) سر کے زیورات میں تعویذ، جھومر، چھپکا، چاند سورج، سر بیچ، طرہ، ٹیکا، موتی کی ٹوسی یا سلک گہر وغیرہ۔

(۲) کانوں کے زیورات میں بھلیاں، بندسے، بالی، پتا، انتی، پتی، کرن پھول، جھمکا، بالا، کان، بالے کی پھلی، جھالا، پھلی، سبزہ، چھلا اور گہر وغیرہ۔

(۳) ناک کے زیورات میں، تھنی، نتھ، بلاق، کیل، سونے کی کیل، مہیرے کی کیل اور جڑاؤ کیل وغیرہ۔

(۴) گلے کے زیور میں، زنجیر، میکل، دھندھکی، طوق، مگنی اور چھپا کلی۔

(۵) ہاتھوں کے زیورات میں، کلن، لچھا، پیونچی، پٹری، چھٹا، آرسی، اٹا، نورتن، جوشن، حسین بند، علی بند، شوق بند، انڈویان اور چڑی۔

(۶) پاؤں کے زیور میں، بھجوسے چھلے، انوٹ، کرٹے، گنگر، گل چھڑے، خلنی، پٹری، چھالگل اور پازیب۔
 زیورات کی یہ فہرست مکمل نہیں۔ اسے مکمل کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اگر کوئی چاہے تو اس کا اضافہ کر سکتا ہے۔

نارنج :- چھپا کے پھول میں ہے نہ گل کی کلی میں ہے جیسی ترے گلے کی ہے چھپا کلی میں بو
 برق :- چاند سورج نہیں بالوں میں طلسم نو ہے ایک جا جمع ہیں مہر و مہتاباں سو پر
 نارنج :- کرتے ہیں عالم کو جس کے پاؤں کے بھجوسے شبید اس شکر کی بلا لیتی ہے خجرا بخت میں
 بحر :- پہن جو موتیوں کے کرن پھول یار نے ماروں پہ ادس پڑ گئی خوشہ ٹھٹھ گیا
 نارنج :- اجمی یہ عرش معلیٰ کے گوشوارے کا گہر گہراں سے تمھارے بلاق میں آیا
 بحر :- لخت جگر سے میرے قیمت میں بڑھ چلے تھے جھوٹے پڑے نگینے سب اس کے نورتن میں

چوتھی خصوصیت - زمانہ لباس اور اجزائے لباس - زیورات کے علاوہ لکھنؤی شاعری میں نسوانی لباس کا ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ رنگ برنگ کے دوپٹوں، اڑھنیوں اور رنگا رنگ پانچاموں، خصوصاً طرح طرح کے پائیچوں کے متعلق آپ بہت سے اشعار بتا سکتے ہیں اور نیچے اور موبان کا ذکر بھی کیا ہے نہیں۔ کمرتی اور محرم اور انگلیا نیز انگلیا کے اجزا (مثلاً انگلیا کا نیلنگہ، انگلیا کی کٹھیاں، انگلیا کا گھاٹ، انگلیا کا ٹھٹھا، انگلیا کے پٹھے، انگلیا کی چڑیا، انگلیا کی دیواریں اور انگلیا کی ڈوری،) تو اس دور کی شاعری کا ایک خاص موضوع ہیں اور اکثر شعرا نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ صرف چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:-

بحر :- مثل کمر چلتی ہیں دونوں کلائیوں بھاری ہیں پائیچے دم رفتار ہاتھ میں
 عشقی :- غضب نیرنگ عکس عارض رنگیں نے دکھلایا شہر اتھا دوپٹا ہو گیا گنار کا ندھے پر
 بحر :- محرم کے ستارے ٹوٹتے ہیں پستان کے انار جھوٹے ہیں
 ناصر :- سرخ پا جامہ ہے، گولہ ہر کلی میں ہے لگا پھولوں کی چھڑیاں ہیں اس رنگ بجن کی ہڈیاں
 جری :- موبان زریلیٹ دیا منہ کے عکس نے گرہن پہ آ کے بن گئی کوٹے کا ہار زلف

پانچویں خصوصیت - محبوبہ کے اعضاء بدن کا تذکرہ - عریاں، فحش اور حیا سوز اشعار ہر زبان اور ہر زمانہ میں لکھے گئے اس لئے عربی کو لکھنؤی شاعری کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اعضاء نسوانی کا تذکرہ اس عربی اور اس فراوانی کے ساتھ غالباً اور کہیں نہ مل سکے گا۔ بھر دوسری زبانوں میں اور خود اردو کے مختلف ادوار میں صرف بعض مخصوص افراد کا میلان عریاں نگاری کی طرف رہا ہے لیکن لکھنؤی شاعری اس خصوصیت میں کہیں اپنا نظیر نہیں رکھتی کہ محبوبہ کے اعضاء بدن مثلاً سینے، چھاتیوں، ناک، پیٹ، کمر، سر، گالوں، رانوں، اور ہڈیوں کے متعلق عریاں اور حیا سوز اشعار صرف بازار شاعری نے نہیں لکھے بلکہ ان بزرگوں نے بھی اس غلاطی کو اچھالا ہے جو سوسائٹی میں معزز اور مقتدر سمجھے جاتے تھے۔ پاس تہذیب اجازت نہیں دیتا کہ ان اشعار کا بنود پیش کیا جائے۔ تحقیق کے طالب تذکرہ سر با سخن تالیف محسن ملاحظہ فرمائیں۔

جیسا کہ ہم نے ابھی کہا، عربی اور فحش گوئی کا عنصر ہر زبان کی شاعری میں موجود ہے لیکن ہر زبان اور ہر دور میں یہ چیز صرف چند شعرا تک محدود رہی ہے اس کے برعکس لکھنؤی شاعری اکثریت اس عام میں یہ چیز صرف چند شعرا تک محدود رہی ہے۔

اس کے برعکس لکھنوی شعر کی اکثریت اس جام میں نگی نظر آتی ہے۔ اس محل پر ہم پھر ایک بار اس بات کو دہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ لکھنوی شعرا سے ہماری مراد ناسخ و آتش اور ان کے پیروں اور شاگردوں اور ان کے شاگردوں کے شاگردوں سے ہے۔ چھٹی خصوصیت - طوایفیں اور رقص و سرود - ہم ابتدا میں کہاتے ہیں کہ لکھنوی غزل کو شعرا یا بالفاظ دیگر لکھنوی کے عشاق میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو کسی پر وہ نشین سے محبت کرتے ہیں اور ان کی تعداد نسبت کم ہے۔ دوسرے وہ جو زمانہ بازاری کے دلدادہ ہیں اور اکثریت انہیں کی ہے۔ پر وہ نشینوں کی تاک جھانک آپ دیکھ چکے - آئیے اب ذرا ان زہر و شول سے نظر ڈالیے، جن کی فتنہ طرازیوں نے لکھنوی قیامت برپا کر رکھی تھی۔ بیس و عشرت کی صحبتیں اور رقص و سرود کی محفلیں معمولات زندگی میں داخل تھیں اور عشق و محبت کی زائیں داستانیں سر روز طیار ہوتی تھیں۔ زندگی کے اس رنگین دور کی تصویریں صرف تاریخ کے اوراق ہی میں محفوظ نہیں، اشعار کے آئینوں میں بھی عکس نکلے ہیں۔ اُس عہد کے اکثر ممتاز شعرا نے کسی نہ کسی رشکو ناہید کے رقص و سرود کا ذکر نہایت بے اختیارانہ طور پر کیا ہے، آئیے گھڑی بھر کے لئے اس بزم میں آپ بھی شریک ہو جائیے۔

رقص و سرود

- صحبت :- ہو گیا ہم کو جنوں مگرے گریباں کو کیا
رقص میں بھی نظر آئے ہر داماں عارض
حسام :- بے حجابی میں بھی پردہ ہی رہا عاشق سے
کرتے ہوتے رقص میں کیا کیا اشارے ہاتھ
فروع :- کیا خوشنما بنائے ہیں حق نے تمہارے ہاتھ
دریائے حسن آپ کا بڑھ جائے چار ہاتھ
پاشیر :- ہاتھوں کو ناز میں جو کمرہ اُٹھائیے
عش ہوئے، لوٹ گئے مار کے سب ہاتھ :- ہاتھ
رق :- وقت رقص آگے بڑھا رکھ کے وہ جب ہاتھ :- ہاتھ
شبید :- دست رنگیں جب کہ دکھائی دیا ہنگام رقص
شیر :- لنگن چمکتے ہیں جو دم ترن، ہاتھوں کے
وزیر :- چل رہے ہیں پاؤں کے چھبوسے اچھے ہنگام رقص
مضطر :- وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کے یہ کہتے ہیں رقص میں
قہر :- ناچ کا حسن بڑھ گیا دو
سرور :- کرتے ہیں سرور رقص میں اس گھبرن کے پاؤں
محمود :- بولی گردوں کو بھی انداز :- آتا نہیں جس
ناسخ :- مثل رفتار آج اُس کے رقص کی بھی کرتے نقص
سالک :- اس ادا سے بزم میں قصاں ہوا وہ رشک، اہ
ناسخ :- رقص میں آتی نہیں تیرے گھنگرو کی صدا
صغیر :- سیاہی پتیلیوں کی یہ بھی اک پردہ ظاہر کا
بہار :- شہا شہ پر تم آگئے یا شہا شہ اندھا ساز کا
محسن :- آواز تالیوں کی ترے سم سے کم نہیں
ناسخ :- آواز یہ ہوتی نہیں زہرا رنگے میں
اظہار :- ہے شرم سے ناہید کا دم بند فلک پر
محسن :- بے حال کر دیا مجھے گانے نے آپ کے
- رکھ لیا اُس نے دم رقص جو داماں سر پہ
رقص میں بھی نظر آئے ہر داماں عارض
کرتے ہوتے رقص میں کیا کیا اشارے ہاتھ
دریائے حسن آپ کا بڑھ جائے چار ہاتھ
عش ہوئے، لوٹ گئے مار کے سب ہاتھ :- ہاتھ
شمع محفل جل گئی اُس خوش اولکے ہاتھ سے
ہیں اہل بزم کے لئے حبلی کلا بیاں
کرتی ہیں خوں ریزیاں ہر قدم پر انگلیاں
مجاہد کہیں جواب کوئی ہم سے بچائے دل
لچکے سب اسے حسین کر کوئے
کیا کیا سماں دکھاتے ہیں طاؤس بن کے پاؤں
رقص میں چالاک ہیں ایسے تمہارے ہاتھ پاؤں
پیچنی پہنا دوں اسے کہکشاں پاؤں میں
بن گیا گھنگرو ہر اک چشم تماشا پاؤں میں
کرتے ہیں آسودگان خاک شینوں زیر پا
پھر کرتی ہے تیری سرمئی پشتوا آنگھوں میں
بھاؤ محفل میں بتایا بتائیں گھاسیاں
کانوں نے بھی سنیں نہیں اسی تھیلیاں
سمجھو رنگیں، ساز کے ہیں تار گھے میں
گانے کی تمہارے ہے یہ تاثیر گھے میں
لے ہے بلا کی، قہر کا کھٹکا گھے میں ہے

رتق :- جوش جنوں میں رہتے ہیں صحرا کے سامنے جنگلا وہ روز گاتے ہیں آ آ کے سامنے لکھنؤ کے اس دور کی مخصوص سوسائٹی کے بعض پہلوؤں پر مندرج ذیل اشعار سے روشنی پڑتی ہے :-

رتق :- نیچے ہم بیٹھے ہیں کوٹھے پہ الگ صحبت ہے
تعلق :- پھر ہاتھ میں ہے ہاتھ سرچوک غیر کا
الانت :- غیروں کے نقشے بزم میں کیا کیا ہر نئے
ناسخ :- لوگوں میں ہونٹ چوم لئے ہم نے کیا کیا
محسن :- مانگا جو میں نے بوسہ لب بزم غیر میں
تحر :- اپنی جگہ پہ دیکھ سکیں گے نہ غیر کو

ساتویں خصوصیت - ہندوانہ الفاظ - رسم و رواج اور روایات - لکھنؤی شعرا نے اگرچہ ہندی کے بہت سے ایسے الفاظ اور محاورے ترک کر دیے جو ملی میں عام طور پر مروج تھے اور زبان کو نہ صرف فارسی ترکیبوں کو بھی بکثرت رواج دیا۔ بائیں ہمہ لکھنؤی شاعری میں ہندو سماج، ہندوانہ رسم و رواج اور ہندوانہ روایات کا اثر نمایاں طور پر موجود ہے :-

صحبت :- زلف پیچاں بہ ہوا سے نہیں جھونکے لیتی
قادر :- کالی کو پوجتا ہے سب قلب ہو گیا
محسن :- اسلام والے مصعب رخ پر نثار ہیں
بحر :- پچھتائے تم سے آنکھ لڑا کر ہم اسے تو
تحر :- بخدا ہندو ہیں تیری بت میخوار آنکھیں
عشقی :- ہولی میں گلال ان پہ پڑا ہے یہ نہ سمجھو
جویا :- پوچھتی ہیں اسے بت چالاک کہ قرآن عارض
ناسخ :- ہو گیا جوگی وہ قاتل پر ہے خول ریڑی دی
سمیع :- تشقہ جبین صاف پہ سیندور کا نہیں
شفیق :- بر تو سے اس کے ہانگ میں سیندور بھر گیا
تحر :- اسے بت تو چیر گیا ہے ہم ایسے ہیں بت پرست
محسن :- حلقہ گیسو میں ہے جلوہ رخ گل رنگ کا
بحر :- دیوالی اُس نے بھری جان پوچ بیٹھے ہم
موصد :- پچکاریاں ہیں نور کی ہولی میں یہ کہوں
محسن :- اے صنم تو وہ کنہیا ہے بلا میں لوں اگر
بحر :- ایسے عمارے سے تو انگو چھا ہی خوب ہے
رتق :- اس کے حضور ابیر ہوا رنگ یا سمن
ناسخ :- ہجوم رکھتے ہیں جاں بازیوں ترے آگے
بحر :- اگر آواگوں سچ ہے تو چہرہ نون ہم نہیں گے
ناسخ :- روئے گل رنگ اگر حوض میں ہو عکس نسک

کالکا کہلاتی ہے اسے مہ تاباں سر پر
ہے کیا ہی بد بلا دل ہندو پرست زلف
کالی سمجھ کے ہوتے ہیں ہندو فدائے زلف
گلکا بہائی اشکِ ندامت کی آنکھ سے
نشتے کے ڈورے نہیں پہنے ہیں زنار آنکھیں
خون دل عشقی سے یہ گلزار ہیں پلکیں
دیکھا کرتے ہیں جو ہندو و مسلمان عارض
ہے مندوں کے بڑے رہتے ہیں جگر کاق میں
روشن ہے آج سمیع رخ سیم بر کی نو
سر پر خانی رکھا جو اُس نے اٹھا کے ہاتھ
پر شاد دل کے آئے جگن ناتھ ہاتھ میں
پائے ہے کالکا پھولوں کی ڈالی ہاتھ میں
چراغ گور ہمارا دیا ہے جگمگ کا
گر دیکھ لوں میں ان کی رنگیلی کلابیاں
بانسلی کی طرح نالا ہوں سراپا انگلیاں
زاہد کے ہاتھ چھوڑ کے لیں برہمن کے پاؤں
رنگت گلوں کی بن گئی بکتا گلال کا
جواہروں کا دیوالی میں جیسے جگمگ ہو
سیہ گول زلف سانپوں میں دل پرداغ مودوں میں
طور فخر آستیں ہو رنگ کی پچکاری کا

بکھر :- اسے جو ہم بھی تو جانیں کہ جنم لیتے ہیں
تم میں سے کوئی صنم جان باری ہو جائے
دھاگا دیا بتوں نے خفا دیکھ کر مجھے
اُٹھا جو میں جینو کمر سے لپٹ گیا
سنگارائے کیا ہے اسلئے آنکھوں سے اوجھل ہے
ہمارے واسطے گویا الوپ انجن وہ کاجل ہے
مختار :- امتحان چلنے کا میرے گھر کے ہندوئے زلف
پاروں میں بھی سستی کی طرح کاجل پاؤں میں

آنکھوں کی خصوصیت - پیری - لکھنوی شاعری میں لفظ "پری" کا استعمال بکثرت ہوا ہے۔ (یہ امر قابلِ ملاحظہ ہے کہ اگرچہ لفظ "پری" مونث ہے لیکن شعرانے اس کے لئے فعل ذکر کے صیغے استعمال کئے ہیں) چند مثالیں ملاحظہ فرمائے :-

وزیر :- دیکھتا ہے وہ پری تصویر پشت آئینہ
بخت اسکندر ہوئی تقدیر پشت آئینہ
مولنس :- تو کاک رکھ کے سن تو کسی شب کو اسے پری
فریاد کر رہے ہیں اسیرانِ دامِ زلف
ناسخ :- اس قدر گھب گئی ہے تیری سنہری رنگت
اسے پری اب تو سنا نہیں زرد آنکھوں میں
موزوں :- وہ پری رکھتا ہے ایسے پیارے پیارے ہاتھ پاؤں
جان ہیں دل ہیں جگر آنکھوں کے تارے ہاتھ پاؤں
ناسخ :- شریک ہے وہ پری خلد دل ہی میں رہے
کمرے مردم دیدہ کا ہے گھر آنکھوں میں

نویں خصوصیت - بھبتی - لکھنوی شعرا کو بھبتی کہنے کا بہت شوق ہے۔ بھبتی کو دوسرے لفظوں میں تشبیہ کر سکتے ہیں لیکن تشبیہ کے لئے ضروری نہیں کہ شاعر اس کی طعن اشارہ بھی کرے، یعنی یہ کہے کہ میں فلاں چیز کو فلاں شے سے تشبیہ دیتا ہوں چنانچہ لفظ تشبیہ اشعار میں بہت کم استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس کے برعکس بھبتی کہنے والے شعرا خود لفظ "بھبتی" شعر میں ضرور لاتے ہیں۔ لکھنوی شعرا کے کلام میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

ناسخ :- اس قدر پٹلی گھر ہے اس پری رخسار کی
کہتے ہیں بھبتی سب اس پر میرے جسم زار کی
قلق :- آنکھوں پر دیکھ کر وہ بھنوں خوب سوچتی ہے
بھبتی کہوں کہ نکلے ہیں سر پر ہرن کے پاؤں
اسیر :- خوشہ اسے تاک کی ہر ایک نے بھبتی کہی
آبوں سے پھل گئے جب میرے سائے ہاتھ پاؤں
بیتود :- بھبتی کہوں، شکن نہیں مانتے پہ آشکار
سطرے یہ سر فروخت کی ہیں اسے قمر جبین
عشقی :- کہوں بھبتی، تلاطم آب گوہر میں نظر آیا
نایاں کس قیامت کی ہے موج نور دانقوتے
ناسخ :- چینی سے صاف تربت چین ہے ترا بدن
بھبتی تری کمر پہ ہے چینی کے بال کی
مختار :- دیکھ کر دستِ حنائی کو کہوں بھبتی منجی
داغ لالہ ہے نہیں منہدی یہ کالی ہاتھ میں

دسویں خصوصیت - داغ جنوں - لکھنوی شعرا کی ایک کثیر تعداد عام طور پر ایک خاص بیماری میں مبتلا نظر آتی ہے۔ اس کا نام "داغ جنوں" ہے اس کی اصل حقیقت تو معلوم نہیں مگر اشعار سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ داغ سر پر ہوتا ہے اور جنوں یا سودا کے جوش سے وہ دم میں آتا ہے۔ کبھی اسے کلمے بھولنے سے تشبیہ دی جاتی ہے، کبھی آنکھ سے کبھی سر سے، کبھی درہم سے اور کبھی لگیں سے۔ مندرجہ ذیل مثالیں داغ جنوں کی تشریح کے لئے کافی ہوں گی :-

گویا :- بان خزاں میں بھی شگفتہ ہے گل داغ جنوں
کہدو اب بلب سے باز ہے آسمان بالائے سر
حرفان :- تیرے سلسلے جو وہ ابرو دکان بالائے سر
ہو سپر داغ جنوں شاید یہاں بالائے سر
وزیر :- داغ سودا سے ہوئی چشم نایاں سر پر
تیرے تیرے بن گئی مژگیاں سر پر
برقی :- سلطنت کرتے ہیں سودا زدگانِ الفت
ہاج ہے داغ سر و مشک سلیمان سر پر
صحبت :- درہم داغ جنوں کی ہے یہ کثرتِ صحبت
مش قاروں ہے یہاں گلی فراوان سر پر

اثر :- جوش سودا نے کیا شمع کی مانند گداز
 غنچہ داغ چٹکتا نہیں سر پہ میرے
 ناظر :- غنچہ داغ چٹکتا نہیں سر پہ میرے
 اشک :- داغ سر پہ طوق گردن میں، اسیر عشق ہوں
 حلقہ اتم گلے میں ہے گلیں بالائے سر
 ”اشک ہے داغ جنوں سے طبع اپنی باغ باغ
 ہم نے پھرتے ہیں فردوس بریں بالائے سر
 گیارھویں خصوصیت :- مضحکہ خیز مبالغے ۔ مبالغے کا اصل مقصد یہ ہے کہ جس کیفیت یا حالت کو بیان کرنا مقصود ہو، مبالغے کے ذریعے اس کی شدت اور اہمیت کو سامع یا قاری کے ذہن نشین کیا جاسکے تاکہ وہ پورے طور پر متاثر ہو سکے۔ لیکن لکھنؤی شاعری میں مبالغے کا استعمال کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ اشعار افسوس کہ بن کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً بیچارہ شاعر طرح طرح سے اپنی حالت زار بیان کرتا ہے مگر سننے والے کو اس سے کسی قسم کی ہمدردی پیدا ہونے کے بجائے اس پر ہنسی آتی ہے اور یہ نتیجہ ہے مبالغے کے نامناسب استعمال کا۔ آئیے پہلے شعرا کی اشکباری کے طوفان ملاحظہ فرمائیے :-

سرور :- ایسا فراقی یار میں رویا میں رات کو
 بستر پہ میرے ہو گیا پانی کمر کمر
 کمر پانی ہو جاتا تو معمولی بات ہے۔ جو بڑھیا قسم کے رونے والے ہیں ان کا سیل سرشک، سر سے بھی دو ہاتھ اوچھا رہتا ہے۔
 طالب :- سر سے دو ہاتھ بڑھا رہتا ہے ابیہم اشک
 ہوں وہ منظر کہ اٹھا لیتا ہوں دریا سر پہ
 اور بعض رونے والے ان بزرگ سے بھی ادبچے درجے کے ہیں :-

اک دل فراقی یار میں رویا میں اس قدر
 چوتھے فلک پہ پہونچا تھا پانی کمر کمر
 استاد جرات کی اشکباری کے سامنے دنیا کے بڑے سے بڑے رونے والے بھی گر دھو گئے۔ ارشاد ہوتا ہے :-
 جرات :- طوفان گرہ کیا کہیں، کس وقت ہم نشین
 موج سرشک تا فلک ہشت میں نہیں
 کیا اس قسم کے اشعار پڑھ کر کسی درمند محبت کی اشکباری کے تصور سے آپ کے دل پر چٹ لگتی ہے؟ کیا اس کے لئے آپ قلب میں کسی قسم کی ہمدردی کا احساس موجود پاتے ہیں؟ ۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے رورو کے دریا بہا دیئے، ان کا جسم گھل گھل کر کس درجہ لاغر ہو گیا ہوگا۔ ان بیچارے ناتوازیوں کے حال زار پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیے :-

گویا :- ناتواں ایسا ہوں گر سایہ پڑا دیوار کا
 گر پڑی گویا کہ سقف آسمان بالائے سر
 جوش :- اے سلیمان، زار ہوں یہ اک بری کے عشق میں
 بھر رہی ہے لے کے مور ناتواں بالائے سر
 آباد :- ابغریوں اس قدر کہ دکھائی نہ دوں گا میں
 اپنی طرح کرے گا مجھے بے نشان دہن
 ناسخ :- لاغر ہیں ہم ایسے کہ نگل جائے جو چوہنٹی
 اٹکے نہ ہمارا یہ تن زار گلے میں،
 کوثر :- کیا لاغری سے قدرت حق ہے کہ مورچے
 لیجائیں لاش عاشق دلیگر دوش پر
 سید :- یہ لاغری ہے دیکھیے جو تو نبض اے طبیب
 آجائے، جائے نبض، تن زار ہاتھ میں
 ناسخ :- لاغر ہوں میں ایسا کہ ترس کان کی بالی،
 ہو جائے صنم طوق کلو گھر گئے میں
 موزول :- اس قدر اے جان جان پہونچی ہے میری لاغری
 چوڑی پاؤں میں پڑے پڑے چھلچھلا ہاتھ میں
 آباد :- یہ ناتواں ہیں عشق کمر میں ہم اے طبیب
 داند نبض گم ہیں ہمارے کلاسیاں
 وزیر :- ہاتھ میں لے جاؤ لاغر فرمائے کے ساتھ
 ڈرنے اے قاصد کہ چپہ ہوتی ہیں اکثر انگلیاں
 طالب :- ہو جاؤں میں پامال یہاں تک تو ہوں لاغر
 چوہنٹی بھی جو شفقت سے رکھے دوش پر پشت
 ناسخ :- کس درجہ غم عشق میں گھل گھل کے موا ہے
 انگلی سے ہیں کم ناسخ مغفور کی ساقیں

نادر :- پاؤں جسم زار پر میرے پڑا، بولا وہ شونج
محسن :- میں وہ لاغر ہوں یہی سمجھا کنویں میں گر پڑا
ناسخ :- ہے گراں کتب، تو کا تپ سبک ہے قاصدا
عشقی :- الحمد للہ ضعف ایسا کرتو کا مہیدہ بدن
عرب میں صرف ایک شخص (مجنون) کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ کسی پرند نے اس کے جھاڑ جھنکاڑ پیسے بانوں میں گھونٹا
بنالیا تھا۔ مگر چارے لکھنؤی شعرا میں سے ہر شخص کا جوش دیوانگی اس درجہ پر پہنچا ہے کہ اسے اپنے سرو پا کا جوش ہی نہیں
چنا بچہ ہر شخص کے سر پر بلبلیں، چلیں، کوتے، طوطیاں، ہمارے دوسرے پرند آشیانے بناتے ہیں اور اسے مطلق خمیر نہیں ہوتی :-
عارف :- جان کر مجنوں مجھے ایک لیلی گلف نام کا
وحشت :- اس قدر سحرانوردی کی کہ مجنوں کی طرح
گویا :- اسے خط نورستہ مجھ کو تیز مجنوں جان کر
عرش :- اسے پرسی وہ شاہ اقلیم جنوں آباد ہوں
چند دلچسپ مبالغے اور ملاحظہ فرمائیے :-

حکیم :- آئے جب زیر قدم یاد مرزہ میں کانٹے
صبا :- تڑپے ہیں اس قدر ہیں دیوار بارہم،
افضل :- ہر چند جستجو میں رہے صاحب نگاہ
محسن :- ناذک کہتے ہیں اس کو، پاؤں زخمی ہو گئے
بارہویں خصوصیت - توسل - لکھنؤی شاعری کی ایک نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے غزل میں خواہ کیسے ہی زندانِ بلکہ
عراں اور حیا سوز منامین کیوں نہ باندھے ہوں، مقطع میں وہ غالباً حصولِ سعادت کی نیت سے، اکثر حضرت علی کا اور کبھی حضرت حسین
یا حضرت حسن یا رسول مقبول کا یا بچپن اور امامِ زمن کا ذکر کرتا ہے۔ کبھی ان بزرگوں کے توسل سے نجات کا طالب ہوتا ہے۔ کبھی ان کے مزار
کی زیارت کی تمنا کرتا ہے۔ کبھی ان کی محبت کا دم بھرتا ہے اور کبھی نعت و منقبت کو "حسن المآب" بناتا ہے :-

ناصر :- غم شبیر سے دامن جو ہے ترے ناصر
شجاعت :- یہ آرزو ہے شجاعت کہ کر بلا حاکم
زکین :- تصور میں زیارت جب ہوئی حامل ہمیں رگیں
نادر :- نہیں کچھ دغدغہ جرم و معاصی دل کو
عشقی :- اور عشقی کو تمنا نہیں کچھ دُنیا میں
ناسخ :- کر دیا سیراب ناسخ دم میں فوجِ تشہ کو
محسن :- یہ سمجھوں مہفت کشور کی ملی ہے سلطنت مجھ کو
ناصر :- طولِ حیات سے ہے یہ ناصر کا مدعا
شرق :- خدا کے فضل سے اسے شرق ایک دن ہم کو
جوش :- ملتا نہیں ہے بندہ کہیں ہاتھ غیر کا
خلیل :- درگاہ میں خدا کی دعا ہے یہ اسے خلیل

زبان اور رسم خط کا تعلق

(بحث کے لئے)

زبان کی قومی، بین الاقوامی اور تہذیبی اہمیت علمی حیثیت سے مسلم ہے۔ عملاً یہ دیکھا جاتا ہے کہ دنیا کی چھوٹی سی چھوٹی اور غیر متحد سے غیر متحد قوم کے پاس بھی زبان موجود ہے۔ زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جنہیں یہ مسئلہ پریشان نہیں کرتا کہ انسان قوت گوئی سے کس طرح کام لیتا ہے، تمدنی زندگی کی کس منزل پر زبان وجود میں آئی، اس کا ارتقاء کس طرح ہوا، انسان اور زبان کا کیا تعلق ہے، زبان اور قوم میں کیا رشتہ ہے، زبان کے تغیر میں کون سے عناصر کام کرتے ہیں، مادری زبان سے کیا مراد ہے اور زبان کس طرح زندہ رہتی ہے؟ یہ سوالات پیچیدہ ہیں اور عام فہم تو کیا علماء کے لئے بھی مشکل پیدا کرتے ہیں تاہم مختلف علوم کی مدد سے انسانوں نے ان سوالات پر بار بار غور کیا ہے اور آج کل جب انسانی حقوق پر علمی اور عملی حیثیت سے نگاہ ڈالی جا رہی ہے تو زبان اور زبان کے تعلق کا مسئلہ بھی زیر بحث آگیا ہے۔ ہندوستان میں زبان کا مسئلہ علمی اور عقلی حیثیت سے طے نہیں کیا جا رہا ہے اس لئے بہت سے لوگوں کے جذبات برہنگہ ہیں اور گتھیاں بڑھتی جا رہی ہیں، چنانچہ زبان سے متعلق کوئی مسئلہ چھپتے ہوئے فوراً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس سے جذبات اور غمیں وابستہ کر کے اس بحث کو علمی راستہ سے ضرور ہٹا دیں گے لیکن میں یہ چند سطریں اس امید میں لکھ رہا ہوں کہ ان پر سائنس اور علوم کی روشنی میں گفتگو کی جائے گی۔ زبان ہی کی طرح رسم خط کا مسئلہ بھی علمی اور غیر جذباتی غور و فکر کا مستحق ہے۔ کیا کسی زبان اور اس کے رسم خط میں کوئی باطنی تعلق ہے؟ کیا جس زبان کے لئے جو رسم خط استعمال کیا جا رہا ہے وہی اس کے لئے مناسب ترین ہے اور کیا ایک زبان کو دوسرے رسم خط میں نہیں لکھا جاسکتا؟ اور اگر لکھا جائے تو کیا یہ کوئی غیر فطری کوشش ہوگی؟ کیا اس سے زبان کی اصلیت اور حقیقت بدل جائے گی؟ اس وقت اس مسئلہ کو کسی خاص زبان یا رسم خط کی روشنی میں دیکھنا مقصود نہیں ہے بلکہ کسی زبان اور اس کے رسم خط کے تعلق کو دیکھنا ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ زبان پہلے وجود میں آئی، اس کی ابتداء کچھ شکل بھی رہی ہو وہ اظہار خیال اور اظہار ضبط کا ایک ذریعہ تھی، اس کا مقصد اظہار و ابلاغ تھا، اس سے وہ سماجی ضرورت پوری ہوتی تھی جس سے سماج کے ذہن میں کسی حد تک یکسانیت اور وحدت پیدا ہوتی ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ بحث بھی اٹھتی ہے کہ سب سے پہلی زبان کہاں اور کن لوگوں میں پیدا ہوتی ہے۔ کیا ابتداؤں کا ایک ہی زبان پیدا ہوا یا کئی زبانیں؟ لیکن یہاں اس سے بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ انسانی زندگی کی ابتدا میں زبان وجود میں آئی اور اگر یہ انسان کئی جگہ رہتے تھے تو ان کی سماجی ضروریات کے تحت مختلف مقامات پر مختلف زبانیں وجود میں آئیں، اس سے نفس خیال پر کوئی اثر نہیں پڑتا یعنی زبان انسانوں میں پیدا ہوئی اور ایک زبردست اجتماعی اساس کی حیثیت سے ابتدائی تمدن کو مضبوط کرنے میں مدد دی، یہ بات ناقابل انکار ہے۔ جب زبان اجتماعی زندگی کی تشکیلات اور تعمیر میں اتنی اہم ثابت ہوئی، جب اس نے ارتقا میں مدد دی تو اسے خود بھی قوتی ہوئی اور انسانی ذہن نے اس عجیب و غریب ایجاد کو دوام بخشنے کے لئے رسم خط ایجاد کرنے کی کوشش کی۔ بہر حال یہ بات طے شدہ ہے کہ زبان پہلے پیدا ہوئی اور اس کا رسم خط بعد میں۔ میں اس سے نتیجہ نکالتا ہوں کہ زبان اور رسم خط میں کوئی باطنی تعلق نہیں ہے بلکہ رسمی ہے اور اگر وہ بات تسلیم کر لی جائے تو زبان اور رسم خط کے متعلق جو بحث جاری ہے وہ محدود ہو سکتی ہے۔

یہاں ذرا دیر کے لئے ٹھہر کر اگر رسم خط کی ابتدا پر غور کریا جائے تو زبان اور اُس کے رسم خط کے تعلق کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ زبان ہی کی طرح رسم خط کی ابتدا بھی دھندھلکے میں ہے۔ لیکن جہاں تک اس سلسلہ میں تحقیقات ہوئی ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداء تصویریں حروف کی مختلف شکلوں سے ہوئی۔ پھر ابجد، چینی اور ہندوستانی فن تحریر کو دیوتاؤں سے منسوب کرتے تھے اور یہودی حضرت ہونانی سے۔ اس میں شکہ نہیں کہ تحریر کی ایجاد بھی تسخیر فطرت کا ایک ذریعہ تھی اور اپنی قوت یادداشت کو دہر پاد اور قوی تر بنانے کے لئے انسان نے اپنے خیالات کو جانی بوجھی تصویروں میں مقفل کر لیا تاکہ کلام ذہنی کی مدد سے وہ اپنے خیالات اور تجربات کی باز آفرینی پر قادر ہو سکے۔ یہ اہم سماجی کارنامہ سحر اور ٹوٹکے کے تصور پر بھی مبنی کہا جاسکتا ہے لیکن جب اس پر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ سحر کی مدد سے بھی فطرت کو شکست دینے یا اُس پر قابو پانے ہی کی کوشش کی جاتی تھی کیونکہ انسان اپنی ابتدائی زندگی ہی سے فطرت کے غلات میں جدوجہد کرنے لگا تھا اور اپنے محدود ادبی وسائل سے کام لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ تحریر آگے بڑھنے کا ایک ذریعہ تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ یادداشت میں سب سے زیادہ مدد قریب ترین مماثلت سے ملتی ہے اس لئے چیزوں کی تصویریں سب سے زیادہ فطری تحریر ہی جاسکتی ہیں۔ درخت کی تصویر دیکھ کر درخت کی یاد ضرور آئے گی اور اُس زندگی کے ابتدائی تجربوں کا جو تعلق درخت سے ہوگا تسلسل خیال انھیں بھی سامنے لا کر طرکے کا لیکن زبان محض اشیاء کے حامل کا مجموعہ تو نہیں، متحرک زندگی میں بنی بنائی چیزیں کم ہیں، خیالات کی رفتار عمل کی مختلف صورتوں اور حالتوں میں ربط پیدا کرتی ہے۔ اس لئے تصویریں تحریر کے علاوہ تصویریں تحریر بھی پیدا ہوئی جس میں خیالات اور تصورات کی علامتیں بھی بنائی جاتی تھیں، یعنی الفاظ خیالوں کی مفقوظی یا صوتی علامات کہے جاسکتے ہیں اور ان کی تصویریں تحریری علامات۔ اس تحریری علامت کا مقصد کسی آواز یا آوازوں کے مجموعے یا خیال کی طرف ذہن کو مقفل کر دینے کے سوا اور کچھ نہیں۔

تصویری تحریر خیالات کی علامت مقرر کرنے کی ابتدائی اور بھٹی کی کوشش تھی لیکن جب انسانی ذہن اور استوار ہوا اور اسکی تجریدی طاقت بڑھی تو اُس نے آوازوں کی علامتیں مقرر کرنے کی کوشش کی کیونکہ تصویریں رسم خط میں جتنے الفاظ ہوتے تھے اتنی ہی علامتوں کی ضرورت پڑتی تھی، پھر مصوری پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے بعض تصویریں ایک دوسرے سے مل جاتی تھیں اور التباس پیدا کرتی تھیں اس لئے زیادہ سا مضطرب طریقہ کی جستجو ضروری تھی۔ جلد گھسنے کی کوشش میں تصویریں محض علامت بن کر رہ جاتی تھیں اور شبال کیا جاتا ہے کہ حروف تہجی انھیں تصویریں یا تصویری تحریروں کی ارتقائی شکل ہیں۔ ابتدائی عبرانی اور یونانی حروف تہجی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر حرف کو فی معنی رکھتا ہے اور ان کی ابتدائی شکل اُس مفہوم یا معنی سے صوتی مماثلت رکھتا ہے۔

اس وقت علمی حلقوں میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ قدیم ترین رسم خط کے نمونے (جو تصویریں یا ہیر و غلیفی نہیں ہیں) شالی سامی قوموں میں ملتے ہیں انھیں کی مختلف شاخیں اور شکلیں کنعانی (یعنی ابتدائی عبرانی اور فنیقی) آرامی، جنوبی سامی اور یونانی کے روپ میں پڑھیں اور پھیلیں۔ یہ آرامی رسم خط تھا جس سے کئی رسم خط نکلے یا کم سے کم اس سے خیال اور اثر لے کر دوسرے رسم خط بنائے گئے چنانچہ قدیم پہلوی تو آرامی رسم خط سے نکلا ہی ہے، برہمی رسم خط بھی اس کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے لیکن یہ بات بہت بحث طلب ہے کیونکہ ابتدا کی کمی یا دہنی طرف سے لکھا گیا اور کبھی بائیں طرف سے۔ یہاں نفس بحث سے اس کا تعلق بھی نہیں ہے، صرف یہ ظاہر کہ مقصود ہے کہ ہر زبان اپنے ساتھ رسم خط لے کر پیدا نہیں ہوئی بلکہ تہذیبی ترقی، تجارتی تعلقات اور سماجی اثرات کے تحت ایک ہی رسم خط اور حروف کئی زبانوں کے لئے استعمال ہونے لگے اور آہستہ آہستہ امتداد و زمانہ سے ان میں تغیرات ہوئے۔ زبانوں میں بھی اضطراب ہونے رہا لیکن پھر بھی کثرت استعمال اور قومی خصوصیات وغیرہ کی وجہ سے زبانوں نے اپنی آزاد حیثیت بہت کچھ برقرار رکھی لیکن قومی تحریر جو ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کر کے پہنچا تو ایک ضروری سماجی ایجاد ہوئے کی وجہ سے لوگوں نے اُسے اپنا لیا اور اپنے الفاظ کو بھی صوتی تحریریں لباس عطا کر دیا۔ مدت گزر جانے کے بعد معمولی تغیرات کر کے ہر ملک میں اُسے قومی رسم خط یا مخصوص زبانوں سے وابستہ

م خطا سمجھ لیا گیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جس طرح زبانوں میں تبدیلی ہوتی رہی ہے اُس طرح رسم خط میں نہیں ہوتی ہے۔ معمولی صوتی تغیرات نے معمولی تبدیلیاں کر لی گئیں۔

ڈیوڈ ڈیوڈنگر جس نے حروف تہجی پر بڑی عالمانہ کتاب لکھی ہے تحریر کے انقلابی فنی کوشاں مغربی سامیوں کے منصوبہ کو تباہ ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ وہ جس سے یہ حروف یونانیوں میں پہنچے اور یونانیوں نے ان میں اضافے کئے۔ انھیں چڑوں سے برابر شاخیں نکلتی رہیں اور ٹکڑوں ٹکڑوں میں پھلتی رہیں کسی رسم خط کو مکمل طور پر تمام حروف صحیحہ اور تمام حروف علت کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ ابھی ہند سال پہلے تک روس کی بعض زبانوں کے پاس رسم خط نہیں تھا۔ علمائے لسان نے ان زبانوں کو ترقی دینے کے لئے ان کے رسم خط بنادے۔

ساری دنیا کے انسانوں کو ایک کرنے کی کوششیں ہمیشہ سے ہوتی رہی ہیں، کبھی مذہب نے یہ فرض انجام دینے کی کوشش کی ہے، کبھی سیاسی فلسفہ نے، کبھی سب کے لئے ایک زبان ایجاد کرنے کی کوشش ہوتی ہے اور کبھی ایک رسم خط۔ ان کے پیچھے حکمرانی اور اقتدار کے جو جذبات کارفرما ہیں وہ اتنے نمایاں ہیں کہ ان پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ آج بھی ایک قوم یا خط کی زبان دوسرے خطوں پر لادنے میں یہی جذبہ کام کرتا ہے کہ اُسے مختلف قسم کی وجہوں سے فلسفیانہ اور عالمانہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن چونکہ اس میں جبر کے پہلو شامل ہوتے ہیں اس لئے کبھی کامیابی نہیں ہوتی۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر کسی طرح زبان اور رسم خط میں یکسانیت پیدا ہو جائے تو کچھ صدیاں گزر جانے کے بعد اس سے فوائد ضرور مرتب ہوں گے لیکن اصل سوال یہ ہے، کیا جس طرح زبان قوم کی تشکیل و تعمیر میں معاون ہوتی ہے اُسی طرح رسم خط بھی کسی زبان سے وابستہ ہوتا ہے؟ تقریباً تمام ماہرین لسانیات اس خیال سے متفق ہیں کہ زبان اور رسم خط میں کوئی خاص تعلق نہیں، آواز اور اُس کی ظاہری تحریری علامت میں کوئی لازمی ربط نہیں ہے۔ پھر جو یہ خیال بار بار دہرایا جاتا ہے کہ اگر کسی زبان کا رسم خط جلا گیا تو وہ زبان بھی ختم ہو جائے گی، اس کا کیا مطلب ہے؟

جب تک تحریر کا فن ایجاد نہیں ہوا تھا زبان کا استعمال محض صوتی حیثیت رکھتا تھا، اُس وقت زبان کسی رسم خط سے وابستہ نہ تھی، لفظوں کی آواز کو محض سامعہ گرفتار کرتا تھا اور بولنے والے کی آواز جو تاثر یا ردِ عمل سننے والے میں پیدا کرتی تھی وہ کچھ دنوں میں اُس کے پہچانے کا عادی بن جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مخصوص الفاظ مخصوص تاثر پیدا کرنے لگتے تھے اور الفاظ کے معنی تعین ہو جاتے تھے، الفاظ کی سماجی حیثیت معنی کے بھی سماجی اہمیت بخشی تھی۔ زبان کا جو مقصد تھا وہ اس طرح پورا ہو رہا تھا۔ جب لکھنے کا فن ایجاد ہوا تو تاثر اور ردِ عمل کو دوام بخشنے کے لئے صوتی تصویروں کو جو سامعہ کی مدد سے ذہن میں ملتی تھیں تحریری علامتوں میں منتقل کر دیا گیا اور وہ تاثر باصرہ کی مدد سے ذہن پر منعکس ہونے لگا۔ سیکھنے اور دیکھنے کے بعد مختلف علامات کی آوازیں اُسی طرح ذہن میں بننے اور تاثر پیدا کرنے لگتی ہیں جس طرح سننے اور سیکھنے کے بعد۔ اگر کسی شخص کو کوئی زبان نہ معلوم ہو تو اُس کے الفاظ (یعنی آوازوں کے مجموعے) سننے کے بعد بھی وہ انھیں سمجھ نہ سکے گا اسی طرح انھیں کسی معلوم یا نامعلوم رسم خط میں لکھا ہوا دیکھنے کے بعد بھی کچھ سمجھا سکے گا۔ تاثر یا ردِ عمل کی وہ منزل جو مفہوم تک ذہن کو پہنچا دے ہمارے علم پر منحصر ہے اور اس کا تعلق عادت سے ہے۔ جس جس رسم خط کو ہم جانتے ہیں اور جس حد تک جانتے ہیں اُسی حد تک ہم اُسے دیکھ کر جلد یا بدیر تاثر حاصل کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مقصد یہ ہے کہ مخصوص تحریری علامتوں کو دیکھ کر مخصوص آوازوں کی طرف ذہن کا منتقل ہوتا محض ہماری عادت پر منحصر ہے اور یہ عادت اکتسابی ہوتی ہے، اس مخصوص علامت کا تعلق ایک مخصوص آواز کے ساتھ ہلکا مقرر کیا ہوا ہے، مثال کے طور پر کسی آواز کو کہتے ہیں۔ ج۔ آواز تقریباً دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے۔ کچھ لوگ اسے لڑائی کی شکل میں پہچانتے ہیں، کچھ لوگ آج کی شکل میں، کچھ لوگ ق کی شکل میں، کچھ لوگ رسم خط میں جی میں یا آواز کسی دوسری شکل میں ملتی ہے۔ اگر

کوئی شخص تمام رسم خطوں کو جانتا ہوگا تو وہ ہر جگہ اس آواز کی تحریر ہی صورت یا علامت کو پہچان لے گا اور چند کو جانتا ہوگا تو محض انہیں میں پہچانے گا اور اگر صرف ایک کو جانتا ہوگا تو صرف اسی ایک میں پہچانے گا، اگر کسی قسم کے رسم خط سے واقف نہ ہوگا تو وہ یہ آواز جاننے کے بعد بھی اُس کی صورتی یا تحریری شکل سے بالکل ناواقف ہوگا۔ جو شخص کوئی رسم خط نہیں جانتا اُسے آوازوں کے پہچاننے کے لئے کوئی رسم خط سکھایا جاسکتا ہے اور تھوڑے ہی دنوں کی مشق کے بعد اُن آوازوں کو جنہیں وہ بولتا چالی میں استعمال کرتا ہے اُس رسم خط میں پہچاننے کا عادی ہو جائے گا، چاہے وہ رسم خط کوئی ہو اور زبان کوئی۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا دنیا کا کوئی رسم خط مکمل نہیں ہے لیکن جو رسم خط جتنا اچھا ہوگا اُسی قدر وہ آوازوں کی اچھی علامتیں یعنی آوازوں سے زیادہ سے زیادہ مماثلت رکھنے والی علامتیں بنیں گی کہ اسے اور اُسی قدر سائنٹفک کہا جائے گا، لیکن جو نگاہیں جس رسم خط کی عادی ہو جاتی ہیں وہی اُن کے لئے آسان معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اور جاپانی رسم خط بہت مشکل ہیں لیکن جو لوگ صرف انہیں علامتوں میں آوازوں کے پہچاننے کے عادی ہو چکے ہیں، وہ آسان سے آسان رسم خط کو بھی ابتداء میں اُن کے ترجمہ میں مشکل سمجھیں گے۔ ایک شخص کوئی رسم خط اور کوئی زبانیں جانتا ہو تو اُس کی عادت ہر زبان کو اُس کے مروجہ رسم خط میں پڑھنے کی ہو جاتی ہے لیکن اگر ایک زبان دو سے رسم خط میں لکھ دی جائے تو زبان جاننے کی وجہ سے وہ رسم خط کی دشواریوں کو عبور کر سکے گا اور جس قدر مشق بڑھاتا جائے گا اُسی قدر یہ دشواری ختم ہوتی جائے گی یہاں تک کہ وہ کسی زبان کو کسی رسم خط میں پڑھنے لگے گا۔

اسے ایک طرح اور دیکھا جاسکے۔ اگر زبان اور رسم خط میں کوئی ایسا تعلق ہو تا کہ ایک زبان کے الفاظ اُسی کے مروجہ رسم خط میں کوئی ردِ عمل یا تاثر پیدا کر سکتے تو البتہ یہ سوال دشواری پیدا کرتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ اصل ردِ عمل مفہوم کی واقعیت سے پیدا ہوتا ہے نہ تحریری علامت سے نہیں۔ مثلاً ہم بہت سے انگریزی الفاظ اردو میں استعمال کرتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر انہیں اردو رسم خط میں لکھ بھی دیتے ہیں جیسے پبلک، پوسٹری، پولیٹیکل، میچ وغیرہ اور ہر وہ شخص جو ان الفاظ اور ان کے معنی سے واقف ہے بغیر کسی وقت کے انہیں پڑھ لیتا ہے۔ اگر یہ الفاظ انگریزی رسم خط میں لکھے جائے تو اُس رسم خط سے ناواقف ان الفاظ کے معنی جاننے کے بعد بھی انہیں پڑھ نہ سکتے۔ ان تمام باتوں سے یہ واضح نتیجہ نکلتا ہے کہ زبان اور رسم خط میں کوئی تعلق نہیں ہے، یہ ہماری روایت اور عادت ہے جو ان میں تعلق پیدا کرتی ہے، جس طرح کی عادت ڈالی جائے پڑ جائے گی یعنی اگر انگریزی زبان کو فارسی رسم خط میں اور اردو زبان کو انگریزی یا لاطینی رسم خط میں لکھنے لگیں تو یہ کوئی غیر فطری، ناممکن العمل یا علمی حیثیت سے غلط فعل نہ ہوگا۔ دونوں رسم خط ایسے ہیں جن میں بعض اوقات بولنے اور لکھنے میں فرق ہوتا ہے اردو کا ”بالکل“ انگریزی یا لاطینی رسم خط میں اپنا اُلٹ لکھ دے گا اور انگریزی کا H یا G اردو میں لکھا جائے گا تو دو حرفت G اور H غائب ہو جائیں گے اور اردو میں یہ لفظ تلفظ کے مطابق ہانی رہے گا ہر زبان میں رسم خط کا مقصد ایک ہی ہے، آوازوں کی علامتیں معین کر کے انہیں استقلال بخشنا، کہیں بھی یہ علامتیں معنی کے متعین کرنے میں مدد نہیں دیتیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر پھر لکھے ہوئے لفظ کے معنی کا تعین ہی نہ ہو سکتا، لیکن ہم جانتے ہیں کہ تقریباً کرتے وقت ہم لفظ کے معنی محض اُس کی صوتی حیثیت کو سامنے رکھ کر سمجھ لیتے ہیں۔ اب اگر یہ بات طے ہو جائے کہ زبان اور رسم خط دو الگ الگ چیزیں ہیں اور کوئی زبان کسی رسم خط میں لکھی جاسکتی ہے تو پھر اردو کے لئے دیوناگری، لاطینی اور فارسی رسم خط میں سے کسی ایک کے انتخاب کرنے کا سوال دوسری نوعیت اختیار کر لے گا۔ فطرت، مزاج اور نفسیات کے نام پر بہت سے علمی مغالطے طیار کئے گئے ہیں انہیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر رسم خط بدل دیا جائے گا تو زبان بدل جائے گی یا خراب ہو جائے گی۔ اگر اس بحث سے مقبول نتائج برآمد ہوں تو پھر بحث شروع کی جائے گی کہ کسی رسم خط کے اختیار کرنے میں کن باتوں کا لحاظ رکھا جائے اور کچھ اس سلسلہ کی نوعیت کیا ہے۔

سید احتشام حسین

(نگار) ہمارے فاضل دوست پروفیسر سید احتشام حسین صاحب نے بڑی اہم بحث شروع کی ہے جس پر ہر شخص کو اپنی جگہ

باب الاستفسار

ماتریدی

(جناب غفران احمد صاحب۔ گوالیار)

مسلمانوں میں ایک جماعت ”ماتریدی“ کا نام بھی سننے میں آتا ہے، جو شاید سنی شیعہ سے علاحدہ کوئی چیز ہے۔
ازراہ کرم اس پر روشنی ڈال کر ممنون کیجئے نیز یہ بھی بتا ہے کہ اسے ماتریدی کیوں کہتے ہیں۔

(نگار) ماتریدی نام ہے ایک گاؤں کا جو سمرقند کے مضافات سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی جگہ ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام ابو منصور محمد بن محمود تھا۔ ان کا شمار متکلمین اسلام میں ہوتا ہے۔ ماتریدی، اشعری اور سنی دراصل تینوں اہل سنت والجماعت ہیں، تینوں فقہ حنفی کے مفسر و شراح ہیں اور تینوں معتزلہ کے خلاف ہیں، لیکن اس سلسلہ میں اشعری جماعت کا نام زیادہ لیا جاتا ہے، البتہ ماوراء النہر کے علاقہ میں حنفی مسلک کا نایبندہ ماتریدی اسکول کو سمجھا جاتا ہے۔

اشعری، ماتریدی اور طحاوی تینوں ایک ہی زمانہ کے متکلم تھے اور ان کی وفات کا زمانہ بھی تقریباً ایک ہی تھا۔ اشعری کا انتقال ۳۲۰ھ میں ہوا، ماتریدی کا ۳۳۰ھ میں اور طحاوی کا ۳۲۰ھ میں۔ ان تینوں کا مقصد اعتزال والحاد کا مقابلہ کرنا تھا۔ نسفی، ماتریدی عقاید کے پیرو تھے جن کی مشہور کتاب شرح عقاید نسفی، اصول فقہ پر ہندوستان و مصر دونوں جگہ درس میں شامل تھی۔ مصر کے مشہور عالم محمد عبدہ بھی ماتریدی عقاید کی طرف مایل تھے۔

اشاعرہ اور ماتریدیوں کے درمیان تیرہ اختلافات تسلیم کئے گئے۔ جن میں سے سات کا تعلق خیالات سے ہے اور چھ کا الفاظ سے۔ اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کا ارادہ ہی اصل چیز ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جزا و سزا کا تعلق اخلاق سے نہیں ہے، لیکن ابو حنیفہ اور ان کے بعد ماتریدیوں کا مسلک یہ ہے کہ انسان کو اپنے اعمال پر اختیار دیا گیا ہے اور اسی لئے وہ جزا یا سزا کا مستحق ہو سکتا ہے۔ ابو حنیفہ کا عقیدہ ہے کہ انسان کا ہر فعل خدا کے ارادہ سے وابستہ ہے لیکن خدا اس پر راضی نہیں کہ اس کے بندہ سے کوئی گناہ سرزد ہو۔ ماتریدی عقاید کی رو سے نجات کا یقین حاصل ہو سکتا ہے، اشاعرہ اس کے قائل نہیں۔ ایک ماتریدی کہہ سکتا ہے کہ میں خدا کا یقینی قائل ہوں، لیکن ایک اشعری صرف اتنا کہے گا کہ ”میں خدا کا قائل ہوں اگر خدا چاہے۔“ بعد کہ ماتریدی خیالات نے اشعری اسکول میں بھی درخور حاصل کیا اور بہت سی باتوں میں دونوں متفق ہو گئے۔

مزدکی مذہب

(ابو محمد صاحب۔ یاقوت پورہ، حیدر آباد دکن)

مزدکی مذہب جسے نوشیروان کے باپ قباد و شہنشاہ ایران اور کنزہ کے بادشاہوں نے اختیار کیا اس کے اصول و عقاید کیا تھے اور کب سے کب تک ایران یا دیگر مقامات میں اس کا رواج رہا۔

(نگار) صحیح لفظ مزدک ہے، مزدک (بضم میم) نہیں۔ اس موضوع پر نگار کے باب الاستفسار میں عرصہ ہوا اظہار خیال کر چکا ہوں۔ استفسارات جلد سوم ملاحظہ فرمائیے۔

اخبار علمیہ

حاملہ عورتوں کا خون دوا ہے :- بات عرصہ سے دیکھی جاتی تھی کہ وہ عورتیں جو گٹھیا اور وجع مفاصل کی مرضی ہیں، حمل کے دوران میں اور ولادت کے بعد بھی دوا دہانگ اس مرض کی تکالیف سے محفوظ رہتی ہیں، لیکن ابھی تک کسی نے غور نہ کیا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔

اب ڈاکٹروں نے اس پر عملی حیثیت سے غور کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حاملہ عورت کے خون میں مزد کوئی نئی چیز پیدا ہو جاتی ہے جو وضع حمل کے بعد بھی دو مہینے تک باقی رہتی ہے اور اس سے دوا کا کام لینا چاہئے۔ چنانچہ حال ہی میں اس کا تجربہ کیا گیا اور وضع حمل کے بعد ایک تہہ ست حاملہ کا خون سات اونس کے مقدار میں لیکر گٹھیا کے مریضوں کو دیا گیا تو چند مہینوں میں مرض کا ازالہ ہو گیا۔

اس طرح ایک اور عورت کا علاج کیا گیا جس کا وزن صرف ۹ پونڈ رہ گیا تھا اور معدومہ لاغر و نحیف ہو گئی تھی۔ اس کو بھی حاملہ عورت کا خون دیا گیا اور وہ بالکل اچھی ہو گئی یہاں تک کہ اس کا وزن ۷۰ پونڈ ہو گیا۔ یہ خون پیکارسی کے ذریعہ سے جسم میں نہیں پہنچایا جاتا۔ بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے پلایا جاتا ہے اور ایک مریض کے لئے صرف چار گھونٹ خون سال بھر کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں دشواری کی بات یہ ہے کہ حاملہ عورتوں کا خون آسانی سے ہر وقت نہیں مل سکتا اس لئے کوشش کی جا رہی ہے کہ حاملہ کا خون لیکر تخلیل و تجزیہ کے بعد معلوم کیا جائے کہ اس میں وہ کیا چیز پیدا ہو جاتی ہے جو وجع مفاصل کے لئے مفید ہے اور اس کا کھان کر محفوظ کر لیا جائے۔

کمی خون کا جدید علاج :- خون کی کمی کا جدید ترین علاج حیاتیات ب - ۱۲ (ویٹامین) کا استعمال ہے۔ اور تازہ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ چیز سورو کے امعاء میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے، چنانچہ یہ حیاتیات سورو کی آنتوں سے حاصل کر کے پیکارسی کے ذریعہ مریض کے خون میں پہنچائی جاتی ہے اور اس سے بہت جلد سرخ خون کے صحیح ذرات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جامعہ ٹورین کے ایک ڈاکٹر مار یو ڈیگیل نے حال ہی میں دو ایسے شخصوں پر آپریشن کیا جو مرچکے تھے اور آپریشن کے بعد ان میں زندگی عود کر آئی۔ اس آپریشن کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر موسون نے بیان کیا کہ موت کی بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں قلب کی حرکت بند ہو جاتی ہے لیکن دوران خون کچھ نہ کچھ جاری رہتا ہے، ان حالتوں میں اگر گردن کی ان عروق (۷۷) میں جو دماغ تک گئی ہیں، خون پیکارسی کے ذریعہ سے پہنچا دیا جائے تو قلب بھر حرکت میں آتا ہے۔ چنانچہ اس نے دو ایسے آدمیوں پر جن کے قلب کی حرکت بند ہو گئی تھی، یہ عمل کیا تو دوران خون شروع ہو گیا اور بھر آئے یہ زندگی عود کر آئی۔

دل بدلا جاسکتا ہے :- ڈاکٹر ولادیمیر ڈیمیگیوٹ روسی ڈاکٹر نے ایک حیرتناک آپریشن کے ذریعہ سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر دل بدلا جاسکتا ہے کسی کے قلب میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو وہ بدلا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس کا تجربہ اس نے ایک بچہ پر کیا۔

اس نے آپریشن کر کے اس کے سینہ کے جوت میں سپید ایک دل نصب کیا اور جب وہ اپنا کام کرنے لگا، تو اس نے اصلی دل کو کال یا اس تجربہ نے اس امکان کو قوی کر دیا ہے کہ آئندہ انسان کے قلب کو بھی اسی طرح بدلا جاسکتا ہے۔

کالیفورنیا کی فورسٹروپ کمپنی بجلی کا ایک ٹیپ آلہ طیارہ کیا ہے جس کا نام ماڈیا ہے۔ اس کے ذریعہ سے نہ صرف ریاض ہمتی و مانع و حساب کے مشکل ترین مسائل حل کئے جاسکتے ہیں، بلکہ وہ ایک راکٹ جہاز کی رہنمائی بھی کرے تو ممکن کر سکتا ہے اور کارخانے کی مشینیں بھی اس کی قوت سے چلائی جاسکتی ہیں۔

علم حیات کا یہ مسئلہ بڑا مشکل ہے کہ زہرہ خلا یا **زہرہ خلا کا مطالعہ** علم حیات کی حالت میں ہو، کیونکہ کرکے جاسے۔ اس مطالعہ میں دشواری یہ حاصل ہے کہ ان خلا یا کی بناوٹ خود وہ حیوانی ہوں یا نباتاتی روشنی میں بانٹل شفات نظر آتی ہے اور اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

کوشش کی گئی کہ ان خلا یا کو رنگین کر کے دیکھا جائے، لیکن اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ یہاں تک فوق البنفسی (Ultraviolet) شدہ اشعہ بھی یا تو خلا یا کو ہلاک کر دیتی ہیں یا مضمحل بنا دیتی ہیں۔

اب ڈاکٹر روپرٹ بادو نے نہایت کردہ و بنفشی شعاعوں سے کام لیکر معلوم کیا ہے کہ ان کا اثر خلا یا پر نہیں ہوتا اور اس نے ممکن ہو گیا ہے کہ خلا یا کی کیمیائی ترکیب کا حال معلوم ہو سکے اور علم الحیات کے بہت سے رموز منکشف ہو سکیں۔

جوہری طاقت سے بجلی جوہری طاقت جس سے آٹم بم وغیرہ ہلک آلات طیارہ کئے جاتے ہیں، بڑی زبردست طاقت ہے اور اس سے دوسرے کام بھی کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اب ماہرین کوشش کر رہے ہیں کہ اس سے امریکہ کے صنعتی و اقتصادی مسائل کی دشواریوں کو دور کیا جائے۔

اس وقت جہاں جہاں اٹومیم کے کارخانے ہیں وہ سب بجلی سے چل رہی ہیں اور ان کے لئے بجلی کی بہت بڑی قوت حاصل کرنا پڑتی ہے۔ اسی طرح کانچ اور لوہے وغیرہ کی صنعتوں کے لئے کوئلہ کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ الغرض اس وقت کوئی صنعت ایسی نہیں ہے جسکے لئے بجلی، کوئلہ یا پٹرول کی ضرورت نہ ہو اور ان سب کے بھیا کرنے کے لئے بڑے مصارف برداشت کرنا پڑتے ہیں، لیکن جوہری طاقت سے بجلی پیدا کرنے کے بعد یہ تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے اور وہ ممالک بھی جہاں کوئلہ وغیرہ کی کمی ہے آسانی سے اپنی صنعت کو ترقی دے سکیں گے۔

• نگار کا آئندہ سالنامہ
ایک ایسی معرکہ آرا تصنیف ہوگی جس کی اس وقت سب زیادہ ضرورت ہے،
یعنی

اُردو زبان کی لسانی تاریخ

(پروفیسر شوکت بیہواری کے قلم سے)

جس میں اُردو زبان کے ماخذ کا کھوج کیا گیا ہے اور اسکے تمام صوتی، صرفی، نحوی سرمایہ کی مفصل و جامع تاریخ پیش کی گئی ہے۔

یہ کتاب نتیجہ ہے سالہا سال کے غایر مطالعہ کا اور علاوہ طلبہ کے ہر اس شخص کے لئے بھی جو اُردو زبان سے دلچسپی رکھتا ہے اس کا مطالعہ از اس ضروری ہے۔ یہ کتاب نگار کے سائز پر نہیں بلکہ کتابی سائز پر شایع ہوگی اور تقریباً ۳۵۰ صفحات کو محیط ہوگی۔ اس کی قیمت چار روپیہ ہوگی، لیکن نگار کے مستقل خریداروں کو صرف ڈیڑھ روپیہ میں مل سکے گی۔

منیر نگار - لکھنؤ

آزاد غلاموں کے نام

یہ ہوا، یہ دھوپ، یہ برسات، یہ خرمن، یہ کشت
 جسکی کمرنوں نے کفنِ ظلماتِ دوراں کے لئے
 لے لے دلِ محراب و منبر، اے ضمیرِ خانقاہ
 تیز ہے جس کے نفس سے آج ہر لالے کی آگ
 جن کے زخموں پر پڑا ہے آج ملت کا نقاب
 خشتِ ہر دیوار سے آتی ہے جن کے عوں کی بو
 کتنی گلیوں کے خنک سرائے میں کھلاتے ہیں پوپ
 تیرگی سے آج بھی بوجھل ہے پشتِ آفتاب
 آج بھی نہتے ہیں عریانی پہ کج خواب و حریر
 آج بھی اکی طنز ہے راتوں پہ سوچ کا فروغ
 طاعتِ تقدیس کی شمعیں ہیں اب بھی دو و خیز
 زہد کی فتنہ گرمی ہے آج بھی پشمینہ پوش
 مومن و مہیش و صوفی اب بھی ہیں یزداں شرکار
 لے لے تیرے دام کا پنخیر ہے سارا بہشت
 تو سمجھتا ہے وہ سورج ہے فقط تیرے لئے
 ہند کے زندہ شہیدوں کی طرف بھی اک نگاہ
 اس ہوا سے بچھ چکے ہیں بیج بتا کتنے سہاگ
 اُن شہیدوں کی رگوں سے کس نے کھینچی ہو شراب
 آج اُنہی کے زرد چہرے دیکھ کر منہ تباہ ہے تو
 آہ کن چہروں کو جھلساتی ہو "آزادی" کی دھوپ
 آج بھی سکوں میں بک جاتے ہیں لاوارث شہاب
 زہر میں ڈوبے ہوئے ہیں آج بھی سونے کے تیر
 اب بھی قائم ہے "مساوات و اخوت" کا فروغ
 آج بھی ابلیس ہے یزداں سے سرگرم ستیز
 آج بھی "گندم نا" ہیں مسجدوں کے "جفر و ش"

 اب بھی ہر دوکان پہ بکتے ہیں رسول و کردگار

آج بھی ریش و عبا ہے مسجد و منبر کا سود، آج بھی ہیں رونق بازار کبے کے یہود
 رہ گئے ہیں بجھ کے جن تاریک سینوں کے چراغ، ان کے ماتھوں پر بھی ہیں ابھرے ہوئے سجدے کا داغ
 اب بھی سلماتے حرم عنتی ہے بوجھل و یزید، آج بھی ارزاں ہے اس بازار میں خونِ شہید
 اب بھی تیمور و ہلاکو کو ہے بازارِ عسکارت، آج بھی جنگیز گر جاتے ہیں کبے کا طوان
 دام افگن ہیں حرم پر آج بھی لات و منات، آندھیل کی زد پہ ہے اب بھی چراغوں کا ثبات
 ظلمتوں میں اب بھی ہے ڈوبی ہوئی انسا کی لوح، آج بھی درکار ہے آدم کو اک طوفانِ نوح
 لب کشائی اب بھی ہے حق و صداقت پر حرام، آج بھی سقراط کا ہے زہر سے لب ریز جام
 اپنے بوجھلوں سے ہیں اب بھی پیمبرِ بیم ناک، آج بھی سکتے ہیں ہوش و خرد کے سینہ چاک
 کار فرما اب بھی ہے دین و سیاست کا فریب، قسمت ہر ابنِ مریح اب بھی ہے مرگِ صلیب
 اعتبارِ ناخدا و بادِ باں کچھ بھی نہیں، بحر کے سینے میں جز موجِ دعاں کچھ بھی نہیں
 ان شکستہ کشتیوں کے ڈوبنے کا غم نہ کر، فطرتِ دریا سمجھ گرد اب کا ماتم نہ کر
 یہ ہوائیں 'یہ اندھیرا' یہ تلاطم، یہ بھنور، ہیں کسی طوفانِ نو آغاز کے پیغامِ بر
 بھر رہتا ہے سینے ٹوٹ کر رہ جائیں گے، موج کہتی ہے یہ ساحل دور تک پہ جائیں گے

کوئی طغیانی ہو اپنا رخ بدلتی ہے ضرور

ناخدا ڈوبے کہ ابھرے موج چلتی ہے ضرور!!

(پروفیسر شورش علیگ)

تاریک مقبرہ

یہ آنسوئوں کی بغاوت، یہ چیختے ہا دل
جراثیموں کا نشین، ہزیمتوں کی زمیں
اماں ملی ہے سفینوں کو تیز دھا روں میں
ہوئی ہے تلخی احساس شعلہ زن کیا کیا
یہ عشق و فرض کے دو زخ طراز ویرانے
یہ مرگ و زیت کے ساحل، یہ رات کے گرداب
یہ دردِ دل، یہ مشیت کی چین پشانی،
یہ تہقہوں کے جہنم، یہ زلزلوں کے وطن
نہ چھ کتنے شرارے ہیں سرِ آہوں میں
عیاں ہے "ظلمتِ گرد" کن جبینوں سے
یہ رنگ و نور کے حاسد، یہ زندگی کے رقیب
بکھر چکے ہیں بہت برق و سیل کے گیسو
مہ و نجوم ہر دام آئے ہیں کیا کیا
نہ پوچھ شور گہ ممکنات کی تقدیر — !
شکارِ گھیل چکا آسماں شہیدوں کا
بدل گئی ہیں گھٹاؤں کی نیتیں کیا کیا
لڑی ہے شمع سحر کس قدر فضاؤں سے
سلگنے والے ہیں جھوٹے پیمبروں کے کفن
جب انقلاب زمانے کا رخ بدلتا ہے
نسیم غلبہ ہو میں نہا کے آتی ہے

یہ اعتبار و یقین کے بچے بچے سے کنول
حیات خاک بسر اور موت عرش نشین
چھپے ہوئے ہیں تلاطمِ گہر کناروں میں
بدل چکا ہے غم دوست پیرہن کیا کیا
وہی ظلم حقیقت، وہی الم خانے
اکٹ سکے نہ حادث خود آگہی کے نقاب
یہ نام و نسل کے آذر کدے، یہ ویرانی
خزانی فروش بہاریں، شگوفہ سوز چمن
بھٹک رہے ہیں آجائے سیاہ راہوں میں
ٹپک رہا ہے ہو کتنی آستینوں سے
اٹھائے پھرتے ہیں بے روح جنتوں کے صلیب
سموم یاس کرے گی کب آنسوؤں سے وضو !
شب فراق کے پیغام آئے ہیں کیا کیا
کہ سیم و زر کی ہواؤں سے بچ گئے ہیں ضمیر
صنم کدہ ہے کہ مرن خدا رسیدوں کا
لٹی ہیں گنگ و ہما کی عصمتیں کیا کیا
ستیزہ کار ہے انسان کن خداؤں سے
میں سن رہا ہوں دلی نیل و طور کی دھڑکن
تو فصل گل میں گول کا سہاگ جلتا ہے
نظر خود اہل نظر کی ہنسی اڑاتی ہے

بنا چکا ہے جنوں کتنے سرخ تاج محل
نگاہ و فکر کے تاریک مقبرے سے نکل !!

دھارے

میں آخر اس زندگی میں قوم و وطن کے کتنے فریب کھاؤں
 میں تیرگی کی فضا میں تاجند روشنی کے کنول جلاؤں
 میں تاجک و پشت فشک و ویران کوہم سوا زمین بناؤں
 چمن کے پھولوں کا نام دیکر چمن کے خاروں کو کیا کرونگا
 خزاں کی آندھی اٹھی چمن میں و دایع گل کا پیام دیتی
 نہ ایک لمحہ بھی ہلہلہائی شعاعِ نجم و قمر کی کمی تھی
 سمیٹ کر اپنی دھوپ کو ساتھ لے گیا آفتاب گیتی
 میں ان نسرودہ بجھے بجھے زرد و ستاروں کو کیا کروں گا
 یہ آئینہ تیرہ بختیوں کا یہ بے آلی حقیقتوں کی
 یہ انجمن خود فریبیوں کی یہ بزم جھوٹی صداقتوں کی
 یہ پستی جہل کا ہمالہ یہ خشک گنگا مسرتوں کی
 ضمیر انساں کی نقلوں میں اک آگ روشن ہے و شتوئی
 میں اپنی دنیا کے ایسے شاداب مرغزاروں کو کیا کرونگا
 اتر گیا چہرہ روز روشن کا ڈھل گئے آفتاب کتنے
 اٹھا دئے وقت کے تقاضوں نے سانے سے حجاب کتنے
 زمیں پہ ٹوٹے پڑے ہیں کردار و آگہی کے رباب کتنے
 دکھتی چٹکاریوں میں تبدیل ہو گئے ہیں حجاب کتنے
 میں نہپہ زاروں کے بدلے لیکر پھر ان شراروں کو کیا کرونگا
 خزاں کا مارا ہوا ہو فلسفین تو پھول کیا مسکرا سکیں گے
 غلات ہوں تیرگی کے جن پر وہ تارے کیا جگمگا سکیں گے
 جو خود ہی کم کردہ کارواں ہوں وہ راستہ کیا دکھا سکیں گے
 جو خود ہی دھاروں میں جا رہے ہوں میں ان کناروں کو کیا کرونگا

رعایتی قیمت

مجموعہ استفسار و جواب

کی تیسری جلد

ضمانت ۱۰۰ صفحات - جبلی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ ہے لیکن اب آپ کو صرف دو روپیہ میں مل سکتی ہے - منیجر منگل

خاورستان

جناب انیسویں بابی احمد فکری کی نظموں کا مجموعہ زیر طبع ہے جو ۲۸ پڑ کے دبیز کاغذ پر نہایت نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شائع ہوگا۔ ضمانت تقریباً ۳۵ صفحات - منیجر منگل

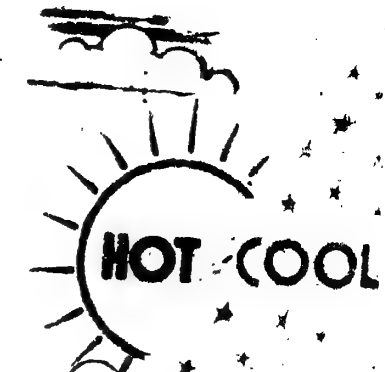
مرزا شوق لکھنوی کا تنقیدی مطالعہ

(از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

مرزا شوق، جہاں عالم و ادیب علی شاہ کے لکھنؤ کے شاعر تھے۔ انکی شنوی کا تنقیدی مطالعہ نہ صرف ادب کے محرکات اور میلانات کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے بلکہ اس تہذیبی ماحول کو جاننے کے لئے بھی جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکم قضا کو جام شراب کی گردش سے سپرد کیا گیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ - منیجر منگل

تذکرہ معاصر سخن

اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں تمام ان اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو شعروادبی و اردو کے کلام پر لکھے گئے ہیں اور اس کے ساتھ اعتراضات کے جوابات بھی مل گئے ہیں اور ان پر محاکمہ بھی کیا گیا ہے۔ جن شعرا کا اس میں تذکرہ کیا گیا ہے وہ حضرات جو فن شعری کے نکات و رموز سے واقف و ناواقف ہیں ان کے لئے یہ کتاب بڑی بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ صرف چند جلدیں باقی رہ گئیں قیمت مع محصول چار روپیہ آٹھ آنے کی پیش نہیں دیا جائے گا۔ منیجر منگل



گرمی بلاشبہ شدید ہے لیکن.....

روح افزا

ٹھنڈا اور تسکین دہ ہے

ہمدرد و واخانہ (وقف) علی

مشہور طبی دسویں سالہ ہمدرد صحت کا

نورہ مفت طب فرمائیں

Hamdard

PRODUCT

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے بڑا ہندوستانی جہاز رانی کمپنی)

مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ رمضان کے بعد جہازیں کو لیجائے والے جہاز مندرجہ ذیل خاص حج سرویس تارخیوں کے لگ بھگ بمبئی سے جدہ روانہ ہوں گے:-

ایس۔ ایس۔ "مظفری"	۲۲۔۴۔۵۱	۹ جولائی ۱۹۵۱ء
"جہانگیر"	۲۵۔۶۔۵۱	۱۲ " "
"علوی"	۲۵۔۶۔۵۱	۱۸ " "
"خسرو"	۲۵۔۶۔۵۱	۲۵ " "
"اسلامی"	۲۵۔۶۔۵۱	۲ اگست ۱۹۵۱ء
"جہانگیر"	۲۵۔۶۔۵۱	۸ " "
"علوی"	۲۵۔۶۔۵۱	۲۵ " "
"خسرو"	۲۵۔۶۔۵۱	۲۶ " "
"اسلامی"	۲۵۔۶۔۵۱	۲۹ " "
"محمدی"	۲۵۔۶۔۵۱	۳۰ " "

روانگی کی صحیح تاریخوں کا اعلان بعد میں کیا جائے گا

کرایہ (مع غوراک) بمبئی سے جدہ اور واپسی

درجہ اول	مبلغ ۱۱۵۱ روپے
عرشہ (ڈیک)	مبلغ ۴۱۵ روپے

اہم اطلاع ان کرایوں میں تقریباً تمام کامرانہ مصروفیات جہاز اور کرایہ کشتی و مجموعی طور پر مبلغ ۴ روپے ۱۲ آنے جوتے ہیں شامل نہیں ہیں۔ عازمین حج کے پاس میں الاقوامی فارم پر بیضہ اور چمپک کے ٹیکے لگوانے کا سرٹیفکیٹ ہونا چاہئے، بیضہ کے سرٹیفکیٹ میں ۱۱ دن سے پہلے ہونا ضروری ہے کہ عازمین حج نے سات روز کے وقفہ سے دو انجکشن لے لئے ہیں اور یہ کہ دوسرا انجکشن بمبئی سے روانہ ہونے کی تاریخ سے کم از کم سات روز قبل لیا گیا ہے۔ اس طرح چمپک کے سرٹیفکیٹ میں اندراج ہونا چاہئے کہ جہاز کی روانگی کی تاریخ سے کم از کم چارہ دن قبل چمپک کا ٹیکہ لگایا ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ مقررہ انٹرنیشنل فارم پر مقامی سپرنٹنڈنٹ کے حکم و مقررہ صحت کے حکام سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ بیضہ کے سرٹیفکیٹ ۱۶ ماہ اور چمپک کے سرٹیفکیٹ تین سال تک کام دے سکتے ہیں۔ عازمین حج کو چاہئے کہ ابھی سے بیضہ اور چمپک کے ٹیکے لگوا کر سرٹیفکیٹ تیار رکھیں۔

نشستیں محفوظ کیجئے جہازوں کی نشستیں محفوظ کی جا رہی ہیں، عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بلا تاخیر اپنے کام پر اسے اپن دے۔ کراچی، ناکہ بند میں مسافر حج سے محروم نہ ہونے چاہئے۔ درخواست میں مذکورہ ذیل تفصیلات کا ہونا ضروری ہے۔ مسافر ایک عازم کا پورا نام والد یا شوہر کا نام و جنسیت یعنی مرد یا عورت اور عمر و درخواست سمجھنے والے کا پورا پتہ و کس درجہ کا ٹکٹ و کس طرح کے ٹیکوں میں سفر گزارا وہ ہے۔ اگر ساتھ میں بچے ہوں تو ان کے نام و پتہ بھی درج کرنا ضروری ہے۔ خواہ وہ شیر خوار ہی کیوں نہ ہوں، جہاز میں جگہ نہ ملنے کی گنجائش نہیں دی جاسکتی لیکن یہ ضرور ہے کہ جن لوگوں کے نام درج ہوں گے ان کی کوٹ پیٹ دے جائیں گے۔

شریک بار ایس اینڈ کمپنی لمیٹڈ

MUGUL BOMBAY نیو یارک کمپنی - دی مغل لائن لمیٹڈ ۱۶ بنگلہ مشرق غوراک بمبئی

<p>نیاز تیز بنی ہوئی ایشک تہم وہ خطوط جو مات نگاری سلاست بیان ذی اور لیلیٰ چک لیاؤ سے انشاء اس بکلی بیلی میرا رجب کے سامنے خطوں اب بھی بھیکے معلوم ہوتے ہیں ان ایڑیوں میں چنے اوشن کی غیور دو ایک گیا ہوا اور ہڈی کا فخر پر طاعت ہوئی ہے قیمت ہر عدد کی چار پیسہ علاوہ محصول</p>	<p>شہاب کی سرگزشت حضرت نیاز کا دو بیہ نظیر افسانہ جو دو زبان میں لکھ پہلی مرتبہ سیرت نگاری کو ہوا پر کمالی جو اس کی زبان تشکیل سکے نزاکت بیان اسکی ہندی مضمون اور اسکی حادیہ حیرت انگیز کے درج ایک بھجتی ہے یہ اوشن نہایت صحیح اور خوش ہے قیمت ایک روپیہ آدھ آنے علاوہ محصول</p>	<p>ہندیات بھاشا جناب نیاز کا ایک کتب ہندو کے نام پر ہندو غرض کے ہونے چاہیے کہ انکی ایسی ہی کی ہے کہوں کتاب ہو بنا بارود میں یہی ہے اس کی زبان موضوعات لکھی گئی ہے جس میں ہندی کتاب کے بمثل نمونہ نظر آتے ہیں قیمت بارہ آنے علاوہ محصول</p>	<p>فلاسفہ قدیم اس مجموعہ میں نہایت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں :- (۱) ہندو فلسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) اوشن کا مذہب نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول</p>	<p>شاعر کا انجم جناب نیاز کے مقبول شہاب کا کمال ہوا افسانہ جس عشق کی تمام بے پناہ کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود ہیں یہ انشاء اپنے بلاط اور انشاء کے کمال سے مستعد چیز ہے کہ دوسری جگہ کی نظر نہیں مل سکتی تازہ اوشن نہایت صحیح و خوش خط سردستی نگین قیمت بارہ آنے علاوہ محصول</p>
---	---	---	--	--

<p>فراسٹ الیڈ علامہ نیاز نے پوری کے مطالعہ سے ایک شخص بانی اچھی کی شناخت و اسکی گیاروں کو بھوک کر اپنے دوسرے شخص کے مستقبل بہت عرصہ و زمانہ وقت انکے صحت پر زور دیا غرت و یکساںی پیش کوئی کر سکتا ہے قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول</p>	<p>نقشبہ ہائے بعد نیاز نے پوری کے عین نالوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہائے نک کے ہوائی فریق علی اکرام کی ازین فی زندگی کام اور دیگر حاشیہ حیات کے یکے کے ہم سب چار زبان پاؤں انشاء کے علاوہ جو زبان انہوں کا ہر دوسرے لکھتے غرض کہتا ہے قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول</p>	<p>مذاکرات نیاز یعنی محفرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات ہندو عالم کا عجیب غریب فیض ہے ایک بار اسکو شروع کر دینا ہر ملک پروردگار ہو یہ بھی جدید اوشن پر جس میں صحت اور معلوم ادبی و ثقافتی مشا جی تعلق شہزادہ کی آواز سے جہل خلو خلو ہوگا حصہ دوم ہر عدد ہندو قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول</p>	<p>انتخابات ادب حضرت نیاز نے پوری کی نقاب کے علاوہ محصول میں تقسیم کے گئے جس میں یہ خاص طور کے کلام پر نقد کی گئی ہے مثلاً اوشن فقر و غلبہ بعضی بغیر یہ جوش و شعور و غیرہ دو حصہ میں عام ادبی و ثقافتی مشا جی تعلق شہزادہ کی آواز سے جہل خلو خلو ہوگا حصہ دوم ہر عدد ہندو قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول</p>	<p>مذہب حضرت نیاز کا وہ محرکہ اوشن مطالعہ میں اس انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور نہایت کثرت مانج ہمارے کے مطالعہ کے اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول</p>
--	--	---	---	--

نگار کے

<p>جموری، فروری، مارچ</p>	<p>جموری، فروری، مارچ</p>
<p>مجموعہ اسلامیاتی، تنقیدی خدمات کا پتھر جس میں مسلمانوں کے ایک سو تیسہ نمبر کے تمام تنقیدی رجحانات اور انتقادی نوٹوں کا واضح کیا گیا ہے۔ اس میں بعض ایسے اکابر و شعراء کا تذکرہ و تعارف کا نام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور ان کا نام نیا ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور قریبی پسند و نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں</p> <p>قیمت تین روپیہ علاوہ محصول</p>	<p>مجموعہ اسلامیاتی، تنقیدی خدمات کا پتھر جس میں مسلمانوں کے ایک سو تیسہ نمبر کے تمام تنقیدی رجحانات اور انتقادی نوٹوں کا واضح کیا گیا ہے۔ اس میں بعض ایسے اکابر و شعراء کا تذکرہ و تعارف کا نام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور ان کا نام نیا ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور قریبی پسند و نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں</p> <p>قیمت تین روپیہ علاوہ محصول</p>

<p>جموری، فروری ۶۲۹</p>	<p>جموری، فروری ۶۲۸</p>	<p>جموری ۶۱۹</p>
<p>نگار کا اٹنا نمبر جس میں تقریباً اسی سال کے بہترین اہل قلم کے خیالات کے گئے ہیں اس سال کی اہمیت یہ ہو کہ اس کے لئے بڑی بڑی معلومات کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے بڑی بڑی معلومات کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے بڑی بڑی معلومات کی ضرورت تھی۔</p> <p>قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول</p>	<p>نگار کا اٹنا نمبر جس میں تقریباً اسی سال کے بہترین اہل قلم کے خیالات کے گئے ہیں اس سال کی اہمیت یہ ہو کہ اس کے لئے بڑی بڑی معلومات کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے بڑی بڑی معلومات کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے بڑی بڑی معلومات کی ضرورت تھی۔</p> <p>قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول</p>	<p>نگار کا اٹنا نمبر جس میں تقریباً اسی سال کے بہترین اہل قلم کے خیالات کے گئے ہیں اس سال کی اہمیت یہ ہو کہ اس کے لئے بڑی بڑی معلومات کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے بڑی بڑی معلومات کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے بڑی بڑی معلومات کی ضرورت تھی۔</p> <p>قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول</p>

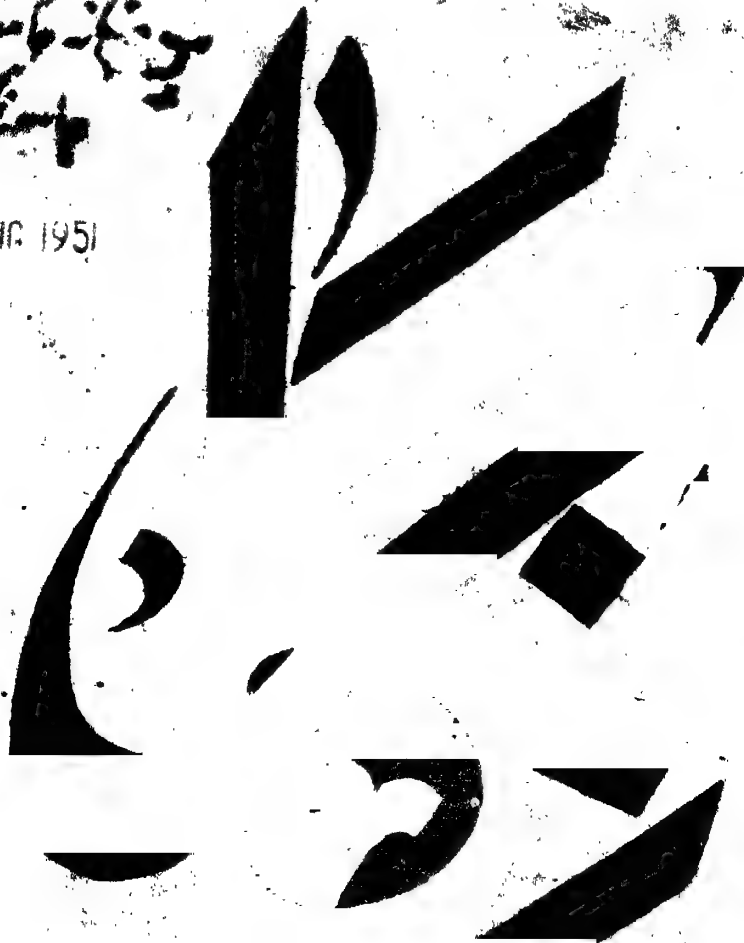
<p>نگار کی قیمت</p>	<p>جموری ۱۳۵۶</p>
<p>سالانہ ہندوستانی پاکستان اور دیگر ممالک کے اخباری جاری نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے بڑی بڑی معلومات کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے بڑی بڑی معلومات کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے بڑی بڑی معلومات کی ضرورت تھی۔</p> <p>قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول</p>	<p>اس سالانہ کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں مارچ تا اگست کی مشرقی عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عرب، عراق، فلسطین و غیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد اس کی موجودہ اقتصادی اور ان کے اداروں کے اسباب و ہود وشی والی کیا ہو اور اس کے ساتھ ہی دنیا کی دیگر ممالک کے مستقبل کی روشنی میں اگر وہ ترقی کے کچھ راستہ کو جان لیں۔ سالانہ کا دوسرا حصہ فروری تا مارچ کے لئے ہے جس میں مئی تک کے ممالک کے حالات کی تازگی اور کتاب کا کوئی ایک نمبر کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے بڑی بڑی معلومات کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے بڑی بڑی معلومات کی ضرورت تھی۔</p> <p>قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول</p>

کتاب نمبر ۱۹۵

جلد نمبر ۱۳۳

پیشانیہ جامعہ اسلامیہ
پابلیشرز

- 9 AUG 1951



ہندوستان و پاکستان دونوں کے

قیامت کی گائیڈ

سائنس و فلسفہ

پروفیسر

تصانیف نیازمندی

اس دور انزاع کو پیشہ کے لئے حکم کرنا چاہیے

انجیل انسانیت

من ویزوال

مولانا تاج محمد ری کی ۳۳ سالہ دور تصنیف مصحف کلاہک
غیرمذہبی کارنامہ میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع
انسانی کو "انسانیت بھرپی" و اخوت عالمہ" کا ایک ختمہ سے
واحد ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور میں مذاہب کی تخلیق
وینی عقائد و رسالت کے مفہوم اور مصادیق و حقیقت
پر تاریخی، علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت
جذبات اور ہندو خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضمائم ۱، ۲ صفحات - مجلد دس و دہم غلام

غلاوہ محصول

زہی استفسارات و جوابات

بیت

من ویزواں کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن سائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے
 اکی فقیر فرست دے۔۔۔ اصحاب کہف۔ عجزہ کرامت۔
 انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان فوج۔
 خضر کی حقیقت۔ بیس علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور
 دہان ماہی۔ حسن یوسف کی داستان۔ قاذون۔ سامری عظیم
 دعاتو بہ۔ لقمان۔ عالم برنج۔ یاجوج ماجوج۔ ارواحِ انور
 حوض کوثر۔ امام ہدیٰ الخوہرئی اور پل مراد اسٹیشن نمود وغیرہ
 صفحات ۶۴۴ صفحات۔ کاغذ سفید دبیر

قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

بھارتستان

جہانستان

حسن کی عیاریاں

ترغیباتِ ظہنی

حضرت نانا کے حجر بنی مقامات اور
فسانوں کا مجموعہ، محمد احسان نے ملک میں
جود و توقیر حاصل کیا اس کا نفع ہمیں
ہر ملک پر کہ جس کے تعلق سے میرا غور ہو
حق کے لئے اس ڈیڑھ میں توجہ
انسان بنی مقامات پر لکھنا ہے
کے ہیں وہ کچھ ایسے غور و نظر سے
اس کے صفحہ سبھی زیادہ ہو
تجربہ حاصل رہے وہ محمول

اور پھر نگاہ کے افسانوں اور رشتہ لادنی کا
 دور ہو جو جس سن میں یہ تصانیف تھیں
 اور پانچ کی خیال کو جبریں کا دور
 علاوہ یہ کہ تہائی و جعفری کی کا حل
 بھی نظر آئے گا۔ ہر فن اور ہر
 اپنی جگہ جو ادب کی حیثیت رکھتا ہو
 اس کی پیش میں متعدد نئے فنکار
 کے آئے ہیں جو بے امتیاز ہیں
 جس کا نام نہ لے سکتے ہیں

[illegible][illegible]

”نگار“ کے بقا و تحفظ کا مسئلہ

نگار کی عمر کا یہ قیسواں سال ہے جو انسانی حیات کے لحاظ سے پورے شباب کا زمانہ مقصود ہوتا ہے، لیکن ہندوستان کی سیاسی دنیا میں اس عمر تک شاید ہی کوئی رسالہ یا اخبار پہنچتا ہو۔ پھر آج میں نگار کی اس سخت حالت کی داد آپ سے چاہتا ہوں اور ان خدمات کا ذکر مقصود ہے جو نگار نے اس وقت تک انجام دیں، بلکہ صرت یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر دنیا میں حتیٰ خدمت جیو یہ بھی کوئی چیز ہے تو کیا آپ اس حق کے ادا کرنے کے لئے طیار ہیں؟

نگار ۱۲ سال سے جاری ہوا تھا اور اس وقت جبکہ تمام ایشیاء، کافی ارزانی تھیں اور کاغذ کی قیمت ڈھائی روپیہ فی ریم تھی، آپ اس کا چندہ پانچ روپیہ ادا کرتے تھے، اس کے بعد جب اقتصادی دشواریاں بہت بڑھ گئیں تو صرف ایک روپیہ کا اضافہ چندہ میں کیا گیا لیکن اب کہ روپیہ کی قیمت چار آنہ سے بھی کم رہ گئی ہے اور کاغذ کی قیمت اٹھارہ روپیہ فی ریم تک پہنچ گئی ہے اور آئندہ اس میں مزید اضافہ کا اندیشہ ہے، کیا ہمارے لئے ممکن ہے کہ اسی چار روپیہ میں سال بھر تک نگار آپ کو فراہم کرتے رہیں ہر چند جو دشواری آج ہمارے سامنے ہے وہی دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں بھی تھی اور اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے لیکن ہم نے کبھی ان دشواریوں کا اظہار آپ سے نہیں کیا اور کسی نہ کسی طرح اپنی وضع نباہتے رہے، گھرب کہ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں اور تقسیم ہند نے ہندوستان کے اردو رسائل کا مستقبل بہت تاریک بنا دیا ہے، یہ مسئلہ بہت زیادہ اہم ہو گیا ہے اور اگر فرصت ہو تو قسور سے دیر کے لئے آپ کو بھی اس پر غور فرمانا چاہئے

ہم جانتے ہیں کہ موجودہ اقتصادی مشکلات میں ہر شخص مبتلا ہے، لیکن پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جب سوال سیر و تفریح یا دوسری غیر ضروری مشاغل کا آتا ہے تو آپ اس اقتصادی دشواری کو بھول جاتے ہیں اور کہیں نہ کہیں سے ان غیر ضروری مصارف کو پورا کرتے ہیں پھر کیا آپ کے لئے ممکن نہیں کہ صرف دو روپیہ سال کا مزید بار نگار کے لئے بھی برداشت کر لیں اور اس کا سالانہ چندہ چھ روپیہ کی جگہ آٹھ روپیہ ادا کریں

یقین کیجئے کہ ہم نے انتہائی مجبوری کی حالت میں یہ درخواست آپ سے کی ہے اور اس توقع کے ساتھ کہ آپ اسے منظور فرمائیں گے لیکن اگر آپ میں سے کوئی صاحب ایسے ہیں جو اس قلیل اضافہ کو بھی منظور نہیں کر سکتے تو پھر وہ سالانہ حاصل کرنے کی توقع قائم نہیں کر سکتے یہ اضافہ ہم آئندہ جنوری ۱۹۵۷ء سے کرنا چاہتے ہیں اس لئے ابھی کافی وقت ہے، سوچکر ہمیں اطلاع دیجئے کہ آپ سالانہ چاہتے ہیں یا نہیں۔ یہ درخواست ہندوستان و پاکستان دونوں ملکوں کے قریداروں سے ہے اور نوٹ کیانی ہے کہ وہ ایک کارڈ کے ذریعہ سے ہمیں اپنے فیصلہ سے مطلع فرمائیں گے تاکہ سالانہ کی اتنی ہی کاپیاں طبع کرائی جائیں جتنی ضرورت ہے وہ حضرات جو فی الحال قریدار ہیں یا اخیر دسمبر ۱۹۵۶ء تک ہوں گے ان سے نگار کا چندہ بدستور چھ روپیہ لیا جائے گا، لیکن سالانہ کی زیادہ قیمت دو روپیہ انھیں ادا کرنا پڑے گی اگر وہ اسے حاصل کرنا چاہیں گے

منیر نگار

نگار

فہرست مضامین اگست ۱۹۵۶ء

جلد ۶۰

ملاحظات

امریکہ و روس کی ذہنیتوں کا اختلاف

پھر اس زمانہ کو جانے دیجئے جس کے متعلق آج کا انسان کہہ سکتا ہے کہ جہل و بے عقلی کا زمانہ تھا، لیکن آج علم و سائنس کی دنیا میں بھی وہی سب کچھ ہو رہا ہے جو پہلا ہوا تھا، بلکہ شاید زیادہ شدت و تیزی کے ساتھ۔ اس سے قبل تو خیر انہی کا ذکر ہی نہیں کیا

یہ بیونیتی تھیں لیکن اب کہ افسانہ بہت زیادہ قلمبند ہو گیا ہے ایک صدی کے اندر ہی اندر عروج و زوال کی داستان بدی ہو چکی ہے، انقلاب کے بعد فرانس کا عروج بھی ایک صدی سے زیادہ قایم رہ سکا، فرانس کے بعد برطانیہ ساری دنیا پر چھا گیا، لیکن سو سال بھی پورے نہ ہونے لگے کہ یہ سادت امریکہ نے چین لی اور ہو سکتا ہے کہ زمانہ امریکہ کو شاید اتنی ہی مدت بھی نہ دے اور نصف صدی گزرنے سے پہلے ہی یہ اقتدار کسی دوسرے کو سونپ دے

اس میں شک نہیں کہ یہ صدی امریکہ کی صدی ہے، جو دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد شروع ہوتی ہے، لیکن حالات بتاتے ہیں کہ یہ صدی چند سال سے زیادہ پہلے والی نہیں اور بہت تیزی کے ساتھ اشتراکی صدی کے لئے جگہ خالی کر رہی ہے ہم نے ابتدائی سطور میں ظاہر کیا تھا کہ انسان کا یہ یقین کر لینا کہ وہ ہمیشہ صحیح سوچتا ہے، سخت غلطی ہے اور امریکہ اس وقت اسی غلطی میں مبتلا ہے، جس سے روس فائدہ اٹھا رہا ہے

امریکہ سمجھتا ہے کہ کامیابی کا انحصار صرف فوجی قوت اور ڈالر کی کثرت پر ہے اور اس لئے وہ اپنے تمام ذرائع انہیں دو چیزوں پر مرن کر رہا ہے، حالانکہ دنیا کے موجودہ میلانات و رجحانات کا اقتدار کچھ اور بھی ہے۔ امریکہ اس حقیقت کو فراموش کئے ہوئے ہے کہ آئندہ ۵۰ سال کے اندر اپنی بقا کے لئے جو تدابیر اسے اختیار کرنا چاہئے ان کا تعلق اسلحہ و ڈالر سے نہیں بلکہ دنیا کے ذہنی انقلاب سے ہے اور یہی وہ ماز ہے جسے اس کے حریف روس نے اسے اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور امریکہ نے اپنا نہیں سمجھا

امریکہ کے طرز عمل سے تمام دنیا کو یہ سمجھنے کا موقع ملا ہے کہ اس کا تنہا مقصود صرف اپنے لئے نئے مارکیٹ پیدا کرنا اور دوسرے ملکوں کی خام پیداوار ارزاں قیمت پر حاصل کر کے وہاں اپنی مصنوعات گران قیمت پر فروخت کرنا ہے، برخلاف اس کے روس اپنے طرز عمل سے کہیں نہ سمجھنے کا موقع نہیں دیتا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود امریکی آبادی میں بھی کوئی بڑا ایثار قربانی اپنی حکومت کے لئے پیدا نہیں ہوتا وہ اس اثرات قبول کرنے والے ممالک میں یہ جذبہ عام ہے۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہم کو کوریا کی لڑائی میں ملتا ہے کہ اس وقت وہاں چین اور کوریا دونوں مل کر اشتراکیت کی طرف سے لڑ رہے ہیں حالانکہ کوئی ایک روسی ڈویژن بھی ان کے ساتھ نہیں ہے اور امریکن ہلاک کی فوجیں ہیں کوئی ایک تنفس بھی ایسا نہ لے گا جس نے محض ملکی خدمت کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا ہو اور تنخواہ پانے والی سپاہ کے ساتھ کوئی ایک قومی دیوانہ بھی نظر آتا ہو۔ بات یہ ہے کہ اس وقت خود جمہوری حکومتوں کی کروڑوں آبادی کو بھی سوا چند مخصوص سرمایہ دار جماعتوں کے ڈاکر کی طرح کی طرف سے فلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے اور اسی لئے وہاں کے عوام میں اپنی حکومتوں کے لئے قربانی کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ تیسری جنگ شروع ہو جاتی ہے اور اس میں امریکہ آٹم بم کی مدد سے کامیاب ہو جاتا ہے لیکن کیا اس کی یہ کامیابی حقیقی کامیابی ہوگی، ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد جب نئی حکومتیں قایم ہوں گی تو کوئی ملک بھی ایسا نہ ہوگا جو ڈاکر ٹیک طریق حکومت کی موافقت میں ڈے دے

امریکہ کا یہ دعویٰ کہ ڈاکر ٹیک طریق زندگی کی برتری ساری دنیا میں تسلیم کی جا چکی ہے، صحیح نہیں، خود مغربی یورپ میں بھی جو ڈاکر ٹیک کا گھر سمجھا جاتا ہے اگر اشتراکیت پسندوں اور جمہوریت پسندوں کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو جمہوریت پسندوں کی تعداد اتنی نہ تنگے گی کہ وہ اشتراکیت کو اپنے ملک سے دور کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ یہ حال ہے مغربی یورپ کا پھر جاسکے دوسرے ممالک جہاں ڈاکر ٹیک سے واقف ہی نہیں ہیں

اس وقت امریکہ کا دنیا کے تمام مسائل کو صرف اسلحہ اور ڈالر کے نقطہ نظر سے دیکھنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ لوگوں کو صرف ڈاکر ڈاروٹ دیکر کام کرانا چاہتا ہے۔ معقولیت اور تالیفِ افواہ اس کے پیالہ کوئی چیز نہیں امریکہ اس میں شک نہیں اپنے طرز عمل کے جواز ثابت کرنے کے لئے کافی ہر وہاں ڈاکر ڈاکر دے گا کہ وہاں حکومت نے دس کروڑ ڈالر میں اقوامی پر واپار کے لئے سنگھڑے کئے ہیں اور یہ رقم بظاہر بہت بڑی رقم معلوم ہوتی ہے، لیکن روس اس وقت تک اپنی کامیابی

حاصل کر چکا ہے اس کا جواب دینے کے لئے پانچ ارب ڈالر بھی کم ہے۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے گروہوں باشندوں کو ڈاکٹریسی کی ضرورت کا یقین دلا تا آسان بات نہیں۔ محدود روپ کی جمہوری حکومتوں میں بھی لاکھوں مزدور و محال اشتراکیت کی طرف مائل ہیں اور اشتراکی اخبارات سے وہ اس قدر متاثر ہیں کہ ان کے دلوں سے روسی نظام حکومت کا اثر مٹا نا دشوار ہے کسی جماعت کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کے توقعات کا لحاظ رکھا جائے لیکن امریکہ کی طرف سے جو پروپگنڈا ہوتا ہے اس میں صرف امریکہ کی موجودہ کامیاب و خوشحال زندگی کا ذکر کیا جاتا ہے، حالانکہ سننے والا قدرتا یہ سوال کر سکتا ہے کہ اگر امریکہ کا انسان ابھی زندگی بسر کر رہا ہے تو ہمیں کیا؟ ہم کو اس سے کیا فائدہ پہنچتا ہے

انٹی کالیک کسان، ایران کا ایک مزدور، چین کا غریب باشندہ اگر اشتراکیت کی طرف مائل ہے تو وہ اس کے لئے یہ دلیل بھی رکھتا ہے کہ اس طرح اس کو زیادہ زمین ملے گی، زیادہ مزدوری ملے گی، لیکن امریکہ اس کے مقابلہ میں کوئی ایسی توقع پیدا نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹریسی اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب وہ اشتراکیت سے زیادہ عوام کی توقعات کو پورا کرنے والی ثابت ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب تول سے زیادہ اپنے مل سے اس کا ثبوت ہم پہنچائے

ایران کے علاقہ آذربائیجان میں جنگ کے بعد تقریباً پانچ سال تک روس کا قبضہ رہا اور اس دوران میں وہاں کے لوگوں کی ترقی و آسائش کے لئے خدا جانے کیا کیا، لیکن جب اخیر میں ایران نے روس سے تخلیہ کرنے کے لئے کہا تو اس نے بلا غرض آذربائیجان خالی کر دیا اور بہت سی نعمتیں وہاں کے لوگوں کے لئے چھوڑ گیا۔ کہا امریکہ اور دوسری جمہوریت پسند حکومتیں کوئی ایسی مثال قائم کر سکتی ہیں اور جب ہم اپنے اخلاق کا اتنا بلند ثبوت نہیں دے سکتے جتنی اپنی خوشحالی کی داستانیں سننا کر بد حال ملکوں کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکتیں

نگار کا آئینہ سالنامہ اور

نگار کے سالانہ چندہ میں اضافہ

اس وقت تک جتنے خطوط موصول ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کا رجحان زیادہ تر حسرت نمبر کی طرف ہے، اس لئے یہ بات قطع ہو گئی کہ آئندہ سالنامہ حسرت نمبر ہوگا، لیکن قارئین نگار کو ابھی سے سمجھ لینا چاہئے کہ حسرت نمبر بہت ضخیم ہوگا، علاوہ ان مقالات کے جو ان کی زندگی و شاعری سے متعلق ہوں گے، خود ان کے وہ مقالات بھی ہوں گے جو سیاسیات اور خدمت زبان کے سلسلہ میں انھوں نے لکھے تھے اور اب ایاب میں، ان کے تمام دوادین کا بہترین انتخاب بھی شائع ہوگا، الغرض حسرت نمبر ہر لحاظ سے ایک مکمل تالیف ہوگا، جس کی تفصیلات آئندہ اشاعت میں ملاحظہ سے گزریں گی۔ ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں جبکہ کاغذ کی قیمت اٹھارہ روپے فی ریم تک پہنچ گئی ہے ہم چندہ میں اضافہ کے بغیر اس کو پیش نہیں کر سکتے

اور آئندہ جنوری سے نگار کا سالانہ چندہ قارئین نگار کو چھ روپیہ کی جگہ آٹھ روپیہ ادا کرنا ہوگا۔

وی۔ پی۔ آٹھ روپیہ چھ آنے میں روانہ ہوگا۔ وہ حضرات جن کا چندہ دسمبر ۱۹۳۷ء میں ختم نہیں ہوتا، ان کو حسرت نمبر دو روپیہ چھ آنے میں ذریعہ وی۔ پی۔ روانہ کیا جائیگا اگر دو روپیہ انھوں نے پہلے سے بھیج دئے۔ ازراہِ کرم اس اشاعت میں صفحہ اول کا اعلان پڑھ لیجئے

سناپچ انقلاب فرانس کا ایک پوشیدہ ورق

(حسن کی سحر کاریاں)

فرانس میں انقلاب کی آگ پوری قوت کے ساتھ بھڑک چکی تھی اور کوہہ و بازار میں امیروں، رئیسوں کے سروں کو لوگ پاؤں سے ٹھکراتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ آگ شہر پورے ایک پہنچ گئی اور وہاں کے اکابر (جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی) قید خانوں میں بند کر دیے گئے، جو موت کے انتظار میں نہایت کرب و اضطراب کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ انھیں زندانیوں میں ایک نوجوان اسپانوی عدت ایسی بھی تھی جو اپنے انجام کی طرف سے بالکل مطمئن تھی اور خون و ہراس کی کوئی علامت اس کے چہرہ سے ظاہر نہ ہوتی تھی اسے یقین تھا کہ اس کی خوبصورت سیاہ آنکھیں، بڑبڑاہے چمکدار بال، دلکش چہرہ اور ۲۰ سال کی بھرپور جوانی دست جلا دکھ بھی شل کر سکتی ہے۔ اس کا نام ترزیا تھا۔ ایک اسپانوی رئیس کی لڑکی تھی اور ابتدا ہی سے اپنے غیر معمولی حسن و جمال کی وجہ سے دنیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ بچپن میں ماں باپ نے دوسرے بھائی بہنوں کے مقابلہ میں ہمیشہ اسی کی زیادہ ناز و بر داری کی اور جب وہ جوان ہوئی تو شہر کے تمام دولت مند نوجوان پروانہ دار اس کے گرد جمع ہونے لگے لیکن اس نے کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔ آخر کار جب اس کی عمر ۱۸ سال کی ہوئی تو سیاسی مصلحت کے پیش نظر فرانس کے ایک رئیس کونٹ دو فونسی سے اسکی شادی کر دی گئی۔

جب اس کا شوہر اسے پیس پیس لیکر آیا تو اس کے حسن و جمال نے یہاں بھی آگ لگا دی اور کوئی شان و کرم اور میری آواز کے دربار میں اس کا اس قدر اثر و نفوذ ہو گیا کہ مشہور ہے دربار کے سفیر کو تو بھی بغیر اس کی اجازت کے دانہ نہ چٹکتے تھے۔ اس میں شک نہیں اس وقت کوئی کا دربار اپنے جلال و جبروت کے لحاظ سے بظاہر انتہائی عروج پر تھا، لیکن اندرونی طور پر اس کی حالت اس عمارت کی سی تھی جس کی بنیاد ہل چکی ہو اور اس لئے جب انقلاب کی تحریک شروع ہوئی تو اس کا دوبارہ و چشم چشم زدن میں خاک ہو کر آگیا اور اس کا ایک ایک فرد اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ کھڑا ہوا۔ انھیں بھاگنے والوں میں ترزیا اور اس کا شوہر بھی تھا جنھوں نے پورے دو میں اس لئے پناہ لی تھی کہ وہاں تک انقلاب کے اثرات پہنچنے کا بہت کم اندیشہ تھا۔ لیکن یہ آگ ایسی نہ تھی کہ پیس ہی تک محدود رہتی۔ پچھلے قوم پر انقلاب کا جنوں طاری تھا، اور صدیوں کی مستبد حکومت کو فنا کر دینے کا جوش اتنا زبردست تھا کہ امراء و اشراف کے خون کے سوا اور کسی چیز سے ٹھنڈا ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ وہی لوگ جنھوں نے کبھی اپنے قدم زمین پر نہ رکھے تھے، ان کے پاؤں کا تھیل سے زخمی تھے اور وہی سر جن پر ہر وقت نہ کار و جابر تھار کھانے جگمگا کر رہی تھی اب گلیوں میں گیندوں کی طرح لڑھکے تھے۔

آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ غوثیں سیلاب مرگ پر تھیں بلکہ کیڑے مکر محدود رہ سکتا تھا، وہ چاروں طرف پھیل کر رہا اور آخر کار ہندوستان میں پہنچ گیا جہاں ترزا اور اس کے شوہر نے پناہ لی تھی۔
انقلابی حکومت کی طرف سے ایک افسران کامبر تالی بن مامد ہوا کہ وہ ہندوؤں کا کر تمام پناہ گزین امرا و اشراف کو قید کر دے۔

تالی بن ایک نے دلے کا لڑکا تھا جو ابتداً ایک وکیل کا منشی تھا اور بعد کو ایک روزنامہ کا نامہ نگار ہو گیا تھا، انقلاب کے زمانہ میں یہ نہایت اشتعال انگیز مضامین لکھا کرتا تھا اور جب انقلابی حکومت قائم ہوئی تو یہ بھی اس کا ایک لیکن منتخب کر لیا گیا اور یہی پہلا شخص تھا جس نے میری رٹوائٹ کے قتل کی تجویز پیش کی۔ یہ فطرتاً ہی شقی القلب انسان تھا اور خونریزی و خون آشامی اس کو بہت پسند تھی۔ چنانچہ پورے دو سو پچھتے ہی اس نے امرا و اعیان کی گرفتاری شروع کر دی اور ان کو جیل میں بند کر دیا۔ انھیں قیدیوں میں ترزا بھی تھی جس کا شوہر اسے تنہا چھوڑ کر کسی اور جگہ بھاگ گیا تھا۔ آخر کار ان زانیوں کے قتل عام کی صبح آ پہونچی اور قیدیوں میں بھول بچ گئی، لیکن ترزا کا عالم کچھ اور تھا، وہ آٹھی، شہائی، گہڑے بدلے، بال سنوارے اور تالی بن کا مقابلہ کرنے کے لئے طیارہ ہو گئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اگر تالی بن کی شقاوت و بے رحمی ضرب المثل ہے تو اس کا سن و جمال بھی بے پناہ چیز ہے اور تاریخ کے متعدد ایسے واقعات اس کو یاد تھے کہ میری و خوبصورتی کے تضاد میں بار بار سن ہی کو کامیابی حاصل ہوئی۔

جب وہ بن سفور طیارہ ہو گئی تو اس نے وہیں قید خانہ میں بیٹھ کر تالی بن کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

”میں بے گناہ ہوں اور بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگنا مناسب نہیں۔“

مجھے حاضری کا موقع دیکھ کر میں اپنی بے گناہی آپ پر ثابت کر سکیں۔“

دوسرے دن جب تالی بن قید خانہ پہونچا اور ترزا کو دیکھا تو وہ اس کے سن و جمال کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور باوجود جفاکام و سنگر ہونے کے تنوڑی حیر کے لئے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا قدرت کے ایسے دبر دست شاہکار کوئی کر دینا جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس نے حکم دیا کہ ترزا کو داروغہ محبس کے کمرہ میں بھیج دیا جائے تاکہ وہ اس سے تنہائی میں دریافت حال کر سکے۔ چنانچہ ترزا انتہائی خوش ادائی کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوئی اور جب تنوڑی دیر بعد وہ باہر نکل تو وہ آزاد تھی اور اس کا چہرہ مسرت سے چمک رہا تھا۔

اس سے پہلے جو کچھ ہوا وہ اس سے زیادہ جبرے انگیز ہے، کیونکہ اس نے اپنے علاوہ دوسرے بہت سے قیدیوں کو بھی آزاد کر دیا اور پورے دو ہی آبادی جو چند ساعت پہلے اس کے خون کی پیاسی تھی، تالی بن سے عفو ہونے کے بعد اسے آزادی کی دیوی سمجھنے لگی۔

اس وقت پیرس میں انقلابیوں کا سرگرم و دبیر تھا وہ پورے دو کی خبریں سننے کا بے تابی کے ساتھ منتظر تھا کہ جاسوسوں نے مارے بدست کدہ حالات اس کو لکھ بھیجے کہ تالی بن کس طرح ایک باغی حسین عورت کی محبت پر ملک کے مفاد کو قربان کر دیا اور اب وہی عورت جس کا سر تلک ہونا چاہئے تھا، اہل پورے دو کے سروں پر حکومت کر رہی ہے۔

دبیر پیرس کو پہلے بھی شبہ تھا کہ ترزا جاسوس ہے اور انقلاب کے لیڈروں کو اغوا کرنے کے لئے اشراف و امرا و کی طرف سے نامور کی گئی ہے، یہ حالات سنگھ فست سے بیاب ہو گیا اور اس نے حکم دیا کہ تالی بن فوراً پیرس واپس آئے۔ تالی بن پورے دو سے چلا تو ترزا بھی اس کے ساتھ تھی۔ لیکن مردانہ لباس میں اور جب وہ درستی پہونچا تو اسے

دیں چھوڑ دیا اور خود تہا پہنچ گیا۔ یہیں سے وہ روز رات کو درساں جاتا اور ترنیا سے مل کر صبح کو پیرس واپس آتا۔
 روس پر نہایت سخت دل انسان تھا اور انقلاب کے سوا دنیا میں کوئی چیز ایسی تھی جس کو اپنی طرف مائل کر سکتی۔ انقلاب اس کا خدا تھا اور وہ اس کا بندہ اور وہ ہر اس چیز کا دشمن تھا جو اس خلق کو صدمہ پہنچائے۔ وہ جانتا تھا کہ سب سے بڑا صدمہ جو مرد کے غلامانہ استعمال ہوتا ہے وہ جسن و جمال ہے۔ اس لئے وہ عدوت کا خلق دشمن تھا اور اس پر کبھی رحم نہ کرتا تھا۔ انقلاب کے زمانہ میں خدا جانے کتنی پرورش عورتیں اس کے حکم سے چریخ کی گئیں اور ان میں سے ہر ایک کے تڑپتے ہوئے لاشہ بہتے ہوئے غلامانہ اس لئے جب اسے معلوم ہوا کہ تالی بن، ترنیا کے افسوسناک حال میں مبتلا ہو گیا ہے تو اس کی آنکھیں غضب بہت زیادہ متعلل ہو گئی اور اسے حکم دیا کہ ترنیا جہاں کہیں ہو اسے گرفتار کر لیا جائے۔

گرمی کی رات تھی، ۲ بج چکے تھے کہ انقلابی سپاہیوں کی ایک جماعت اس مکان پر پہنچی جہاں ترنیا بھی ہوئی تھی اور غلامانہ کے گندوں سے دروازہ کو پٹینا شروع کیا۔ ترنیا اپنا لباس شب پہنے ہوئے دروازہ تک آئی اور پوچھا "تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟" انھوں نے جواب دیا کہ "ہم حکومت کے سپاہی ہیں اور تمہیں چاہتے ہیں۔" ترنیا اپنا لباس شب بھی نہ اتار پائی تھی کہ سپاہی دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے اور اسے پکڑ کر لے گئے۔

اس کے بعد اس کے سر کے بال کاٹ دیے، ایک پٹھا ہوا لباس پہنے کو دیا اور نہایت گندے و کشت زخمیوں میں اسے بند کر دیا۔ وہ تین ہفتہ تک اسکے اندر بند رہی اور اس دوران میں جو بھولنے اسکے جسم کو اتنا زخمی کر دیا کہ اسکے نشان آخر عمر تک اس کی جلد پر باقی رہے۔ تالی بن کو جب یہ خبر پہنچی تو اس نے زخموں کے سامنے ہی ایک مکان کرایہ پر لیا تاکہ صبح و شام جب ترنیا کو زخموں سے باہر لایا جائے تو وہ اسے دور ہی سے دیکھ سکے۔ اس نے سپاہیوں کو رشوت دیکر خط و کتابت کی صورت بھی پیدا کر لی اور رات دن اس فکر میں گزارنے لگا کہ روس پر سے کیونکر اس کا انتقام لے۔

آخر کار وہ رات پہنچی جس کی صبح کو ترنیا کی گردن قطع کی جانے والی تھی اور تالی بن بھی اس آخری تذبذب کو مل میں لایا جو ترنیا کی جان بچانے کے لئے اس نے سوچی تھی۔
 اس نے اپنے وفادار دوستوں کو ایک جگہ جمع کیا اور ان سے کہا کہ انقلاب ہماری انتہائی خواہش تھی جو خدا نے پوری کی، لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ روس پر جس نے اب ایک وکیل کی حیثیت اختیار کر لی ہے، پختہ ہم سے چھین لینا چاہتا ہے، اس نے اگر ہم اپنے ملک کو نہایت سے بچانا چاہتے ہیں تو روس پر سے ہٹا دیا جائے۔ اس کی اس گفتگو کا اثر ہوا کہ ایک پوری جماعت اس کی بات کو قبول کر لی اور تالی بن نے فیصلہ کر لیا کہ صبح تک ترنیا نہیں بلکہ خود وہ کسی کی گردن کو تن سے جدا کرنا ہے۔

ہاں حکومت کی مجلس کا نام ہے اور مختلف مسائل پر گفتگو رہی ہے کہ تالی بن دشمنانہ جگہ سے اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمام انہوں سے زیادہ اہم ہوں۔ اس کے لئے کہ اس کو تمام کی آزاد حکومت دینا ہے یا اسے وکیل کی حیثیت میں تبدیل کر دینا ہے۔ یہ گفتگو غار ہے کہ مجھے یہ بھی یاد رہ سکتی تھی۔ رنگ دیکھ کر تالی بن نے کہا "میرے بچے مجھے نہیں مدد کریں گے۔ جو فرائض کی ہماری حکومت کو ختم کر دینا چاہتا ہے وہ ہمارے لئے خطرناک ہے۔ ہر ایک کو اگر ہم سب بڑے مل ہو اور کسی میں بہت نہیں کہ اس غلو کو صد کر کے تو میں خود اس خدمت کو انجام دے گا۔ یہ سبھی نہیں ہیں بلکہ جو دشمن پیدا ہو گیا اور اسے کسی کو اتنا بھی موقع نہ دیا کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ کر سکتا۔ دوسرے دن صبح کو ایک طرف سے اس کی گردن کاٹ کر لیا گیا اور دوسری طرف سے اس کی گردن کاٹ کر لیا گیا۔

قصہ چہار ویش میری نظر میں

گورو افسانوی ادب نے آئندہ ہی ایسی مضامین لکھنے پر توجہ دینا چاہی۔ جو ایسے بھی کوئی ادب اساطیر سے خالی نہیں ہو سکتا۔ ویش سب ہی میں ایسے مراحل آپ کو ملیں گے جہاں افوق الفطرت چیزوں کی ادا دی جاتی ہے۔ کسی دکنی طریقہ سے پلاٹ کی تعمیر و کشش میں کوئی نہ کوئی سحرانہ کیفیت پیدا ہی کر دی جاتی ہے۔ گورو ادب کا جس داخل میں نظر سے براہ راست سابقہ پڑا وہ فارسی تھا۔ سالہ انداز بات کا بلکل بنانا جیسے آپ کو فارسی شاعری میں نظر آتا ہے اس سے کہیں زیادہ نشری کاوشوں میں ملنا کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔

ادب کے آئینہ نشی ہی سے ذہن انسانی قصص و حکایات کا عادی ہے۔ ہر سرزمین پر اس قسم کے قصے موجود تھے۔ مصری سرزمین کے قصے، جہانکا افسانے اور دہر دلا کی ڈیڑھ گیلی سے کوئی بے خبر ہے۔ پہلے یہ چیزیں کتبیل کی صورت میں تھیں جو زیادہ تر آسانی کا غفلت سے متعلق تھیں۔ چنانچہ ہادی ہر ذہنی کتاب چاہے وہ نواریت ہو یا زور، انجیل ہو یا قرآن، گیتا یا رامائن سب میں آپ کو مثالی شکل میں قصے و حکایات ملیں گے جن میں کوئی پیغام، کوئی سبق، انسان کو قصوں کے پردے میں دیا گیا ہے اور اس طرح انسانیت کی لغو و نفاذ و ترقی کی کوششیں کی گئی ہیں۔

عصر وارسے کے قصوں میں شروع ہی سے موجود ہے۔ ہم ان قصوں کو سنتے تھے اور ان میں دھم اور کہ اپنے کو کم و کم اگر ہم کا ہیرودہ سے بھی اسی طرح بننے کی کوشش فرمود کرتے تھے۔ چنانچہ ذہنی کتابوں کے وہ قصے جو کسی پیغام کے حامل ہو کر آئے تھے ہمارے قریب مدگار رہے۔ مثلاً ہم ایک با اطلاق آدمی بننے کی کوشش کرتے تھے۔ دوسری مل کی مدد کا ہمیں اشتیاق پیدا ہوا، ہمسایہ سے ہم مدد ہی، اپنے ہم جلسوں کا خیال و غبر و دیر۔ مگر جب یہ چیزیں کچھ بڑی ہوتی ہوئے گئیں اور ذہن انسانی کے آگے ہاتھ پیرانے لگا تو ہم نے اپنے ہم جلسوں کے متعلق انھیں راستوں پر قصے گڑھنے شروع کر دیے۔ اب ان قصوں میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں ہمیں کسی افوق الفطرت ادا کی ضرورت ہوا کرتی۔ اچھے کاغذ میں تو غیر غلام و مولیٰ اور ان کے گھروں کی مدد سے لیا جاتی مگر وہ کاموں یا بعض اور دوسرے پہلوؤں پر ان کی مدد کیے لی جاتی۔ اس لئے ذہن انسانی نے انسانیت اور انسانیت کے درمیان ایک ایسے راستہ کی تلاش شروع کی جس پر بڑے کام یا عشق و محبت کی بعض اہمیتیں جو ان ہنگاموں سے تھیں یہی سکتی تھیں کہ جب جائیں، چنانچہ اس نے دیو، جنات اور بدیوں کی تخلیق کی، ویسے بھی شیطان کا اشارہ انھیں ایسا ہی کتابوں سے مل چکا تھا۔ ان کے مسکن بھی ایسے مقامات جو بڑے جگہ کے نام سے تو اس زمانہ کے لوگ واقف تھے مگر شروع کی سطوات ان کو باطلی نہ تھیں۔ چنانچہ کوہ قات، دیوار ہنقرہ، اولیس کی چوٹیوں ان کے مسکن بن گئے۔ اب انھیں بھی سپرد عقل ہو کر کسی انھیں کے سر و صوبہ دی جاتی ہیں میں چل دیں کہ انھیں کم ہوا کرتے۔ مگر یہ حالت وہ انھیں سب کے ساتھ شامل ہو کر انسانی گروہ میں بھی داخل ہوتے گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک بڑی حد تک یہ تھیں کہ انھیں انسانی گروہ میں اس کے لئے بڑھنے کی جگہ کا بھی ہوتا تھا۔ وہ تہہ نہ کرتے نہ پرتیں اس تہہ پر یہ بتاتی ہے کہ انسان میں شروع کرنے کے اصول ہیں انھیں تھیں۔ لہذا ہم ان چیزوں کو غیر حقیقی تو نہیں کہتے بلکہ انسانی سطح نظر یا انجیل دہر دلا سے انھیں اس طرح کے تخلیق کرنا کے ہر ادب میں کہیں وقت اور کن کن مقامات کی بنا پر دونا ہوتی، اس سے کہیں اس طرح کے مسکن کے گروہ میں آئے

ان اقتباسات سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ کسی کسی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ایک انگریز شاہزادی اور اس سے اس طرح کی باتوں کا اظہار اور پھر رسم و رواج، کتیاں، ہر کار سے، فاتحہ پڑھنا، سٹھوارا۔ اچھوانی۔ تبیع۔ برقع۔ کتنی عجیب عجیب باتیں ہیں اور خصوصاً اس وقت اور حیرت ہوتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی، انگریزوں کے رسم و رواج سے کم و بیش انگریزوں کے ذوق سے واقف تھے۔ اور پھر اس کے وقت میں تو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بہت ممکن ہے کہ پہلو پکانے کے لئے یہ کہہ دیا جائے کہ یہ تو پڑانے تھے ہی میں رہا ہو گا۔ میرامن نے ترجمہ کر دیا۔ مگر اس میں ذوق کم ہے۔ یہ سب تبدیلیاں قریب قریب میرامن کی ہیں اور اگر ان کی نہ بھی جویش تو کم از کم وہ انھیں صحیح ضرور کر سکتے تھے جب کہ وہ انگریزوں کی تہذیب اور ان کے تمدن سے بخوبی واقف تھے۔ جہاں انھوں نے اور تبدیلیاں نادانستہ یا اپنی خوشی سے کی تھیں وہاں ایسی چیزوں کو جلیصں وہ جانتے تھے کہ صریحاً غلط ہیں کیوں نہ بدل دیا۔ اس کا الزام ضرور ان پر ہے اور رہے گا۔

انھیں یہ بھی خیال نہ پیدا ہوا کہ وہ کتاب بھی انگریزوں کی خاطر لکھ رہے تھے اور پھر ایک اٹیسویں صدی کے انگریز کے لئے اور اس کے ملک رسم و رواج کو کیسے اس طرح پیش کر رہے ہیں

قصوں کے پلاٹ ویسے بالکل ہندوستانی افسانوں کی طرح ہیں۔ متوازیات (مماثلتیں) آپ کو ہر جگہ ملیں گی۔ پلاٹ کے موج اور الجھاؤ وہی الف لیلا اور طلسم ہوشربا و حاتمی قصوں کی طرح پیچیدہ ہوتے چلے گئے ہیں۔ قصہ در قصہ کی ترکیب عمل میں لائی گئی ہے۔ قصہ جابجا الجھتا چلا جاتا ہے۔ جب شاہزادہ نیمروز اپنا قصہ بیان کرتا ہے تو بالکل میرامن کے بے نظیر سے اس کا قصہ مل جاتا ہے۔ نیمروز کا برسی سے ملنا اور بے نظیر کا ماہ رخ سے ملنا قریب قریب ایک سا ہے۔ اعتدال کے قریب قصہ پھر پلٹتا ہے اور وہی حاتمی قصے کی طرح الجھتا ہے۔ نوم ان شاہزادے کا قصہ سن کر کہتا ہے "اے شاہزادے تو نے واقعی عشق کی بڑی محنت اٹھائی لیکن قسم خدا کی کھاتا ہوں کہ میں اپنے مطلب سے دو گز راہ تیری خاطر جنگل پہاڑ میں پھر دوں گا" مگر یہ الزام صرف چار رویش ہی پر نہیں آتا بلکہ سبھی قصے اور داستانیں اسی طرح کی ہیں۔ ہر قصہ کا ہیرو کسی بادشاہ یا دولت مند کا بیٹا ہے۔ ہر ایک کا عاشق مزاج یا جانا باز ہونا ضروری ہے۔ ہیرو یا ہیروئن کسی نہ کسی کو کوئی غوق لعلرت ہستی اٹھا لے جاتی ہے اور آخر میں ہر قصہ کا انجام مسرت یا شادمانی ہوا کرتا ہے۔ اس کے لئے ہم خاص طور سے چار رویش کو نہیں کہہ سکتے۔ ایسے دور میں جب بادشاہ ہی سب کچھ ہو۔ رعایا کی زندگی اور موت کا دار و مدار اسی کی خوشی اور خفگی پر ہوا ہو سو چاہی کیا جاسکتا تھا۔ بات یہ بھی تھی کہ عوام کے ذہن میں اس سے اچھی اور کوئی زندگی بھی نہ تھی اور قصے چونکہ عموماً طریقہ ہوا کر سکتے لہذا ہر چیز اپنی انتہائی خوبی کے ساتھ پیش کی جاتی۔

چار رویش کی کردار نگاری سے ہمیں بڑی ایسی موتی ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ مصنف کا مقصد صرف عربی اور ہندیاتی چٹخارہ تھا۔ یا اگر ایسا نہیں تھا تو وہ بادشاہوں اور شہزادیوں کی زندگی سے واقف نہ تھا یا اگر تھا تو حقیقت سے ہٹ کر اس نے ضرور لکھنے کی کوشش کی۔ پہلے درویش کی سیر میں جو شاہزادی دمشق کا کردار پیش کیا جاتا ہے وہ اتنا عجیب و غریب ہو گیا ہے کہ محض اس امر کے کہ اسے روپیہ پیسہ آسانی سے کافی تعداد میں مل جاتا ہے کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بادشاہ کی لڑکی ہے۔ بادشاہ زادی چپکے سے چپکے چوری قاضی سے نکاح پڑھواتی ہے اور اس درویش سے ہم بستری کرتی ہے مگر جب وہ اپنا قصہ بیان کرتی ہے تو سوداگر کے لڑکے سے رات رات بھر سالوں بغیر نکاح کے لطف کی رایتیں کاٹتی ہے، یہ کیرکڑ کا نیا لٹ پہلو عجیب ہے، ایسی باتوں سے شاہزادی کا کردار کم از کم ایک اچھی عورت کا کردار نہیں رہ جاتا۔ شہزادی نہ سہی پھر بھی

ایک عورت جسے اچھا کردار سمجھ کر پیش کیا جائے اس سے اس طرح کے کام لینا کچھ عجیب سا ضرور معلوم ہوتا ہے اور پھر یہ نظریہ تو اس وقت کا ہے کہ عورت صرف عورت ہے چاہے وہ بادشاہ زادی ہو یا فقیر کی لڑکی مگر از کم کم اس زمانہ میں نظریہ یہی تھا کہ ہر بادشاہ زادی با عصمت اور عفت آباد ہوا کرتی ہے۔ یہاں قصہ میں شاہزادی کو ہر وقت جنسیت کے سوا اور کچھ نہیں سوچتا ساری زندگی ایک کوچھوڑ کر دوسرے کو پکڑتی پھرتی ہے۔ گھر سے تاجر بیچے کے ساتھ رات میں بھاگ نکلتی ہے اور پس منظر بالکل خاموش و جامد نظر آتا ہے نہ کوئی پاسبان ہے نہ پرسان حال۔ بعینہ یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک سسنان قلعہ میں ایک آہو بانہ آوارہ عورت بند ہے وہ جب چاہتی ہے اور جس سے سودا ملے ہو جاتا ہے اسی کے ساتھ چل گھڑی ہوتی ہے۔ مکمل شہوانیات کا مرتع ہے۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ایسی چیزیں کس طرح کردار سے وابستہ کی گئیں اور ہاگو ایسا کیا گیا تو دوبار میں پیدا ہوتی ہیں۔ یا تو ماحول پر جنسیت کا غلبہ تھا یا مصنف کو واقعات و کردار کا صحیح علم نہ تھا۔ لاعلمی تو ہم نہیں مان سکتے اس لیے کہ یہ چیزیں ان کے سامنے تھیں اگر آج ہم کوئی ایسی غلطی کریں تو کچھ وجوہات ڈھونڈ بھی جاسکتی ہے۔ حالانکہ یہ غلطی کچھ آردو ہی کے افسانہ نگاروں نے نہیں کی۔ ہندوستان کی سرزمین کی سبھی داستانیں عام اس کے کہ وہ منسکرت ہوں یا ہندی اس سے خالی نہیں ہیں۔ اس کے کردار بھی جنسی دباؤ کے شکار ہیں جہاں شہوت پرستی اور محبت میں کوئی امتیازی لکیر نہیں کھینچی جاسکتی۔ مہرچمہ کٹکا اور بیتال جیسی وغیرہ اخلاقی، ادب باشی اور قابل نفرت جنسی فسادات سے بھری پٹری ہیں جنہیں اس طرح مزہ لے لے کر بیان کیا گیا ہے گویا یہی زندگی کے سب سے اہم مسائل ہیں۔ جہاں بھارت میں بدھ شطر کے دھرم راج میں حکومت ۸۲ ہزار یا ۸۸ ہزار روپے تھیوں میں سے ہر ایک کے لئے ۲۰ روپے یا ۲۱ روپے مقرر کرتی ہے

اگر ہم تاریخ کو ہر سہرا لیں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ مشرقی ادب تقویتاً ہر دور میں دربار یا امیروں کی بارگاہ پر جیسے سائی کرتا رہا ہے، ان ادیبوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ان صاحب دربار امراء کو خوش کر کے اپنی روٹی پیدا کرنے کے لئے ایسی ایسی باتیں بنائیں جن سے ان کرم فرماؤں کی طبیعت سیدھک اٹھے اور اسی ترنگ میں وہ انعام و اکرام کی تقسیم میں اضافہ کریں چنانچہ ان کے یا ان سے متاثر ماحول کے لئے یہ چیزیں پیش کی جاتیں جسے ادبیت، حقیقت یا حقیقت یا حقیقت سے بہت کم مطلب ہوا کرتا۔ انہیں داستان سازوں کے لئے ناگشتی کہتا ہے:-

”چونکہ ان کا پیشہ امیروں کی خوشنودی ہے اس لئے ان میں خودداری کا احساس باقی ہی نہیں رہتا۔ کی ہوس میں اندھے ہو جاتے ہیں اور مدح و ثنا پر اپنا دین و ایمان نثار کر دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر کتنا افسوس ہوتا ہے کہ آرٹ کی خاطر زندگی کے لئے بیکار تو ہو ہی جاتے ہیں لیکن با ایں ہمہ آرٹ کو قایدہ کیا اٹنا نقصان پہنچاتے ہیں۔ علاوہ اس کے یہ لوگ امیروں کی غیر فطری زندگی کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ بے زار ہو کر مر نہیں جاتے بلکہ حسن و عشق کی دنیا میں اپنی روح تلاش کرنے کا دلچسپ مشغلہ اختیار کرتے ہیں۔ امیروں کو ان کا آرٹ یہ تلقین کرتا ہے کہ وہ انسانی نیکی کے لئے نہیں بلکہ حسن پرستی یعنی عیاشی کے لئے زندہ ہیں۔ امیروں کے دیرسایہ جو غریب رہتے ہیں وہ بھی ان مکرہ جذبات سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جن کی ترجمانی آرٹ کر رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں میں ذہنی بُرائی اور ادب باشی کے اثرات سرعت سے پھیلنے جاتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے زمانے کے آرٹ کا ادبی حشر ہوا جو ایک عشوہ فروش ہرجائی کا ہوتا ہے۔ آرٹ فضاوت و بلاغت، عبارت آرائی اور رنگین بیانی میں اپنی ضمیر فروش و نفس پروری کو چھپاتا ہے اور طوائف و غنہ و غارہ سے اپنی بد صورتی پر پردہ ڈالتی ہے۔ غرض کہ ہمارے زمانہ اور ہمارے طبقہ کے آرٹ میں اور کسی کسی میں ذرا فرق نہیں۔ یہ تشبیہ لفظ صحیح ہے۔ آرٹ اتنا ہی خود فروش۔ سیاہ باطن اور فریب کار ہے۔“

اس اقتباس کے بعد اس ضمن میں مجھے اب کچھ نہیں کہنا اور فیصلہ کو آپ پر چھوڑ کر آگے بڑھتا ہوں۔ تاجر کچے کا کردار سوائے داستان گو کے اور کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ لاؤ بالی پن اور بے پروائی عموماً پیشی ہے۔ جو ہر امر کچھ پاڑے باپ کے بیٹے کے لئے عموماً لائی جاتی ہے۔ ویسے اس کی سادہ لوحی کا بھی کافی خیال رکھا گیا ہے معاملات عشق میں سوداگری کا کوئی عنصر نہیں جھلکتا۔ رحم و مروت و خلق روائیتی ہے جس میں کسی انفرادیت کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ عشق کی دھن میں کچھ سوچ نہیں سکتا اور شاہزادی کے اشاروں پر کام کرتا ہے۔ ساری زندگی میں سوائے عشق کے اسے کوئی اور مصیبت پیش نہیں آتی جو تکلیفیں جا بجا ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں وہ بھی اسی ضمن میں

ضررنا مثل بھائی بہن کی محبت دکھائی گئی ہے اور اچھی طرح دکھائی گئی ہے۔ حالانکہ بعض اوقات خاطر داری میں ملکہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے کہ حقیقت معدوم ہو جاتی ہے۔ جب بہن کھانا کھلاتی ہے تو چھنے کھانے ہو سکتے ہیں بیک وقت لاتی ہے اور برابر اسی قسم کا کھانا کھلاتی رہتی ہے۔ بھائی کو مصیبت میں دیکھ کر بہن کا اظہار افسوس بہت نیچرل طریقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس کا بھائی کو صلاح دینا کہ وہ اب کسی سفر پر جائے اور اپنی حیرانی و پریشانی دور کرے۔ یہ ہرگز ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ وہ بد دل ہو کر اسے بھگانا چاہتی ہے۔ اس لئے کہ جس عنوان سے وہ بھائی کو رخصت کرتی ہے وہ اس کی محبت کی بہترین مثال ہے

”جب رخصت ہونے لگا بہن نے ایک سری بھاری اور ایک گھوڑا چڑاؤ ساز سے توضیح کیا۔ اور ٹھکانی پکوان ایک خاصہ دان میں بھر کر ہرنی سے ٹکا دیا اور چھانگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر بانڈھا۔ دہی کا ٹیکہ ماتھے پر لگا آفسوپی کر بولی سدھا رو! تمہیں خدا کو سونپا۔ پیٹھ دکھاتے جاتے ہو اسی طرح جلد اپنا منہ دکھاؤ۔“

دوسرے اور تیسرے صدیش کی سیر میں کوئی کردار ہمیں ایسا نہیں ملتا جو جاذب نظر ہو۔ چھوٹے چھوٹے کردار ہیں جو دھوپ چھاؤں کی طرح ہمارے سامنے سے گزرتے چلے جاتے ہیں اور تھکے میں اتنی تیزی پیدا ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والا اس دھن میں کہ بھر کیا ہوا، بجائے اثر کے ان کے سہارے ہی کو کافی سمجھتا ہے۔ کبھی کبھی حرکات و سکنات اور ماحول کا تضاد ہم کو ضرور چونکا دیتا ہے مگر ہم صرف مسکرا کر پھر انسانیہ میں ہمہ تن ڈوب جاتے ہیں

آزاد بخت بادشاہ کی سرگزشت ہم کو بھر ایک عجیب و غریب کردار سے روشناس کراتی ہے یہ خواجہ سگ پرست ہے جس طرح پہلے درویش کی سیر میں بہن کا کردار پیش کیا گیا ہے اُسی نمونہ کا یہ بھائی کا کردار ہے مگر دونوں میں زبردست فرق ہے۔ بہن کا کردار محض رسمی اور روائیتی ہے۔ کوئی انفرادیت اس میں آپ کو نہ ملے گی مگر خواجہ سگ پرست کے کردار میں انفرادیت ہے اس کی زندگی کی ہر منزل دوسری ہے اور ایک نیا مرحلہ پیش کرتی ہے جسے ملے کرنے کے لئے ہمارے سامنے ایک نیا سانچہ لایا جاتا ہے اور ہم ہر تہ از سر نو ایک نئے سفر کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ بھائی ہر تہ بد سلوکی اور بد عہدی کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کی جان مال ناموس تک کے درپے ہوتے ہیں

..... مگر خواجہ ہر تہ درگزر کرتا ہے آخر کار عاجز آکر انھیں پنجرے میں قید کرتا ہے اور جو سلوک ان کے ساتھ کرتا ہے وہ حق بہ جانب معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں خواجہ سگ پرست کا اپنے بھائیوں کا قید کرنا بھی کردار نگاری کا زبردست نکتہ ہے اگر یہ نہ ہوتا تو ہم کو خواجہ کے کردار میں ایک سیاسی کنی کا احساس ہوتا اور مصنف کو ہم محض عینیت پرست سمجھتے۔ ایک دشمن کے ہاتھ سے ہمیشہ اس طرح پریشان رہنا اور اسے اپنے قبضہ میں پکڑ کر ہمیشہ اسے نہ صرف چھوڑ دینا بلکہ اس کی جان و مال سے مدد کرتے رہنا انسانی کردار سے بالاتر چیز ہے جسے صرف کوئی فوق فطرت ہمتی ہی انجام دے سکتی ہے

اس موقع پر ہمیں کے کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے۔ اس کی جال فروشی اور ونا داری کا اچھا نمونہ پیش کرتی ہے اور آخر میں اس کا انجام ”کر جھلا ہو جھلا“ کے مصداق کی تصدیق کرتا ہے

چار درویش میں موقع موقع سے مافوق الفطرت ہستیوں سے بھی مدد لی گئی ہے جو زیادہ تر قصہ کے انسانی کرداروں کو سنبھالا دیتی ہیں۔ نقاب پوش، ہر درویش کو خود کشی سے بچاتا ہے۔ دست غیب زمین سے خزانہ برآمد کرتا ہے۔ بڑا بٹ ابو برہنوں کی مادی برقوق فطرت ہونے کا عقیدہ خواہ سب پرست کی دستگیری کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ چوتھے درویش کی سریر میں فوق فطری عنصر زیادہ تیز ہو گیا ہے اور قریب قریب پورے قصہ پر حاوی ہے۔ ابتدا۔ منتہی۔ اختتام ہر جگہ یہ عنصر بہت سرگرمی سے نظر آتا ہے کشمکش (CONFLICT) میں بھی اس کا زبردست حصہ ہے۔ نہ خانے میں ایک طلسمی بندر کی کئی تصادم پیدا کرتی ہے اور قصہ کے بڑھنے اور پھیلنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ سہرک صادق جنوں کا بادشاہ آتا ہے۔ اس کا عشق اور عورت کی تلاش، تصادم اور ٹھہراؤ (Stalemate) کی عملی کیفیتیں ہیں۔ ملک صادق کا کردار کم و بیش ویسا ہی ہے جیسا کہ تصوں میں عموماً ان ہستیوں کا کردار پیش کیا جاتا ہے۔ معشوق کی تلاش آدم زاد کے ہاتھوں اس کے کردار کو عوامی نظریے کچھ الگ ضرور کر دیتی ہے اور سہر شاہزادے کی عہد شکنی پر ملک صادق کا عتاب رسمی اور روایتی ہے۔ آخر میں شہنشاہ شاہ شہنشاہ قان کا کردار بیحد داستان امیر حمزہ کے شہنشاہ شاہ سے ملتا ہے۔ جھولا اُسٹو امنگالے کی رسم بھی غالباً وہیں سے عبارت ہے

قصہ کے داستان گو کا کردار سرگرمی سے بہت کم اُبھرتا ہے۔ زیادہ تر وہ ایک سینائی مشین میں ہے جو فلم رول بیٹ کر دیتا ہے۔ تصویریں آپ کے سامنے نکلتی چلی جاتی ہیں اور محویت کے عالم میں آپ داستان گو کی شخصیت و کردار پر دھیان بھی نہیں دیتے

سید محمد عقیل

سہ عوامی نظریہ یہ ہے کہ فوق فطری ہستیاں اپنے معشوق کو انسان کی نظروں میں ہلاک کر کے اُٹھالے جاتی ہیں

لمحات فصاحت کا مفید ترین مصروف

آپ غلام اہل یا تاجر، امیر ہوں یا غریب آپ کے لمحات فصاحت کا بہترین مشغلہ ”خیر کثیر“ ہونا چاہئے۔ ”خیر کثیر“ یعنی نیک طبابت جی رہ شریف ترین فن ہے۔ جس سے آپ خدمت خلق کے علاوہ خاطر خواہ مالی منفعت اور عزت و توقیر حاصل کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اپنا نام ”رفیق صحت“ آپ کا بہترین رفیق ہوگا، اس میں سہراہ ایسے ایسے تیر بہون، کم خرچ اور سہل الموصول نسخے درج ہوتے ہیں۔ جن کی نظریاتی دنیا میں لٹا مشکل ہے۔ پہلا پرہ تہدی جیسے غیر علاج مرض پر شایع ہوا ہے۔ جس میں اس مرض کے ماہر و اعلیٰ پرہ پرہ کا عمدی مدد شفا ملتی گئی ہے، تہدی کے اسباب اور ان کا آسان خیر بہون کم خرچ علاج کے علاوہ دیگر امراض پر بہترین صدی نسخے۔ صنعتی دہائی میں ناپاہر کردئے گئے ہیں۔

سالانہ چندہ تیس روپے (تیس) تہدی نمبر ایک روپیہ (ایک)

لے کا پتہ :- مکتبہ ”رفیق صحت“ داتا گنج بخش روڈ۔ لاہور

۳۰۰ء کی جنگ

اگر اب سے ۵۰ سال بعد لڑائی چھڑی (گو خیال تو یہی ہے کہ زمانہ اتنی ہمت نہ دے گا) تو وہ کس نوعیت کی ہوگی اس پر ماہرین فن ابھی سے غور کر رہے ہیں۔ خیال کہ آئندہ ۵۰ سال کے بعد جنگ کی نوعیت بالکل مختلف ہوگی، ایٹم بم کی ایجاد سے پیدا ہوا ہے۔ یونہی تو اس سے قبل بھی یعنی لڑائیاں ہوئی ہیں ان کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف رہی ہے، مثلاً جنگ پور (افریقہ) میں سوار دستوں سے کام لیا گیا، سسٹھ کی جنگ میں دور مار توپیں زیادہ کارآمد ثابت ہوئیں اور سسٹھ کی لڑائی ٹینکوں کی لڑائی تھی، لیکن اب آٹم بم اور بائیڈروجن بم کی ایجاد کے بعد لڑائی کے تمام پچھلے طریقوں کو بالکل بدل جانا ہے اور اس کی طیاریاں ابھی سے جو رہی ہیں

لوگ سمجھتے ہیں کہ آئندہ جنگ صرف ایٹم بم کی جنگ ہوگی اور تمام دوسرے ذرائع اپنی اہمیت کھو بیٹھیں گے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ ذرہ ایٹم کے انفجار کے پیش نظر صرف یہی نہیں ہوا کہ ایک نہایت مہلک قسم کا بم طیار ہو گیا، بلکہ تمام دوسرے آلات و ذرائع جنگ پر بھی اس کا بڑا اثر ہوگا اور خشکی، تری اور فضا کی افواج و آلات جنگ سب میں تبدیلیاں ہو کر بالکل نیا فن حرب وجود میں آئے گا

اس سے قبل دنیا پر کئی دور گزر چکے ہیں، سب سے پہلا عجمی دور وہ تھا جب انسان صرف پتھر کے اوزاروں سے کام لیتا تھا اس کے بعد وہ دھات کی چیزیں طیار کرنے لگا تو فلذاتی دور شروع ہوا، لیکن حال کا دور آٹمی دور ہے اور اس میں جو ایجادات و اختراعات ہوں گی وہ نہ صرف طریق جنگ بلکہ دنیا کی تمام تمدنی و معاشرتی ڈھانچہ کو یکسر بدلیں گی انفجاری آٹم بم میں کامیاب ہونے کے بعد ماہرین سائنس غور کر رہے ہیں کہ اس زبردست قوت سے کیا کیا کام لئے جاسکتے ہیں وہ حکماء جن کے سامنے صرف انسانی معاشرہ ہے وہ تمدن و معاشرت کو بدلنے کی فکر میں ہیں، وہ علماء جن کا تعلق صنعت و حرفت سے ہے وہ صنایع ملکی پر اس قوت سے کام لینے کی فکر میں ہیں، لیکن ارباب جنگ و حرب یہ سوچ رہے ہیں کہ آٹمی دور میں کون کون سے محیر العقول اور حد درجہ ہلک آلات حرب طیار ہو سکتے ہیں۔ اور صرف سوچ ہی نہیں رہے ہیں، بلکہ انکی طیاریوں میں مصروف ہیں

اس وقت آٹم کاراز صرف چند ملکوں کو معلوم ہے اور قیمتی یا خوش قسمتی سے یہ راز ایک ہی ہلاک کے اندر محدود نہیں ہے بلکہ دونوں مخالفین ہلاک اس سے واقف ہیں اور روس و امریکہ کا ایک دوسرے سے خالیف رہنے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے۔ فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ لڑائی میں آٹم بم کا استعمال دونوں طرف سے ایک ساتھ ہوگا یا بالکل نہیں ہوگا اور ہوا بھی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لیکن پچھلا تجربہ بتاتا ہے کہ جنگ کی ابتدا غائب آٹم بم سے نہ ہوگی اور اس کا استعمال اگر ہو بھی تو صرف اس وقت ہوگا جب دونوں فریق میں سے کوئی ایک جان سے ہاتھ دھوئے کھلی جنگ میں بھی زہریلی گیسوں کے استعمال کا بڑا اندیشہ تھا کیونکہ دونوں فریق کے پاس یہ گیس موجود تھی، لیکن اس سے کام نہیں لیا گیا۔ حالانکہ گیس کے اثرات سے بچنے کے لئے نقاب وغیرہ بھی طیار کر لئے گئے تھے۔ اس تجربہ کے پیش نظر خیال کیا جاتا ہے کہ آئندہ جنگ میں آٹم بم کے استعمال میں اور زیادہ احتیاط سے کام

لیا جائے گا، کیونکہ اول تو اس کے مہلک اثرات کا دفعیہ آسان نہیں اور اگر بھی تو اس کی طیارہ کے لئے بڑے صرف اور کافی قوت کی ضرورت ہے، تاہم انفجار آٹم کاراز صدام ہو جانے کے بعد دیگر آلات حرب میں البتہ غیر معمولی ترقی ہو جائے گی اور موجودہ فنون جنگ کی ہیئت بالکل بدل جائے گی۔ اس وقت حملہ کے اصول یہ ہیں کہ دشمن کی فوج اور اس کے مرکزوں پر ہوائی جہازوں سے بم گرائے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ ٹینک بڑھتے ہیں جن کے پیچھے سپیل فوج ہوتی ہے اور اس کے عقب میں توپ خانہ ہوتا ہے۔ لیکن آئندہ یہ ترتیب اور ان چیزوں کی ہیئت بہت بدلی ہوئی ہوگی۔ ہوائی جہاز بجائے پٹرول کے آٹمی قوت سے چلیں گے بہت تیز رفتار ہوں گے اور ان کی حیثیت فضا میں وہی ہوگی جو ابانی میں جنگی جہازوں کی اس وقت ہے، ان میں بڑی بڑی توپیں نصب ہوں گی جو آٹمی گولے برسائیں گی، اور اترنے کے لئے انھیں بہت تھوڑی سی جگہ درکار ہوگی، ان کی ساخت ایسی ہوگی کہ زمین پر اترنے کے بعد وہ ترکیب کا کام بھی دے سکیں اور نامحور زمین پر وہ چلی سکیں یہ سہ منزلہ ہوں گے اور سپاہیوں کی ایک بٹالین ان کے اندر آسکے گی۔ ان میں ٹیلی ویژن بھی نصب ہوگا جس کے ذریعہ سے وہ دیکھ سکیں گے کہ ان کی بمباری کا کیا اثر ہوا، یہ بمباری صرف آٹم بموں کی نہ ہوگی بلکہ مہلک بیماریوں کے جراثیم کی بھی ہوگی۔ وہ جس حصہ زمین کے اوپر سے پرواز کریں گے اس کا فوٹو بھی لے سکیں گے خواہ موسم کیسا ہی خراب ہو۔

سنہ کا توپ خانہ بھی مختلف ہوگا، توپیں، ٹریکٹرز پر قائم ہوں گی اور انجن کے ذریعہ سے منتقل کی جائیں گی، یہ ٹریکٹرز وسیع ہوں گے کہ ان میں توپ خانہ کا پورا اسٹاف بیٹھ سکے گا اور ان کی ساخت ایسی ہوگی کہ اگر دیا سا صفحہ آئے تو وہ اس کو بھی یہ آسانی عبور کر سکیں، ان کی توپیں آٹمی گولے برسائیں گی اور ان کی ساخت موجودہ توپوں کی ساخت سے مختلف ہوگی کیونکہ آئندہ یہ پیادہ فوج کے ساتھ ساتھ چلیں گی اور ان گولے برسانے کے لئے زیادہ فاصلہ کی ضرورت نہ ہوگی ٹینکوں کی ساخت بھی بہت بدل جائے گی اور آئندہ یہ بہت بڑے بڑے طیارے جائینگے اور تین سو سے زیادہ $R \alpha fnd$ ان پر اثر انداز نہ ہو سکے گی، یہ زمین کے ہر حصہ میں گزر سکیں گے خواہ وہ کیسا ہی نامحور و دشوار گزار کیوں نہ ہو۔ یہ اپنی توپوں سے آٹم گولے برسائیں۔ آلات تصویر کشی، ریڈیو، ٹیلی ویژن، لاسکی ٹیلی فون اور تمام جدید ترین ذرائع مداخلت و خبر رسانی سے آراستہ ہوں گے

آئندہ فنی حیثیت سے جو تبدیلی ہونے والی ہے، اس کی نوعیت کچھ اس طرح ہوگی کہ پہلا فضائی فوج اس مقام پر بمباری کرے گی جس پر قبضہ کرنا ہے، اسی کے ساتھ توپ خانے گولے برسائیں گے، ٹینک آگے بڑھیں گے اور اسی کے ساتھ پیادہ فوج قبضہ کرتی چلی جائے گی

جس لڑائی میں آٹم بم استعمال کیا جائے گا اس کی ترتیب کچھ اور ہوگی، سب سے آگے دشمن سے قریب تر پیادہ فوج ہوگی اس کا سبب یہ ہے کہ آٹم بم کا اثر چار مربع میل کے اندر ہی اندر رہتا ہے اور ہر فریق آٹم بم کا استعمال چار میل کے حدود سے باہر ہی کرے گا تاکہ خود اس کی فوج اس سے متاثر نہ ہو، اس لئے جو فوجیں دشمن سے قریب تر ہیں وہ بھی محفوظ رہیں گی اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہوگا کہ پیادہ فوج جلد سے جلد آگے بڑھ سکے اور یہ کام ہوائی جہازوں اور آہن پوش موٹروں سے لیا جائے گا، گویا الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ آئندہ پیادہ فوج کو خود زیادہ مارچ نہ کرنا پڑے گا بلکہ وہ میکاکی ذریعہ سے میدان حرب میں منتقل کی جائیں گی

یہ سچ ہے کہ آٹمی جنگ میں وہی فریق زیادہ کامیاب ہوگا جو سب سے پہلے حملہ کرے گا، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ مداخلت کے سوال کو نظر انداز کر دیا جائے، کیونکہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سب سے پہلے کس کی طرف سے حملہ ہوگا، چنانچہ آٹمی حملہ کے نتائج کے پیش نظر تحفظ و مداخلت کی تدابیر بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے تمام اہم مقامات کو قلعہ بند کیا جائے گا اور یہ قلعہ بندیوں

زمین کے اوپر بھی ہوں گی اور زیر زمین بھی۔ زمین کے اوپر بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹلے جن کے چاروں طرف سرنگیں وغیرہ بھی ہوں گی ایسے بے گناہ جانیں گے کہ ریڈیائی شعاعوں کی گرمی کو قبول نہ کریں گے اور جدید ترین آلات سے آراستہ ہوں گے، زمین کے اندر کی پناہ گاہیں یوں سمجھنا چاہئے کہ زمین دھڑلہ رہے گی جہاں سرنگیں، ہوٹل، حاشیہ گاہیں، بجلی کی روشنی، دوکانیں وغیرہ سب کچھ ہوگا پیادہ فوج کو بہت سبک سامان سے آراستہ کیا جائے گا تاکہ ان کا بوجھ بہت کم ہو جائے اس کی وردی بہت لمبی ہوگی اور اسی چیز سے طیار کی جائے گی جگہ گیس، ریڈیائی شعاعوں اور موسم کی صورتوں سے محفوظ رکھ سکے، ہر ایک کارکن کو از کم ایک ہفتہ کے لئے وطن میں کی چھوٹی چھوٹی ٹکلیوں کی صورت میں تقسیم کیا جائے گا اور کچھ ٹکلیاں پیاس بجھانے کے لئے بھی ہوں گی۔ اس کے علاوہ جو کچھ فراہم کیا جائے گا اس کا انتظام ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے ہوگا

ہر سیاہی گردن سے لیکر پاؤں تک ایک ایسے لبادہ میں لپٹا ہوا ہوگا جس پر ریڈیائی شعاعوں کا اثر نہ ہو سکے، سر پہ ایک خود ہوگا جس میں ایسی عینک لگی ہوگی جو درمیان کا کام بھی دے سکے، اس کے پاس ایک ریڈیوسٹ بھی رہے گا اور لاسکی ٹیلی فون بھی تاکہ ہر وقت وہ خبر دے سکے اور ہدایت سن سکے۔ اس کی ہندوق از خود چلنے والی ہوگی اور اس کو چلانے کے لئے خود اس کو کچھ نہ کرنا پڑے گا، اس کے پاس ایک ایسا آلہ بھی ہوگا جو لبادہ کے اندر کی ہوا کو ٹھنڈا رکھ سکے

تعلیم کے لحاظ سے بھی مستقبل کا سپاہی بہت ترقی یافتہ ہوگا، خصوصیت کے ساتھ اس کو نفسیات کا ماہر بنایا جائیگا اور ضرورت کے وقت وہ مرکب، ٹینک، ہوائی جہاز وغیرہ سب چلا سکے گا

پوسٹکس، بدھس کا مشہور بیٹی نزاو شاعر تھا۔ ایک دن جب وہ کلیسا اپنی شادی کرنے جا رہا تھا تو راستہ میں اس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ میری ایک سوچ ہو رہی ہے اور اس سے قبل ایک سو بارہ عورتوں سے محبت کر چکا ہوں

شادی کے بعد وہ اس بیوی سے بھی نباہ نہ کر سکا اور آخر کار اس کا ایک رقیب پیدا ہو گیا جس سے اس کی بیوی محبت کرنے لگی تھی۔ بٹکن کو اس کا علم ہوا تو اس نے اپنے رقیب کو ڈویل کا پیٹنچ دینا اور اس لڑائی میں بٹکن مارا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۳ سال کی تھی

اگر ۲۰ سال میں اس نے پہلی شادی کی تھی تو اس کے سنے یہ ہیں کہ سترہ سال میں اس نے ایک سو تیرہ یعنی ہر سال تقریباً آٹھ عورتوں سے شادی کی

۱۷۷۷ء میں لارڈ ڈارلن اور اس کی بیوی میں ایک عبارت کے متعلق جیسے وہ اپنی قبر پر کندہ کرانا چاہتا تھا اختلاف ہو گیا اور یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ نوبت عدالت تک جانے کی پہنچ گئی اور بیوی نے قسم کھائی کہ جب میرا شوہر مرے گا تو میں اس کی قبر پر قصبہ کروں گی

کچھ دن کے بعد اتفاق سے لارڈ ڈارلن مر گیا اور بیوی بہت خوش ہوئی کہ اب اسے اپنی قسم پوری کرنے کا موقع ملے گا اور اس کی قبر پر قصبہ کر کے اپنے جذبہ انتقام کو پورا کرے گی، لیکن انسوس ہے کہ اُس کی یہ آواز پوری نہ ہو سکی۔ کیونکہ جب ڈارلن کا وصیت نامہ پڑھا گیا تو اس میں لکھا تھا کہ ”میری لاش دریا میں ڈال دی جائے“

سردار جعفری کے سماجی شعور کا تجزیہ

کسی فرد یا کسی شاعر کے شعور کے مطالعہ میں جرتے ہوئے مادی حالات کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ اسکا شعور مخصوص مادی حالات اور سماجی ماحول میں مسلسل عمل اور رد عمل سے تشکیل پاتا ہے، یوں تو انسان کے شعور پر نہ جانے کتنی چیزوں کا اثر پڑتا ہے اور ہر منزل اس کے شعور کی تشکیل میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیتی ہے اور اس پر اپنا اثر چھوڑ دیتی ہے لیکن اصل چیز معاشی زندگی کے حالات ہیں جو سماجی اور معاشرتی احساس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب حالات بدل جاتے ہیں تو شعور خود بخود بدل جاتا ہے اس لئے کہ شعور کسی کے پاس پہلے سے بننا بنا یا موجود نہیں ہوتا ہے، گویا اب یہ ظاہر ہو گیا کہ معاشی تبدیلیوں سے سماجی اور معاشرتی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں، لیکن یہ تبدیلیاں ہر طبقہ اور ہر گروہ میں یکساں طور پر نہیں ہوتی ہیں، جو لوگ تاریخی جدلیت کے اصول اور معاشی تغیر کو اچھی طرح سمجھتے بغیر تبدیلیوں کو قبول کر لیتے ہیں ان کے اندر ایک واضح تضاد ملتا ہے اور ان کے خیالات اور وقت کے تقاضوں میں مکمل ہم آہنگی نہیں ہوتی ہے، جذبہ اور شعور میں کوئی دیوار نہیں حائل ہے۔ بغیر شعور اور تخیل کے کسی جذبے میں گہرائی نہیں پیدا ہو سکتی، شعور جتنا رجا ہوا اور شدید ہو گا جذبہ بھی اتنا ہی شدید ہو گا لیکن کبھی کبھی جذبہ غلط بھی ہو سکتا ہے، جذبہ کی یہ خامی شعور کی خامی کو ظاہر کرتی ہے، شعور، احساس، تخیل اور جذبات کائنات کی ہر چیز کی طرح بدلتے رہتے ہیں، تغیر کا یہ عمل برابر جاری ہے۔ ادب اور آرٹ کبھی بھی انسان کی اس جدوجہد سے غلط نہیں ہو سکتا، طبقاتی کشمکش بھی اسی جدوجہد کا ایک اہم حصہ ہے۔ وہ اس کو متاثر بھی کرتی ہے اور اس عمل میں اس سے متاثر بھی ہوتی رہتی ہے، یعنی یہ کہ انسانی شعور مادی زندگی کی پیداوار ہے، لیکن جو چیز اس کو جلا دیتی ہے، وہ مادی زندگی کا عکس ہے، یعنی انسان کا علم جو مادی بنیاد پر اثر انداز بھی ہوتا ہے

ادب کا تعلق دنیا کے محسوس واقعات سے ہے۔ وہ ہماری معاشی اور معاشرتی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا رہتا ہے جس طرح زندگی کے دوسرے حرکات اور سکناات، ادیب یا شاعر عام انسانوں کی طرح ایک خاص نظام حیات اور ایک مخصوص حیثیت اجتماعی کا پروردہ ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تاریخ ادبیات کے کوئی معنی نہ ہوتے۔ ادب دور بندو بدلتے اور بڑھتے ہوئے انسانی خیالات اور جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے، ادب زندگی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں، وہ زندگی کے ساتھ سائے کی طرح رہتا ہے۔ وہ زندگی کی تفسیر بھی ہے اور تنقید بھی۔ ادب کی شخصیت اور شعور ہر ماحول کی اسی اثر اندازی کی وجہ سے مارکس، وجود کو سوچنے اور عمل کو 'نظر' پر فوقیت دیتا ہے

زندگی کی طرح ادب کی بھی ایک جدلیاتی (حرکت ہوتی ہے۔ جو اہم تضاد پہلوؤں سے ترکیب پاتی ہے اور ایک پہلو تو خارجی، علی یا مادی ہوتا ہے، دوسرا داخلی، تخیل اور جمالیاتی، دوسرا پہلو فن کار کی انفرادیت کا منسوب ہوتا ہے، لیکن یہ انفرادیت اور داخلیت اجتماعی جذبات اور اجتماعی زندگی سے الگ نہیں ہوتی ہے، بلکہ شعور کی تیز، عمل اور تخلیق کی صلاحیت سے پیدا ہوتی ہے اور اجتماعی مفاد کو آگے بڑھاتی ہے اور ایسی انفرادیت اجتماعی میں کم ہو کر بھی زندہ رہتی ہے۔ سردار جعفری انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "آج یہ مجاہد اور شہید ایک دو نہیں بلکہ لاکھوں اور کروڑوں کی

تعداد میں پیدا ہو رہے ہیں اور ایک ہی وقت اور ایک ہی زمانہ میں دنیا کے ہر گوشے سے اُٹھ رہے ہیں۔ آج سارا کرہ ارض ان کی گرفت میں ہے، چین کے لاکھوں سرخ سپاہی اور کروڑوں کسان، روس کے کروڑوں باشندے۔ ہندوستان، ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکا کے کروڑوں مزدور یہ سب نئے مجاہد ہیں، نئے ہیرو ہیں اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عوام اور محنت کش طبقہ سے آتے ہیں، اور ان کی شجاعت انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی بھی ہے، آج یہ اس طرح پیدا ہو رہے ہیں جیسے موسم بہار میں پھولوں کی فراوانی ہوتی ہے، یہ بیسویں صدی کے انسان کے فائنما جذبہ کے صحیح ترجمان ہیں اور انھیں جذبات کی تصویر کشی آج سچی شاعری ہے۔۔۔۔۔ کوئی شاعر اس وقت تک ان کی تصویر کشی نہیں کر سکتا جب تک کہ یہ جذبات خود اس کے اپنے سینے میں موجزن نہ ہوں اس لئے یہ ضروری ہے کہ یہ اجتماعی جذبہ شاعر کا انفرادی جذبہ بن جائے اور اس کے لئے آج کے ترقی پسند شاعر کا خود بھی مجاہد ہونا ضروری ہے۔

مختصر یہ کہ کسی شاعر کے شعور کا تجزیہ کرتے وقت ہمیں اس کے ماحول اور مادی حالات کا بھی جائزہ لینا ہوگا، مادی حالات اور معاشی زندگی کے آثار چڑھاؤ کو سمجھنے بغیر شاعری کو صحیح طور پر تاریخی حقائق کی روشنی میں نہیں سمجھا جاسکتا، ایسے اسی روشنی میں سردار جعفری کی شاعری پر نگاہ ڈالی جائے:

سردار جعفری کے سماجی شعور کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس دور کے بدلتے ہوئے مادی حالات اور طبقاتی ڈھانچے کو سمجھنا ہوگا اس کی شاعری کے پیچھے جو فلسفیانہ اور نظری اور عملی پس منظر ہے جو خارجی حقائق ہیں۔ ان سے واقفیت حاصل کرنی پڑے گی، اور زندگی اور سماج کی حرکت کو سمجھنا پڑے گا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ چیز بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تاریخی انقلاب کے دور میں شعور کی تشکیل بہت پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں، بہت دنوں تک تبدیلی کے عناصر واضح نہیں ہوتے ہیں۔ اور آگے کی راہ روشن نہیں ہوتی ہے اس کے علاوہ جو زمانہ اور ملک سیاسی اور معاشی حیثیت سے زیادہ کشمکش اور پیچیدگی کا شکار ہوتا ہے اتنا ہی اُسکے تجزیے میں دشواری ہوتی ہے جنگ عظیم کے بعد اور خاص طور سے سن ۱۹۱۷ء کے بعد ہندوستان نے ایک نئی کروٹ لی، آزادی کی جنگ تیز سے تیز تر ہو گئی سیاسی شعور نے سماجی شعور کو متاثر کیا اور ہمارے شعروادب میں ایک نئی چھوٹ اور ایک نیا انداز اور جذبہ پیدا ہو گیا، شاعر اب حکم کھلا میلان جنگ میں آگئے اور غلامی کی طوق کو سیاسی رہنماؤں کے ساتھ ملکر اتارنے کی کوشش کرنے لگے، تو می آزادی کی اس جنگ میں طبقاتی شعور بھی تیز تر ہوتا گیا، ہڑتالوں پر ہڑتالیں ہونے لگیں، اور مزدوروں اور محنت کشوں نے پہلی دفعہ ایک نئے اجتماعی شعور کی طرف قدم بڑھائے اس وقت اردو کے فوجی شعراء اور ادباء بھی انقلاب روس سے متاثر ہونے لگے تھے، تاہم ۱۹۳۵ء میں ملک راج آنند اور بجا پھر کی کوششوں سے انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا، ترقی پسندی کی اس تحریک نے شاعروں اور ادیبوں کے لئے ایک نیا راستہ کھول دیا، اب انسانیت کے بین الاقوامی تعلقات مستقل مطالعہ بن گئے، سماج کو نئے زاویوں سے دیکھا جانے لگا، تمام برائیوں اور فزبول کا ذمہ دار سماجی اور معاشی نظام کو ٹھہرایا گیا جو دولت کی غلط تقسیم سے عمل میں آیا تھا

سردار جعفری کی شاعری کی عمر تقریباً وہی ہے جو ترقی پسند تحریک کی ہے، شروع شروع میں اس تحریک میں شعور کی پختگی اور گہرائی کے بجائے جوش اور جذبے کی فراوانی تھی، اور ایک طرح کی رومانیت بھی، لیکن یہ رومانیت مریضانہ نہیں تھی، اسکو ایک طرح سے انقلابی رومانیت کہا جاسکتا ہے، اس لئے کہ اس وقت ترقی پسند شعرا کی نظر زندگی اور ادب کے سماجی تعلق پر تھی، اسوقت اشتراکی جذبات کے ساتھ ساتھ قومیت اور آزادی حاصل کرنے کے جذبات بھی تھے، فواہش اور عمل کی ناقابل تفریق حدود کے اندر ایسے ہی شعور کی تخلیق ہو سکتی تھی، سماجی شعور اس وقت ایسے ہی منزل پر تھا، سردار کی ابتدائی نظمیں مثلاً بغاوت، جوانی، انتظار، کرب، لکھنؤ کی ایک شام، محبت کا خون اور حسن ناتام وغیرہ میں یہ انقلابی رومانیت کا رفرمانظر آتی ہے، ان نظموں کا جو میلان ہے وہ خاص سن و عشق کا میلان نہیں ہے۔ ان کے اندر وہ مغلوبیت اور سپردگی نہیں ملتی بلکہ اس کے برعکس ایک حوصلہ انگیز انبساط اور

عل اور انقلاب کی طرف ذوق انگیز اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً

برق کی طرح چمک مچھلنے کی اندھ لپک
موج کی طرح سے وابستہ ساحل ہی نہ رہ
عمربھریوں تو نہ جل شمع شبستاں ہو کر
حسن کے بھرے آٹھ عشق کا طوقاں ہو کر
پھول کی طرح سے کھل شوق کے گلزار بنیں
پھیل جا نکھت گل رنگ بہاراں ہو کر

اور انتظار نہ کر، میں سرور اپنے محبوب کو سمجھتا نہیں لیکن اس سے اتنا ضرور کہتا ہے کہ تم اس وقت میرا انتظار نہ کرو، یہ عجب گھڑی ہے۔ میں سرور عشق کی دنیا نہیں بسا سکتا، دیکھو وہ کس پنڈار اور عزم کے ساتھ محبوب سے کہتا ہے:

میں تجھ کو سمجھ لیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا
سرور عشق کی دنیا بسا نہیں سکتا
میں تیرے ساز محبت پر گانہ نہیں سکتا

میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

اُردو شاعری کے اندر حسن و عشق کا اتنا سائنٹفک تصور انھیں نے شاعری کی وجہ سے وجود میں آیا، اس سے پہلے حسن و عشق کا تصور مریضانہ تھا، وہ ہم سے زندگی تاب اور توانائی چھین لیتا تھا، لیکن ان شاعروں نے اسے اصیت (موجودہ شکل ۱۹۵۷ء) اور انسانی محبت سے ہمکنار کیا اور یہ تصور انفرادیت اور داخلیت کے محدود حلقے سے نکل کر کائنات پر محیط ہو گیا اور اُردو شاعری عشق کے ایک ایسے تصور سے آشنا ہوئی جو بدلے ہوئے احوال اور سماجی شعور سے پوری طرح ہم آہنگ تھی، نئے پودے شاعروں کو حالات کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ بزم بائے رامش و رنگ سے اٹھا کرتے ہوئے رنگستانوں میں پھینک دے گئے تھے، اسی وجہ سے ان کا تصور عشق محض خیالی اور روایتی نہیں ہے، بلکہ اس میں غم، مایاں، وسیع ہو کر غم دوراں سے مل گیا ہے، حجاز نے اپنی محبوبہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے سرخ آنچل سے ایک پرچم بنالے تو اور اچھا ہو۔ احمد ندیم قاسمی نے شاہراہ حیات کو غم سے آلودہ دیکھ کر سر سے حکایت عشق و جلال ہی سننے سے انکار کر دیا، اور ساحر تو محبت ہی نہیں کو ناپا چاہتا، اور اگر کرتا بھی ہے تو ”ظلم کی جھاد میں دم توڑتی ہوئی لڑکی“ اسے اپنی طرف کیسے پھینکتی ہے اور یہاں تک کہ آخیں اپنی ناکام محبت کے کہانی بھی سننا نہیں چاہتا، غرض سماجی حالات کی ناسازگاریاں اور فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس ان کی محبت کی راہ میں پہاڑ کھڑ کر دیتا ہے، اور زندگی کی تنجیاں قدم قدم پر ان کے راتے میں جاہل ہوتی ہیں وہ عشق کے معاملے میں محض جذباتیت ہی کے دھارے پر نہیں بہتے بلکہ عقل و شعور کی روشنی میں آگے بڑھتے ہیں سرور کی ابتدائی نظموں میں ”مزدور لڑکیاں“ اور ”سرمایہ دار لڑکیاں“ بہت اچھی نظمیں ہیں، ان نظموں میں حسن و عشق کا طبقاتی تجزیہ ہے، جب وہ سرمایہ دار لڑکیوں کے لئے کہتے ہیں:-

مرد کی صد ہوں کی محنت نے منوار دیا نہیں
یہ کنار و بوس کا حد سے گزر سکتی نہیں

عشق کے ذوق نظرانے نگہا رہے انھیں
ڈوب تو سکتی ہیں لیکن ابھر سکتی نہیں

اور مزدور لڑکیوں کے لئے یہ لکھتا:-

سخن آلام نے سانچے میں ڈھالا ہے انھیں
ساز ان کا سوز حسرت خاموشی کا باب

گردش افلاک نے گودی میں ہالا ہے انھیں
بیکسی ان کی جوانی مفلسی ان کا شباب

اپنی نظروں سے یہ لگ سکتی ہیں تاریخوں کے باب
 ان کے تصور و کیفیتی رہتی ہے چشم انقلاب
 ٹھوکر دوں پرانے جھک سکتے ہیں ایوان قصود
 توڑ دیتی ہیں ہتھوڑوں سے چٹاؤں کا غرور
 بن کے قوت ایک دن ابھری برسوں کی تھکن
 دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظام انجمن

ان کے بڑھتے ہوئے شعور کو ظاہر کرتا ہے، سرمایہ داری نظام میں محبت اور تقارر اور سماج میں محنت کی جگہ کو جانے بغیر اس طرح نہیں کہا جاسکتا تھا۔ مختصر یہ کہ سردار جعفری "رومان سے انقلاب" تک منزل طے کرنے میں کہیں بھی رعب عصر سے الگ نہیں ہوئے، ان کا شعور مرثیہ روائیت اور مقصدیت کے دلدل میں کبھی بھی نہیں پھنسا بلکہ مارکسزم کی روشنی میں انھوں نے طبقاتی جدوجہد میں عوام کے ساتھ ہو کر اپنے شعور کو اور زیادہ گہرائی اور انقلابی قدردار سے وابستہ کر لیا

انقلاب روس کے بعد پوری دنیا میں آزادی کی جدوجہد نے واضح شکل اختیار کر لی، طبقاتی کشمکش تیز تر ہو گئی، اس کشاکش اور جدوجہد کی تصویر بھی شاعر پیش کر سکتا تھا جس کا شعور واضح ہو اور جس کی شاعری آزادی اور اشتراکیت کی جدوجہد کو آگے بڑھاتی ہے، سردار کا شعور بہت تیز کام رہا ہے، وہ اپنی منزل اور اپنے فرائض بہت جلد جان گئے اور اپنی شاعری کو ایک تخلیقی عمل کی کسوٹی پر رکھا، اس طرح انھوں نے عوام کے ساتھ ہو کر طبقاتی کشمکش میں حصہ لیا اور مزدور طبقے کی جدوجہد کو اپنا لیا، وہ جتنا ہی عوام سے قریب ہوتے گئے، ان کی شاعری میں اتنی ہی عظمت اور بلندی، یقین اور توانائی آتی گئی، ان کے لئے "عوام سب سے بڑی حقیقت ہیں۔ ان کے خواب سب سے سہانے خواب ہیں ان کا نصب العین سب سے بلند نصب العین ہے، وہ سماج اور تاریخ کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں، زندگی انھیں سے حرارت حاصل کرتی ہے اور انھیں سے دنگ۔ شعور ادب انھیں سے حسن اور قوت حاصل کر سکیں گے، اس درخت کی چٹائی توڑی جاسکتی ہیں۔ شاخیں کاٹی جاسکتی ہیں لیکن اس کی جڑیں بہت گہری ہیں، انھیں اس وقت تک نہیں اسوقت تک نہیں اکھاڑا جاسکتا جب تک کہ وہ ارض کی پاش پاش نہ کر دیا جائے اس لئے کٹی ہوئی شاخوں سے نئی کنبلیں بھوٹی رہیں گی، نئی پتیاں نکلتی رہیں گی، نئے پھول کھلتے رہیں گے" (دیباچہ چھوہ)

اسی وجہ سے اس کی انقلابی نظموں میں سوز و گداز کے بجائے جاہ و جلال ہے۔ ایک نیا عزم اور یقین اور جذبہ ہے، وہ باعمل اور محرک انسانیت کی انقلابی جدوجہد کو پیش کرتا ہے۔ وہ آہوں اور اشکوں اور سسکیوں کا طوفان نہیں پیش کرتا بلکہ انسانیت کے ساتھ عوام کے انقلابی جذبات اور اپنے دور کی انسانیت کو پیش کرتا ہے، وہ دنیا کے ہر حصہ میں عوام کی جنگ آزادی میں شریک ہے، اور ان کی فتح پر خوش ہوتا ہے اور اسے اپنی فتح سمجھتا ہے

طبقاتی شعور جعفری کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ہے، وہ صحیح معنوں میں انقلاب اور عوام کا شاعر ہے، اس کے یہاں شاعر کا انفرادی جذبہ اجتماعیت میں مکمل ہم آہنگی اختیار کر لیتا ہے اور اسی وجہ سے اس کے یہاں وہ سچا خلوص نظر آتا ہے جو سچی شاعری کو جنم دیتا ہے، خلوص کے ساتھ، حسن، گرمی، جوش، آہنگ، موجب رہ نظام کی صحیح تصویر اور اشتراکیت کے عالمگیر اثرات بھی ہیں۔ انھیں سے اس کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے، اس کے نزدیک سب سے بڑا حسن انسان اور اس کی جدوجہد میں ہے اس لئے کہ یہ سب سے بڑا حسن ہی نہیں ہے بلکہ حسن کے باقی تمام مظاہر کا خالق بھی ہے، جعفری کی یہی انسانیت ہے جو اسے اتنی عظمت بخشی ہے۔ اس کے نزدیک سماجی زندگی اور اس کی کشمکش سے الگ ہو کر آرٹ کی تخلیق کرنا ناممکن ہے، وہ دنیا کے منطقی تسلسل کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور ماضی کے جاندار روایات کو بڑے سلیقے اور احترام کے ساتھ آگے بڑھاتا ہے، وہ انقلاب کے ساتھ ساتھ ارتقاء کا بھی قائل ہے اس لئے کہ ارتقاء کوئی بے مقصد اور مابعد الطبیعیاتی عمل نہیں ہوتا بلکہ انقلاب ہی ارتقاء کا مقصد ہے۔ اپنی طویل نظم "ایشیا جاگ اٹھا" میں جعفری نے اس ارتقاء کا سائنسی نگاہ سے مطالعہ کیا ہے، اور انقلاب کے روحانی تصورات سے قطعی احتراز کیا ہے، اس کے مطالعہ سے جعفری کے شعور کے ارتقاء کا اچھی

طرح احساس ہوتا ہے، جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، جعفری زندگی کے منطقی تسلسل کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ زندگی کا یہ تسلسل ”نئی دنیا کو سلام“ میں جاوید اور مرتیم کی محبت میں ظاہر ہوتا ہے اور ”آخری خط“ میں بھی جو ایک سرخ سپاہی نے نازی حملے کے دوران میں اپنی بیوی کو لکھا تھا، آخری خط کا ہیرو اپنی بیوی کو مشورہ دیتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد وہ دوسری شادی کر لے اسلئے کہ:-

باغ کے آغوش میں گل چاہئے زندگی میں تسلسل چاہئے
ہو اگر دل کو تسلسل کا یقین، موت بن جاتی ہے جام انگلیں
سرے ڈھل جاتی ہے مایوسی کی دھوپ موت پھرتی ہے پیدائش کا روپ
موت جب آکے کوئی شمع بجھا دیتی ہے زندگی ایک کنول اور جلا دیتی ہے

اسی عقیدے کی وجہ سے اس کا انقلابی ہیرو آنسو نہیں بہاتا، ماتم نہیں کرتا، اپنی غول گشتہ تمناؤں پر فرائض نہیں کرتا اس لئے کہ اسے اپنی فتح پر یقین ہے، وہ موت کو ہلکا کرتا ہے اور زندگی کو مسرت سے سمجھنا کر دیتا ہے، وہ انیس کے مرثیوں کے ہیرو کی طرح بین نہیں کرتا۔ کاہتا نہیں، یہوش نہیں ہو جاتا بلکہ وہ ”فیوجک“ کی طرح پھانسی کے سائے میں نئی زندگی کے گیت گاتا ہے، اور ”زویا“ اسٹارہ سالہ بہادر روسی پولکی کی طرح نازیوں کے پھانسی کے پھندے پر تلک کر کہتا ہے، ”جیت ہماری ہوگی ایٹالین ضرور آئے گا۔ آج کے یہ انقلابی ہیرو پھانسی کے تختے پر چڑھ کر شہتے ہیں اور جدوجہد کے رک جانے پر آنسو بہاتے ہیں، ان کی رگوں میں خون بجلی بن جاتا ہے اور آنکھوں کے آنسو شراروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں جعفری بھی ”آنسوؤں کے چراغ“ میں شنائتھی اور ہمارے عورتوں سے یہی سوال کرتا ہے:

شریف بہنو

غیور ماؤ

تمھاری آنکھوں میں جلیوں کی چمک کے بدلے

یہ آنسوؤں کا دھوکا کیوں ہے؟

اور پھر ان سے کہتا ہے تمھاری یہ آنکھیں جن میں آنسو جھلکا رہے ہیں ظلم اور سرمایہ داری کے اس جھکڑ میں چراغ سحری کی طرح؟ جاہلیں گی، اس لئے تم آنسوؤں کے بدلے اپنی آنکھوں میں شرارے بھر لو اور اس طرح:

”میں اپنے نفعے کی آگ لاؤں

تم اپنی آہوں کی مشعلوں کو جلا کے نکلو

ہم اپنی رعوں کی تابناکی سے اس اندھیرے کو پھونک دیں گے“

اس لئے کہ وہ انقلاب کا قائل ہے، اس میں اصلاح پسندی کا نہیں، اسے ارتقاء اور انقلاب کا صحیح شعور حاصل ہے،

موجیں جب بڑھتی ہیں دریاؤں میں طوفان بدوش

اپنے ہر لوح کو شمشیر بنا لیتی ہیں

جب اترتی ہیں فضاؤں سے زمیں پر کرنیں

سرخ نیزوں پر اندھیرے کو اٹھالیتی ہیں۔

اسکی شاعری طبقاتی شعور کو براہِ کفہ کرتی ہے اور پڑھنے والے کے اندر عمل کا جذبہ جاگاتا ہے۔ وہ اس نظام کی ظالمانہ جنگلی اور بدصو اور نمایاں کرتا ہے، عوامی جدوجہد میں زیادہ جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہو کر شاعری کو موثر حربہ بنانے کی تلقین کرتا ہے اس ہی اپنے تعارف ان الفاظ میں کر دیا ہے:-

”نولا دکی گر جے ہے یہ آہن کا شور ہے، نغمہ نہیں ہے شاعر نازک خیال“

مکن ہے کہ بعض دمیانی طبقے کے نقاد ایسی شاعری کو جس میں نولاد کی گنج ادا آہن کا شہر ہو گواہ سے کمر خالی سمجھیں لیکن شاعری کے اندر جو گنج اور شور ہے وہ زمانے کی دین ہے، وہ ماحول اور زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں۔ ایسی شاعری پر پھینال کہنے والوں کو دنیا کے سب سے بڑے انقلابی شاعر اپنا گوشہ کی کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے:

”اس شاعری پر بہت سے شاعر جوچ انگلیں اٹھاتے اور نقاد کچھ سننے سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے وہ جلائیں گے۔ لیکن روح کہاں ہے؟۔ یہ تو محض خطابت ہے۔ شاعری کہاں ہے؟۔ یہ تو صرف صحافت ہے۔ سرمایہ داری بڑا سجدہ لفظ ہے۔ بلبل کتنا حسین لفظ ہے، لیکن پھر بھی ایسی ہی شاعری کو دل کا اور میر تقی میر کے قلم سے سیلاب میں سارے جھوٹ اور فریب کو ہوا بچا ہے گا۔“ میں محسوس کرتا ہوں میں ایک انقلابی کارخانہ ہوں جہاں حریت ڈھالی جا رہی ہے، میں نہیں چاہتا لوگ مجھے سرحد کے کنارے بکھلا ہوا پھول سمجھ لیں اور اپنے پیکار لحوں میں دل پہلانے کے لئے مجھے توڑ لیں۔“

آج شاعری غلط تصوف اور ابعد الطبیعیاتی پسندوں سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لے رہی ہے، جہاں صاف ہوا اور روشنی ہے انقلابی شاعری آج بندوق کی طرح ایک حربہ ہے جو عوام دشمن صفوں پر گولیوں کی طرح باڑھ کوئی ہے اور اپنے کہنے کے لادے سے ظلم اور جبر کے پیراؤں کو اکھاڑ دیتی ہے۔ ”سیلاب چین“ میں جعفری ایک جگہ چین کی سرزمین سے یہی التجا کرتا ہے کہ وہ اس کی شاعری کی مضمون میں اپنا تھوڑا سا خون دیدے اپنے ”طوفان کی دو ایک بچیلیاں“ اور اپنے ”جولا کھسی کے کترانے کی دو چار چنگاریاں“ اس کے سینے میں بھر دے تاکہ شاعر اس کے انقلاب کی داستان کہ سکے۔ اور شاید اسی جذبے کے ماتحت جب اس نے اپنی نظم ”رومان سے انقلاب تک“ میں پندرہ برس کی قریبی پسند شاعری کا تجزیہ کیا تو اسے انقلابی جذبہ اور شاعری کے اس مقدس مقصد کی کمی نظر آئی، اس کو سارے اشعار بے کیف نظر آئے، اس نے ان میں اشکوں کے طوفان اور خوابوں کے رومان تو دیکھئے پر ان میں تلوار کی دھار اور بکلی کی تیزی نہیں پائی۔ تو وہ گھبرا کر کہ اٹھتا ہے کہ:

میرے ہاتھوں سے میرا قلم چین لو

اور مجھے ایک بندوق دیدو

شاعر سمجھتا ہے کہ اس کی شاعری بیکار رہی ہے، وہ اپنے ساتھیوں کی حرارت، ہوا کی روانی اور دلوں کی روانی اور دلوں کی تڑپ کو شعروں میں منتقل نہیں کر سکا اس وجہ سے وہ اپنے بے جان گیتوں سے شرار رہا ہے۔ حالانکہ قلم پھینک کر تلوار اٹھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، قلم تلوار سے کم طاقتور نہیں۔ میرے خیال میں جعفری جذبے کی شدت میں قلم پھینک کر بندوق اٹھانے کی تلقین کرتا ہے وہ شاعروں کو رومان کی غراب آور فضا سے نکال کر عوامی انقلابی جدوجہد میں شریک کرنا چاہتا ہے وہ شاعری کو بندوق کی طرح ایک حربہ بنانے کی تلقین کر رہا ہے، لیکن جذبے کی شدت اور ایک طرح کی شکست سے دب کر اس کا بیان گنجلک ہو گیا۔ اس کے بعد جعفری کا شعور اور زیادہ عوام سے قریب ہوتا گیا۔ اس میں اور زیادہ سادگی، جوش، عزم، یقین اور انقلابی جدوجہد کی تصریح ملتی گئی، آج وہ دلی و جان سے نئی زندگی کی بقا اور امن کے لئے لڑ رہا ہے۔ اس جنگ میں اسے اپنی فتح کا یقین ہے اور یہ عزم اور یقین کسی لمحے میں بھی اس سے الگ نہیں ہوتا۔ وہ امن کے اس انقلابی رول کو اپنی نظم ”امن کا ستارہ“ میں اسٹالین کے کردار میں بھرپور طور سے ظاہر کرتا ہے اس آزاد نظم میں جعفری نے سویت روس کی امن پسندی کو بہت جاندار طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جعفری کے یہاں جو امیجری (imagery) ملتی ہے وہ بالکل جدید قسم کی ہے، اس پر اپنا گوشہ کی اور پہلو نور ودا کا کافی اثر معلوم ہوتا ہے۔ وہ امیجری کے حلقوں میں ابہام اور دور از نگار اشاریت میں نہیں پھنستا۔ بلکہ اس کے برخلاف اس امیجری سے اس کی نظمیں زیادہ حسین اور بے غش ہو جاتی ہیں۔ وہ اس سے طبقاتی شعور کو آگیا کر کے میں موند لیتا ہے اور اپنے شعور اور جذبے کو اور بھی بڑھوش اور آگیا کر کے میں اس امیجری میں انقلابی روحانیت بھی آگیا ہے اور کہیں صاف اور سیدھی، دیکھئے مزید صفحہ ۱۰۱

۱۔ میں وہ کہتا ہے۔
ان کے کانوں میں یہ بھاری شین پہاڑوں کے مانند رکھی ہوئی
ریل کی پٹریاں ان کے سینوں پر لیٹی ہوئی
گرم بجلی کے تار ان کی نیلی رگوں سے گزرتے ہوئے
انسانیت کے بارے میں جب وہ کہتا ہے۔

ساری انسانیت ایک ہے
چین کے آتش افروز رخسار سے
محوں آلودہ پڑتان کے چاک قلب و جگر تک
میکسکو اور اسپین کی رات سے
ہنگری اور رومانیہ کی ستر تک
سوئیڈین کے طرب زار سے
ہندو ایران کے آنسوؤں تک
حبشیوں کی سلگتی ہوئی روح سے
ویٹ نام اور برما کی سپہری ہوئی بھلیوں تک
ساری انسانیت ایک ہے

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جعفری پُرانی امجری اور دشمنی کے استعمال کو بالکل پسند نہیں کرتا، لیکن وہ اس کے برتنے میں احتیاط
چاہتا ہے اور اس میں حسب ضرورت انسانے کی بھی ضرورت سمجھتا ہے، وہ خود اس معاملہ میں بہت محتاط ہے
”میں اپنی شاعری کے معاملہ میں کافی محتاط ہوں اور سب سے احتیاطی کے چکر میں نہیں پڑتا، لیکن اسکی شاعری بالکل خشک اور
سوکھی نہیں ہے۔ اسکی انقلابی شاعری کا دل بھی تغزل سے دھڑکتا ہے، لیکن تغزل یا لیرک کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ ممتاز حسین کے الفاظ
میں۔ ”حیات بھی ہے اور حیات کا فہم بھی۔ یہ تاریخ بھی ہے اور شخصیت کا اظہار بھی۔ یہ فرد بھی ہے اور فرد سے جذباتی وابستگی
بھی۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں صرف موضوع (Subject) ہی کا ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ موضوع کے ساتھ
جذباتی قربت۔ اظہار میں شخصی۔ دل سے دل کی بات کہنے والا ہے اور صورت میں سادگی، بیساختگی اور اس شخصیت کا ہونا ضروری
ہے جسے ساری قوم اپنا سنگیت کہتی ہو“

یعنی یہ تغزل اس کی سادگی میں ہے جو عوام کی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے جس سے خواہیدہ جذبات اور سوچیں پیدا ہوجاتے ہیں لیکن یہ تغزل
اسوقت حاصل ہو سکتا ہے جب شعر کو سماجی شعور کی گرمی میں پھلایا جاتا ہے، ایسی شاعری میں شاعر کا شخصی اور عوامی مطالعہ
وحدت اختیار کر لیتا ہے، عوامی سنگیت شعر کو عوام کے دلوں تک پہنچاتی ہے، اور انھیں مل کے نئے آواز دے کرتی ہے۔ وہ اپنے اختلاقی جذبہ
میں اس طرح دوسروں کو بھرپور طور سے شامل کر لیتا ہے اور شاعر اور سامعین کے درمیان پھر ردی کا دھار اور جذبات کی وہ قربت
ہو جاتی ہے جس سے ایک آواز دوسرے کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ یہ تغزل یا لیرک، مخدوم کی نظم ”مانے والے سپاہی سے پوچھو“ اور
”ایٹالن“۔ دامق کے گیت ”بھوکا ہے بنگال“۔ ساحر کی نظم ”میرے گیت تمہارے ہیں“ اور سردار جعفری کی نظم :
”اے امیراب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا“ میں موجود ہے، اس میں موضوع کے ساتھ جذباتی قربت بھی ہے شخصی اظہار ہے
اور ساتھ ہی حب الوطنی اور عوام دوستی کے جذبے میں ڈوبی ہوئی ہے، جعفری کی اس نظم سے اس کی عوامی سنگیت سے تغزل کے
انقلابی ردول کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور ان کی سادگی اچھا ہے۔

اے امیراب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا
راہ میں تیرے لئے سنگ گزراں ہیں لاکھوں
ماجکستان کے پیروں کی قفسی چھاؤں میں
تیزہ و خنجر و شمشیر و سناں ہیں لاکھوں
اے امیراب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا

اور آخری بند کا یہ جلال :-

مگر ساروں کی بندی کو جلال آئے گا
شکر یزوں کے کیچے سے دھواں اٹھے گا
اور دریاؤں کے سینے میں اُجال آئے گا

اے امیراب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا

جعفری کی اس نظم میں بالکل ویسا ہی تغزل ہے جو ترسون زادہ کی نظموں میں ہے جو سویت روس کے مقبول شاعر ایسا آکروں کی ()
کی شاعری میں ہے، لیکن پھر بھی ابھی ہمیں عوامی سنگیت کی ہیئت کی معلوم ہوتی ہے، سردار جعفری کو ابھی اور نہ یادہ اپنی نظموں میں
عوامی سنگیت اور تکنیک کا خیال رکھنا پڑے گا، انھیں عوام کی ذہنی سطح اور ادبی معیار کو مدنظر رکھنے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی عوام کے اور
زیادہ قریب آنا ہے، تاکہ ان کی شاعری عوامی ادب کے صحیح معیار پر پوری اتر سکے۔ ترقی پسند شاعری میں اس کی بڑی کمی ہے لیکن ترقی پسند
شعرا اب اس کی طرف توجہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں، یہ بڑی اچھی علامت ہے

مختصر کہ سردار جعفری کی شاعری محض نعرہ، سیاسی اور جماعتی پروپیگنڈہ نہیں ہے، بلکہ اس کی شاعری کے شعور میں انقلاب اور
ارتقاء کا بہت سا تشنگ اور وسیع مفہوم ہے، ماضی کے جاندار ادبی روایتوں سے انحراف نہیں ان کا احترام ہے۔ روایتی شاعری کا
پوری عظمت اور "سوز و گداز" ہے لیکن "سوز و گداز" اس کے یہاں ماتم نہیں بنتا بلکہ نئی زندگی کا دلولہ اور جوش بن جاتا ہے، اس کی
انقلابی شاعری کے اندر فلسفیانہ روح جاری و ساری ہے۔ وہ انسان کا شاعر ہے اور اپنی زندگی اور اپنے عمل سے نئی راہیں تعمیر کرتا ہے
مارکسزم نے جعفری کو حیات اور کائنات سے گہرا عشق سکھایا ہے، اور انسانیت پر ایمان۔ اسی مارکسی نقطہ حیات سے متاثر ہونے کی وجہ
سے وہ تجربے کی خاطر نفسیات کی مہول بھابیوں میں نہیں پھنستا۔ بلکہ زندگی اور ادب کے مطالعہ کی مدد سے آگے بڑھتا ہے، اس کی شاعری
زندگی کے روزمرہ واقعات سے مولاہتی ہے۔ اس میں تاریخ، وقت اور حقائق کی تحریر اہمیت ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک ادبی رنگ
اس نے آزاد شاعری کو کسی مریض روحانیت کے مبہم اشاروں کے لئے استعمال کرنے کے بجائے عام اور بڑی حد تک پرانے ادبی رنگ سے
قریب رکھا ہے، انقلاب اور ارتقاء کے انھیں اساسی اصولوں میں یقین رکھنے کی وجہ سے وہ نراج اور ادبی دہشت پسندی سے بڑی
حد تک بچ گیا۔ اس کے اندر عقل اور جنون میں ہم آہنگی ہے، بول تو بعض اوقات وہ الفاظ کے انتخاب میں زیادہ احتیاط نہیں برستے۔
بعض اوقات بندشیں ڈھیلی ہوتی ہیں۔ ان خامیوں کے باوجود سردار کی جدت فکر، ادبی صداقت، خلوص اور خود اعتمادی سے
انکار نہیں ہو سکتا، سن و سال کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری بھی پختگی کی منزل میں طے کرتی جا رہی ہے، اگر انھوں نے اپنی شاعری کو
اور زیادہ لحاظ موضوع اور ہیئت، سنگیت اور تکنیک عوامی شاعری سے قریب رکھا تو ان کی جگہ اردو شاعری میں مستقل ہے،
آج اردو شاعری کو ان سے بڑی امیدیں ہیں

فیض الرحمن عظمیٰ

خطوط دو طرح کے ہیں۔ اصلی اور فرعی۔ اصلی خطوط کو اولین انسان نے اپنی طبیعت سے وضع کیا تھا۔ فرعی خطوط بعد میں پہلی خطوط سے نکال لئے گئے۔ اصلی خطوط صرف چار بتائے جاتے ہیں۔ ان میں قدیم مصری ہیرروغلیفی بھی ہے۔ موجودہ خطوط جو دنیا میں رائج ہیں قریب قریب سبھی ہیرروغلیفی سے متفرع ہوئے ہیں۔ اصلی خطوط کو کبھی چار ارتقائی دوروں سے گزرا ہے:

(۱) صودی ذاتی - (۲) صودی رموزی - (۳) مقطعی - (۴) ہجائی صودی ذاتی دور انسان کی تہذیبی تاریخ کا قدیم ترین اور سادہ ترین دور ہے۔ اس زمانہ میں انسان درجہ حیوان سے بہت قریب تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس وقت دو نطق اور اس کی حرکتوں کی سے محروم تھا۔ وہ اشاروں سے باتیں کرتا تھا اور کبھی کبھی چیزوں اور جانوروں کی تصویریں بنا کر اپنے دل کی بات دوسروں کو سمجھاتا تھا۔ دوسرے دور میں اس نے بعض چیزوں کے اظہار کے لئے رموز اور اشارے وضع کر لئے اور ان کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگا مثلاً کثرت کا مفہوم اس نے بہت سے نقطوں سے ادا کیا۔ محبت کے لئے کبوتر کی شکل اختیار کی اور عداوت کے لئے سانپ کی۔ تیسرا اور چوتھا دور ارتقاء اور تہذیب کے دور ہیں۔ ان میں انسان نے ترقی کی طرف ایک قدم بڑھایا اور تہذیب و شائستگی کے اولین آثار اس میں نمایاں ہوئے۔ تیسرے دور میں داخل ہونے سے پہلے انسان پونا سیکھ چکا تھا۔ مختلف چیزوں کے اُس نے مختلف نام رکھ لئے تھے اور اب وہ اس فکر میں تھا کہ جہاں ان چیزوں کا نام لے کر وہ ان کو بتا سکتا ہے کوئی ایسا ذریعہ بھی ہو کہ وہ دوسرے لوگوں کو کبھی جو وہاں موجود نہیں اپنے دل کی بات بتا سکے اس کے لئے اس نے ایک نیا طریقہ نکالا۔ ہر آواز کے لئے اس نے ایک صورت بنائی۔ یہ صورت اس جانور یا چیز کی تھی جس کے نام کی ابتدا اس آواز سے ہوئی تھی۔ مثلاً 'ج' کی آواز جتانے کے لئے اس نے اونٹ کی گردن بنائی۔ اس لئے کہ اونٹ کا نام اس نے 'جیمیل' رکھا تھا۔ 'ب' کی آواز اس نے ایک رعب شکل سے ظاہر کی جو ایک سادہ قسم کے گھر یعنی گھر سے بہت مشابہ تھی۔ اس لئے کہ وہ گھر کو 'بیٹھ' کہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ کام فیقیوں کا تھا۔ اس کے بعد کچھ ہی زمانہ گزرا ہو گا کہ حروف کی شکلیں جو دراصل اشیاء اور حیوانات کی صورتیں تھیں جن کے لئے وہ تقرر کی گئی تھیں بدل بدل کر اور ترقی پا کر کچھ سے کچھ ہو گئیں۔ انسان ان کی تاریخ سمجھ گیا جو ایک قدسی امر تھا، اور یہ حروف ملاقات محض کے طور پر استعمال ہونے لگے۔ حروف اور ان کی آوازیں کا قدیم فطری تعلق جب نظروں کے سامنے نہ رہا تو یہ سمجھ لیا گیا کہ حروف اور ان کی آوازیں میں محض رسمی اور اسمی تعلق ہے۔ حروف کے ارتقائی دوروں میں یہ آخری دور ہے جس کو اس فن کے عالموں نے ہجائی کہا ہے اور جس سے گزرا کر یہی موجودہ حروف و خطوط اپنی اس حالت کو پہنچے ہیں

حروف کی تاریخ کا یہ مختصر سا خاکہ ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں اور نہ اس سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں

(۱) موجودہ حروف یا تو اصلی حروف سے نکالے گئے ہیں یا ان سے متفرع ہوئے ہیں اور ترقی پا کر موجودہ شکلوں تک پہنچے ہیں

(۲) اصلی حروف اشیاء و حیوانات کی شکلوں سے لئے گئے تھے

(۳) اصلی حروف کے ارتقائی مدارج میں سے ایک درجہ وہ بھی ہے جب وہ کسی چیز یا جانور کی شکلیں تھے اور اس آواز پر دلالت کرتے تھے جو اس چیز یا جانور کے نام کے شروع میں تھی

(۴) موجودہ حروف درحقیقت ان ہی شکلوں کی کسی قدر مسخ شدہ اور بدلی ہوئی صورتیں ہیں

اس تفصیل کے بعد امتیاز صاحب کے دعوے کو پرکھئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حروف کا زبان سے یا ان آوازوں سے جن پر وہ دلالت کرتے ہیں کوئی باطنی تعلق نہیں۔ حروف بہت ہیں۔ کچھ اصلی ہیں اور کچھ فرعی۔ فرعی حروف کی بہت توہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی آوازیں سے کوئی فطری تعلق نہیں رکھتے اور شاید اصلی حروف سے ترقی یافتہ اور متفرع حروف کی بابت بھی یہ کہا جاسکے لیکن اصلی حروف کے متعلق یہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اصلی حروف سے ترقی پا کر بنے ہوئے حروف کے متعلق بھی کم سے کم علمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنی آوازیں سے بے تعلق ہیں۔ علمی طور پر اس لئے کہ اگر ہم ان حروف کی تاریخ جانتے ہیں۔

ان کی تبدیلیاں ہمارے سامنے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ یہ حروف اپنے مدلولات (آوازیوں) کی شکلوں، صورتوں اور روپوں سے ترقی پا کر ہی ان شکلوں تک پہنچے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان میں ان کے مدلولات میں کوئی فطری یا اصلی تعلق نہ مانیں۔ اگر کسی چیز کی صورت کا اس چیز سے کوئی تعلق ہے اور وہ تعلق لازمی اور فطری ہے تو ماننا پڑے گا کہ حروف کا بذاتی آوازیوں سے بھی تعلق ہے اور وہ بھی فطری اور لازمی ہی ہے۔ مثلاً 'ج'، 'ہی' کو لیجئے۔ یہ شکل اونٹ کی گردن کی صورت میں اب سے ہزاروں برس پہلے لکھی جاتی تھی۔ 'ج' کو اس صورت کا قایم مقام سمجھنا چاہئے۔ اونٹ کی گردن کی صورت اگر اونٹ کی ذات پر دلالت کر سکتی ہے تو اس کے نام یعنی 'جیل' پر بھی اور اس کے واسطے سے تنہا اس کے پہلے جز یعنی 'ج' کی آواز پر بھی۔ دنیا کی کوئی منطق اسے ناجائز یا خلاف فطرت قرار نہیں دے سکتی۔ پہلے قسم کی دلالت اگر عقلی ہے تو دوسری فطری ہے۔ آردو میں حروف کے نام بھی اسی اصول پر رکھے گئے تھے۔ مثلاً 'جیم'۔ 'صاد'۔ 'عین'۔ 'قاف' بترتیب ان شکلوں کے نام ہیں۔ 'ج'۔ 'ص'۔ 'ح'۔ 'ق'۔ یہ شکلیں اپنے اسماؤ کے شروع میں بھی ہیں۔ جس طرح 'ج' سے لازمی طور پر جیم ہی سمجھا جاتا ہے اسی طرح 'جیل' بھی۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ جہاں اصول کے طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حروف کا اپنی آوازیوں سے کوئی تعلق نہیں، وہاں کسی ایک زبان کے حروف کے تعلق بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہی حروف کا اس زبان سے لگاؤ ہے، دوسرے حروف اس زبان اور اسکی آوازیوں سے بے تعلق ہیں لیکن یہ بات پہلے سے بہت مختلف ہے۔ کسی زبان کا ان تمام حروف سے یکساں تعلق ہو سکتا ہے جو ایک ہی قسم کے حروف سے ترقی پا کر امتداد ازانہ کے ذریعہ ردل بدلا کر وجود میں آئے۔ احتشام صاحب کا یہ دھوئی کر زبان کا اسکے رسم خط سے کوئی فطری تعلق نہیں کم سے کم علمی خیادوں پر صحیح نہیں اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی غور کے قابل ہے۔ احتشام صاحب جس قسم کا تعلق زبان اور اس کے رسم خط میں دیکھنا چاہتے ہیں وہ تو زبان سے متعلق کسی چیز میں بھی نہیں۔ الفاظ اور اس کے معانی بلکہ خود انسان اور اس کی زبان میں بھی احتشام صاحب کوئی لازمی ربط نہیں پائیں گے۔ لفظوں کے معنی ہم وہی پلٹتے ہیں جو برسوں سے سنتے آئے ہیں۔ احتشام صاحب کے الفاظ میں مخصوص معنی کا تعلق مخصوص لفظ کے ساتھ ہمارا مقرر کیا ہوا ہے۔ زبان کا انسان کے ساتھ بھی اسی قسم کا تعلق ہے۔ انسانوں کا کوئی طبقہ، فرقہ، یا جماعت کسی زبان سے مخصوص نہیں۔ انسان جس سرزمین میں پیدا ہوا۔ جس قوم کی آغوش میں اس نے آنکھیں کھولیں اسی کی زبان بولنے لگا۔ یہ ساری چیزیں انسان دنیا میں آنے کے بعد سیکھتا ہے اور جب وہ کسی چیز کو سیکھ لیتا اور اس کا عادی ہو جاتا ہے تو وہی چیز اس کی فطرت بن جاتی ہے۔ عادت اگر فطرت نہیں تو فطرت کی شریک ہے۔ اس میں فطرت کی سی تنگی بھی ہے اور فطرت کا سادشت تعلق بھی

احتشام صاحب نے ایک بامزہ سوال کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کیا جس طرح زبان قوم کی تشکیل و تعمیر میں معاون ہوتی ہے اسی طرح رسم خط بھی کسی زبان سے وابستہ ہوتا ہے۔ شاید وہ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ زبان سے قومیت کی تعمیر ہوتی ہی ہے کیا رسم خط کو بھی قومیت کی تعمیر میں کوئی دخل ہے۔ اگر ان کا منشا یہی ہے تو میں عرض کروں گا کہ زبان کا کسی قوم سے جو تعلق ہے قریب قریب وہی رسم خط کا بھی ہے۔ قوم کے امتیازی صفات و خصوصیات میں سے زبان بھی ہے اور اس کا رسم خط بھی۔ دنیا کی ہر چیز اپنی امتیازی صفات ہی سے زندہ ہے۔ دنیا پانی سے ہے اور پانی روانی سے۔ کوئی قوم اپنی خصوصیات کو کہہ کر اپنی قومیت کی تعمیر نہیں کر سکتی۔ احتشام صاحب کے لفظوں کا ایک مفہوم اور بھی ہو سکتا ہے۔ ہر چیز ظاہر وہی ہے لیکن وہ مفہوم میں نے اس نے نہیں لیا کہ اپنی جگہ خود وہ اپنی قوم ہے۔ وہ مفہوم یہ ہے کہ زبان جس طرح قوم کی تعمیر میں ذخیل ہے، کیا رسم خط بھی زبان کی تعمیر و تشکیل میں اسی طرح دخل رکھتا ہے۔ یہ مفہوم اس نے صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ کیا ضرور ہے کہ زبان کی تعمیر قوم کے لئے اور رسم خط کے تعمیر زبان کے لئے ایک درجے کی اول و دہرے یہ کس نے کہا کہ رسم خط زبان کی تعمیر میں معاون ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا گیا ہے کہ کسی زبان کا اس کے رسم خط سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس اصل کو جسم و روح کے تعلق سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ زبان اور قوم کی تعمیر میں سلسلہ میں ہے معنی سی بات

یہ بھی کوئی ترقی پسند ہی کہہ سکتا ہے کہ زبان قوم کی تعمیر میں معاون ہوتی ہے جب قوم سے قومیت مراد نہ لی جائے، اس لئے کہ ہمارے زمانہ کے ترقی پسند ہر بات اُلٹی کہتے ہیں۔ وہ بقول شخصے گھوڑا گاڑی کے پیچھے چوڑنے کے عادی ہیں۔ زبان قوم کی تعمیر نہیں رہتی بلکہ قوم زبان کی تعمیر کرتی ہے

ایک بات تو میں بھولا ہی جا رہا تھا۔ احتشام صاحب نے یہ نتیجہ کہ ”زبان اور رسم خط میں کوئی باطنی تعلق نہیں بلکہ رسمی ہے“ اس مقدمے سے نکالا ہے۔ ”زبان پہلے پیدا ہوئی اور اس کا رسم خط بعد میں“ اس مقدمے کو انھوں نے طے شدہ بتایا ہے۔ بیچ پہلے ہے اور درخت اور اس کی شاخیں بعد میں۔ لیکن پھر بھی درخت اور اس کی شاخوں کا بیج سے باطنی تعلق ہے۔ اس استدلال میں ایک بڑا مغالطہ ہے۔ رسم خط سے کیا مراد ہے؟ اگر وہ صورتیں ہیں جو اول اول انسان نے اپنے دل کی بات کہنے کے لئے بنائیں تو رسم خط پہلے ہے اور زبان بعد میں۔ کوئی اہل علم نہیں کہہ سکتا کہ اس قدیم زمانہ میں انسان کی کوئی زبان بھی تھی۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہی صورتیں موجودہ حروف کی بنیادیں ہیں جن پر رسم خط کی پوری عمارت کھڑی کی گئی ہے اور اگر رسم خط سے مراد عہد حاضر کے ترقی یافتہ اور ڈھلے ڈھلائے حروف ہیں تو زبان سے بھی موجودہ سہشت اور گھری ہوئی زبانیں حروف کیوں نہ لی جائے۔ اس صورت میں زبان اور اس کے حروف کا تعلق چولی اور دامن کا سا ہوگا

زبان کا رسم خط سے کتنا شدید تعلق ہے آسانی کے ساتھ اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسے صرف مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ میں ادب پر کہیں جسم و جان کے ارتباط کا ذکر کر آیا ہوں۔ زبان اور رسم خط کے ارتباط کو بھی کچھ ایسا ہی سمجھئے۔ یوں تو روح کے لئے ہر جسم برابر ہے۔ اس کو جسم چاہئے، کوئی بھی ہو۔ جسم اگر صالح، توانا اور کامل ہے تو روح کو ترقی کرنے اور اندرونی توانائی حاصل کرنے کی بڑی آسانیاں ہیں۔ زبان کو بھی رسم خط چاہئے۔ وہ بھی رسم خط کی محتاج ہے۔ اور رسم خط کی صلاحیت اور کاملیت کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے۔ ایک اور مثال درخت اور زمین کی ہے۔ درخت کو زبان سمجھئے اور زمین کو رسم خط۔ درخت ایک خاص قطعہ زمین سے متعلق ہوتا ہے جس میں اس کی جڑیں پیوست ہوتی ہیں۔ درخت کے نشوونما میں اس قطعہ زمین کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ رسم خط کو زبان کے نشوونما میں تو کوئی دخل نہیں لیکن وہ زبان کے مزاج، اس کی گوناگوں تبدیلیوں، اور ارتقا کی منزلوں کا حامل ہوتا ہے۔ رسم خط زبان کا آئینہ ہے جس میں اس کے خط وخال نظر آتے ہیں۔ اس کی زندگی کا مقیاس ہے۔ ایک کتاب ہے جس میں زبان کی پوری تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ انگریزی زبان کا ایک لفظ *mother* (ماتنا) جس کا لفظی معنی ”مادر“ ہے کرتے ہیں۔ لیکن لاطینی حروف میں، جس میں انگریزی زبان مدقول سے لکھی جا رہی ہے، ”کنو“ لکھتے ہیں۔ یہ لفظ میں خاموش ہے۔ کسی زمانہ میں یہ بولا جاتا تھا۔ بعد میں تلفظ کی آسانی کے پیش نظر گرا دیا گیا۔ مگر دستہ لکھا جاتا رہا۔ یہ چل جاتا ہے بولائیں جاتا لیکن لکھا جاتا ہے اپنے اندر اس لفظ کی تاریخ پنہاں رکھتا ہے۔ ہم اس چل ہی کی مدد سے یہ کھوج لگانے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ اصل میں ”کن“ تھا جس کے معنی ہیں گنا اور قیمت لگانا۔ یہ مادہ سنسکرت میں بھی ہے

درخت جو زمین میں جڑیں بٹکا ہے آسانی کے ساتھ اکھاٹا نہیں جاسکتا اور اگر کسی سخت زمین سے اکھاٹو دوسری جگہ اس کو جا دیا جائے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ درخت خشک ہو جاتا ہے اور اگر دوسری جگہ میں جا آئے تو بچے چل نہیں دیتا۔ یہ اثر اس زمین سے الگ کرنے کا نوتا ہے جہاں عرصہ سے وہ لگا ہوا تھا۔ یہ تو ایک مثال ہے۔ کسی زبان کے قدیم رسم خط کو ترک کرنا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا خط اختیار کرنا ایک غیر فطری عمل ہے۔ اس سے زبان کا مزاج بدل جاتا ہے۔ اس کی تاریخ مٹ جاتی ہے۔ لفظ جان بوجھتے ہیں اور زبان میں وہ اثر اور مادہ نہیں رہتا جو ہلکتے تھے پھر اس نے حاصل کیا تھا۔ اس کی تفصیل سے میں معذور ہوں۔ تفصیل کا مطلب یہ ہے کہ میں زبان کی زندگی کی پوری تاریخ دہرا رہا ہوں

مولوی عزیز حسن صاحب مراد آبادی :-

جون سہارے کے محقق ہیں پروفیسر سید احتشام حسین صاحب نے زبان اور رسم الخط کے متعلق جو مضمون شائع کر لیا ہے اس میں موصوف نے رسم الخط کی ابتدا پر کافی تفصیل روشنی ڈالنے کے ساتھ اس امر کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی رسم الخط کو چونکہ اس زبان سے کوئی حقیقی تعلق نہیں ہے اس لئے کوئی بھی رسم خط کسی زبان کے لئے اختیار کر لیا جائے اس سے کوئی خاص فرق نہ پڑے گا۔ اور مضمون کی آخری سطروں میں آندو کے لئے رسم الخط کی تبدیلی کا سوال بھی پیش کر دیا ہے

۱۔ امر الکل واضح ہے کہ زبانیں اول معرض وجود میں آئیں اور رسم الخط بہت بعد میں پیدا کئے گئے۔ نیز یہ کہ زبان ایک فطری چیز ہے اور رسم الخط سزا یا وضعی۔ اور اگر ایک زبان اپنے موجودہ رسم خط کے علاوہ کسی دوسرے رسم خط میں لکھی جائے تو اس سے پہلے فرق واقع ہوگا۔ مثلاً انگریزی کے حروف (A - B) کی شکل بدل کر کچھ اور کر دیں اور اس کو بی کہنے لگیں تو اس سے زبان میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوگی۔ سید صاحب موصوف کی تحریک اس امر کو واضح نہیں کرتی کہ رسم خط کی تبدیلی کا مقصد حروف کی موجودہ شکل کو بدل کر دوسری طرح بنا دینا ہے یا کسی دوسرے موجودہ رسم خط کو کسی زبان کے لئے اختیار کر لینا ہے کیونکہ جب اس مسئلہ کو اس نوعیت سے دیکھا جائے کہ دنیا کی کسی زبان کے حروف بھی میں بھی۔ جامعیت موجود نہیں ہے کہ وہ اپنی موجودہ تعداد کو برقرار رکھتے ہوئے کسی دوسری زبان کے تمام حروف کو ادا کر سکیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر زبان کو اس کے موجودہ رسم الخط میں ہی ادا کرنا ممکن ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں ہے

ابتداء میں انسان مختلف آب و ہوا اور مختلف ماحول میں پرورش پاتا تھا اور ہر جگہ کی آب و ہوا اور ماحول اس کے جسمانی ساخت۔ رنگ و روپ عادات و اطوار۔ مزاج و طبیعت کی تعمیر مختلف طریقہ پر کر رہے تھے حتیٰ کہ طرزِ ادا اور لہجہ تک پر اس کا اثر پڑ رہا تھا اور ایک خط آبادی کا لہجہ دوسرے حصہ آبادی سے مختلف طرح پر تعمیر ہو رہا تھا۔ اس لہجہ اور زبان کی حرکت نے آہاؤں کو جنم دیا جو بعد میں حروف کہلانے لگے دوسری حروف ایک زبان کی بنیاد ہیں اور یہی رسم خط کی بھی۔ اکثر حروف تو ایسے بنے جو تمام زبانوں میں مشترک ہیں مثلاً ۱۔ با۔ ۲۔ جا۔ ۳۔ وا۔ ۴۔ را۔ ۵۔ سا وغیرہ۔ اور بعض حروف ایسے بنے جو اس خط آبادی میں ہی محدود تھے مثلاً عربی کا ک۔ ص۔ ط۔ ع۔ ح۔ ظ۔ ق وغیرہ کہ ان کے خاص مخارج ہیں جن کی وجہ سے یہ معرض وجود میں آئے یا فارسی کی ژ۔ ہندی کی ژ۔ انگریزی کا ایکس (x) کہ یہ حروف دوسری زبان میں نہیں ملتے۔ ان حروف سے بنے ہوئے الفاظ کو ہم کسی طرح بھی دوسرے رسم الخط میں ادا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہم ہندی کا لفظ ”گڑہ“ انگریزی رسم خط میں لکھنا چاہیں تو ”گرہ“ لکھیں گے (اور اگر خود ایک دوسرا لفظ ہندی میں موجود نہ ہو) اور جب اس کو عربی رسم الخط میں لکھیں تو ”کر“ ہو کر رہ جائے گا۔ یہ کہنا ایک حد تک ضرور صحیح ہے کہ کسی زبان کو اس کے موجودہ حروف تہجی کی شکل سے کوئی مخصوص نسبت نہیں ہے کہ وہ زبان بغیر ان کے زندہ ہی نہیں رہ سکتی مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی اتنا ہی یقین ہے کہ ان مخارج اور صوتی اسالیب کے بغیر جو اس زبان کے حروف تہجی بیان کرتے ہیں وہ زبان باقی نہیں رہ سکتی یعنی اگر ہم حروف کی موجودہ شکل بدل کر دوسری طرح لکھنے لگیں تو اس سے زبان پرچند فرق نہ پڑے گا مگر کسی زبان کے لئے ایسا رسم خط اختیار کرنا کہ وہ اس کے تمام صوتی اسلوب ادا کرنے پر قاصدہ ہو زبان میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کرنے کا باعث ہو جائے گا۔ اس کی ایک بین مثال عربی کے حروف تہجی میں موجود ہے کہ دوسری زبانوں میں یہ حروف موجود نہیں ہیں اس لئے رسم خط تبدیل کر دینے کی صورت میں اس کی آواز بالکل ختم ہو جائے گی اور اس حروف سے مرکب اکثر عربی الفاظ دوسرے رسم خط میں پہونچ کر کچھ سے کچھ ہو جائیں گے۔ مثلاً اظہ۔ دوسرے رسم خط میں جا کر آکا یا آک ہو جائے گا۔ ”جمع“ ”حرف“ ”جو“ رہ جائے گا۔ ”طالع“ ”گردش طالع“ سے ”تائے“ ”ہو جائے گا۔ ”طبع“ ”غریب حق“ کا ”تک“ ہو جائے گا۔ اور ”جاس“ ”پنا جاہ“ تبدیل کر کے ”جائے“ بن جائے گا اور ”طاسرہ“ کہ اتنی بڑی تبدیلی ہو کہ زبان کی سمجھ و حال بالکل بدل جائے گی۔ یہ شہر زبان اور

مردود کے موجودہ شکل میں کوئی حقیقی رشتہ موجود نہیں ہے مگر کسی زبان کے رسم خط کو بالکل بدل ڈالنے کے لئے اتنا ہی تو کافی نہیں ہے کہ رسم خط کی ابتداء پر بحث کرے یہ ثابت کر دیا جائے کہ ایک حرف کی تحریر میں شکل کو اس کی صوتی حالت سے کوئی مناسبت نہ پہلے غمی ذاب ہے بلکہ اس سلسلہ میں غلط نہ کرنا چاہئے تاکہ کوئی دوسرا موضوع رسم خط ایسا ہے جو اس زبان کی تمام صوتی حرکات و اسالیب کو جو ایک زبان کی بنیاد اصلی میں ادا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر ایسی صلاحیت اُس رسم خط میں موجود نہیں ہے اور پھر بھی وہ اُس زبان کے سرسنتھ جارہا ہے تو یہ تبدیلی صرف رسم خط کی نہ ہوگی بلکہ اصل زبان ہی بدل جائے گی کیونکہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ف۔ ز۔ ض۔ ظ۔ سے بنے ہوئے تمام الفاظ باقی رہیں اور ان کے درمیان تمیز و تفریق بھی قائم رہے اور ان چاروں حروف کی علاحدہ علیحدہ شکلیں مثلاً حرف ایک شکل (ح) باقی رکھی جائے۔ زبانوں کی اصلی بنیاد تو فعل کا صوتی اصول ہے اور حروف اس کی تحریر ہی شکل ہیں۔ جب تک ایک زبان کے اصوات و مخارج کے ادا کرنے کے لئے حروف جہاں نہ کر دے جائیں اُس زبان کا رسم الخط تبدیل کرنا دیدہ و دانستہ زبان کو بھانسی کے تختہ پر لگانا ہے کیونکہ اس حالت میں بعض ناقابل عبور دشواریاں لاحق ہو جائیں گی مثلاً قریباً تخریج والے حروف کی ثبات جب کسی دوسرے رسم الخط میں کی جائے گی تو اکثر اصل مفہوم متعین نہ ہو سکے گا مثلاً عربی کے اصل اور عسل۔ صحر اور سحر۔ سحر اور صحر۔ مضی اور مذی۔ خطنہ اور خنتہ۔ زمن اور ضمن۔ حرب اور ہرب وغیرہ کے درمیان تمیز کر سکی کوئی صورت نہیں رہتی اگر ان کو عربی رسم الخط کے بجائے کسی دوسرے رسم خط میں لکھ دیا جائے۔ اسی طرح انگریزی کے (Two - Top) (Weak - week) (Dear - Deer) (Woman - one) (Two - Top) (Two - Top) کو جب کسی دوسرے رسم خط میں لکھا جائے تو تمیز ہو سکے گی کہ کوئی سا لفظ مقصود ہے۔ اردو و نگہ عربی۔ فارسی اور ہندی تینوں زبانوں کا مجموعہ ہے اور اس میں ہر سے زبانوں کے حروف اور الفاظ موجود ہیں اس لئے بہت سے الفاظ یہاں بھی ایسے ملتے ہیں جن کی کتابت اگر کسی دوسرے رسم خط میں کی جائے تو معنی میں التباس پیدا ہو جانا ضروری ہے (باز۔ بعض) (بجو۔ بعد) (باد۔ بعد)۔ (صور۔ سور) (صل۔ ہل) (زم۔ ضم) (ارض۔ عرض) (بہر۔ بصیر) وغیرہ

رسم خط میں تبدیلی کے حامی اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ایسے الفاظ کے معنی کا تعین جس طرح ہم معذائے گفتگو اور تقریر میں کرتے ہیں حالانکہ اس وقت کسی لفظ کے معنی کا اظہار نہیں کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح تحریر میں بھی رسم الخط بدل جانے کے بعد ان کے معنی متعین کر لئے جایا کریں گے اور اس میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ یہ جواب اس حد تک ضروری صحیح ہے کہ جن لوگوں نے کسی زبان کی تحصیل اس کے موجودہ رسم الخط میں کر لی ہے ان کو معنی میں التباس پیدا نہ ہوگا، کیونکہ وہ الفاظ کی موجودہ اشکال سے واقف ہیں اور سیاق عبارت سے ان کو لفظ اور اس کا مفہوم متعین کرنے میں چنداں دشواری نہ ہوگی مگر رسم خط کی تبدیلی سے آئندہ زبان کی جو شکل جو جائے گی اس میں ایسے الفاظ کے درمیان تفریق نہ ہو سکے گی اور بعض الفاظ تو لازمی طور پر بدل جائیں گے جنکی مثال ہم نے ع کے الفاظ میں اوپر پیش کی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ آئندہ نسل جس زبان کی تحصیل کرے گی اس کی حالت موجودہ حالت سے بالکل مختلف ہوگی اور اُس نسل کے لئے معنی میں التباس پیدا ہونا کس حد تک ممکن ہے اس کو محسوس کرنا دشوار نہیں ہے۔

مصادر اور ادیان کے مشتقات کے اصول ہر زبان کی صحن میں موجود ہیں ایسی اصول زبان کی تمام تر بنیاد ہوتے ہیں۔ ایک لفظ اپنے تمام مشتقات میں اپنے اصل مادہ کو کبھی بھی ضایع نہیں کرتا اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کی اصل کیا ہے لیکن اکثر صورتوں (جن کی چند مثال ہم نے اوپر درج کی ہیں) الفاظ کی اصل ہی گم ہو جائے گی اور کسی طرح بھی بہتہ نہ چل سکے گا کہ یہ کون سا لفظ ہے۔ کہاں سے نکلا ہے اور پھر اس کی کیا کیا صورتیں ہیں اور اس طرح تمام حرفت کو کیسے پرکار کر دینا پڑے گا۔ نیز یہ کہ پھر تحقیق لغات کے لئے اصناف کی عقلی وصحت کو معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی معیار باقی نہ رہ جائے گا۔ یہ صاحب موصوف نے اپنے مضمون میں ایک مثالی پیش کی ہے کہ اگر نیری کا (مثلاً) جب فارسی رسم خط میں لکھا جائے گا تو ”ہائی“ ہو جائے گا مگر

سید صاحب نے اس کو فراموش فرما دیا اگر کسی میں ایک دوسرا "اؤ" بھی موجود ہے جسکی وجہ سے (معنی علم) اور اس کے معنی میں جلدی کی وجہ سے سچا گنا یا چیز چلنا اور لغات کی کتاب میں دونوں الفاظ کے اصل ماخذ ملتے گئے ہیں اھل علم کی رعایت ان الفاظ کی موجودہ شکل اور ان کی نام مشتق و درتوں میں باقی رکھی گئی ہے تاکہ لفظ کی اصل ضایع نہ ہوئے یائے۔ اگر اگر کسی زبان کو وجود فارسی رسم خط میں لکھے گئے تھے تو یہ سب کچھ کمر مفقود ہو جائے گا۔ یہی حال ہر زبان کی حرف کا ہے اور چونکہ اس سے ہر عظیم یافتہ واقعہ ہے اس لئے اس کی مزید تفصیل سچا طوالت ہوگی اس لئے اس کو قلم انداز کیا جاتا ہے

ایک زبان میں حروف و الفاظ کے تعین کے بعد سب سے اہم درجہ اس کے صرف و نحو کا ہوتا ہے اور اس میں اکثر موقوفوں پر صرف حروف سے بعض کام لئے گئے ہیں جو اسی رسم الخط سے وابستہ و متعلق رہ سکتے ہیں۔ مثلاً عربی کا "ال" جس کی ایک مثال سید صاحب نے اپنے مضمون میں پیش بھی کی ہے کہ "بالکل" دوسرے رسم الخط میں جاکر "بالل" ہو جائے گا۔ یہاں تک تو خیر کسی ایک طرح برداشت کر بھی لیا جائے لیکن اُن مواقع پر کیا صورت ہوگی جب کسی اسم پر "ال" داخل کیا جاتا ہے اور وہ آواز نہیں دیتا مثلاً :-

بسم اللہ الرحمن الرحیم جب اس کو دوسرے رسم الخط میں لکھا جائے اور صرف حروف مغلوں ہی کی کتابت کی جائے تو ان الرحمن الرحیم میں دونوں اسماء میں ال نہیں لکھا جائے گا اور خوبی اصول پر یہ بالکل غلط ہوگا۔ عربی میں "ال" کے استعمالات پانچ ہیں جو مختلف معنی کے فایده دیتے ہیں۔ پھر ک مثالیہ ہے۔ واؤ۔ با۔ تا۔ تسمیہ ہے (واللہ اعلم) اور دو میں بھی متعمل ہے۔

"ل" لئے اور واسطے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (لہذا اردو میں بھی "اس لئے" کے معنی میں مروج ہے) "و" پس کے معنی آتا ہے۔ فارسی میں یائے وحدانی تنکیہ کا فایده دیتی ہے۔ اردو میں "پ" ساتھ کے معنی میں آتی ہے جیسے بدرجہ مجبوری یا مجبوری انگریزی میں *prefixes* اور *suffixes* کی فہرست بہت ہی طویل ہے۔ صرف (a) سات معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے (*already - foot*) یہ ظاہر ہے کہ ان میں کوئی حرف کسی زبان کا بھی مجبور طور پر کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ ایک مخصوص اصول کے تحت دوسرے الفاظ سے ملکر ہی وہ معنی پیدا کرتا ہے جو ہم نے بیان کئے ہیں۔ ہم اس مختصر مضمون میں اشتقاق اور حروف کی اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتے کیونکہ ان سے ہر بڑھا لکھا آدمی واقف ہے اور اس موقع پر ان کی جانب صرف اشارہ کر دینا ہی کافی ہوگا۔ ان اشارات سے ہمارا مقصد یہ اظہار کرنا ہے کہ حروف کو اتنا زبان سے کوئی حقیقی تعلق نہ تھا مگر ہر زبان کی ارتقائی حالت میں حروف سے بہت کام لیا گیا ہے اور اس نے مسئلہ کی صورت کو بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ سید صاحب موصوف نے اپنے مضمون میں اس ارتقائی کیفیت کو بالکل نظر انداز فرما دیا ہے

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ محض اصولی ہے اور کسی ایک زبان سے اس کا تعلق نہیں ہے البتہ مثالیں صرف انہی زبانوں سے دی جا سکتی ہیں جن سے ہم واقف ہیں۔ اس مضمون میں بھی یہی کہا گیا ہے اور اس تمام بحث سے دوسرے اہم نتائج کے ساتھ ایک قابل لحاظ نتیجہ یہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ الفاظ اور اس کے ساتھ ہی قواعد زبان کو تبدیل کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ اس زبان کا جس قدر بھی لٹریچر آج تک جمع ہو چکا ہے اس کو قلم نیست و نابود کر دیا جائے یا کم از کم اتنا ضرور ہوگا کہ وہ بھی اُن زبانوں کے لٹریچر کی طرح ہو جائے گا جو ختم ہو چکیں اور صرف مخصوص علماء ہی ان کے ادب اور علمی کارناموں سے واقف ہیں کیا ایک زبان کا یہی خواہ اس کے تمام سرمایہ علم و ادب کے لئے نیک خواہی کے طور پر یہ مشورہ دینے کی جرأت کر سکتا ہے ؟

علمی اصول پر بحث تو الگ رہی ہمارے اسلاف کے سامنے یہ مسئلہ دو مرتبہ اپنی عملی شکل میں پیدا ہوا اور انھوں نے دونوں بار اس کو نہایت خوبی سے حل کیا۔ پہلے مسلمان جب ایران میں داخل ہوئے تو اپنے ساتھ مذہب اور ایک دوسری زبان بھی لائے ایران نے اسلام قبول کیا اور مذہبی ضرورت سے عربی زبان کو سیکھا۔ چند ہی دن میں فارسی میں عربی کے الفاظ کثرت سے شامل ہوتے چلے گئے مگر ایران نے عربی الفاظ لئے تو اس کے ساتھ ہی وہ تمام عربی حروف بھی اپنائے جو فارسی میں نہ تھے تاکہ جن

الفاظ کو فارسی میں شامل کیا جا رہا ہے وہ اپنی اصل حالت میں باقی اور قائم رہ سکیں۔ دوسری بار اُس وقت جب یہی مخلوط فارسی ہندوستان میں داخل ہوئی اور یہاں کی ملکی پرواکرتوں اور سنسکرت سے سابقہ پڑا اور ان کے میل سے ایک نئی زبان کی تعمیر شروع ہوئی تو اُس عہد کے علماء نے صرف الفاظ ہی نہیں بلکہ ہندی کے تمام حروف اس نئی زبان کے حروف بھی میں شامل کر دئے۔ ٹ - ڈ - ٹ کی علاوہ شکلیں وضع کیں اور چھا - جھا وغیرہ کو مرکب حروف کی حیثیت میں اختیار کر لیا۔ اور اس طرح ہندی کے جو الفاظ اس نئی زبان میں شامل ہوئے ان میں کسی طرح کی تبدیلی کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ اور الفاظ اپنی اصلی حالت میں باقی رہے۔ جن علماء نے فارسی میں عربی حروف کو شامل کیا یا جنہوں نے اُردو میں ہندی حروف کو داخل کیا ان کے سامنے یہی تمام امر تھے جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں۔ انہوں نے الفاظ اس طرح نہ لے کر اپنی زبان کے حروف تہجی علیٰ حالہ قائم رکھتے اور دوسری زبانوں کے الفاظ توڑ موڑ کر لیتے۔ حروف کی جو نوعیت اور حیثیت ایک زبان میں ہے جس کا بیان ہم نے مسطور بالا میں اختصار سے کیا ہے ان علماء کے پیش نظر تھی اور اس کو انہوں نے ہر موقع پر تہام و کمال بخود رکھا اس امر کو ان علماء نے ادب و لسانیات نے اُس زمانہ میں محسوس کر لیا تھا کہ ایک زبان کی بنیاد اصلی حروف کی تہجی پر ہی تشکیل ہے اور حروف کے اسالیب صوتی کو اگر تبدیل کیا گیا تو زبان ہی فنا ہو جائے گی اسی وجہ سے انہوں نے ہندی حروف کی شکلیں ہمیں کہ اُس رسم خط کے مطابق کر لیں جو ان کے استعمال میں تھا مگر اُس زبان کے حروف تہجی جن مخارج اور صوتی اسالیب کو ادا کرتے تھے ان کو علیٰ حالہ قائم اور باقی رکھا۔ اپنے اس عمل سے ان علماء نے ہمارے سامنے اس کی راہیں کشادہ کر دی ہیں کہ اگر ہمیں اس طرح کے لسانی مسائل پیش آئیں تو ہم بھی ایسا ہی کریں۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ سب سے زیادہ مکمل یہ رسم خط وہ سمجھا جائے گا جس میں سب سے زیادہ اسالیب ادا اور مخارج کے اظہار کی قدرت ہو اور اس اعتبار سے اُردو کا موجودہ رسم خط سب سے زیادہ مکمل سمجھنا چاہئے کیونکہ اس میں عربی۔ فارسی۔ سنسکرت اور انگریزی کے تمام حروف کو ادا کرنے کی قدرت۔ صلاحیت اور اہمیت موجود ہے

سید صاحب نے اپنے مضمون کی آخری مسطور میں فرمایا ہے کہ کیا اُردو کا موجودہ رسم خط ہی باقی رہنا مناسب ہے یا اسکو بدل کر لاطینی یا دیوناگری رسم خط اس کے لئے موزوں ہوگا

سید صاحب کے مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے نیاز صاحب نے بالکل صحیح طور پر یہ سوال کیا ہے کہ رسم خط کی تبدیلی پر غور کرنے سے پہلے اس امر کا انکشاف ہونا ضروری ہے کہ کسی زبان کا رسم خط آخر کس وجہ سے تبدیل کیا جائے۔ اور جب تک وہ اسباب وجہ سامنے نہ آجائیں اس مسئلہ پر غور نہیں ہو سکتا۔ اُردو کا رسم خط تبدیل کرنے کے تفصیلی اسباب سید صاحب نے ظاہر نہیں فرمائے ہیں اس لئے ان کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے مگر اپنے قیاس کی بنا پر یہ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ملک کے موجودہ عام لسانی جہانات کے پیش نظر ہی سید صاحب نے اس مسئلہ کو چھیڑا ہے اور چونکہ دیوناگری رسم خط ملک کی اکثریت کا پسندیدہ رسم خط ہے اس لئے سید صاحب نے اس کو اُردو کے لئے بھی تجویز فرمایا ہے۔ تمام اُسولی مباحث سے قطع نظر ہم سید صاحب سے بعد ادب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ ایک ملک میں ایک ہی زمانہ میں ایک ہی رسم الخط میں دو مختلف زبانیں پرورش پاتی رہیں ؟ اور دونوں کا علاوہ وجود میں بھی باقی رہے۔ ظاہر ہے کہ جس زبان کے مؤیدین کی تعداد زیادہ ہوگی صرف وہ زبان باقی رہے گی اور دوسری زبان اُسی میں ضم ہو کر خود فنا ہو جائے گی اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا معجزہ ہوگا

افسریابی اور رضا ابن فیض

عرصہ سے جناب افسریابی کو یہ شکایت تھی کہ نقضاً عظمیٰ، ان کے کلام سے سر قمر کرتے ہیں اور اس باب میں انکی برہمی ایک بار اس مذہب بڑھ گئی کہ انھوں نے مجھے یہ لکھا کہ اگر آئندہ نقضاً کی کوئی نظم شایع ہوئی تو وہ نگار کا مطالعہ بند کر دیں گے، میں نے ان کو لکھا کہ یہ بات اصول کے خلاف ہے اس نے میں قیصل سے قاصر ہوں، لیکن آپ مضمون کے ذریعہ سے ضرور اپنی شکایت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک مختصر سا مضمون لکھ کر بھیجا، جس پر چند کتب کے لب و لہجہ کو دیکھتے ہوئے اس کی اشاعت کچھ مناسب نہ تھی لیکن ان کے مزید اصرار پر اس کو مجسبہ شایع کرنا پڑا اب رہا اصل مسئلہ کہ رضا صاحب کی طرف سے افسر صاحب کو جو شکایت پیدا ہوئی ہے وہ درست ہے یا نہیں، اس کے متعلق میں اس وقت تک کچھ نہیں کہنا چاہتا جب تک خود رضا صاحب کو ایک بار جواب دینے کا موقع نہ ملے۔ لیکن اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ اگر افسر صاحب کا خیال صحیح ہو تو بھی ان کو بہم ہونے کی جگہ خوش ہونا چاہئے تھا کہ لوگ ان کے کلام کی تقلید کرتے ہیں اور ان کے خیالات سے استفادہ کرتے ہیں اگر نثری کا یہ مشہور جملہ شاید ان کی نگاہ سے نہیں گزرا کہ:-

Imitation is the sincerest form of flattery

چہ دلا اور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد

اگر کوئی شخص برابر میرے چیرتا ہے تو وہ میرے نزدیک ایک حد تک درخور معافی ہے۔ لیکن اگر وہ میرے افکار پر غاصلانہ قبضہ کرتا ہے تو گو یا میری شہرت اور نیک نامی کو ناجائز طور پر حاصل کرنے کی سعی مذموم کا مرتکب ہوتا ہے اس کی انتہائی نرم سزا یہی ہو سکتی ہے کہ اس پر پڑ پڑل چھڑک کر دیا سلائی دکھا دی جائے

میں تو اردو کا قابل ہوں مگر بسا اوقات یہ چیز اس قدر *Negativity* قسم کی ہوتی ہے کہ بہ آسانی نظر نہیں آ سکتی اس لئے کہ ٹائٹ اور مشابہت برائے نام ہوتی ہے شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ برا شعر کوئی مصرع لڑ جائے

تو اردو اور سرقہ میں زمین آسمان کا فرق ہے تو اردو کو تو خیر گوارا کیا جاسکتا ہے مگر سرقہ قطعاً ناقابل برداشت چیز ہے، سرقہ کرنے والا گو یا قانون و اخلاق کی تمام قوتوں کے خلاف ایک محاذ تعمیر کرتا ہے اس کا وجہ تہذیب و انسانیت کے لئے ایک مستقل چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے مجھے شعر و ادب کے سلسلے میں بار بار ایک محکمہ احتساب کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے اس محکمے کو *Ministry of the Poets* سمجھئے، اس میں ہر اس شاعر کا امتحان لیا جائے

جس کی شاعرانہ پوزیشن مشکوک ہو، جو شاعر اس کتب خیال کا سنہ یافتہ ہو اسی کو شعر گوئی کا مستحق سمجھا جائے اور جو لوگ سر فیکٹ نہ ہونے کے باوصف شاعری سے باز نہ آئیں ان کو تبدیل آب و ہوا کے لئے اندامان بھیج دیا جائے۔ اگر کوئی غائب یا اقبال کی تقلید کرتا ہے تو یہ بات بذاتہ قابل اعتراض نہیں ہے بلکہ اس کے *Intellectual* ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اس کا یہ مشکل کے لئے غیر معمولی دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اگر یہ پردہ تقلید وہ ان کے افکار و تصورات کے خاکے اڑاتا ہے یا بہ الفاظ دیگر سرقہ کرتا ہے تو یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے

ناظرین! نگار کو یاد ہو گا کہ نمبر سترہ میں ”سودھ کی آواز“ کے زیر عنوان میری ایک نظم شایع ہوئی تھی،

جناب فضا ابن فضی نے اس کے متعدد مصرع نہایت شرمناک طریقے پر چرائے اور اب بھی ان کی یہ ناپاک کوششیں جاری ہیں میرا خیال ہے کہ فضا صاحب شعر کہتے وقت ”نقل راعقل باؤ“ کے بجائے ”نقل راعقل“ کو بد نظر رکھتے ہیں، اگر کوئی *Red handed* مجرم بھی پکڑا جائے تو اس کی حالت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے، جناب فضا کی یہی کیفیت ہے۔
سی نے سچ کہا ہے :-
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہئے

فریب نے میرے اشعار کا سرقہ کیا بھی تو اتنے بھونڈے اور عامیانا انداز میں کر گئے تو ان حضرت پرغصہ کے بجائے ہنسی آتی ہے، مثال امر کے طور پر چند مصرع پیش کرتا ہوں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ شہرت از زان کا جنون اچھے بھلے آدمی سے کیسی کیسی دیکھیں گے کہ وہ اتنا ہے: تاہ کے شعلے رہیں گے برن زاروں میں اسی

(سورج کی آواز)

(اہرن زار)

(سورج کی آواز)

(اہرن زار)

(سورج کی آواز)

(اہرن زار)

(سورج کی آواز)

(اہرن زار)

(سورج کی آواز)

(اہرن زار)

(سورج کی آواز)

(صبح نشور)

(سورج کی آواز)

(صبح نشور)

برن زاروں میں قید برقی تیاں

روشنی پر تیرگی کب تک چڑھائے گی غلات

آفتابوں پہ ظلمتوں کے غلات

خانقاہوں میں نظر آئے ہیں کتے بھیرٹے

بھیرٹے معکف مساجد میں

مجھ کو اس دنیا میں قرفوں سے ہے انسان کی تلاش

آدمی کی تلاش ہے مجھ کو

میں نے دیکھا ریگ زار کو بلا کو برقی پاش

ریگ زاروں میں برقی کے تودے

جام و مینا میں کہاں تک زہر گھولا جائیگا،

ابھی تو ساغر امرت میں زہر بھر رہے

(ذرا یہ ”ساغر امرت“ ملاحظہ ہو)

زلزلے ضربتی رہے گی تاہ کے بوڑھی زمیں

ابھی زمین کو جتنا ہے زلزلے، سیلاب

میری نظم ”طوفان“ کا ایک مصرع ہے :-

کر بلا انداز ہے بھر شور زار آب دگل

فضا صاحب کا ارشاد ہے :-

دک اٹھے یہ سکوں زار آب دگل نہ شتاب

واہ دے شتاب !

ان کی اس تم نظری کی داد چارلی چپلن بھی نہیں دے سکتا کہ وہ ”ٹکار“ سے میرے اشعار کا چربہ کرتے ہیں اور ”ٹکار“

چھ دلا درست دزدے کو بگن چراغ دار دے !

میں ان ساغر امرت صاحب سے حرف آخر کے طور پر کہ دینا چاہتا ہوں کہ آئندہ وہ مجھ پر مشفق ناز نہ کریں ورنہ میں ایسی ترکیب اختیار کر دوں گا کہ انھیں پشیمان ہو تا بیٹے گا بھر تقدیر ”شاعری“ معلوم ہوگی !

آجکل کے نقاد

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

جب تنقید کی گرفت یا گرم بازاری زیادہ ہو جاتی ہے تو تصانیف بے جان نہیں تو نیم جان ضرور ہونے لگتی ہیں آجکل اُردو پر تنقید کا دورہ چل رہا ہے جہاں جائے جس سے لٹے یا تو نقاد ہو گا یا نیتا۔ ایک ادب کا لاگو دوسرا آبرو کا! ہمارے نقاد کی سبکدوشی الجھن یہ ہے کہ اُردو کے تمام لکھنے والے دوس میں کیوں نہ پیدا ہوئے۔ ایک ایک دو دو کر کے کیوں پیدا ہوئے، ایک وقت سارے کے سارے کیوں نہیں! اور اب جبکہ ان باتوں میں سے ایک بھی وقوع میں نہ آئی تو پھر یہ تمام شعرا اور ادیب عرض البلد ۲۰ پر کام کیوں نہیں آجاتے! تعلیم دینے کے ہر زمانہ میں طریقے مروج رہے۔ پہلا تعلیم بذریعہ راز دستی دیکھائی تھی۔ یہ زمانہ خاقہ مستی کا تھا اس کے بعد تعلیم ذریعہ دست کاری ہوئی۔ یہ زمانہ ننگ دستی کا تھا۔ اس کے بعد تعلیم بذریعہ چابک دستی ہونے لگی، یہ زمانہ جو۔ ازاری کا تھا۔ آخر میں تعلیم بذریعہ زبان درازی دیکھائے گئی اور یہ زمانہ آزادی کا ہے۔ موجودہ تنقید نگاری اس تعلیم کا نتیجہ ہے یا خود تعلیم اس تنقید کی پیداوار۔ گو سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے!

ذہب اپنے تاریک زمانہ میں بھی اس حد تک منحرف نہیں بلاتے جان نہ رہا ہوگا۔ یعنی تنقید آج بیسویں صدی کی دھڑ میں ہے۔ سائنس، فلسفہ، معاشیات، سیاسیات یا قوتِ مردی کے سلسلہ میں کوئی ایسا نظریہ دریافت نہ ہوا ہوگا جسے ہمارے نقادوں نے اُردو شعری و ادب پر چسپاں نہ کیا ہو۔ جو نظریہ جتنے زیادہ فساد یا فحشیت کا ہوگا، اتنی ہی شدت و شوق سے اُسے شعرا و ادب پر چسپاں کرینگے جن انکشافات سے انسانوں کا تباہ کیا جانا آجکل بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہو، اُن سے شعرا و ادب کو سہار کرنے میں مضائقہ کیا!

ایک عرصہ سے دنیا اضطراب و ہرجاں میں مبتلا ہے۔ زندگی کی کشتی کچھ اس طرح ڈانوا ڈول ہے کہ ذہن و فکر کا توازن قائم نہیں رہا۔ ہر بدولی بیزارسی اور بدچلنی کا جواز سائنس، فلسفہ، سیاسیات کے نظریات میں مل جاتا ہے۔ لوگ سمجھنے سے گھٹے ہیں کہ زندگی عبارت ہی ہے فسق و فساد سے۔ کچھ سمجھتے ہیں اور ایک دیکھتے ہیں کچھ سمجھتے ہیں کہ جرحِ شدید اشتعال یا یو سی میں شدید جرائم کی سزا ملنی یا معاف ہو جاتی ہے اسی طرح موجودہ بدنامی یا بدامنی میں شعرا و ادب میں کیسی ہی بے راہ روی یا تالافتی کیوں نہ برتی جائے محاسبہ یا مواخذہ کا کوئی اندیشہ نہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس طرح کی حرکتیں کو سراہنے والے بھی کافی تعداد میں مل سکتے ہیں!

علومِ اصول و نظریہ دریافت کرتے ہیں، علوم ہی ان کی رد و بدل کرتے رہتے ہیں۔ علم کا کام ہی یہ ہے۔ تجربات و معذلات کے ذخیرہ میں اسی طرح اضافہ ہوتا آیا ہے لیکن کس نظریہ کو کہاں اور کب برسرِ کار لانا چاہئے اس طرزِ ہماری نظر کم جاتی ہے۔ فریڈ کا نظریہ اشتراکیت کے اصول آٹم بم کا انکشاف اپنی اپنی جگہ پر مسلم اور مبارک لیکن کسے کہاں اور کب کام میں لانا چاہئے یہ بھی کچھ کم اہم بات نہیں ہے

اگر شعری اور انشائیہ پر دلی بیرونی محلِ مزاج اور موسیقی کے اعتبار سے مناسب الفاظ اور فقرات کا استعمال کیا جانا ضروری ہے یہی نہیں بلکہ کہانیاں اور صراحت تک کی ناپ تول مقرر ہے تو پھر اس زیادہ ضروری ہے کہ زندگی (جو سبکدوشی شعری اور انشائیہ پر داری ہے)

کے سلجھانے سنوارنے میں انتہائی احترام، احتیاط اور ایمانداری سے کام لیا جائے!
 انسان پہلے عناصر کی دستبرد میں تھا جن سے بڑی حد تک سائنس نے اسے نجات دلائی۔ اب وہ سائنس کی دستبرد میں ہے۔ ظاہر ہے
 اس دستبرد سے بھی نجات پانے کی سبیل اسی کو کرنا پڑے گی۔ اُسے سائنس کی انسانیت میں ڈھانچہ بڑے گا۔ ادب کا رشتہ براہ راست انسانیت
 سے ہے اس لئے ادب اور سائنس میں توافق پیدا کرنا ہر ادیب اور سائنس دان کا فرض ہی نہیں فن بھی ہونا چاہئے!
 نقاد کو یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ سائنس غیر شخصی ہوتی ہے اور شعرو ادب قطعاً شخصی و انفرادی۔ چنانچہ شعری صداقت اور سائنسی
 صداقت میں جو فرق ہے اس کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ حیوانی صداقت اور انسانی صداقت میں بھی فرق ہے
 ہمارے جنسی میلانات ایک حیوانی صداقت ہے۔ شرافت و عفت و صنداری وغیرہ انسانی صداقتیں ہیں۔ فرائیڈ نے ایک حیوانی صداقت
 کی طرف اشارہ کیا ہے اور بالکل سچا کیا ہے، یہ نظریہ ایک طرح کی طبی شخصیت ہے اس نے ایک مرض کی طرف اشارہ کیا ہے "مبارک مرض"
 کر لیجئے۔ اس سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس مرض سے ہم تمام انسانی نفسیاتوں کو داغدار کرتے ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں ایسے لوگوں
 کی کمی نہیں ہے جو فرائیڈ کے نظریہ کی بنا پر لذت اٹھانے میں تامل نہ کریں گے لیکن اگر کسی کے نظریہ کے احترام میں کسی طرح کی تفتی چھپنے
 پر تیار نہ ہوں گے!

بڑا شاعر کسی نظام کا زاہد اور بدردہ نہیں ہوتا بلکہ وہ خود ایک نئے نظام کا مبلغ اور مبشر ہوتا ہے، میں شاعری کو
 بشلائے ذکر کرنے اور اس طرح شاعر کو حکومت کا آلہ کار بنانے کی موافقت نہ کروں گا
 میں اس کا قائل ہوں کہ شاعری کو فنی بھی اپنی ہو اور راگ بھی اپنا!

اچھا اور بڑا شاعر کسی مخصوص طبقہ یا مخصوص عہد کا شاعر نہیں ہوتا۔ وہ ہر طبقہ اور ہر عہد کا شاعر ہوتا ہے۔ اشتراکی نظام کا
 اچھا اور بڑا شاعر اتنا ہی قابل قدر اور قابل فخر ہوگا جتنا کسی اور نظام کا اچھا اور بڑا شاعر ہوگا وہ نظام آج سے ہزار برس پہلے تھا
 یا ہزار برس بعد آئے

حکومت شاعر کا آلہ کار ہوتی ہے شاعر حکومت کا آلہ کار نہیں ہوتا۔ غالب حکومتوں نے مغلوب حکومتوں سے اپنی شرائط منوائی
 ہیں لیکن کوئی حکومت شاعروں سے اپنی شرائط نہیں منوائی ہے۔ آج اگر اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اشتراکیت اپنی شرائط
 شاعر سے منمائے تو اسے شاعر جانیں تو میں یہی کہوں گا کہ اس قسم کی تحریک شاعری اور ادب کے منصب کے منافی ہے!

میرے ذہن میں اکثر یہ دوسرے گزرتے ہیں کہ اردو تنقید کے جیسے نظریے کتابوں میں اور نقاد بازاروں میں ہیں اردو میں اتنے
 شاعر اور لکھنے والے بھی ہیں یا نہیں! آج کل جتنی دوائیں دریافت کی جا چکی ہیں اتنے امراض بھی دریافت کئے جا سکیں گے یا نہیں!
 نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ شاعر اور ادیب نہیں ملے تو یہ نقاد آپس ہی میں "مزاج المومنین" شروع کر دیتے ہیں

بعض نقاد ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جیسے گرہ باز کو ترہوتے ہیں، بیٹھے بیٹھے یک بیک چتری سے آرٹ فضا میں ایک آدھ چکر کاٹے
 دو چار گرمی لگا دیتے اور پھر چھتری پر لوٹ آتے اور یاد دہائیں معروضہ ہونے لگتی ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جن کو دیکھ کر ہندوستان کی انسانی
 ہڈی گری یاد آجاتی ہے یعنی رستی فضا میں پھینکی وہ کھڑی ہوگئی اس پر چڑھ کر نظروں سے غائب ہوئے دیر بعد پھر آسمان پر آئے!
 اردو شعرا نے محبوب کے دہن اور کمر پر بھروسہ وصال کی اقسام یا ترکیب استعمال پر اتنی موثر لکائی ہے کہ ہونگی جتنی تنقید پر تنقید نگاروں
 نے غائب لکھے یا چڑھائے ہیں، بیدل اور موتی کی خیال بندی ان تنقیدی خیال بندیوں کے سامنے ہچکچاتی ہے

تنقید کی آجکل وہی گرم بازار ہے جو آج سے تقریباً پچیس تیس سال پہلے ادب لطیف یا بگوریت کی تھی، جسے دیکھتے جہاں
 دیکھتے عاشق کی "تعلیم بالغان" میں مصروف! ایک جملہ لکھا دس بارہ نقطہ اس کے بعد ایک فقرہ پندرہ ہیں نقطہ پھر دو چار
 لفظ دو چار سکتے ایک آدھ جھٹکے بالآخر جاں بحق تسلیم! جیسے کوئی عاشق کسی دوسرے کے معشوق کو سکرات میں اپنے دھبہ نامہ

کامسودہ سنار ہوا!

ان تنقیدوں کو دیکھتے دیکھتے سنتے سنتے اور بڑھتے بڑھتے سمجھ پر وہی حالت طاری ہوتی ہے (کیونکہ ہواست ان) کسی آئین پر گاڑی رکھی۔ ایک صاحب گارڈ سے گفتگو کرنے لگے۔ گارڈ کے ایک دوست دھ سے یہیں دیکھ رہے تھے۔ دوست کی متغیر حالت دیکھ کر قریب پہنچے، گفتگو کرنے والے بزرگ جا چکے تھے، پوچھا خیریت تو ہے تم اس پاگل سے کیوں گفتگو کر رہے تھے گارڈ اس طرح چونکا جیسے اُس نے کوئی بڑی خوشی کی خبر سنی ہو لیکن یقین نہ آتا ہو، دوست نے بتایا کہ وہ شخص اس نواح کا معروف پاگل تھا اور معلوم نہیں کیوں آئین کی طرف آنکلا تھا۔ کئی بار پوچھے اور تصدیق کرانے کے بعد کہ وہ شخص وہاں پاگل تھا، گارڈ نے بے اختیار ہونکر دوست کو کھٹکے لگا لیا اور بولا دوست خدائے کرم کو جزائے خیر دے میں تو بڑے شدید غلجھان میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں پاگل ہوں!

اُنی تنقیدی مضامین کو پڑھ کر جو ہر روز کسی نہ کسی رسالہ اخبار میں نظر سے گزرتے ہیں مجھے ہمیشہ دوسروں سے پوچھنا پڑتا ہے کہ میں پاگل تو نہیں ہوں! ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں نے اپنی بد وقت ایک صاحب سے رجوع کی اُنھوں نے کچھ اس طرح باتیں کیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے فکیر ہو گئے دونوں پاگل ہو چکے تھے! (علیگڑھ میگزین اکبر نمبر)

عورت اور تعلیمات اسلام

از

مالک رام۔ ایم۔ اے

واقعہ تو گول کی طرف سے اسلام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ عورت کی اصلاح اور اسکے حقوق کی حفاظت کا خیال نہیں کیا اور اسکو لڑائی کی حیثیت سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ مالک رام صاحب نے اس تصنیف میں بتایا ہے کہ گہوارہ سے لیکر جدید عورت کی اور اس کی زندگی کی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو اسلام نے ترک کر دیا ہو اور اس کا اقتدار قائم کرنے کی انتہائی تاکید نہ کی ہو۔ اس کتاب میں عورت سے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس سے بحث نہ کی گئی ہو اور اس التزام کے ساتھ کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف قرآن پاک ہی کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے چونکہ مالک رام صاحب عربی کے بھی فاضل ہیں، اسلئے ان کی یہ کتاب ایک ایسے اسکالرز کی سرچ کا نتیجہ ہے جو تقلید و اتباع سے بے نیاز ہے اور ہر مسئلہ کا استنتاج میں خود اپنی مستحکم رائے رکھتا ہے۔ کتاب نہایت نفیس کاغذ پر پاکیزہ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہے قیمت تین روپیہ علاوہ محصول۔ نگار ہیکل انجینی گھنٹو

تنقیدی اشارے

پروفیسر آل احمد سرور۔ ریڈر شعبہ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کے آئین تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔

پروفیسر سرور اس عہد کے نہایت مشہور نقادوں میں سے ہیں اور ان کے تنقیدی مقالات سندی حیثیت رکھتے ہیں۔ مقالات کی فہرست یہ ہے:-

اُردو ناول کا ارتقا۔ اُردو میں فسانہ نگاری۔ اُردو شاعری میں خمریات۔ خطوط میں شخصیت۔ انگریزی شاعری۔ ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ۔ اکبر شخصیت اور آرٹ۔ چکیت لکھنوی۔ اقبال اور ادب کا فلسفہ۔ قافیہ دہائی۔ رتن ناتھ سرشار۔ ہندوستانی ادب میں آغا حشر کادریہ۔ سرسید کے خطوط۔ مکیاتب مہدی۔ خنداں۔ جدید اُردو تنقید۔

حیات شبلی۔ مجھے کون کون سی کہانیاں پسند ہیں

۲۴۲ صفحات۔ کاغذ ۷۸ پونٹ

قیمت تین روپے (۳)

نگار ہیکل انجینی گھنٹو

نئی دنیا کی پرانی باتیں

شہر درمنوٹ میں کوئی عورت اتوار کو سیرگاہوں میں اس وقت تک نہیں جاسکتی، جب تک اس کا شوہر ۲۰ قدم پیچھے بندوق کندھے پر رکھے ساتھ ساتھ نہ چل رہا ہو۔ یہ قانون اس زمانہ کی یادگار ہے جب یہاں کے سرخ باشندے سفید فام عورتوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے

نیویارک میں کسی مرد کو حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے یا کسی اور کے عریاں بچے کو کپڑے پہنائے۔ یہ قانون اُس زمانہ کی یادگار ہے جب مردوں نے یہ احتجاج کیا تھا کہ عورتیں انھیں بچوں کو کپڑے پہنانے پر مجبور کرتی ہیں

شہر کولمبوس میں کسی بی کو ۹ بجے رات کے بعد بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی بی ایسی نظر آتی ہے تو پولیس اسے پکڑ کر بند کر دیتی ہے

شہر کیوسٹ میں شام کو جس وقت گھڑی ۶ بجاتی ہے تو سب گھر والے احتیاطاً کھڑے ہو جاتے ہیں

رومنفورڈ میں پارکوں کی بچوں پر، داڑھی، مونچھ یا سر کے بال چھوڑنا سخت ممنوع ہے

شہر ٹریڈ میں پیدل چلنے والوں کے سامنے کوئی گبری آجائے تو فوراً پکڑ لی جاتی ہے

ڈیٹروٹ میں اگر کسی شخص کا کتا کسی ڈاکیر پر حملہ کرتا ہے تو محکمہ ڈاک اس کے خطوط وغیرہ اس کے مکان تک پہنچانے سے باز رہتا ہے

شہر یلم فیلڈ (نیوجرسی) میں وہ بچے جو کالی کھانسی میں مبتلا ہیں گھر سے باہر نہیں نکل سکتے اور اگر نکلیں گے بھی تو قانوناً ان کو ایک سختی اپنے گلے میں لٹکا کر باہر آنا پڑے گا جس پر پہلی حروف میں لکھا ہوگا کہ ”مجھے کالی کھانسی ہے“

ماساچوسٹس میں مردوں کے لئے آٹھ دوکانوں میں جانا ممنوع ہے جہاں عورتیں اپنی آرائش کے لئے جا یا کرتی ہیں۔ اگر کوئی مرد یہاں جاتا ہے اور عورتوں کی طرح اپنے بال آراستہ کرتا ہے تو اسے سزا دی جاتی ہے

غزل :- علی اختر حیدر آبادی

(۱)

ہر سانس کے ساتھ اک نشتر بھی سینے میں آتا اور جاتا ہے
فریاد سننے تو یا نہ سننے اس پر تو کسی کا زور نہیں
کشتی ہے کنارے پر جنگی طوفان کی حقیقت کیا جانیں
اب یا د بھی تیری آتی ہے، چٹلی میں دبائے اک نشتر
انداز یہی ہیں مگر اُن کے تقدیر کے بل کھلنے سے رہے
ہر بات کے سو پہلو ہی نہیں، ہر پہلو میں اک بات بھی ہے

سینے پہ محبت میں اختر نالک بھی گوارا ہوتے ہیں
بازی ہوا یہ ایسی ہے جس کو خود جان کے مارا جاتا ہے

(۲)

دل ڈوب رہا ہے میں خوش ہوں تکمیل محبت ہوتی ہے
سوچو تو چین میں کانٹے بھی، ہوتے ہیں امین راز چین
انظہار جفا بھی مشکل ہے، انکار و نفا بھی مشکل ہے
بیمار پہ کس کا دل نہ کڑھا، اک آپ مگر نہتے ہی رہے
یہ سحر تمنا تھا یا رب! یا کھیل نگاہ ساقی کا
کل نہیں چھڑے تھے ساز طرب، مئے جہوم رہی تھی مینا میں
الزام جفا کس نے رکھا، اب رہنے بھی دیجئے یہ قصہ
آنسو جو نکلتے ہیں دل سے ہلکوں پر ستارے بنتے ہیں

دل واقعہ راز غم ہو اگر فردوس ہے دنیا بھی اختر
شعلے میں چراغ محفل کے، پروانوں کی جنت ہوتی ہے

جگن ناتھ آزاد :-

کبھی بلندی ذوقِ نظر تک آپہونچی، کبھی حیاتِ غمِ بال و پر تک آپہونچی
 فغاں کر لی گئے بھی ہم تم اسے نہ روک سکے، شبِ وصالِ مدودِ سخن تک آپہونچی،
 نظر سے بڑھ کے زباں تک کہیں نہ آجائے، جہاں دل کی کہانی نظر تک آپہونچی
 ابھی تو دل میں ہے خوابیدہ حسرتِ پرداز، یہی ہوس جو کبھی بال و پر تک آپہونچی
 نظر کی بات تو کچھ آدھے مگر کیونکر، تری شہیدِ دل بے خبر تک آپہونچی
 بھٹک رہی ہے ابھی تک تو آرزو دل کی،
 اگر کبھی یہ تری رہگذر تک آپہونچی

عہدِ نو

(خطیبہ ہند سیدہ اختر)

کل بھی تھیں مہینتیں مجروحِ اولام و گماں ! کشتہ ابھام ہے دُنیا کے انسان آج بھی !
 کل بھی تھا چشمِ بصیرت پر حجابِ اقتدار ! حریت کی روح ہے مرہونِ زنداں آج بھی !
 کل بھی اظہارِ صداقت جرم تھا اس دہر میں ! کلمہٴ اعلائے حق ہے وجہِ عصیان آج بھی !
 کل بھی تھے جوشِ آنا کے واسطے دار و رس ! اہل حق کے واسطے ہے تیغِ ہراں آج بھی !
 کل بھی تھا بدنامِ نظارہ ہر اک اہلِ نظر ! جذبہٴ دیدار ہے مجروحِ دوراں آج بھی !
 کل بھی تھی سرمایہ داری اک بلائے زندگی ! خوگرِ آلام ہیں مزدور و دہقاں آج بھی !
 فرقِ ظالم پر بدخشاں کل بھی تھا تاجِ غور ! جلوہٴ فرعونیت ہے مست و رقصاں آج بھی !
 کل بھی تھا پیرِ مغان کو اپنے میخانے پہ ناز ! تمکنت کے ساتھ ہے پیرِ خمستاں آج بھی !
 سیدہٴ گیتی سے کل بھی اٹھ رہا تھا اک دھواں ! ذرہ ہائے دہر میں شعلہٴ ہواں آج بھی !
 کل بھی تھیں سورج کی کرنیں مرگِ شبنم کا پیام ! لٹتی جاتی ہے متاعِ شہنشاں آج بھی !

بھول بیٹھا آج کا انسان اگلا طرز و طور

اشدِ اندر خوب آیا ہے یہ عہدِ نو کا دور

مطبوعات موصولہ

دیوان فانی گورکھپوری مشہور بزرگ سید شاہ شاہد علی سبزوئی کی غزلوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ شاہ صاحب موصوف خلیفہ ہیں مولانا شاہ آستی مرحوم کے جو نہایت مشہور و مقبول غزل گو شاعر بھی تھے، اور غالباً شاعری کا ذوق بھی ان کو اپنے پیر و مرشد ہی کی صحبت و محبت میں پیدا ہوا ہو گا، جو بعد کو ریاض اور دسکیم کے قیام گورکھپور کی وجہ سے اور زیادہ شدید ہو گیا ہو گا ابتداء میں جناب دسکیم کے صاحبزادے انیم خیر آبادی نے ایک مفصل مقدمہ کے ذریعہ سے صاحب دیوان کے تمام حالات و سوانح اور ان کے شاعرانہ ذوق پر روشنی ڈالی ہے

کلام صاف و سلیس ہے اور دلہستان لکھنؤ کے اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب ریاض و امیر کا طوطی بول رہا تھا اور اس باب میں وہ اپنے پیر و مرشد آستی مرحوم سے بالکل علیحدہ نظر آتے ہیں طباعت و کتابت معمولی قیمت پانچ روپے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات

خوابوں کے ویرانے جناب مسعود جاوید کے دس مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے، جن میں انھوں نے بتایا ہے کہ ہمارا سماج ان مظالم کی طرف سے کس قدر بے پرواہ ہے جو ارادی و غیر ارادی طور پر اس کی طرف سے روز دنیا میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اس نظریہ کے پیش نظر اور لوگوں نے بھی خسانے لکھے ہیں، لیکن شاید یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ادب انشا کی و فکشی و باندی کے لحاظ سے مشکل ہی سے کوئی دوسرا شخص جناب مسعود جاوید کا ہمسر ہو سکتا ہے موجودہ عہد کا ادب لطیف خواہ کتنا ہی مفید و کارآمد کیوں نہ ہو، لیکن اس میں کلاسیکل بننے کی اہمیت نہیں پائی جاتی مسعود جاوید کی انشاء میں یہ اہمیت بہ وجہ احسن پائی جاتی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آج نہیں تو کل اس حقیقت کو محسوس کیا جائے گا یہ مجموعہ مکتبہ دانش مزنگ لاہور نے شایع کیا ہے۔ قیمت دو روپے

چاندنی کے سائے یہ مجموعہ بھی جناب مسعود جاوید کی تراوش فلم کا نتیجہ ہے۔ اس کا پہلا حصہ صرف ان ادبی و افسانوی خطوط کے لئے وقف ہے جن کی وساطت سے فاضل مصنف نے زندگی کی بہت سی گتھیوں کو سلجھایا ہے اور نفسیات کے بڑے بڑے مشکل مسائل پر نہایت شگفتہ انداز میں بحث کی ہے۔ ادب و انشاء کی وہ خصوصیت جو ان کی تمام تحریروں میں پائی جاتی ان خطوط میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے

دوسرے حصہ میں چند ایسے افسانے ہیں جو انگریزی کا ترجمہ ہیں، پہلا افسانہ آمادہ نیگور کے ایک افسانہ کا ترجمہ ہے اور اس قدر کامیاب ترجمہ ہے کہ مشکل ہی سے اسے ترجمہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ مجموعہ بھی مکتبہ دانش مزنگ نے شایع کیا ہے۔ قیمت دو روپے

یونانی دوا سازی تالیف ہے جناب حکیم حاجی محمد یوسف صاحب حضروی کی جس میں پہلے انھوں نے طبی نقطہ نظر سے دوا سازی کے اصول کو پیش کرتا ہے اور پھر عرقیات، سفوف، روغنات، حبوب، شربت اور مجون وغیرہ طیار کرنے کے صحیح طریقہ بتاتے ہیں۔ کتاب چونکہ ایک ماہر فن کی لکھی ہوئی ہے اس لئے اسے مفید ہونا ہی چاہئے۔ قیمت دو روپے چار آنے ضخامت ۱۳۶

لئے کا پتہ: خضروی دواخانہ ۱۵، موتی مسجد، بندر روڈ کراچی

کاندھمی جی بادشاہ خاں کے دیس میں یہ کتاب پڑھانا کاندھمی مرحوم کے سکرٹری پیارے لال کی تصنیف ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر سید عاجز حسین نے کیا ہے

بادشاہ خاں اور خدائی خدمتگار یہ دونوں ایسے لفظ ہیں جو ایک دوسرے سے جدا ہو سکتے ہیں اور نہ ان کو نظر انداز کر کے اس بات کا پتہ چل سکتا ہے کہ صوبہ سرحد ایسے خطہ میں کاندھمی جی کی تعلیم اہنسا کیوں مقبول ہوئی

بادشاہ خاں سرحدی کاندھمی مشہور ہیں، لیکن لوگ انھیں ایسا کیوں کہتے ہیں اس کی صحیح وجہ اسی وقت معلوم ہو سکتی ہے جب کاندھمی جی کے سفر سرحد کا غایر مطالعہ کیا جائے

اس کتاب میں پوری تفصیل کے ساتھ جہان کاندھمی کے دورہ سرحد کا حال درج کیا ہے اور اس قدر دلکش انداز میں کہ خواندہ سے زیادہ دلچسپی اس میں پیدا ہو گئی ہے

ترجمہ کی خوبی کے متعلق صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ وہ ڈاکٹر عاجز حسین کا کیا ہوا ہے متعدد قصا ویر نے کتاب کو اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے

کتابت، طباعت، کاندھسب پبلیشرز۔ کتاب مہلہ شایع کی گئی ہے، حجم ۲۵۲ صفحات - قیمت تین روپے - ناشر :- مکتبہ جامعہ - جامعہ نگر - دہلی

یہ کتاب مدین موہن گپت صاحب نے سچوں کے لئے بہت آسان زبان میں لکھی ہے، پہلے باب میں حکومت کے **ہمارا راج** بڑے بڑے اصول، آزادی و مساوات کے حقوق اور مذہبی آزادی پر گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں انتخاب صدر کی پوزیشن، وزراء کو نسل کی حیثیت اور قانون سازی سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے سیاسی نقشہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے

کتابت و طباعت بہت روشن ہے۔ قیمت ۱۰ روپے۔ ناشر مکتبہ جامعہ - جامعہ نگر دہلی

مجموعہ ہے کرشن چندر کے دس افسانوں کا، جن میں پہلے افسانے کا عنوان "پڑانے خدا" ہے۔ ابتدا میں عمر و رضا **پڑانے خدا** کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جس میں کرشن چندر کی فسانہ نگاری پر غور کیا اور اس مجموعہ کے افسانوں پر خصوصاً تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے

کرشن چندر ملک کے نہایت ممتاز فسانہ نگار ہیں اور دور جدید کے افسانہ نگاروں میں وہ اعلیٰ سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں میں فکر و نظر کا ایک خاص ٹھہراؤ پایا جاتا ہے اور جو رومان کے مخصوص رنگ کے ساتھ مل کر بہت دلچسپ چیز نظر آتا ہے

اس مجموعہ کا یہ دوسرا ڈیویشن ہے جسے مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی نے شایع کیا ہے

اسلام کے معاشی نظریے تصنیف ہے ڈاکٹر محمد یوسف الدین صاحب ام۔ اے کی جو جامعہ عثمانیہ میں کلچرل ڈپٹی کے پروفیسر ہیں۔ اس کتاب کی دو جلدیں ہیں۔ پہلی جلد چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں

ایم جاہلیت کے معاشی و معاشرتی نظام کو ظاہر کیا گیا ہے۔ دوسرا باب اسلام اور دیگر مذاہب کے معاشی اصول کا تقابلی مطالعہ ہے، تیسرے باب میں پیدائش دولت، تجارت، صنعت و حرفت، وسائل محنت، فراہمی روزگار، مسائل پر اسلامی نقطہ نظر کو پیش کیا گیا ہے، چوتھا باب تقسیم دولت سے متعلق ہے، جس میں وراثت، تقسیم اراضی، لگان، معدنیات، جاگیرات و عطیات وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے

یہ جلد میں مسئلہ اجرت، سود و تقسیم منافع، حکومت کی آمدنی کی تقسیم، مبادلات، زر، صحت، دولت، زکوٰۃ، جزیہ اور قرض وغیرہ پر بالتفصیل لکھ لیا گیا ہے۔

یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے جس قدر اہم ہے، اسی قدر یہ مکمل و جامع بھی ہے، معاشیات و معیشت، سیاست و نظم و نسق حکومت کا جو ایسا ہمیں ہے جس کو اسلامی نقطہ نظر سے پیش نہ کیا گیا ہو اور اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے سیاسی و معاشی حیثیت سے اسے اب سے ساڑھے تیرہ سو سال پیشہ تر وضع کئے تھے، وہ آج بھی کم اہم نہیں ہیں۔

اس موضوع پر مولانا مناظر احسن گیلانی کی ایک تصنیف اس سے قبل شائع ہو چکی ہے، لیکن زیر نظر تصنیف میں اس سے زیادہ تفصیلاً لکھا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر محمد وسعت الدین نے اس کی تصنیف میں جس محنت و کاوش اور تحقیق و ترقیق سے کام لیا وہ معمولی دل و دماغ کا کام نہ تھا۔ اخیر میں ۳۶ صفحات کا اشارہ یا انڈکس نے اس کتاب کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے، مصنف نے اخیر میں تکی کو جو بہت دی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مختلف زبانوں کی تقریباً ۱۰۰ کتابوں کا مطالعہ کر کے اس کتاب کو تصنیف کیا ہے ورنہ جلد دل کی ضخامت ۱۱۰ صفحات سے زیادہ ہے اور متوسط قطع پر نہایت عمدہ کاغذ اور طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شائع ہے۔ قیمت دس روپے آٹھ آنے (دعہ) ہے جو کسی طرح زیادہ نہیں کہی جاسکتی۔

ستانِ کیفی مجموعہ ہے نثری چند بھان کی کیفی مرجم کی نظموں اور غزلوں کا جسے ان کے ڈائریکٹر سیر کثور اسٹرن نے شائع کیا ہے۔ اس کی صفائی، محاوروں کا صحیح استعمال، عہد وسطیٰ کی غزل گوئی کی بڑھ چھٹا، اور معروف و مانوس خیالات جو اس عہد کی خصوصیات تھیں ان کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن ان کی نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ شعرا کی خصوصیات تھیں ان کے بھی پائی جاتی ہیں، لیکن ان کی نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اقتضائے وقت سے بے خبر نہ تھے اور اس سلسلہ میں بعض نظمیں بہت پاکیزہ ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندو مسلم سے ہونے لکھ کے بڑے حامی تھے۔ ایک نہایت ہی مختصر مثنوی نے جنگ جیش و اطالیہ پر لکھی ہے اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ مثنوی نگاری کو اپنا فن بنا لیتے تو بہت زیادہ اب ہوتے۔ طباعت و کتابت میں خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ لکھتے کا پتہ، مکتبہ خزانہ ہند دہلی۔

آہِ حیات مجموعہ ہے جگدیش بھٹناگر حیاتِ نبیؐ کے غزلوں کا جو بیاض کی صورت میں ۴۴ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ جناب حیات میں اردو ادب اور شاعری کا شوق وراثتاً منتقل ہوا ہے۔ ان کے پروا دارانے ہر سنگہ راستے اخبار کوہِ لور کے نیچے جو سہارے سے پہلے لاہور میں شائع ہوتا تھا اور جس سے نثری نو لکھتو بھی وابستہ تھے اور مرزا ہر گوپال تفتہ بھی انکے دو حیلیں ار تھے۔ انھیں خاندانی روایات کا اثر ہے کہ جناب جناب حیات کے کلام میں ہم کو زبان و بیان کے لب و لہجہ اور فارسی تراکیب کے استعمال ان سے بڑی صفائی اور استواری نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

دل ایک روز ہو کے رہے گا جنوں طراز شاید مذاقِ تمنا اگر ہو

بڑھ گئے خود ہی قدم دیر و حرم کے آگے جاوے شوق میں حایلِ حد منزلِ دہوئی

ہم کی ترکیبیں ان کے کلام میں بکثرت پائی جاتی ہیں اور جس روانی و سلاست کے ساتھ انھیں استعمال کیا گیا ہے اس سے پتہ ہے کہ حیات، موتوں کے سنگ سے زیادہ متاثر نہیں۔ جناب حیات کی غزل گوئی میں غلطی رنگ زیادہ جھلکتا ہے، جس کا سبب خود انھیں ہی ہے۔ اتنا فطرت میں رچا ہوا ہے غم کہ مجھے خود بھی کچھ نہیں احساس

ہمیں امید ہے کہ جناب حیات کی یہ بیاض تغزل کا صحیح ذوق رکھنے والے طبقہ میں قدر و تحسین کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

آٹھ آنے - لکھتے کا پتہ:- حالی پبلشنگ ہاؤس اردو بازار دہلی



گر نمی باشد شہید
لیکن.....

روح افزا

کھنڈا اور تسکین دہ ہے

ہمدرد و واخانہ وقف دہلی

{ مشہور طبی دستوں رسالہ "ہمدرد صحت" کا
نورہ مضمت طلب فرمائیں }

Hamdard
PRODUCT

جیسا ہشتہار دینا حرام ہے اس سے زیادہ میرے پاس
کون شہوت صدر وقت نہیں ہے۔ اتنا آنا آپ کا نسل ہے
میں غمخیزی کے دوا دینا بہترین مقبولیت حاصل کر چکا ہے ولایت میں
ایک طرح مروج ہیں۔ داخلی کو دہلی کے ایک شخص
جوان بڑھے سب گھاتے ہیں اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں جیسی ادویات کو
کتنے جات پر کار ہیں اس سے جو کہ اس قدر برتر ہے کہ وہ جیسی دوا وہ وہ
باز بھی جیت کر سکتے ہیں اس قدر عموماً دماغ ہے کہ کہیں کی دماغی عدم توازن
آنے لگتے ہیں اس کیلئے انجمنیات کے تصور فرمائیے اسکے استعمال کرنے سے پہلے زیادتی
کریں گے ایک شہری چھ سات سو غمخیزوں آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی اسکے استعمال
سے اس کے کام کرنے سے مطلق تسکین نہ ہوگی۔ یہ دوا زساموں کو شہد ہا پہلے
سرخ اھٹھن کنڈن کے درختوں پر بنا دی۔ یہ دوا نہیں ہے بلکہ ہزاروں ایسے علاج
ایک استعمال سے ہزاروں کیلئے چند سو سال کے جوان ہیں لگے ہیں۔ یہ نہایت
درجہ عموماً وہ ہے کہ آپ ہمیں دیکھ کر سکتے۔ القصد اس کی صفت تحریر میں نہیں
اسکی۔ جتنے کہ کچھ لکھے اس سے بہتر عموماً دوا دینا بہتر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی ۲۲ روپے چار روپے (دو روپے)
(نوٹ) خوردہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فرست دہ لغات ملت دہلی میں ان کے ماحول
ماحولیات کو کھتا ہوں کہ دوا اکیس روپے کر لیں۔ نفاذ کو سے ہوشیار رہئے۔
میری اس سال شہرت پر خود فرمائیے۔

پتہ:- حکیم ثابت علی بیچ زبان خوش کلام

(آغا نئی مولا نیک دم صاحب)

محمود فکھر لکھنؤ۔ یو۔ پی

من ویزواں جلد اول

کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ اب یہ دس روپے

میں ملے گی۔ من ویزواں جلد دوم کے

ساتھ طلب کرنے پر دونوں پندرہ روپے

میں علاوہ محصول مل سکیں گی۔

مینجر منکار لکھنؤ

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب پرانی ہندوستانی جہاز ران کمپنی

سروس

جج

خاص

مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ سال رواں کے جج کے لئے اپنے ایک اور جہاز کی روانگی کا اعلان کرتی ہے۔
جہاز کا کرایہ (مع فورٹ) بمبئی / جدہ واپسی

درجہ اول / ۱۱۵۱ روپے

عرشہ (ڈیک) / ۴۱۵ روپے

ان کرایوں میں محصولات جدہ اور کشتی کا کرایہ جن کی مجموعی رقم (۷۰) روپے (۱۲) آنے ہوتی ہے، شامل نہیں۔ عازمین جج کو
آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس وقت تک بمبئی نہ آئیں۔ جب تک کمپنی انہیں آنے کے لئے نہ کہے

اہم اطلاع

عازمین جج کے پاس "انٹرنیشنل فارم" پر مہضہ اور چیک کے ٹیکے لگوانے کا سرٹیفکٹ ہونا چاہئے۔ ہیفے کے سرٹیفکٹ میں =
درج ہونا ضروری ہے کہ عازم جج نے سات روز کے وقفہ سے ڈو انجکشن لئے ہیں اور یہ کہ دوسرا انجکشن بمبئی سے روانہ ہونے کی تاریخ سے
کم از کم سات روز قبل لیا گیا ہے اس طرح چیک کے سرٹیفکٹ میں یہ اندراج ہونا چاہئے کہ جہاز کی روانگی کی تاریخ سے کم از کم چودہ دن قبل
چیک کا ٹیکہ لگوا لیا گیا ہے۔ یہ سرٹیفکٹ مقررہ "انٹرنیشنل فارموں" پر مقامی میونسپلٹی کے حفظان صحت کے حکام سے بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں
ہیفے کے سرٹیفکٹ ۶ ماہ تک اور چیک کے سرٹیفکٹ تین سال تک کام دے سکتے ہیں۔

عازمین جج کو چاہئے کہ وہ ابھی سے ہیفے اور چیک کے سرٹیفکٹ تیار رکھیں

نشتیں محفوظ کرائے

جہازوں کی نشتیں محفوظ کی جا رہی ہیں۔ عازمین جج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بلا تاخیر اپنے نام ہمارے یہاں جمع کرائیں
تاکہ بعد میں سعادت جج سے محروم نہ ہونا پڑے، درخواست میں مندرجہ ذیل تفصیلات کا ہونا ضروری ہے:-

- (۱) ہر ایک عازم جج کا پورا نام - (۲) والد یا شوہر کا نام - (۳) عمر - (۴) درخواست بھیجنے والے کا پورا پتہ و شغل
- (۵) کس درجے کا ٹکٹ چاہئے - (۶) کن تاریخوں میں سفر کا ارادہ ہے؟ اگر ساتھ میں بچے ہوں تو ان کا نام و فیرو درج کرانا
- بیمہ نہایت ضروری ہے خواہ وہ شیر خواہی کیوں نہ ہوں جہاز میں جگہ لے کر گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جگہ
ہم ہمارے ہاں درج ہوں گے ان کو ٹکٹ پہلے دئے جائیں گے۔

ٹرنز مارین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

منیجنگ ایجنٹس:-

دی مغل لائن لمیٹڈ، ۱۹، بینک سٹریٹ، فورسٹ، بمبئی

"MOGUL" BOMBAY,

رجسٹرڈ نمبر ۴۶۶ - پبلشرز: سید محمد رفیع
پریس: سید محمد رفیع

6 SEP 1951



ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ

قیمت فی کاپی ۱۰/-

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان

آکھڑ روپیہ (معاملات)

پوسٹل نمبر: ۴۶۶ ڈی. سی. اے. ۱۰۰
پریس: سید محمد رفیع

تصانیف نیاز پختوری

ہندو دلم نزع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

من ویزواں

مذہبی استفسارات و جوابات
کا
مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:- ۱۔ اصحاب کھٹ - معجزہ و کرامت انسان مجبور ہے یا مختار - مذہب و عقل - طوفان نوح - خضر کی حقیقت - مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں - یونس اور دبان بانی حسن یوسف کی داستان - قارون - سامری - علم غیب - دعا تو پر یقین - عالم برنخ - یاجوج ماجوج - ہاروت اوروت - حوض کوثر - امام مہدی - نور محمدی اور پل صراط - آتش نمرود وغیرہ صفحات ۶۲۴ صفحات کا قدسید دبیر قیمت علاوہ محصول پانچ روپے دیکھو

مولانا نیاز پختوری کی ہم سالہ دو تصنیف صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہو اور جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحافت مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند انشاء اور بزرگ خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہو ضخامت ۶۲۴ صفحات مجلد نو روپیہ علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات و تاریخی و دنیاوی حیثیت سے نہایت شیخ ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی ان افسانے اور زیادہ دلکش بنا دیے ہیں۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

نگارستان
جمالستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالے اور دیگر نگار کے افسانوں اور مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن نگار ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا مدد و ترغیب اور پاکیزگی زبان کے اندازہ اس ہو سکتا ہے کہ اس کے مستخدمین بہترین شاہکاروں کے علاوہ ہر ایک غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے ہیں اور ان اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی میں مستند افسانے اور ادبی مقالے نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اور ان میں اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ادب میں نہ تھے۔ اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

دہن طرٹ صلیبی نشان اس بات کی علامت
ہے کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہو گیا

نگار

ادیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۰

حسرت مضامین ستمبر ۱۹۷۷ء

شمار ۳

۱	تلاطحات	۲	مکرار مضمون..... محو عزت من مراد آبادی
۵	ہندی اردو نزاع..... م	۳۵	عقیدہ احمد صدیقی کا آئٹ..... تشکیل المرحوم شکیل
۱۳	غالب اور ٹولک..... چوہدری ٹولکی	۳۸	باب لا متفسار (تعبایہ مومن)
۱۵	فن ڈراما نویسی..... ابراہیم یوسف		منظومات..... شہدائے حق تعالیٰ، تنویر احمد عذیب، انصاف فیضی، دل نواز
۲۳	انسان و انسان اعلیٰ (ڈرامہ برنارڈشا)..... مسعود جاوید	۴۷	اشتہار.....

”نگار“ کا آئندہ سالنامہ حسرت نمبر ہوگا ”نگار“ کے سالانہ چندہ میں اضافہ

بات بالکل طرہ ہے کہ آئندہ سالانہ حسرت نمبر ہوگا لیکن فی الحال یہ بتنا مشکل ہے کہ وہ کس نوعیت کا ہوگا ظاہر ہے کہ اس میں حسرت کے حالات زندگی
اور شاعری پر توجہ ہوگی، ان کے کلام کا انتخاب ہونا ہی ہے، لیکن اس کے علاوہ اور کیا ہوگا، اس کی تفصیل نہ پوچھئے۔
کوشش کی جا رہی ہے کہ عہد حاضر کے تمام اہم فنکاروں اور ادیبوں کے مضامین حاصل کئے جائیں اور ان کے کلام کا ایسا
انتخاب پیش کیا جائے جس سے حسرت کی عزت کوئی کی انفرادیت پوری طرح واضح ہو سکے۔
سالانہ کے حجم کے متعلق ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ کاغذ کی گرانی و کمیابی کا خیال ہماری راہ میں حائل ہوگا
لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم کر لیجئے کہ:

سالانہ حاصل کرنے والوں کو نگار کا چندہ آٹھ روپیہ ادا کرنا پڑے گا اور جن حضرات کا چندہ دسمبر ۱۹۷۷ء
میں ختم نہیں ہوا، سالانہ ان کے نام بھی دو روپیہ چھ آٹھ روپیہ دے دیں گی اور آٹھ روپیہ دے گئے۔

جن صاحب کو دو روپیہ کا اضافہ منظور ہو اور سالانہ حاصل نہ کرنا چاہیں، وہ ازراہ کرم مطلع فرمادیں

پاکستان کے غریب عام قلم ذیل کے پتہ پر سالانہ فرمائیں: شکر منشا، محلہ دھنسی - ۲۱۲ - پیرانی بخش کالونی - کراچی

ملاحظات

پاکستان کا نعرہ جہاد اسلام کی مذہبی اصطلاحات میں سب سے زیادہ گراؤ کن چیز آج کل اصطلاح جہاد ہے، جس کا نام شیعہ ہی جگہ و حرب، فق و خونریزی کا مفہوم ذہن انسانی کے سامنے آجاتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس غلط فہمی کا شکار صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ خود مسلمان بھی ہیں اور انھیں خبر نہیں کہ اس غلط فہمی سے ان کو کتنا نقصان پہنچا اور پہنچے رہا ہے

لفظ جہاد کا مادہ جہد ہے جس کے لغوی معنی سعی و کوشش کے ہیں۔ لیکن جگہ بہ بہت وسیع المعنی لفظ ہے اس لئے اسلام نے اس کے مراد و معنی معرکہ کو رکھے ہیں اس کو ایک ایسے تمدنی اصول کی حیثیت دیدی ہے جس میں جدوجہد (Struggle) کا مفہوم تو اپنی پوری وسعت کے ساتھ پایا جاتا ہے لیکن مسابقت (Competition) سے اس کا کوئی تعلق نہیں (جو تمدن جدید کی بدترین لعنت ہے) تعلیمات اسلام شاہد ہیں کہ اس کا مقصود دنیاوی جاہ و ثروت کا حصول کبھی نہیں رہا بلکہ اس نے صرف تزکیہ نفس، بلندی اخلاق اور علوئے کردار پر زور دیا ہے اور اسی کو ذریعہ نجات قرار دیا ہے خواہ وہ دنیاوی ہو یا اخروی یا دونوں، اسی لئے جہاد اسی عمل کے سلسلہ میں اسلام کی اولین ہدایت ہے کہ اس کی ابتدا احتساب نفس سے ہونا چاہئے، جس کا دوسرا م جہاد بالنفس ہے، یعنی سب سے پہلا جہاد وہ ہے جو خود اپنی ذات سے شروع ہونا چاہئے، اس کے بعد جہاد بالمال ہے یعنی اگر اپنے یا قوم کے اخلاق درست کرنے کے لئے مال صرف کرنے کی ضرورت ہو تو اس سے بھی دریغ نہ کرنا چاہئے، انفرنس جہاد سے مراد جذبہ ایثار و قربانی ہے حق و صداقت کی حمایت کے لئے، اخلاق و روحانیت کی ترویج کے لئے اور اسی کا دوسرا نام دینی یا غی جہاد ہے

اس میں شک نہیں کہ اس جہاد میں جان کی قربانی اور حرب و قتال بھی شامل ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جہاد کے ابتدائی مراحل طے کئے بغیر جن کا تعلق انفرادی و اجتماعی دونوں طرح تزکیہ نفس و اصلاح کردار سے ہے جنگ کی منزل تک پہنچنا ممکن ہے؟ اور اگر ان ابتدائی منازل کو ترک کر کے دفعتاً حرب و قتال کی راہ اختیار کی جائے تو کیا وہ مفید و نتیجہ خیز ہو سکتی ہے

یہ ہے وہ اصولی چیز جس کی روشنی میں پاکستان کے نعرہ جہاد پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کے قیام کو چار سال کا زمانہ گزر گیا اور اس دوران میں ہمیشہ یہی کہا گیا کہ پاکستان ایک اسلامی حکومت ہے اور اسلامی اصول ہی پر اس کی بنیاد قائم کی جائے گی۔ لیکن وہ اسلامی اصول کیا ہیں ان کی مزاحمت و مخالفت تک نہیں ہوئی کیونکہ قسمی سے ابھی تک وہاں کالاشی ٹرینیں ہی مرتب نہیں ہو سکا ہے، لیکن جس حد تک وہاں کے حالات کا علم حاصل ہے، ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کی عام و خاص کسی جماعت میں وہ صحیح اسلامی احساس اب تک پیدا نہیں ہوا ہے، جس کی ابتدا جہاد بالنفس، تزکیہ اخلاق، علوئے کردار اور احتساب ذات سے ہوتی ہے۔ یہ احساس وہاں انفرادی حیثیت سے کہیں پایا جاتا ہے۔ اجتماعی حیثیت سے، رہا تو ہیں حکومت و سوس کا ذکر ہی فضول ہے، کیونکہ وہ اس وقت تک ان مہمات شرعی اور ان مشاغل بود و لعب کا بھی اندازہ نہیں کر سکا، جو اسلام کی سنجیدہ و متین تعلیم کے گہرے سرشتی ہیں اور وہ اپنے دستور کار میں کوئی تبدیلی ایسی پیدا نہیں کر سکا کہ ہم اسے چند سال قبل کی افرنی حکومت سے معیہ کر سکیں

انفرنس جس حد تک صحیح و احیاء اسلام کا تعلق ہے، پاکستان کا نعرہ جہاد (مگر واقعی اس سے مراد حرب و قتال ہے) بے عمل سی بات ہے اور جب تک وہاں کی آبادی جہاد بالنفس اور احتساب نفس کی منزل سے گزر کر اپنے اخلاق میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ کرے، اس کو جہاد بالسیف کا خیال بھی دل میں نہ لانا چاہئے کیونکہ دوسرے دل کو فتح کرنے سے پہلے اپنے نفس کو فتح کرنا ضروری ہے

یہ تو ہماری دینی و مذہبی حیثیت اس سلسلہ کی، اب آئیے دنیاوی مصالح و دائرہ کے نقطہ نظر سے اس پر غور کریں۔ پاکستان کے نعرہ جہاد کا مقصد انفرادی و قومی کے لئے دین و دنیا کا سب سے بڑا کام ہے جو (جیسا کہ مولانا مکتبہ علی خاں کی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے) بلکہ صرف سرزمین شہیدانہ کے تعلق رکھتا ہے۔ مگر اس کی حاکمیت بالحق ظاہر ہے۔ کیونکہ پاکستان اگر تیسرے کے جنگ کرنا چاہتا ہے تو اس کی دینی صورتیں جو سکتی ہیں، یا تو وہ دانت کوڑے کا جہاد نہ قدم اٹھائے گا۔ دانت کا سوال تو فی الحال کوئی پریشانی نہیں ہو، کیونکہ ہندوستان اس پر حملہ کرنے سے براہ راست جارحانہ اقدام سراسر اس کے مخالف ہے ہم سے تو وہ پاکستان کو نظر انداز کر رہا ہے

کھلی ہوئی بات ہے کہ جس جنگ وطن آبادی، فوج، اسلامی اور مذہبی جنگ کا تعلق ہے، ہندوستان و پاکستان میں کوئی نسبت نہیں اور اگر ان دونوں ملکوں کو اس کے سوجھ بوجھ میں پر مقرر رکھتے ہوئے دیکھنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں تو جیتنے پر ہوتا ہے، وہ پاکستان سے بھی پوشیدہ نہیں، اس لئے اگر واحد اس تلخ حقیقت کے پاکستان نے جہاد بلند کر دیا ہے اور اس نعرہ سے اس کی مراد کشمیر یا ہندوستان پر حملہ کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو اپنے سوا کسی اور پر ہیکر و سرکنا بڑگا۔ پھر یہ دیکھو کہ خدا کا تو یہ نہیں سکتا کیونکہ خدا اللہ مسلمان کے درمیان یہ رسم عرصہ ہوا اٹھ چکی ہے، یقیناً خدا کے سوا کسی دوسرے کا بھروسہ ہو گا اور وہ دوسرا تو برطانیہ و امریکہ ہو سکتا ہے یا دوسری مسلم حکومتیں۔ سو آئیے سب سے پہلے مسلم حکومتوں پر ایک نگاہ ڈال لیں۔ افغانستان و پاکستان کے تعلقات پہلے ہی سے خراب ہیں اس لئے اس سے مدد کی توقع تو درکنار ہر وقت یہ اندیشہ رہتا ہے کہ مسلم نہیں وہ کس وقت موقع ملے دیکھ کر خود پاکستان پر حملہ کر دے اور اس کے لئے اس سے بہتر دوسرا موقع کون سا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان میں جنگ چھڑ جائے۔ ایران پر ٹرول کی لڑائی کے سلسلہ میں اس وقت جس ناؤک دوسرے گورہا ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ وہ گئے عراق، حجاز و غیرہ ممالک سے یہ توقع رکھنا کہ فوج، اسلامی اور وہیہ سے پاکستان کی مدد کریں گے خیالی قیام ہے، کیونکہ آجکل خود انکو اپنی لڑائی سنبھالنا مشکل ہے۔ ترکہ کا ذکر فضول ہے کیونکہ اس کی پالیسی میں کفر و اسلام کا کوئی سوال ہی نہیں۔ وہ ہر مسئلہ کو قومی (ترکی) نقطہ نظر سے دیکھتا ہے نہ کہ اسلامی فائزہ نگاہ سے۔ اس لئے اگر پاکستان جنگ کی ہمت کر سکتا ہے تو صرف برطانیہ و امریکہ کے بھروسہ پر اور یہ روش اعتقاد جتنا ناؤکی، بڑا اور خطرناک ہے اس کا اظہار تفصیل حاصل ہے

کھلی ہوئی بات ہے کہ برطانیہ و امریکہ اگر پاکستان سے بھروسہ ہی ہو سکتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ انھیں اسلام یا مسلمانوں کا بڑا خیال ہے بلکہ صرف اس بنا پر کہ اس طرح وہ اپنے سیاسی اغراض پورے کر سکتے ہیں اور وہ غرض صرف یہ ہے کہ اگر کسی وقت روس سے لڑائی چھڑ جائے جس کا ہر وقت امکان ہے تو وہ پاکستان کی سرزمین اور اس کے سمندر میں اپنی بری بحری و فضائی قوت کے مرکز قائم کر سکیں۔ کہا تو یہ جانا ہے کہ پاکستان سے اس قسم کا خفیہ معاہدہ ہو چکا ہے، لیکن اگر یہ غلط ہو تو بھی آخر کار نتیجہ یہی نکلے گا کہ پاکستان کو بغیر چین وچر امریکن ہلاک کے یہ مطالبات پورا کرنا پڑیں گے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر ایسا ہو بھی تو کیا صحیح ہے۔ جب پاکستان تیسری عالمی جنگ میں امریکن ہلاک کا ساتھ دینا طے کر چکا ہے تو ابھی سے یہ وعدہ کر لینا کہ ضرورت کے وقت وہ امریکن ہلاک کا اپنے یہاں قومی مرکز بنانے کی اجازت دیدیگا، کیا بڑا ہے جبکہ اس طرح کشمیر کے حصول میں (غور و بر، ان، اولی و ساطت سے ہوا جنگ کے ذریعہ سے) اس کو آسانی ہو سکتی ہے۔ بغا ہر منطق صحیح معلوم ہوتی ہے، لیکن اس میں دو بہت بڑے مغالطے شامل ہیں۔ ایک یہ کہ امریکن ہلاک کی طرف سے جو امداد پاکستان کو کڑے گی اس کی نوعیت کیا ہوگی اور دوسرے یہ کہ کیا اس رد کے بعد بھی پاکستان اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے گا۔ ظاہر ہے کہ بھروسہ جنگ، امریکن ہلاک اپنی نہیں تو پاکستان بھیجے گا نہیں کیونکہ اس صورت میں ہندوستان اپنے آپ کو کیمپ وٹس ہلاک میں شامل کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور تیسری عالمی جنگ شروع ہو جائے گی جسے امریکن ہلاک فی الحال پھانچا ہوا ہے۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ وہ یہ کرے گا کہ سا اپنی جنگ دیتا رہے، لیکن محض اس قدر مدد سے پاکستان یہ لڑائی نہ جیت سکے گا، کیونکہ صرف ذخائر حربہ کی فراہمی سے کچھ نہیں ہوتا جب تک سپاہ کی تعداد کافی نہ ہو، ذرائع نقل و حمل وافر نہ ہوں، اسلامی سازی کے کارخانے خود ملک کے اندر نہ پائے جائیں، کوئلہ و پٹرول کے ذخائر موجود نہ ہوں اور پاکستان میں ان تمام باتوں کی کمی ہے۔ بھروسہ جنگ یہ ممکن ہے کہ لڑائی صرف ایک ہی محاذ (کشمیر) میں محدود رہے، پاکستان کو کم از کم چار محاذ پر یکساں قوت کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے گا، ایک کشمیر، دو وسط پنجاب، تیسرا مشرقی بنگال اور چوتھا سرحد و جتھا اور اگر اسی زمانہ میں افغانستان نے پاکستان پر فوج کشی کر دی یا قبائل کے بھولے کفر و فساد پر آمادہ کر دیا جس کا قومی اندیشہ ہے تو ایک یا پانچوں محاذوں پر لڑنا پڑے گا اور ان پانچوں محاذوں پر یکساں قوت کے ساتھ وہ کبھی جنگ نہیں کر سکتا۔ مشرقی بنگال اس قدر دھوا تھ ہے اور وہ ممالک میں ہندوستان کا اتنا بڑا علاقہ قابل ہے کہ وہ آسانی سے وہاں لگ بھگ پانچ ہی نہیں سکتا۔ تقریباً ہی حال راہبستان کے محاذ کا ہے کیونکہ یہ سیکڑوں میل کا میدانی کاڈ ہے اور وہ اپنی ہندوستانی فوجوں کو کھٹے پٹھے سے نہیں روکا جا سکتا۔ اب رہ گئے دو محاذ کشمیر اور پنجاب کے ممالک میں سے وہ کسی ایک محاذ پر اپنا عرصہ مکمل سکتا ہے دونوں پر نہیں اور اگر ایک سے تسلیم کریں کہ کشمیر و پنجاب میں کسی ایک جنگ ہندوستان کی فوجوں کو کھپا کر سکتا ہے تو یہی اس کا کوئی نتیجہ ہو گا کہ باقی تمام محاذوں پر اسکو دشمن کی فوجیں پھیلے جہاں پھر پھریں گی۔ یہاں کی کمی، ہندوستان و ہندوستان دونوں جنگ کے تمام بڑے بڑے شہر کھینے ہوئے غیر محفوظ ہیں، لیکن چونکہ پاکستان کو یہ مقابلہ ہندوستان کے زیادہ شہر پر ہوا ہی کرنا پڑے گا اس لئے اس کو زیادہ فضائی قوت سے مزین کرنا پڑے گی اور ہندوستان اس سے نصرت قوت میں کراچی، لاہور، پشاور و دہلی پر

اور ڈھاکہ اگر بیماری کر سکے گا

الغرض جس مذہب دو دفنی ملکوں کے فوجی و اقتصادی توازن کا تعلق ہے، بظاہر پاکستان کا یہ دکھانظر آتا ہے، وہ گئے جذبات سوئکن ہے پاکستان اس ماننا سے زیادہ بڑھا ہوا ہو، لیکن جذبات کی بنا پر قرار نیاں پیش کی جاسکتی ہیں، عائیں دی جاسکتی ہیں، جنگ نہیں جیتی جاسکتی، اس کے لئے خطائیں کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے اور حقیقتوں کو جذبات سے کبھی نہیں مٹایا جاسکتا

اس سلسلہ میں گفتگو کا ایک اور پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ دو عین ہفتہ لڑائی جاری رہنے کے بعد سکورٹی کونسل دسی قدم یہاں بھی اٹھانے لگی جو اس نے کوریا میں اٹھایا ہے، لیکن اگر پاکستان نے یہ خیال قائم کیا ہے تو اس کی غلط فہمی ہے اور اگر اس کو اس بات کا یقین دلایا گیا ہے تو یکسر کر و فریب ہے۔ کیونکہ اول تو ہندوستان کبھی کوئی جارحانہ اقدام کرے گا نہیں جس کی بنا پر اسے حملہ آور قرار دیکر سکورٹی کونسل کو اس کے خلاف قدم اٹھانے کا بہانہ ملے (خفا عسکر ایسی صورت میں جبکہ ہندوستان خود پاکستان کو کشمیر میں حملہ آور کر چکا ہے اور کشمیر میں امریکی فوج کی ناکامی سب پر واضح ہو چکی ہے) اور اگر امریکن ہلاک نے کسی نہ کسی پہلو سے سکورٹی کونسل میں اس مسئلہ کو اٹھایا بھی تو کثرت رائے اس کے خلاف ہو گئی، اقوام عالم کبھی اس بات پر راضی نہ ہوں گی کہ ہندوستان کے خلاف قدم اٹھا کر دنیا کو تیسری عالمگیر جنگ میں مبتلا کیا جائے

بعض کا خیال ہے کہ پاکستان کا ضرور جہاد صورت اس کی دھونس (Bulldozing) ہے یا پھر تو زیادہ لیاقت علی خاں نے یہ سب کچھ اسلئے کیا ہے کہ ان کے خلاف جہادیشیاں وہاں قائم ہو رہی ہیں ان کے خیال کو اندرونی سیاست سے ہٹا کر بیرونی سیاست کی طرف مبذول کر دیا جائے اور حکومت ان اعمدہ کی خطروں سے محفوظ ہو جائے۔ اگر یہ صحیح ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ ان دونوں کا یہ عمل بہت خراب ہو گا اور جہاد کی تباہی پوری نہ ہونے کے بعد خود حکومت کو سبک کے جوش کا درد بننا پڑے گا اور نوابزادہ لیاقت علی خاں کی فوجین اور زیادہ نازک ہو جائے گی

بہر حال پاکستان کا ضرور جہاد عقل و مزہب تو بر و سیاست کسی نقطہ نظر سے بھی قابل تحسین نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ اس سلسلہ میں جو متعلقہ قوتیں وہاں کے بعض اخباروں نے شائع کئے ہیں یا جو تقریریں وہاں کے بعض ذمہ دار حضرات نے کی ہیں، وہ نصرت یہ کہ افسوسناک ہیں بلکہ پاکستان کے احساس کمتری کو بھی ظاہر کرتی ہیں

دوستی کی طرح لڑائی کی بھی ایک تہذیب ہوتی ہے اور کسی قوم کا اس تہذیب سے ہٹ کر صورت ملکا، کھوٹ، یا گالی گلوچ پر اتر آنا صدمہ ہے سنجیدگی و ممانعت کے خلاف ہے۔ لڑائی سے زیادہ سنجیدہ حقیقت کوئی نہیں اور جو قومیں اس میں چھپو رہے ہیں سے کام لیتی ہیں وہ اگر کامیاب بھی ہو جائیں تو انہیں کبھی احترام و عزت کے ساتھ نہیں دیکھا جائے گا۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ "جنگ کی حالت میں بھی اپنے دشمن کے ساتھ اس طرح پیش آؤ کہ اگر کل وہ تمھارا دوست ہو جائے تو تمھیں اس سے شرمندہ نہ ہونا پڑے" اور یہاں تو ابھی جنگ بھی شروع نہیں ہوئی

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہی مسلمان جس کو اقبال نے عقاب و شاہین بننے کی تعلیم دی تھی آج "زارع و زغن" کی طرح شور مچا رہا ہے اور اس وقار و مردانہ باری کو بالکل کھو بیٹھا ہے جو مسلمان کی پیشہ خصوصیت فاعلہ رہی ہے

کشمیر کا مسئلہ اس میں شک نہیں بہت نازک و پیچیدہ ہے، لیکن یہ خیال کرنا کہ اسے لڑائی سے حل کیا جاسکتا ہے، اتنی بڑی غلطی ہے کہ اسے خود کشی کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا

تقسیم ہند کے بعد جو نظام انصافیت پر جوئے اس کے تصور سے بھی مدللے کھوٹ ہو جاتے ہیں، لیکن یقین کیجئے کہ جنگ کے بعد یہ نظام اس سے بڑھ کر شرف کے ساتھ رہنا ہو گا۔ آپ ان ہوتا کہ مناظر کا اندازہ کر لیں کہ جس سے وہاں جانیں و دلوں ملکوں کو دو چار ہو گا۔ پھر یہاں کی عقلندی سے کچھ کشمیر کے لئے جس کی آبادی ایک کروڑ بھی نہیں، ہم کرور انسانوں کو مصالحت میں مبتلا کیا جائے گا، شہر کے شہر ویران کر دئے جائیں۔

یہ مسئلہ جس طرح ممکن ہو آپس میں ہمدردی و مصلحت و اخلاقی کے ساتھ حل ہو سکا ہے اس کے لئے ہر طرح کی ہمدردی ہے کہ دونوں ملکوں کے اکابر و شخصیت کے ساتھ جہاد پر اہل ضرور اور نوابزادہ لیاقت علی خاں، برابر ایک دوسرے سے ملنے اور اپنے عدلیان مقامات کی دیوار عائلہ کو پی، کیونکہ یہی اصل حقیقت پاکستان و پاکستان کوئی کرہ ہونا ہے اور اتحاد ہی میں دونوں کی نجات ہے

ہندی اردو نزاع

ہندوستان کے لسانی مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی زمانہ میں سارے ہندوستان کی زبان ایک نہ تھی۔ یوں تو کچھ زبانوں نے کثرت میں وحدت کا کام کیا تھا اور ہندوستان کے بڑے حصے کی واحد اپنی زبان بن گئی تھیں۔ مگر ساتھ ہی دوسری مقامی زبانوں کا ارتقا بھی ہوتا رہا تھا اور جب راج الوقت زبانیں ہندوؤں اور دودھاؤں کی ملکیت بن کر رہ گئیں اور جنتا سے اپنا ناتا توڑ لیا تو انہی مقامی زبانوں نے عوام کا سہارا لیکر فروغ پایا۔ پہلے سنسکرت نے راج کٹ پہنا اور بہت دنوں تک اسکی چمک تک سے دوسری زبانیں ماند رہیں، مگر رفتہ رفتہ جب یہ ”آکاش ہانی“ بن گئی تو دھرتی والوں نے بھی اس سے اپنا ناتا توڑ لیا۔ اور پھر دودھ دھرم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ پالی کو فروغ حاصل ہوا، اور اس کے پوتر بولی ہندوستان کے باہر تک سنائی دینے لگے، مگر اس کے پیر بھی میدان سے بہت جلد اٹھ گئے اور پھر شورسینی پراکرت اور شورسینی آپ بھرنش نے سر اٹھایا اور سنسکرت کے لگ بھگ دو آبی کی شورسینی آپ بھرنش ایک طرح سے سارے شمالی ہندوستان کی زبان بن گئی۔ اخیر میں یہ آپ بھرنش بھی کتابوں میں بند ہو کر رہ گئی۔ اور اس کی شاخوں میں برج بھاشا اور کھڑی بولی وغیرہ فروغ پایا۔ آج برج بھاشا نے دم توڑ دیا ہے اور کھڑی بولی کی دو شاخیں اردو اور ہندی ہندوستان گیر ہونے کا دعویٰ کر رہی ہیں

اب یہ دہرانے کی ضرورت تو نہیں معلوم ہوتی کہ اردو کیسی زبان نہیں ہے اور ہر فہم دلت نے اس کی آبیاری اپنے خون جگر سے کی ہے نافع اور مفتوح کے اختلاط نے جہاں ایک نے کچھ کو جنم دیا، وہاں ایک نئی زبان کا وجود میں آنا ضروری تھا۔ یہ نئی زبان اردو تھی اس کے نئے بن کی نشانی اس کا فارسی رسم الخط اور فارسی و عربی الفاظ کا اضافہ تھا، رفتہ رفتہ یہ زبان ہر طبقہ میں مقبول ہوتی گئی اور ہر شخص نے بلا تفریق و مذہب و ملت اس کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا اور اس طرح یہ زبان ہندوستان کے ایک بڑے حصے کی زبان بن گئی۔ اور بقول ڈاکٹر ارا چند یہ اٹھارویں صدی میں ہندو اور مسلمان دونوں اردو کو اپنی مشترک زبان سمجھنے لگے تھے۔ مگر برہمنی سے آدھ کے سر سے یہ ”مشترک“ سماج بہت جلد ہی ترک کیا اٹھارویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے اوائل ہی میں ایک نئی زبان ہندی کے نام سے جنم لینا شروع کرتی ہے۔ اس زبان کا ڈھانچہ بھی کھڑی بولی کا ہے۔ مگر کھڑی کی یہ جدید شکل خالص سنسکرت (تتسم) سے مدد لیتی ہے اور نہ صرف پراکرت، کول اور ڈاؤنڈی زبانوں کے ان الفاظ کو خالص کر رہی ہے جو عام فہم ہیں بلکہ سنسکرت کے ان الفاظ کو بھی قبول کرتی ہے جو لسانی تہذیبوں کے تحت اپنی شکل بدل چکے ہیں اور انہیں سے اردو ہندی کشمکش کی ابتدا ہوتی ہے۔

عام طور پر اس جھگڑے کی ابتدا فریڈرک ڈیلم کی سے کی جاتی ہے اور ایک مذہب سے صحیح بھی ہے مگر اس کے علاوہ دوسرے محرکات بھی ہیں جو اس سلسلے میں محدود معاون ثابت ہوئے۔

اگر ہم خود کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں کہ اگر ڈاکٹر ٹنگر اسٹ ایک نئی زبان کو جو دینے نہ لائے تو بھی ایک زبان ضرور پیدا ہوتی جو قیماً اردو سے بہت مختلف ہوتی۔ یہ ممکن ہے اگر فریڈرک ڈیلم کی کی پشت پناہی نہ ہوتی تو یہ زبان بہت دیر میں فروغ پاتی مگر ایک مختلف زبان کا وجود میں آنا ضروری تھا، خواہ اختلاف رسم الخط ہی کی شکل میں تھا۔ اس اختلاف کی بنیاد فرقہ وارانہ جذبات ہی ہوتے جو اگر مزید ملکی حکومت علی کے تحت بہت جلد بھڑک اٹھے تھے۔

ایک عام بات ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم پر غلبہ پاتی ہے تو مفتوح قوم کا ایک طبقہ حاکم قوم کی ریس کر لے لیتا ہے، مگر ساتھ ہی محکوم قوم کا ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے جو بالکل متاثر نہیں ہوتا ہے اور جب قومی شعور بیدار ہوتا ہے تو وہ لوگ بھی جو ثقافتی کرتے ہیں اس سے متغیر ہونے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ قومی شعور افاقہ پانے لگتے ہیں۔ مسلمانوں کے طبقے کے زمانے میں بھی یہی ہوا حتیٰ کہ آکر کے زمانہ میں بھی جس نے ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کر کے غلوں سے کی تھی۔ جہاں ہندوؤں کا ایک طبقہ اس کا ہم خیال تھا، وہاں جتوؤں کے رانا کے روپ میں ایک طبقہ اس کا مخالف بھی تھا ساتھ ہی فاتح قوم میں ایک طرح کا احساس برتری بھی ہوتا ہے۔ اور محکوم قوم جب حاکموں کے آداب اختیار کرنے لگتی ہے تو حاکموں کو ناگوار گزرتا ہے وہ کسی طرح یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے غلام کسی طور ان کی بڑائی کی کوشش کریں، اسی لئے جب آکر نے عبدالرحیم خاں خاں کی ہفت ہزاری منصب عطا اور اس کے فوراً بعد ان کو بھی یہی منصب عطا کیا تو مسلمان امیروں کو بڑا ناگوار گزرا اور یہی وہ جذبہ تھا جس کی وجہ سے مسلمان آکر کی ہندو مسلم رواداری کی کوششوں کو سراہ نہ سکے۔ بدایونی قوس سے آکر کو مرتد ہی مگر دھنسا ہے اور یہ آکر کا رد عمل تھا۔ جو اورنگ زیب کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ اورنگ زیب کی اسلامی پالیسی سے خوش ہو کر لوگ اسے ”زور پیر“ ہی کیوں دیکھتے تھے مگر ہندوستان جیسے غلوں ملک کے لئے اس کی پالیسی بالکل مناسب نہ تھی۔ اس کے رد عمل کے طور پر ”ہندو قومیت“ نے جنم لینا شروع کیا، جس کا اظہار ”جائوں، سکھوں، راجپوتوں اور مرہٹوں کی بغاوت کی شکل میں ہوتا ہے اور بقول ڈاکٹر عہد الحق ”شیوا جی کے زمانہ ہی میں مرہٹوں سے فارسی الفاظ کا اخراج شروع ہو گیا تھا۔“ یہ رجحان اسی رد عمل کا مظہر ہے۔

اس نئی زبان کے وجود میں آنے کے بعد میں فورٹ ولیم کالج کے قبل کے فنی نمونے، آسانی پیش کئے جاسکتے ہیں۔ آکر ہی کے عہد میں ”گنگا کوئی نے شہادہ میں“ چند چند برتن کی ہیمہ“ کھڑی بولی ہندی میں لکھی، اس کا رسم الخط دیوناگری ہی تھا۔ جٹ مل نے ”گورابول کی کتھا“ ۱۶۸۰ میں تصنیف کی اور سدا سکھ کی ”سکھ ساگر“ اور انشاوار اللہ خاں کی ”رائی کیتل“ فورٹ ولیم سے کچھ ہی قبل لکھی گئی ہیں۔ اردو داولوں نے رانی کیتل کو نہیں اپنایا (حالانکہ یہ فارسی رسم الخط میں لکھی گئی تھی) اس سے بخوبی یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اردو زبان میں کیوں وجود میں آئی؟ اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ جس وقت مسلم شعرا اپنی ریختہ پر فارسی کی آج چڑھا رہے تھے اس وقت غیر مسلموں میں برج بھاشا کا بول بالا تھا۔ رنتر کا رواج تو وہاں ہی تھا ساری ادبی سرگرمی شاعری پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ ہوں تو کھڑی بولی کے اثرات تاہم، آکر اور تانک کے علاوہ اس دور کے بہت سے شعرا میں مل جاتے ہیں۔ مگر ان اثرات کی بنا پر ہم ان کا ناموں کو اردو ادب میں شامل نہیں کر سکتے اس لئے اردو کے دور اول کے شعرا میں ہمیں کوئی غیر مسلم شاعر نہیں ملتا۔ اور یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ ریختہ کے مقابلہ میں ہندوؤں نے برج بھاشا ہی کو اختیار کیا، یہ بہت بعد کی بات ہے جب اس میں چلبست اور سرور جہاں آبادی پیدا ہوئے۔

اس کے علاوہ ہندوستان کے غیر مسلم باشندے سنسکرت کی محبت کو اپنے دل سے کبھی نہ نکال سکے، گو یہ زبان ایک خاص دور کے علاوہ ہندوستان کے کسی حصے میں کبھی مروج نہ رہی، مگر چونکہ ان کے دور میں کی یادگار تھی، یہ ان کا قومی سراہ تھا، اس میں ان کا ذہن تھا دیشیوں اور پنجبوں کے پوتروں کے لئے اس لئے یہ زبان ہمیشہ ان کے لئے شاعرانہ بہ بہانی رہی، ساتھ ہی سنسکرت زبان کا ادب بھی اعلیٰ درجہ کا تھا۔ اس کے تراجم مختلف زبانوں میں ہوتے رہے ہیں اور اس کی مقبولیت کا ثبوت ہیں، اتنے ترقی یافتہ اور االاال زبان و ادب کو بھلا دینا تقریباً ناممکن تھا، مسلمانوں نے اپنی فارسی طاقی کے آگے اس کو منہ نہ لگایا مگر یہاں کے باشندے اس سے کس طرح انحراف کر سکتے تھے۔ یہ سنسکرتی رجحان ہمیشہ دلیں میں موجود رہا اور جب کبھی موقع ملا تو بروہہ کا راز آیا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں۔ ”مغلوں کے دوران قیام آکر میں ہندوستانی زبان میں ایک نئے رجحان کا اضافہ ہوا ہے جسے ہم ”سنسکرتیت“ کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ امر کہ او آپ پورٹ کی سب سے بڑی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں سنسکرتیت سے عام انحراف تھا ہے اس کے برخلاف جدید گدڑائی زبان میں جب انھیں شاعرانہ اختیار کرتی ہیں تو انھیں خواہ مخواہ سنسکرت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ چنانچہ کئی ادبیات میں سنسکرت کے الفاظ تو ضرور ذکر و تکرار کی شکل میں ملتے ہیں۔ پریم (پریم)، ہریت (ہریت)، دیشی (دیشی)۔۔۔۔۔ لیکن چونکہ سانی تہذیبیاتی نہایت چمکے چمکے تھے اس لئے

سنسکرتیت کے بڑھتے ہوئے رجحان سے مسلمانوں کو بھی مغرور تھا، اس کی شہادت ہمیں قدیم وکٹی ادب سے ملتی ہے جہاں سنسکرت کے بے شمار الفاظ بلا تکلف نظم و نثر میں ملتے ہیں مثلاً میگھ، دوت، چرن، چنٹا، دپن و دشن وغیرہ۔۔۔۔۔ اکبر جامہ کو سرت لگاتی کہتا ہے، برقع کو چتر گیت، جوئے کو چرن دہرن اور موبان کو کس کہیں، اسی رجحان کا اظہار محلات شاہی اور ہاتھیوں کے نام سے بھی ہوتا ہے قدیم اردو کا بھی (ہاتھی) آکر وہ جاکر سنسکرت کا گج ہو جاتا ہے اور محل کے بجائے شاہی محلات کے لئے بھون کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور آج بھی جب ایک صوبیت نکلتی ہے تو سنسکرت کے احیاء کی کوششیں بڑے حدود سے ہوتی ہیں۔

اس کے برخلاف مسلمانوں کے دلوں پر فارسی اپنا دھاک دھاکٹھائے ہوئے تھی۔ جہاں اس کے جلو میں ایک اعلیٰ ادب تھا وہاں یہ ہندوستان کی سرکاری زبان کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان بھی تھی۔ اس کے علاوہ اردو کی پیدائش اور نشوونما فارسی کی مرہون محنت تھی۔ شیخ سعدی و گلشن نے وہی کوہی مشورہ دیا تھا کہ جو کچھ فارسی کے دیوانوں میں بندھ چکا ہے اس کو ریختہ میں منتقل کر دو۔ اور ریختہ کے دہد اہل کے بھی فنکاروں نے تقریباً یہی کیا ہے۔ شروع میں تو کھڑی بولی کے اثرات باقی رہے۔ مگر چونکہ سب فن کار فارسی میں مہارت مامہ رکھتے تھے لہذا ان کے ہاتھوں یہ خام زبان فارسی زیادہ اور ہندوستانی کم رہ گئی، انھوں نے شیراز کے انگریز کھلائے اور نئے ارغوان کا چسکا لگایا بلبل ہزار داستان کے چھپے سنائے، کوہ الوند و بے ستون و تختہ گلاب کی سیر کرائی، دجلہ و فرات سیبوں و جہیوں میں غسل دیا اور اس کو فارسی لباس (رسم الخط) سے مزین کیا۔ اور اردو زبان بالکل فارسی اثرات کے تحت آگئی، اور آج بھی یہ حقیقت ہے کہ غیر فارسی کی خاصی قابلیت اور عربی کی عاقبتیت کے کوئی انسان اردو دانی کا دعویٰ نہیں کر سکتا، لہذا بقول اقبال وراثت مہنگامی۔

”قیاس یہی کہتا ہے کہ جب اردو کا جنم ہی ان خصوصی نوعیت کے ساتھ ہوا تھا تو پھر اس نوعیت کا بتدریج ترقی پانا اور اس ترقی کے اعتبار سے ایک بالکل جدا گانہ زبان کا بننے جانا کوئی ان ہولی سی بات نہ تھی؟“

یہ تو وہ اثرات تھے جو غیر شعوری طور پر اپنا کام کر رہے تھے اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی اصلاحیہ کاسلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جب آہستہ آہستہ اجنبی ہاتھوں کا اگر انبار ستم بڑھتا گیا تو ہندوستانیوں نے اپنے اس تنزل اور ان کی اس ترقی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اور انھیں اس بات کا بہت چلا کہ اجنبیوں کے اس غلبے کی وجہ ان کا بالیدہ قومی شعور ہے۔ اس وقت ساری دنیا پر "Hinduism" کا جادو چل چکا تھا۔ لہذا محکموں نے بھی قومیت کا سہارا ڈھونڈھا اور چونکہ ہندوستان میں قومیت کے احیاء کا مطلب مذہب کا احیاء تھا لہذا مذہب کی اصلاح پر خاص طور پر زور دیا گیا، اور یہ ضروری ہو گیا کہ ہندو اور مسلمان الگ الگ اپنی قومیت کی تعمیر کریں، اس کے علاوہ معاشرتی اصلاح کے میدان میں بھی مسلمان اور ہندو الگ الگ ہی رہے۔ کیونکہ ہندو مذہب کے اصول و فرائض کے معاشرتی مسائل بھی الگ الگ تھے اور پیروں دیکھتے ہی کہ مسلمانوں کا ایک خاص گروہ میدان میں آتا ہے جس میں راجہ رام موہن رائے کیشب چندر سہن، راج نرائن بوس، ہرس کرچی، رام گوپال کھوش اور رانا ڈے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ساتھ ہی دیناند سرسوتی (۱۸۸۳ - ۱۸۲۲) کی قیادت میں آریہ سماج کی بنیاد پڑتی ہے۔ یہ تحریک بڑی ہی فرقر پرست تحریک تھی۔ اس کا اصول ہی تھا "Hinduism" "ہندو مت" سے اس تحریک سے ہندوستان کو "قومی" معاشرتی اور مذہبی طور پر متحد کرنے کا جو اصول سوچا وہ بڑا ہی خطرناک تھا۔ یہ اصول شدھی کی تحریک تھا (یعنی غیر ہندوؤں کو ہندو بنانا)۔ شومئی قسمت سے اس تحریک نے سب سے زیادہ اسلام پر حملے کیے اور مسلمانوں نے بھی "توحید کے تحفظ" کے لئے بڑی بڑی باغیہاں دکھلائیں، پھر کیا تھا ہر طرف مناظر ہوئے لگے اور ان میں مباحثہ نے فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے میں بڑی مدد کی اور اس کی وجہ سے سیاسی اختلافات کو بھی کافی تقویت پہنچی، اور فرقہ وارانہ قومیت اور مسلم قومیت نے اپنا راستہ بالکل الگ کر لیا، اور اس موقع پر سید احمد شام حسین کی رائے قابل غور ہے کہ تقابلی مہینوں صدی میں جب ہی قومیت نے جنم لیا اور اسے ایک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی تو حالات اتنے بدل چکے تھے کہ اس نے برج بھاشا کیس اور ہندی کی کوئی بنیاد نہیں بنایا، بلکہ کھری بولی کو ہی اپنی اصل ہندی کی بنیاد قرار دیا۔

انسانی اختلافات کو مزید تقویت پہنچانے میں ہماری سفید قام آکا بھی پیش رہے ہیں۔ یہاں کے حالات کا سہارا لیکر وہ اپنے "سلسلہء سہ ماہی" کے دسے مسلک کو پورے طور پر بروئے کار لانے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد سے قبل ہی انھوں نے اختراق کی صورت میں پیدا کر دی تھیں، لٹریچر میں لارڈ وائٹسٹون نے کلکتہ میں دوسرے عالمیہ قائم کیا، جس میں عربی و فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی اور اسی زبان کی کتابیں شائع کی جاتی تھیں، سلسلہء میں ریڈیڈنٹ جو تھکن نے بنارس میں سنسکرت کالج کی بنیاد قائم کی، جہاں سنسکرت کی سرپرستی کی گئی۔ اس طرح انھوں نے شروع ہی سے یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانیں بھی دو ہیں اور ان کے سرچشمے بھی دو ہیں، اور پھر سلسلہء میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد کے بعد یہ اختلافات ایک باقاعدہ شکل میں رونما ہوتے ہیں اور نئی ہندی آہستہ آہستہ بننے لگتی ہے۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اس دور میں اردو نے اپنی لکھی لکھن کا خیر مقدم کیا، اس کا ثبوت اردو کے دورِ مصیقت سے بھی ملتا ہے ۱۸۳۷ء کے لگ بھگ اندو سے ایک ہفتہ دار اخبار "انوار اخبار" کے نام سے خلیج ہوتا ہے۔ قاضی عبدالغفار صاحب کے مطابق "یہ پہلا پرچہ تھا جس میں ناگری اور اردو زبانیں مشترک کی گئیں"۔ سید ابوالصم صاحب اردو مصیقت نگاری کے تیسرے دور (۱۸۶۶-۷۷) کی ایک خصوصیت یہ بتلاتے ہیں کہ اکثر اردو اخباروں کے ہندی آڈیشن اور ہندی اخباروں کے اردو آڈیشن لکھتے تھے وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ راجہ بھرت پور کی سرپرستی میں ایک اخبار "مظہر السور" نکلتا تھا جس میں دونوں رسم الخط جگہ پاتے تھے، گارساں داسی اپنے چودھویں خط (۱۸۶۴) میں اودھ اخبار کے متعلق لکھتا ہے: "اس کی ادارت شیو پرشاد کرتے ہیں۔۔۔ بعض مضامین دیناگری رسم الخط میں ہیں۔ تقریباً اسی زمانہ میں اردو ہندی جھگڑے کی باضابطہ ابتدا ہوتی ہے۔ قاضی عبدالغفار صاحب کے الفاظ میں سلسلہء میں پری سے ہندی کا پہلا اخبار ہفتہ وار "برہمن پتر" جاری ہوا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نئی زبان سن و شور کو پہنچ رہی تھی اور اس قابل ہوتی جا رہی تھی کہ اردو کے مقابل میں کھڑی کی جا سکے۔

تقریباً اسی زمانہ میں بنگال میں بنگلہ علاقوں کی زبان "فارو" دیر گئی اس واقعہ سے شمالی مغربی اضلاع والے بھی متاثر ہوئے اور ان کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ ہندی ناگری رسم الخط میں علاقوں کی زبان ہو۔ اور اس طرح اردو ہندی کا جھگڑا مزید زور پکڑتا ہے۔ ڈاکٹر ابوالکلیث صدیقی کا خیال ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق اخباروں میں بحث کی ابتدا گورنمنٹ کی اس تجویز سے ہوتی ہے کہ ہندوستان کی علاقوں میں کوئی زبان اور کن حروف میں رواج پانے کی مستحق ہے۔ اس زمانہ کی مختلف تصنیفات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ چلتا ہے کہ پہلی باضابطہ کوشش سلسلہء سے شروع ہوئی ہے جس کا ذکر مولانا حالی نے "حیات جاوید" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "..... سلسلہء میں بنارس کے بعض سربراہان ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عہدالتوں سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے ہماشا زبان جاری ہو جو دیناگری میں لکھی جائے، غرض کہ ہندوؤں کی ایک قومی مجلس میں جو اس وقت بدھتھ کرپن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم تھی، اس بات کی جیور جیڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جا بجا اس کے لکھنیاں اور سہائیں مختلف ناموں سے قائم کی گئیں۔۔۔۔۔ یہاں یہ فکریں ہو رہی تھیں کہ ان ہی دونوں اعلیٰ گورنر بنگال بھاگپور کی سائنٹفک سوسائٹی میں آئے اور سوسائٹی کی طرح سے ان کو ایڈریس ایسی اردو میں دیا گیا جس میں عبارت ان کی غرض سے عربی اور فارسی کے الفاظ اکثریت سے داخل کیے گئے تھے اور اس کا سمجھنا ایک ایسے حاکم کے لئے مشکل تھا جس پر باہو اس وقت نہ تھا۔ بہار کے تعلیم یافتہ پہلے ہی سے تحریک کر رہے تھے کہ جس طرح بنگال میں بنگلہ زبان اور بنگلہ خط علاقوں میں جاری ہو گیا ہے۔ اسی طرح صوبہ بہار میں بہاری زبان اور بہاری حروف جاری کیے جائیں۔ چونکہ پڑاؤ ایڈریس کے بہت ہی کم علاقے تھے انھوں نے کہا کہ جس زبان میں پڑاؤ نہیں پڑتا ہے یہ ہرگز نئی زبان نہیں ہے۔ اور یہی بہاری زبان ہے۔ اور یہی بہاری نہیں ہو سکتی ہے۔ پڑاؤ انھوں نے چند روز کے بعد حکم دیا کہ بہار کی تمام علاقوں میں کتنی حروف اور زبان لکھی جاتی ہیں۔ اس واقعہ

شمال مغرب کے ہندوؤں کا حوصلہ بڑھا اور ان کی کوششیں زیادہ جیڑی سے ہونے لگیں۔۔۔۔۔ ۱۸۸۵ء میں جبکہ سرسید وائسرائے کی پبلسٹیو کو سنل میں سرسید کے ایک کٹھن کی پیش میں ہندوؤں کو اردو کی مخالفت کا موقع چھڑا۔ اور اس واقعہ پہلے سے بھی زیادہ زور شور کے ساتھ شمال مغربی اضلاع اور پنجاب کے ہندوؤں نے اردو زبان اور فارسی خط کی مخالفت شروع کی۔ دونوں صوبوں میں یہ بے شمار انجمنوں اور جماعتوں کی طرف سے ہونے لگی۔ چنانچہ سرسید کے بعض مسلمان دوستوں نے پنجاب میں انجمن حمایت اردو قائم کی اور میچوویل اور ٹھٹھکیش میں بھی اس کے بعد مارچ ۱۸۹۵ء کو حضور سرانٹونی میکڈانلڈ لکچر ڈونر اضلاع شمال و مغرب داودہ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے معزز اور سربراہان اردو ہندوؤں نے پھر ایک میچوویل اس غرض سے گزرا تا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہروں میں بجائے اردو زبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کی جائے۔ اسوقت کے سارے اخباروں میں اس مسئلے متعلق بڑی گراگرم نہیں چھڑی ہوئی تھیں۔ میرٹھ کے اخبار جلوہ طوم میں "جس کی لکھی اس کی بھینس" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں لکھا گیا تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اس لئے وہ جب خواہش تھیں ان کی زبان میں لکھنا اور اس کے وارث علی نے علی گڑھ اخبار میں پرچوش مقالہ سہر قلم کیا تھا اور یہ ثابت کیا تھا کہ دراصل اردو ہی اہل ہند کی زبان ہے۔ مشہور مستشرق ڈاکٹر سال دی تاسی اپنے ۱۸۹۵ء کے خطبے میں اس مسئلہ پر پوری وضاحت سے روشنی ڈالتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ "میں اب بھی ہندی کے مقابلے میں اردو کی حمایت کرتا ہوں اگرچہ میں اول الذکر کی اہمیت اور افادیت سے منکر نہیں۔ خوش قسمتی سے اہم شخصیتوں نے اس بحث پر میری تائید کی ہے۔ لکچر کرنل جے چیمبرس پر فیروزہ ہندوستانی جامعہ آکسفورڈ کا ایک خط میرے پیش نظر ہے۔ جسے میں نقل کرتا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ آپ اور بہت سے نامور ہندوستانی حضرات جدید ہندی کے مقابلے میں اردو کے رواج کے حامی ہیں۔ ہندی مجھے بالکل پسند نہیں۔ سائنسکرت ترکیبیں ہندوستان کے کسی ایسے حصہ میں رائج نہیں جہاں میں ۶۲ - ۱۸۳۴ء تک مقیم رہا۔۔۔۔۔ دیوناگری رسم الخط اس میں کوئی شک نہیں کہ سنسکرت اور ٹھٹھکیش ہندی کے لئے اچھی طرح موزوں ہے لیکن اپنی الفاظ کو تحریر کرنے کے لئے بہت ناقص ہے۔ کیونکہ اس رسم الخط میں دوسرے حروف کو ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ المختصر میں یہ سمجھتا ہوں کہ فارسی رسم حروف ہندوستان میں عام استعمال کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ ہندوستانی سپاہی انھیں فارسی حروف کو استعمال کرتے ہیں اور اگر نہیں کر سکتے تو دیوناگری نہیں بلکہ کتھی کو استعمال کرتے ہیں اگر ننگالی ہوں تو جہاجی کو اور پنجابی ہو تو گورکھی کو۔ اگر وہ فارسی رسم الخط استعمال نہیں کر سکتے تو اس رسم الخط کو استعمال کرتے ہیں جو ان کے مفاد کے مطابق ہو۔ ہمیں یہ بھولنا چاہئے کہ آریہ ہندوستانی ایک ہی ہے۔ آخر الذکر نام یوروپوں کا ایجاد ہے۔ ننگال میگزین بابت جنوری ۱۸۹۵ء میں اردو کے متعلق بہت سی روایات عبارتیں شائع ہوئی ہیں۔ اس مضمون میں اردو کے لکھان گرام مصنف نے جہاں اردو کا ذکر کیا ہے۔ اس سے وہ شاعرانہ زبان مراد لی ہے جو زیادہ تر ریختہ لکھاتی ہے جو ہندوستان کے کسی حصے میں رائج نہیں۔۔۔۔۔ اچھے دلائل نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ان دلائل پر بھی حجت کی ہے جو اس کے ہم خیال نہیں ہیں اور اسی طرح حروف آریہ جن میں دیوناگری میں نہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کتھی کے جملوں کو سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے جو ہندی الاصل نہیں۔ مگر ہندوستان کے زبان کا جو ملائیٹک رہا ہے، بہت سے ہندوؤں کی خواہش ہے کہ انھیں متروک کر دیا جائے۔ چنانچہ ان میں ایک نے ہندوستان کے تعلیم نصاب کو خط لکھا ہے کہ ہندو عربی و فارسی الفاظ نہیں سمجھ سکتے۔ اور اپنے دعویٰ کی دلیل کے طور پر اس نے انھیں اس فرض کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔ جس کا مطلب اس نے ایک ہندو اسکول اسٹریٹ لکھا تھا جس کے استاد نے ایک ہی جملہ انتہا اور بے ہنر لکھا ہے۔ "جنگلی گیتے" کے قلم کار نے ایک گھوڑے سے گڑ گڑاتا، اسکول اسٹریٹ لکھا تھا اس نے بہت خیال ہندو طبقوں کی طرف سے

اور علاوہ اس کے ہندی نہایت ہی پرانے زبان ہے۔ جس وقت سرکار نے یہ حکم دیا کہ اردو زبان سرکاری کاموں میں مستعمل ہو تو اس وقت ہم نے تصور کیا تھا کہ رفتہ رفتہ ہماری ہندی زبان بھی ساتھ ہندی حروف کے جاری ہو جائے گی اور جس طرح کہ فارسی زبان اٹھادی گئی ہے حروف بھی باقی نہ رہیں گے۔ لیکن اب جو ہم دیکھتے ہیں کہ جا بجا یہ تجویزیں ہو رہی ہیں کہ اردو کی جو نو روٹی قلم ہو اور یہی زبان اودھی وضع تحریر بالعموم جاری کیا جاوے تو ہم کو نہایت افسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کے حق میں لوگ کیا کر رہے ہیں اور کیا لوگوں کو کسی کی حق تلفی کرنے میں ترس نہیں آتا اور اس پر بھی افسوس کرنا چاہئے کہ بیشتر ہندو اس کی ترقی کو روک کر اردو کی ترقی پر دل لگاتے ہیں۔

اوپر کے دونوں اقتباسات پڑھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں مضمون نگار حضرات علم السنہ سے قطعی نااہل ہیں۔ ان دونوں مضامین میں سطحی جذباتیت ہے اور فرقہ واریت کی رنگ آمیزی۔ عام طور پر اس سلسلے میں زیادہ مضامین ایسے لکھے گئے جنہیں دلیل کے بجائے جھٹ اور سنجیدگی کے بجائے جذباتیت کا فرمایا اور اس حملہ اور ————— جواب حملہ نے مسئلہ کو بجائے سلجھانے کے اور الجھا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس منافرت اور مخالفت کا اثر ان عام لوگوں پر بھی پڑے بغیر زبان جو ایک گھریلو زبان رکھتے تھے اور زبان کی باریکیوں سے ناواقف تھے۔ لیکن محض زبانوں کے نام پر ان کے دلوں میں فرقہ وارانہ جذبات پیدا ہو گئے اور وہ یہ بغیر سمجھے ہوئے کہ اردو اور ہندی کیا ہے ایک دوسری زبان سے نفرت کرنے لگے۔

اگر ہم ہندوستان کی سیاسی حالت کا جائزہ لیں تو ہمیں اس میدان میں بھی افتراق اور نفاق ہی نظر آئے گا۔ ۱۹۴۷ء میں کانگریس کی بنیاد پڑی۔ اس وقت سارے دیش بھگت بلا تفریق مذہب و ملت اس میں شامل ہوئے مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۱۹۴۷ء میں سرسید کانگریس سے علیحدہ ہو گئے اور ان کے ساتھ مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی تھا۔ ۱۹۴۷ء میں سرسید نے محمدان ایجوکیشنل کانفرنس بلائی اور ۱۹۴۹ء میں انھوں نے *Indian Mohammedan Defence Association* قائم کیا۔ اور اس طرح ہندو اور مسلمان دونوں سیاسی مقاصد کے لئے بھی متحد ہو سکے۔ ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ سرکار برطانیہ نے جمال الدین افغانی کو اپنا آکر بنایا۔ اور ”پان اسلامی تحریک“ کے سبز باغ میں مسلمانوں کو ایسا الجھا دیا کہ وہ معروف و معروف واپران کا کلمہ پڑھنے لگے۔ اور ۱۹۴۹ء میں مسلم لیگ باضابطہ قائم ہوتی ہے اور دونوں دو دھاروں میں بٹ جاتے ہیں اور اس طرح انسانی اختلافات میں مزید شدت آ جاتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں ناگریس پر چاروں بھاء کا قیام عمل میں آتا ہے۔ اس بھاء نے ہندی کی ترویج و ترقی کے لئے جان توڑ کوششیں کیں۔ ابوشام سندھ واس نے (جو اس وقت اس بھاء کے منتری تھے) سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور ساٹھ ہزار آدمیوں کے دستخط کے ساتھ ایک محضر طیارہ کرالیا اور ہندو یہ مہاراج پر تاج نوابین سنگھ راجہ اچودھیا، سرانٹون میکڈانلڈ کے رو بہ دربار ۱۹۴۷ء کو یہ محضر نامہ پیش کیا گیا اور آخر کار گورنمنٹ کی طرف ۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو یہ حکم جاری ہوا کہ عدالتی کاغذات ہر دو زبان میں جاری ہوں اور جو شخص چاہے وہ اپنی عرضی ناگری رسم الخط میں بھی دے سکتا ہے۔ اس طرح ہندی کو باضابطہ ایک *Recognition* مل جاتا ہے اور وہ اردو کے دوش بدوش کھڑی کر دی جاتی ہے۔

پس حق سے مسلمان غاریت کے رجحان سے نجات نہ پاسکے۔ اور اس نے غیر مسلموں کے لئے اپنی زبان کو سہل نہ پاسکے۔ میر اس کے جواب میں جب بائبل بیگ کا فساد عجائب لکھنا اور زبان کو صاف و شستہ بنانے کی دھن میں ناخ کا پر کو قتی الفاظ کی تیج کرنا فارسی پرستی کے رجحان کا مظہر ہے۔ اسی وجہ سے نظریہ آری عرصہ تک گنام دیا اور ایک بازار سی شاعر گردانے لگا۔ بیچارے ہندوستانیوں کی فارسی بھی کافی اعتناء تھی۔ طالب، امیر خسرو کے علاوہ کسی کو فتح بھی نہیں لگاتے۔ اس کے علاوہ اردو شعراء فارسی شعراء کے مقابل میں احساس کتری میں مبتلا تھے۔ اس نے ہر ادارہ کے قریبی، حلقہ، مکتبہ اور صحاب کا ہم پلہ قیود پے

تھے۔ اس نے جب بیمار مسلمانوں نے فارسی کی طوطی رجوع کیا تو "بوسے کجوسی می آید" کہہ کر ان کا حلق کڑایا گیا۔ بچارے دیا شکر پستہ پر کیا گیا یعنی "خوفک جب تخمین کے عوض قضمیک کی گئی تو آہستہ آہستہ وہ دل برداشتہ ہونے چلے گئے۔

مذاہب کا کوہ عالی ادران کے ساتھیوں کا، جنہوں نے آزدو کو فارسی کی علامی سے آزدو کرایا اور جس کی وجہ سے ڈاکٹر عبدالحق یہ کہنے لگے کہ کبھی بدھمت ہندوستان کی کوئی مشترکہ زبان ہوگی تو وہ عالی کے مناجات پر وہ کی ہوگی (گوکہ فارسی اب بھی اقبال کی شاعری) ابلا کلام آزدو اور نیاز فچوری کے اضافوں میں زندہ ہے اور حیدرآباد کے دارالترجمہ میں کچھ دنوں پہلے تک زندہ تھی) اور شکر ہے کہ اسی سادگی کے باعث آزدو زبان ابھی تک زندہ ہے۔

جب مسلمان عام طور پر کانگریس سے علیحدہ ہونے لگے تو جماعت کا دعویٰ مرحوم نے حسانی اختلافات کو دور کرنے کے لئے "ہندوستان" کی مثالی دکھائی اور دونوں گروہوں کو رام کرنا چاہا۔ مگر کانگریسی جی کی "ہندی اٹھوا ہندوستانی" والی تحریک اس نے دھل سکی کہ اصل تو وہ ماہر لسانیات نہ تھے، زبانوں کے بننے بگڑنے اور چلنے پھرنے کے جو اصول ہیں اس سے انہیں واقفیت نہ تھی۔ اس کے علاوہ دونوں گروہوں کو خوش کرنے کی کوشش میں وہ کسی کو خوش نہ کر سکے۔ بھارتیہ سہیتہ پریشد کے اجلاس ناگپور منعقدہ ۱۹۳۳ء میں وہ اپنا ہندوستانی خطبہ پیش کرتے ہیں۔ "اس سب کا سبھا پتینوا دینے کے کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو وہی پریرت ہوتے ہیں۔ ایک میرا سہیتہ کار نہ ہوتا۔ دھرم سے میرا ہندوستان کی سب سبھا شاؤں سے پریم۔ جو کچھ میں آشاکر تا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیدھا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا سیدھا کشتیر بڑھائیں گے۔۔۔۔۔ اس پر دیش کے پریک سبھا جی کے سہیتہ کار، سبھا شا ستری آپس میں کھو دیس ادبیں کہیں سبھا شاؤں دوا ہندوستان کی تیرہا یوگرہ دوا را سیدھا کیوں نہ کریں۔ جماعت جی کا ہندوستان کی سب سبھا شاؤں سے پریم تھا اس لئے ۱۸ ستمبر ۱۹۳۳ء کے ہرکن سیدک میں ہندوستان کی پول تعریف کرتے ہیں۔ "ہندوستانی ہم اس زبان کو کہتے ہیں جسے اتر ہندوستان میں آدمیوں کا بہت بڑا طبقہ بولتا ہے اور ہم مانتے ہیں کہ جو شہ کارو بار میں استعمال ہوتے ہیں انہیں جن کو ہندوستان کے ذخیر میں جمع کر لینا چاہئے اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ آزدو، ہندی دونوں کو اور ادب میں استعمال ہونے والی سبھا شاؤں کو ان کی ترقی کے لئے پورا موقع ملنا چاہئے۔"

مگر کانگریسی مرحوم کی ہندوستانی آکر کے دین الہی کی طرح چند خاص لوگوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ کچھ دنوں تک لوگوں نے اس تحریک کے ذریعہ مشترکہ زبان کا خواب دیکھا تھا۔ مگر یہ خواب شرمندہ تعبیر ہی رہا، کیونکہ غالباً پنڈت سندر لال جی کے علاوہ کوئی اس تحریک کو غلوں سے نہ اپنا سکا تھا۔

۱۹۴۲ء میں لاہور ریڈیویشن پاس ہوا اور مسلم لیگ نے پاکستان کا دعویٰ کیا، آہستہ آہستہ دو قومی نظریہ زور پکڑا گیا اور بالآخر ملک تقسیم ہو گیا، کہا جاسکتا ہے کہ آزدو اور ہندی کے الگ الگ دو ملک بن گئے اور آج ہندوستان میں آزدو کی غریب وطنی اور بے کسی آنکھوں کے سامنے ہے۔

مکتوبات نیاز تین حصوں میں

ڈپٹی نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور الجھل پن کے لحاظ سے فنِ انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے ساتھ خطوط آداب بھی پیچھے مسلوب ہوتے ہیں۔ قیمت حصہ اول و دوم فی حصہ چار روپیہ، حصہ سوم میں رنگین گروہوں کی تصویریں شریک نیاز ہندوستان کے لئے حاصل۔

غالب اور ٹونک

والیوں ٹونک نے ہمیشہ اہل کمال کو نوازا اور خاطر خواہ داد و دہش سے ان کی ہمت افزائی کی۔ تاریخ ٹونک میں کوئی دھماکا ایسا نہیں گزرا جس میں اہل فضل و کمال کا تذکرہ موجود نہ ہو۔ لیکن نواب وزیر الدولہ صاحب کا دور حکومت خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جو میرزا غالب جیسے اہل کمال کو بھی اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

چنانچہ ۱۸۵۷ء میں نجم الدولہ دہلی کے حکمران حضرت میرزا اسد اللہ خان غالب نے ایک قصیدہ بزرگان فارسی نواب وزیر الدولہ بالقاب کی خدمت میں تسلیم فرمایا کہ بزرگوار عرضداشت بھیجا۔ پیشکش حضور والا سے اس کے جواب اور صلہ میں کچھ تامل ہوا تو میرزا نے موصون نے پھر ایک قطعہ بطور عرضداشت تجدید نواب وزیر الدولہ بہادر روانہ کیا۔ سرکار والا سے صلہ قصیدہ حسب دلخواہ میرزا نے موصون کو عطا ہوا چنانچہ نقل قطعہ عرضداشت بحکمہ درج ذیل ہے:

قطعہ

کات شمع و چراغ ہفت ایوان
نوشنت جواب نامہ ام ہاں
درویش نوشتہ سوئے سلطان
از صفحہ دیدہ منہلستان
زال سو اثر ہے پہیچ عنوان
اب کاشش نہ گشتے ثنا خواں
از گفتہ خویشتن پشیمان
زینہار مجور فریب شیطان
تا نامہ فرستدت بہ سامان
زود آں ہم جمع کرد نتوان
دیر است کہ دادہ است فرماں
آرند بکوشش فراوان
الماس زمعدن و زرد اذکان
توس ز حراق و ز زعمان
با قوت گزیدہ از ہشتان
شمیر برزدہ از صفایان
زد بخت گراں بہان ایران

گفتم بخرو بجاوت انس،
آیا ز پیر و بود کہ نواب
آں گو نہ عرضتہ کہ دانی
آہنگ نہ قصیدہ کہ گوئی،
ایں ہر دور رسیدنیت پیدا
رنجید مگر ز مدح نواب
بیہات چہ گفتہ ام کہ ہاشم
عقلم بجواب گفت غالب
نواب بفکر ارمنان ہست
دانہا کہ بخاطرش گذشت است
ز دوست کہ جمع نیز گردود
تا راہ رواں پھر و برگرد
دیباچہ و مشتق محفل از مردم
قبل از دکن و ز مرد از کردہ
فیروزہ فقر از لاشا پور
ز بغداد
پیشہ قیمتی ز کشمیر

بالجہ درنگ چل از ہی بہت
چوں پیر فرد بہ دلفریبا
گشتیم بزم امید و ادبی
گفتم کہ جو با منی این گرم کرد
تا چارہ رود حق گزارسی
من نیز طلب کنم برایش
آئینہ و تاج از سکنہ
از عالم غیب جام جمشید
عمر ابد و نشاط دایم
توفیق جواب نامہ خویش
تعبیل عطاؤ بذل احسان

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میرزائے موصون کے تعلقات ریاست ٹونک سے خاص تھے اور یہ رسم و راہ ایک مدت تک قائم رہی، نواب وزیر الدولہ کے انتقال کے بعد ایک خط جو میرزائے موصون نے والی رامپور کو پیشنبہ بتاریخ ۱۸ جون ۱۸۶۷ء کو لکھا تھا وہ خط نواب محمد علی خاں صاحب بہادر والی ٹونک کو کسی ذریعہ سے مل گیا۔ اور وہی خط نواب صاحب کی تاریخی کا باعث ہو کر تعلقات اہم کی کشیدگی کا سبب ہوا۔ جس کی عبارت درج ذیل ہے :-

عبارت خط

از مکاتیب غالب

(۱۸۶۷ء)

”پیر و مرشد اذراہ خیر خواہی ایک امر عرض کرتا ہوں محمد علی خاں ابن وزیر محمد خاں ریش ٹونک نے بعد از نشینی گورنمنٹ کو ”بین الدولہ“ اور دو جزو ”ملک و جنگ“ لکھ کر دئے اور وہاں سے وہ ان کو عطا ہوئے حضور کے اہراد و مچاؤ نے سلاطین باہریہ کا خطاب نہ قبول کیا مگر حضرت کے جد امجد کو احمد شاہ درانی نے مخاطب بہ ”مخلص الدولہ“ فرمایا۔ حضرت اگر مناسب جانیں تو اس خطاب کو معہ دو جزو ”شمس الملک“ و ”بہرام جنگ“ جناب ملکہ معظمہ سے بذریعہ گورنمنٹ اپنے واسطے لیں۔“

تم سلامت رہو ہزار برس
دولت و عروج و جاہ روز افزوں

ترقی دولت کا طالب

غالب

۱۸ جون ۱۸۶۷ء

نواب محمد علی خاں صاحب نے خط مذکورہ کی بعض عبارت اور غرض مطلب کو اپنی شان کے مطابق ذخیال کرتے ہوئے میرزائے موصون سے ترک تعلق کر لیا۔

ع۔م۔وکی

فن ڈرامائیسی

انسان اپنے جذبات مسرت والہ کا مختلف طریقوں سے اظہار کرتا ہے، کبھی الفاظ سے، کبھی اشاروں سے، کبھی چہرہ کے آثار چڑھاؤ اور کبھی اعضاء کی جنبش و حرکت سے اپنی ناپسندگی اظہار کبھی تو وہ اس طرح کرتا ہے کہ زبان سے کہہ دیتا ہے۔ یہ بات مجھے پسند نہیں۔ کبھی وہ صرخت و نفرت سے اپنے غم و دوسری طعن پر لیتا ہے کبھی چہرہ پر مسکینیں ڈال کر اس کا اظہار کرتا ہے اور کبھی کبھی جب وہ بیک وقت ان تمام طریقوں سے کام لیتا ہے اس میں زیادہ مزہ دے دیتا ہے اظہار جذبات کے ذریعہ بعض فطری ہوتے ہیں اور بعض اکتسابی۔ آواز ایک فطری چیز ہے مگر کسی خاص طریقہ سے استعمال اکتسابی چیز ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی مختلف قسم کی آوازیں تو نکالتے لگتا ہے لیکن کوئی خاص زبان استعمال نہیں کرتا یہ وہ بڑا ہوتا ہے اور اپنے آس پاس لوگوں کو بولتے سنتا ہے تو ان کی نقل کرتا ہے اب اس نقل سے وہ چند الفاظ سیکھ لیتا ہے پھر ان الفاظ کے معنی سمجھتا ہے مثلاً اس کو بھوک لگتی ہے تو وہ بولتا نہیں ہے بلکہ بھوک بھوک چلاتا ہے۔ لیکن صرخت کہہ دیتے اس کا مقصد پورا نہیں ہوتا بلکہ اعضاء کی جنبش، چہرہ کے آثار چڑھاؤ کی آواز وستی سے بھی اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے کسی کا محض یہ کہہ دینا کہ میں بہت رنجیدہ ہوں وہ اثر پیدا نہیں کرتا جو چہرہ کے آثار چڑھاؤ اور اعضاء کی جنبش سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے اظہار رنج و مسرت کے لئے زبان ثانوی حیثیت رکھتی ہے، اگر زبان نہ ہو تو ہم اشاروں کے ذریعہ سے اپنے مطلب کا اظہار کر سکتے ہیں پھر حال اگر زبان سے کوئی بات کہہ دیں اور اشاروں سے اس میں تاثر پیدا نہ کریں تو ہماری بات میں زور پیدا نہیں ہو سکتا اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جب انسان سوسائٹی میں رہتا ہے تو وہ ضرور مختلف طریقوں سے دوسروں کے تاثرات کو بھی سوس کرے گا اور پھر دوسروں کے سامنے ان تاثرات کو پیش کرتا ہے اور جب وہ اس طرح دوسروں کی تقالی کرتا ہے تو ڈراما یا ٹک جو دہیں آتا ہے۔ گویا ڈراما یا ٹک انسان کے جذبہ تقالی کا اظہار ہے۔ ارسطو انسان کو سوشل حیوان ہونے کے ساتھ ساتھ عقل حیوان بھی قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ نقالی انسان میں بچپن سے ولایت کی جاتی ہے اور فطرتاً انسان نقالی سے خوشی محسوس کرتا ہے۔

ڈراما، تاریخ کے ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے اور جب تک انسان میں نقالی کا جذبہ موجود ہے ڈراما یا ٹک بھی وجود رہے گا۔ ڈراما یا ٹک صرخت و دوسروں کے احساسات و جذبات کو منتقل کر دیتا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے سوسائٹی کی تمدنی و معاشرتی پہلوؤں کو بھی پیش کرتا ہے اس لئے وہ دیگر صنف ادب سے اہمیت میں کسی طرح کم نہیں۔ ڈراما یا ٹک کی اہمیت جو اس کو دیگر اصناف ادب سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی عوام سے قربت ہے کیونکہ جب ڈراما یا ٹک لکھا جاتا ہے تو اس کو دیکھنے والے کوئی مخصوص طبقہ نہیں ہوتا بلکہ سوسائٹی کے ہر طبقہ کے افراد اس میں شامل ہوتے ہیں، ڈراما یا ٹک زائد اول نویں یا افسانہ نگار کی طرح اپنی تخیل کے مقصد کو لئے الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا بلکہ اس کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ کرداروں اور مکالموں سے اپنے مقصد کی اس طرح پیش کردہ عوام کے سامنے وہ آئینہ ہو جائے اس لئے ڈراما کو پیش کرنے میں صرخت و صنف ہی کی محنت کافی نہیں ہوتی بلکہ کرداروں کی ہی محنت کافی ہے۔

(۱) ایٹج :- شیکسپیر کے زمانہ میں عام طور پر ایٹج تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ (۱) پہلا پاسائے کا ایٹج جو ڈراما کے لوازم کسی بھی کھلی ہوئی جگہ مثلاً سڑک، یا میدان وغیرہ کا کام دیتا تھا۔ (۲) دوسرا عقبی ایٹج جس میں کچھ فرنیچر ہوتا تھا اور جسے کسی محل۔ کمرہ یا کونسل ہال یا اسی قسم کے اندرونی مقامات کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ (۳) تیسرا یا بالائی ایٹج جو آرام کرنے یا سنگھار کے کمرہ کا کام دیتا تھا۔ اس زمانہ میں ایٹج کی اس سادگی کے باعث سین تبدیل کرنے میں آسانی ہوتی تھی ایک ہی سین میں ایکٹروں کی تبدیلی سے مقام تبدیل کر دیا جاتا تھا اور دیکھنے والے قصہ میں سین تبدیل ہونا محسوس کر لیتے تھے۔ موجودہ زمانہ کے ایٹج کی پیچیدگیاں ناظرین کو بھی الجھن میں ڈال دیتی ہیں اور وہ بمشکل اپنی توجہ پلاٹ و کردار پر مرکوز کر سکتے ہیں۔

(۲) ایکٹر :- ایٹج ڈراما کے ساتھ ہمارے ذہن میں ایکٹر کا خیال خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی اہمیت وہی ہے جو موسیقی میں آواز کی۔ موسیقار خواہ کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو، لیکن اگر اس کی آواز میں ہل اور کشش نہیں ہے تو وہ لوگوں کی توجہ اپنی جانب منقطع نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر ایکٹر جذبات و احساسات کو اسی طرح پیش نہیں کر سکتا جس طرح ڈراما نویس نے محسوس کیا ہے تو ڈراما کا سیاق نہیں ہو سکتا، اداکاری خود ایک آرٹ ہے اور اداکار بہت بڑا آرٹسٹ، ایک اداکار کی انتہائی کامیابی یہ ہے کہ وہ جس کردار کی نقل کر رہا ہے خود اس سے اس قدر قریب ہو جائے کہ دیکھنے والوں کی ہمدردی و نفرت کے اس کی ذات سے وابستہ ہو جائے اداکار کا کام صرف مکالمے ادا کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ ان میں ان کی صحیح روح سمجھ دے۔ وہ سمجھ لے کہ کہاں اس کو اپنی آواز کو گوناسے کہاں زیادہ گون الفاظ کو رک رک کر ادا کرنا ہے اور کن الفاظ کو تیزی سے، کس لفظ پر زور دینا ہے اور کس پر نہیں۔ جو ہم روز کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو سہاٹ بولنے کے عادی ہوتے ہیں باوجود اس کے کہ ان کے دلائل ٹھوس اور گفتگو مدلل ہوتی ہے اکثر اس شخص سے مقابلہ میں ناکامیاب ہو جاتے ہیں جو عام گفتگو اور بول چال میں الفاظ کے استعمال میں مہارت رکھتے ہیں ایک اداکار کا خاص فن اشاروں کے ذریعہ سے احساس و جذبات کا اظہار ہے۔ اگر وہ تاثرات کو اپنے چہرہ اور حرکت سے پیدا نہیں کر سکتا تو وہ کوئی خاص تاثر پیدا نہیں کر سکتا۔

(۳) دیگر لوازم :- ڈراما کی طیاری صرف ایک اچھے اداکار اور مکالموں کو اچھی طرح ادا کر دینے پر ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ ایٹج پر اس ماحول کو پیش کرنا ہے جو وقت و زمانہ کے مطابق ہو۔ اگر اس میں قومی خصوصیت، لکچر زبان اور مکان کا لحاظ نہ رکھا جائے تو وہ محض بیکار ہے فرض کیجئے ہندوستان میں ایک ڈراما ایٹج کیا جا رہا ہے جس میں باز بہادر اور روپ متی کی داستان محبت ہے۔ اب اگر باز بہادر ایک موجودہ جٹکھن میں طرح منہ میں سگار دباے، سر پر بیٹ رکھے اور سوٹ بوٹ سے لیس ہو کر آتا ہے تو کوئی شخص اپنی ہنسی ضبط کر سکیگا اس لئے ایٹج اور لباس کی طیاری میں زمانہ کے ماحول، تہذیب، معاشرت اور اس کے ساتھ ساتھ زمانہ ان اور قومی خصوصیات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

تاریخی اعتبار سے ڈراما اول سے قدیم ترین چیز ہے اور ان کے اجزائے ترکیبی کو ایک سمجھنا پڑی غلطی ہوگی۔ انسان کی دلچسپی ناول اور ڈراما ہمیشہ سے انسانوں کے جذبات و احساسات سے رہی ہے اور انسان کی اس خواہش پر ناول کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ اپنے آس پاس کے لوگوں کو ان کے اصل روپ میں دیکھنا چاہتا ہے کیونکہ جب ہم آپس میں ملتے جلتے ہیں اور ہمارے درمیان موشمول تعلقات قائم ہوتے ہیں تو ہمیں باوجود بے انتہا بے تکلفی کے اپنے کردار پر ایک نقاب ڈال رہے ہیں۔ اس نقاب کو الٹ کر دیکھنے کی ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے اور اس کی یہ خواہش کبھی داستان کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے کبھی ڈراما کی صورت میں کبھی ناول کی صورت میں۔

آج کل کے ایٹج کے لوازم :- ناول ایک مکمل ادبی صنف ہے اور ڈراما مکمل طور پر صنف ادب نہیں۔ اس کے لئے ایٹج کا ضرور ہے بھی ہوتا ہے اس لئے چاہا جس قدر باہر ہے ناول اسی قدر آزاد ہے۔ اس نے ڈراما کی شکل آرٹ ہے اور ناول اس کے مقابلہ میں آسان ہے۔ ڈراما کے وقت ایٹج کے متعلق پوری معلومات نہایت ضروری ہیں، دلیم جیسی ڈراما لکھتا ہے کہ ناول ہر شخص لکھ سکتا ہے

جس کے پاس قلم وادوات اور کاغذ ہے، لیکن ڈراما لکھنے کے لئے اور بہت کچھ چاہئے، ان دونوں میں سب سے اہم فرق تکنیک کا فرق ہے، ولیم ہنری ڈیسن لکھتا ہے کہ، ”داستان یا ناول کی کہانی بیان کرنے کے لئے ہوتی ہے اور ڈراما نقالی ہے جو حرکت و تقریر کے ذریعہ کی جاتی ہے ناول یا ایسی صنف ادب ہے جو اپنے اندر ہر چیز کو محیط کر لیتی ہے اور ہر وہ چیز جو ناول نگار بیان کرنا چاہتا ہے، آسانی سے بیان کر دیتا ہے نیز اس کے ساتھ قاری کا ذہن خود ہر اس چیز پر خود مگر تازہ و محسوس کرنا چاہتا ہے جو ناول نگار نے محسوس کیا ہے۔ برخلاف اس کے ڈرامہ قاری کو ہزاروں اُلجھنوں میں پھنسا دیتا ہے اور اس لئے ہر شخص ڈرامہ میں وہی دلچسپی محسوس نہیں کر سکتا جو ناول میں ہوتی ہے نظریات موجودہ ڈرامہ میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ ڈراما نویس ان معمولی معمولی جزئیات کو بھی بیان کر دے جو اسٹیج سے متعلق ہیں۔ وہ اگر کمرہ کا سین بیان کرتا ہے تو کمرہ کے فرنیچر اور اس کی دافش سے لیکر معمولی معمولی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ کمرہ داروں کے کپڑوں کے رنگ ان کے پہننے کے طریقوں تک کو بیان کرتا ہے وہ کمرہ داروں کی حرکات و سکنات، ان کا لب و لہجہ، چہرہ کے آثار چڑھاؤ آواز کی بندی و پستی تک بتلاتا ہے اور بعض ڈرامہ نویس تو کمرہ داروں کے تعارف کے وقت ان کے کیرئیر تک پر ریاک کر دیتے ہیں۔ مگر پھر بھی ہر شخص سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ڈرامہ پڑھتے وقت ان معمولی جزئیات پر ایسی ہی نظر رکھے گا۔ ڈراما اور ناول میں یہ ایک ایسا بین قریق ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ کر دیتا ہے۔

کسی فنکار سے یہ توقع رکھنا کہ وہ زندگی کے ہر پہلو پر ایک ہی وقت میں روشنی ڈال سکے گا، صحیح نہیں۔ کیونکہ زندگی ہزاروں ڈراما کی بنیاد اختلافات سے بھری پڑی ہے۔ ڈراما نویس زندگی کے کسی ایک پہلو کو منتخب کر لیتا ہے، واقعات میں ایک رابطہ و تسلسل پیدا کرتا ہے اور پھر کمرہ داروں کے ذریعہ سے ان کو پیش کرتا ہے۔ اگرچہ ڈراما نویس خود ان کے متعلق اپنی کوئی رائے نہیں دے سکتا مگر پھر بھی یہ کہہ دینا کہ معصنف خود کو اس سے علیحدہ رکھتا ہے درست نہیں۔ خود ڈراما نویس کی ذات اور اس کے نظریے اکثر گوشوں سے جھانکنے نظر آتے ہیں۔ جب ڈراما نویس اس طرح زندگی کے کسی ایک پہلو یا سوسائٹی کی کسی خاص کمرہ داری کو منتخب کر لیتا ہے تو یہی اسکے ڈرامہ کا مواد ہوتا ہے۔ اب ڈراما نویس مجبور ہوتا ہے کہ وہ کمرہ داروں کے مکالموں اور ریمیں کی تبدیلیوں کو اپنے مواد سے وابستہ رکھے وہ کمرہ دار، ماحول اور کردار کی پوزیشن برقرار رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ اس لئے ڈراما کی ماہیت اور مواد میں چلی دامن کا ساتھ ہی ان دونوں کو آپس میں جوڑے رکھنے میں ڈرامہ نویس کو واقعات میں کافی کاٹ چھانٹ کرنا پڑتی ہے اور اب یہ اس کی صلاحیت پر ہوتی ہے کہ وہ کس واقعہ کو ڈراما کا تسلسل برقرار رکھنے کے لئے ضروری سمجھتا ہے اور کس کو نہیں اور کون کن کن واقعات کو اپنے نقطہ نظر کی وضاحت اور کرداروں کے اُبھارنے کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔

صنف واقعہ اور مواد ہی وہ چیزیں ہیں جن پر ڈراما کی بنیاد ہوتی ہے بلکہ اس کے علاوہ کشش (Compulsion) ڈرامہ کار کے اہم جزو ہے۔ بلا کشش کے ڈراما وجود میں نہیں آسکتا۔ کشش مختلف قسم کی ہو سکتی ہے۔ کبھی دو انسانوں میں کشش ہوتی ہے کبھی انسان اور سوسائٹی میں کبھی حقایق اور جذبات میں کبھی خود اپنی خواہشات کی، جو قصہ کے ذریعہ بیان کی جاتی ہیں۔ اس طریقہ سے ہر ڈراما کسی کسی کشش سے شروع ہوتا ہے،

ڈراما کا ڈھانچہ

ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جب یہ کشش شروع ہو جاتی ہے تو وہ کن کن مراحل سے گزرتی ہے۔

اس کشش کے شروع ہونے کے لئے کسی خاص حادثہ کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر حالات واقعات ہماری نظروں کے سامنے آتے گئے ہیں اور یہ واقعات مختلف مراحل سے گزرتے ہیں اور پھر اس حادثہ کا کوئی خاص نتیجہ برآمد ہوتا ہے ڈراما کو اپنے قصہ میں مقیم کیا گیا ہے اور اب اپنی پانچ حصوں کے پیش نظر پانچ ڈرامے پانچ ایکٹ کے لکھے جاتے ہیں۔ لیکن اب اس خیال میں مزید ترمیم کی جاتی ہے کہ ڈراما کو حسب ضرورت ایکٹوں میں تقسیم کر کے جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ڈرامے کے پانچ حصے

ہم کو غور و فکر سے صاف نظر نہیں آتے۔ مگر وہ ہر ڈراما میں محدود ہوتے ہیں

پانچ قدرتی حصے مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) تمہید واقعہ - (۲) الجھاؤ - (۳) نقطہ عروج - (۴) سبھاؤ - (۵) انجام (Conclusion) لیکن ان سب سے پہلے تمہید یا انگشتان ضروری ہے۔

(۱) تمہید یا انگشتان :- اس میں ناظر کو ان ضروری باتوں کے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں جو ڈراما سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ ڈراما میں بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کے متعلق ڈراما نویس تو بہت کچھ جانتا ہے مگر ناظر نہیں۔ اسی طرح ڈراما میں سیکڑوں کردار کے بعد دیگر سیکڑوں کے سامنے آتے ہیں جن کے متعلق ڈراما نویس تو اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کون ہیں اور مختلف کرداروں کا آپس میں کیا رشتہ ہے مگر ناظر اس سے قطعی ناواقف ہوتا ہے اس لئے ان کا تعارف ڈراما نویس کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لئے مختلف طریقوں کو استعمال کیا گیا ہے کبھی تو اس قسم کے تعارف کو کسی ایک کردار کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے اور کبھی خود کلامی کے ذریعہ اکثر کردار اپنا تعارف کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں طریقے غیر مزید اور غیر مناسبت ہیں۔ اگر پہلا طریقہ ناظر کے لئے اکتا دینے والا ہوتا ہے تو دوسرا طریقہ قطعی غیر دلچسپ اور غیر قدرتی اس لئے ڈراما نویس عام طور پر اس کو مکالمات کے ذریعہ پیش کرتا ہے اور مکالمات کے دوسرا میں ایسی دلچسپیاں پیدا کرتا ہے کہ ناظر کو ڈراما میں بلکہ ان میں گہری دلچسپی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایک قادر ڈراما نویس کے فن کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ تعارف کو وقتاً فوقتاً اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ وہ بالکل ڈرامہ کا جزو بن جائے، بہر حال اس سلسلہ میں جو چیز قابلِ غماخ ہے وہ یہ ہے کہ انگشتان یا تعارف کا واضح، مختصر ڈرامائی اور پلاٹ سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے اور اس میں کسی قسم کی بناوٹ کی جھلک نظر نہ آئے۔

(۲) الجھاؤ یا کشش :- بردہ اُسٹھے ہی ڈراما کا پلاٹ شروع ہو جاتا ہے۔ اور وہ کشش جس پر ڈراما کی بنیاد رکھی گئی ہے ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ عام طور پر کوئی پیچیدگی اور کشش آہستہ آہستہ کسی کردار کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے اور تدریجی طور پر واضح اور صاف ہوتی چلی جاتی ہے جس سے مختلف کرداروں کے درمیان جدوجہد شروع ہو جاتی ہے اور اب وہ کیفیت جو ایک فرد سے متعلق تھی آہستہ آہستہ دوسروں پر اثر ڈالنے لگتی ہے یہ ضروری نہیں کہ یہ کشش یا پیچیدگی جو ایک کسی فرد کے اندر پیدا ہوئی ہے کسی ایک واقعہ کا ردِ عمل ہو بلکہ کبھی تو یہ پیچیدگی کسی ایک واقعہ سے متاثر ہو کر شروع ہوتی ہے اور کبھی متعدد واقعات کسی فرد میں ایک خاص کیفیت پیدا کرنے کے ذریعہ دار ہوتے ہیں مگر بات ڈراما نویس کے ذہن میں ہمیشہ رہتی ہے کہ امر واقعہ کے اندرونی اور بیرونی حالات کو اس طرح اجاگر کرے کہ وہ ناظر کے سامنے دونوں پہلوؤں سے آئینہ کی طرح صاف اور روشن ہو جائیں کبھی کبھی کسی ڈراما میں دو مختلف کہانیاں شروع ہو جاتی ہیں اہم کہانی کی پیچیدگی تو فوراً ظاہر ہو جاتی ہے مگر دوسری کہانی کی پیچیدگی جو اس کے ساتھ حرکت کر رہی ہے دیر تک سامنے نہیں آتی۔ پیچیدگی یا کشش شروع ہونے کے بعد ڈراما کا سب سے اہم دور شروع ہوتا ہے جس میں کہانی، ماحول، اثرات اور پیچیدگیوں سے گزرتی ہوئی نقطہ عروج کی طرف بڑھتی ہے۔ یہی وہ دور ہوتا ہے جس سے کسی ڈراما نویس کی دہانت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی طرح واقعات، حالات اور کرداروں کے اندرونی احساسات کا جائزہ لے رہا ہے۔ ایک ذہین اور فنکار ڈراما نویس غیر ضروری واقعات کو خواہ وہ کتنے ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں نظر انداز کر دیتا ہے اور ضروری واقعات کو بھی اختصار سے پیش کر کے اپنی نگاہی کا ثبوت دیتا ہے ڈراما کے اس حصہ میں اس بات کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے کہ واقعات میں ربط ہو اور کوئی غیر متعلق واقعہ پیش نہ کر دے یا کوئی ایسا واقعہ جو کردار کے مطابق نہیں ہے اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ کہانی برابر آگے بڑھتی رہے۔ اگر کہانی آگے نہیں بڑھتی تو پھر ڈراما نویس مکالموں میں کشائی پیدا کرے ڈراما غیر دلچسپ اور غیر موثر ہو گا، کہانی کے واقعات میں تسلسل ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ واقعات کشش کے غیر حقیقی معلوم ہونے (۳) نقطہ عروج :- چونکہ ڈرامائے واقعات کا سلسلہ لامتناہی نہیں اس لئے جلد یا بدیر ایک ایسا مقام آ جاتا ہے جہاں واقعات کے مطابق کہانی ایک فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے جس کو ہم ڈراما کا نقطہ عروج کہتے ہیں۔ ویسے تو ڈراما میں ایسے کئی مقام آتے ہیں کہ لوگ یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں کہ کیا ہو گا۔ لیکن ڈراما کا نقطہ عروج وہی ہے جہاں سے کہانی ایک فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہوتی ہے اور اس سے

اختیار کرتی ہے ڈراما کو نقطہ عروج تک پہنچانے اور اس کو ایک نیا موڑ دینے وقت اس کا لحاظ ضروری ہے کہ جو موڑ کہانی میں پیدا ہوا ہے وہ غیر فطری تو نہیں، بعض مصنفین نقطہ عروج کو فوراً نہیں لاتے بلکہ برابر اس کی کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک ہوسکے نقطہ عروج کو دور رکھا جائے۔ بہر حال نقطہ عروج جلد آجائے یا دیر۔ لیکن اس کو قدرتی اور منطقی ہونا ضروری ہے۔ ڈراما میں نقطہ عروج نہایت اہم حصہ ہے کہ ڈراما جس قدر نقطہ عروج سے قریب ہوتا جاتا ہے، ڈراما نویس کی ذہانت و فنکاری کا امتحان سخت سے سخت ہوتا جاتا ہے۔ بڑی کوششیں پہلے ہی سے عقیدے متعلق اپنی رائے قائم کر لیتا ہے کہ ایسا ہوگا مگر پھر بھی اس کے ذہن میں ایک بے چینی ہوتی ہے کہ وہ جلد از جلد سب کچھ معلوم کر لے اسکی سانس رک جاتی ہے اور بدل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور اپنے اس کردار کی قسمت کا بے چینی سے انتظار کرتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا یہ کردار جلد از جلد کشمکش سے گزر جائے جس میں وہ مبتلا ہے۔ یہ حصہ ڈراما کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے اگر یہ ڈراما نویس کی خامکاری کے باعث کمزور رہ گیا تو پھر ڈراما کی دلچسپی اور اہمیت ختم ہو جاتی ہے چونکہ ڈراما کا سب سے دلچسپ حصہ ہے اس لئے عام طور پر ڈراما نویس اسکو دیر تک سانس نہیں لاتے تاکہ لوگوں کی دلچسپی ختم نہ ہو۔

(۴) سلجھاؤ :- نقطہ عروج گزر گیا اور ڈراما اب چوتھے دور میں داخل ہوتا ہے، جس کو سلجھاؤ کہتے ہیں۔ اگر ڈراما کامیڈی ہے تو پھر سیرو اور ہیر وئی کے سامنے سے وہ مشکلات طاری ہونا شروع ہو جاتی ہیں جن کے باعث انھیں الجھنوں، پیچیدگیوں اور کشمکش میں مبتلا ہونا پڑتا تھا اور اگر ٹریجڈی ہے تو پھر وہ تمام عناصر جھٹٹا شروع ہو جاتے ہیں جن کے باعث برائیاں ابھی تک اپنا اثر قائم نہیں کر سکی تھیں۔ اب وہ آزادی سے اپنا عمل کرنے لگتی ہیں۔ بہر حال ڈراما کا نتیجہ طریہ ہو یا المیہ نقطہ عروج تک پہنچنے سے پہلے ناظر یا قاری جس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا وہ دور ہونے لگتی ہے، لیکن اب ایک شکل یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ کس طرح دلچسپی کو برقرار رکھا جائے۔ اسی لئے عام طور پر ڈراما نویس نقطہ عروج تک کہانی کو پہنچانے میں دیر لگاتے ہیں اور نقطہ عروج کے بعد بہت تیزی کے ساتھ نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ اس مشکل مسئلہ سے آسانی سے گزر جائیں، المیہ ڈراموں میں تو یہ دلچسپی برقرار رہتی ہے مگر طریہ ڈراموں میں دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے کچھ ایسے ایسے واقعات پیش کرنا پڑتے ہیں جس سے انجام تک پہنچنے میں کچھ رکاوٹیں پیدا ہو جائیں، اب چونکہ واقعات کا ایک نیا موڑ شروع ہوتا ہے اس لئے ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ اب واقعات میں تسلسل کی ضرورت نہیں، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اب تو ڈراما نویس کے آرٹ کا اور سخت امتحان شروع ہوتا ہے۔ اس حصہ کے ہر واقعہ کو تمام واقعات سے مربوط ہونا چاہئے۔

(۵) انجام :- چوتھے مرحلے سے گزرنے کے بعد ڈراما اب آخری مرحلہ یعنی انتہام یا انجام میں داخل ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے ڈرامے عام طور پر کسی خاص نتیجہ تک نہیں پہنچاتے۔ نتیجہ کو اس طرح مبہم چھوڑ دینے کا منطقی سبب یہ ہے کہ زندگی بہت پیچیدہ اور ہزاروں تضاد کا مجموعہ ہے، ایک واقعہ کے بعد دوسرے واقعہ کا پیدا ہونا ناگزیر ہے اس لئے زندگی کے پیچیدہ واقعات کے متعلق کوئی آخری رائے دینا ممکن نہیں بلکہ ڈرامہ میں چونکہ زندگی کو ہم آرٹ کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اس لئے اس میں انجام کو اس طرح مبہم چھوڑ دینا غلط ہے ڈراما طریہ ہو یا المیہ، ڈراما نویس کے لئے یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ وہ اپنے ڈراما کے انجام کو ان حالات سے مربوط رکھے جو جدوجہد کے درمیان ظاہر ہوئے تھے اور نقطہ عروج پر پہنچنے سے قبل جن کے متعلق ایک وحدانہ تصور پیدا ہو گیا تھا جس طرح واقعات اور ان کے نتائج کو غیر منطقی نہ ہونا چاہئے اسی طرح انجام بھی غیر منطقی نہ ہونا چاہئے۔ ڈراما کو المیہ سے بچانے کے لئے درمیان میں کسی ایسے واقعہ کو داخل کر دینا جو اس کے انجام کو تبدیل کر دے، یوں تو غیر ممکن ہے مگر ان مصنفین کو جو طریہ ڈراما لکھتے ہیں اس قدر موقع ضرور دیا جاتا ہے کہ وہ انجام کو المیہ سے بچانے کے لئے کسی ایسے غیر متوقع واقعہ کے ظہار کو کسی کردار کو یکایک سنبھال کر واقعات کے رخ بدلیں لیکن یہ ضروری ہے کہ ڈراما کی اخلاقی و جمالیاتی قدیم مجرورج نہ ہوں۔

پلاٹ ڈراما کا بڑا اہم حصہ ہے جس کے بغیر کوئی ڈراما وجود میں نہیں آتا۔ اگر ہم ڈراما کو منطقی کے پلاٹ کا مطالعہ کریں تو ہم کو منطقی پلاٹ کے اجزاء کے متعلق کوئی فرق نظر نہ آئے گا۔ مگر وہ نئی کہ مختلف حالات میں کام کرتا پڑتا ہے تاہل نگار کو آزادی ہوتی ہے کہ

وہ جس قدر چاہے اپنے مواد کو بھیلائے مگر ڈراما نویس ایسا نہیں کر سکتا، ناول پڑھتے وقت قاری جس قدر چاہے وقت دے سکتا ہے مگر ڈراما نویس کو یہ آسانی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ جیسے کوئی شخص ڈراما کو دیکھنے بیٹھا ہے تو اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس کو ایک مرتبہ ہی میں دیکھ لے۔ اس لئے ڈراما نویس کو ہر مقام پر اختصار کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے اس لئے وہ واقعات میں کاٹ چھانٹ اور غیر ضروری واقعات کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے اسطو نے ڈراما نویس کو نصیحت کی ہے کہ اسے اپنے پلاٹ کی ترتیب میں کسی داستان کو کام میں نہیں لانا چاہئے مگر کہ داستان عام طور پر غیر ضروری اور غیر دلچسپ واقعات سے پر ہوتی ہیں۔ اس لئے ڈراما کے پلاٹ میں غیر ضروری واقعات خواہ وہ کتنے ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں، نظر انداز کر دینا ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ناول نگار کے مقابلہ میں ڈراما نویس کو یہ آسانی حاصل ہوتی ہے کہ وہ ان چیزوں کو ایڈجسٹنگ کے ذریعہ ظاہر کر دیتا ہے اور ان تمام غیر ضروری تفصیل سے بچ جاتا ہے جو ناول نگار کے لئے ناگزیر ہیں۔

جب ہم پلاٹ کا ذکر کر رہے ہیں تو سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ڈراما نویس نے جو پلاٹ منتخب کیا ہے اور جو واقعات پیش کر رہا ہے وہ زندگی سے کس قدر قریب ہیں وہ زندگی کی صحیح نمائندگی بھی کرتے ہیں یا نہیں وہ کچھ ایسے واقعات تو نہیں جو زندگی سے ہم آہنگ نہ ہوں۔ دوسری چیز پلاٹ کی ترتیب میں اخلاقی قد میں ہیں ایک ڈراما اسی وقت بڑا کہا جاسکتا ہے جبکہ اس کی جڑیں ہماری روزانہ کی زندگی میں بہت گہری ہوں۔ ایسے لوگوں کی داستانیں نہ ہوں جو فوق الفطرت ہیں جو زندگی سے بہت دور ہیں اور جن کا عام زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ بلکہ ایسے لوگوں کی داستانیں ہوں جو عام انسانوں کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو ہماری زندگیوں سے متاثر ہوتے ہیں اور ہم کو زندگی سے متاثر کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ڈراما کو صرف انسانی زندگی کے اس حصہ کا نمائندہ سمجھ لیا جائے جس کو ٹریجڈی کہتے ہیں بلکہ ڈراما کا تعلق انسانی زندگی کے اس حصہ سے بھی ہے جس کو کامیڈی کہتے ہیں۔ کیونکہ انسان جہاں اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں میں دلچسپی لیتا ہے وہیں اس کی زندگی کا انحصار روز کی ان چند خوشیوں پر بھی ہے جو اس کو حاصل ہوتی ہیں۔ اس لئے پلاٹ کے انتخاب میں خواہ زندگی کے روشن پہلو کو دیکھا جائے خواہ تاریک کو اسے زندگی سے علیحدہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ قریب تر ہونا چاہئے کیونکہ ڈراما کے پلاٹ کی بڑائی اس کی حقیقی زندگی کی قدروں میں پوشیدہ ہے۔ پلاٹ اور واقعات منتخب کرتے وقت ڈرامہ نویس کا اولین فرض ایسے واقعات کا انتخاب کرنا ہے جن پر وہ بغیر جھجک کے رائے دے سکے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ایک ہی واقعہ پر مختلف ڈراما نویسوں کی اپنی دلچسپی کا سبب بن سکتی ہیں۔

..... ہم پلاٹ کی دو قسمیں کر سکتے ہیں، مربوط و غیر مربوط۔ مربوط پلاٹ میں تسلسل و ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ وہ واقعات کا ایک مجموعہ ہوتا ہے جن میں سے کچھ کا تعلق اصل واقعہ سے ہوتا ہے اور کچھ کا نہیں۔ ایسے پلاٹ غیر دلچسپ ہوتے ہیں اور دیکھنے والے جلد گھبرا اٹھتے ہیں۔ برعکس اس کے مربوط پلاٹ میں واقعات کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ تمام واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اس میں ناظر قاری کو ڈرامہ کی غایت سمجھنے میں زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑتی بلکہ وہ آسانی سے اس مرکزی خیال کو پالیتا ہے جس پر ڈرامہ کی بنیاد قائم ہے اس طرح کے پلاٹ پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ واقعات کا یہ تسلسل غیر قدرتی چیز ہے۔ اس اعتراض کو کسی حد تک تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن پھر بھی اس کا جواب یہ ہے کہ زندگی میں واقعات کا تسلسل کے ساتھ پیش آتا ممکن نہیں ہے اور زندگی میں ایسے واقعات کا پیش کرنا کہ ان میں تسلسل اور ربط ہو غلط نہیں کہا جاسکتا۔ ان میں پہلی چیز متوازنیت (Proportion) اور دوسری تقابل

(Contrast) ہے۔ متوازنیت ڈراما کو زیادہ ذہنی اثر بنانے کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی جیسے واقعہ کو دہرایا جائے یعنی اگر کوئی واقعہ ڈرامے کے حصہ میں پیش آئے تو بالکل ایسا ہی دوسرے حصہ میں دوسرے طریقے سے پیش کیا جائے۔ اس سے ڈرامائی قد میں بڑھ جاتی ہیں اور وہ تمام مختلف اجزاء جن کے ذریعہ سے ڈراما کا پلاٹ ترتیب دیا گیا ہے ایک وحدت میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ کبھی کسی ڈراما دو مختلف پلاٹوں سے ترتیب دیا جاتا ہے جن میں ہر پلاٹ میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا مگر جب ایک ہی واقعہ یا

ایک ہی خیال دونوں کہانیوں کا علاحدہ علاحدہ محرک ہوتا ہے تو ہمیں ڈراما کی غایت سمجھنے میں ڈراما بھی وقت پیش نہیں آتی بلکہ متوازنیت کی اس طرح کی مثالیں ہم کو ٹیکسیر کے ڈراموں میں بہت ملتی ہیں۔ *A Midsummer Night's Dream* اس کی بڑی اچھی مثال ہے جس میں ڈراما نویس محبت کو ایک تھلاک عقل جذبہ سے تعبیر کرتا ہے۔ ایسا جذبہ جس میں ہر لڑکیاں اپنے والدین کی حکم مردوں کی کرتی ہیں اور عشاق تباہی کی زندگی بسر کرتے ہیں اس میں ٹیکسیر نے مرکزی خیال کو نمایاں کرنے کے لئے اس طرح کے ساتھ *dream of a man of a dream* کا تصور شروع کیا اور متوازنیت مدد لیتا ہے اور دونوں کہانیوں میں محبت کے اثرات بتلاتا ہے۔ ڈراما کے پلاٹ کی ترتیب میں تقابل بڑی اہم چیز ہے۔ کیونکہ انسان کو ہر سر قدم پر ہزاروں اختلافات سے واسطہ پڑتا ہے۔ اسی "کشکش" پر دنیا کی مدنی قائم ہے۔ ڈرامہ کے سلسلہ میں اس کو یوں سمجھئے کہ ڈراما یا تو طریہ انماذ میں شروع کیا جاتا ہے اور المیہ المیزان میں ختم ہوتا ہے یا المیہ انداز میں شروع ہوتا ہے اور طریہ طور پر انجام پذیر ہوتا ہے۔ اس سے تمہید سے نقطہ شروع تک پہنچنے اور نقطہ عروج سے انجام تک پہنچنے میں ایک نمایاں اختلاف نظر آتا ہے اور خاص طور پر المیہ ڈراموں میں یہ فرق بہت نمایاں ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی حالات کس طرح گزر رہے تھے اور کسی معمولی سی

غلطی یا کسی کردار کی معمولی لغزش نے حالات کو بالکل بدل دیا ہے اور اس طرح پلاٹ کے ان دو حصوں میں ایک نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اختلاف سنجیدہ اور المیہ ڈراموں میں "کامک" کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی سنجیدہ پلاٹ کے ساتھ ایک دوسرا پلاٹ شروع کر دیا جاتا ہے جس میں قطعی سنجیدہ اور الم نہیں ہوتا۔ ایسے موقع پر ڈراما نویس متوازنیت اور تقابل دونوں سے کام لیتا ہے یعنی پلاٹ جو صرف کامک کے لئے استعمال ہوتا ہے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس کا مرکزی خیال اصل واقعہ ہم آہنگ بھی ہو اور ایسا معلوم ہو کہ دونوں واقعے ایک ہی اصل کے حصہ ہیں مگر دونوں میں اس طرح اختلاف پیدا ہو جائے کہ ایک واقعہ کو سنجیدہ طور پر دیکھ تو اس پر سنجیدگی کا اثر ہو اور دوسرے واقعہ کو دیکھ تو قہقہے لگائے۔ اس طرح نقطہ اختلاف پیدا کر کے ڈرامہ نویس ناظر یا قاری کو ایک وقتی تسکین دینا چاہتا ہے، کیونکہ مسلسل ایک ہی قسم کے المیہ اور سنجیدہ واقعات سے انسان دوچار ہوتا رہے تو گھبرا جاتا ہے۔ یہاں ایک اور تقابلی اختلاف کا ذکر کرنا خالی اندکچی نہ ہو گا اسکو ڈراما کی اصطلاح میں ڈرامائی طنز کہتے ہیں: ایک ہی چیز کے دو مختلف روپ ہیں جو تقابل سے ظاہر کئے جاتے ہیں اسکا تشریح ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ جو بات لکھنے پر ہی جاتی ہے ناظر یا قاری کا علم اس کے برخلاف ہوتا ہے۔ یہ اختلاف یا تو موقع و محل کا ہو سکتا ہے یا واقعہ کا یا طنز کا لیکن اگر غور سے ڈراما کا مطالعہ کیا جائے تو عوام طور پر تمام حالتیں ہی ظاہر ہوتی ہیں اور علاحدہ علاحدہ ان کو ظاہر نہیں کیا جاتا۔ مثال کے طور پر اس کو ہم اس طرح ظاہر کر سکتے ہیں کہ کسی ڈراما میں کوئی سازش کی جا رہی ہے جس سے قاری بخوبی واقف ہے کہ اس کا علم اس شخص کو ہے جس کے متعلق سازش ہے مگر سازشی گروہ سمجھتا ہے کہ شخص متعلقہ اس سے واقف نہیں۔ اس قسم کے ڈرامائی طنز کی بڑی اچھی مثال ٹیکسیر کے ڈرامے ہنری ٹیم میں ملتی ہے۔ بعض ڈرامائی طنز اس طرح پیش کئے جاتے ہیں کہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ایسا ہو گا لیکن انجام ویسا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ایک مجرم کو گرفتار کیا جاتا ہے ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنے بے گناہ ہونے کا ثبوت پیش کرے گا مگر جب عدالت میں پیش ہوتا ہے تو مجرم ہونے کا اقبال کر لیتا ہے۔ ڈرامائی طنز کا ایک طریقہ ایسے الفاظ کا استعمال بھی ہے جس کے دو معنی ہوتے ہیں ایک بولنے والا اس کو کسی اور معنی میں بول رہا ہے اور سننے والا اس کے کچھ اور معنی سمجھ رہا ہے یا بولنے والا جو الفاظ بول رہا ہے وہ خود ان کے معنی سے واقف نہیں جن سے مخاطب واقف ہے۔

پلاٹ پر اس قدر بحث کرنے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پلاٹ کی تفکارانہ دلچسپی اس بات سے متعلق ہے کہ قصہ کے بعض حصہ کو قاری یا ناظر اس وقت تک پوشیدہ رکھے جائیں جب تک کہ اصل بات کا انکشاف خود بخود نہ ہو جائے یا تمام واقعات کی کڑ اور محرکات کا شروع ہی میں انکشاف کر دینا ضروری ہے، بعض کا خیال ہے کہ تمام جوئیات ڈرامہ کے انکشاف سے پلاٹ کی دلچسپی پر قرار نہیں دینی گئے خیال غلط ہے کیونکہ اصل دلچسپی خود پلاٹ کے اندر موجود ہوتی ہے اس بہت سی وہ باتیں جن سے ناظر یا قاری واقف ہوتا ہے خود ڈراما میں حصہ لینے والے بہت کم کردار واقعات نہیں دیتے اور اس طرح ناظر کو کرداروں کے عمل اور رد عمل سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب محرکات اور کرداروں کو پوشیدہ رکھنا بہت پُرانا

آسٹ ہو چکا ہے۔ موجودہ زمانہ میں تمام جزئیات کو بیان کر دینا اور پھر پلاٹ کی دلچسپی برقرار رکھنا بہت بڑا آرٹ مانا جاتا ہے۔ پلاٹ کے ساتھ ساتھ اگر ہم ڈراما کے تین اہم عناصر اتحاد زمان، اتحاد مکان اور اتحاد عمل پر غور کر لیں تو نامناسب نہ ہوگا۔ سب سے پہلے ہم اتحاد زمان پر غور کریں۔ اتحاد زمان سے مراد وہ وقت ہے جس میں اس ڈرامہ کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے عام طور پر چوبیس گھنٹہ کا وقت مقرر ہے۔ اس سے زیادہ وقت کی کہانی جو ہیمنوں اور مفتول کے دوران میں ختم ہو جائے بہت مشکل ہے اس لئے اتحاد زمان کو ڈرامہ کو کوئی ایسا قانون سمجھ لینا کہ اس پر عمل ناگزیر ہے غلط ہے۔ اس کو صرف تھیوری تک تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

اتحاد زمان کے بعد اتحاد مکان ہے۔ یعنی ڈراما کے واقعات کو جگہ کی قید لازمی ہے۔ یعنی جس شہر یا جس قصبہ کے واقعات کسی کہانی میں دہرائے جا رہے ہیں وہ اس قصبہ یا شہر سے باہر نہ نکلیں۔ اتحاد مکان کے متعلق ارسطو بالکل خاموش ہے۔ جہاں وہ ڈراما کے متعلق وہ اپنی رائے دیتا ہے وہاں اتحاد زمان کے متعلق تو لکھتا ہے کہ اس کو سورج کی ایک گردش پر ختم ہو جانا چاہئے۔ لیکن اتحاد مکان کے متعلق اس کی کوئی رائے موجود نہیں۔ شکسپیر اکثر اپنے ڈراموں میں اتحاد مکان پر دھیان نہیں دیتا۔ اس لئے ڈراما پر اتحاد مکان کی قید لگانا مناسب نہیں معلوم ہوتی۔

ان دو فعل اتحاد اول کو دیکھ لینے کے بعد ہمیں اب اتحاد عمل پر غور کرنا ہے۔ اتحاد عمل سے مراد صرف ایک پلاٹ نہیں بلکہ مختلف پلاٹوں کا اتحاد مراد ہے کہ وہ سب ایک ہی پلاٹ کے مختلف اجزاء معلوم ہوں اور ان کا علحدہ علحدہ کوئی وجود نہ ہو۔

ابراہیم یوسف

(باقی)

نگار جولائی ۱۹۷۷ء

ایک مستقل کتاب جس کا نام ہے
”۵۵ سال کے بعد“

یہ کتاب نفسیات عمل پر اتنا مفید و دلچسپ لکھی ہے کہ آپ اس کو ایک بار پڑھیں پلنے کے بعد اس وقت تک چھوڑ نہیں سکتے جب تک ختم نہ کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ ا۔

زندہ رہنا بھی ایک فن ہے

اور اگر اس فن کو آپ نے سمجھ لیا تو پھر

۱۔ دنیا کا ہر رنج و الم آپ کے لئے بے معنی ہو جائے گا۔

۲۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات کو کا آغاز ہوگا

۳۔ آپ کی عمر طبیعی کا معیار بالکل بدل جائے گا

۴۔ ان خطا پر عمل اور صیغی کا موجودہ مفہوم قطعاً باقی نہ رہے گا۔

جسم ۶۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے علاوہ محصول

پبلشر نگار لکھنؤ

عورت اور تعلیمات اسلام

از مالک رام ایم۔ اے

تعلقات لوگوں کی طرف سے اسلام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے عورت کی اصلاح اور اس کے حقوق کی حفاظت کا خیال نہیں کیا اور اس کو لونڈی کی حیثیت سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ مالک رام صاحب نے اس تصنیف میں بتایا ہے کہ گوارہ سے لیکر تک عورت کی اور اس کی زندگی کی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو اسلام نے ترک کر دیا ہو اور اس کا اقتدار قائم کرنے کی انتہائی تاکید نہ کی ہو۔ اس کتاب میں عورت سے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس سے بحث نہ کی گئی ہو اور اس التزام کے ساتھ کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف قرآن پاک ہی کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے، چونکہ مالک رام صاحب عربی کے بھی

خامض ہیں اس لئے ان کی یہ کتاب ایک ایسے اسکالر کی دیکھ بھال کا نتیجہ ہے جو تقلید و اتباع سے بے نیاز ہے اور جو ہر استدلال و تامل میں خود اپنی مستحکم رائے رکھتا ہے۔ کتاب نہایت نفیس کاغذ پر پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کی ہے قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

انسان و انسان اعلیٰ

(برنارڈشا کے ڈرامہ کا ایک حصہ)

برنارڈشا کا یہ ڈرامہ **MAN AND SUPERMAN** اس کے بہت اہم اور مشہور ڈراموں میں سے ہے، نہ اس نے کوہ ڈرا کی حیثیت سے اس کا شاہکار ہے بلکہ محض اس نے اس سے برنارڈشا کا فلسفہ حیات اور ابعاد الطبیعیاتی زاویہ نظر واضح ہو جاتا ہے۔

نیاز

منظر:-

..... سر ہنگ کو سامان پر روشنی و سکوت طاری ہے۔ اوزار کی بڑھتی جا رہی ہے۔ آگ کے شعلے ایک بار پھر سفید ماکہ میں دفن ہو چکے ہیں اور ان کی سرخی اب ختم ہو چکی ہے۔ ستاروں بھرے آسمان کے مقابل کوہستانی چوٹیوں کی تاریکی قابل عبور حد تک عمیق نظر آرہی تھی، لیکن اب ستارے غائب ہو چکے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود آسمان کا نیات کے حدود سے باہر دے پاؤں کسی اور طرف چلا گیا ہے۔ کوہسار کے بجائے اب صرت ”لاشے“ ہے۔ ہر جگہ اور ہمیشہ موجود رہنے والی ”لاشے“۔ آسمان — نہ کوہستان — نہ روشنی — نہ آواز — نہ زمان — نہ مکان — بلکہ ایک مطلق خلاء — پھر کاپک کسی جگہ سے ایک کمرورسی زرد روشنی ابھرنی شروع ہوتی ہے، جس کے ساتھ ساتھ کسی آسیبی ساز پر ایک لائقناہی نغمہ نرم و مریض سرور میں بجنے لگتا ہے۔ فوراً ہی دو تین اور خفی رباب اس نغمہ میں اپنی جھنکار شامل کر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی زرد روشنی میں خلاء کے اند ایک انسان ظاہر ہوتا ہے۔ ایک ”فیر جہانی“ کمرورسی انسان — ایک مرد — ”لاشے“ پر تلک —!! — موسیقی اس کے قریب سے ہو کر گزرتی ہے تو ایک ساعت کے لئے وہ اپنا سراوچ اٹھاتا ہے لیکن اس کے بعد ہی ایک بوجھل شہنشاہی سانس کے ساتھ وہ پھر اپنے سر کو انتہائی پاس کی کیفیت میں جھکا لیتا ہے۔ اپنی کوشش میں بایں واکام ہو کر رباب پھر ایک بار اپنا نغمہ ”امیدی کے ساتھ دہراتا ہے اور آخر کار تیز ہوا کے طاغوتی ساز سے اٹھنے والی جھپوں میں یہ راگ دم توڑ دیتا ہے۔

کچھ پر بعد ہی خلا میں ایک اور رنگی سناہ زرد روشنی ظاہر ہوتی ہے۔ اس مرتبہ اس میں نفیشتی جھلک نہیں بلکہ دھوئیں کی سی ناگوار زردی نکلا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک لامحدود حسرت و غم کا ایک گیت خفا میں پھیلنے لگتا ہے۔ یہ ایک اس زرد روشنی میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ ایک ضعیف صورت ہے — دانتوں سے محروم — کمر جھکی ہوئی — خلاء میں آوارہ — وہ کسی مذہبی جماعت و مرتبہ کا امتیازی لبادہ پہنے ہوئے ہے۔ سست و لایس انداز میں وہ ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے ایک شہد کی مکھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کی جگہ و انتہا ہوتی ہے اور اس ضعیف کی آواز بالکل طحال ہے۔ آخر کار اپنی اس آوارہ گردی میں وہ چالکی آکسیجن سے محروم ہوجاتی ہے جس کی اس کو کچھ تھی — یعنی ایک رفیق — ایک تسکین آمیز آواز کے ساتھ یہ غریب بوڑھیا اس مرد کا دامن

زناقت مضبوطی سے پکڑ لیتی ہے اور اسے اپنی خشک دیکھت آواز میں مخاطب کرتا ہے۔

ضعیفہ۔ معاف کیجئے۔ مجھے یہاں کی تنہائی پاگل کر دیتی ہے۔ بڑا خوفناک ہے یہ مقام !

مرد۔ نو وارد ہیں آپ ؟

ضعیفہ۔ ہاں۔ شاید میرا آج ہی صبح مری ہوں۔ میں اپنے گناہوں کا اعتراف کر چکی ہوں۔ زندگی میں مجھے انتہائی مذہبی خوش نصیب تھا۔

میرے بستر مرگ کے چاروں طرف میرے خاندان کے افراد مغموم کھڑے تھے لیکن میں صرف صلیب پر اپنی نگاہیں جھکے ہوئے لیٹی تھی یہاں تک

میرے سانسے تاریکی چھا گئی۔ اور جب ایک بار پھر روشنی ہوئی تو وہ بھی روشنی تھی جس کو میں اچھے ساتھ لئے ہوئے آوارہ کچھو بھی

ہوں لیکن نظر کچھ نہیں آتا۔ میں گھنٹوں سے اس دہشت تک تنہائی میں سرگرداں ہوں

مرد۔ (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) اُن! آپ ابھی تک وقت کے احساس سے آزاد نہیں ہوئیں۔ یہاں ابدیت کی فضا میں یہ احساس

جلد زایل ہو جاتا ہے

ضعیفہ۔ ہم ہیں کہاں ؟

مرد۔ جہنم میں

ضعیفہ۔ (پندار کے ساتھ) جہنم! میں اور جہنم میں!!۔ ایسا کہنے کی جرأت تم کو کیونکر ہوئی ؟

مرد۔ (غیر متاثر انداز میں) کیوں نہیں۔ محترمہ ؟

ضعیفہ۔ تم نہیں جانتے کہ تم کس سے گفتگو کر رہے ہو۔ میں ایک شریف و معزز خاتون ہوں اور کلیسا کی ایک وفادار کینسر۔

مرد۔ مجھے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

ضعیفہ۔ تو پھر میں جہنم میں کیسے ہو سکتی ہوں ؟ ممکن ہے کہ یہ مقام وہ اعوان مطہر ہو جہاں روحانی حقیقت سے پوری طرح پاک و صاف ہونے

کے لئے مجھے بھیجا گیا ہو۔ کیونکہ میں بالکل بے عیب و بیاداع زندگی نہیں بسر کر سکی اور کون ہے جو ایسا کر سکے ؟۔ لیکن جہنم!۔ اُن!۔

تم جھوٹ بولی رہے ہو

مرد۔ جہنم بے محترمہ۔ جہنم! میں یقین دلاتا ہوں۔ جہنم۔ جہنم کا بہترین حصہ۔ یعنی بہت زیادہ دیران لیکن آپ تو شاید

تنہائی پر محبت و معیت کو ترجیح دیں گی

ضعیفہ۔ لیکن میں تو پورے خلوص کے ساتھ توبہ و استغفار کر چکی ہوں۔ میں اعتراف گناہ بھی کر چکی ہوں.....

مرد۔ کس قدر ؟

ضعیفہ۔ اپنے کردہ گناہوں سے کہیں زیادہ!۔ مجھے اعتراف گناہ سے محبت تھی

مرد۔ ادھر! لیکن حقیقت سے زیادہ اعتراف گناہ تو شاید اسی قدر محبوب ہے جتنا کہ حقیقت سے کم گناہ ہوں کا اعتراف۔ بہر حال محترمہ

اب اسے آپ غلط فہمی سمجھیں یا اداوی غلطی لیکن یہ واقعہ ہے کہ آپ بھی میری ہی طرح معصوب و مقہور ہیں۔ اور اب اس کے علاوہ

اور کوئی چارہ کار نہیں کہ اپنی موجودہ حالت کو بہر ممکن صحت سے قابل قبول بنایا جائے

ضعیفہ۔ (غصہ کے ساتھ) اُٹھ! میں اپنی زندگی میں زیادہ بکار ہوتی تو بھی یہی انجام ہوتا۔ میرے تمام نیک اعمال بیکار گئے!۔

یہ انصاف کا خون ہے

مرد۔ نہیں! آپ کو پوری طرح اور صاف صاف الفاظ میں بتا چکا تھا کہ اعمال بے گناہ سے ترقی پانے انصاف ہے اور اعمال نیک کے

لئے انصاف بے ترقی!۔ یہاں ہمارے ساتھ بہت سے نیک انسان بھی موجود ہیں

ضعیفہ - کیا تم ایک نیک انسان تھے ؟

مرد - میں ایک قاتل تھا

ضعیفہ - قاتل ! - ات ! - یہ آخر مجھے یہاں قاتلوں کے گروہ میں رہنے کے لئے کیوں بھیجا گیا ؟ - میں اس قدر بے کار تو نہ تھی - میں ایک نیک

عورت تھی - ضرور کوئی غلطی ہو گئی ہے - میں اس غلطی کو کیسے اور کہاں دہرا سکتی ہوں ؟

مرد - مجھے معلوم نہیں کہ یہاں غلطیاں دست بھی پہنکتی ہیں یا نہیں - لیکن گمان غالب یہ ہے کہ اگر یہاں کوئی غلطی سرزد ہو بھی جائے تو اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا -

ضعیفہ - لیکن میں اس غلطی کی صحت کے لئے کسی سے درخواست کر دوں ؟

مرد - اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو ابلیس سے درخواست کرتا محترمہ ! - وہ اس مقام کی رقم و راہ کو سمجھتا ہے - میری سمجھ میں تو یہ جگہ آج تک نہیں آ سکی -

ضعیفہ - ابلیس ! - میں اور ابلیس سے کلام کر دوں !!

مرد - محترمہ ! جہنم میں ابلیس ہی بہترین سوسائٹی کا رہنما ہے -

ضعیفہ - بد معاش ! میں خوب سمجھتی ہوں کہ میں جہنم میں نہیں ہوں -

مرد - یہ آپ کیسے سمجھتی ہیں ؟

ضعیفہ - یہ ایسے کہ یہاں مجھے کوئی تکلیف یا اذیت محسوس نہیں ہوتی -

مرد - اوہو ! تب تو آپ کو یہاں بھیجے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی - آپ پر دانستہ عذاب نازل کیا گیا ہے -

ضعیفہ - یتیم کیسے کہہ سکتے ہو ؟

مرد - اس لئے کہ جہنم ایک مقام ہے بدکار و بد نفس انسانوں کے لئے - بد نفس لوگ یہاں بالکل راحت سے رہتے ہیں کیونکہ یہ جگہ بنائی

ہی گئی ہے ان لوگوں کے واسطے - آپ کہتی ہیں کہ آپ کو کوئی تکلیف یا اذیت محسوس نہیں ہو رہی ہے - اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں

کہ آپ بھی انھیں میں سے ایک ہیں جن کی بدولت جہنم زندہ ہے -

ضعیفہ - کیا تمہیں کوئی اذیت و تکلیف محسوس نہیں ہوتی ؟

مرد - میں بد نفس لوگوں میں سے نہیں ہوں محترمہ ! - اس لئے جہنم میں مجھے کوفت ہوتی ہے - ایسی کوفت جو بیان سے باہر ہے -

- یقین سے ماورا -

ضعیفہ - تم بد نفس لوگوں میں سے نہیں ہو ! - تم نے کہا تھا کہ تم ایک قاتل تھے -

مرد - ہاں - مگر وہ تو صرف ایک دست بردست جنگ کا واقعہ تھا - میں نے اپنی تلوار ایک ایسے بوڑھے شخص کے جسم میں اتار دی تھی جو اپنی

تلوار کو میرے جسم میں پیوست کرنے کی کوشش کر رہا تھا -

ضعیفہ - اگر تم بد نفس انسان تھے تو تمہاری اس حرکت کو قتل نہیں کہا جاسکتا -

مرد - بوڑھے شخص نے اسے قتل ہی قرار دیا کیونکہ بقول خود وہ اپنی لڑائی کی مصمت و آمرد کی حفاظت کے واسطے شمشیر کی تھوڑی سی حرکت

اس داستان کو مختصر طور پر بیان کی تھی کہ اپنی حماقت سے میں اس لڑائی کی محبت میں گرفتار ہو گیا - میں نے اظہارِ جذبات کیا تو وہ

وجہ اٹھی اور اس بوڑھے شخص نے امانت آمیز الفاظ کے بعد مجھے قتل کر ڈالا -

ضعیفہ - تم ہی اپنے باقی تمام جہانوں کے مانند تھے - قاتل - تمام - سب کے سب !

مرد - بلکہ اس سے بھی کم دو دن یہاں ایک ساتھ رکھے گئے - محترمہ !

مرد — پختہ عمر ہے محترمہ! — لیکن جنیم میں بڑھاپا ناقابل برداشت چیز ہے۔ اس میں حد سے زیادہ حقیقت ہوتی ہے۔ یہاں ہم "محبت" اور "حکمت" کی پرستش کرتے ہیں۔ چونکہ ہماری دھمیں مستحب و مقہور ہیں اس لئے ہم اپنے تلوہا میں نشوونما پیدا کرتے ہیں ایک ۷۷ سال کی معزز خاتون کی حیثیت سے آپ جنیم میں کوئی دوست نہ پاسکیں گی۔

ضعیفہ — لیکن اپنی عمر کا میرے پاس علاج ہی کیا ہے؟
مرد — آپ پختہ عمر کر رہی ہیں کہ آپ اپنی عمر کو اپنے پیچھے چھوڑ آئی ہیں۔ آپ کی عمر اب ۷۷ سال ہے اور ۷۷ سال — نہ، اس سال ہے اور ۷۷ سال!

ضعیفہ — واہیات!
مرد — غور کیجئے محترمہ — کیا میرے یہ الفاظ صحیح نہیں؟ — اور کیا یہ اُس وقت بھی اسی قدر صحیح نہ تھے جبکہ آپ کرہ ارضی پر زندہ تھیں؟ — جب آپ ۷۷ سال کی عمر کو پہنچیں تو اپنی ہجرتوں اور سفید بالوں کے نیچے کیا آپ خود کو درحقیقت اس سے زیادہ بوڑھا محسوس کرتی تھیں جتنا کہ ۳۰ سال کی عمر میں؟

ضعیفہ — نہیں! — بلکہ اور زیادہ جوان! — ۳۰ برس کی عمر میں تو میں ایک بیوتون عورت تھی۔ مگر خود کو جوان محسوس کرنے اور دوسروں کو بوڑھا نظر آنے سے فائدہ کیا؟

مرد — اب آپ سمجھیں محترمہ، ظاہری شکل محض ایک سرباب تھی۔ آپ کی جھڑپاں ٹھیک اسی طرح جھوٹ بولتی تھیں جس طرح بہت سی مردہ طبیعت سترہ سالہ احق لڑکیوں کی نرم جلد اُن کی عمر کی بات جھوٹ بولتی ہے۔ سنئے! یہاں ہم ہم نہیں رکھتے۔ ایک دوسرے کو ہم جسمانی شکل میں دیکھتے ضرور ہیں لیکن یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ جب ہم زندہ تھے تو اس وقت ہم نے ایک دوسرے کا تصور کرنا اسی طرح سیکھا تھا۔ اور ہم اب تک اپنی شکلوں کا تصور اسی طرح کرتے ہیں کیونکہ کوئی اور بہتر طریقہ ہمیں معلوم نہیں۔ لیکن ہمیں یہاں یہ قدرت نصیب ہے کہ جو عمر بچا ہیں اختیار کر کے ایک دوسرے کے سامنے ظاہر ہوں۔ آپ اپنی قدیم شکلوں میں سے کسی ایک کا صرف ارادہ کر لیجئے۔ فوراً آپ کی صورت اسی قسم کی ہو جائے گی۔

ضعیفہ — ایسا ہونا ممکن نہیں۔

مرد — آزمائش کر لیجئے۔

ضعیفہ — اچھا۔ سترہ سال!

مرد — ٹھہرئے۔ اس سے پیشتر کہ آپ کسی خاص عمر کی تعین کا فیصلہ کریں، بہتر ہے کہ میں آپ کو بتا دوں کہ ان معاملات کا یہاں سے گہرا تعلق ہے۔ بعض اوقات یہاں کے باشندوں کو "سترہ سال" کا شوق و جنون ضرور پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ جذبہ بہت دھلکا قائم نہیں رہتا۔ آج کل یہاں کے فیشن میں انسانی عمر چالیس سال یا پلوں کہئے کہ ۳۷ سال ہے۔ لیکن اس رواج میں بھی اب تغیر کے آثار نمایاں ہیں۔ اگر آپ ۷۷ سال کی عمر میں حسین تھیں تو میں مشورہ دوں گا کہ آزمائش کے لئے اسی کا انتخاب کیجئے اور جنیم میں ایک جدید فیشن قائم کر دیجئے۔

ضعیفہ — تمہارے ایک لفظ کا بھی مجھے یقین نہیں۔ بہر حال ۷۷ سال ہی سہی۔ (ایک تیز چھپک!) — بوڑھی عورت ایک نوجوان لڑکی میں تبدیل ہو جاتی ہے جو زندگی برق لباس زیب تن ہوئے ہے اور اس قدر خوبصورت ہے کہ اس کا گرد ہلکی نندہ روشنی کا حلقہ یکایک اپنی تانی روشنی اختیار کر لیتا ہے۔ (-----)

مرد — سارہ!

سارہ — کیا؟ — تم مجھے جانتے ہو!

سارہ - بد معاش! میں نے زندگی بھر اس کے ماتم میں سیاہ لباس پہنا ہے۔

فرزان - بیشک! اس لئے کہ تمہیں زیب دیتا تھا۔ لیکن زندگی بھر ماتم کرنا اور بات ہے اور پوری ابدیت تک سو گوار رہنا بالکل وہ سری چیز ہے۔ علاوہ اس کے یہاں تو تم بھی اسی قدر مردہ ہو جتنا کہ وہ۔ کیا اس سے زیادہ مضحکہ خیز اور کوئی چیز ہو سکتی ہے کہ ایک مردہ انسان دوسرے مردہ انسان کا ماتم کہہ رہا ہو جس کی ضرورت نہیں، عزیز سارہ! اور نہ خائف ہونے کا موقع۔ جہنم میں لغوات کی کمی نہیں، (یہاں اس کے علاوہ بمشکل ہی کچھ اور مل سکے گا)۔ لیکن موت - عمر - اور انقلاب کی لغویت جہنم میں ختم ہو جاتی ہے کیونکہ یہاں ہم سب مردہ ہیں اور سب کے سب جاوداں۔ یہاں کی رسم و راہ کو تم جلد سمجھ جاؤ گی۔

سارہ - اور کیا یہاں سب مرد مجھے "عزیز سارہ" کہہ کر خطاب کریں گے؟

فرزان - نہیں! یہ تو میری زبان کی لغزش تھی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔

سارہ - (تقریباً محبت آمیز انداز میں) فرزان! کیا تمہیں اس وقت واقعی مجھ سے محبت تھی جبکہ تم نے میرے ساتھ اس قدر شرمناک سلوک کیا تھا؟

فرزان - (بیمینی سے) اُن! میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ محبت کا افسانہ نہ چھیڑو۔ یہاں لوگوں کے لبوں پر محبت کے علاوہ اور کوئی ذکر ہی نہیں محبت کا حسن۔ محبت کی تقدیس و پاکیزگی۔ محبت کی روحانیت اور محبت کی نہ جانے کیا کیا بات!۔ معاف کرنا۔ واقعی مجھے تو اس سے کوفت ہوتی ہے بے انتہا۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ جس شے کے ذکر سے وہ کرتے رہتے ہیں وہ دراصل ہے کیا شے!۔ میں جانتا ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں محبت کی تکمیل حاصل ہو گئی ہے کیونکہ اب وہ کوئی جسم نہیں رکھتے۔ محض تصوری نفسانیت اور دوسرا پرستی ہے!۔ سرسرا لغو!

سارہ - کیا موت بھی تمہاری روح کو آلائشوں سے پاک کرنے میں ناکام رہی فرزان؟ کیا دنیا کی عدالت کا وہ خوفناک انصاف بھی جہنم کی یادگار میرے باپ کا مجسمہ ہے تمہیں خوف و ادب نہیں سکھا سکا؟

فرزان - ہاں خوب یاد آیا۔ کہو! اب تمہیں اہل کی وہ یادگار۔ وہ مجسمہ۔ کس حال میں ہے؟

سارہ - اس پر میری کثیر رقم صرف ہوئی تھی۔ خانقاہ کے مدرسے کے لڑکے اسے چین نہ لینے دیتے تھے۔ ان میں جو شرم سے وہ اسے توڑنے پھوٹنے رہتے تھے اور جن کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا وہ اس پر اپنا نام لکھ ڈالتے تھے۔ دو سال کے عرصے میں اس مجسمہ کی تین جگہیں بدلتی گئیں اور آٹھ گیلوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ آخر میں نے مجھ کو اسے اس کی قیمت پر چھوڑ دیا۔ مجھے خوف ہے کہ اب تو بدشت لگ چکی اُس کی صورت مسخ ہو گئی ہوگی۔ آہ میرا غریب باپ!

فرزان - خاموش!۔ سنو!۔ (کیا ایک کسی مخفی ساز سے دو بلند آوازیں پیدا ہوئی ہیں جو بتدریج دھم دھم ہوتی جا رہی ہیں۔۔۔۔۔) اوہو! یہ تو وہی لقمہ ہے جو وزارت نے مجسمہ کے متعلق بنایا تھا۔ یہ تمہارے باپ کی آدھا اعلان ہے۔ بہتر ہے کہ تم غائب ہو جاؤ اُسوقت تک کہ میں اُسے ملاقات کے لئے تیار نہ کر لوں۔ (وہ غائب ہو جاتی ہے)

دخلا کے اندر سے سفید رنگ مرعوب ایک دیہات مجسمہ نوہا ہوتا ہے جس کا ایک شاخدار سرسبز مرد کا شکل میں جھانسا گیا ہے لیکن وہ اپنی شان و شوکت کی طرف سے ہلک انتہائی ہے پروائی اختیار کئے ہوئے ہے۔ اُس کے قدم بہت سبک و چھلکے ہیں اور اُس کے چہرے کی ہر ایک جھری سے "میں تعطل" کی سی مسرت ٹپک رہا ہے۔ اپنے متناسب جسم کو وہ جس مستعدانہ ہی میں رکھتا ہے وہ سبک و چھلکے کا ہے۔ اُس کی مویچوں کے سبب اس کی طرف مڑنے ہوتے ہیں۔ پلکار کا نہیں کی طرح۔ جس سے اُس کی شان و درجہ میں اضافہ ہو گیا ہے۔ فرزان کے ساتھ اُس کے تعلقات آہستہ آہستہ

(.....)

فرزان - آہ - دوست! - تم آگے! - موزارت نے جو نغمہ تمھارے لئے لکھا ہے تم اسے کیوں نہیں سیکھ لیتے؟
مجسمہ - برہمنی سے اُس نے یہ نغمہ تمھاری آواز کے لئے لکھا ہے اور میری آواز پر ایک ہے - غیر - ہاں کہو تم نے توبہ کر لی یا نہیں؟
فرزان - تمھارا خیال مجھ پر اس قدر غالب رہا کہ میں توبہ نہ کر سکا۔ اگر میں ایسا کر لیتا تو پھر تمھیں یہاں جنت سے آکر میرے ساتھ گفتگو کا موقع کیسے ملتا؟
مجسمہ - صحیح ہے۔ اپنے رویہ پر اسی طرح قائم رہو دوست - میری تمنا ہے کہ میں تمھیں قتل کر ڈالتا - اور یقیناً میں ایسا کر لیتا اگر ایک حادثہ واقع نہ ہوا ہوتا۔ پھر تو میں یہاں تمھاری جگہ آجاتا اور تمھیں زندہ رہنے کے لئے ایک مجسمہ اور محصوم دیا کرتا شہرت ملتی - غیر جانے دو ان باتوں کو - کہو کوئی نازہ خبر؟

فرزان - ہاں - تمھاری لڑکی مر گئی ہے -
مجسمہ - (حیرت سے) میری بھلی؟ - (دکرتے ہوئے) ہاں ہاں - وہی نا جس کی محبت میں تم بچنس گئے تھے - اب سمجھا میں - ہاں تو اس کا نام کیا تھا؟

فرزان - سارہ -
مجسمہ - یقیناً - سارہ! - بڑی خوبصورت تھی وہ بشرطیکہ میرا حافظہ غلطی نہ کرتا ہو۔ کیا تم نے اُس کے شوہر کو مطلع کر دیا ہے؟
فرزان - اپنے دوست فرزادی کو؟ - نہیں - سارہ کی آمد کے بعد میں نے اُسے اب تک نہیں دیکھا۔
(سارہ غضب آلود انداز سے روشنی میں نمودار ہوتی ہے)

سارہ - کیا مطلب ہے اس کا؟ - فرزادی یہاں اور تمھارا دوست! - اور تم آبا جان میرا نام بھی بھول گئے؟ تم یقیناً پتھر میں تبدیل ہو گئے ہو۔

مجسمہ - عزیزہ! - بنہیت زندہ جہانی شکل کے اس مرمی میں میری اس قدر زیادہ تعریف و توصیف کی گئی کہ میں نے اسی صورت و شکل کو اختیار کرنا مناسب سمجھا - یہ تو تم بھی تسلیم کرو گی کہ وہ سنگتراش اپنے عہد کا ماہر ترین انسان تھا۔

سارہ - آہ! - یہ غرور و پندار ہے! - ایسی خود پرستی! - اور تم!
مجسمہ - آہ میری بیٹی! تم زمین پر اتنی مدت تک زندہ رہیں کہ اس انسانی کورہی کے حدود سے گزر گئیں۔ اب تمھاری عمر صرف ۸۰ سال کی ہو گئی میرا شہ
حیات تو صرف ۶۴ سال کے سن میں ایک حادثہ کی بنا پر منقطع ہو گیا تھا۔ اس لحاظ سے اب میں سن و سال میری تم سے کہیں چھوٹا ہوں۔ علاوہ
انز میری کچی یہاں آکر وہ شے جسے ہمارا آزاد منش دوست فرزان "شاہ پندار" دانش مندی کا ڈھونگ " قرار دیتا ہے! لکل تم ہو جاتی ہو
میں التجا کرتا ہوں کہ اب تم مجھے اپنا ہی سایا ایک "ذی حیات" شخص سمجھو - آپ نہیں -

سارہ - تم بھی اسی بدعاش کی سی باتیں کرتے ہو۔

مجسمہ - فرزان بڑا مفکر ہے - سارہ! - ایک بڑا شہساز گہرا ایک اچھا مفکر۔

سارہ - (دہشت محسوس کرتے ہوئے) اب میں کچھ سمجھتی جا رہی ہوں تم دونوں شیطان ہو میرا ذوق اکٹبا ہے ہو بہتر موزارتا کہ میں خدا سے دعا کرتی -
مجسمہ - (اُسے تسکین دیتے ہوئے) نہیں نہیں نہیں - میری بچی! - دعا کرو - اگر تم ایسا کر دیتی تو یہاں رہتے تالین کو ایک خاص فائدہ حاصل ہے کہ ضایع
کر دو گی - یہاں پھانگ پر یہ الفاظ تحریر ہیں کہ: "اے اللہ داخل ہونے والے! ہر ایک کے اپنے کچھ حصہ مل جائے" خدا سوچ کس قدر سکون و راحت کی چیز ہے! یہ
کیونکہ امید آخر ہے کیا؟ - اخلاقی ذمہ داری کی ایک شکل ہے یہاں کوئی امید ہے نہیں اور اس لئے یہی فرض ہے اور کوئی کام - یہاں
دعا و عبادت سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اپنی حسب مشاء و اعمال سے کوئی نقصان - مختصر یہ کہ مجسمہ کہ جنم ایک ایسا مقام ہے جہاں تمھیں اپنی
مست تفریح کے حصول کے علاوہ اور کوئی کام ہلکی نہیں - (دفرانہ ایک گہری شہنشاہی سانس لیتا ہے) تم شہنشاہی سانس لیتے ہو دوست تو سنو؟ لیکن
اگر تم میری طرح جنت میں آباد ہوتے تو تم کو یہاں جو فائدہ حاصل ہے اس کا احساس کر سکتے - (راتی)

تکرار مضمون

ہم نے مکتا پیل - مئی - جون ۱۹۵۷ء میں اصولی سرحد کی بحث میں شاعر کی اس نفسیاتی کیفیت سے گفتگو کی تھی کہ جب وہ کسی دوسرے شاعر کا ایسا مضمون سنتا ہے جو اس کے مذاق طبیعت کے مطابق ہو اس کی حالت کیا ہوتی ہے۔ آج ہم بتانا چاہتے ہیں کہ ہر شاعر کے کلام میں وہ اس کے مستقل نظریات کے متعلق جو اشعار ملتے ہیں ان میں ترقی و تفرق کے پیشمار کیفیات موجود ہوتی ہیں۔ مگر چونکہ ہمارے شعرا کے دواویس دین فارشائع ہوتے رہے ہیں اس لئے یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے کہ کونسا شعر پہلے کہا گیا ہے اور کونسا بعد میں۔ ورنہ اس کی مثالیں بکثرت مل جاتیں۔ جس مضمون کو بعد ہی پہلے بہتر طریقہ پر ادا کر دیا گیا ہے بعد میں اسی مضمون کا دوسرا شعر کہا گیا اور وہ پہلے کی نسبت کم تر ہے۔ ہم یہاں کافی کے لام سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں جس سے ہمارے اس خیال کی تصدیق ہو سکے گی۔ پہلی مثال ۱۔

وہ بدگمان کہ مجھے تاب رنج زیت نہیں مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا
دوسرا شعر ملاحظہ ہو:-

تو نے کرم کیا تو بعنوان رنج زیت غم بھی مجھے دیا تو غم جاوداں نہ تھا
پہلے شعر میں ایک معقول بات معقول پیرایہ بیان میں کہی گئی ہے اور شعر میں نورت موجود ہے مطلب یہ ہے کہ تمام رنج و غم وابستہ حیات ہے اور زندگی خود محدود و مختصر ہے۔ اس لئے جو غم مجھے دیا گیا ہے وہ بھی عارضی ہے جاوداں نہیں۔ لہذا مجھے تو غم جاوداں نہ ملنے کا غم ہے اور وہ بدگمان سمجھتا ہے کہ مجھے ”تاب رنج زیت نہیں“۔ اس میں اپنی ہمت کی بلندی اور انسانی مجبوری کو پیش کیا ہے۔ دوسرے شعر میں خود اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ مجھے صرف ”رنج زیت“ ہے اور چونکہ زندگی عارضی ہے اس لئے یہ غم بھی غم جاوداں نہیں۔ اس شعر میں صرف انسانی مجبوری کو پیش کیا ہے۔ پہلا شعر اقیات میں ہے اور دوسرا عرفانیات میں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا پہلے کہا گیا ہے اور دوسرا بعد میں۔
دوسری مثال - اقیات کا ایک شعر ہے:-

اپنے دیوانہ پر اتام کرم کر یارب درو دیوار دے اب انھیں دیوانی ہے

”اتام کرم“ کی تفصیل کتنی بلند ہے اور اس میں کیسی دلاؤ و تیزی اور جاویدیت ہے۔ پھر اتام کرم اور وہ بھی ”اپنے دیوانہ پر“ کس قدر ناز و لطیف ہے۔ شعر میں کوئی لفظ زائد یا غیر ضروری نہیں ہے جس سے شعر میں غیر معمولی برستگی پیدا ہو گئی ہے۔ خانی کے اس شعر کے ساتھ غالب کے اس شعر کو بھی یاد رکھنا چاہئے۔
سرمایہ کرامت کن و انگاہ بغارت بر
بر خرمن دیرتے بر مزمردہ باران شو
خانی کے دوسرے مصرعہ کی دعا غالب کے پہلے مصرعہ میں آگئی ہے اور دوسرے مصرعہ میں انرا دعا کو قالم رکھتے ہوئے غالب نے پہلے مصرعہ کی تفصیل بڑی خوبی سے کی ہے۔ اس عالم کا نظام کچھ اس طرح واقع ہوا ہے کہ قدرت کسی پر اتام نعمت کبھی نہیں کرتی اور انسان جس قدر سامان نعمت و آسائش خواہے کچھ کہے کہ اس کو مدد دے کہ وہ کمزور ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسی بات کو غالب نے ایک دوسرے شعر میں یوں ظاہر کیا ہے:-

خوشی کا کھیت نہ ہو اگر سوا ماہر آوے سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈ ہے ابھی سے برقی خرمن کو

لیکن اس کے باوجود انسانی ہمت کہ ایک انسان ہر عمل عطا ہوا ہے کہ انسانی اپنی طلب و کوشش میں کوتاہی نہیں کرتا اور عشق میں انسانی ہمت و جرأت ہر لمحہ کے ساتھ نقصان برداشت کرنے کی قوت ترقی کرتی رہتی ہے۔ غالب اور غالب نے اپنے اپنے اشعار میں عشق کی اسی

بند فطرت کو پیش کیا ہے فانی کے اس شعر کی بلندی کو نظر میں رکھتے ہوئے ان کا دوسرا شعر دیکھنا چاہئے جو جدا نیات کلام فانی کا آخری مجرور ہے۔
 درد ویا کرم کیا اب اسے لا دوا بنا
 شیشہ دل عطا کیا اب اسے پاش پاش کر
 اس شعر میں ”درد“ اور ”شیشہ دل“ پہلے شعر کے ”درد ویا“ کے مقابل استعمال کئے گئے ہیں اور اسی طرح ”لا دوا بنا“ اور ”پاش پاش کر“ پہلے شعر کے ”دیرانی دے“ کے ہم معنی ہیں۔ لیکن پہلے شعر میں جو بات صرف ایک مصرعہ میں آگئی ہے یہاں پورا شعر اُس کے لئے کہا گیا ہے اور پھر بھی وہ بات پیدا ہو سکی۔ اس شعر میں نئی بات ہے مگر زبان میں کوئی جدت ہے، علاوہ اس کے غیر زوری طویل کلام کے باعث شعر کو بندش میں سستی پیدا ہو گئی ہے۔ خان آرنو کا مشہور واقعہ ہے کہ انھوں نے مطلع کہا تھا کہ:

سیر چرمی بدست آں نگار ناز میں دیدم
 بشاخ صندلین پیچیدہ مارے غبریں دیدم
 اتفاق سے کوئی ایرانی ادھر آنکلا۔ خان موصوف نے اپنا مطلع اُسے سنایا اُس نے بہت تعریف کی اور آخر میں ہلاکہ ”خوب گفتی اما خیل طول گفتی پھر قورے توقف کے بعد خان موصوف کو یہ مشورہ دیا کہ شعر کو اس طرح کر دو۔

سیر چرمی بدست آں نگارے
 بشاخ صندلین پیچیدہ مارے
 ظاہر ہے کہ اس اختصار کلام نے شعر میں کس قدر زور و اثر پیدا کر دیا۔ فانی کے شعر سے بھی اگر مذکورہ الفاظ کم کر دیے جائیں۔ تو شعر زور و اثر ہو جائے گا۔ خود کلام فانی میں اس اصول اختصار کی ایک عمدہ مثال موجود ہے۔ باقیات فانی کا ایک شعر ہے:-
 اچھا یقین نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
 اک تو ہی نا خدا نہیں ظالم، خدا بھی ہے
 شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن طرز بیان ایسا عمدہ ہے کہ خواہ مخواہ ایک لطافت پیدا ہو گئی ہے۔ جذبہ خود پرستی کے خلاف یہ ایک عمدہ اور دلآویز طرز بیان ہے۔ پہلے مصرعہ میں ”اچھا یقین نہیں ہے تو“ قایل کے اطمینان اور یقین اور مضبوط و راسخ اعتقاد کو ظاہر کر رہا ہے یعنی مجھے تو اس پر پورا اعتماد و اعتقاد ہے اگر تجھے یقین نہیں ہے تو پھر تجھ کو دیکھ۔ فانی کے اس شعر کا مافذ غالباً حضرت امیر خسرو کا یہ شعر ہے:-
 نا خدا در کشتی اگر نباشد گو مباشش
 نا خدا داریم مارا نا خدا در کار نیست
 لیکن حضرت امیر کے شعر میں خدا پر توکل کر لینے کی تلقین ہے اور فانی نے اس میں ایسی وسعت پیدا کر دی ہے کہ حضرت امیر کا کل مضمون بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ صرف دوسرے مصرعہ میں آگیا ہے۔ خسرو نا خدا کی غیر موجودگی میں خدا پر توکل کرتے ہیں۔ فانی نا خدا کی اس خود پرستی کو حقارت سے دیکھتے ہیں کہ وہ کشتی کے ڈوبنے اور تیرنے کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں ”ظالم“ کتنا بیغ ہے۔
 فانی کا دوسرا شعر اسی مضمون کا جدا نیات میں ہے:-

کشتی اعتبار توڑ کے دیکھ
 کہ خدا بھی ہے نا خدا ہی نہیں
 جو مضمون پہلے شعر میں کہا گیا ہے بالکل وہی دوسرے میں ہے لیکن اختصار کی وجہ سے دوسرے شعر میں برجستگی زیادہ ہے۔
 نظم و نثر کا فرق زیادہ تر زبان اور طرز بیان سے متعلق ہے۔ جن خیالات کو نثر میں بیان کیا جاتا ہے وہی نظم میں بھی ادا کئے جاتے ہیں لیکن شعر کی زبان نثر سے زیادہ شمسہ و شائستہ اور طرز بیان زیادہ برجستہ ہوتا ہے اور اسی لئے اختصار کلام محاسن شعر میں شمار ہوتا ہے تیسری مثال۔ باقیات کا ایک شعر ہے:-

اں فسانہ سن گئے اگ کہ گئے
 میں جو رو یا مسکرا کر رہ گئے
 محبوب کے سامنے رونے میں غم عشق کی ایک پوری داستان مضمر ہے اور عاشق مجبور کے اس گریہ پھر اور محبوب کا جسم ایک دوسرا فضا ہے جس میں عشق کی مجبوری اور صحن کا استغنا، دونوں موجود ہیں۔ برقیاتی تیرنے بھی اس خیال کا شعر کیا ہے:-
 بھگو روتا دیکھ کہ وہ ہمیں دئے
 برق چلی ابرار اہل سم را
 تیرنے اپنے رونے اور محبوب کے نہنے کی ایسی عمدہ تشبیہ نظم کر دی ہے کہ اس سے لفظ ”نغم“ عشق پر بھی لانی رہ سکتی ہے لیکن فانی

کہ فسادہ میں جتنی گہرائی ہے وہ تیرے "برق و باران" میں نہیں ہے اسی مضمون کو فانی نے دوسری جگہ یوں ظاہر کیا ہے :-
ان کے آگے جب یہ آنکھیں ڈبڑا کر رہ گئیں وہ حیا پر درنگا ہیں مسکرا کر رہ گئیں
لیکن پہلے شعر میں پہلے مضمون صرف دوسرے مصرع میں ادا ہو گیا ہے اور پہلے مصرع میں ایک دوسری ہی بات کہی گئی ہے جو بجائے خود نہایت لطیف ہے۔ ثانیاً شعر میں غیر ضروری طول کلام کے ساتھ صرف اظہار واقعہ کیا گیا ہے۔ طرز بیان کی دلکشی کے علاوہ اس شعر میں کوئی کیفیت بھی نہیں ہے۔
جو تھی مثال - باقیات کا ایک شعر ہے :-

سایہ بھی جس پر میرے نشین کا پڑ گیا کیوں آسمان وہ باغ ہی سارا اجڑ گیا
شاعر اس بات کو جانتا ہے کہ وہ سیرت و تیر و نصیب ہے۔ یہ بات بھی اس کے پیش نظر ہے کہ بختوں کا اثر صحبت خوش نصیبوں کے لئے بھی اچھا نہیں۔ یہ بھی اس کو یقین ہے کہ دنیا میں تباہی اور بربادی جو کچھ بھی آتی ہے وہ گردشِ افلاک کی وجہ سے آتی ہے۔ یہ بھی اس پر روشن ہے کہ فلک اس کے ستارے کے لئے اس کے آشیانے کی بریادی کے درپے ہے وہ ان تمام امور کو اس انداز میں کیجا کر دیتا ہے کہ شکایت تو صرف آسمان سے ہے لیکن اس شکایت کے اندر اپنی کل روئداد و رد و جمیع کر دی ہے۔ اسی مضمون کا دوسرا شعر عرفانیات میں ہے :
اس دلِ دیوانہ کی ویرانہ سازی کچھ نہ پوچھ اس نے جب اور چین کا کیا بیاں ہوگا
اس شعر میں شکایت آسمان کو کم کر دیا ہے جو نہایت ہی زور دار کلمہ تھا۔ اس کے کم ہو جانے سے شعر میں وہ لطف باقی نہ رہا۔ کیونکہ پہلے شعر میں یہ تمام مضمون کنایہ کے طور پر ادا ہوا ہے اور دوسرے میں وضاحت کے ساتھ اسکو مرزا غالب کی زبان سے سنئے فرماتے ہیں کہ :
دوش کنز گردش بختم گلہ بر روئے تو بود چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود
فانی کے دوسرے شعر میں سیدھا سادہ مضمون ہے نہ اس میں جدت ہے نہ طر فگی۔ کلام فانی میں ہم کو ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ بعد کا کہا ہوا شعر پہلے کہے ہوئے شعر سے بڑھ گیا ہے۔ باقیات کا ایک شعر ہے :-

دل میں سما کے پھر گئی آس بندھا کے پھر گئی آج نگاہ دوست نے کعبہ بنا کے ڈھادیا
"نگاہ دوست" نے دل میں سما کے ایک آس پیدا کی اور امید ہی تمام اعمال انسانی کا مرکز ہے۔ اور کعبہ کی مرکزیت بھی مسلم ہے۔ دوسرے نگاہ دار نے قلب میں پاکی اور جلا پیرا کی اس کی وجہ سے بھی دل میں کعبہ کی سی طہارت پیدا ہو گئی۔ جب وہی نگاہ جو مہمار کعبہ تھی پھر گئی تو یاس و نو میدی کی تارکیاں دل پر مسلط ہو گئیں اور جو کعبہ بنایا تھا وہ منہدم ہو گیا۔ نگاہ یار کی کرشمہ کاری پر ایسا ہی ایک شعر اور کہا ہے جو عرفانیات میں ہے۔
پھر اک گھر مست کہ بے کیف ہے عالم، میخانہ بیک گردش پیانہ بنا دے
یہ شعر پہلے شعر سے کہیں بلند ہے۔ باقیات کا ایک شعر ہے :-

تیر میں جاسطے سے تو قطع نظر کر کے دیکھ قطرہ قطرہ میں سمندر ہے نظر پیدا کر
سمندر کی حقیقت قطرہ میں پوشیدہ ہے، کیونکہ سمندر خود کوئی چیز نہیں ہے طول کے مجموعہ کا نام سمندر ہے اور اس طرح سمندر کی حقیقت ہر قطرہ میں مستور ہے۔ اسی مضمون کا دوسرا شعر عرفانیات میں ہے :-

ذره میں ہے گم وسعت صد عالم صحرا ذرہ کو سمجھ وسعت صحرا سے گزر جا
اس شعر میں مضمون زیادہ بلند ہو گیا ہے کہ صحرا کی وسعت اور پہنائی ہر ذرہ میں گم ہے وہ بھی ایک صحرا کی نہیں "صد وسعت صحرا"۔ دوسرے شعر میں پہلے کی نسبت وسعت زیادہ ہے۔ علاوہ انہیں دوسرے شعر میں کم سے کم الفاظ میں وہ تمام مضمون آگیا ہے جو پہلے شعر میں ہے۔
اپنے مضامین میں خود ہی اضافہ کرنے کی اکثر مثالیں اس وقت بھی ہمارے سامنے موجود ہیں گو ہم ان اشعار کے متعلق یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ مضمون پہلے کہا گیا تھا اور بعد مضمون بعد میں۔ اس لئے ہم ان اشعار کو صحیح نہیں کرتے البتہ ایک مثال جگر و آبدی کے کلام سے پیش کرتے ہیں جسکے بارہ میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ شعر ہے :-

ترسے جلووں میں گم ہو کر خودی سے بختبر ہو کر تمنا ہے کہ وہ جاؤں زمزم تا پا نظر ہو کر
یہ شعر عشق کے ایک ابتدائی مرحلہ سے متعلق ہے جبکہ حسن سے لگاؤ بدرجہ اتم ہوتا ہے اور عاشق محبوب کے جلووں میں گم ہو جانے کی تمنا کرتا ہے اور اسکو
خبر نہیں ہوتی کہ جمال محبوب خود اسکی ذات میں کیا انقلابات پیدا کرے گا باعث ہے۔ یہ شعر جس مقام کی تفسیر ہے وہ اہل نظر کے نزدیک
ہوس سے قریب تر ہے۔ اس کے بعد ایک وقت آتا ہے جب خود عاشق کی ذات میں انقلابات واقع ہونے لگتے ہیں اور وہ جن جلوؤں کی تمنا کرتا تھا
ان کی تاب اب اس میں نہیں رہتی تو کہتا ہے کہ:-

خود ہوئی گم ہمیں بھی کھو بیٹھی نگہ بار یاب نے مارا

اس مقام سے بھی جب عاشق آگے بڑھتا ہے تو ایک منزل آتی ہے جہاں عاشق کے خیالات کا انتشار بالکل رفع ہو کر کامل کیسوفی پیدا ہو جاتی ہے اس مقام
کی حالت یہ ہے کہ:- جگر وہ حسن کیسوفی کا منظر یاد ہے اب تک نگاہوں کا سمٹنا اور ہجوم نور ہو جانا
جب یہ مرحلہ بھی طے ہو جاتا ہے تو ایک اور مقام آتا ہے جہاں خود عاشق کی ذات میں حسن محبوب کے جلوے پنہاں ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس عالم میں
جب اس کو دیوار محبوب میسر آتا ہے تو اس کی حالت کیا ہوتی ہے:

ہجوم تجلی سے معمور ہو کر نظر رہ گئی شعلہ طور ہو کر

پہلا شعر فکر نے اپنی شاعری کے دور سویم میں کہا ہے اور بعد کے تین شعروں چہاں میں آخری شعر کے متعلق مجھے ذاتی طور پر
علم ہے کہ وہ اپنے قابل اشعار سے بعد میں کہا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک کے بعد دوسرے شعروں میں ترقی ہی ہوتی چلی گئی ہے۔ جگر کے تذکرہ آخری
دو شعروں کے ساتھ فانی کے اس شعر کو بھی یاد رکھنا چاہئے:-

فضائے شوق کا وہ شعلہ زار ہو جانا وہ اک اک ذرہ دنیائے دل کا طور ہو جانا

ان مثالوں میں ہضامیں دو نولں طرح کے موجود ہیں وہ بھی جن میں شاعر اپنے گزشتہ کلام سے ترقی کی ایک منزل آگے بڑھ گیا ہے اور وہ بھی جہاں
اپنے ہی مضمون سابق کو دہراتے وقت وہاں تک بھی نہ پہنچ سکا جہاں تک پہنچنا تھا خود لکھا ہے کہ ایک مستقل نظریہ شاعر کے سامنے ہے اسکے متعلق وہ بہترین اسلوب
دانشین طرز بیان پر جوش طرہ نقیہ تناسط اور درباہانہ کشش کے ساتھ اشعار کہ جاتا ہے لیکن ایک وقت اس پر ایسا آتا ہے کہ اسی نظریے سے متعلق
شعر کہتا ہے کہ یہ تمام صفات اس میں مفقود ہوتی ہیں۔ اس سے اس امر کا واضح ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ وہ ذہنی جوش جو ہر تخلیق اثر کا اصل سہرا ہوتا
ہے خود اپنے اقتدار کی چیز نہیں ہے کہ جب چاہا اس کو پیدا کر لیا۔ نیزہ امر بھی فانی کی متذکرہ مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ شعر کہتے وقت قوت نقد کس حد تک
ضعیف ہو جاتی ہے کیونکہ اگر شاعر کی یہ قوت ضعیف نہ ہو گئی ہوتی تو وہ کوشش کرتا کہ پہلے شعر سے اس کا دوسرا شعر بڑھ جائے یا کم از کم اس کے رتبہ تو
ہو جائے۔ اور اگر اس پر قدرت حاصل نہ ہوتی تو پھر اس شعر کو کلام سے خارج کر دیتا۔ اس تمام بحث سے اس امر کی شہادت فراہم ہوتی ہے کہ
جن شعروں کو قائلین نے سرقہ قرار دیا ہے وہ دراصل پہلے شاعر کے مضمون میں اضافہ کرنے کی ایک ناکام کوشش ہے اور اس میں بدینیتی کو بہت ہی
کم دخل ہے الا اشارہ اللہ اور قوت نقد کا ضعف اس ناکامی کو شاعر کی نظروں سے پوشیدہ کر دیتا ہے۔ قائلین اس کو سرقہ قرار دیتے ہیں حالانکہ اگر شاعر
کی نفسیات پر غور کر لیا جاتا تو یقیناً ان کو دوسرا ہی فیصلہ کرنا پڑتا۔ ہم حضرت کعب ابن زہیر کا نظریہ پہلے پیش کر چکے ہیں کہ:-

ما ارانا نقول الامعرا اذ معا وامن قولنا لمرورا

(ترجمہ) ہم کہتے ہیں وہ انگوں سے مستعار یا ہوا خیال ہوتا ہے یا اپنے ہی کہے ہوئے کو دہراتے ہیں

گویا شاعر صرف دو طرح کے شعر کہتے ہیں۔ انگوں سے استفادہ۔ یا اپنے خیالات کا اعادہ۔ ہم شاعر کی انفرادیت پر شروع میں اظہار خیال کر چکے ہیں۔ یہ
انفرادیت بھی اس کے تمام کلام کی اصل روح ہوتی ہے اور دوسروں سے استفادہ ہوا یا اپنے ہی خیالات کا اعادہ اس انفرادیت کو کلاش کرنا ایک
ناقابل سب سے پہلا فرض ہے۔ اگر کلام میں یہ چیز نہ پیدا ہو جائے تو وہ سرقہ ہے اور اگر شاعر کو اپنی انفرادیت اور ذہنی کاوش بھی شعروں میں موجود
ہے تو اس کو سرقہ کہنا کوتاہ نظری کا ثبوت دیتا ہے۔

محمد عزیز حسن مراد آبادی

رشید احمد صدیقی کا آرٹ

بورژوائی تہذیب کو اجتماعیت سے ہمیشہ خون رہا ہے اس لئے کہ بورژوائی تہذیب میں انفرادیت ہی کے سہارے انسان اپنی طاقتوں اور قوتوں کو زندگی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ایک انسان سے دوسرے انسان کو جو ملکہ تعلق نہیں ہوتا اس لئے بورژوائی تہذیب کو زندگی دینی پڑتی ہے۔ بورژوائی سماج کی عمارت کو انفرادیت کی بنیاد پر کھڑی دیکھ کر وہ لوگ جو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ انفرادی قوت پر مبنی ہوئی ہے یہ نہیں جانتے کہ یہی انفرادیت ہے جس سے انسان کے تعلقات کبھی گہرے نہیں ہونے پاتے اور سماجی زندگی کی کڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہی انفرادیت ہے جس سے بورژوائی نظام کے انسان کائنات کے اسرار نہایت ہی اجنبی اور غیر سماجی فرد کی حیثیت سے جان لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہی انفرادیت ان کے نفس کو آزادی دیکر سماج کی ”زنجیروں“ سے انھیں دور کرتی ہے۔

جس فنکار کو سماجی تعلقات کے ساحل نظر آجاتے ہیں وہ بورژوائی سمندر میں زندگی کی کشتی چلانا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ سماجی تعلقات اسے آزادی بخش دیتے ہیں اور بورژوائی کے برعکس وہ انفرادیت کی سطح سے بلند ہو کر سماج سے وابستہ ہو جاتا ہے اور وہ اچھی طرح سمجھ جاتا ہے کہ سماج اور سماجی اور اجتماعی زندگی ہی انسان کو صحیح معنوں میں آزادی دیتی ہیں، وہ عوام کی جمہوریت کی حقیقت سمجھتا ہے اور سماجی حقیقت کی تخلیق اس طرح کرتا ہے کہ اس میں اس نظام زندگی کے غلط آوازیں بلند ہوں جس میں سماجی زندگی کو حسن دینے کے کوئی انداز نہ پائے جاتے ہوں۔

رشید احمد صدیقی کے آرٹ میں وہی انفرادیت پائی جاتی ہے جس میں دنیا کو سمجھنے کی نہایت ہی غیر سماجی کوشش ہوتی ہے۔ ان کے فن میں سماجی شعور کی تصویر نہایت دھندلی ہے ان کے یہاں انسان دوستی کے جذبہ کا فقدان ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی طنز و عذار میں زندگی پیدا نہیں ہوتی۔ خلوص اور انسان دوستی کے جذبے کے فقدان نے ان کی طنز سے اثر انگیزی کی ساری صلاحیتیں چھین لی ہیں، رشید احمد کے پاس حقیقت کا کوئی ادبی تصور نہیں اس لئے جب وہ حقیقت کے قریب جا کر طنز پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ناکام ہو جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں بعض وقت مستقبل سے یا دوسری ایسی تصویریں نظر آتی ہیں جنہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ”مُرخہ“ میں جہاں مرشد آئے والے دور کا ذکر کرتے ہیں وہاں نئی دنیا اور اشتراکیت سے بریزا روی کے عناصر نمایاں ہیں۔

ان کے مضامین عموماً ان کی اپنی ذات اور اپنے ماحول یعنی علیگڑھ کی فضا سے تعلق رکھتے ہیں، بعض وقت ان کا ماحول مشرقی اور مغربی روایات کا ایک ایسا امتزاج بن جاتا ہے جس کی سطح نہایت ہی بُرے فردش ہے اور تبہ بالکل ساکن! روزمرہ کے واقعات ان کا آرٹ ہے ان کا فن کبھی زندگی کی گہرائیوں سے دلچسپی نہیں لیتا۔ بنیادی اسباب یہی ان کی نگاہیں نہیں جاتی ہیں۔ ان کا فن کبھی زندگی کو آگے بڑھنے میں رو نہیں کرتا، ان کا ماحول میں تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے اس میں ذوقِ عمل کا فقدان ہے جس کی تلافی ہنگامہ گفتار سے کی جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اساطیری اور سیاسی حوالہ جات سے ان کا آرٹ غیر معمولی فائدے حاصل کرتا ہے اور اکثر شخصیتِ الفاظ کے اشارے سے ناگفتنی کی ایک داستان پیش کر دیتے ہیں اور اس طرح پیر کے ہوتے بھی رشید صدیقی وہ سب کچھ بیان کر جاتے ہیں جنہیں تہذیب برداشت نہیں کرتی۔ یہاں وہ روسی ادب کے شہرِ مزارچہ نگار زندگی کو کے قریب ہو جاتے ہیں جس کی بخش باتوں میں مزاح تو پیدا ہو جاتا ہے مگر پیرا نہیں ہوتی۔ رشید احمد صدیقی کا فن زندگی کا سطحی تر جہان ہے اس لئے ان کی طنز منہ کنڈ خیزی کے سوا کچھ نہیں وہ صرف سطحی دلچسپی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

اور اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ جب وہ ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں سوراخ، پوینورسٹی، جیل، تعزیرات ہند، پولس، بیوی کو ذہنی اور جسمانی فتنہ و فساد کے مرکزی ادارے سمجھنے لگتے ہیں، بیوی بچے کو انسان کے لئے بیڑیاں تصور کرتے ہیں اور بیگانی مولوی اور مارواڑی کو سکون سفر کے بدترین دشمن سمجھتے ہیں تو مزاح ضرور پیدا ہو جاتا ہے لیکن خیالات میں مخصوص انداز کے قرار کی وجہ سے طنز پیدا نہیں ہوتا اور کہیں انسان کی بے حس کی بے نقابی میں طنز کی لکیریں ابھرتی بھی ہیں تو فوراً ٹوٹ جاتی ہیں اس لئے کہ انھیں انسان پر مطلق بھروسہ نہیں ہوتا ایک وقت تھا کہ جب مرد شکار کے لئے جاتے تھے تو عورتیں باغبانی کیا کرتی تھیں، پھر مرد جب بھیڑ بکریوں کے مالک بنے تو عورتوں کو گھر کا کام سپرد کیا گیا اور وہ غلام بن گئیں۔ رفتہ رفتہ عورتوں کے سارے حقوق چھین لئے گئے، انھیں ناقص العقل کا خطاب دیا گیا اور اس کے بعد انھیں اپنے حقوق کے مطالبہ کا بھی حق نہ رہا۔ پورٹ والی ذہنیت کے انسان آج بھی عورتوں کو اپنے ساتھ زندگی کے اُس میدان میں لانا نہیں چاہتے جہاں جدوجہد ہے اور جہاں انسان کے تعلقات اچھے بنتے ہیں وہ ابھی تک عورتوں کو ناقص العقل سمجھتے ہیں، ان کے حقوق کی وسعت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اگر وہ عورتوں کو ذلیل نہ سمجھیں تو وہ اپنے خدا کے نزدیک باغی سمجھے جاتے ہیں۔ رشید صدیقی کے عورت کا تصور نہایت ہی رحمت پسند عورت کا مذاق اڑاتے ہیں ضرور لیکن ساتھ ساتھ خود بھی اپنا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ عورتوں کو فتنہ و فساد کی بنیاد سمجھتے ہیں، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی عورتوں کو دیکھ کر وہ بالکل اسی طرح چکر اجاتے ہیں جیسے وہ انگریزوں کی لائی ہوئی تہذیب کے ہر رخ کو خطرناک سمجھ کر ہلکاتے ہیں۔ ایک جاگیردار تھے ہیں:- ”انگریز اور عورت دونوں ایسی چیزیں ہیں جن سے مرد معقول ڈرا کرتے ہیں، عورت سے محبت کرنا ہمیشہ ہر قوم اور ہر ادب میں مقبول رہا ہے۔ اسی محبت کی آڑ میں سب کچھ ہوا۔ جیل، ہسپتال، فنون لطیفہ، مضمون نویسی، اکاسا، وصیت نامے اور پاگل خانے قسم کی تمام چیزیں اسی کی منت کش ہیں۔“

دوسری جگہ دیکھئے:- ”میں ڈاکٹر صاحب کے کمال فن کا انتہائی قائل ہوں جتنا میرے علاج میں کوئین کا با عورتوں کے ناقص العقل ہونے کا۔“ رشید صدیقی کے فن میں فوراً اتفاق پیدا ہو جاتا ہے جب وہ اپنے ایک مضمون میں ایک وکیل کی بیوی کے کردار میں انسانیت دکھا کر زندگی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ کردار زندگی کو گھر کے سنبھال لیتا ہے۔ مصیبت کے طوفان میں مسکراتا دکھاتا ہے، جدوجہد کی تعلیم دیتا ہے۔ ممکن ہے رشید صاحب نے اس کردار کو غیر شعوری طور پر تزلزل دیا ہو۔

عورت کو ذلیل سمجھنے کا خیال یقیناً سرمایہ دارانہ ذہنیت کی پیداوار ہے ایسے دور میں جہاں عورتیں مردوں کے ہر قدم پر ساتھ ہیں، عورت کا ایسا تصور نہایت ہی رحمت پسند نظریہ ہے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی پیدائی ہوئی عورتوں پر طنز کے تیر چلائے جاسکتے ہیں لیکن ایسے مزاح سے کوئی فائدہ نہیں۔

رشید صاحب کا ایک مضمون ہے ”کر“ اس مضمون میں غریبوں پر شفقت کرنے کا وہی جذبہ موجود ہے جو آج سرمایہ داروں کا ہے، جس پر انھیں بہت فخر ہے۔ غریبوں سے محبت کرنا کچھ اور شے ہے اور شفقت کرنا کچھ اور۔ اس مضمون میں وہ عید و پیر احسان کرتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح ایک بل کا مالک کسی خوبصورت مزدور لڑکی کو کچھ زیادہ مزدوری دلا دیتا ہے۔

رشید صدیقی نہ تو اردو کے چہرے ہیں اور نہ ہزار ڈش۔ اس لئے کہ ان کی طرافت میں طنز کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ ان کی طرافت سکھوں کے لئے نہیں ہے، ان کے یہاں ایک تصویر بٹھتی نہیں کہ دوسری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ایسی تیزی اور سہایت طنز اور طرافت دونوں کے لئے مضر ہے۔ ان کے یہاں بات میں بات پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایک واقعہ تیزی سے دوسرے واقعہ پر چھٹا چلا جاتا ہے۔

ان کے یہاں انسان دشمنوں پر طنز کے کوڑے نہیں چلتے۔ ان کے پاس طنز کی ایسی سوشیاں ہیں جی سے وہ جہاں سے چاہتے ہیں غلوں کے چند قطرے گر لیتے ہیں لیکن بعد کو وہ سوشیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور وہ زیادہ کام کرنے سے مجبور ہو جاتے ہیں۔

اسے پاپ (A - POPE) نے اپنی طویل نظم THERAPY OF THE LOCK میں جہاں محدث کی بیوقوفی کا مذاق اڑایا ہے وہاں وہ خود بھی عریاں ہو گیا ہے۔ اس کی طنز سے اُس وقت زندگی چھین جاتی ہے جس وہ وہ ایک بے رحم تیزی سے جاتا ہے

وہ بے رحم کے لئے بے رحم نہیں بنتا، اس کے ماحول میں عورتوں نے فیشن ہی کو اپنی زندگی سمجھ رکھا تھا، کتے کے بچے کی موت پر عورتیں شوہر کی موت سے زیادہ غم منایا کرتی تھیں۔ پوپ نے اپنے ماحول کی اچھی عکاسی کی ہے، مافوق الفطرت عناصر کو شامل کر کے طرافت میں زندگی پیدا کر دی ہے، لیکن چونکہ اس کے پاس حقیقت کا کوئی مادی تصور نہ تھا اس لئے وہ اپنی طنز میں تیزی اور بہت شکنجی پیدا نہ کر سکا۔ وہ بورژوا طبقہ کا ترجمان بن کر رہ گیا اس کی طنز میں کوئی تعمیری پہلو نمایاں نہ ہوا، اس کی آواز اور بے طبقے کی آواز بن کر رہ گئی، اس کی نظم پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے ایک بورژوا فنکار غیر شعوری طور پر اپنے نظام زندگی کو قائم رکھنا چاہتا ہے، طنز کے تیر صرٹ اس لئے چلاتا ہے کہ اس کے ذہن میں اپنے نظام کا جو خاکہ ہے اس سے الگ اس کے نظام کا کوئی خاکہ نہ بن سکے۔ وہ کسی عنصر کو دھلتا دیکھنا نہیں چاہتا۔ رشید صدیقی کی طنز و طرافت میں بھی تیزی اور بہت شکنجی پیدا نہ ہو سکی، اس لئے کہ ان کی طنز و طرافت میں کہیں کوئی تعمیری پہلو نمایاں نہیں۔ یہاں بھی سچ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اُس نظام زندگی کو ہمیشہ قائم دیکھنا چاہتے ہیں جس میں وہ سانس لیتے ہیں غیر شعوری طور پر اس کے لئے وہ اپنے ہر کردار کی بے عرقی بھی پسند کر سکتے ہیں۔ ان کے آرٹ میں ہمیں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک بورژوا دانی دوسرے بورژوا دانی کو ڈانٹ رہا ہے اور بولوں پر مسکراہٹ بھی پھیل رہی ہے۔ رشید صدیقی کے انداز بیان سے کسی بھی نئے آہنگ کا پتہ نہیں چلتا۔ انداز بیان کنایوں، صنعتوں اور تشبیہوں کا مروجہ منہ ہے ان کے یہاں گفتگو کے ہاتھ مناظر کے پس پردہ اس تیزی سے بدلتے رہتے ہیں کہ ربط و سلسلہ شکست و ریخت کے صدمہ پہنے کا عادی بن جاتا ہے وہ ایک سلسلہ قائم رکھ کر اشیا و اشیاء پیدا نہیں کر سکتے۔ ان کے یہاں بات میں بات پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایک بات پر دوسری بات اس طرح چھا جاتی ہے کہ پڑھنے والا گھبر جاتا ہے۔

بعض وقت ان کی تحریر میں بڑی زندگی معلوم ہوتی ہے لیکن وہ زندگی تھوڑے وقفہ کی زندگی ہوتی ہے۔ بعض مضامین میں متحدہ خیالات اور طریقہ تفصیلات کے ساتھ ورنہ اور قابل قدر انجام بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا ڈرامائی انداز بھی ان کے فن کو بعض وقت بڑی زندگی بخش دیتا ہے۔ دو مختلف عجیب غریب عناصر ان کے یہاں جب ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو زندگی ابل پڑتی ہے یونیورسٹی اور پولیس کے نزدیک تحقیقات ہی سب کچھ ہے، عورت اور ندی دونوں طاقت کو زندگی سمجھتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان کے اکثر مضامین اردو ادب کی نہایت ہی اچھی مثالیں ہیں۔ رشید صدیقی کے مخصوص علامات اگرچہ فرسودہ علامات ہیں پھر بھی بعض وقت ان سے کچھ نہ کچھ زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ادھر کا کھیت، مدرانڈیا، حاجی بلع العلّیٰ اور مرشد وغیرہ ان کے مخصوص علامات ہیں۔

فنکار اپنی تخلیقات کو اپنی ذات تک محدود نہیں کر سکتا ہے، اس کی تخلیقات زندگی اور دنیا کے لئے نہ ہوں تو فنکار ملزم ہے رشید احمد صدیقی کے فن سے ہماری امیدیں اب بھی وابستہ ہیں۔ ہم ان کے آرٹ سے یاموس نہیں ہیں۔ ان کے اجتماعی شعور سے بھی یاموس نہیں بہت بڑی غلطی ہوگی۔

شکیل الرحمن شکیل

”رفیق صحت“ لاہور

کا پہلا شمارہ ”تب دق نمبر“ تھا۔ اس کی افادیت کے پیش نظر عوام نے اسے توقع سے بڑھ کر پسند کیا۔ اب اگست نمبر وائٹل کی دق مینے ”پانیوریا“ پر شائع ہو رہا ہے۔ ستمبر کا پرچہ خنازیر پر شائع ہوگا۔ اگر آپ اپنا تک اس کے خرید نہیں ہوئے تو فوراً ہو جائیں ورنہ مجرأت و فوائد کا یہ ذخیرہ آپ کسی قیمت پر بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔ سجاوٹ کے رہنے والے اصحاب دور و پے دفتر نگار میں جمع کر کے فوراً ہمیں اطلاع دیں۔ پرچہ آپ کے ہم جاری کر دیا جائے گا۔

مئی سالہ رفیق صحت و آئینہ بخش لاہور

باب الاستفسار

مومن کے قصاید

(فضل الہی صاحب - کراچی)

غالباً یہ نثر نگار ہی کو حاصل ہے کہ اس زمانہ میں سب سے پہلے اسی نے مومن کی یاد کو تازہ کیا، وہ نہ بچ تو یہ ہے کہ لوگ اسے بالکل بھلا بیٹھے تھے اور دوسرے استادزہ کے ساتھ مومن کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہ آتا تھا اس لئے یہ شمس کبرتری خوشی ہوئی۔ نثر نگار کے مومن نمبر کا دوسرا ڈیشن شایع ہو گیا ہے، لیکن اس میں غالباً زیادہ تر مومن کے تغزل سے بحث کی گئی ہے اور اس کی قصیدہ گوئی کا ذکر تفصیل کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ بہتر تو یہ تھا کہ مومن نمبر کے دوسرے ڈیشن میں ایک مضمون اس موضوع پر بھی شامل کر دیا جاتا، تاکہ قصیدہ گوئی میں جو مرتبہ مومن کا ہے، وہ ظاہر ہو جاتا، لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا، اس لئے میں اپنی ذاتی ملاحظات کے لئے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ مومن کے قصاید کی تعداد کتنی ہے، وہ کس کس کی تعریف میں لکھے گئے ہیں اور دوسرے ممتاز قصیدہ گو شعرا کے مقابلہ میں مومن کی حیثیت کیا ہے۔

(نگار) مومن نمبر میں یقیناً ایک مستقل مضمون مومن کی قصیدہ گوئی پر ہونا چاہئے تھا اور میں اس سے خالی الذہن نہ تھا، لیکن اس خیال کی تکمیل میں متعدد اسباب حایل تھے۔ ایک یہ کہ اس مضمون کے لئے کم از کم تین جزو کا اضافہ کرنا پڑتا اور یہ حالات موجودہ جبکہ کاغذ کی گرانی و کمیابی انتہائی مذک پہنچ چکی ہے۔ یہ اضافہ ممکن نہ تھا، دوسرے یہ کہ اس موضوع پر جو بحث بھی کر لکھنا پڑتا اور اس کے لئے جس اطمینان و سکون کی ضرورت ہے وہ فی الحال مجھے میسر نہیں، بہر حال اس فرد کو راحت پر مجھے افسوس ہے کہ اس کی تلافی ایک حد تک اسی طرح ہو سکتی ہے کہ آپ کے استفسار کے جواب میں مختصراً اس موضوع پر کچھ عرض کر دوں۔

قصیدہ گوئی میں سودا اور ذوق کو خاص شہرت حاصل ہے، کیونکہ ان دونوں نے متعدد قصائد لکھے اور اپنا پورا زور و طبع ان پر صرف کر دیا غزل کی طرح اردو میں قصیدہ گوئی بھی فارسی کی تقلید تھی اور چونکہ فارسی کی قصیدہ گوئی کا تعلق شاعری سے اتنا زیادہ نہ تھا جتنا اظہارِ فضل و کمال سے اس لئے اردو میں بھی قصیدہ گوئی کا رنگ یہی رہا۔ تاریخی و علمی اصطلاحات، دقیق و مشکل الفاظ، تخیل کی بندی، مضمون آفرینی، نعت بیان، مبالغہ، و تعلیل، قصیدہ گوئی وہ خصوصیات تھیں جو فارسی میں عام طور پر پائی جاتی تھیں اور جن کا متبع اردو میں بھی کیا گیا۔

فارسی قصیدہ گوئی کی تفصیل پر اظہارِ خیال کا محل نہیں، در نہ میں شاید زیادہ تفصیل کے ساتھ ان خصوصیات پر روشنی ڈال سکتا۔ بہر حال ان تمام ذیلی مباحث سے ہٹ کر جو قوت ہم اردو کی قصیدہ نگاری پر نگاہ ڈالتے ہیں تو چار شاعروں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں، سودا، ذوق، غالب اور مومن۔

غالب نے اردو میں کوئی ایسا قصیدہ نہیں لکھا جس کا ذکر سودا اور ذوق کے قصاید کے ساتھ کیا جاسکے۔ اس نے اپنا سارا انداز و تقلم فارسی قصیدہ نگاری میں صرف کر دیا اور بہت کامیاب ہو ا۔ سودا ان خصوصیات کے لحاظ سے قصیدہ کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی، بڑا کامیاب قصیدہ گو تھا۔ ذوق کے قصاید گونہ و بہان کے لحاظ سے سودا کے قصاید سے کم تر ہیں، لیکن روانی و تسلی کے لحاظ سے وہ سودا سے بڑے

ہوتے ہیں۔ موتن کے یہاں ذوق و سودا دونوں کا رنگ پایا جاتا ہے اور اگر مدح گوئی کو اپنا پیشہ بنا کر زیادہ قصاید لکھتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ سودا اور ذوق کے ساتھ ان کا نام بھی نہ لیا جاتا۔

موتن نے صرف تو قصیدے لکھے، ایک حمد میں، دوسرا لغت میں، چارہ خلفاء و کرام کی منقبت میں، ایک حسن کی شان میں۔ صرف دو قصیدے انھوں نے دنیاوی حیثیت سے لکھے، ایک والی ٹونگ کی مدح میں، دوسرا صبرِ پشیمانہ کی تعریف میں، اور ان تمام قصاید میں انھوں نے سودا اور ذوق دونوں سے اپنی راہ علیحدہ اختیار کی۔

قصیدہ میں تشبیہ خاص چیز ہے اور اس پر تمام شعرا نے اپنا پورا زور صرف کیا ہے، لیکن عرفی کی طرح یہ خصوصیت موتن ہی کو حاصل تھی کہ اکثر قصاید میں انھوں نے تشبیہ کو اس کے صحیح معنی میں پیش کیا اور پورا رنگ تغزل اس میں بھر دیا۔

خلیفہ ثانی کی منقبت میں جو قصیدہ ہے اس کی تشبیہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

جو اُس کی زلف کو دوں اپنا عقدہ مشکل تو بہا ہوس کا بھی ہرگز کبھی نہ چھوٹے دل
تم اور حسرتِ ناز، آہ کیا علاج کروں، میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے وصال
چلا ہی جاتا ہوں میں گوجلا نہیں جاتا غضب ہے شوقِ رسائی و دوری منزل
خدا سے ڈر بہت بید رہے یہ کیا انصاف کہ تو جفا سے نہ ہو اور وفا سے ہوں میں بخل
کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ غزل کے اشعار نہیں ہیں۔ سودا اور ذوق کے قصاید میں ایسا رچا ہوا رنگ تغزل آپ کو نہ ملے گا۔

موتن نے بھی دوسرے شعرا کی طرح قصاید میں زمانہ کی شکایت، اس کی ناقدر شناسی اور اپنی ناکامی و ناہمدی کا ذکر کیا ہے، لیکن اکثر و بیشتر اسی متغزلانہ رنگ میں خلیفہ ثانی کی منقبت میں تو انھوں نے غزل کیا پوری داسوخت لکھ دی :

نیک نامی نہ سہی مجھ کو بے تم سے سروکار چھوڑ دوں، آج وفا کر دو وفا سے بیزار
گر تمھیں صحبتِ اغیار سے پرہیز نہیں ہم بھی کچھ چارہ آزاد کر دیں گے ناچار
وہ جلع محض دشمن میں جو ہو شمعِ لقا مجھ کو چھڑا نہ کرو تم سے کہا ہے سوار
بے مروت مری نظروں میں ہیں اندازِ ترس آجکل کچھ نگہِ لطف ہے سوئے اغیار
آپ دیکھا نہ سنا اودے، پر جھوٹ نہیں تیری آنکھیں کبہ دیتی ہیں نہ کرنا انکار

الغرض موتن کی یہ خصوصیت کہ وہ قصیدوں میں بھی غزل کی طرف آجھلتے ہیں، ان کی وہ انفرادی خصوصیت ہے جس میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔

جیسا کہ پہلے کہ چکا ہوں۔ قصاید میں زور بیان، مبالغہ، دقتِ آفرینی اور تمثیلات کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھا جانا تھا اور یہ وہ روایت تھی جس سے موتن بھی نہ بچ سکے اور چونکہ وہ عربی فارسی کے فاضل، طب و نجوم کے ماہر تھے اس لئے ایسی ایسی علمی اصطلاحیں استعمال کیں اور ایسی ایسی تمثیلات سے کام لیا ہے کہ ہر شخص ان کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ مثلاً حضرت عثمان کی منقبت کے مطلعِ ثالث میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

صوفیوں نے ترسے چہرہ کا جو عالم دیکھا ہوئے قایل کہ تجلی کو نہیں ہے مکرار

اس شعر کا مفہوم سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا جب تک کسی کو صوفیوں کا یہ نظریہ معلوم نہ ہو کہ تجلی خداوندی کی مکرار نہیں ہو سکتی، دعا ہے کہ صوفیوں کو تیرا چہرہ دیکھنے کے بعد ہی اس کی تصدیق ہوئی کہ تجلی کی مکرار ممکن نہیں۔ کہنا صرف یہ تھا کہ تو اپنے جمال میں بے مثل ہے لیکن اسے ظاہر کیا اس انداز سے ! اسی قصیدہ میں اصطلاحاتِ نجوم کا عالم دیکھئے :

زورہ اوج سے برقیں کی رجعت ہو جائے تو میں زہرہ کو کہے کہ تیرا سے انکار
تا کہ ہو جائے ہر آزاد کا مصدر ایک سخت محبتیں کو ہے دفعِ طبعیت پہ قرار
بند ہے امید گر لک خوشہ گندم کی مجھے تیر توئی سے ہو برجِ شرف کے میزار

مگر حصول زیر مسکوک کی سمجھوں میں دلیل،
خون کے میرے ارادہ سے ہوا ذرا بے حسد،
زینت اپنی ہے تو ترسیع و تعاقب کے سوا
ماضی شیر سے ہو سیدہ غور شدہ نگار
قتل پر پیسہ کم باندھے ہے شکل جبار
بھول جائیں گے خیمہ میں باقی انظار
ان اشعار میں موتیوں نے اپنی زبونی قسمت اور رفیعی طالع کا ذکر کرتے ہوئے گویا اس شعر کی تشریح کی ہے:-

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس

آسمان بھی ہے ستم ایجا د کیا

ان اشعار میں ذرہ (بلندی) برہمن، زہرہ، نحسین، تجوی، خرق، ذابح سعد، تربیع، تعاقب، انظار، سب علم نجوم کی اصطلاحیں ہیں
رئیں پتالہ کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کی ابتدا بھی انھوں نے اسی قسم کے اشعار سے کی ہے،
صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی حیرہ اختری
کثرت دود سے سیاہ شعلہ شمع غاوری
چشم ستارہ سحر یوں نعل سے سرسہ سا
دشت ترک چرخ سے تیز نگاہ مشتری
موتیوں نے فلسفہ کی اصطلاحوں سے بھی کام لیا ہے، مثلاً:-

جب ستیا مجھ اس نے وہی الفت دی ہل
یہ غلط ہے کہ اعادہ نہیں بہر معدوم
فلاسفہ کا اعتقاد ہے کہ جیسے معدوم ہو جائے وہ پھر وجود میں نہیں آسکتی، موتی کہتا ہے یہ خیال غلط ہے، کیونکہ جب کبھی محبوب نے مجھے
ستیا، گئی ہوئی محبت پھر لوٹ آئی۔

ایک اور شعر: فکر الزام حکیم و متکلم ہو اسے،
تو مجسم نظر آجائیں نقاط مودوم
نقطہ کو حکیم و متکلم فرضی و مودوم مانتے ہیں، موتی کہتے ہیں کہ اگر میرا مودوم ان کے اس نظریہ کو باطل کرنے پر آئے تو نقطہ بھی جسم اختیار کرے
سامنے آجائے۔

نعتیہ قصیدہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

ہے دشت بنم طرب کثرت نتائج سے
نہ کیوں ہو شکل حماری کو نازہ شکل عروس
شکل حماری اور شکل عروس، تقلید کی دو شکلیں ہیں، جن میں شکل عروس کثرت نتائج کے لحاظ سے زیادہ اہم چیز کہی جاتی ہے۔
اسی شکل عروس کا ذکر انھوں نے ایک اور جگہ بھی کیا ہے:-

گواہ عصمت مریم ہو کثرت اولاد
عقیدہ مجھ سے سنے گر بیان شکل عروس
موتی کا یہ شعر بہت مشکل ہے، اس لئے اس کی توضیح کے درپنا ہوں:-

شکل عروس تقلید کی ایک ایسی شکل ہے جس سے نتائج کثیر پیدا ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر میں کسی عقیدہ (یا نچہ عورت) کے سامنے شکل
عروس کا بیان کر دوں تو اس کا ناچہ بن دور ہو جائے اور اس کی اولاد کی کثرت کو دیکھ کر لوگوں کو حجاب مریم کی پاکدامنی کا یقین آجائے کیونکہ
جب ایک عقیدہ کے اتنی اولاد پیدا ہو سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دو چیزہ کے بطن سے اولاد نہ ہو سکے۔

دیکھ کر تیزی تیغ کوہ شکاف،

ٹوٹ جاتی ہے سرکشوں کی کمر

خط نصف النهار ہو محسوس

گر فلک کو عددو بنائے سپر

خط نصف النهار فضائے آسمانی کا ایک فرضی خط ہے، لیکن موتی اپنے مودوم سے کہتا ہے کہ اگر تیرا دشمن تیری توار کا دار بچانے کے لئے

۱۔ جن حضرات کو ان اشعار کی تشریح درکار ہو وہ مجھے ملحدہ دیانیت کر سکتے ہیں۔ مسئلہ استفسار و جواب وقت گنجائش کی وجہ سے تشریح ممکن نہ تھی۔

صيد حرم

(پرومیسر شور علیگ)

بشہرے مرد کے طاعت فروشنے	مصلیٰ در بطن مصحف بدوشے	سکوتش گرچہ خود مہر دہن بود	خروش او خروش انجمن بود
بگاہش مریم زخم مریدان	زمنش کفارہ خوئی شہیدان	دادم خوردے سو گند از پیہر	پیایے سجدہ با کردے بدادر
نظر ایش ہمہ تسبیح و تہلیل	نفسہائش ہمہ انفاس جبریل	بدل نشتر بسینہ داشتے تیر	کہ یارب وارہاں از دست ایسیر
کمانش را فنگ از کشف والہام	بشہر اندر کراوات دمنش عام	اہی درد دلا کن تو در ماں	اہی جانی اس فرتوت بستال
کمندش بر حرم دامنش بر افلاک	طاہک صید ویز دانش بفرک	خدا دند اچہ کا فرما جسدائی	برافروزد چہ راغ بارسانی
بزم از اہل کسبہ بردہ گوئے	دے آبش خوردے بے وضوئے	چہ اثر دہا بشکل آدمی ہا است	چہ عبرت عبرت نظارگی ہا است
بمیرت قدسی سجدہ طرازے	بعصورت راہب گیسو درازے	ولیکن جوی دغائش بے اثر بود	شبش را آفتابے بے سحر بود!
نشان سجدہ پیشانی او	گواہ معرفت سالانی او	ای نالیدوی پیچیدوی گفت	گمرا از خداے ما بر آشفت
چہ ذرہ ذرہ خورشید بردوش	چہ قطرہ قطرہ عمام در آغوش	بگفتم میں چہ فریاد و فغانست	بگفتا درود در دے امانست
چہ عارف عارف شبہ نوہ دے	چہ موبے موبہ دجلہ شکارے	بگفتم آخرت از چیست از ماتم	بگفتا کشتہ آب حیاتم
وے با آن ہمہ عرفان فروشی	باں دستار فضل و فقر کوشی	بگفتم گمیدانت برہم از چیست	بگفتا ماتم دہا ز شادیت
اسیر دام بردش نازینے	بت تو بہ شکن آہوئے پینے	بگفتم من بدروت پے نبرد	بگفت از دام آدم زاد مردم
بصحر امریکہ بشکستہ! بے	بخوں غلطیدہ وحشی غزالے	بگفتم گل رخا آخر چہ خواہی	بگفتا کیفرے از بیک اہی
بہجوم یاس و آشفہ نگارے	ہوئے تند و شمع رہزارے	بگفتم ہرچہ خواہی از خدا خواہ	بگفتا دم مزی استغفر اللہ!
ہم از آہنگ خود افتادہ ناہید	ہم از انوار خود بے نور خورشید	زمان را نگار و یاد سے نیت	زمان را درود گفتی داو سے نیت
زاشک پیہم داد زلف برہم	سر ایش تو کوئی نخس ماتم	چہ فریاد و فغان آخر تو اں کو	
ز ستر پاچہاں بدوش سپوش	تو کوئی شمع کہ بگشت خاموش	خدا مرد و نبی مرد و وصی مرد!!!	

ابھی ابھی تو.....!

(شہاب اشرف، ام لکام)

ابھی ابھی تو فضاؤں سے شعلہ سبوتا کا تھا
جہاں شوق کے ذرے کھنک اُٹھے تھے ابھی
ابھی ابھی تو تبسم کے پھول جھکے تھے
ابھی ابھی تو اُٹھی تھیں وہ ملتفت نظریں
ابھی تو دوش سے ڈھلکا تھا گلشنِ آہن
ابھی تو جاگ رہا تھا نگاہ کا جا دو
پہل رہی تھی ابھی دوش پر وہ زلف کی رات
ابھی تو راگنی انسان کے روپ میں تھی کھڑی
ابھی تو نرم تکلم کی پڑ رہی تھی پھوار
یکسی برق سی لہر کے ہو گئی روپوش
عروسِ شب نے کلیجہ پکڑ لیا اکدم
اتر گئیں جو کھلیں تھیں چوڑیاں پیہم

نازش پر تا بگڑھی:

تری راہ چھوڑ کے بڑھ گیا، ترسے دے ہو گئے گزر گیا
کبھی تو نے مجھ پر کئے ستم تو یقینِ لطف میں کھو گیا
نہ قرار دشمن جاں ملا نہ سکونِ مرگ بنا ملا
تھیں آج دیکھ کے مہراں بھی جی جی میں شاد
جو خطا ہوئی تھی ناز سے وہ سہو وشتِ دل ہوئی
تری یاد پہنچی ہے اب کہاں کہ تو ذہن ہی سے اتر گیا
کبھی تیرے لطف و کرم پہ بھی مرے دل میں دہم گزر گیا
غمِ عیش سے جو گزر گیا وہ قیامتوں سے گزر گیا
گرا گیا یہ دلِ ناتواں کہ نہ جانے کس لئے ڈر گیا
جو غرورِ عشق میں گر گیا وہ گناہِ حسن کے سر گیا

گھٹائیں :-

(تنویر احمد علوی ایم۔ اے)

آنچل سے فضاء میں اڑ رہے ہیں
دامن سے ہوا میں جڑ رہے ہیں
جھونکوں میں شراب ط رہی ہے
یا ربے شباب ط رہی ہے

گردوں پہ گھٹائیں گھر رہی ہیں
پریاں ہیں کہ اڑتی پھر رہی ہیں
کلیوں کے سلام لا رہی ہیں
پھولوں کے پیام لا رہی ہیں

بادل ہیں ہوا میں رقص فرما
دنیا ہے شباب کا سا سنا
کوثر کی سی موج آ رہی ہے
زلغوں کی سی چھاؤں چھا رہی ہے

بوندوں کی قطار گر رہی ہے
پتوں پہ پھوار گر رہی ہے
پھولوں کو پسینہ آ گیا ہے
سادوں کا ہسینہ آ گیا ہے

بجلی میں شباب کی سی اک رو
بدلی میں شراب کا سا پر تو
شعلہ سالپک کے رہ گیا ہے
آنسو سا چمک کے رہ گیا ہے

ظلمات میں چشمہ صبا محی
بادل میں چمکتی ہے صبحی
دیوانوں کے خواب ہیں گھٹائیں
کیا مست و خواب ہیں گھٹائیں

حریم ناز میں عرض و نیاز :- (عذیب میرٹھی)

واکر در نشاط، بہاراں کا واسطہ !
تجھ کو نسیم صبح گلستاں کا واسطہ !
پیغام برگ و بار سنا غلّ شوق کو
باد مراد عالم امکاں کا واسطہ
صحی چین میں ابر کو دے رخصت خرام
بڑ مردگی سنبل و ریمیاں کا واسطہ
غشّوں کو پھر عطا ہو نذر شگفتگی
آب و ہوائے ارض خیاباں کا واسطہ
زبورِ نو بہار کو پھر نغمہ سنجی کر
آہنگ ساز و چنگ شبنماں کا واسطہ
پھر آرزو کے طائر وحشی کو کر رہا
فصل خروش مرغِ خوش الحال کا واسطہ
مقلِ درخو کے دام سے دے عشق کو نجات
ذوقِ جنونِ سلسلہ جنیاں کا واسطہ
ہاں پھر بابِ خاطر اندوہیں کو چھیڑ
مضربِ تارِ جنبشِ مرثکاں کا واسطہ
پھر مشعلِ امید جلا طاقِ یاس میں
آشکوں کے اہتمام چراغاں کا واسطہ
فرمانِ اختصار شبِ ہجر کو لے !
روئے حسین کی صبح درخشاں کا واسطہ
کچھ چارہ ساز ہی دلِ غول گشتہ بھی تو ہو
نکبیلِ شوق تابشِ افشاں کا واسطہ !
پائے طلب کو بڑھے دے سوئے در طب
افسردگیِ خاطر ویراں کا واسطہ
پھر رامِ زندگی میں دے صہبائے تیغ اور !
خیریں لبوں کے چشمہ جیواں کا واسطہ
تیغِ جفاے ناز کو رکھ دے نیام میں
اطاعتِ بے نہایت پنہاں کا واسطہ !
کہ اگر پھر ایسی رنگ و بو آئے
اشعارِ عذیب سوزناں کا واسطہ !

شبنون

(فضا ابن فیضی)

یہ جس دھیل، جبر و جفا، جنگ و جاکلی
یہ زندگی کے لب پہ ہلاکت کی راگنی

یہ قافلہ غبار کے کمرؤں کے شہر میں
ظلمت کے یہ سینے مہر و غور کی نسر میں

بلور کی زمیں پہ چٹانوں کی بارشیں
پہ خندہ سحر سے ہلو کی تراوشیں

معصوم لاشیں آتش و آہن کی دھوپ میں
ناسور سکرائیں تبسم کے روپ میں

کندھ کے طاق میں یہ مس قحام کے دئے
بیع ضمیر و عقل، زرو سیم کے لئے

شبنم کی صنو سے کئے گلستاں ہر شعلہ ناک
کیا کیا اوائلی مل کے شگوفوں نے سر پہ خاک

ہے کائنات ادھڑے ہوئے موت کا کفن
الاسیت پہ آف یہ شبنون اہر میں

ہیں مسخ آدمیت کبریٰ کے خال و خد
ڈوبا ہوا ہے زہر میں نوشینہ خرد

یہ زندگی کے بجھے ہوئے خوشنائزل
یہ آگ کی لپیٹ میں فرو دس کے محل

ہے ذر ذرہ شعلہ گر و صاعقہ تراش
نظرت کے آئینے سر باز راہ پاش

سنگی ہوئی بہار یہ مجلسی ہوئی نسیم
اتم کناں سوادِ گل و شبنم و شمیم

دھندلے ضمیر، حلقہ اندیشہ تنگ و تار
کیا کیا لٹی ہے عصمت تقدیس روزگار

یہ الہی یہ ذہنوں میں دیوانگی کی رو
دم سی فکر و فرض کے روشن ہونے کی نو

شعلوں کا یہ شکوہ یہ آہن کا طلاق
نشت و خیزن کی زوہ یہ شیشے کے قصر و طاق

دل شاہجہاں پوری :-

مری تہنادہ دار و دیوار جلائی جلائی
کچھ مدد کی تھی کچھ تھا نہیں مدد نہیں ہوئی
میں نے محبت کا راز کچھ اورد کچھ جوں کچھ
ابھی ابھی اتک پہ رہے تھے جس چاہ کر لیا
رو آ کر تسلی دلو دے جا رہے کوئی
کچھ کچھ ہی نہیں آتا کچھ تھا ہے کوئی
نہا کا میوں کے بعد بھی چھوٹا نہ ہاتھ سے
کیا جانے کس خیال سے دایاں آرزو
اس سلسلے میں گئے کئی دور منزل عشق کے
کبھی نہا کی خیزنیں کبھی نہا کی تاش ہے
وہ ملاہ مسن وہ مجر و نیاز عشق
دیکھا تھا ایک خواب جو بیک نظر میں ہے
میرا ایک برق حق میرا حق نظر آئی
قد اشرفی سے جلا تھا کس نے پندار
میں نے کچھ سے لے چارہ و گریبان نہ کھینچ
تاشاس راز پہ لکڑا تو میرے دل کا ہے
میرا کھٹام قطر آج خدا لایا
دل جھٹکا تھا کہ دشمن یہاں کوئی

راز پھر بھی نہ کھلا عشق کی آہرائی کا
اور بھی تم نے بے قرار کیا
مجھ پر بڑا کرم ہے محبت چاہ سادکا
مجھ پر بڑا کرم ہے محبت چاہ سادکا
اسی نگاہ سے آفاقہ ہے فسانے کا
یاد اس کی رہ گئی ہے گردل نہیں
دل جیاں تڑپے بھولیاں ہیں کہ کون
پس مری نظر کچھ پھر بار دیکھ کر
میں نے آہ سو کچھ بھی سوئے تھیں دیکھ کر
ایک انسان ہے دنیا دور انسان
میں نے کچھ سے لے چارہ و گریبان نہ کھینچ
میں نے کچھ سے لے چارہ و گریبان نہ کھینچ
میں نے کچھ سے لے چارہ و گریبان نہ کھینچ

صدائے شکست :-

(نظیر صدیقی)

(۱)

یارِ میرے دل کا اجڑا بھی سن لے فرصت ہو تجھے تو یہ صدا بھی سن لے
ساغر کی کھنک سے حال محفل تو سنا ٹوٹے ہوئے ساز کا گلا بھی سن لے

(۲)

سن لے یہ نوائے بینوا بھی سن لے ذروں سے جدائی کا گلا بھی سن لے
ساغر کو زمیں پر چپکنے واسلے توڑا تو شکست کی صدا بھی سن لے

(۳)

مضرب سے تیری حالت ساز سنی شیشے سے صدائے سنگ انداز سنی
ٹوٹا جوا چانک مرا ساغر کل رات میں نے ترے قہقہے کی آواز سنی

(۴)

پینے سے کلیجے کو نکالا تو نے دیکھا میرے صبر کا تماشا تو نے
قصاب کی روح جس ترا زو میں گئی شاعر کا بھی دل اسی میں تولا تو نے

(۵)

توبن کے بشر کبھی جو اُترا ہوتا انسان کی مصیبتوں کو سمجھا ہوتا
بچے کی نگاہ جس کا گہوارہ ہو اس درد کو باپ بن کے دیکھا ہوتا

(۶)

بچہ ترا نزع میں سسکتا ہو کچھ تجھ سے ہلک ہلک کے مانگا ہوتا
اس وقت غمِ دور کبریائی تیرا تخلیق کی لغتوں کو سمجھا ہوتا

مقالات نیاز

فلاسفہ قدیم

بہن حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و نقد عالیہ کا عجیب و غریب مجموعہ ہے، ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول - منیجرنگار

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں: (۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مادین کا مذہب نہایت مفید کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول - منیجرنگار

تنقیدی اشعار

قول فصیل

پروفیسر آل احمد سرور۔ ریڈر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے انیس تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ پروفیسر سرور اس عہد کے نہایت مشہور نقادوں میں سے ہیں اور ان کے تنقیدی مقالات سندھی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۲۲ صفحات - کاغذ ۲ پونڈ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول منیجرنگار

جس میں ملک کے مشہور مفکر بلند خیال شاعر علی اختر آختر حیدر آبادی نے جوش کی مشہور نظم "حرف آخر" کو سامنے رکھ کر اس کے تمام خیالات کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے کتنی ہی عقل و فراست سے کام لے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کو خدا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ فنی حیثیت سے آخر کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جسے ان کے شاعرانہ عروج کے ثبوت میں باہمانی پیش کیا جاسکتا ہے۔ شروع میں حضرت نیاز تجوری کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ کاغذ ۲ پونڈ دبیر گروپوش رنگین قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

مرزا شوق لکھنوی کا تنقیدی مطالعہ

(از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

مرزا شوق، جان عالم و اجد علی شاہ کے لکھنؤ کے شاعر تھے۔ ان کی فنوی کا تنقیدی مطالعہ نہ صرف ادب کے محرکات اور میلانات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے بلکہ اس تہذیبی ماحول کو جاننے کے لئے بھی جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکم خدا کو جام شراب کی گردش سے پھیر دیا گیا ہے قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ - منیجرنگار

جو بٹا اشتہار دینا حرام ہے پس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے۔ انا نہ اتنا آپ کا قلم ہے۔
معجون غنبری - دو دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت بیک کے ماح سب گمان ہیں اس دوا کے مقابل میں سیکرٹری امداد اور کتبہات بیکہ اس کا ہمکنار ہے۔ ہر مہم جو کو دو تین ہر دوا اور دوا بھر بھی منفعہ نہیں ہے۔ اس قدر نفوی دوا ہے کہ بھونک کر انا بھی خود کو دوا دے لیتی ہیں اس کو کل بحالت کے تصور فرمائیے اس کے استعمال کرنے سے پہلے پناہ دین کر لیجئے۔ ایک تیشی چرسان برونچ آکاسم و انفلو کرڈی اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق ٹھکن نہ ہوگی۔ دوا دوا مل کو شل ٹکا بچھل کے سونے اور شل کنڈن کے درخشاں بنادے گی۔ یہ دوا نئی نہیں ہے بلکہ اصل دوا جس کے علاج اس کے استعمال سے امیر اور مگر شل بندہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ نہایت حد تک ہی دوا ہے کہ آپ برونچ نہیں کر سکتے۔ ان قدر اس کا صفت نہیں میں نہیں آسکتی جو جو کہ کہہ لیجئے اس سے بہتر متوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی ۲۴ روپے ۲۴ روپے (۲۴ روپے)
نوٹ: قادیانہ و دیگر قیمت واپس۔ نہایت دوا خانہ مفت منگائیے جس منڈا کو حاضر و آفرجان کر گھٹا ہوں کہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقال سے ہوشیار رہئے

حکیم ثابت علی بیج زبان خوش کلام

(دوا نفوی مرزا نیاز کے دم صاحب)
محمود گروپوش رنگین - یو۔ پی۔

گوہر

(جناب نظیر جمیلی ام۔ ۱-۱ کے قلم سے)

یہ کوئی سن گھڑت کہانی نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے صوبہ بہار کا اور ایسا دردناک واقعہ ہے کہ اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ایک مہر شوہر کی جوان بیوی اور اس کے سب سے بڑے جوان بیٹے کی داستان حاشق ہے اور اس قدر دلچسپ کہ انڈیا میں کوئی شے اسے بے پرواہی سے دیکھتی ہو جاتی ہے قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول - منیجرنگار

دی موگل لائن لمیٹڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہاز ران کمپنی

سروس

ج

خاص

مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ سال رواں کے ج کے لئے اپنے ایک اور جہاز کی روانگی کا اعلان کرتی ہے
جہاز کا کرایہ (مع خوراک) بھی / جدہ واپسی

درجہ اول ۱۱ ۵۱/- روپے

عرشہ (ڈیک) ۱۵/- روپے

ان کو ایروں میں محصولات جدہ اور کشتی کا کرایہ جن کی مجموعی رقم (۴۰) روپے (۴۰) آنے ہوتی ہے، شامل نہیں۔
غلامین ج کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس وقت تک بیٹھ نہ آئیں۔ جب تک کہ اپنی انھیں آنے کے لئے نہ لکھے۔

اہم اطلاع

غلامین ج کے پاس "انٹرنیشنل فارم" پر بیٹھ اور چیک کے ٹیکے گوانے کا سرٹیفکیٹ ہونا چاہئے۔ بیٹھ کے سرٹیفکیٹ میں یہ درج ہونا ضروری ہے کہ غلامین ج نے سات روز کے وقفہ سے ڈکو انجکشن لے لئے ہیں اور یہ کہ دوسرا انجکشن بھی لے رہا ہے۔ روانہ ہونے کی تاریخ سے کم از کم سات روز قبل لیا گیا ہے، اسی طرح چیک کے سرٹیفکیٹ میں یہ اندراج ہونا چاہئے کہ جہاز کی روانگی کی تاریخ سے کم از کم چودہ دن قبل چیک کا ٹیکہ لگوا لیا گیا ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ مقررہ "انٹرنیشنل فارم" پر مقامی سیونٹی کے حفظان صحت کے حکام سے بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔
بیٹھ کے سرٹیفکیٹ ۹ ماہ تک اور چیک کے سرٹیفکیٹ تین سال تک کام دے سکتے ہیں۔
غلامین ج کو چاہئے کہ وہ ایسی سے بیٹھ اور چیک کے سرٹیفکیٹ طلب رکھیں۔

نشتیں محفوظ کرائیے

جہازوں کی نشتیں محفوظ کی جا رہی ہیں۔ غلامین ج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بلا تاخیر اپنے تمام ہمارے یہاں درج کرائیں تاکہ بعد میں سادگی سے محروم نہ ہونا پڑے، درخواست میں مندرجہ ذیل تفصیلات کا ہونا ضروری ہے:-
(۱) ہر ایک غلامین ج کا پورا نام - (۲) والد یا شوہر کا نام - (۳) عمر - (۴) درخواست بھیجے والے کا پورا پتہ (خط (۵) کس درجہ کا ٹیکٹ چاہئے - (۶) کن تاریخوں میں سفر کا ارادہ ہے؟ اگر ساتھ میں بچے ہوں تو ان کا نام وغیرہ درج کروانا بھی نہایت ضروری ہے خواہ وہ شیرازہ بھی کیوں نہ ہیں۔ جہاں بچے کی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ بلکہ یہ ضرور ہے کہ بچے کے نام ہمارے ہاں درج ہوں گے اور ٹیکٹ پر لکھے جائیں گے۔

فرز مارلین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

نشتیں محفوظ کرائے کے لئے

تحریر: جے۔

دی موگل لائن لمیٹڈ "MOGUL" BOMBAY, بمبئی

مکتوبات نیاز	شہاب کی سرگزشت	جذبات بھاشا	فلاسفہ قدیم	شاعر کا انجام
(تین حصوں میں)	حضرت نیاز کا وہ عظیم نظیر	جناب نیاز نے ایک	اس مجموعہ میں حضرت نیاز	جناب نیاز کے عنوان بہا
ادب نگار کے تمام وہ خطوط	افسانہ جو اردو زبان میں	دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین	کے دو علمی مضامین	کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق
جذبات نگاری، سلاست بیان	بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری	ہندی شاعری کے نمونے	شامل ہیں :-	کی تمام نثر بخش کیفیات
رگینی اور البیلے پن کے لحاظ	کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی	پیش کر کے ان کی ایسی	(۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم	اس کے ایک جملہ میں موجود
سے فن انشائیں بالکل پہلی	زبان و تخیل اس کی نزاکت	تشریح کی ہے کہ دل بقیاب	کی روحوں کے	ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ
چیزیں اور جن کے سامنے	بیان اس کی بلندی مضمون	ہو جاتا ہے اردو میں بھی	ساتھ۔	اور انشاء کے لحاظ سے
خطوط غالب بھی پچھلے معلوم	اور اس کی انشا بحالیہ سحر	سب سے پہلی کتاب اس	(۲) مادین کا مذہب	اس قدر بلند چیز ہے کہ دو گھر
ہیں ان آڈینوں میں ہے	حلال کے درجہ تک پہنچتی	موضوع بد لگتی گئی ہے	منہایت منفید و دلچسپ	جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی
آڈین کی غلطیوں کو دور کیا گیا	ہے۔ یہ آڈین نہایت صحیح	جس میں ہندی شاعری	کتاب ہے۔	تازہ آڈین نہایت صحیح و
ادوارہ پڑنے کے کاغذ پر مکتب	اور خوش خط ہے۔	کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں	قیمت	خوش خط، سردرقی نگین
ہوئی ہے قیمت ہر حصہ کی	قیمت دو روپے	قیمت بارہ آنے	ایک روپیہ	قیمت بارہ آنے
چار روپیہ علاوہ محصول	علاوہ محصول	علاوہ محصول	علاوہ محصول	علاوہ محصول

فراسٹ الیہ	نقائط بھانیکے بعد	مذاکرات نیاز	انتقادیات	مذہب
مولف نیاز فقیہوری۔ اس کے	نیاز فقیہوری کے تین فاضول	یعنی حضرت نیاز کی دائری	حضرت نیاز کے انتقادی مقالے	حضرت نیاز کا وہ
مطالعہ سے ایک شخص	کا مجموعہ جس میں بتایا گیا	جو ادبیات و تنقید عالیہ کا مجموعہ، فہرست مضامین پر	محرکہ آثار و مقالہ جس میں	انہوں نے بتایا ہے کہ
انسانی ہاتھ کی شناخت	کہ ہمارے ملک کے ادیان	عجیب غریب ذخیرہ ہے	ایران ہندستان کا اثر ہر من	مذہب کی حقیقت کیا
اور اس کی کیردوں کو دیکھ کر	طریقت علمائے کرام کی	ایک بار اس کو شروع کر دینا	شاعری پر فارسی زبان کی	ہے اور دنیا میں کیونکر
اپنے یاد دہ سر سے شخص کے	اندونی زندگی کیا ہے اور	اخیر تک پڑھ لینا ہے۔	بیدارش پر کوغناء نظر آزدو	ہے اور دنیا میں کیونکر
مستقبل، سیرت، عروج و	ان کا دور و ہماری معاشرت	بھی جدید آڈین جو جس میں	شاعری پر تاریخی مضمون آزدو	راج ہوا۔ اس کے مطالعہ
زوال، موت و حیات	و اجتماعی حیات کیلئے کس	صحت اور نفاس کا غرض، لگوئی کی مدد پر عہد ترقی کے بعد انسان خود فیصلہ	نقائشائے رنگ و رنگ (غالب)	کر سکتا ہے کہ مذہب کی
صحت و بیماری، شہرت	سرم قاتل ہی، زبان پلاٹ	و طباعت کا خاص اہتمام	نقائشائے رنگ و رنگ (غالب)	کی فانی غزل لگوئی پر تبصرہ
نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی	انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ	کیا گیا ہے۔	ادبیات و اصول نقد	قیمت
کر سکتا ہے :-	ان افانوں کا ہے وہ مرتبہ	قیمت	ایک روپیہ	ایک روپیہ
قیمت ایک روپیہ	دیکھنے سے حلق رکھتا ہے	ایک روپیہ	ایک روپیہ	ایک روپیہ
علاوہ محصول	قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول	علاوہ محصول	قیمت چار روپے علاوہ محصول	علاوہ محصول

فردری مارچ

2107

جنوری ۱۹۷۷ء

ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا اور جذبات نگاری کے لحاظ سے ناول اپنا نظریہ

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

قیمت دور ویدیم علامه محصول

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

لکھا رکھا، فناء نمبر ہے جس میں تقریباً بیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع ہوئے۔

کئے گئے ہیں اس سالنار کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے

ہم سنی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ انہی بخاری کے لئے اسلوب ہیں اور

بیاد غایم ہوئی ہے۔ میتین روپیہ ملاوا سٹوں

جنوری ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں "اوس ہینڈس" کی مشہور عالم کتاب

اس کی شقیں کی تلاش کا ترجمہ واقعات ہے جس میں اس نے ایران، مصر،

مالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی

ہا ہے کہ ان کا مقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔

سابقہ کا دوسرا حصہ اذیت ناک رہے گا کہ جس میں اپنی جگہ سے جھڑکے

۱۱۱۱

سال ۱۹۴۸ء

100

100

وہ کہہ چکا اور بس لی لکھ

کے لئے اس کا ذکر کیا ہے۔

پنجاب سائنس و طبیعت
ماہنامہ نگر دوشنبہ

رجسٹرڈ نمبر ۴۶۶

4 OCT 1951



ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ

قیمت فی کاپی ۱۰/-

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان

آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

چھ روپیہ (بغیر سالنامہ)

نومین نمبر دوسرا اڈیشن خالی ہو گیا

دو روپیہ علامہ محصول

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مذہم نزع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

من ویزوال

مذہبی استفسارات و جوابات

کا
مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیا آڑنے روشنی ڈالی ہے
ان کی مختصر فہرست یہ ہے :- اصحاب کہف - معجزہ و کرامت
انسان مجبور ہے یا مختار - مذہب و عقل - طوفان نوح - حضرت
کی حقیقت - مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں - یونس اور دبان -
حسن یوسف کی داستان - قارون - سامری - علم غیب - دایا
توبہ - لقمان - عالم برزخ - یاجوج ماجوج - ہاروت ماروت -
حوض کوثر - امام مہدی - نور محمدی اور پل صراط - آتش نمرود وغیرہ
صفحہ ۶۲۴ صفحات کاغذ سفید دبیرہ قیمت علاوہ محصول پانچ روپے

مولانا نیا زنجبوری کی ۳۰ سالہ دو تصنیف و صحافت ایک غیر فانی کا زمانہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہر ادوس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند افکار اور بزرگ خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ ضخامت ۶۴۲ صفحات مجلد نو رویہ لکھنؤ علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں ترغیباتِ حسنی یا
اور دوسرے افسانے شہوانیاتِ مجلد

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی ان افسانوں اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی و دنیاوی حیثیت سے نہایت بڑے واسطے کے ساتھ معقائد سمجھ رکھ گیا ہے۔ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذہب عالم نے اسے رائج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے بنیاد میں قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

ہنگارستان جمالستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالہ اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیلا ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے اندازہ اس ہو سکتا ہو کہ اس کے متقدّمین بہترین شاہکاروں کے علاوہ ہر ایک غیر زبانوں میں نقل کئے گئے اس ادب میں متقدّمانے اور ادبی مقالہ نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لئے ضحاست بھی زیادہ ہے۔ جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول قیمت انچورڈ پیکٹ آنے علاوہ محصول

ایک غلطی کا ازالہ
ستمبر کے شمار میں ایک مقالہ اردو ہندی نثر کے موضوع پر شائع ہوا ہے اور مقالہ نگار کے نام کی جگہ غلطی سے م۔ ج۔ راج ہو گیا ہے۔ اس مقالہ کے مصنف شہباز حسین صاحب ہیں۔ خریداران نگار بازارہ کرم اس کی تصحیح کریں۔ بنو نگار

ایک نکتہ نامہ ملیہ اسٹیمپنگ اور ایسی ہی نشان اس بات کی علامت
بکھر کر دور میں ہے کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہو گیا۔
اڈیٹر: نیاز فتحپوری
4 OCT 1951

جلد ۶۰	فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۵۱ء	شمار ۴
۲	ملاحظات	۳۱
۵	وسلایٹیا کی کچھری ترقی..... لطیف الدین احمد	۳۶
۱۳	انسان و انسان اعلیٰ..... مسعود جاوید	۴۸
۲۱	افس ڈراما نویس..... ابراہیم پرست	۴۰
۲۲	عشق	۴۲
۲۹	آجس اور آتیر کا ابتدائی اور انتہائی کلام..... شوکت بکرامی	۴۵
	بابا لاسلہ والناتو..... قربان فتحپوری۔ محمد عزیز حسن	
	بابا لاسلہ والناتو.....	
	انتقابات	
	مراسلات	
	منکوبات..... بیدہ اختر۔ محمود یاز۔ رقم۔ شفقت۔ بشیر قمر۔ اکرم مسرور	
	مطبوعات موصولہ	

خریداران نگار کے لئے

ایک نہایت ضروری اعلان

- ۱۔ نگار کا سالانہ چندہ مع سالانہ کے دس میں جنوری، فروری کے پرچے شامل ہوں گے (۳۲ روپیہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن جو حضرات سالانہ لینا نہ چاہیں گے اور سالانہ میں صرف دس پرچوں پر قناعت کریں گے ان کے لئے چندہ پرمستور وہی چھ روپیہ رہے گا
- ۲۔ اگر آپ سالانہ لینا نہیں چاہتے تو ازراہ کرم جلد از جلد مطلع فرمائیے، کیونکہ کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے سالانہ کی کاپیاں ڈال دیں نہیں چھاپی جائیں گی
- ۳۔ اگر آپ نے اطلاع نہیں دی تو سمجھا جائے گا کہ آپ سالانہ لینا چاہتے ہیں اور وہی بلی آٹھ روپیہ چھ آنے میں روانہ ہوگا اگر آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ختم ہوتا ہے۔ ورنہ دو روپیہ چھ آنے کا وہی بلی جاسے گا
- ۴۔ جو حضرات سالانہ لینا پسند فرماویں گے اور اس کی اطلاع ہم کو دیدیں گے ان کی خدمت میں دسمبر ۱۹۵۱ء کے پرچے کے بعد اربچ ۱۹۵۲ء کا نگار بھیجا جائے گا
- ۵۔ فقراؤں کو بھیجے گئے سال کا چندہ چھ روپیہ ہے اور پورے بارہ مہینے کے سال کا چندہ آٹھ روپیہ ہے
- ۶۔ آئندہ سالانہ ۱۹۵۲ء میں صرف نمبر ہوگا
- ۷۔ پاکستانی کے خریدار تمام رقوم ذیل کے کسی پتہ پر سالانہ فرمائیں:-
ڈاکٹر ضیاء عباس باغی۔ ۲۲۲۔ پیر الہی گٹھن کالونی۔ کراچی۔ اور ملک محمد دین اینڈ سنز، پبلشرز، گل روڈ۔ لاہور

ملاحظات

کانگریس دور اسے پر سیاسی جماعتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک کانگریس، دوسری کسان پر جاپارٹی، تیسری ہندو جمابھا، چوتھی سوشلسٹ، راشٹریا سنگھ کاڈگریس اس نے نہیں کرا کہ وہ دراصل ہندو جمابھا ہی کا Trade Name ہے۔ صرف لیبل بدلا ہوا ہے، ورنہ چیز وہی ہے۔ گیونٹ جماعت بھی چنڈاں قابل لحاظ نہیں، کیونکہ ابھی اس کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہوئی کہ وہ انتخاب کے مقابل میں سامنے آ سکے اور اگر کسی گیونٹ نے یہ ہمت کی بھی تو اسے سوشلسٹ جماعت کی حمایت حاصل کرنا ہوگی

ہندو جمابھا — ایک قدامت پرست مذہبی جماعت ہے جو ہندوستان میں صرف ہندو راج، ہندو مذہب اور قدیم ہندو کلچر دیکھ کر چاہتی ہے۔ وہ پاکستان کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتی اور تقسیم ہند کی غلطی کا ازالہ اس طرح چاہتی ہے کہ پاکستان کو فتح کر کے پھر بھارت میں شامل کر لیا جائے۔ وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ ہندوستان کی ہم کو مسلم آبادی یا تو ہندو مذہب اختیار کرے (حالانکہ ہندو کوئی مذہب نہیں ہے بلکہ صرف ایک سوشل تنظیم ہے) یا یہاں سے باہر نکل جائے۔ یہ وہ جماعت ہے جس کے اکثر افراد ہمیشہ کانگریس کے دشمن اور حکومت برطانیہ کے دوست رہے ہیں انھوں نے اس سے قبل ملک کی آزادی کے لئے ایک جہاں کی غلط بھی کبھی گوارا نہیں کی اور ہمیشہ سرمایہ داری کا ساتھ دیا۔ اس لئے حیرت ہونا چاہئے کہ وہ جماعت جو اپنی قوت عمل کا ذکر رطل کے لحاظ سے اتنی قدامت پرست، اس قدر رجعت پسند اور اس درجہ بے عمل رہی ہو، اس میں آج یہ جرات کیوں پیدا ہو گئی کہ وہ کانگریس حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہتی ہے، پاکستان کو بھی فتح کر لینے کا ارادہ رکھتی ہے اور ہم کو مسلمانوں کو سرزمین ہند سے نکال کر یہاں خالص ہندو ملک قائم کرنے پر بھی مصر ہے

اس میں شک نہیں ہندو جمابھا کی یہ ذہنیت رد عمل ہے برطانیہ کی اس منافقانہ حکمت عملی کا جو اس نے ہندوستان میں اختیار کی اور جس کا تنہا مقصد ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دینا تھا، ہر چند یہ ذہنیت انگریزی راج ہی کے زمانہ میں کافی پختہ ہو چکی تھی، لیکن حکومت کے خون سے کوئی عملی قدم نہ اٹھایا جاسکتا تھا جب ہندوستان آزاد ہوا، ملک دو حصوں میں بٹ گیا اور انگریز یہاں سے چلا گیا تو یہ سا باہا سال کی دہائی ہوئی چنگاری و فتنہ بھڑک اٹھی اور ہندوؤں کا جذبہ انتقام مسلمانوں کے خلاف مختلف صورتوں سے رونما ہونے لگا

کانگریس یقیناً خالص سیاسی جماعت تھی اور مذہب سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا، لیکن اس کی یہ خصوصیت بھی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی ایک سبب تو وہی تھا جو ابھی عرض کیا گیا اور دوسرا یہ کہ کانگریس کے قیام کا جو مقصد تھا وہ ان کے نزدیک پورا ہو چکا تھا اور اب کسی مدعا کو سامنے رکھ کر آگے بڑھنے کے لئے انھیں آسان ترین طریقہ بھی نظر آیا کہ ہندوستان کو خالص مذہبی حکومت میں تبدیل کر دیا جائے وہ تو کہتے کہ مہاتما گاندھی کے بعد نئی قومی حکومت کی باگ جو اہر لال نہرو کے ہاتھ میں آئی، اور بین الاقوامی ساکھ پیدا کرنے کے لئے حکومت

کا دستور لاندھی اصول پر مرتب ہوا، ورنہ جس خطہ سے اس وقت ملک دوچار ہے وہ پہلے ہی سامنے آ جاتا اس دوران میں ایک عام شکایت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ کانگریس اپنے اصول سے ہٹ گئی ہے اور اس کے ارکان میں خود غرضی، نفس پرستی، مادی طمع اور بددیانتی بہت پیدا ہو گئی ہے پھر چونکہ حکومت کانگریس پارٹی کی ہے اس لئے یہ الزام گویا براہ راست حکومت پر عائد ہوتا ہے اور وہی ان شکایت کے ازالہ کی ذمہ دار ہے۔ ظاہر ہے کہ حکومت نظم و نسق کی اس فرائی کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی اور وہ اول دن سے اس تھی کے سلجھانے کی میں ہے کہ حکومت پر کانگریس کا اقتدار قائم رکھتے ہوئے کیونکر ان خرابیوں کو دور کیا جاسکتا ہے اور ہر سال کانگریس کے اجلاس میں یہی سوال پیش

اور جزیہ معنی پھر زول کے سوا کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ سال گزشتہ سبب کرپائی جی اور ٹنڈن جی کا مقابلہ تھا تو نہرو، کرپائی جی کی موافقت میں تھا کہ کرپائی جی بہر حال ٹنڈن جی کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ آدود خیال ہیں اور اس طرح یہ مقابلہ گویا جیت پسند اور اصلاح پسند دو قوتوں کا مقابلہ تھا لیکن بد قسمتی سے رجعت پسند جماعت کو کامیابی ہوئی اور ٹنڈن جی کی صدارت نے اس گتھی میں اور زیادہ پیچیدگیوں پیدا کر دیں۔ ٹنڈن جی کو ہمیشہ سے کانگریس کے آدمی رہے ہیں لیکن ان کی ذہنیت جمابھائی ہے اور اگر انھوں نے اپنے دوران صدارت میں کوئی ایسی بات نہیں کی کہ حکومت سے کھلا ہوا تصادم ہو جاتا، پھر بھی ان کی صدارت کو جو حامی اثر کانگریس پر پڑا تھا وہ جمابھائی نوعیت کا تھا، اور جو اہر لال نہرو ہائی کمانڈ اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کا بوجھ اپنے ضمیر پر بری طرح محسوس کرنے لگے تھے

اس کشمکش کا نتیجہ ہو اگر جو اہر لال کے بعض ساتھی ان سے اور کانگریس سے جدا ہو کر اپنا عائد علیحدہ قائم کرنے لگے اور کانگریس کا مستقبل زیادہ تاریک نظر آنے لگا۔ جو اہر لال کو چونکہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اکثر ارکان سے جنھیں ٹنڈن جی نے منتخب کیا تھا اول ہی دل سے اختلاف تھا اور حالات زیادہ ناگوار ہوتے جا رہے تھے اس لئے ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ وہ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں میں تغیر و تبدل کا مطالبہ کریں اور یہ صورت عدم تبدیلی خود ورکنگ کمیٹی کی عمری سے مستغفا دیدیں

جو اہر لال نہرو کا یہ طرز عمل گویا ایک چیلنج تھا ٹنڈن جی کی بائیس کے خلاف جس کے جواب میں ٹنڈن جی نے اس کو تو منظور نہیں کیا کہ وہ اپنی منتخب کی ہوئی ورکنگ کمیٹی میں کوئی تبدیلی کریں لیکن انھوں نے خود صدارت سے استعفا دیدیا۔ ٹنڈن جی کے اس طرز عمل کو بعض لوگ ان کے اشارے سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ بھی ان کی ایک چال تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر انھوں نے کانگریس کی صدارت نہ چھوڑی تو جو اہر لال ورکنگ کمیٹی سے علیحدہ ہو جائیں گے اور اس واقعہ کانگریس کے اقتدار پر اتنا خراب اثر پڑے گا کہ آئندہ انتخاب میں شکست ہی سے وہ یا کانگریس کو کوئی فائدہ حاصل ہو سکے گا

اس کو کانگریس کا بہر پرورد اچھی طرح جانتا ہے کہ جس حد تک عوام کا تعلق ہے وہ کانگریس اور جو اہر لال نہرو میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اور کانگریس کی جڑیں سالہ باقی ہے وہ صرف نہرو کی ذات سے وابستہ ہے۔ اس لئے آئندہ انتخاب میں کانگریس کسی نمبر کا کامیاب ہو جاتا اس حال میں کہ نہرو کی دلچسپی کانگریس سے ختم ہو چکی ہو ان کے نزدیک بھی ممکن نہ تھا۔ اور اسی لئے کانگریسوں نے ٹنڈن جی کے بستے اور ورکنگ کمیٹی کی نئی تعمیر و تشکیل کے کچھ ٹھوٹے کو برداشت کر لیا

نہرو کے صدر کانگریس ہونے کے بعد دو سراسوال پیدا ہوئے کہ آیا وہ لوگ جو کانگریس کو چھوڑ چکے ہیں، پھر کانگریس میں شامل ہوں گے یا نہیں اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے رفیع احمد قدوائی اور کرپائی کی طرف لوگوں کی نگاہیں چنانچہ حالات بتاتے ہیں کہ قدوائی تو نابالغ جلد واپس آگیا ہیں گے اور کرپائی بھی خود واپس آئے بعد میں راہ اختیار کریں گے، کیونکہ نہرو کے صدر کانگریس ہو جانے کے بعد یہ جا پارائی کی اہمیت تقریباً ختم ہو چکی ہے اور کرپائی جی کو اپنے بیٹے کے دور میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ جا پارائی کو بپک کی ہمدردی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ اب وہ کوئی نئی چیز ایسی پیش نہیں کر سکتی جو کانگریس کے مفاد سے مختلف ہو۔ اور اس لئے وہ لوگ جن سے ہمدردی و اعانت کی توقع کی جاتی تھی وہ اگر کانگریس کی طرف سے تو موافقت جماعت میں شامل ہو جائیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا نہرو کی صدارت کانگریس اور رفیع احمد قدوائی یا دوسرے متصرف ہونے والے ارکان کی واپسی سے یہ گتھی ہمیشہ کے لئے کھلی جائے گی اور کانگریس حکومتوں کی خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ ہمیں اس میں شبہ ہے

اس سلسلہ میں رفیع احمد قدوائی کا یہ بیان بہت معنی خیز ہے کہ جب تک کانگریس حکومت کے ارکان میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہو اور علی حثیت سے ان خرابیوں کا انکار نہ کیا جائے جنھوں نے کانگریس کو بدنام کر دیا ہے، جنھیں صدارت کی تبدیلی یا ورکنگ کمیٹی کی جدید تشکیل مفید نہیں ہو سکتی قدوائی صاحب کا یہ بیان کھلا ہوا اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ نہرو کی کامیابی کا اصل تعلق صوبائی حکومتوں سے ہے اور جب تک ان میں کوئی تبدیلی نہ آجائے کوئی مفید نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا۔ بالکل وہی چیز ہے جس کا ذکر نہرو جی نے بھی اپنی سوانح حیات میں کیا ہے۔ انھوں نے صحت و صاف الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ کانگریس پارٹی باؤسی کا شکار ہو گئی ہے اور ہماری طاقتیں غلط راستے پر استعمال ہو رہی ہیں۔ ہمیں پارٹی باؤسی کی لغت کو ختم کرنا ہوگا۔

اسی کے ساتھ دوسری خرابیوں کو بھی جو کانگریس کو کمزور کر رہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ تمام کانگریس کمیٹیاں اس سرفرازی کو تسلیم کریں تاکہ پارٹی باڈی اور عوامی پڑوسی ہو جائے۔ جو لوگ انصاف سے کام نہیں کر سکتے انھیں ذمہ دار عہدوں سے ہٹا دینا چاہئے اور آئندہ انتخاب میں صرف انھیں امیدواروں کو نامزد کرنا ہے جن کے متعلق یقین ہے کہ وہ پوری دیانت و امانت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیں گے اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اقلیتوں کے نامزدوں کو کانگریس اصول کے حامی ہیں انتخاب کے لئے نامزد کیا جائے

ہمارے وزیر اعظم نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو موجودہ حالات میں کانگریس کی اصلاح کے لئے کہنا چاہئے تھا، لیکن ان کو کچھ اور تفصیل میں حاکم یہ بھی ان صفات کہہ دینا چاہئے تھا کہ کانگریس کمیٹیاں ان لوگوں کی ملکیت نہیں ہیں جو صرف جیل جانے کی سزا پانے پاس رکھے ہیں اور کوئی تنظیمی اہلیت یا اطلاقی زندگی میں رکھتے خصوصیت کے ساتھ ملازمتوں میں تو کانگریس کو بھی نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ صرف کام کی اہلیت، کیرکٹر کی مضبوطی، انتظامی قابلیت، رد و انداز کی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ کیونکہ پچھلے چار سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ انتظامی معاملات میں سب سے زیادہ وہی لوگ ناکارہ ثابت ہوئے جن پر بعض کانگریسی ہونے کی وجہ سے اور صرف اس استحقاق پر کہ وہ ایک یا دو مرتبہ جیل جاتے ہیں، بھروسہ کیا گیا تھا یہ وقت جو اہر لال نہرو کے لئے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا ہے اور ان کی ذرا سی غلطی یا رعایت سخت تباہ کن ثابت ہوگی۔ ان کو معلوم ہونا چاہئے (اور ان سے زیادہ کوئی اس حقیقت کو جان سکتا ہے) کہ سنڈن جی کا استعفا اور سنڈن جی کے ساتھیوں کا خاموشی کے ساتھ ان کی صدارت کانگریس کو قبول کر لینا اس لئے نہیں ہے کہ یہ لوگ اپنی رجعت پسندی کو ترک کر چکے ہیں یا صداقت کے ساتھ کانگریس کی تنظیم کو اصلاح چاہتے ہیں بلکہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ جو اہر لال نہرو کی وساطت سے انتخاب میں کامیابی حاصل کر سکیں (جو بصورت دیگر ممکن نہیں)۔ اور جب وہ اس میں کامیاب ہو جائیں تو پھر زیادہ قوت کے ساتھ مخالفت کریں

افرض جو اہر لال نہرو کو اس وقت ان برادران یوسف سے ہوشیار رہنے کی سخت ضرورت ہے اور انھیں چاہئے کہ سب سے پہلے وہ صوبہ کی کانگریس کمیٹیوں کو گندہ عناصر سے پاک کر لیں اور پھر اس بات کی کوشش کریں کہ کانگریس ٹکٹ پر وہی شخص انتخاب کے لئے کھڑا ہو جس کو کیرکٹر میرا ہے۔ ہم یہ کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے ہیں جو نہرو کے سامنے نہ ہو، لیکن ہم کہیں ات سے ڈر لگتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ نہایت کچے جذباتی قسم کے انسان ہیں اور ایسا انسان ہمیشہ ظاہری تعلق اور تعلقات دیرینہ کے خیال سے متاثر ہو جاتا کرتا ہے

پچھلے چار سال کے تجربہ نے جو اہر لال نہرو کو اچھی طرح بتا دیا ہو گا کہ ملک کا دوست کون ہے اور دشمن کون، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اس وقت کتنے سانپ تھے جو انھوں نے اپنی آستین میں پال رکھے تھے، اس لئے آئندہ انتخاب ان کے لئے آخری موقع ہے کہ وہ اپنے ان تجربا سے فائدہ اٹھائیں اور صحیح معنی میں ہندوستان کو ایک لائبریری جمہوریت بننے کا موقع دیں۔

اس وقت جو اہر لال نہرو کے مخالفین میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت صحرا جی کی ہے، جو نہرو کو ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کر کے لوگوں کو نہرو کی ڈکٹیٹر شپ کا یقین دلارہے ہیں۔ صحرا جی دراصل راشٹریا سیک سنگھ کے علی بابا ہیں، اس لئے ان کا یہ طریقہ عمل غلات تو قلع نہیں، لیکن خطرناک بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خالص کانگریسی کہتے ہیں اور کانگریس ہونے ہی کی حیثیت سے وہ نہرو اور نہرو کو پر ہمتہ جینی کر رہے ہیں۔ اس سے اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے لوگ ان کے ظاہر و باطن میں تیز کر کے دھوکہ میں آجائیں۔ ایک بہت بڑی گتھی مشرقی پنجاب کی بھی ہے، جہاں زبردست اکثریت سہارن پور کی ہے۔ اگر اس کو کانگریس ٹکٹ پر مقابلہ کرنے کا موقع مل گیا تو نتیجہ وہی ہو گا جو اس سے قبل ظاہر ہو چکا ہے اور اگر کانگریس کے خلاف ہو کر اس نے الگشن میں حصہ لیا تو کانگریس کو کامیابی کی دہائی بہت کم امید ہے۔ بہر حال نہرو اس وقت ایک بڑی کٹھن منزل سے گزر رہے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ اس منزل سے کامیاب گزرنے میں ہر حیثیت سے ان کا ساتھ دیں۔

ایک غلطی کی تصحیح

سچیر کے نگار میں "صدائے شکست" کے عنوان سے جو نظم شایع ہوئی ہے وہ علامہ جسٹس منظر کی ہے، غلطی سے نظیر صدیقی کا نام درج ہو گیا۔ منظر نگار

وسط ایشیا کی کلچری ترقی

وسط ایشیا کا علاقہ پہلے تورانی کہلاتا تھا، پھر روسی ترکستان کہلایا اور آج اس کا نام سوویت مشرق ہے۔ یہ علاقہ افغانستان و ایران کے شمال میں چینی ترکستان سے لیکر بحر قزحین (کاسپیان) تک پھیلا ہوا ہے۔ انڈیا، ترکستان، سوئیزیا، ازبکستان، اور ترکمانستان کی پانچ آزاد و خود مختار جمہوریتوں پر مشتمل ہے جو سوویت وفاق میں شامل ہیں

چودھویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور علم و فن کا تنہا مرکز تھا۔ فارسی شاعری کا باوا آدم رودکی ایک تاجیک تھا فردوسی بھی تاجیک نژاد تھا، بولعی سینا بخارا میں پیدا ہوا، مشہور عالم البیرونی جینوا کا باشندہ تھا۔ اسلامی تاریخ نے جتین دربرین سلطنت پیدا کئے ان میں جعفر برکی اور نظام الملک طوسی کے علاوہ تیسرا عالمی شیر نوائی بھی ازبک تھا اور خراسانی کی تیموری حکومت میں سلطان حسین کا فیض و غیر تھا۔ خوارزم کی سلجوقی حکومت اسی علاقہ میں سرسبز ہوئی اور نظام الملک کا جو سر کمال بھی اسی سرزمین پر چمکا

خاندان تیمور کے سائنس دان شہزادے رفیع بیگ نے سمرقند کی رصد گاہ میں بیچہ کر فلکیات کے جو اصول وضع کئے وہ بیسویں صدی کے امریکی ہیپٹ کے لئے بھی وجہ حیرت بنے ہوتے ہیں، البی بیگ نے اپنی رصد گاہ کی جو عمارت بنوائی تھی، اُس وقت کی دنیا میں اس عمارت کا ثانی قسطنطنیہ کی تعمیر ایاصوفیہ کے علاوہ دوسری عمارت نہ تھی

حافظ و خیام اور سعدی جیسے ایرانی تھے اتنے ہی تورانی بھی تھے۔ بہل شیراز کو اپنے محبوب کے ”خال بندو“ کے سامنے جب تحفہ پیش کرنا تھا تو اس کی نگہ انتخاب پر ایران کے اصفہان و شیراز نہیں چڑھے بلکہ توران کے سمرقند و بخارا ہی اس قابل نظر آئے۔ وسط ایشیا کی عظمت اور اس کے قدیم کلچر پر حافظ کا یہ شعر دلیل ہے

بلاشبہ اس زمانہ میں وسط ایشیا کی یہ مسلم قومیں تہذیب و تمدن کا مرکز تھیں اور دنیا کو علم و فن کی روشنی پہنچا رہی تھیں، کون نہیں جانتا کہ تیموری و سلجوقی و بارعلی و کلچری ترقیوں کے لحاظ سے مشعل ہدایت تھیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ خوارزم و خراسان اور سمرقند و بخارا ساری دنیا میں روشنی کی حیثیت سے مشہور و معروف تھے

استراذ وقت نے اس پورے علاقے کو زار روس کی نوآبادی بنا دیا، سارا ملک امیروں اور خاندانوں کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گیا، اسی عہد میں زار شاہی زمانہ میں رجائے بن کر رہ گئیں۔ باہر کی دنیا میں امیر بخارا اور خاق خجوا کی ریاستوں کو تو لوگوں نے جانا۔ باقیوں کو تو کسی نے پہچاننا نہیں

سائنسی نظام کی بدولت اور قومی حکمرانوں کی رجعت پرستی کے طفیل اس علاقہ کی یہ مختلف قومیں اقتصادی بھائی کے گڑھے میں گر گئیں اور صدیوں تک کلچری تنزل میں مبتلا رہیں۔ سوشلزم کے روسی انقلاب کے وقت یہ تمام قومیں غلامت و جہالت کے پاتال میں پہنچ چکی تھیں، جسم و جان میں علاقہ قائم رکھنا اتنا دشوار ہو گیا تھا کہ یہاں کے لوگ کسی دوسری طرف دھیان دے ہی نہ سکتے تھے۔ انقلاب کے وقت ان مختلف علاقوں کا تعلیمی و وسط ڈھانی فی صدی سے زیادہ نہ تھا۔ اس اوسط میں سے اگر امراء و محال حکومت اور ملاؤں کو نکال دیجئے تو عوام سو فیصدی جاہل تھے

اقتصادی بد حالی، سیاسی بے بسی اور قومی حکومت کی فرض ناشناسی اس ایک شمال سے روشن ہو جاتی ہے کہ امیر عظیم آخند خان نے اپنے چھ سال کی حکمرانی میں اور پھر نے دو کروڑ روپے سالانہ کی آمدنی میں سے ایک سجدہ ایک مدرسہ اور ایک پبلک لائبریری خرید کر دیئے۔ دوسری شمال یہ ہے کہ

کہا یا دوسرے خاص کے ادب میں بھی حاجی نصیر الدین کے کردار نے کبھی ادب پارے پیدا کر دئے اور قبل انقلاب کا روسی ادب بھی ان محنت محکوم قوموں کے ادبی اثرات سے دامن و بچا سا تھا۔ چنانچہ اٹالائی کے شاعروں میں کالک اور حاجی مراد مشہور کردار ہیں۔

ترکمانیہ کے کلاسیک ادب کی عمر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ نہیں، لیکن اس کا بے لکھا ادب (لوک گیت اور ساکے) اتنا ہی پرانا ہے جتنا ازبکستان کا سیاری ادب ہے۔ سوویت حکومت قائم ہونے کے وقت ترکمانیہ کے کلاسیک شاعر مخدوم قلی کی رزمیہ داستانیں ترکمان قوم کے دلوں میں وطنیت اور جاننازی کے جذبہ کو ابھار رہی تھیں اور ایک ایک ترکمان اس جذبہ سے محو رہتا تھا۔ مخدوم قلی کے بعد اس کا بیجا جلیلی مقبول اور محبوب عوام ہو کر اپنی قوم کا "لاڈلا مطرب" بنا۔ وردی قلیچ نہایت ہی مقبول شاعر ہے۔ یہ پیدا شدہ اندھا ہے یہ ایک بے (زمیندار) کے کھیت پر مزدوری کرتا تھا وردی کو بچپن ہی سے گانا سننے کا شوق اور حافظہ بلا تھا۔ جو گیت سنایا وہ بھلیا۔ اس طرح وہ خود بھی گانے لگا۔ "گانے گانے کلاؤنت ہو جاتا ہے" ہماری زبان میں ایک کہادت ہے جو وردی پر پوری طرح کچی اُترتی ہے۔ پھر وہ گیت جوڑنے لگا اور اپنی جوانی ہی میں قوم کا محبوب شاعر بن گیا۔

وردی کی عمری شاعری میں وسط ایشیائے فن و صناعیت کی تمام روایات محفوظ اور زندہ ہیں۔ لیکن اس نے ایک بدعت بھی کی ہے اور وہ یہ کہ جب وہ کوئی نظم سنائے لگتا ہے تو پہلے ایک حکایت بیان کر دیتا ہے، یہ حکایت گویا اس نظم کا دیباچہ ہوتی ہے جس میں اس کی وہ تسمیہ، شان نزول اور اخلاقی نتیجہ ہوتا ہے۔

وردی نے جو زمانہ دیکھا اور جن حالات سے دوچار ہوا وہ ایسے سنگین و جانکاہ واقعات تھے جن کے سامنے بڑے بڑے مرد بھی قائم نہ رہ سکتے تھے۔ مگر وردی کے قدم کو لغزش نہیں ہوئی۔ اس نے دیہات کے افلاس اور جہالت کے اندھیرے میں آنکھیں کھولیں، شدید و مصائب برداشت کئے مگر اس کے مزاج و فطرت پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ وردی نے ان حالات کو ستم ظریفی سمجھا اور اسی طرح برتا بھی۔ اس کی عمر بھر کی شاعری میں کسی ایک موقع پر بھی شکست کا احساس یا ناامیدی کا اظہار نہیں ملتا۔ وہ حقیقتاً باہمی مسک کا آدمی ہے۔ شاعر سلیمان و فرج کی طرح اس کے کلام کی خصوصیت بھی طنز و مزاح ہے۔

انیسویں صدی میں ازبکستان میں بھی ترکمانیہ کی طرح تین بڑے شاعر پیدا ہوئے۔ مقیمی، بلعاش اور محمود، اور عجیب اتفاق تھا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے زمانے میں دربار داری اور اس کی تصدیق خوانی سے محروم اور باغی رہا۔ درباری شعراء کے برخلاف ان تینوں نے مہمان ملک و قریب وطن کے گیت گائے یا پھر سامنے آقاؤں کی جوس کاریوں اور سفائیوں کا پردہ چاک کیا۔

دنیا کے عوام انسان نے تاریخ کے ہر دور میں ظالم اور سفاک حکمرانوں اور آقاؤں سے نفرت کی ہے، ازبکستان کے عوام انی شاعروں کے طنز و مزاح کے اور ظلم رانوں سے اپنی نفرت پہچان کر ان شعراء سے محبت کرنے لگے تھے۔ جینا و خوند کے خان اور امیر اور زار کے گماشتے ان ترقی پسند شاعروں پر جبر و تشدد کرتے تھے مگر کبھی بھی ان کی آواز کو خاموش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

ازبکستان میں صدر الدین مقیمی کو ساقیوں کے لڑکھائیاں حاصل تھیں اور وہ ایک نہایت مقتدر و محترم شاعر و ادیب ہے۔ جب انقلاب و ترقی ہو تو مقیمی کی استاد سی مسلم ہو چکی تھی۔ شروع ہی سے مقیمی نے ترقی پسندی کو اپنا مسلک بنالیا اور جمعی قحاطوں کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہا۔ اپنے عقیدے کی قیوت اس نے سزا و عقوبت کا شکار ہوا کی اور میں وقت انقلاب شروع ہوا مقیمی آگے کی صف میں نظر آتا۔

وسط ایشیائے انقلاب کے اثرات
ایشیائے سوویت قوموں کی ترقی کا اعلان کرنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انقلابی دور کے حالات قوموں کی کل آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس نے قہقہے کو اپنے قہقہے کے ساتھ حکمرانوں کے خلاف بھی بغاوت کرنا پڑی۔ اور جب ان تمام طاقتوں میں طاقتور اور سزا دہندگان کو دئے گئے، جب ان صدیوں سے عقیدہ کے پر آزادی کا دل کا سورج چکا تو ترکستان میں اس کی سو فیصدی مسلم آبادی کے اندر نسلی

انتہا سے اپنے تعلقات قریبیوں سے بڑھ کر اپنے جہود میں آگئیں۔ روس کی وفاقی جمہوریت نے ان کی جمہوریتوں کی حدود اور حدود کے علاوہ امدادی اس کے لئے انسانی سلوک کا پہلا اخلاقی تجربہ کیا کہ ان کو درکار ہی سلوک کی دولت پر تمام قومی رہیوں کے لئے لکھ کر دی گئی تھیں۔ اب جمہوریت سے مراد انہ کے لئے کرنا نہیں اور اپنی رواداری اور بھائی چارہ کا رشتہ قائم کرنا۔ اسی اخوت اور مساوات کے پرانے اصول کو نیا رخ دیا گیا ہے۔ سب اور دوسری قومیں بھی جو یہ خداوندی اخوت سے روایت دفاق میں شامل ہوئیں۔ یہ تعلقات آج تک قائم ہیں اور مضبوط تر ہونے لگے ہیں۔ اس کا ایک بڑا ثبوت تو دوسری جنگ عظیم میں سوویت روس کی بے مثال فحش ہے اور دوسرا ثبوت یہ کہ کچھ عرصہ میں سوویت حکومت نے اپنی وفاقی جمہوریتوں کو اس بات کا پھل دیا کہ وہ اپنی مخصوص قومی قومیں بنائیں اور دنیا کی طاقتوں سے براہ راست سیاسی تعلقات قائم کریں۔ لیکن آج بھی کسی وفاقی جمہوریت نے اپنے اس اختیار کو استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ حالانکہ وہ اپنی جنگ میں پہلی جہت میں نے انتہائی کوشش کر لی کہ پورے قوم پرست یوکرینیوں اور بیلاروسینوں کو تو اپنا مل جائے جسے ان فحش طاقتوں میں حکومتوں کا سر دھرا جانا چاہئے۔ جس اعلیٰ سہائی چاہئے کہ اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہو سکتا ہے؟

مشرقی اور مغربی ریب کی ہستیاں عالم میں مشہور و معروف ہیں۔ ان دونوں ممالک میں سوویت روس کے کئی سفر گئے اور وہاں کے حالات پر کئی کتابیں لکھیں جو مطالعہ کی حیثیت سے غیر جانبدارین کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام "اشتراکی تہذیب" ہے۔ یہ دو خطی جلد اہم معنی کا حامل ہے، اشتراکی نظام سماجی باطنی فرق و اختلافات ہی کو نہیں مٹا بلکہ رنگ و نسل کا امتیاز، آقا و غلام، اشراف و اجلاں کا لے اور گودے کا فرق ختم کر کے ایک نئے تمدن یا کلچر کو جنم دیتا ہے۔

اشتراکی تعمیر کے لئے لازم تھا کہ سماجی اور نسلی تقسیموں کو ختم کر کے کچھری اپنی بیج کو بھی باقی نہ رکھا جائے۔ کوئی قوم دوسری قوم سے کلچر یا تہذیب میں بھی پیچھے نہ رہے۔ سوویت آئین میں رنگ و نسل کا فرق کو ختم کر دیا گیا ہے اور قانون پر عمل درآمد ہونے کا سب سے بڑا ثبوت خود اشتراکیت کی بات ہے جو ایک چھوٹی سی قوم جارجین کا ایک فرد اور ایشیائی ہونے کے باوجود کچھ سالوں کا لی گوری قوموں کا، عیسائی، یہودی اور مسلم مذہبوں کے ماننے والوں کا محبوب و میراثی بننا ہوا ہے۔

یہ سچا اور اس پر عمل کر کے دکھا دینا کہ بہت قریبی قریبیوں کے ترقی یافتہ قوموں کے برابر ہو جائیں، اشتراکیت کے داغ کا کارنامہ ہے۔ چنانچہ پچھلے صدی کے پچھلے دور میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ جو علاقے زیادہ پیچھے ہوئے ہیں وہاں کے لئے بہت سے زیادہ دیکھ بھل رہے رکھا جاتا ہے۔ پچھلے قوموں کو ترقی یافتہ قوموں کے بعد واپس کر دینے کی یہ پالیسی بہت زیادہ حد تک کامیاب ہو چکی ہے۔

اس فکر میں جو جہاں ایک ادیب، سلطانوں کے ڈراما پر دارا شاہین کا حوالہ ہے موقوفہ نہ ہوگا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں روسی کیلکٹ اپنی کائناتیں بھول کر غریب تھیں۔ اس نے سرخ فوج کے قائم و جرنیل کی حیثیت سے انقلاب کے باغیوں کی سرکوبی کر دی۔ سلطان کے اس ڈرامہ کا یہ دور بھی ختم ہو گیا اور مصنف نے ڈرامہ میں وہ واقعات پیش کئے ہیں جو ڈراما دیکھنے والوں یا ان کے باپ اور بھائیوں کو پیش آنے لگے تھے اس ڈرامے میں ایک منظر بھی ہے کہ جرنیل فرزند ایک سپاہی کو جس کا نام قرم ہے اس پر تادیب کرتے ہیں۔ وہ سرخ سپاہی اپنے آپ کو انگریز کے قابل نہیں سمجھتا اور کہتا ہے کہ "میں ایک بڑے چارے کا ایک اداکار ہوں" اس پر جرنیل فرزند اس سپاہی کو کھاتے مٹا دیتے ہیں۔ شاہین کے شروع میں گستاخے ڈراما ہے، اس کی اصل اپنے بچے کو پہاڑ کی غدی پر سے ڈھکیں دھکیں اور ساتھ ساتھ آگ لگتی ہے۔ اس طرح روسی قوم اپنے پیچھے رہے ہوئے چاروں کو کھاتے مٹا دیتی ہے۔ سوویت نظام کی یہ پالیسی ہے کہ چھوٹی قوموں میں بھی نہایت اونچے اونچے کے شاعر و فنکار پیدا کر دے۔ LA ۱۹۲۱ء کی قوم تعداد میں کل بیکھیں ہزار ہے۔ سیاحان اعلیٰ سطحی اس قوم کا ایک نامور شاعر ہے کہ جس نے پہلی صدی کا پورا کچھ لکھا ہے اور جس کی نظمیں نعتیں ساری سوویت قوموں میں بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں بلکہ اسکولوں کے کتب خانوں میں داخل ہیں۔ سیاحان کی نظمیں کا ترجمہ گورکی نے کیا ہے اور اسے روس کے دانشور کرنا ہے۔ گورکی نے جب یہ کہا "ادب کی قدر خدا نہیں بلکہ انسان کی بنا کر رکھتی ہے"۔ گورکی کے لکھنے میں سیاحان کی شاعرانہ قی

سوویت قوموں کے بچے اور بچے بھائی چارہ کے ثبوت میں ایک تو یہ شہادت اور دوسرا یہاں ہوں۔ انہیں بڑے شاعر و شاعرانہ خیالات ہوتے ہیں۔

کہ دوسری جنگ عظیم کے شروع میں جرمن فوجیں روس کے بہت بڑے علاقے پر قابض ہو گئی تھیں۔ بہت سی آبادیاں تباہ و برباد ہوئیں اور ان کے باشندے موت کے گھاٹ اتار دئے گئے تھے۔ لاکھوں بچے یتیم و فغاناں برباد ہو گئے تھے۔ سوویت نظام قوم کے بچوں کو سب سے بڑی دولت سمجھتا ہے۔ یوکرین اور ہیلو روس کے ہزاروں سفید عیسائی بچے سوویت مشرق کے مسلمانوں کے پاس تعلیم و تربیت کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ ہر گھر میں ایک بچہ کو گود لینا رواج با جاتا ہے۔ جس دفتر سے بچے تقسیم کئے جاتے ہیں وہاں ایک عورت آتی اور اپنا حصہ مانگتی ہے۔ جواب ملتا ہے کہ بچے سب تقسیم ہو گئے۔ وہ عورت سر ہلک کر پیٹھ جاتی ہے کہ اب وہ اپنے شوہر کو کیا جواب دے گی جو کئی روز سے تھاں سا کر رہا تھا کہ وہ جا کر ایک بچہ لے آئے۔ اس کا گھر کوٹہ بن گیا۔ سارے گھروں میں بچے ہوں گے اور ان کا گھر شرمندہ و ذلیل ہوگا۔ عورت کی بد حالی کو دیکھ کر دفتر والے اسے یقین دلاتے ہیں کہ اب جو بچے آئیں تو سب سے پہلے اسے ایک ”شہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی“ دی جائے گی۔ معلوم رہنا چاہئے کہ یہ عورت خود بھی نو بچوں کی ماں تھی

دوران جنگ میں ایک مصنف کا فسانہ شایع ہو کر بے حد مقبول ہوا جس کا عنوان ہی ”قومی بھائی چارہ“ تھا۔ اس فسانے میں تین ٹیگروں کا قصہ ہے جو ایک ہی ٹینگ پر مامور تھے۔ یہ تینوں تین مختلف قوموں کے فرد تھے۔ مگر جب ڈیوٹی پر نہ ہوتے تب بھی ہر وقت اور ہر جگہ دیکھے جاتے تھے اور اس بنا پر ان کے ٹینگ کا نام ہی ”قومی بھائی چارہ“ پڑ گیا تھا۔ اس لئے کہ انسانی محبت و رفاقت کی جو مثال ان تینوں کے عمل سے ملتی تھی وہی سوویت ”قومی پالیسی“ تھی

ان دو ایک مثالوں سے اس پالیسی کی اہمیت کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے
 زار شاہی عہد میں یورپی روس کا علاقہ اور اس کی شہری آبادی تعلیم اور کلچر سے روشناس تھی۔ اس زمانے کا
 تعلیمی و کلچری ترقی پورے ملک کا تعلیمی اوسط بائیس فیصد ہی تھا۔ لیکن سوویت حکومت کے اٹھارہ برسوں میں یہ اوسط بالواس
 فیصد تک جا پہنچا تھا۔ نیچے دئے ہوئے اعداد و شمار کسی تفصیل کے محتاج نہیں ہیں :-

۱۹۱۷ء میں ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں جملہ طلباء کی تعداد	۱۸ لاکھ تھی
۱۹۲۷ء میں	۱۸ لاکھ تھی
۱۹۳۷ء میں	۱۸ لاکھ تھی
۱۹۵۷ء میں اعلیٰ تعلیم کا ہوں میں طلباء کی جملہ تعداد	۱۸ لاکھ تھی
۱۹۶۷ء میں	۱۸ لاکھ تھی
۱۹۷۷ء میں	۱۸ لاکھ تھی

۱۹۱۷ء اور ۱۹۷۷ء میں طلباء کی اس تعداد پر تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں، اس لئے کہ زار شاہی عہد میں کتابوں کی اشاعت کا اوسط محض
 اٹھارہ سات تھا جو سوویت عہد میں بڑھ کر چار اعشاریہ ایک یعنی چھ گنا ہو گیا۔ یہ اطلاع کم دلچسپ نہ ہونا چاہئے کہ سوویت روس میں کتاب
 لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہے جو دنیا کے بہت زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی نہیں ہوتا اور ایسی مثالیں بھی ہیں کہ کتاب شایع ہونے کے دو گھنٹے بعد
 بازار میں نہیں ملی ہے

اس ذیل میں کا زکستان کی مثال کے پیش نظر باقی علاقوں کے متعلق قیاس قائم کیا جاسکے گا۔ انقلاب سے پہلے یہ علاقہ خانہ بدوشوں کا ملک تھا
 پچھلے چھ صدیوں میں کا زکستان کے اندر جتنا ادب وجود میں آیا، سوویت عہد کے چند برسوں میں اس سے چند گنا ادب پیدا ہو گیا
 ۱۹۱۷ء اور ۱۹۷۷ء تک کے ہیں۔ اس کے بعد کے برسوں میں جنگ کے چار سال چھوڑ کر ترقی کی رفتار بہت زیادہ تیز رہی ہے۔ جنگ کے زمانہ
 میں بہت بڑی تباہی و بربادی ہوئی مگر جنگ کے پنج سالہ پروگرام میں تعمیر و ترقی بھی بہت زیادہ ہوئی ہے۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۷ء تک کا پنج سالہ پروگرام
 چارہ سال میں مکمل ہو گیا اور سوویت روس میں بعض چیزوں کی پیداوار بڑے سے بڑی پیداوار کرنے والے ملکوں کے برابر پہنچ گئی ہے
 وسط ایشیا کی بعض قوموں کے پاس کسی قسم کا کلاسیکی ادب نہیں تھا۔ جو کہ عہد لوک گیتوں اور ساکھوں کی شکل میں تھا۔ یہ عام تجربے کی بات

”سوویٹ ادب کا پیکر قومی اور اس کا وضع اشتراکی ہوگا“ یہ خصوصیت غالباً سوویٹ قوموں ہی کے ادب کو حاصل ہے کہ اس نظریے کی بدولت ان کے معیاری اور عوامی ادب میں فرق نہیں رہا۔ اور اس مقصد کے حاصل ہونے میں کسی خاص کوشش کو دخل نہ تھا۔ اس لئے کہ اس وقت تک سوویٹ نظام میں ایسے سازگار حالات پیدا نہ ہو سکے تھے جو معیاری ادب کی پیداوار کے لئے موافق فضا بنا سکتے، مگر عوامی شاعری نے انقلابی موضوع پر گیت شروع کر دئے جو گاؤں گاؤں پہنچ گئے

ان ”گشتی“ شاعروں کو مختلف قوموں میں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، ترکمانیہ میں آشک کہلاتے ہیں اور کازکستان میں الکتین، تاتاریا میں جتشی کہے جاتے ہیں اور کہیں صرف شاعر بہر حال سوویٹ عوام میں سوویٹ ادب کا بیج بونے والے یہ ”گشتی“ شاعر ہی تھے جو ہمیشہ گمنامی میں رہے۔ کبھی کسی نے ان کا نام جانا نہ ان کے جوہر کو تسلیم کیا۔ لیکن سوویٹ نظام نے حالات کو بالکل بدل دیا ہے۔ سوویٹ ادب کی بے مثال ترقی ہر قوم کے عوامی شاعروں کو منظر عام پر لے آئی ہے۔ بہت سے شاعر جو پہلے اس جماعت میں شامل تھے آج اساتذہ ادب کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کا کلام کلاسک میں شمار ہوتا ہے جیسے جمبول زابراور سلیمان، ان کا کیا ہوا ایک ایک لفظ اور ان کی زندگی کے متعلق ایک ایک بات ہیں کرور انسانوں تک جا پہنچتی ہے

عوامی شعرا کا وصف انقلاب اور انقلابی موضوعات کی جو اہمیت عوامی شاعروں کے سامنے تھی ظاہر ہے کہ دیہاتی عوام اس کو سمجھ سکتے تھے۔ اس لئے ان عوامی شاعروں نے یہ کیا کہ عوام کو صرف وہ اتنی بات سنائے جو عوام آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ یہ کھلی حقیقت تھی کہ زار شاہی کے اندر کتنی خرابیاں تھیں اور سوویٹ نظام نے ان خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کیسی کاری ضرور لگائی ہے۔ وہ اس حقیقت کو بھی پہچانتے تھے کہ رجعت پسند طبقہ اس نئے نظام کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ چنانچہ ان شاعروں نے اس وقت کے مجموعہ کلام سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان لوگوں نے اس وقت کے حالات کی رعایت ملحوظ رکھی اور دیہاتی عوام کو یقین سمجھانے میں احتیاط اور دانشمندی سے کام لیا۔ ان شاعروں نے نئے حالات کے نتیجے نکال کر اپنے سننے والوں کو تعلیم دی، اور ان کے خیالات کو نوعیت ایسی ہوتی تھی جو انسان فطرت کو حرکت میں لائے بغیر رہ سکتی تھی۔ اسی کی کراہتیں اور مستقبل کی برکتیں اس سادہ طریق پر پیش کیں کہ دیہاتی عوام کے ذہن نشین ہو گئیں

سوویٹ طاقت کے وجود میں آتے ہی وسط ایشیا کے کورستانی علاقے ان گننام شاعروں کے نعروں سے گونج اٹھے تھے۔ آزاد شدہ انسانیت، قصیدے، آزادی کے لیڈر لینن کی شاد وصف، قوم کو جمہوریت کے لئے جہاد حریت کے نعروں، جیت پسندوں کو نیت و نابود کرنے پر سرخ فوج، الکت، یہ تمام باتیں ان کی شاعری کا موضوع تھیں۔ ایسے شاعروں میں جمبول زابراور سلیمان، دروسی قلیچ، آغ، تقبازا اور فرخ وغیرہ بہت نامعلوم نے کشادہ آغوش انقلاب کا خیر مقدم کیا تھا

اس طرح دیہادی عوام کے اندر نئی زندگی کا شعور ابھرا اور اسے بیان کرنے میں معیاری ادب کو اس عوامی ادب یا لوگ گیتوں سے بہت مسالا۔ ایک طرف اسکول کی ریڈیں چھاپ کر بے پڑھے لکھے عوام میں پریس زبردست خدمت انجام دے رہا تھا تو دوسری طرف یہ عوامی شاعر تخلیقی بنائے مرتب کر رہے تھے۔ سوویٹ واقعیت نگاری کا یہ عظیم انسان کارنامہ ہے کہ کل کے بے پڑھے لکھے بھٹا یا آج کے دیہاتی لڑکے، شاعر صحافت دنیائے مرد میدان بن گئے

اوپر ذکر کیا ہے کہ سوویٹ نظام نے چالیس مختلف قوموں کے لئے مناسب حال حروف تہجی بہم پہنچائے۔ یہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنی آسانی اہل گیارہ، بلکہ ایک کاراہم تھا جس کی مختصر تفصیل جاننا فائدہ سے خالی نہ ہوگا

جن قوموں کی کوئی تحریری زبان نہ تھی ان میں ایک زبردست مشکل یہ بھی تھی کہ ہر قوم مختلف و متعدد قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی، اور ان قبیلوں کی بولیاں بنیادی طور پر تو ایک تھیں مگر برقیہ کی ایک خاص فرقہ گ بھی تھی۔ گویا زبان کی شاخیں موجود تھیں مگر زبان غائب تھا اور چونکہ کوئی زبان موجود نہ تھی اس لئے ان تمام قبیلوں کی ایک قومی وحدت بنادینے کا کام اتنا ہی مشکل ہو گیا تھا جتنا نقطے کے بغیر خط کھینچنا دشوار ہوتا ہے

لیکن سوویٹ لیڈروں کی مخلصانہ دل سوزی اور دیدہ ریزی نے اس اہم مشکل کو بھی حل کر لیا، ماہر مقرر کئے گئے اور انھوں نے ایک قوم کے تمام فیملوں کی بولیوں کو اکٹھا کیا، اور پھر فضولیات کو چھانٹ کر ایک قومی زبان کی ایک لغت مرتب کر لی جس پر سہ درسی کتابیں لکھی گئیں، اخبار جاری کئے گئے اور بالآخر ایک ادبی زبان بن کر ادبی سرمایہ وجود میں آئے لگا اور پھر قومی اتحاد و خود پیدا ہو گیا

سوویٹ رُوس کی تمام کچھڑی قوموں کی جدید شاعری اور کلچری ترقی میں قومی پریس سب سے زیادہ قابل تحسین

وسط ایشیا کی جدید شاعری ہے، جس نے درسی کتابیں اور بے شمار اخبار شائع کر کے جدید شاعری کو مقبول بنایا۔ ہر اخبار میں نظم کا حصہ ضروری ہو گیا تھا۔ اس وقت کی شاعری کا رنگ قدرتی طور پر طنزیہ اور مزاحیہ تھا اس لئے مقبول عوام ہو جانے میں آسانی بھی تھی۔ اس کے بعد ہی فیکٹری اور تعلیم کا ہوں نے اپنے مختصر اخبار نکالنا شروع کر دیے۔ اس طرح بھی شعور سخن کو چمکنے کا بڑا موقع ملا۔ اور جب دیہاتوں میں اسکولوں کا جال پھیل گیا تو اسکول ٹیچروں نے ہر گاؤں سے مقامی اخبار نکالنے شروع کر دیے۔ دیہات میں تعلیم عام ہوئی تو ہر شخص پڑھا لکھا بن گیا اور اس طرح بہت سے جوہر قابل پیدا ہوئے جن میں سے بعض بعض مستند اہل قلم بن گئے۔ اس کی ایک مثال بوڑھا جیک ربیع ہے جس نے تعلیم بالخانہ کی اسکیم کے تحت پڑھنا لکھنا سیکھا۔ پھر ربیع نے مضمون نویسی شروع کی اور پہلا مضمون قدامت پرستی کے خلاف لکھا اور نعرے کر اٹھائے آباد پوچھا جاتا تھا کہ مستقر ہے۔ اخبار تاجکستان کے دفتر میں مضمون شائع ہونے کو دیا اور اس اخبار کا مستقل نامہ نگار بن گیا۔ آج ربیع کی تصانیف دوسری

سوویٹ زبانوں میں ترجمہ ہو رہی ہیں

کلچر اور عوام سوویٹ یونین کے اندر اور خاص طور سے وسط ایشیا کے ملکوں میں جو شعرو ادب پیدا ہوا اس میں ایک قسم کا تذبذب تھا،

اولیٰ اور عوام غیر قطعی تھی۔ ہر چند اس سے پہلے زمانے میں روسی عوام ایسے ادب کی بھی آرزو کرنے کے مجاز نہ تھے، پُرانے زمانہ میں وہ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ انھیں ادب کی ضرورت ہے، ادب ان کے لئے پیدا ہونا چاہئے

تعلیم عام ہونے کے ساتھ اخباروں کی کثرت سوویٹ کلچر کی ترقی کی پہلی پیڑھی تھی، عوامی کلچر کی تیز ترقی کا دوسرا بڑا سبب اور ذریعہ تھیٹر بنا اور جتنی خدمت مستقل تھیٹر ٹول نے کی اتنی ہی شوقیہ ڈراما کرنے والی ٹولیں نے بھی کی۔ رسول دارا بھی پوری طرح ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ شوقیہ ڈرامہ کرنے والوں کی نالک منڈیاں دور افتادہ علاقوں میں پہنچنے لگ گئیں۔ شروع شروع میں یہ نالک منڈیاں اخباروں میں چھپنے والے مضامین کو عالی شان عمارتیں کھڑی ہو گئی ہیں۔ دیہاتی میلوں میں نالک کے کھیل پہلے سے بھی مقبول تھے۔ لیکن انقلاب سے پہلے ان نالکوں کی نوعیت مذہبی ہوتی تھی وسط ایشیا کے عوام ایسے مذہبی نالکوں کو ”ذکر“ کہتے تھے، اور شہابی تعقاؤں والے ”شہابی“ یہ ذکر یا شہابی مذہبی روایتوں سے اخذ کئے جاتے تھے۔ ہمارے یہاں

کی درپس ان نالکوں سے ملتی جلتی چیز ہے۔ تیز کلچری ترقی کا تیسرا بڑا ذریعہ کھیل کود تھے۔ وسط ایشیا میں جتنے عوامی کھیل کھیلے جاتے تھے، سوویٹ کلچر کے مبالغوں نے ان کھیلوں سے بھی کام لیا اور کچھ اصلاح کر کے ان میں ناچ گانے کا اضافہ کر کے بہت دلچسپ و مفید بنا دیا۔ خیوا کے بازاروں اور تاش حوض کے دیہاتوں میں جتنے قصبے کہانیاں مقبول عوام تھیں ان سب کو اسکچوں اور ڈراما کی صورت دی گئی جنہیں وہاں پسند کر سکتے تھے۔ بعد میں ہی ڈرامے مستقل تھیٹر کے وجود میں آئے کا سبب بن گئے۔ اکیلے ترکمانیہ کے اندر دس تھیٹر کمپنیوں کی ابتدا اسی طرح ہوئی تھی۔ تاشقند کا عمرہ تھیٹر جو ایک بلند پایہ شاعر ڈراما

نگار کے نام پر بنا ہے اور سوویٹ یونین کے نہایت مقدّر تھیٹر ٹول میں سے ایک ہے، اس تھیٹر کی ابتدا بھی ایک نالک منڈلی سے ہوئی جس کا لیڈر حمزہ مکیم زادہ تھا یہ واقعہ ہے کہ ان منڈلیوں نے بہت سے امور ڈرامہ نگار اور ایکٹر پیدا کئے۔ ایسے فن کاروں میں حمزہ کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ حمزہ ایک ازبک ڈراما نویس

شاعر اور موسیقار تھا۔ اس کے ادبی اور صناعتی کارنامے سوویٹ ادب کے کلاسک میں گنے جاتے ہیں۔ حمزہ پہلا غیر روسی فنکار تھا جسے یہ بلند مرتبہ حاصل ہوا۔ اس کی تصانیف بہت ہیں اور سب مقبول ہوئیں، مگر بے اور دمقان، اور دوطوفان، کو سب سے زیادہ مقبولیت ملی۔ اس کے ڈرامے آج بھی کھیلے جا رہے ہیں۔ وہ اگر قبل انقلاب کا اہل قلم تھا مگر اس کے خیالات ہمیشہ ترقی پسندانہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شروع ہی سے عوام میں مقبول تھا۔ جہت پسند جماعت نے

حمزہ کو قتل کر دیا۔

(باقی)

انسان و انسان علی

(برنارڈشا کے ڈرامہ کا ایک حصہ)

(بہ سلسلہ اسبق)

فرزان — آج بہت خوش طبع نظر آتے ہو تم — آخر معاملہ کیا ہے ؟
 مجسمہ — میں نے ایک زبردست فیصلہ اور ایک انقلابی قدم کیا ہے میرے دوست ! — مگر پہلے یہ بتاؤ کہ ہمارا دوست ایلین کہاں ہے۔ اس معاملہ میں مجھے اس سے مشورہ لینا ضروری ہے۔ اور بلاشبہ سارا بھی تو اس سے متعارف ہونا چاہتی ہو گی
 سارہ — تم میرے واسطے عذاب و عقوبت کی تیاریاں کر رہے ہو
 فرزان — یہ سب تو تم پرستی ہے سارہ ! — یقین کرو — یاد رکھو ایلین اس قدر ”سیاہ خام“ نہیں جتنا کہ دکھایا جاتا ہے
 مجسمہ — آؤ اُسے آواز دیں

(مجسمہ کے ہاتھ کی ایک حرکت پر موسیقی کی بلند آوازیں پھر لہرانے لگتی ہیں..... روشنی کا ایک سرخ حلقہ چمکنے لگتا ہے اور اس کے اندر سے ایلین نمودار ہوتا ہے۔ وہ سن رسیدہ معلوم ہوتا ہے اور اس کا سر قبل از وقت بالوں سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ ایک خفیف سی ٹیک ٹیکتی دوست پروری اور مہربانی کی جھلک کے باوجود اس کی فطرت کچھ ایسی ہے کہ اگر اس کے اقدامات کا مطالعہ کن جواب نہ دیا جائے تو وہ برہم ہو جاتا ہے۔ اُس کو دیکھ کر اس کی خند و شفقت یا تحمل و دروہاری کی قوتوں پر کچھ زیادہ اعتماد پیدا نہیں ہوتا اور وہ مجموعی طور پر ایک ناگوار حد تک خود غرض ہستی نظر آتا ہے۔ لیکن وہ چالاک ہے اور چرب زبان۔ ان دو مردوں کی بہ نسبت اُسے اچھی تربیت کم ملی ہے اور اس عہد کے مقابلہ میں اس کے اندر زندگی کی قوتیں حد سے زیادہ کم ہیں)

ایلین — (خلوص کے ساتھ مجسمہ سے مخاطب ہو کر) کیا مجھے آج پھر اس عالی مرتبہ شخصیت کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے ؟ — (فرزان سے سر دھری کے ساتھ) اپنے خادم کا سلام لو فرزان — (سارہ سے ہندب انداز میں) اجنبی خاتون ؟ — آداب عرض !

سارہ — کیا تم.....

ایلین — (سر دھری ہو کر) جی ہاں — ایلین — آپ کا خادم !

سارہ — میں پاگل ہو جاؤں گی

ایلین — (جری لچریں) پریشان ہونے کی ضرورت نہیں محترمہ — آپ کو کدھض سے ہمارے پاس آئی ہیں۔ وہ دنیا مذہب کے نام لینے والوں اور مذہبی پیشواؤں کی غلام ہے۔ آپ ابھی تک اسی دنیا کی مصیبت اور خون و دہشت میں مبتلا ہیں۔ آپ نے وہاں لوگوں کو میری خدمت کرتے سنا ہے لیکن یقین کیجئے کہ اس کے باوجود وہاں میرے دوست گروہ درگروہ موجود ہیں

سارہ — ہاں — تم اُن کے دلوں پر حکومت کرتے ہو

ایلین — یہ آپ کا حسن ظن ہے محترمہ — لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ غلطی پر ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ دنیا کا کام میرے بغیر نہیں چل سکتا لیکن دنیا اس پر

فرزان — (سر و نفرت سے) تمہارے الفاظ بالکل ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی نیم دروازہ عورت کسی مغنی کی چالوس کمرہ ہی ہو۔
 ابلیس — تمہاری باتیں مجھے برہم نہیں کر سکتیں۔ مجھے تو تمہاری حالت پر ایک حقارت آمیز افسوس ہوتا ہے۔ تمہارے پاس روح باقی نہیں اور پھر جن چیزوں سے تمہارا دامن خالی ہوتا جاتا ہے ان کا وقوف و شعور تمہیں نہیں — (مجھ سے مخاطب ہو کر) تم ایک فطری و پیدائشی مغنی ہو۔ کیسا اچھا گاتے ہو تم! — موزارت اگر یہاں رہتا تو تمہیں سنگ مرور ہوتا۔ لیکن یہاں وہ گھبرا گیا اور جنت میں چلا گیا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ بعض خاصے سمجھدار لوگ جن کے متعلق خیال کیا جاسکتا تھا کہ یہاں ہر دلعزیز میلے کے انجام کار یہاں ہماری سوسائٹی میں ناکام انسان ثابت ہوئے۔ فرزان کی طرح

فرزان — سوسائٹی میں ایک ناکام انسان ثابت ہونے پر مجھے درحقیقت بہت افسوس ہے
ابلیس — یہ بات نہیں کہ ہم تمہاری ذکاوت و ذہانت کے مداح نہیں۔ ہم اس کے معترف ہیں لیکن میں اس مسئلہ کو تمہارے نقطہ نظر سے دیکھ رہا تھا۔ یہ جگہ تمہیں موافق نہیں آئی۔ درحقیقت ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ تمہارے پاس دل نہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اپنی تمام قنوطیت اور نفرت کیشی کے پیچھے تم ایک محبت بھرادل رکھتے ہو۔۔۔۔۔
فرزان — (کاپٹے ہوئے) رہنے دو۔ بس کرو

ابلیس — (برہمی سے) بہتر — لیکن واقعہ یہ ہے کہ تم میں کیف و مسرت کی اہلیت ہی نہیں — ٹھیک ہے نا؟
فرزان — یہ الفاظ بھی منافقت سے خالی نہیں لیکن پہلے سے کچھ کم نا قابل برداشت — بہر حال اگر تم اجازت دو تو میں حسب معمول گوشہ
تنہائی میں پناہ لینا چاہتا ہوں

ابلیس — تم گوشہٴ جنت میں کیوں پناہ نہیں لیتے؟ — وہ جگہ تمہارے لئے موزوں ہے۔ (سارہ سے) کیا آپ بھی اسے یہ ترغیب نہیں دیتیں کہ اپنی بہبودی کی خاطر ذرا آب و ہوا تبدیل کرے؟

سارہ — لیکن اگر وہ جنت میں جانا چاہے تو کیا ایسا ممکن ہے؟

ابلیس — کیوں نہیں! — روک ہی کون سکتا ہے؟

سارہ — کیا ہر شخص — کیا میں بھی جنت میں جا سکتی ہوں؟

ابلیس — (قدرے منفرد سے) یقیناً — بشرطیکہ آپ کا ذوق اس نوعیت کا ہو

سارہ — پھر ہر شخص جنت میں کیوں نہیں چلا جاتا؟

مجتہمہ — (مسکراتے ہوئے) یہ راز میں بتا سکتا ہوں عزیزو — وہ یہ ہے کہ جنت تمام کائنات میں سب سے زیادہ سبکھن جگہ ہے۔
 ابلیس — ہمارے کپتان صاحب نے تو بالکل صحت الفاظ میں حقیقت کہہ ڈالی۔ واقعہ یہ ہے کہ جنت کی زندگی بڑی صبر آزما چیز ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ مجھ وہاں سے نکال دیا گیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں قیام کرنے پر کوئی چیز مجھے مایل ہی نہیں کر سکتی تھی۔ سیدھی بات یہ ہے کہ میں نے خود ہی جنت کو چھوڑ دیا۔

بجتمہ — مجھے اس میں ذرا بھی تعجب نہیں۔ ایک ادبی فردوسی زندگی کو کوئی برداشت نہیں کر سکتا
 ابلیس — نہیں۔ کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جن کو زندگی موافق آتی ہے۔ ہمیں انصاف کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئے۔ کچنان صاحب —
 یہ معاملہ بالکل اخلاط طبع سے تعلق رکھتا ہے۔ میں فردوسی قسم کے مزاج و ذوق کا قائل نہیں۔ ایسا ذوق میری سمجھ ہی میں نہیں
 آتا۔ لیکن کائنات کی تشکیل و تکمیل کے لئے تو ہر قسم کی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ذوق و طبع کی قسموں کا کوئی شمار نہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں
 جو جنت کو پسند کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے فرزانہ کو یہ پسند ہے

فرزان — لیکن — صاف گئی معاف — اگر تم جنم میں مانا جاتے تو کیا واقعی وہاں واپس جاسکتے تھے ؟ — یا محض انکو کہتے ہیں ؟

ابلیس — واپس اور وہاں! — میں اکثر وہاں جاتا ہوں۔ کیا تم نے کتابوں میں ایسا نہیں پڑھا؟ کیا تمہارے پاس اس بات کی کوئی سند ہے کہ ہمارے خط اور فردوسی طبقے کے درمیان کوئی حد قائل موجود ہے

سارہ — لیکن درمیان میں ایک بڑی خلیج تو ضرور حایل ہے

ابلیس — محترمہ! ایک استعارہ کا مفہوم کبھی حقیقی حیثیت سے لینا چاہئے۔ یہ خلیج دراصل ملوکوتی اور ابلیسی ذوق کے باہمی فرق کی خلیج ہے۔ اس سے زیادہ ناقابلِ عبور خلیج اور کونسی ہو سکتی ہے؟ — آپ نے زمین کی سطح پر جو کچھ دیکھا ہے اس پر غور کیجئے۔ ایک فلسفی کے دارالتعلیم اور بیڑا زردوں کے حلقہ کے درمیان کیا کوئی مادی خلیج حایل ہے؟ — لیکن اس کے باوجود یہ بیڑا زرد کبھی اس دارالتعلیم پر نہیں آتے۔ کیا آپ نے کبھی اس ملک کی سیر کی ہے جہاں میرے سب سے زیادہ متبعین ہیں؟ — یعنی انگلستان؟ — وہاں گھوڑ دوڑ کے وسیع میدان ہیں۔ اور بہت سے سرود خانے بھی ہیں جہاں لوگ ہمارے کپتان صاحب کے دوست موزارت کے تخلیق کردہ نعمات گاتے بجاتے ہیں۔ لوگ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں بھی اور سرود خانوں میں بھی۔ اس معاملہ میں انھیں روکنے والا کوئی قانون نہیں کیونکہ اگر یہ کہتے ہیں کہ وہ کبھی غلام نہیں ہو سکتے۔ وہ ہر کام آزادی سے کر سکتے ہیں جہاں اجازت انھیں حکومت اور رائے عامہ دیتی ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ ایک گھوڑ دوڑ کے میدان کی بہ نسبت ایک معیاری ہرودہ زیادہ بلند۔ زیادہ مہذب۔ زیادہ شاعرانہ۔ زیادہ ذہنی اور زیادہ شریفانہ مقام تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن کیا کبھی ایسا ہوتا ہے گھوڑ دوڑ کے پرستار اپنا شغل چھوڑ کر سرود خانے میں گروہ درگروہ چلے آئیں؟ — نہیں! — انھیں وہاں اسی منجھلا کبیدگی اور کوفت کی اذیت سہنی پڑے گی جو ہمارے دوست کپتان کو جنت میں برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ان دونوں مقامات درمیان استعارہ کی ایک بڑی خلیج حایل ہے۔ اگر محض مادی خلیج ہوتی تو اسے یہ لوگ آسانی سے عبور کر سکتے تھے یا کم از کم اس مادی خلیج پر ان لوگوں کے واسطے ایک پل تعمیر کیا جاسکتا تھا، لیکن ناپسندیدگی کی خلیج ناقابلِ عبور ہے اور ابدی

سارہ — میں تو اسی وقت جنت میں جاتی ہوں

مجسمہ — میری بچی! پہلے دو باتیں سن لو۔ میرے دوست ابلیس نے سرود خانے کی جو مثال پیش کی ہے مجھے ذرا سے پورا کرنے دو۔ انگلستان میں ہر سرود خانے کے اندر انھیں ایسے پڑ مردہ تھکے ہوئے لوگوں کی قطاریں نظر آئیں گی جو وہاں اس لئے نہیں آئے کہ انھیں درحقیقہ قدیم معیاری موسیقی مرغوب ہے بلکہ وہاں صرف اس لئے موجود ہیں کہ ان کے خیال میں یہ موسیقی ان کو مرغوب ہونا چاہئے۔ بالکل یہی! جنت میں ہے۔ وہاں بہت سے لوگ شان و شوکت سے فروکش ہیں اس لئے نہیں کہ وہ مسرور ہیں بلکہ اس واسطے کہ ان کے خیال میں بلند مرتبہ کا بھی تقاضہ ہے کہ وہ جنت میں رہیں۔ ایسے لوگ تقریباً سب کے سب انگریز ہیں

ابلیس — ہاں۔ جنوبی مالک کے لوگ تمہاری طرح جنت کو چھوڑ کر یہاں میرے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز جب انتہائی مصیبت میں ہوتا ہے تو اسے اپنی حالت کا علم ہی نہیں ہوتا۔ اگر ایک انگریز کو اپنی راحت میں خفیت سا غفل محسوس ہوتا ہے تو سمجھتا ہے کہ نیکی کے راستہ پر ہے

مجسمہ — مختصر یہ کہ اگر تم جنت کے فطری استحقاق اور طبعی موزونیت کے بغیر وہاں جاؤ گی تو وہاں تمہیں مسرت حاصل نہ ہو گی

سارہ — اور کیا کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ میں اس کے لئے فطری استحقاق و طبعی موزونیت نہیں کہتی؟ — میرے اس حق پر کلیسا کے بڑے بڑے پیشواؤں نے بھی کبھی کوئی شک و شبہ نہیں کیا۔ میرا یہ فرض ہے کہ اس مقام سے فوراً چلی جاؤں

ابلیس — یہی ہے! آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ لیکن مجھے آپ سے بہتر ذوق کی توقع تھی

سارہ — آہ! — مجھے توقع ہے کہ میرے ساتھ تم بھی چلو گے۔ یہاں نہیں ٹھہر سکتے تم۔ لوگ کیا کہیں گے؟

مجسمہ — لوگ! — واہ۔ بہترین لوگ تو اس جگہ موجود ہیں۔ کلیسا کے پیشوا اور سب۔ جنت میں اس قدر کم لوگ جاتے ہیں اور یہاں

یاد رکھو کہ "مردی" یا "انسانی" اب ایک ذوالرہ و برہانیت ہوتا جاتی ہے۔ کمر قیام کے ذریعہ بڑا دل، ذہنی پیشہ، آجکل کے ذہنی پیشہ انسان ہیں۔
 ابلیس — ایک شخص جس کے لیے یہ علم تھا کہ میرے خلقت تحت و حکمت کو جو ہنگامہ برپا ہے، اس میں انجام کار دے گا۔ کی بدولت بھی اگر کچھ د
 کارائی نصیب ہوگی۔ اپنے غیر خلقت کے لحاظ سے کائنات ایک باضابطہ جہدِ حیات ہے۔ اور اتنی بڑی اکثریت کو اپنا جمنو اینا کرنے کے لئے
 یہ نا ممکن ہے کہ مجھے میرے واجبِ جہد سے معزول رکھا جائے

فرزان — میرے خیال میں بہتر یہ ہے سارہ کہ تم اسی جگہ قیام کرو
 سارہ — (ریشک و حسد سے) تم نہیں چاہتے کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں
 فرزان — یہی نہ تم مجھ جیسے اوہاں کے ساتھ جنت میں رہنا پسند نہ کرو گی
 سارہ — رو میں سب یکساں ہیں۔ پھر تم تو تو یہ بھی کر چکے ہو؟
 فرزان — عزیز سارہ! تم بے وقوف ہو۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ جنت بھی کمرہ اعلیٰ کی طرح ہے جہاں لوگ اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ "کمرہ" انھیں
 قیہ و استغفار کے ذریعہ "کمرہ" بنائے جاسکتے ہیں۔ "گفتہ" کو معذت کے ذریعہ سے "ناگفتہ" میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اور
 "حقیقت" کو تشفقہ طور پر "جوہر" قرار دیکر مٹایا جاسکتا ہے؟؟ — نہیں! — جنت ایک مسکن ہے حقیقت کے آقاؤں کا۔ اور

اسی لئے میں وہاں جا رہا ہوں

سارہ — اس نصیحت کا شکریہ! — لیکن میں تو مسرت کے حصول کے لئے جنت میں جا رہی ہوں۔ "حقیقت" کو تو میں کمرہ ارض پر کافی بھگت چکی ہوں
 فرزان — یہ بات ہے تو تمہیں یہیں قیام کرنا چاہئے کیونکہ جہنم مسکن ہے "عدم حقیقت" کا اور مسرت کے کلاخیوں کا۔ جنت اور کمرہ ارض دونوں سے
 پناہ حاصل کرنے کی جگہ یہی ہے، کیونکہ عیسای میں پہلے کچا ہوں جنت حقیقت کے آقاؤں کا مسکن ہے اور کمرہ ارض حقیقت کے غلاموں کا
 زمین کی دنیا بچوں کی لپک پرورش گاہ ہے جہاں مرد اور عورت ہیرو اور ہیروئن یا اولیاء و ناجر سب طرہ ایک کھیل کھیلتے ہیں۔ لیکن اُن کی
 اس خیالی دنیا سے جو "فردوسِ عرفاء" سے تعبیر کی جاسکتی ہے اُن کے جسم اُن کو گھسیٹ کر جنت میں ڈھکیل دیتے ہیں — بھوک اور پیاس
 سردی و گرمی، بھولت و انمطاط، مرض و تکلیف — اور پھر سب کے بعد موت اُن کو حقیقت کا غلام بنا دیتی ہے۔ ہر روز تین چار بار
 کھانا کھاؤ اور جہنم کا ضروری ہے۔ ہر صدی میں تین بار ایک جدید نسل پیدا کرنا لازم ہے۔ مذہب و عقیدت، روان و رنگینی — اور
 سائنس کے تمام طویل زمانے سمیت کربور اصرور اس دُعا میں جذب ہو جاتے ہیں کہ "اے مہود! مجھے ایک تندرت حیوان بنا دے۔"
 لیکن یہاں ہم گوشت و پوست کے اس ظلم و تشدد سے محفوظ ہیں کیونکہ یہاں آگرم کسی طرح بھی حیوان نہیں رہتے۔ یہاں تم ایک روح ہو
 ایک غیر انسانی مظہر۔ ایک تصور۔ ایک رسم۔ لافانی۔ لافانی۔ لافانی۔ اور مختصر آدک "لاجیم" — یہاں نہ سماجی مسائل ہیں۔ نہ
 سیاسی مسائل۔ نہ مذہبی مسائل۔ اور شاید سب سے زیادہ مسرور کن بات یہ ہے کہ یہاں "مسائلِ صحت" کا بھی کوئی وجود نہیں۔
 یہاں ظاہری شکل و صورت کو ختم کیا جاتا ہے۔ جذبات کو محبت۔ احساسات کو زندگی۔ وجدان کو شہادت۔ حوصلوں کو شہاد۔
 بالکل اسی طرح جیسے زمین کی دنیا میں کہا جاتا تھا۔ مگر فرق یہ ہے کہ یہاں تمہاری تردید و مخالفت کرنے والے ٹھوس حقائق موجود نہیں۔
 تمہاری ظاہر و باطن اور حقیقی ضروریات کے درمیان کوئی ستم ظریفانہ تضاد نہیں۔ کوئی طریقہ انسانی سوانح نہیں۔ کچھ بھی نہیں
 صرف ایک ایسی روحانی ایک ہمگیر جذباتی ڈرامہ — جیسا کہ تمہارے ایک چین شاعر نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے "یہاں شاعرانہ و طانی
 عین محض ہے۔" اور لپک "ادبی ناسایت" کہیں پیشہ بندیوں کی طرف آگے۔ اور آگے۔ گھنچتی چلی جاتی ہے۔ کچھ اس طرح کی
 قدم بھی آگے نہیں بڑھتے۔ کیا تم ان تمام باتوں کے باوجود اس مقام کو چھوڑنا چاہتی ہو؟

سارہ — لیکن اگر جہنم واقعی اس قدر حسین ہے تو جنت کائنات اس سے زیادہ شاندار نہ ہوگی!

(انہیں جہنم اور فرزان سب کے سب ایک ساتھ سمجھا کرتے ہیں۔ کیونکہ فرزانہ وہ ہے کہ خاموش ہو جاتے ہیں)

فرزان — معافی چاہتا ہوں

ابلیس — نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ تمہاری گفتگو میں دخل تو میں نے دیا تھا

مجسمہ — تم کچھ کہنے والے تھے

فرزان — آپ سب اصحاب کے بعد

ابلیس — (فرزان سے) تم نے میری مملکت جہنم کے اوصاف پر اس قدر فصیح و دلیکش گفتگو کی ہے کہ میں اس دوسری آبادی یعنی جنت کے تفصیل

پر بھی ایسی ہی غیر جانبدارانہ روشنی ڈالنے کا کام تمہارے ہی سپرد کرتا ہوں

فرزان — میری قبلی تصویر کے مطابق جنت ایک ایسا مقام ہے جہاں ہمیں کھیلنے اور نائیش کے سوا کچھ بھرنے کے بجائے زندہ رہنا اور کام کرنا

ہوتا ہے۔ وہاں ہم اشیاء کی صورت کو نہیں بلکہ اصلیت کو دیکھتے ہیں۔ وہاں ظاہری شان و شوکت اور چمک دمک کے علاوہ کوئی اور

چیز نظر انداز نہیں کی جاتی۔ اور وہاں استقلال اور خطر پسندی ہی میں ہماری خلعت و شوکت مضمر ہے۔ آخر یہاں جہنم میں اور طرح ارض

پر ڈرائے کھیلے جاتے ہیں اور تمام دنیا کو ایک ایسی طرح قرار دیا جاتا ہے تو جنت کی بابت ہم کم از کم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک منظر ہے جس پر وہ

لیکن جنت کی کیفیت استعارہ کی مدد سے بیان نہیں کی جاسکتی۔ میں ابھی کچھ دیر بعد وہاں چلا جاؤں گا کیونکہ مجھے امید ہے کہ وہاں

پہنچنے میں مسرت کے ذیل مضحکہ کن فربہ و دروغ سے محفوظ ہو جاؤں گا اور اپنی ابدیت کو غور و فکر کے مشغلہ میں صرف کر سکوں گا

مجسمہ — تو !

فرزان — کتنا صاحب ! میں تمہاری نفرت کو مجرم نہیں سمجھتا۔ ایک اندھے آدمی کے واسطے نگار خانہ ایک بے کیف جگہ ہے جس طرح تم

حسن و مسرت جیسے سراپوں کے تصور سے لذت گیر ہوتے ہو اسی طرح میں بھی اس کے فکر و خیال سے کسب کیف کروں گا جو مجھے تمام

چیزوں سے زیادہ دلکش و دلچسپ محسوس ہوتا ہے۔ یعنی ”زندگی“۔ وہ قوت جو خود اپنی حقیقت پر غور و فکر کرنے کے لئے

بے پناہ بلند تر ذہنی و فکری قدرت کے حصول کی جدوجہد کرتی رہتی ہے۔ تمہارے خیال میں میرے اس دماغ کو کس لئے بنایا گیا ہے؟

کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت کے لئے نہیں بلکہ جو کچھ میں کرتا ہوں اسے جانتے سمجھنے کے واسطے۔ تاکہ میں ایسا نہ ہو میں زندہ رہنے کی

اندھی کوششوں میں خود کو ہلاک کر دوں

مجسمہ — اگر صرف میرا پاؤں دھسلا تو تم شمشیر زنی کی اندھی کوشش میں خود کو کبھی کا ہلاک کر چکے ہوتے میرے دوست !

فرزان — گستاخ مسخرے ! صبح سے پیشتر ہی تیری منسی ایک دہشت ناک کوفت میں تبدیل ہو جائے گی

مجسمہ — ۱۱۱ — کیا تم بھول گئے کہ جب یہی الفاظ میں تمہیں دنیا میں اپنی سنگین چوکی پر کھڑا ہو کر سنا تھا تو تم کس درجہ خائف ہو جاتے تھے؟

یہ الفاظ میرے سانس سے جڑا ہو کر کچھ بے معنی محسوس ہوتے ہیں

فرزان — لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ نغمہ ساز کے ساتھ ہمیشہ ناگوار معلوم ہوتا ہے

سارہ — اُن ؟ — ان امور مزاحیہ باتوں سے گفتگو میں غفلت نہ ڈالو۔ ہاں فرزان یہ بتاؤ کہ کیا جنت میں فکر و غور کے علاوہ اور کچھ نہیں ؟

فرزان — مجھے اس کے علاوہ جنت میں اور کسی مسرت کی تلاش نہیں۔ لیکن وہاں ایک اہم کام بھی ہے اور وہ یہ کہ ”زندگی“ کو اس حد تک

میں اوراد و بکائے۔ ذرا غور کرو کہ ”زندگی“ اپنی لامعلیٰ اور بے صبری کے عالم میں کس کس طرح خود کو ضائع کرتی رہتی ہے کس قدر ذہن

خود اپنی راہ میں پیدا کر لیتی ہے اور خدا اپنے وجود کو ہلاک کر دیتا ہے۔ زندگی کی یہ بے پناہ قوت تھکنے ہے ایک دلعزگی کی ناک لامعلیٰ کہ

میں یہ خود اپنی رفتار کی مزاحمت نہ کرنے لگے۔ شاعر کہتے ہیں ”انسانی کس قدر زبردست شاہکار ہے“۔ جیسا کہ ! مگر اس قدر

کار بھی ہے وہ !۔ انسان زندگی کی قوتوں کا وہ اعلیٰ اور اعجاز انگیز نظام ہے جسے زندگی آج تک حاصل کر سکی ہے۔ زمرہ چیز

میں سب سے زیادہ شدید طور پر زندہ۔ ذی حیات نظم اجسام میں سب سے زیادہ صاحب وقوت و شعور۔ لیکن یہی تمام خالق

کے باوجود جس قدر ناکارہ و بے طاقت ہے اس کا داغ !!۔ اس کی حماقت کو ان حقایق نے نیکند و برجم بنا دیا ہے جو اس نے سخت و افلاس میں بے محاب دیکھے ہیں۔ اس کی قوت تخیل نے عزم کر لیا ہے کہ ان حقایق کا مقابلہ کرنے کے بجائے وہ بھوکوں مر جائے گا اور اگر نہ لگے۔ ان کو اپنی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے سراب در سراب پیدا کرتی چلی جائے گی۔ اور اس طرح خود کو ایک "اعلیٰ ذکاوت" کو کر پکارے گی!۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ "حماقت" اور "قوت تخیل" اپنے اپنے عیوب سے ایک دوسرے کو مستہم کرتی ہیں۔ "حماقت" کہتی ہے کہ "تخیل حماقت ہے اور "تخیل" کا دعویٰ ہے کہ "حماقت" جہل ہے۔ حالانکہ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ "حماقت" تمام علم پر قابض ہو گئی ہے اور "تخیل" تمام ذہانت پر۔

المبیس — اور اس طرح ان دونوں نے ملکر ایک عجیب مضحکہ خیز صورت حالات پیدا کر دی ہے۔ جب میں فاسٹ کے اُس "خصوصی معاملہ" کے بند و بست میں مصروف تھا تو کہا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ انسان کی عقل و خرد نے اگر اب تک اس کے لئے کچھ کیا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کچھ وحشی و زردلوں سے زیادہ وحشی بنا دیا ہے۔ ایک شاندار محنت مند جسم ایک سو بیار و منفرد فلسفیوں کے داغوں کے برابر ہے۔ یہ امر تم فراموش کر رہے ہو کہ بے دماغ جسمانی شان و شوکت کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔ ایسے بہت سے حیوانات جو دماغ کے علاوہ باقی ہر لحاظ سے انسان سے بے انتہا بڑے تھے عالم وجود میں آئے اور فنا ہو گئے۔ زمین پر اس قسم کے بہت حیوانات رہ چکے ہیں جن کا ایک قدم پس میل کا ہوتا تھا جن کے بادل جیسے پردوں سے دن کی روشنی غائب ہو جاتی تھی۔ لیکن آج وہ سب کہاں ہیں؟ — عجائب خانوں میں ان کے چند آثار باقی رہ گئے ہیں اور وہ بھی اس قدر کماب و ناکمل کہ ان کی ایک چھوٹی سی بڑی یا ایک دانت کی قیمت ایک ہزار سپاہیوں کی زندگی سے بھی زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ حیوانات زندہ تھے اور زندہ رہنا چاہتے تھے لیکن دماغ سے محروم ہونے کے باعث وہ زہیمہ بن گئے، مقصد کی تکمیل کیسے کریں اور اس لئے خود کو تباہ کر دیا۔

المبیس — اور کیا انسان اپنے دماغی پنوار کے باوجود خود کو کچھ کم تباہ کر رہا ہے؟ کیا تم نے حال ہی میں زمین کے نشیب و فراز میں گشت لگایا ہے؟ — میں نے ایسا کیا ہے اور انسان کی تمام حیرتناک ایجادات کا معائنہ کر چکا ہوں۔ اس لئے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ زندگی کے سلسلہ میں انسان کچھ بھی ایجاد نہیں کرتا البتہ موت کے طریقے اختراع کرنے میں وہ خود فطرت سے آگے بڑھ جاتا ہے اور اپنے کیمیاوی علوم اور مشینوں کے ذریعہ ایسا قتل عام کر ڈالتا ہے جو ہلک و پامال اور تھما تھما طور پر بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے آج دنیا میں جو کسان ملتے ہیں وہ آج بھی بالکل وہی کھانا پیتا ہے جس سے ہزار سال خیر کے انسان کھاتے پیتے تھے۔ جس مکان میں وہ رہتا ہے وہ ایک ہزار صدیوں میں بھی اتنا نہیں بدلا جتنا کہ ایک بلند مرتبہ خالقوں کے لباس کی وضع دس بارہ ہفتوں میں بدل سکتی ہے۔ لیکن جب بھی انسان قتل و غارت کے لئے اٹھتا ہے تو اپنے آباؤ اجداد کے قدم نیزہ و تیرا و تبر و کمان کو اپنے بہت پیچھے چھوڑ کر ایک ایسی مشین اپنے ہاتھوں میں سمجھالیتا ہے جو اس کی آنکھوں کے صرف ایک اشارہ پر تمام عنصری قوتوں کی ہلک و پھول شروع کر دیتی ہے۔ فنون امن سے انسان قطعی ناواقف ہے۔ میں نے اس کے سوئی کارخانے وغیرہ دیکھے ہیں۔ ان کی مشینیں ایسی ہیں کہ اگر ایک کے کو غذا کے بجائے دھیرے کی بھوک ہوتی تو وہ حیرتیں کتا بھی ان کو ایجاد کر سکتا تھا۔ میں انسان کی بھڑی ٹانگیں کی مشینوں، شور کوڑھالی گاڑیوں اور ٹھکانے والی سائیکلوں سے خوب واقف ہوں۔ ان سب کی حیثیت مشین قوت اور سطح بھوک کے نیچے چلنے والی تار پیر و کشتی کے مقابلہ میں محض ایک کھلونے کی سی ہے۔ انسان کی صنعتی جدوجہد میں اس کی حرص و کاپی کے علاوہ اور کوئی جذبہ کارفرم نہیں۔ اس کا دل تو اس طرح ہے۔ "زندگی" کی حیرتناک قوت جس پر تم کو اس حد پر خود و تازہ دراصل "موت" کی قوت ہے۔ انسان اپنے حقائق کو تباہ کاری کے پیمانے سے لاپتا ہے۔ اس کا مذہب کیا ہے؟ — مجھے اس فطرت کرنے کا ایک عذر مل گیا!۔ اس کا عقائد کیا ہے؟ — تمہیں تہذیب و تمدن کا ایک بہانہ! — اس کا اخلاق کیا ہے؟ — جھوٹی ہنزیب! — پیرا کرنے کی محنت کے بغیر کھانے کا ایک بہانہ! — اس کا فن مصوری کیا ہے؟ — قتل و غارت گری کی تصاویر پر خوبصورت نظریں

فن ڈراما نویسی

(ہر سلسلہ، اسبق)

کردار نگاری اب ہم ڈراما کے ایک اور اہم جزو کردار نگاری کا مطالعہ کریں گے۔ کیونکہ کردار نگاری ہی سے ایک ڈراما نویس اپنے ڈراما کو زندہ جاوید بنا سکتا ہے۔ اور کردار نگاری ہی کے ذریعہ ڈراما کی افادی جالیاتی اور فنکارانہ قدروں کا تعین کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلی چیز کردار نگاری میں یہ پیش نظر ہوتی ہے کہ ڈراما کے کردار کیا عام انسانوں سے مشابہ نہیں یا فوق البشر ہیں جن کا ہم نے پہلی روزانہ اور عام زندگی میں کبھی مطالعہ نہیں کیا۔ ایسی ہستیاں جن سے کبھی ہمارا واسطہ اور تعلق نہ رہا ہو ہماری توجہ کو کبھی اپنی جانب منسلک نہیں کر سکتیں بلکہ اکثر ہمیں اکتا دینے والی ہوتے ہیں اس لئے ڈراما نویس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ڈرامہ کے کرداروں کے انتخاب میں ایسے لوگوں کو رکھے جو عام انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈراما کے کرداروں کو ایسی جگہ سے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں جو ہمارے تجربات اور مشاہدات سے بالاتر ہوں۔ یہاں ایک چیز ہمیں ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ڈراما کی کردار نگاری اور ناول کی کردار نگاری میں فرق ہے۔ ناول نگار کو کردار نگاری میں جو آسانیاں حاصل ہیں وہ ڈراما نویس کو نہیں۔ ناول نگار اپنے کرداروں کو براہ راست پیش کرتا ہے۔ ان کے اوپر اپنی رائے دے سکتا ہے اور ان کے جذبات و احساسات کو بیان کر سکتا ہے لیکن ڈراما نویس ایسا نہیں کر سکتا۔ تو وہ اپنے کرداروں پر کوئی رائے دے سکتا ہے اور نہ اپنے طور پر ناظر یا قاری کو ان کے متعلق کسی قسم کی معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ اس لئے عام طور پر کسی ناول کے کرداروں کے مقابلہ میں ڈراما کے کردار زیادہ کامیاب اور زندہ جاوید ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں نفسیات کا مطالعہ ادب کا ایک اہم جزو بن گیا ہے جو ناول نگار اور ڈراما نویس کے امتحان کی کسوٹی ہے۔ اس کسوٹی پر ناول نگار تو آسانی اور کامیابی سے گزر جاتا ہے مگر جس نے ڈراما نویس کے لئے یہ وقتیں پیدا کر دی ہیں کہ وہ کس طرح ایک محدود دائرہ میں رہ کر ان حالات اور جذبات کو ظاہر کر سکتا ہے۔ پھر انسانی جذبات اس قدر پیچیدہ ہیں کہ ان کو فی الحال کسی سائنس کی مدد سے نہیں پرکھا جاسکتا۔ کیونکہ ایک ہی واقعہ کے اثرات مختلف لوگوں پر مختلف ہوتے ہیں اس سے ڈراما نویس کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈراما نویس اس امتحان سے کامیابی کے ساتھ نہیں گزر سکتا۔ مگر ابھی ڈراما نویس کے ہاتھ میں پلاٹ اور پلاٹ میں متوازنیت اور تعادل کا بڑا ہتھیار ہوتا ہے جس سے ایک واقعہ کے مختلف اثرات اور ان کے مختلف رد عمل کو ظاہر کیا جاسکتا ہے اور مختلف کرداروں کی نفسیات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ ڈراما نویس نے فطرت انسان کا گہرا مطالعہ کیا ہو۔

وہ ان کے محرکات کو سمجھتا ہو جن سے انسانی جذبات حرکت پذیر ہوتے ہیں

جیسا کہ پلاٹ کی بحث میں ہم نے بتایا تھا کہ ڈراما کے لئے اختصار بہت ضروری ہے یہی اختصار کردار نگاری میں بھی لازمی ہے۔ ایک ناول نگار تو جس قدر چاہے اپنے کرداروں کو پھیلا سکتا ہے مگر ڈراما نویس ایسا نہیں کر سکتا اور اختصار کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کو قدم قدم پر اختصار سے کام لینا پڑتا ہے ایک محدود دائرہ میں وہ اپنے کرداروں کی اندرونی و بیرونی کشش کا اظہار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے سامنے کہانی کو آگے بڑھانے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اس لئے ڈراما نویس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اختصار کا دامن نہ چھوڑے اور ممکن طریقے سے اختصار سے کام لے لیں ڈراما نویس یہ سوچتے ہیں کہ وہ اپنے ڈرامے کو جس قدر پھیلا دیں گے اسی قدر ان کے کردار نمایاں ہوں گے اور اس طرح مرکزی خیال کو بھی سمجھیں۔ اس آسانی ہوگی غلط ہے۔ کسی کردار اور پلاٹ کی بڑائی اس کے اختصار میں ہے نہ کہ اس کی طوالت میں۔

کردار نگاری میں اس کی بھی ضرورت ہے کہ ڈراما نویس اپنی توجہ اس خاص نکتہ اور کردار کی اس خاص خصوصیت پر مرکوز کر دے۔ جس کو وہ خصوصیت کے ساتھ نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ اس سے اختصار کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور وہ ان تمام غیر ضروری تفصیلات سے بچ جائے گا جو اختصار کی راہ میں حائل ہیں پر و فیسر ٹرل مین لکھتے ہیں کہ ”ڈرامہ میں میرو یا کسی خاص کردار کی اس خصوصیت کو نمایاں کرنا لازم ہے جو کہانی کے بہاؤ میں مدد دے، لیکن کسی کردار کو نمایاں کرنے کے لئے ایسے واقعات داخل نہیں کرنا چاہئے جو کردار کی شخصیت سے علیحدہ ہیں، جو ڈرامہ پر براہ راست کسی پہلو سے اثر نہیں ڈالتے اور نہ کہانی جس مرکزی خیال پر گردش کر رہی ہے اس سے ان کا واسطہ اور تعلق ہے۔ اگر اس طرح کردار نگاری میں غیر ضروری خصوصیات کو اجاگر کیا گیا تو اس کو کم نا واجب کردار نگاری کہیں گے۔“

ڈراما میں اس کے علاوہ ایک اہم چیز یہ بھی ہے کہ ڈراما نویس خود کو ڈراما کی شخصیتوں سے قطعی علیحدہ رکھے۔ یہی چیز ڈراما اور ناول کی کردار نگاری میں فرق پیدا کرتی ہے۔ ناول نگار خود کرداروں سے بے تعلق نہیں کر سکتا۔ وہ ان کے احساسات و جذبات پر رائے دیتا ہے اور ان کی اندرونی کشش اور پوشیدہ محرکات کو بیان کرتا ہے ان کی اچھی اور بری خصوصیات پر اظہار خیال کرتا ہے گھر ڈراما نویس صرف ایک ناظر ہوتا ہے جو دور کھڑے ہو کر ان کا مطالعہ کرتا ہے اور کیمرا کی طرح ہر اس چیز کو جو اس کے سامنے آتی ہے دوسروں پر ظاہر کر دیتا ہے اور خود بے تعلق رہتا ہے۔ اس سے ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ ڈراما نویس اپنے خیالات اور نظریات کو ڈراما کے ذریعہ پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ ہر ڈرامہ میں مصنف کے نظریات اور رجحانات اکثر گوشوں سے جھانکتے نظر آتے ہیں۔ ڈراما نویس کی کرداروں سے بے تعلق کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ غایت اور مرکزی خیال سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے خیالات اور نظریات ڈراما ہی کے کرداروں کے ذریعہ سے ظاہر کرتا ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کسی پلاٹ کے لئے کردار پیدا کئے جاتے ہیں، غلط ہے بلکہ کرداروں کی کشش، ان کے اندرونی جذبات اور بیرونی ماحول سے پلاٹ خود بخود وجود میں آ جاتا ہے۔ یہ پلاٹ نہیں ہوتا جو کرداروں کے احساسات و جذبات کا رخ بدل دیتا ہے بلکہ یہ کردار ہوتے ہیں جو پلاٹ کا رخ بدل دیتے ہیں۔ تھیکر نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ”میں اپنے کرداروں کو کنٹرول نہیں کر سکتا میں ان کے ہاتھ میں ہوتا ہوں اور وہ جہاں چاہتے ہیں مجھے لے جاتے ہیں۔“ اس سے ظاہر ہے کہ پلاٹ اور کرداروں کے تعلق میں پلاٹ کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ کرداروں کی ہے۔

مکالمے ڈراما نویس ہر کردار کو مکالموں کے ذریعہ سے پیش کرتا ہے اور انہی کے ذریعہ سے وہ کرداروں کی اندرونی کشش اور بیرونی مشکلات کا اظہار کرتا ہے۔ اس لئے مکالموں میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر وہ لفظ جو کسی کردار کے زبان سے نکلے اس کو کردار کی شخصیت اور فطرت سے ہم آہنگ ہونا چاہئے اور اس کے مکالموں کی بنیاد اسکے خیالات و جذبات پر ہونا چاہئے کیونکہ مکالموں میں ڈراما نویس لغزش بھی کر دار کو اس کے اصل منصب سے ہٹا سکتی ہے، جو مکالمے کسی ڈراما میں بولے جائیں وہ ایسے کھرے ہوئے دانے نہ ہوں جن کے جمع کرنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہو بلکہ ایسے دانے ہوں کہ جب وہ جمع کئے جائیں تو سب ملکر ایک وحدت میں منسلک کئے جاسکیں۔ اس سے اول تو اختصار کا مسئلہ حل ہو جائے گا دوسرے یہ کہ ہر کردار اپنے صحیح روپ میں نظر آنے لگے گا اور مرکزی خیال بھی نمایاں ہوگا۔

ڈراموں میں ہم کو اکثر ایسے کردار بھی ملتے ہیں جو اکثر تنہا کھڑے ہو کر اپنے خیالات کا اظہار بلند آواز سے کرتے ہیں اسے خود کلامی کہتے ہیں چونکہ ڈراما میں ناول کی طرح کسی چیز پر تبصرہ نہیں کیا جاسکتا اس لئے اس شکل کے پیش نظر ڈراما میں خود کلامی کا ذریعہ اختیار کیا گیا ہے، ہر خدیہ یا بات غیر فطری ہے مگر بعض اوقات حالات کے تحت اس کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ وہ بات جو کوئی شخص سوچ رہا ہے، اس کا اظہار ناظرین پر بھی ضروری ہوتا ہے، تاہم جہاں تک ممکن ہو خود کلامی سے استراز کرنا چاہئے۔ مکالموں کا فطری ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور بر محل ہونا بھی ضروری ہے۔ انہی زبان پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ کوئی کردار ایسی زبان استعمال نہ کرے جو بناوٹی اور غیر فطری ہو۔

ڈراما کی اقسام (۱) المیہ (Tragedy) ٹریجڈی ڈراما کی وہ قسم ہے جو سب سے زیادہ سنجیدہ ہوتی ہے جس کا اختتام (۲) طبعیہ (Comedy) ڈراما کی یہ قسم طبعیہ انداز میں اختتام پزیر ہوتی ہے جس میں زندگی کو زیادہ سنجیدہ انداز میں نہیں

کیا جاتا اور میں میں سمجھتے ہوئے ہیں۔

(ج) المٹاک طوبیہ (Tragic Comedy) : یہ المیہ اور طوبیہ ڈراموں کا ایک اتحاد ہوتا ہے جس کا اختتام عام طور پر طوبیہ انداز میں ہوتا ہے۔

(د) تاریخی (Historical or chronicle Play) : ایسے ڈراموں میں اہم اور نمایاں اشخاص کی زندگیوں کے حالات بیان کئے جاتے ہیں اور ان اشخاص کے ساتھ چند ایسے کردار بھی شامل کردئے جاتے ہیں جو صرف ذہنی تخلیق ہوتے ہیں۔

(ه) سوانح (Farce) : یہ کامیڈی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے جس میں سوائے تہمتوں کے اور کچھ نہیں ہوتا اور یہ تہمتیں عام طور پر مبالغے اور منحرف پن سے پیدا کئے جاتے ہیں۔

(و) معجزاتی اور انشائی (Miracle + morality) : یہ ڈرامے عام طور پر گزشتہ زمانہ میں لائے جتے تھے جس میں کسی پیغمبر یا کسی اولیاء کی زندگی بیان کی جاتی تھی۔

(س) خیالی (Fairy) : اس میں ایسے واقعات پیش کئے جاتے ہیں جو حقیقی زندگی سے تعلق نہیں رکھتے۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ڈرامہ اور نوریوں کی زندگی سے بحث کرتا ہے ڈراما ان کے آپس کے تعلقات اور خیالات و محسوسات ان کے جذبات و محرکات۔ ان کی جدوجہد کی تفسیر ہے۔ زندگی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے متعلق لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ فلسفی زندگی کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔ انھوں نے زندگی کو کیا سمجھا ہے اور کیا محسوس کیا ہے اور زندگی کے متعلق ان کی کیا رائے ہے اس پر ہزاروں کتابیں مختلف فلسفیوں کی موجود ہیں جن کو دیکھ کر ہم اس کے متعلق مختلف فلسفیوں کے خیالات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ڈراما نگار بھی زندگی کے متعلق ایک فلسفہ پیش کرتا ہے۔ اکثر ڈراما نویس صرف زندگی کا مشاہدہ کرنے والے ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ زندگی کے متعلق سوچنے والے بھی ہوتے ہیں۔ ان کا زندگی کے متعلق ایک مخصوص زاویہ نگاہ ہوتا ہے اور اسی زاویہ نگاہ سے اپنے کرداروں کو پیش کرتے ہیں۔ ہر ڈراما ایک خاص زمانہ اور ایک خاص ماحول کی پیداوار ہوتا ہے ایک ڈراما نویس کبھی اس ماحول اور اس زندگی کی عکاسی نہیں کرتا جس کا اس نے مطالعہ نہیں کیا ہے وہ زندگی کے حقائق سے بحث کرتا ہے وہ صرف ان سچائیوں کو پیش کرتا ہے جن کا انکار نہیں۔

یہ خیال کرنا کہ ڈراما کی کہانی فرضی ہوتی ہے اس نے اس کا سچائی سے کوئی تعلق نہیں غلط ہے۔ ادبی کہانیوں میں ہر چیز سچی ہوتی ہے۔ سوانام اور تاریخ کے ڈراما نویس جو کہانی اپنے لئے منتخب کرتے ہیں وہ آسانی یا الہامی نہیں ہوتی بلکہ ڈراما نویس کو اپنی کہانی اپنے ارد گرد کے چلنے پھرنے انسانوں میں ڈھونڈنا پڑتی ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے افراد کا گہرا مطالعہ کرتا ہے۔ ان افراد میں اس کے اعزہ ہوتے ہیں۔ اس کے دوست ہوتے ہیں۔ اس کے اصر ہوتے ہیں۔ اس کے ہوتے ہیں دو کا انداز ہوتے ہیں جن سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ اس کے گھر کے حاکم ہوتے ہیں اور ہر وہ شخص ہوتا ہے جس سے اس کا تعلق ہے اور پھر اپنی زندگی کے مطالعہ میں کوئی نہ کوئی ایسا گوشہ مل جاتا ہے جس سے کوئی معمولی اور خیر اہم کہانی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کہانی بظاہر معمولی نظر آتی ہے مگر ڈراما نویس کا ذہن معمولی واقعات سے بہت اہم اجزاء تلاش کر لیتا ہے۔ ان واقعات میں تاریخی واقعات سے زیادہ سچائی ہوتی ہے کیونکہ تاریخ میں عام طور پر تصنع کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ مگر ڈراما نگار کہانی کے واقعات میں اس احتمال کی گنجائش نہیں کیونکہ ڈراما نویس انہی سچے واقعات کو بیان کرتا ہے جس کا اس نے خود مطالعہ کیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ڈراما نویس ہمیشہ اپنے کرداروں کے چہرہ میں کسی ایسے کردار کی تلاش کرتا ہے جو آئینہ ہو تا ہے ؟ کیا ڈراما نویس کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ ہمیشہ ایک آئینہ کر در پیش کرے۔ اس کے جوابات مختلف ہیں۔ ایک ایسا شخص جو ہر چیز میں اخلاقی قدروں کو تلاش کرتا ہے اس کا جواب اثبات میں دے گا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اخلاقی قدروں کا معیار کیا ہے۔ کیا اخلاقی قدروں سے مراد وہ اصول ہیں جو فلسفیوں نے مقرر کئے ہیں اور کیا اخلاقی قدریں جو فلسفیوں نے مقرر کی ہیں ایسے مسلمہ الثبوت اصول ہیں جن سے انکار کی گنجائش نہیں۔ اور کیا وہ تمام اخلاقی قدریں جن کو فلسفیوں نے معیار اخلاقی قرار دیا ہے کسی ایک فرد واحد میں کل طور پر مل سکتی ہیں ؟ ان سب سوالات کا جواب اثبات میں ملنا مشکل ہے۔ ہر شخص میں

کہ کورس میں کسی ہوتی ہے۔ جو اس خطائی سے بچا رہے۔ یہی انٹرنیشنل کونسلوں اور زیادہ تر معصومین کے انتظامی امور کو دیکھ کر اس کے کسی ایسے کردار کی تلاش کرنا جو انتظامی سہارا کا مکمل نمونہ ہو۔ اول تو غلط ہے اور ایسا کردار پیش بھی کیا جاسکتا تو وہ چلتا پھرتا عام انسان نہیں ہوگا بلکہ کسی قدر اور خیالی انسان ہوگا جس سے ہر شخص اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرے گا۔ اس نے ڈراما نویس کو ایسا کردار پیش کرنا چاہیے جو ارد گرد کے عام انسانوں میں نظر آئے لیکن اس صورت میں کیا انٹرمل انسان سے مراد وہ شخص ہوگا جس میں ایک خاص طبقہ کی خصوصیات موجود ہوں؟ اس کا جواب ہے ہونگا کہ ڈراما نویس کو ایسے ہی کردار پیش کرنا چاہئے جو کسی طبقہ کی نمائندگی کرتے ہوں اور ایسا کردار دنیا میں مشکل نہیں کیونکہ ہر طبقہ اور فرقے میں ایسے افراد مل سکتے ہیں جو مکمل طور پر اس طبقہ کی نمائندگی کر سکیں۔ ایک ایسا شخص جس کی ہر بات میں ماحول کے ماحول میں ہوتی ہے تو وہ اس ماحول سے متاثر ہو کر جو رہی جاتا ہے مگر جب اس کا اس ماحول سے متاثر ہو کر وہ چاروں کی کسی عادت کو ترک کر دیتا ہے تو اسے کہتے ہیں کہ وہ ڈراما میں کسی ایسے انسان کی نمائندگی نہیں ہوتی جو واقعی یا تصور ہی ہوتے ہیں بلکہ ایسے انسان پیش کئے جاتے ہیں جو جتنے پھرتے ہوتے ہیں اور جو عام طور پر ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں اور پھر ڈراما نویس اس طرح تنقید کرتا ہے کہ عوام کی عقلی زندگی سامنے آجائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈراما ماحول پر بھی تنقید ہے یا نہیں؟ اس کا جواب صاف ہے کہ کیونکہ انسان ماحول ہی کی پیداوار ہے اور اس کے اندر جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں وہ کیسے ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔ پیدائش کے وقت بچہ کا کوئی کیکر نہیں ہوتا لیکن بعد کو بلکہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہو کر اس کا کیکر تبدیل ہوتا ہے۔ انٹرنیشنل کوئی کردار ماحول ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کی تعمیر ماحول کے اثرات سے ہوتی ہے۔

یہ غلط فہمی لگتا ہے کہ "تاریخ بظاہر ہزاروں اور سلطنتوں کی روایتوں سے زیادہ کوئی چیز نہیں۔ لیکن دراصل وہ نام ہے نظر و تحقیق کا۔ اس گہرے میں ماحول کا تعلق واقعات کی کیفیات اور اسباب سے ہے۔" تاریخ کی اس تعریف کو اگر ہم ڈراما پر منطبق کریں تو ہم کو ڈراما کے اندر بھی وہ خصوصیات نظر آئیں گی جو تاریخ کے دائرہ عمل میں آتی ہیں۔ اگر تاریخ کے اس حصہ سے ہم بحث کریں جو سلطنتوں کی روایتوں سے تعلق ہوتا ہے تو ہم کو ایسے تاریخی ڈرامے مل سکتے ہیں جن کی بنیاد کسی تاریخی واقعہ پر رکھی گئی ہے اور جن کی کہانی کسی اہم تاریخی واقعہ سے پیدا ہوئی ہے مگر چونکہ تاریخ صرف سوانح نگاری یا واقعہ نگاری نہیں ہے اس لئے اس کا دائرہ ہر دور کے معاشی، عمرانی اور مجلسی حالات تک وسیع ہے اور ڈراما ہر دور کے معاشی، عمرانی اور مجلسی حالات کے گہرے مطالعہ سے دلچسپی لیتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ہر وہ بیگنڈے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور سیاسی سماجی۔ معاشی اور عمرانی تبدیلیوں کا زیادہ تر دائرہ دار اسی ہر وہ بیگنڈے ہے جو موجودہ زمانہ میں زندگی جس قدر جزو رفتار ہے اس لئے اسی قدر ہر وہ بیگنڈے تیز ہوتا جائے اور ڈراما ایسا ہی اختیار ہے جو اس تیز رفتار زندگی کا ہر رخ سمجھ دے سکتا ہے۔ یہاں اس بحث کے چیرنے کی ضرورت نہیں کہ کیا ادب سے ہر وہ بیگنڈے کا کام لیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ مگر قطعاً طور پر صرف امتداد کہنے کا کافی ہوگا کہ ادب ہر وہ بیگنڈے کا ایک اہم اختیار ہے۔ اس زمانہ میں تو اس بلکہ ہر زمانہ میں ہر وہ بیگنڈے کا فرض انجام دیتا ہے۔ خود ہمارے ادب میں کیا اس سلسلہ میں بیگنڈے کا کام نہیں کیا۔ آجکل ہر وہ بیگنڈے ایک ایسی عالمگیر حیثیت حاصل کر چکا ہے کہ قدم قدم پر ہر وہ بیگنڈے کی مدد کار ہوتی ہے۔ حکومتیں اپنا ہر وہ بیگنڈے اکر رہی ہیں۔ بڑی بڑی تجارتی فرموں سے لیکر معمولی سے معمولی دو افروزش پر وہ بیگنڈے کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور حد تو یہ کہ کوئی نہ لگے اور غور نہ لگے بھی ہر وہ بیگنڈے میں اپنا اثر رکھتے ہیں۔ اسی لئے اس کو موثر بنانے کے لئے ہر وہ بیگنڈے کے لئے نئے نئے طریقے ایجاد کئے جاتے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کے کورس میں ہر وہ بیگنڈے کی تعلیم کو داخل کر دیا گیا ہے انسان فطرتاً ایسے واقعات سے متاثر ہو کہ جس کے سامنے واقعہ ہوں۔ اگر کسی شخص سے یہ کہا جائے کہ میرا دوست مر گیا تو وہ اس سے اس قدر متاثر نہیں ہوگا جتنا کہ اپنے دوست کو انٹرنیشنل کے سامنے کر کے رکھ کر کہے کہ ڈراما اور فلم واقعات کو اصل کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ یہ وہ موثر چیز ہیں۔ ہمارے بچے ان کی زندگی کے حالات پر حکمرانوں کی زندگی پر نہیں ہو سکتے تھے ان کو یہ وہ فلم یا سٹیج پر ڈراما کے مدد پر یہ کہہ کر کہیں کی اچھی اور برا کی انٹرنیشنل صورت کا دل سے منکر نہیں لگا یا جاسکتا تھا بلکہ اس کا تجربہ دیکھا جاتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی ممالک کی یہ چھائی ہے کہ وہ بیگنڈے بہت صاف و صاف ہیں۔ ان کی شکل میں یہ کہہ جاسکتا ہے کہ ان ممالک کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کی زندگی میں ایسے واقعات ہوتے ہیں جو عام طور پر ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں اور پھر ڈراما نویس اس طرح تنقید کرتا ہے کہ عوام کی عقلی زندگی سامنے آجائے۔

دھرتا ہے بلکہ خاموشی سے پردہ فلم یا اسٹیج پر یہ بتلادیا جائے کہ دو مختلف اشخاص دو مختلف صابنوں سے اپنے کپڑے صاف کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص بارہ دھرتی محنت اور کوشش کے اپنے کپڑے صاف اور اچلے نہ کر سکا جبکہ دوسرا شخص جو اس مخصوص صابن سے اپنے کپڑے صاف کر رہا ہے انھیں اچھے اور صاف کرنے میں کامیاب ہو گیا تو دیکھنے والے کے ذہن میں فوراً یہ بات اُتر جائے گی۔ یہی حال خیالات اور عقاید کا ہے۔ ڈراما خیالات اور عقاید کے پرچار کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اس کے ذریعہ جب خیالات اور عقاید پیش کئے جاتے ہیں تو وہ بہت زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں اس لئے اس دور میں ڈراموں کی ہیئت اور بڑھ گئی ہے۔ پہلے زمانہ میں ڈرامہ صرف تفریح کا مشغلہ سمجھا جاتا تھا اب وہ ایک اہم فرض انجام دینے لگا ہے۔ اس دور میں جبکہ عقاید کے اختلافات سے دوچار ہوتا ہے تو ڈرامہ میں تو اس کے ذہن کے لئے ایک محرک مل جاتا ہے اور پھر اس کے لئے جنسی داغ کو ایک راستہ مل جاتا ہے جو اسے تاریکیوں میں نہیں بھٹکنے دیتا۔

ابراہیم یوسف

خریدارانِ "نگار" کے لئے

ایک نہایت ضروری اعلان

۱۔ "نگار" کا سالانہ چندہ مع سالنامہ کے (جس میں جنوری، فروری کے پرچے شامل ہوتے ہیں) آٹھ روپیہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن جو حضرات سالنامہ لینا نہ چاہیں گے اور سال میں صرف دس پرچوں پر قناعت کریں گے ان کے لئے چندہ بدستور چھ روپیہ رہے گا

۲۔ اگر آپ سالنامہ لینا نہیں چاہتے تو ازراہ کرم جلد از جلد مطلع فرمائیے، کیونکہ کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے سالنامہ کی کاپیاں زاید نہیں چھاپی جائیں گی

۳۔ اگر آپ نے اطلاع نہیں دی تو سمجھا جائے گا کہ آپ سالنامہ لینا چاہتے ہیں اور وی پی آٹھ روپیہ چھ آنے میں روانہ ہوگا اگر آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۷ء میں ختم ہوتا ہے — ورنہ دو روپیہ چھ آنے کا وی پی جاتا ہے

۴۔ جو حضرات سالنامہ لینا پسند نہ فرمادیں گے اور اس کی اطلاع ہم کو دیدیں گے ان کی خدمت میں دسمبر ۱۹۵۷ء کے پرچے کے بعد مارچ ۱۹۵۸ء کا "نگار" بھیجا جائے گا

۵۔ مختصر آویں سمجھ لیجئے کہ دس مہینے کے سال کا چندہ چھ روپیہ ہے اور پورے بارہ مہینے کے سال کا چندہ آٹھ روپیہ ہے۔

مینجر نگار

عشق

جھیل ایک یاقوت بود کی طرح نیلگوں آسمان کے نیچے چمک رہی تھی اس کا چہرہ شکن سے بالکل صاف تھا۔ گویا وہ ایک خوبصورت عورت تھی ساکت و مطمئن، جو سو رہی ہو اور کوئی دلکش خواب دیکھ رہی ہو۔ یہ دو شیرازہ صحرائیں تھی جس کے چاروں طرف خود رو پھولوں کی کثرت کا یہ عالم تھا، گویا قدرت نے اس کے لئے جملہ گل آراستہ کیا ہے اور وہ اس کے اندر آرام سے سو رہی ہے۔

ہلکی ہلکی باد نسیم چل رہی تھی، گویا اسے ہنند سے جگا رہی تھی تاکہ وہ درخت بلوط سے کچھ باتیں کرے جو خاموش جھیل کے اس خواب شیریں سے لطف اٹھا رہا تھا۔ آخر کار بلوط کے دل میں بھی ہیجان پیدا ہوا، جھیل کی طرف سر جھٹکا کر اپنا چہرہ اس کے بلوریں سینہ میں دیکھا اور کیفیت عشق اس کے اندر پیدا ہونے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ جھیل بھی عشق و محبت کے کئے گہرے اور خوفناک راز اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے اور اس کے خوبصورت ساحل سے شیخناک محبت کے کتنی قربانیاں پیش کی ہیں۔

زانہ بہار کا تھا اور نضا بڑے محبت سے لبریز اس لئے بلوط میں بھی جھیل سے راز و نیاز کی باتیں کرنے کا جذبہ قوی ہو گیا۔ جھیل کی عمر شاید ہزار سال سے بھی زیادہ تھی لیکن اس راز سے اس کے سوا کوئی واقف نہ تھا۔ بلوط کی عمر تین سو سال کی تھی اور صحرائے تما درخت اس سے واقف تھے۔

ان دونوں کی شناسائی گرمی کی ایک دوپہر سے شروع ہوئی تھی جب ایک طرف بلوط اپنا ٹھنڈا سایہ جھیل پر ڈال کر اس کو تازات آفتاب سے بچا تھا اور دوسری طرف جھیل اپنے پانی سے اس کے ریشوں کی آبیاری کر رہی تھی۔ بلوط نے آہستہ آہستہ اپنا سر جھکایا اور بولا:۔ ”اے جھیل، تیرا وجود بھی کتنا مبارک وجود ہے۔“ جھیل نے جواب دیا:۔ ”میں بلوط تو زیادہ قابل تعریف ہے کیونکہ چڑیاں تیرے دامن میں گھونسلہ بناتی ہیں، اور تیری شاخوں پر بچے کچھ

کرتی ہیں، مجھے یہ سعادت کہاں نصیب! بلوط۔ ”کیا تیری آغوش میں رنگین مچھلیاں پناہ نہیں لیتیں؟ یہ بھی تو خدا کے محبت ہی کی بیبیاں ہیں۔“ جھیل۔ ”یہ صحیح ہے لیکن ان میں چڑیوں کا سا گرم خون کہاں، چڑیوں کے عشق میں جوش و خروش ہے اور مچھلیوں کا جذبہ محبت سرد خاموش۔“

جہ بہت جلد خشکی پیدا کر دیتا ہے۔ بلوط۔ ”مگر تیرے ساحل پر تو آدم زاد محبت کرنے والے آکر بیٹھے ہیں، راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں۔ کیسی کیسی خوبصورت لڑکیاں اپنے جسم کو بزمِ تیری آغوش میں کھینچتی ہیں۔ ان کا خون تو سرد نہیں؟“

جھیل۔ ”لیکن یہ مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا کیونکہ وہ بھی میری ہی طرح عورت ہیں، مرد میرے پانی سے ڈرتے ہیں اور میری آغوش سے وہ ہیں۔ علاوہ اس کے کہ لڑکیاں بہت بے ادب ہیں، میرے صاف و شفاف پانی کو مٹی سے گندہ کر دیتی ہیں، میری مچھلیوں کو پریشان

میرے چہرے کو شکنوں سے بھر دیتی ہیں جھیل و بلوط دونوں دفعتاً خاموش ہو گئے، کیونکہ ناگاہ انھوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان مرد ایک خوبصورت لڑکی کے کمر میں ہاتھ ڈالنا

خراں چلا آ رہا ہے۔ تھوڑی دیر تک تو بلوط اور جمیل خاموشی سے دیکھتے رہے لیکن عورت زیادہ دیر تک خاموش نہیں رہ سکی، اسلئے جمیل بول اٹھی۔
 ”یہ دونوں چار سال سے ہر موسم بہا میں یہاں آتے ہیں اور گھنٹہ بھر تیرے تن کا سہارا لے ہوئے راز و نیاز عشق میں مصروف رہتے ہیں۔“
 بلوط بولا۔ ”میں بھی ان دونوں کی سچا سچا ہوں، لیکن حیرت ہے کہ ان دونوں نے اب تک شادی نہیں کی۔“

جمیل۔ ”انسان عجیب مخلوق ہے، مرد سمجھتا ہے کہ شادی کے بعد آرزوں کی لذت ختم ہو جاتی ہے۔ تم بھی تو مرد ہی ہو، تم کو تو ایسا نہ کہنا چاہئے۔“
 یہ سنکر بلوط کو غصہ آیا لیکن اس نے ضبط کیا کیونکہ تین سو سال کے بعد اس کے لئے پہلا موقع صحبت کرنے کا تھا اور وہ اسکی خفا کو خراب کرنا چاہتا تھا۔
 یہ دونوں خاموشی سے اس جوڑے کا تماشا دیکھنے لگے، کیونکہ تماشائے عشق بھی مطلق سے خالی نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب یہ جوڑا اپنی جگہ سے اٹھا تو جمیل نے بلوط سے کہا کہ:-

”دیکھتے ہو ان کی بدینہری کہ کھانے کی خالی ٹوکری کسی بدینہری کے ساتھ انھوں نے میرے سینہ پر کھینچ اری۔“
 بلوط۔ ”اور ادھر بھی تو دیکھو کہ میری پوست کو انھوں نے چاقو کی نوک سے زخمی کر کے کیا کیا۔ اور میری اذیت کی کوئی پروا نہ کی۔“
 جمیل نے دیکھا کہ ”دودل تیرے چہرے سے ہوئے“ اس کے تن پر منقوش تھے اور اس کے نیچے دونوں کے نام درج تھے۔
 جمیل۔ ”دیکھ کر خاموش ہو گئی اور پھر یہ سوچ کر کہ غروب کا وقت ہے، بلوط کو عشق و محبت کی کچھ داستانیں سنانا چاہئے تاکہ اس کو نیند آجائے۔ یہ سوچ کر اس نے آواز بلند سے کہا:
 ”بلوط کیا تم سو رہے؟“

بلوط۔ ”نہیں میں سویا نہیں بلکہ اس انسانی جوڑے کے انجام پر غور کر رہا ہوں۔“
 جمیل۔ ”تمہیں کیوں اس کی فکر ہے؟“
 بلوط۔ ”مجھے فکر اس لئے ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ انسانی لڑکیاں جب جوان ہونے کے بعد محبت کے بانے کی خواہش اپنے اندر محسوس کرتی ہیں تو مردوں کی دانشمندی کی بہت کم پروا کرتی ہیں۔“

جمیل۔ ”اس میں غلطی مردوں کی بھی ہے کہ وہ محبت محرتے ہی عورت کا سب کچھ اس سے فوراً چھین نا چاہتے ہیں، خیر اس نوجوان کا ذکر چھوڑو۔ مجھے یاد ہے کہ جب ملکہ الزبتھ انگلستان کی فرمانروا تھی اس کے ایک چاہنے والے کو نہایت تاریک و سرور قید خانہ میں بند کر دیا گیا۔“
 بلوط۔ ”خوب کیا، کیونکہ۔۔۔“

جمیل۔ ”کیونکہ کا یہاں کوئی سوال نہیں۔ سنو جو کچھ اس کے بعد ہوا پہلے اس کے دل میں فخر پر یوست کیا، پھر بھاری آہنی گولے اس کے ہاتھ پاؤں میں باندھ دئے گئے اور اس کی لاش مع اس کے خنجر کے جو اس کے دل میں پوست تھا میرے اندر پھینک دی اور دس سال تک وہ خنجر مجھے دیکھ رہا ہوتا رہا، اس جوان کی ہڈیاں اب بھی میرے اندر موجود ہیں۔ کیا تم جانتے ہو کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اس وقت انگلستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔“
 بلوط۔ ”وہ کیونکر۔۔۔“

جمیل۔ ”اس طرح کہ یہ نوجوان الزبتھ کی تمام عشق بازیوں اور ہتھکنڈوں سے واقف تھا اور اسے معلوم تھا کہ الزبتھ کے جاسوسوں نے کس طرح اسے پایا کو جنگ پر مجبور کر کے اسے شکست سے دوچار کیا۔“

بلوط۔ ”چھوڑو ان قصوں کو، مجھے تاریخ سے دلچسپی نہیں، تم تو کچھ ایسی باتیں کرو جو موسم بہار میں دو محبت کرنے والے دلوں کو بھلی معلوم ہیں۔“
 جمیل سمجھ گیا، اس وقت بلوط پر جذبہ عشق غالب ہے اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی۔ پھر بھی اسے اس محبت کی پاداری کا یقین نہ تھا۔

صبح کا وقت تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھولوں کی خوشبو سے لدی ہوئی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بلوط نے بھی اپنی شاخوں کو بارش کے پانی سے دھو چکا تھا اور جمیل بھی ہوا کی مدد سے اپنی زخموں میں پیچ و خم پیدا کر چکی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو سمجھانے کے لئے آدہ تھے۔

اسی وقت ایک نوجوانی ایک خوبصورت لڑکی کو لے ہوئے آہستہ آہستہ جھیل کے کنارے پہنچا اور دونوں بلوط کے سایہ میں بیٹھ کر محبت کی سرگوشیوں میں مسرور ہو گئے۔ مرد انتہائی شیفٹنگی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کرتا تھا اور لڑکی بھی مدد دہ خوشدلی کے ساتھ اس کے اعتراضات محبت کو سن رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی، اپنے کپڑے اتارے اور نہانے کا لباس پہن کر جھیل کے کنارے آئی اور پانی میں اُتری۔ نوجوان نے پوچھا: ”پانی زیادہ سرد تو نہیں ہے“

جھیل نے یہ سوال مسکریٹ بیچ دیا بکھایا اور اپنے دل میں سوچا کہ بہار اور سردی! کیا خوب معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان ابھی تک اسرارِ عشق سے پوری طرح واقف نہیں ہے۔ تاہم جھیل نے سورج کی کرن کی مدد سے اپنے پانی کی سردی کو دور کر لیا یہاں تک کہ جب لڑکی اس کے اندر داخل ہوئی تو وہ کافی گرم ہو چکا تھا۔

لڑکی نے اپنا قدم پانی میں رکھا تو بولی ”پانی گرم ہے“ اور آہستہ آہستہ کمر کر پانی تک بڑھ گئی اور مسکراتے ہوئے نوجوان سے کہا کہ ”تم بھی آ جاؤ۔“ یہ کہہ کر لڑکی اور آگے بڑھی یہاں تک کہ جب پانی اس کے سینہ تک پہنچ گیا تو اس کا پاؤں دفعتاً پھسل اُڑا اور وہ چیخ اُٹھی کہ ”مجھے بچاؤ میں ڈوب رہی ہوں“ نوجوان پیرنا نہیں جانتا تھا، لیکن بے اختیار اپنی محبوبہ کی مدد کے لئے پانی میں کود پڑا اور جب اپنی محبوبہ کے پاس پہنچا تو اس نے گردن میں ہاتھ ڈال دئے اور اسے بھی کھینچ کر پانی کی تہ تک لے گئی۔

یہ دیکھ کر بلوط کی رگِ حیمت کو جنبش ہوئی اور جب آخری بار مرد پانی کی سطح سے اُبھر تو اس نے اپنی شاخیں جھکا دیں جن کو کپڑے کر وہ نوجوان اُپر آگیا اور اپنی محبوبہ کو بھی باہر لے آیا۔

آفتاب ڈوبنے والا تھا اور یہ انسانی جوڑا ساحل سے اٹھ کر واپس پل گیا اور بلوط و جھیل دونوں چاندنی رات میں تنہا رہ گئے۔ بلوط کی شاخ سے پانی کا ایک قطرہ ٹپک کر جھیل کی آغوش میں گر گیا۔

جھیل بولی:- ”کیا تم در رہے ہو“

بلوط:- ”اگر تو سنگدل نہ ہوتی تو تو بھی میری طرح آنسو بہاتی۔ وہ کون ہے جو عشق کے اسی درد و زناظر کو دیکھ کر متاثر نہ ہوگا“

جھیل نے آسمان کی طرف نگاہ کی، اپنے صاف چہرہ کو چاند کے آئینہ میں دیکھا، مسکرائی اور اپنی زلفوں میں رزار ہا شکنیں ڈال کر خاموش ہو گئی۔ ناگاہ اسی وقت شاخ بلوط پر ایک بیل آیا اور چپکے لگا۔ جھیل کا دل اس کا نغمہ منکر سمجھ گیا اور بلوط سے بولی:- ”تم مجھے سنگدل سمجھتے ہو اور اس حقیقت سے بے خبر ہو کہ مجھ سے زیادہ رقیبِ القلب کوئی اور نہیں“

بلوط نے اپنا سر جھیل کی طرف جھکا دیا۔ چاند اور زیادہ چمک اُٹھا۔ ہوا چھوڑی کی خوشبو سے معطر ہو گئی اور جھیل بولی کہ ”میں خود ایک آنک سے زیادہ نہیں جو معلوم نہیں کس وقت ساکنانِ طاءِ اعلیٰ کی آنکھوں سے ٹپکا تھا“

بلوط جھکا اور جھیل کو بوسہ دیکر خاموش ہو گیا۔

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ادیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ادیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ (دفعہ) علاوہ محصول - منیجر نگار گھنٹو

جمالتان

ادیب نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، اندر تخیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی اور معاشرتی مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور سر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس ادیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ادیشنوں میں تھے قیمت پانچ روپیہ (دفعہ) علاوہ محصول - منیجر نگار گھنٹو

انیس اور امیر کا ابتدائی اور انتہائی کلام

(شوکت بلگرامی)

انیس یہ مشہور قصہ ہے کہ میر انیس مرحوم نے بچپن میں ایک بکری پالی تھی جس کو بہت چاہتے تھے جب وہ مری تو ان کو بہت ملال ہوا اور اُسکے مرنے پر یہ شعر کہا:

انوس کو دُنیا سے سفر کر گئی بکری
آنکھیں تو کھلی رہ گئیں اور مرنے کی بکری

سناء کہ جب ان کے والد کو خبر ہوئی تو انھوں نے ہونہار بیٹے کو بلا کے کمر اس شعر کو پڑھوایا، تعریف سے دل بڑھایا اور اس خوشی میں کہ صاحبزادہ نے پہلے پہل شعر کہا ہے اپنے بیگانوں میں مٹھائی تقسیم کی اور اس دھوم دھام سے انیس کی شاعری کی بسم اللہ ہوئی۔ ممکن ہے کہ اس نئی روشنی کے زمانہ میں، انیس محبت کا چھلایا بچوں کے بہلانے کا طریقہ سمجھی جائیں یا بعض کو یہ نظر اس کو بزرگانِ قدیم کی سادہ دلی خیال کرس لیکن جن کو خدا نے ختم حقیقت نگار عطا کی ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ باتیں معمولی باتیں نہیں بلکہ وحشی دلی کے تسخیر کی گھاتیں ہیں۔ کاش ہم سمجھتے کہ مناسب طبع تعلیم کیا چیز ہے۔ ایک کاواک گیر یہی ہے والا لڑکا ایک دیا سلائی کی ڈبیول کو جو بکے مکان بنانے والا بچہ بہترین آرٹسٹ اور اعلیٰ ترین انجینیر ہو سکتا ہے اور اُس سے بہت کچھ منفعت حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کو طبعِ خدا دوسے کام لینے کا موقع دیا جائے لیکن انوس ہے ہم رحمانِ طبیعت کا مطلق خیال نہیں کرتے اور مختلف الانوالانِ طبیعتوں کو مردہ تعبیر پر زور سٹی کے سیاہ رنگ میں رنگتے چلے جاتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ۔ 'کار و نیرینہ نیست بخاری' اس بیان سے غرض یہ ہے کہ میر انیس مرحوم شاعری کا خدا داد جو اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کو اس کے اظہار کا پورا موقع ملا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج دُنیا سے شاعری میں انیس کا مثل نہیں نظر آتا۔ اس کو بھی رحمانِ طبیعت ہی کا کرشمہ کہنا چاہئے کہ میر انیس کی زبان سے پہلا شعر نکلا تو مریہ کا۔ یہ تو ابتدا کا حال تھا اب انتہا کا قصہ سنئے۔ میر آغا حسین صاحب جو عابدین دہلی میں ہیں اور آجکل حیدر آباد دکن میں تشریف رکھتے ہیں۔ بیان فرماتے تھے کہ میں ایک دفعہ حالتِ مرض الموت میں میر صاحب کی عیادت کو گیا تو معلوم ہوا کہ زبانِ نعلین تشریف رکھتے ہیں اطلاع کی تو پر دہ کردا کے بلایا اند گیا تو دیکھا میر صاحب مرحوم لیان سے منہ ڈھانچے لیٹے ہوئے ہیں اور میر انیس مرحوم پہلو میں بیٹھے ہیں میں بھی انھیں کے پاس بیٹھ گیا اور بکار کے بوجھا کہ میر صاحب مزاج کیسا ہے۔ اس کے جواب میں لیان کے اند ہی سے میر صاحب نے فرمایا کہ کیا کہوں ضعف و ناطاقی و سستی و اعضا شکنی ایک لکھنے سے جو ان کے بڑھایا گیا کیا کچھ

میں جو کہ ان کی خدمت میں گستاخ تھا اس نے بے باکانہ عرض کیا کہ حضرت یہ تو آپ میر تقی مرحوم کی زبانی اپنا حال بیان فرما رہے ہیں۔ یہ سنکے میر صاحب نے منہ سے لحاظ ہٹایا چند سکند تک بغیر میری طرف دیکھتے رہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر فرمایا کہ

اک جوانی کیا گئی سو درد پیدا ہو گئے
تو ہی اسے پیری بتا ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے

میر آغا حسین صاحب فرماتے تھے کہ آج تک وہ آواز میر سے کافوں میں گونجتی ہے اور اُس نورانی صورت کو آنکھیں دھونڈھتی ہیں جو بیونڈھاک ہوگئے راقم حروف نے ایک دفعہ برسمیل تذکرہ یہ حکایت سید علی صاحب پوتن سے (جو میر انیس مرحوم کے شاگرد اور ان کے خاص مٹے والوں میں ہیں) بیان کی تو انھوں نے اس کو سُننے کے فرمایا کہ میں تم کو وہ شعر سناؤں جس کے بعد میر انیس مرحوم نے کوئی شعر نہیں کیا۔ یعنی انتقال کی صبح یا اس کے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ میر صاحب نے سوئے اٹھے تو میر پوتن مرحوم کو بلایا اور فرمایا کہ شب کو ایک مطلع خیال میں آیا ہے اس کو لکھ دو ہمارے بعد خواہ اس پر سلام کہنا، خواہ غزل (جو کہ میر پوتن مرحوم) میر صاحب ہمیشہ غزل گوئی سے منع کرتے تھے اس نے غزل کہنے کا اشارہ اس عرض سے کیا کہ ہمارے بعد تم کو غزل گوئی سے کون روکے گا اور اس کے بعد یہ مطلع جو فیض آباد کی شاعری کا مقطع تھا پڑھا۔

سب عزیز و اقربا آتشنا ہو جائیں گے
قبر میں بیونڈھتے ہیں جدا ہو جائیں گے

اللہ اللہ وہ محبت کا پہلا۔ وہ وفا کا بندہ جس نے بچپن میں ایک بے زبان کی بددلی پر اظہارِ تاسف کیا تھا۔ آخری وقت کس حسرت و افسوس کے ساتھ دنیا کی ناپائیدار محبت کا ذکر کر رہا ہے اور اپنے عزیز و احباب سے کس قدر بیگانہ اور ناامید ہونے کے دنیا سے جا رہا ہے۔ (اُردوئے معلیٰ سلسلہ ۱)

ہر چیز کی ابتدا چونکہ بہت خفیف ہوتی ہے اس لئے لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے لیکن جب وہ باتیں منہائے کمال کو پہنچ جاتی ہیں اس وقت ہماری آئیر آنکھیں ان ابتدائی خفیف باتوں کو ڈھونڈ سکتی رہتی ہیں۔ جنہوں نے ان کو معراجِ کمال پر پہنچایا۔ اس کا خیال تو اکثر لوگ کرتے ہیں کہ: ”یہ بچپنا ہے تو اس کا شباب کیا ہوگا۔“ لیکن ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے جو عمر رفتگی کی یاد تازہ رکھیں اور اس سے سبق لیں۔ چونکہ میرا افسردہ اور مراد اول اسی لئے بنایا گیا ہے کہ گزربے ہوؤں کی یاد میں رہا کرے اور ان کے انجام کو سوجھا کرے۔ اس لئے سوا اس کے اور کوئی مضمون مجھے ملتا ہی نہیں کہ ان کی باتیں کروں اور سردھنوں۔ اس کے قبل اُردوئے معلیٰ کے کسی پرچے میں ”انیس کا ابتدائی اور انتہائی کلام“ نذر ناظرین کر چکا ہوں اور آج ایک دوسرے میحائے سخن یعنی حضرت آئیر مینائی مرحوم و مغفور کا ابتدائی اور انتہائی کلام سناتا ہوں

میرے جلیل القدر دوست حافظ جلیل حسن صاحب جلیل بیان فرماتے تھے کہ حضرت کو بچپن ہی سے شاعری کا چسکا تھا یہ خبر جب ان کے والد ماجد کو پہنچی تو ایک دلی شب کہ جبکہ منشی صاحب مرحوم بیٹے پاؤں دبار سے تھے ان کے والد ماجد نے پوچھا ”میاں ہم نے سنا ہے کہ تم شعر کہتے ہو ذرا ہم بھی سنیں کہ ہمارا امیر کیسے شعر کہتا ہے“ سنکر امیر مرحوم پہلے تو بہت اٹکار کرتے رہے مگر شفیق باپ کے محبت آمیز اصرار سے مجبور ہو کر عرض کیا کہ گھر میں سب لوگ کہا کرتے ہیں کہ برسات گزری جاتی ہے اور بارش نہیں ہوتی اسی مضمون کو کہا ہے اور اس تہید کے بعد یہ شعر جو حضرت نے اسی زمانہ میں تصنیف فرمایا تھا عرض کیا کہ:۔

ابر آتا ہے ہر بار برستا نہیں پانی
اس غم سے ہے یا دوسرے اشکوں کی روانی

یہ سن کے شفیق باپ نے تعریف سے دل بڑھایا کہ کبھی شعر تو بہت صاف ہے اور مضمون بھی سچا لیکن تمہارا سن ابھی اس شغلہ کے لئے موزوں نہیں پہلے اچھی طرح پڑھ لکھ لو اُس کے بعد شعر کہنا۔ یہ روایت اس زمانہ کی ہے جب منشی صاحب پندرہ برس کے تھے ممکن ہے کہ اس کے قبل انہوں نے اور بھی شعر کہے ہوں۔ لیکن عموماً لوگوں کو جو ان کی شاعری کا حال معلوم ہوا وہ اسی واقعہ سے اس لئے اگر ہم اس شعر کو آئیر کا ابتدائی کلام کہیں تو بجا نہیں یہ جو کہتے ہیں کہ بچے کے پاؤں پانے میں معلوم ہوتے ہیں بالکل سچ ہے۔ اگر ہم اس شعر کی خوبی معلوم کرنا چاہیں تو اس کی آسان تدبیر یہ ہے کہ اسی مضمون کو اسی بحر و قافیہ میں موزوں کر کے دیکھیں، میرا خیال ہے کہ اس امتحان کے بعد ہر شخص کو یہ کہنا پڑے گا کہ:۔ سارے کہلوست از بہارش پیدا است۔ پندرہ برس کے لڑکے کا خیال تو آپ سن چکے اب دیکھئے کہ بہتر برس کا مشاق سخن کیا کہتا ہے اس سلسلہ کا واقعہ ہے کہ جب آئیر مرحوم نے میدر آباد کا سفر کیا جو یقیناً ان کا سفر آخرت تھا تو راہ میں ایک مسدس اعلیٰ حضرت حضور نظام کی مدح میں تصنیف فرمایا تھا جو چھپ چکا ہے اور وہ بھی ان کا آخر کلام سمجھا جاسکتا ہے لیکن حقیقتاً اس کے بعد بھی انہوں نے ایک غزل کے چند شعر کہے تھے جس کا مقطع جو حقیقت میں آئیر مرحوم کی شاعری کا مقطع ہے ان کا انتہائی کلام ہے اور وہ یہ ہے کہ

شاعری میں آئیر کی خاطر
میر اپنی زبان چھوڑ گئے

افسوس ہے کہ تیرے زمانہ کی زبان، خالی باتیں رہ گئی ہیں اس لئے مجھے استاد مرحوم کا یہ کہنا کسی طرح نہیں بھولنا کہ:۔

ہے آج جو سرگزشت اپنی
کل اس کی کہانیاں نہیں کی

(اُردوئے معلیٰ نومبر سلسلہ ۱)

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عظیم النظیر افسانہ جو آرزو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان و تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی ہندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرہ

زبان اور رسم الخط

(فرمان فقہوری)

پروفیسر اشتام صاحب کی یہ تحقیق کہ ”زبان اور اس کے رسم الخط میں کوئی باطنی تعلق نہیں ہے“ اور ”کسی زبان کو دوسری زبان کے رسم الخط پر لکھنے سے اس کی ہیئت و حقیقت پر اثر نہیں پڑتا“ میرے نزدیک صداقت سے عاری ہے اور پروفیسر موصون نے جو نتائج مرتب فرمائے ہیں ان میں غلطی سے کیا گیا ہے کیونکہ اکثر مقامات پر ان کی تحریر خود ان کے دعووں کی تردید کرتی ہے

”زبان نام ہے مجموعہ الفاظ کا اور الفاظ مرکب ہیں اصوات سے۔ اصوات نام ہے ان تصاویر۔ خطوط۔ نقوش۔ علامات یا نشانات کا جو ارتقا کی مثال ہے کہ آج حروف کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں اور ان کا مقصد اسوائے اظہار معنی کچھ نہیں ہے۔ مدیر نگار نے اشتام صاحب کے مضمون پر تعارفی نوٹ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ”رسم الخط نام ہے چند نقوش کا جو تلفظ کے ادا یا اظہار کے لئے فرض کر لئے گئے ہیں“ اس تعریف میں ایک بڑی کمی ہے وہ یہ کہ رسم الخط کو تلفظ کے ساتھ اظہار معنی کا بھی وسیلہ نہیں قرار دیا گیا

زبان کے آغاز میں جب کوئی آواز کسی کے منہ سے نکلی ہوگی تو آواز فیہ والے نے اپنے مقصود و خیال کو سامع تک پہنچانے کے لئے نئے مقصود و مجسمہ پیش کی ہوگی یا مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے اشاریہ کی تصویر یا اس سے مناسبت رکھتے والے خطوط و نقوش بنائے ہوں گے مرنی اور خارجی اشیا کے اظہار کیلئے جو آوازیں نکلی ہوں گی ان کے ابلاغ میں چندال سہولت رہی ہوگی لیکن غیر مرنی اور داخلی کوائف کو سمجھانے کے لئے بڑی دشواریاں پیش آتی ہوں گی آج بھی ہم خارجی اثرات کو سمجھانے اور سمجھنے میں اتنی دقت محسوس نہیں کرتے جتنی امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ کو سمجھانے میں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف احساسات (مثلاً عشق۔ حس۔ غمش۔ غم۔ غصہ وغیرہ کے معنی کا تعین ہو سکا اور نہ آج تک ان کی جامع اور متفقہ انجیال تعریفیں مرتب ہو سکیں جب

ہم اس مسئلہ کو عقل و فکر کے میزان پر تولتے ہیں تو صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ احساسات (feelings) و جذبات (emotions) کے اظہار معنی کے لئے بھی کوئی نہ کوئی نقش یا تصویر ہی بنائی گئی ہوگی۔ اس طرح خارجی اور داخلی کوائف کے مطابق کا اظہار صرف نقوش یا حروف سے ممکن تھا آج بھی ادارے معنی کے لئے حروف استعمال کئے جاتے ہیں اور انھیں حروف کا دوسرا نام رسم الخط ہے۔ پروفیسر اشتام صاحب بھی زبان کے Orthography

تاریخ۔ ارتقا و تعمیر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”الفاظ خیالوں لمفطی۔ یا صوتی علامات کہے جاسکتے ہیں اور ان کی تصویریں تحریری علامات۔ اس تحریری علامات کا مقصد کسی آواز یا آوازوں کے مجموعہ یا خیال کی طرف ذہن کو منتقل کرنا ہے۔۔۔۔۔ تصویریں تحریری خیالات کی علامت مقرر کرنے کی ابتداء کو شش تھی۔۔۔۔۔ لیکن جب انسانی ذہن استوار ہوا اور اس کی تحریری طاقت بڑھی تو اس نے آوازوں کی علامتیں مقرر کرنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔

اور خیال کیا جاتا ہے کہ حروف تہجی انھیں تصویریں تحریروں کی ارتقائی شکل ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف کوئی نہ کوئی معنی رکھتا ہے اور ان کی ابتدائی شکل اس مفہوم یا معنی سے صدیء جاہلیت رکھتا ہے۔ اشتام صاحب کی اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی میری طرح حروف یا رسم الخط کو اولے تلفظ و معنی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس حقیقت سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زبان اور اس کے رسم الخط میں معنوی تعلق ہے۔ نہ کہ ”ان میں کوئی باطنی تعلق نہیں ہے“ میں سمجھتا ہوں کہ اشتام صاحب نے دائرۃ انجام کار کو نظر انداز کر دیا ہے اور خواہ مخواہ اس مسئلہ کی بحث کو طول کیلئے کا موقع دیا ہے

نے اپنے مقالہ (نگار گشت سلاش) میں اس بحث کو آگے بڑھانے پر زور دیا ہے اور حروف کے متعلق ایک دوسرا نظریہ پیش کر دیا ہے۔ انسان نے جب زبان
 نیکیا تو اول اداسے مطلب کے لئے مختلف الفاظ وضع کر لئے اور ان سے کام لیتا رہا۔ عرصہ دراز کے بعد یہ مختلف معاشرتی ضروریات سے مجبور ہو کر
 قریب قریب ایجاد کرنا چاہا تو اس کو سب سے پہلے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جو الفاظ وہ بولتا ہے ان کا تجربہ کر کے معلوم کرے کہ وہ سب کتنی مختلف
 آوازوں سے مرکب ہیں اور اس طرح وہ آوازیں ہر زبان میں ہیں اور تین کے درمیان نکلیں (اس تعداد میں ایک دو یا تین کے علاوہ کہیں اشتراک
 نہیں ہے) اُس نے ان تمام آوازوں کی علیحدہ شکلیں وضع کر لیں اور ان شکلوں کے علاوہ نام بھی رکھ لئے۔ اس مسئلہ میں سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے
 کہ مختلف ملکوں کے رہنے والوں نے زبان سے نکلی ہوئی آوازوں میں بہت کچھ اختلاف پایا۔ جیسا کہ ہم مختصر اپنے گزشتہ مقالہ میں ظاہر کر چکے ہیں۔ عرب
 اور فارس میں ہمیں اتنی ہی گراں کے بالکل ہی قریب دوسری آواز ہے۔ اس کا پتہ نہیں چلتا۔ ہندوستان اور انگلستان میں ک ہے
 اور ت موجود نہیں۔ یہی حال د اور ڈ۔ تہ اور تہ کا ہے۔ اچھ کی تعمیر احوال، آب و ہوا، خلق و زبان کی سادگی، مشاغل زندگی، مذاق و عین
 اور رجحان طبعی سے مجموعی طور پر ہوئی ہے۔ اس میں انسان کے تصور و ارادہ کو مطلق دخل نہ تھا، زبان و رہنمائی کو ہم الفاظ کی بنیاد کہتے ہیں۔
 ان میں تیسری یا کئی کرنا زبان کو بدل دینے کے مترادف ہے۔ انھیں آوازوں کو جو انسان کی زبان سے ادا ہوتی تھیں بعد کو مختلف اشکال (یعنی حروف) کے
 ساتھ وابستہ کر دیا گیا اور اس طرح زبان اور رسم خط دونوں کی بنیاد ساتھ ساتھ پڑی

حروف کی ان تحریری شکلوں نے ایک طرف ان تمام آوازوں کو محسوس شکل عطا کر دی اور دوسری طرف اس کا موقع فراہم کر دیا کہ زبان ترقی
 کے مواقع ملے کرے، ظاہر ہے کہ مختلف قوموں نے حروف کی مختلف شکلیں وضع کیں اور اگر اس میں نفسیات کا دخل بھی تسلیم کیا جائے تو یہ مختلف قوموں
 کے اختلاف مذاق و ذہنیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ابتدائی عربی رسم الخط میں حتیٰ کہ خط کوئی تک میں دو اور موجود نہیں ہیں۔ دوائر کی ابتدا خط نسخ
 سے ہوئی ہے۔ موجودہ انگریزی رسم خط اور بعض دیگر خطوط میں دوائر ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ حروف کی شکلیں اس طرح وضع کی گئیں کہ وہ ایک دوسرے
 کے ساتھ ملائے جاسکیں۔ مثلاً عربی کے پ اور آ کو باہمی ترکیب دیکر کہا جائے گا تو ”با“ ہوگا اگر عربی کے ب اور انگریزی ت کو باہمی ترکیب لے
 جانے کی کوئی صورت نہیں۔ اسی طرح دیوناگری حروف کے ساتھ اور کسی زبان کے حروف نہیں ملائے جاسکتے۔ عربی سب سے پہلے حیرت انگیز رسم خط میں لکھی جائے
 تھی۔ اس کے بعد خط کوئی اختیار کر لیا گیا اور تقریباً دوسری یا تیسری صدی ہجری میں خط نسخ وضع ہوا اور اس کے بعد جیسے جیسے قوم کا مذاق کھڑا کیا
 مختلف اقسام کے خطوط وضع ہوتے گئے۔ نستعلیق، قطر، شفیقہ، فردوسیہ، شکستہ وغیرہ وغیرہ۔ عرب کی تہذیبی اور معاشرتی ترقی کی مکمل تاریخ بتا
 سکتے ہیں اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسم خط کی ترقی میں قومی نفسیات کا کتنا دخل ہے۔ عرب کی سادہ مزاجی تقریباً بنو امیہ کے اخیر دور تک باقی رہی اور
 اس وقت تک عرب صرف اسلامی احکام و ادارے سے واقف تھے۔ ہارون رشید اور مامون اعظم کے عہد میں دیگر علوم و فنون بھی عربوں نے سیکھے شروع
 کئے اور ایرانی قوم کے مسلمان ہو جانے کے بعد ان سے میل جول کے باعث عرب قوم میں تکلفات اور نثرانگیت پیدا ہونا شروع ہوئی اور قومی ذہنیت
 کے اس تبرک کا اثر رسم خط پر بھی ہوا اور خط نسخ ایجاد کیا گیا جس میں دوائر پیدا ہوئے اور اشکال حروف نستعلیق سے قریب تر ہو گئے۔ اس تمام بحث
 و مباحثہ کا یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ ہر قوم کے رسم خط میں اس قوم کی مخصوص ذہنیت اور انفرادی قومی نفسیات لازماً شامل ہوتی ہے اور زبان کی تعمیر
 بھی اسی قومی نفسیات کے تحت ہوتی ہے۔ جس طرح رسم خط ایک قوم کے نفسیاتی احوال اور مذاق و رجحان کا پتہ دہہ ہوا کرتا ہے وہی حالت زبان
 کی بھی ہے اور ہم نے اپنے گزشتہ مقالہ (نگار گشت سلاش) میں اس امر کو واضح کیا تھا کہ ایک زبان کو صرف اسی کے مخصوص رسم خط میں لکھا جاتا
 ہے اور چونکہ زبان کی تعمیر میں قومی نفسیات شامل ہے اس لئے لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ رسم خط میں بھی وہی نفسیات کا اثر ہوگا۔ عربی رسم خط
 جو مختصر نویسی کی صفت موجود ہے وہ غالباً دنیا کے کسی دوسرے رسم خط میں نہیں ہے، اس سے قومی نفسیات کا رسم خط میں دخل صاف ظاہر ہے
 اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ رسم خط اس قوم کی ذہنی خصوصیات اور قومی نفسیات سے وابستہ ہوتا ہے تو پھر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ رسم خط
 کی ترقی میں بھی مدد و معاون ہوتا ہے

سب سے پہلی چیز جو ہم سے متعلق ہے وہ مختلف زبانوں کے مختلف حروف ہیں۔ عربی کا تاجیب انگریزی رسم خط میں لکھنے کی کس صورت پیش آتا

ہے تو (The) لکھتے ہیں۔ حالانکہ خود انگریزی زبان میں (The) کا تلفظ دو طرح ہوتا ہے ایک (دہہ) جیسے *the* میں ہے۔ دوسرے دال کی آواز دیتا ہے جیسے *the* میں۔ عربی میں اس کی جواز ہے اس کے لئے انگریزی میں مسلم طور پر کوئی حرف موجود نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ترکی کے سلطان عثمان کو انگریزوں میں *Mehmed* لکھا ہے۔ بعض معمولی درجہ کے مصنفین تا کوئی بھی کہتے ہیں جیسے *Osman* میں کوئی صحیح اطلاق نہ تھا نظر نہیں آتا اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریز قوم عربی کے حرف تاء کا صحیح تلفظ ادا کر ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح عربی کا قافہ جسکو انگریزی رسم خط میں *Kh* سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس *Kh* سے جو آواز اصولاً پیدا ہونا چاہئے وہ حرف "کھ" سے ادا ہوتی ہے۔ درہ خیر کہ انگریزوں میں *Mehmed* کہتے ہیں اور گفتگو میں بھی بجائے "خیر" کے "کھیر" کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہر قوم تلفظ ہی کے اصول پر حرفوں وضع کرتی ہے اور حرفوں اس قوم کی زبان کو اس کے اپنے اصلی احوال پر قائم رہنے اور ترقی دینے کا باعث ہوتے ہیں۔ بہر حال اگر تلفظ زبان کی ترقی کا باعث ہے تو رسم خط کو بھی یقیناً ترقی کا باعث ہونا چاہئے۔

لے بات یہ نہیں ہے بلکہ دو ترکی زبان میں عثمان کا تلفظ عثمان ہے اور انگریزی مصنفین انھیں کے تلفظ کے پیش نظر عثمان کو *Mehmed* لکھتے ہیں (دہا)

ایک قدیم کتب خانہ کی بعض نادر کتابیں

غیاث اللغات مطبوعہ ۱۸۶۳ء (فارسی) - - - - - چار روپیہ	ترجمہ کلیات دمعالمات - - - - - پندرہ روپیہ
سواطع الالہام از فیضی (عربی) - - - - - سات روپیہ	بحر مجید - حکیم اصغر حسین فرخ آبادی - - - - - آٹھ روپیہ
نخب اللغات دارالشفی (فارسی) - - - - - سات روپیہ	تشریح کبیر حکیم محمد کبیر الدین دہلوی - - - - - بارہ روپیہ
علم ہنر و شہدہ جات (اردو) - - - - - چار روپیہ	لاب التشنیص مکمل - - - - - آٹھ روپیہ
فتویٰ یوسف زینما حامی (فارسی) - - - - - تین روپیہ	اسرار مکتب از حکیم محمد عبدالعزیز لاہوری - - - - - چار روپیہ
مصدق الریل، انوار الریل (فارسی) - - - - - سات روپیہ	طب کی فارسی کتابیں
مرانی انیس - - - - - چھ روپیہ	قرابادین کبیر مکمل حکیم - - - - - سولہ روپیہ
نالا عندلیب (فارسی) - - - - - آٹھ روپیہ	مجموعات فرنگی (از ہنری پرکیٹر) - - - - - پندرہ روپیہ
ترجمہ حقائق البلاغت (اردو) - - - - - تین روپیہ	فخری الادویہ مع تحفۃ المؤمنین از حکیم محمد حسین علوی شیرازی - - - - - دس روپیہ
علم الکتاب خواجہ درد (فارسی) - - - - - چھ روپیہ	محیط اعظم مکمل از حکیم محمد اعظم خاں دہلوی - - - - - پچیس روپیہ
ترجمہ کلیات انجیلی مکمل - - - - - سولہ روپیہ	اکسیر اعظم - - - - - چونتیس روپیہ
ترجمہ قانونی پولی سینا مکمل - - - - - تیس روپیہ	مفرغ القلوب - مفید الاحسام (علم جراحی) - - - - - بارہ روپیہ
کتاب مکتب مکمل - - - - - دس روپیہ	علاج الامراض از حکیم محمد شریف خاں دہلوی - - - - - آٹھ روپیہ
مختصران المفردات - - - - - چار روپیہ	مختصر اکسیر مکمل - جلد از حکیم امام الدین پاک پٹن - - - - - دس روپیہ
امراض چشم - - - - - پانچ روپیہ	قرابادین اعظم از حکیم محمد اعظم خاں دہلوی - - - - - پندرہ روپیہ
	قرابادین قادری از حکیم محمد اکبر ازراقی - - - - - بارہ روپیہ

نگار - ایک ہی لکھنو

باب الاستفسار

علم جعفر

(جناب سید دل محمد رضا جالندھری - خانیوال، ملتان)

بعض اصحاب علم جعفر کو امام جعفر صادق سے منسوب کرتے ہیں اور بعض حکماء کا خیال ہے کہ یہ علم حضرت دانیال کے ذریعہ دنیا میں پہلا ہوا کہم نگار کے ذریعہ تفصیلی روشنی ڈالے اور اس کے وضعی اصولوں پر بھی یہ حاصل بحث فرمائیے تاکہ حکم کلانے کا طریقہ معلوم ہو سکے

(نگار) علم جعفر (جعفر نہیں) کے متعلق عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے موجد و مخترع امام جعفر صادق تھے، اور بعض نے دانیال نبی کا نام بھی اس سلسلہ میں لیا ہے۔ دانیال کا ذکر عیسوی لکڑیچر میں تو بیشک پایا جاتا ہے لیکن اسلامی لکڑیچر میں بہت کم۔ اور اگر پایا بھی جاتا ہے تو اس کی حیثیت ایسی نہیں کہ انھیں کوئی نبی تصور کیا جائے۔ طہریتی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دانیال ان قیدیوں میں سے ایک تھے جو تخت نصر کے زمانہ میں بیت المقدس گرفتار کر کے لائے گئے تھے اور چونکہ آدمی بہت ذی فہم تھے اس لئے رفتہ رفتہ وہ وزارت کے عہدہ تک پہنچ گئے مسعودی نے مروج الذهب میں دو دانیال کا ذکر کیا ہے، پہلے اور بڑے دانیال کا زمانہ اس نے قوت اور ابراہیم کے درمیان کا زمانہ بتایا ہے اور انھیں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پیشین گوئیاں کرتے تھے اور انھیں پیشین گوئیوں کا مجموعہ کتاب جعفر کے نام سے انھوں نے مرتب کیا تھا۔ رہا امام جعفر صادق سے جعفر کو علمی و فنی حیثیت سے منسوب کرنا، یہ بھی کوئی صحیح تاریخی حقیقت نہیں معلوم ہوتی۔ اس ظن و قیاس کا سبب غالباً وہ روایت ہے جو شیعت کے ابتدائی زمانہ میں رواج پانگنی تھیں

جب شیعت کی سیاسی تحریک کو زیادہ مضبوط و پائیدار بنانے کے لئے اس کو مذہبی رنگ دیا گیا تو اس سلسلہ میں منجہ اور بہت سی روایات کے اس روایت کی بھی نشر و اشاعت کی گئی کہ خاندانہ حضرت علیؑ کے تمام افراد کو جو خطا و عیسیاں سے پاک ہیں علم لدنی حاصل ہے اور وہ تمام اہل واقعات باخبر ہیں جو قیامت تک دو نما ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ایک ایسی کتاب کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جس میں حضرت علیؑ نے قرآن کے یہاں گھر بھیج منہم کو ظاہر کیا تھا۔ الغرض حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کے متعلق شیعوں میں یہ عقیدہ عام طور پر رائج ہو گیا تھا کہ وہ غیب کے حالات جانتے ہیں اور یہ سب کچھ کتابی شکل میں ایک کے بعد دوسرے کو منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے

تیسری صدی ہجری میں بشر بن الحارث معتزلی نے ظاہر کیا کہ اس کتاب کو وہ جعفر کے نام سے موسوم کرتے ہیں، دوسری صدی ہجری میں کتاب الحارثیوں میں اہل قصبہ کی کتاب ادب الکاتب کے حوالہ سے ظاہر کیا ہے کہ جعفر ایک کتاب تھی جسے جعفر بن محمد صادق (جیسے امام) نے مرتب کیا تھا جس میں قیامت تک کی تمام پیشین گوئیاں درج تھیں۔ اس کتاب کا نام جعفر اس نے قرار پایا کہ وہ کبریٰ کے بچہ کی کھال پر لکھی گئی تھی (جعفر عربی میں کبریٰ کے بچہ کو کہتے ہیں) لیکن حیرت کی بات ہے کہ ابن عساکر نے اپنی فہرست میں امام جعفر صادق کا بہت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ علم الکلیسیا کے ذکر کے سلسلہ میں وہ جابر بن حیان کے نام کے ساتھ ان کا نام بھی لیا ہے، لیکن جعفر نامی کتاب کا کوئی ذکر نہیں کرتا

اصل قصہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں (جس کا ابھی میں نے ظاہر کیا) شیعہ جامعہ پیشین گوئیوں کی متعدد کتابوں کے وجود کی قابلِ غرض نہیں وہ

ایم کہتے تھے۔ انہیں جس سے ایک کتاب جعفر بنی، دوسری جامعہ اور تیسری مصحف قاطر
 یہ عقیدہ کہ ائمہ معصومین عجب کے حالات سے واقف تھے مختلف طریقوں سے رائج کیا گیا۔ چنانچہ ایک شیعی مورخ لکھتا ہے کہ جب امامون الرشید نے غلام
 اسی رضا کو اپنا جانشین مقرر کیا تو انھوں نے امامون کو لکھا کہ ”جعفر امام جعفر بنی کے رو سے یہ نامزدگی ناممکن (اصل معلوم ہوتی ہے)“
 اس سلسلہ میں موجدین کی روایت بھی سن لیجئے، وہ کہتے ہیں کہ ان کا ہمدی، غزالی کا محبوب شاگرد تھا اور غزالی کے پاس جعفر کی کتاب موجود تھی۔ یہ بھی
 جاتا ہے کہ غزالی نے جعفر بنی کی رو سے ابن قنات کے درختان مستقبل کی پیشین گوئی کی تھی اور مرتے وقت یہ کتاب ابن قنات ہی کو دیدی تھی۔ لیکن اس سلسلہ
 ابن خلدون اور البیرونی کی رائیں زیادہ مستند معلوم ہوتی ہیں۔ بیرونی امام جعفر صادق کا بڑا عمار تھا، لیکن اس نے جعفر کو ان سے کہیں منسوب نہیں کیا۔
 ابن خلدون لکھتا ہے کہ ”جعفر بھی ملائیم کے سلسلہ میں ایک کتاب رہی ہوگی جسے امام جعفر صادق نے مرتب کیا ہوگا۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔“
 ابن خلدون نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہارون بن سعید الاجلی کے پاس امام جعفر صادق کی ایک کتاب جعفر کا ہونا بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کا بھی کوئی ثبوت
 نہیں ہے۔ البتہ حمد ہارون الرشید کے ایک منجم یعقوب بن اسحاق الکندی کی ایک کتاب جعفر کا ذکر ضرور اس نے کیا ہے، جس میں علم نجوم کی رو سے کچھ پیشین گوئیاں
 کئی تھیں لیکن یہ کتاب بعد کو ناپید ہو گئی

یہی جعفر کی تاریخی حیثیت جس سے صحت استنباط چلتا ہے کہ ممکن ہے یہ ملائیم کے قسم کی پیشین گوئی کی کوئی کتاب رہی ہو، جسے شیعی حضرات امام جعفر صادق
 سے منسوب کرتے ہیں، لیکن اس کی فنی حیثیت پر اس عہد کے کسی مورخ نے کچھ نہیں لکھا۔ بعد کو لوگوں نے جبکہ علم الحروف اور حروف ابجد کے اعداد سے اس کا
 ملق قرار دیا اور رفتہ رفتہ جعفر علم سیمیا کی ایک شاخ قرار پائی، اگر ان خلدون نے علم سیمیا کی بحث میں کہیں جعفر کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں،
 نجد کے حروف یا اس کے اعداد سے نتائج کا استخراج یا مستقبل پر علم لگانا یہ بھی صحت میں عقیدہ کی بنا پر تھا کہ قرآن چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے
 ربی حروف بھی بڑی متحرک چیز ہیں اور یہاں تک کہ ان کے اعداد کے پیش نظر پیشین گوئی بھی کی جاسکتی ہے۔ جعفر دراصل دونوں تقریباً ایک ہی قسم کی خبریں
 بیان اور ان کے ساقط الاعتبار ہونے کا سبب بڑا ثبوت یہ ہے کہ دونوں نقشے جارہے ہیں اور غالباً نصف صدی کے بعد ان کو لوگ بالکل بھول جائیں گے۔

”نگار“ کے پُرانے متفرق پرچے

- ۱۔ ۲۲ = مارچ ۱۲ - اپریل ۸ - مئی ۸ - اگست ۸ - ستمبر ۸ - اکتوبر ۸
 ۲۔ ۲۲ = اپریل ۱۲ - اگست ۸ - ستمبر ۱۲ - اکتوبر ۱۲ - نومبر ۱۲
 ۳۔ ۲۲ = فروری ۱۲ - مارچ (انتقالِ خیر) ۸ - اپریل ۱۲ - اگست ۱۲ - ستمبر ۱۲
 ۴۔ ۲۲ = ستمبر ۱۲ - اکتوبر ۱۲ - نومبر ۱۲
 ۵۔ ۲۲ = جنوری (راہدین نمبر) ۸ - مارچ ۱۲ -
 ۶۔ ۲۲ = اگست ۱۲ - ستمبر ۸ - اکتوبر ۸ - دسمبر ۸
 ۷۔ ۲۲ = جنوری، فروری (پاکستانی نمبر) ۸ - مارچ ۱۲ - مئی ۱۲
 ۸۔ ۲۲ = جولائی ۸ - اگست ۸ - ستمبر ۸ - نومبر ۸ - دسمبر ۸
 ۹۔ ۲۲ = جنوری، فروری (افسانہ نمبر) ۸ - مارچ ۱۲ - جولائی ۱۲ - ستمبر ۱۲
 ۱۰۔ ۲۲ = جنوری، فروری (تقدیر نمبر) ۸ - مارچ ۱۲ - اپریل ۸ - مئی ۱۲
 ۱۱۔ ۲۲ = جولائی ۸ - اکتوبر ۸ - نومبر ۸ - دسمبر ۸
 ۱۲۔ ۲۲ = جنوری، فروری (نمبر نگار) - اکتوبر ۸

- ۱۳۔ ۲۲ = جنوری (فرات القریہ) ۸ - جولائی ۸ - اگست ۸ -
 اکتوبر ۱۲ - نومبر ۸ - دسمبر ۸
 ۱۴۔ ۲۲ = فروری ۱۲ - مئی ۱۲ - جولائی ۱۲ - ستمبر ۱۲ -
 ۱۵۔ ۲۲ = جنوری، فروری (صحابہ کرام) ۸ - مارچ ۸ -
 مئی ۱۲ - جون ۸ - جولائی ۱۲ - اگست ۱۲ -
 ۱۶۔ ۲۲ = جنوری (تاریخ اسلامی ہند) ۸ - فروری ۱۲ -
 اپریل ۸ - مئی ۱۲ - دسمبر ۱۲ -
 ۱۷۔ ۲۲ = جنوری (دستخط نمبر) ۸ - فروری ۸ - مارچ ۸ -
 اپریل ۸ - اکتوبر ۸ -
 ۱۸۔ ۲۲ = فروری ۸ - مارچ ۸ - اپریل ۸ - مئی ۸ - اگست ۸ -
 ستمبر ۸ - اکتوبر ۸ - نومبر ۸ - دسمبر ۸
 ۱۹۔ ۲۲ = مئی ۱۲ - دسمبر ۱۲ -

اقتباسات

آئس کریم کی قدامت تاریخی نقطہ نظر سے آئس کریم بڑی پرانی چیز ہے اور اب سے پانچ ہزار سال پہلے کی تاریخ میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ نیرونی اور سکندر اعظم سفر و حضر، صلح و جنگ ہر موقع پر اس کا استعمال کرتے تھے۔

عہد قدیم میں امراء و سلاطین کے لئے آئس کریم طیار کرنا آسان نہ تھا۔ سیکڑوں غلام برتن پرش پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا کر وہاں سے مکلوں اور نندوں میں لپیٹ کر برتن کی سلیں لاتے تھے اور دودھ، شراب اور شہد کو ذیل میں بھر کر برتن کے اندر ان کو اتنا گھاتے تھے کہ وہ بخود ہو جاتے تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب سکندر نے ہندوستان اور باختر پر تاخت کی تھی تو وہ اتنا کرنا آئس کریم کھا یا کرتا تھا

سقراط دم کے وقت تک وہاں اس کا استعمال امراء کے لئے مخصوص تھا اور قرون وسطیٰ میں بادریوں نے اس کا استعمال ناجائز قرار دیا۔ سب سے پہلا وہ شخص جس نے اٹلی میں اس کو زیادہ رائج کیا سیاح مارکو پولو تھا۔ اس کا بیان ہے کہ یہ صنعت اس نے اہل چین سے سیکھی تھی چین کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ولادت مسیح سے تین ہزار سال قبل وہاں اس کا رواج عام تھا اور جب مارکو پولو وہاں پہونچا تو اس نے دیکھا کہ یہ چیز عام طور پر بازاروں میں فروخت ہوتی ہے

مارکو پولو نے یہ صنعت صرف بادشاہوں کے بادریوں کو سکھائی اور اس کو اتنا راز میں رکھا کہ اس کے دو سو سال بعد یورپ میں اس کی یاد بھی لوگوں کے دلوں سے محو ہو گئی یہاں تک کہ جب کیتھرائن کی شادی ہنری دوم کے ساتھ ہوئی تو اس کے جبین میں آئس کریم بنانے کا نسخہ بھی دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہنری دوم کو اس سے زیادہ دنیا میں کوئی چیز محبوب نہ تھی۔ وہ جائے گرمی ہر موسم میں اس کا استعمال کرتا تھا۔ اور اسی کے دوبارے یہ صنعت فرانس کے عوام تک پہونچی

انگلستان میں اس کے ایک صدی بعد اس کا رواج ہوا جس کی ابتدا شارمل اول سے ہوتی ہے (جس کا سر پارلیمنٹ کے حکم سے قطع کیا گیا تھا) ایک دن اس نے اپنے اطالوی بادری سے کہا کہ آج کوئی ایسی نئی چیز طیار کرو جو بہت لذیذ ہو۔ اس نے آئس کریم طیار کر کے پیش کی اور بادشاہ اتنا خوش ہوا کہ اس سے حلف لیا کہ اس کا نسخہ کسی کو نہ بتائے گا۔ لیکن جس وقت جلاوطنے شارمل کا سر قطع کیا اور لوگ جوق درجوق تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تو اطالوی بادری نے اس کا نسخہ گراں قیمت پر فروخت کر دیا

اس وقت امریکہ میں اس کا رواج اتنا عام و ترقی یافتہ ہے کہ اگر اسے آئس کریم کھانے والوں کا ملک کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کا سالانہ صرف وہاں ۲۳ کروڑ گرام سے کم نہیں ہے اور وہاں کی ہر یونیورسٹی میں اس صنعت کی تعلیم ہوتی ہے اور اس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی دیا جاتی ہے

وہاں آئس کریم بازاروں کے علاوہ دو خانوں میں بھی ملتی ہے اور ایک اچھے آئس کریم بنانے والے کی تقاضا وہاں ۱۰۰ ڈالر ماہانہ سے کم نہیں ہوتی

امریکہ میں آئس کریم بنانے کے کارخانے دیکھنے کی چیز ہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں جن کا درجہ حرارت صفر سے بھی ہر درجہ کم ہوتا ہے، طیار کی جاتا ہیں اور یہاں کام کرنے والے سردی سے محفوظ رہنے کے لئے قطب شمالی کی رہنے والی قوموں کا لباس پہن کر اندر داخل ہوتے ہیں۔ ان کو روزانہ ۸ گھنٹے معمولی کا تیل بھی دیا جاتا ہے تاکہ ان کی صحت خراب نہ ہو

امریکہ میں تقریباً ۱۰۰ قسم کی آئس کریم طیار ہوتی ہے، اور تازہ ترین اختراع اس سلسلہ میں یہ کی گئی ہے کہ آئس کریم کے کیک نہ بنائے کی ذائقہ

سفیدی چھینٹ کر پھیلا دیتے اور پھر اس کو ایک گرم دیگ کے اندر رکھ کر فوراً نکال لیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالائی سطح تو گرم ہو جاتی ہے لیکن اٹلے کی سطح کے نیچے جب چمچ جاتا ہے تو اسے وہی منجمد آتش کرم ملتی ہے

اہل ایران اور موسیقی اس میں شک نہیں کہ فن موسیقی پر ایران ہندسے بہت کچھ لکھا ہے اس نوع کے قدیم لٹریچر میں اسحاق موصی (۷۲۳ھ) کی کتاب الفہم والايقاع اور سرخسی (۷۵۰ھ) کی کتاب "الموسیقی الکبیر" خاص شہرت رکھتی ہیں

ان کے بعد ابن خردادبہ (۷۷۳ھ) نے ایک کتاب اسی فن پر لکھی جس کا نام "کتاب الملہود والملاسی تھا۔ مروج الذهب میں بھی ان تقریروں کا ذکر موجود ہے جو المعتز خلیفہ عباسی کے حضور میں ابن خردادبہ نے فن موسیقی پر کیا کرتا تھا۔ ان کے بعد مشہور طبیب ابو بکر رازی (۸۰۵ھ) نے بھی ایک کتاب موسیقی پر لکھی تھی اور فارابی (۸۵۰ھ) کی کتاب الموسیقی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران نے اس فن میں کتنی ترقی حاصل کی تھی جس کا ثبوت ابو حنیفہ خوارزمی کی کتاب مفاتیح العلوم سے بھی ملتا ہے

شیخ الرئیس ابو علی سینا (۱۰۳۷ھ) نے بھی کتاب "النجاة" فن موسیقی پر لکھی جو اب بھی بعض کتب خانوں میں پائی جاتی ہے ابن سینا کے ایک شاگرد ابن زبیر (۱۰۷۷ھ) کی "کتاب الکافی فی الموسیقی" کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے جس میں اس نے ایرانی و خراسانی موسیقی کا تفصیلی ذکر کیا ہے

فخر الدین رازی (۷۷۷ھ) نے بھی اصول فن موسیقی پر اپنی کتاب جامع العلوم میں بہت کچھ لکھا ہے۔ رازی کے بعد ناصر الدین طوسی (۷۷۷ھ) نے عربی میں ایک رسالہ اس فن پر لکھا

ساتویں صدی ہجری کے وسط میں ایک بہت بڑا ماہر موسیقی صفی الدین عبد المؤمن پیدا ہوا (۷۹۳ھ) اور اس نے دو کتابیں لکھیں ایک کتاب الادوار، دوسری رسالۃ الشرح اس کی حیثیت ایک نایک کی سی تھی جس نے ایران کی قدیم موسیقی میں بہت کچھ اضافہ کیا اور موسیقی کا ایک مستقل اسکول اس کے نام سے قائم ہو گیا۔ اس کے بتائے ہوئے اصول موسیقی کی متعدد دلوگوں نے تفسیر و تشریح کی جن میں شرح مولانا مبارک شاہ (۷۹۷ھ) بہت اہمیت رکھتی ہے۔ قطب الدین شیرازی (۷۹۷ھ) نے بھی اپنی کتاب درۃ التاج میں اسی اسکول کی موسیقی کو بیان کیا ہے۔ اور محمد محمد دآبی نے بھی نفائس الفنون میں اس کا ذکر کیا ہے

اسی زمانہ میں عبد القادر بن غیبی المرافی (۸۳۳ھ) ایک اور ماہر موسیقی پیدا ہوا جو دربار تیمور و شاہ رخ سے وابستہ تھا۔ حاجی خلیفہ اور شرف الدین ہروی نے اسے اصول موسیقی کا بہت بڑا ماہر تسلیم کیا ہے، اس نے ایک کتاب فارسی میں جامع الاالحان کے نام سے لکھی (۸۷۱ھ) جس کا قلمی نسخہ جامعہ آکسفورڈ کی لائبریری میں موجود ہے، اس کے علاوہ تین کتابیں مقاصد الاالحان، شرح الادوار، کنز الاالحان اور بھی لکھیں جن میں سے اول الذکر دو کتابیں تو محفوظ ہیں لیکن تیسری کا پتہ نہیں چلتا۔ ابن غیبی کے بعد اس کے لڑکے عبد الغفر نے ایک کتاب نقادۃ الادوار اور اس کے پوتے نے مقاصد الادوار تصنیف کی

نویں ہجری کے بعد ایران میں کوئی بڑا نایک تو پیدا نہیں ہوا لیکن اوسط درجہ کے ماہرین دسویں اور گیارہویں ہجری میں بھی پائے جاتے تھے جن میں ایک ابو القاسم سعید تھا جو اخیر ہجری میں پایا جاتا تھا

اس زمانہ میں کچھ کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں ماہرہ المروج اور تعلیم النہات کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ شمس الدین محمد ہجری کی درالکظیم شیرازی کی نوامراتی قانیہ، جلال الدین ودائی کی اخلاق جلالی، شہاب الدین عجمی کی علم الاقلام اور احمد المسلم موصی کی درالکافی فن الموسیقی بھی قابل ذکر ہیں۔

فہرست

حضرت نیاز کا وہ معرکہ الاقلام جہاں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی کماحقہ حقیقت ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول منبجہ نگار۔ لکھنؤ

مراسلات

مخدومی ! ”نگار“ کی گزشتہ اشاعت میں جناب افسر سبانی کا مراسلہ میری نظر سے گزرا۔ مراسلہ کے مجموعی مخاطب فقہا صاحب ہیں۔ اور اصولاً انھیں کو اس کا جواب دینا چاہئے، لیکن لغز مضمون میں ایسی باتیں آگئی ہیں جن پر عمومیت کے ساتھ گفتگو کی جاسکتی ہے۔ مجھے فقہا صاحب کی طر فدار ی مقصود نہیں لیکن افسر صاحب نے جس جرم کی سزا پر شرول چھڑک کر دیا سلائی دکھانا ”جو بڑ کی ہے“ اسی جرم کے وہ خود بھی مرتکب ہوئے ہیں۔
تقلید، قواد اور سرقہ معنوی اعتبار سے تین مختلف چیزیں ہیں لیکن کسی شعر کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ شاعر ان تینوں میں سے کس چیز کا مرتکب ہوا ہے، دشوار امر ہے۔ کیونکہ اساتذہ کے دواوین میں بے شمار اشعار ایسے مل سکتے ہیں جن کے متعلق قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ لکھنے والے تقلید اور سرقہ کے مرتکب ہیں یا قواد ہو گیا ہے۔ خصوصاً جذباتی اور داخلی شاعری میں جذبات اور احساسات بڑی حد تک یکسانیت کے حامل ہوتے ہیں اور شاید یہی وجہ تھی کہ کسی شاعر کو سامنے رکھ کر مشق سخن کرنا موزن نہیں تصور کیا جاتا تھا بشرطیکہ لکھنے والے نے اس مضمون سے کوئی نیا پہلو پیدا کیا ہو یا اسی مضمون کو اپنے رنگ میں حسن طور پر ادا کیا ہو۔ اس سلسلہ میں افسر صاحب کے مندرجہ ذیل بیان کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ فرماتے ہیں ”اگر کوئی غالب یا اقبال کی تقلید کرتا ہے تو یہ بڑا بڑا کوئی قابل اعتراض بات نہیں بلکہ اس کے لئے ~~مستحق تعذیب~~ ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن اگر یہ پردہ تقلید وہ ان کے افکار و تصورات کا خاکہ اگلاتا ہے یا الفاظ و دیگر سرقہ کرتا ہے تو ایک ناقابل معافی جرم ہے۔“ بیان کو اذکم میرے لئے کو ناقابل فہم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو افسر صاحب تقلید اور سرقہ کے فرق کو نہیں سمجھتے یا ان کے ضمیر میں جو کتنا ہے اس کی بنیاد وہ خود فریبی کے کام لے رہے ہیں۔ میں افسر صاحب سے بعد ادب دریافت کرتا چاہتا ہوں کہ اقبال اور غالب کی تقلید کرنے ”اور ان کے“ افکار و تصورات کا خاکہ اگلاتے“ کا وہ کیا مفہوم لیتے ہیں؟ اگر اقبال کی تقلید سے ان کی افکار اقبال کے نظریات کی پیروی ہے تو یقیناً ذہین ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اقبال کو نہ صرف سمجھنا بلکہ اس کی پیروی بھی کرنا بلا شک و شبہ بہت بڑی بات ہے۔ لیکن یہ فرض ہے کہ نظریات تو مستعار لئے جاسکتے ہیں مگر طرز اور اسلوب پر ڈاک نہیں ڈالا جاسکتا۔ تقلید کے ~~مستحق تعذیب~~ ہونے کی دلیل اُسی وقت ہو سکتی ہے جب کچھ کا پٹا ڈھنگ اور اپنا اسلوب ہو۔ اس کے بغیر اگر اقبال کے خیالات، اقبال ہی کی علامتوں اور اقبال ہی کے اسلوب پر بیان ہوں تو ”سرقہ“ میں تبدیل ہو جائے گا۔ بہترین مثال کے طور پر افسر صاحب کا بیشتر کلام پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس وقت نوشتا صرف سارا آئندہ معرے پیش کر رہا ہوں جو بغیر کسی کرد و کاوش کے افسر صاحب کی صرف دو ایک نظموں سے لئے ہیں:-

(افسر) پھر میں مشرقِ ماضی کے تختہ ناردل میں کسی پاش نہیں مرگ و زبیت کا مضمون

(اقبال) پھر میں مشرق و مغرب کے لالہ نادہل میں کسی جہن میں گر بیان لالہ چاک نہیں

(افسر) عفا ہوئی اب بے شبانہ (اقبال) باقی ہے کہاں بے شبانہ

(افسر) سکھ رہے ہیں بٹیروں کو طرز و اسلوب (اقبال) بہتر ہے کشیدوں کو سکھا دیں دم آہ

(افسر) وہ جس کو حق نے عطا کیا ہے سوسہ جذبِ قلندر (اقبال) وہ موردِ پیش میں کو حق نے عطا کیا ہے سوسہ جذبِ قلندر

اقبال :- کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

افسر :- بدل نہیں غلامی سے زندگی کی تمام تدریس

اقبال :- اس رہیں خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں

افسر :- کبھی سراغ نگار مٹی نہ پاسلیگا رہیں خانہ

اب مجھے صحت اتنا عرض کرنا ہے کہ اگر قضا صاحب اس جرم میں معذور قرار دے جائے تو پھر افسر صاحب کیوں بری قرار دے جائیں؟ میں اس مسئلہ کو آپ پر چھوڑتا ہوں کیونکہ مجھے آپ کی ادبی دیانتداری پر کامل بھروسہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ ایسے مسائل میں ذاتی تعلقات اور مراسم سے قطعاً ہٹ کر فیصلہ کریں گے۔ مجھے حیرت ہے کہ اپنی کمزوری کے باوجود افسر صاحب نے اتنی جرأت کیسے کی؟ نفس مضمون سے قطع نظر تحریر کا انداز بھی افسر صاحب کے متعلق کوئی خوشگوار تاثر نہیں چھوڑتا۔ افسر صاحب کا ابتدائی کلام (۱۹۴۵ء تک بھی) نوے فیصد ہی اقبال کا چرہ ہوتا تھا۔ اب بھی وہ اقبال کے جنگل سے نکل نہیں سکے ہیں، لیکن کم از کم اب ان کے کلام میں پختگی اور تھوڑی بہت انفرادیت ضرور آگئی ہے تاہم ان کا یہ مراسلہ ابھی ان کی ادبی اور ذہنی شعور کی ناچنگی ظاہر کرتا ہے۔ بہر حال اس سلسلہ میں آپ کے تاثرات کاشت سے انتظار رہے گا۔

محمود ایاز (بٹلور)

(نگار) آپ کو معلوم ہو کہ افسر صاحب کا خد میں نے بدلنا خواستہ شایع کیا تھا اور قطع نظر اس سے کہ قضا صاحب پر جو الزام انھوں نے قائم کیا تھا وہ اپنی جگہ درست تھا یا تا درست، ان کی تحریر کا بوجھ حد درجہ ناشرانہ ہوتا تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ ان کو اپنے اسرا طرز عمل کی ناپسندیدگی کا علم میرے علاوہ دوسرے حضرات کی طرف سے ہی ہو جانا چاہئے میں نے اسے شایع کر دیا تھا

آپ نے جو کچھ لکھا ہے میں اس سے بڑی حد تک متفق ہوں اور قضا ابن فیض اعظمی کے متعلق میں کبھی یہ خیال قائم نہیں کر سکتا کہ انھوں نے افسر کے کلام سے سرقہ کیا ہے۔ قضا صاحب نے اس وقت تک مجھے جواب میں کچھ نہیں لکھا اور میں ان کی اس خاموش سنجیدگی کی قدر کرتا ہوں۔

عورت اور تعلیمات اسلام

از مالک رام ایم۔ اے

تا واقعہ لوگوں کی طرف سے اسلام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسے عورت کی اصلاح اور اس کے حقوق کی حفاظت کا خیال نہیں کیا اور اسکو نوٹری کی حیثیت سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ مالک رام صاحب نے اس تصنیف میں بتایا ہے کہ اجماع سے بلکہ مذہب عورت کی اور اس کی زندگی کی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو اسلام نے ترک کر دیا ہو اور اس کا اقتدار قائم کرنے کی انتہائی تاکید کی ہو۔ اس کتاب میں عورت سے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس سے بحث نہ کی گئی ہو اور اس الزام کے ساتھ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف قرآن پاک ہی کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے، کتاب بنایت نفیس کاغذ پر پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ شایع کی گئی ہے۔ قیمت تین روپے علاوہ محصول۔ نگار بک کمپنی لکھنؤ

نگار جولائی ۱۹۵۷ء

ایک مستقل کتاب ہے جس کا نام ہے "۵۵ سال کے بعد"

یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ :-

زندہ رہنا بھی ایک فن ہے

اور اگر اس فن کو آپ نے سمجھ لیا تو پھر

۱۔ دنیا کا ہر رنج و الم آپ کے لئے بے معنی ہو جائے گا

۲۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات نو کا آغاز ہوگا

۳۔ آپ کی عمر طبعی کا سمیار بالکل بدل جائے گا

جم ۱۰ صفحات۔ قیمت ایک روپے ۱۰ روپے علاوہ محصول

نیچر نگار لکھنؤ

نئی شاہراہ

(سیدہ اختر)

میری نگاہِ شوق میں "اک نئی شاہراہ" ہے ! اک نئی شاہراہ کیا ؟ اک نئی جلوہ گاہ ہے !
 دیر و حرم جہاں نہیں، چٹکب این و آں نہیں ! لغو بہرِ بہمن نہیں، غفلتِ اذال نہیں !
 جس کا ہر ایک گام ہے منزل اسن و آشتی جس میں بجز یقینِ عشق، وہم نہیں گماں نہیں !
 جس میں رہیں جستجو قافلہٗ حیات ہے ! شام و سحر جہاں فقط تذکرہٗ نجات ہے !
 جس کے ہر اک نشیب میں جس کے ہر اک فراز میں اک نئی سرزمین ہے اک نئی کائنات ہے !
 دیکھ وہ صاحبانِ دل محوِ فحرامِ شوق ہیں ! نقشہٗ لبانِ جہد ہیں، بخود جامِ شوق ہیں !
 اُن کے پیام میں نہاں ایک نیا پیام ہے ! ایک شعورِ زلیت ہے ایک صلاحِ عام ہے !
 خطرہٗ پیش و پس نہ کر "نئی شاہراہ" میں ! جلوے ہیں، تیرے منظرِ منزلِ مہر و ماہ میں !

ٹیپو کے مزا پر !

(محمود آياز ہنگواری)

تو نے جس خاک کے ذروں کو جہاں تاب کیا وہ زمیں آج بھی بے لعل و گہر ہے ساقی
 تو نے جس شب کے اندھیروں میں اجالے ڈھونڈے وہ فضا آج بھی محرومِ سحر ہے ساقی
 لیکن اس ظلمتِ پیہم سے گراں بار نہ ہو وہ ذرا دور پہ اک صبح کی تنویر بھی دیکھ
 اس خانہٗ تاریک سے کچھ اور پرے اپنے ہر خواب کی رنگینیِ تعبیر بھی دیکھ

رزمِ ردولوی :-

محیطِ عشق میں کیا جانے حالت ہو کیا دل کی، سفینہ دیکھئے تہ کی خبر لائے کہ ساحل کی
 اسیری میں نشین کا زمانہ یاد کیا کرتے، قفس پر بھی جو پڑ جاتی کوئی افتاد کیا کرتے
 سکوت میں ہے سکوں، خاموشی میں لذت ہے، یہ اضطراب مرے دل نے کیوں پسند کیا
 ہمنفس یہ عالم گم گشتگی کے راز ہیں، یا گیا منزل کو میں یا پا گئی منزل مجھے
 مری مجبور یوں کا نام رکھ لو دوسری دُنیا، یہ کوئی فاصلہ ہے جو قفس سے آشیان تک ہے
 ابھی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے کارواں اپنا، ابھی لپیٹی ہوئی دامن سے گردِ کارواں تک ہے
 جہانِ عشق میں ہے اختیارِ ریاں مت پوچھ، بس ایک جبر پہ کچھ اختیار باقی ہے
 یہ لالہ زارِ مقتل، یہ ہوائے دامنِ تامل، سکوں سائل رہا ہے میند سی معلوم ہوتی ہے
 موت بھی کیا سمجھ کے آئی ہے، یہی دن تھے بہار آنے کے،
 عجیب راز ہے دیدارِ دوست کا عالم، بہت ہے ایک گھڑی ساری زندگی کم ہے
 اک وہ کہ دل میں آگے پردے الٹ کے سب، اک ہم کہ چاک اپنا گریباں نہ ہو سکا،
 ڈوبنے کے لئے کچھ کم تھا نہ دریا کا بہاؤ، کیوں یہ طوفاں اُٹھا اب پار اُترنا ہے ہمیں

شفقت کاظمی :-

تیری جدائیوں کو زمانہ ہوا گھر، دل ہے کہ سرِ زانوے حسرت ہے آج تک
 لب پہ آیا تو سہی شکوہُ بیداد گھر، تیری آذر وہ نگاہی سے حیا بھی آئی
 اس سے پہلے کہ مری روح نے مژدہُ عیش، دل ترے درجِ محبت سے لگا بھی آئی
 فرق آیا نہ تری غمے جفا میں ظالم، رنگ کیا کیا نہ بدلتی رہی دُنیا اپنا
 کاظمی ترکِ آرزو کے سوا، چارہ انتظار کیا کرتے

عزم :- (بشیر بدر)

ہاں مرے فرض سے مجھ کو مری محبوب نہ روک
پہنچ لے سرگمیں آنکھوں سے چھلکے آنسو
ایسے پاکیزہ عسدا یم ہے یہ ماتم کیسا
میری محبوب بھی آلام سے گھبراتی ہے
ہر حسین چہرہ ہے پڑمردہ تنکا میں غمناک
اس طرف صبح مسرت ہے اُدھر شام الم
تاکے جبہ و دستار خدائی کے نشان
ذہن انسانی کو پیہم جو ڈسے جاتے ہیں
اب مرے ذہن میں روشن ہے ارادوں کا چراغ
ہاں مرے فرض سے مجھ کو مری محبوب نہ روک

ابھی دینا ہے نئی صبح کا پیغام مجھے
یہ ترے ساتھ نہ کر دیں کہیں بڑنام مجھے
مسکراہٹ کی ضرورت ہے بہر گام مجھے
لوگ دینے نہ لگیں یہ کہیں الزام مجھے
توڑنا ہے یہ طلسم غم آلام مجھے
دور کرنا ہے یہ فرق سحر و شام مجھے
توڑ دینا ہے فصول خیزی اضماع مجھے
ختم کرتے ہیں خداؤں کے وہ اولام مجھے
روک سکتا نہیں ظلمت کدہ شام مجھے
ابھی دینا ہے نئی صبح کا پیغام مجھے

اکرم دھولیوی :-

آتی گئی بہار نکھر تا گبا چمن
دل پریشاں ہو تو پھر راحت کہیں ملتی نہیں
عزم گلشن میچے با قصد صحرا کیجئے
یہی ہے اہل محبت کی داستان نیاز
جان دیدوں سختی منزل سے گھبرا کر قبول
روئے ناکامی مگر مجھ سے نہ دیکھا جائے گا
وہاں خزاں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا
جہاں تمہارے بول پر مہنسی نہیں ہوتی

کلام سرور :-

یاد آتی ہے تو اس طرح کہ رو دیتا ہوں
تیرا کہلا کے بھی محروم کرم ہوں لے دوست
بھول جاتا ہوں تو ایسا کہ محبت ہی نہیں
اس حقیقت پر غماض بھی ہے حیرت ہی نہیں
خوش بھی ہوں کبھی آنکھ بھی تر ہوتی ہے
میرے محبوب تیری شان تغافل کے نثار
جیسے ہو جائے بہر حال سحر ہوتی ہے
وہ شب غم جو ترے نام سے سر ہوتی ہے

مطبوعات موصولہ

نالہ ناشاد مجموعہ ہے جناب رام پرشاد کھوسلا ناشاد کی عزتوں اور نظموں کا۔ ناشاد مرحوم کا وطن پنجاب تھا لیکن اپنے اکتسابات علمی کے لحاظ سے وہ سارے ہندوستان کے لئے باعث فخر تھے۔ ان کی ساری زندگی تعلیم و تعلم ہی میں بسر ہوئی اور آخر دم تک علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہے، وہ انگریزی کے بہت بڑے ادیب تھے اور مودخ کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ اخلاق کے لحاظ سے بھی ان کی سطح عام انسانوں سے بہت بلند تھی اور تصون کی طرف مایل ہونے کی وجہ سے وہ مذہب کی تفریق کے قابل نہ تھے۔ دیانت و امانت، خلوص و صداقت ان کی زندگی کا وہ اصول تھا جس سے وہ کبھی نہیں ہٹے اور اخوت عامہ و انسانیت پرستی ان کا نصب العین تھا جس کو انھوں نے کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ بھرپور ظاہر ہے کہ جس شخص کی زندگی اتنی پاکیزہ ہوگی، اس کا کلام بھی اسی قدر پاکیزہ ہوگا۔ اس مجموعہ کا پہلا حصہ عزتوں پر مشتمل ہے جن کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا ابتداء و سوویت سے پاک ہونا ہے۔ دوسرے حصہ میں نظمیں ہیں اور مختلف عنوانات پر ہیں۔

ابتداء میں ڈاکٹر سید محمود کا نہایت سلیطہ مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے پوری تفصیل کے ساتھ ناشاد کو ایک صوفی شاعر ہونے ثابت کیا ہے۔ اگلے بعد پروفیسر عبداللہ بن عبدالمطلب نے ناشاد کی شاعری سے بحث کی ہے اور اس کی خصوصیات کو پوری طرح نمایاں کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ناشاد کے کلام میں بعض بڑی دلکش خصوصیات پائی جاتی ہیں اور اقبال تک ڈبو پڑنے سے اسے شایع کر کے زبان کی بڑی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ قیمت چار روپیہ۔

تحقیق و تنقید مجموعہ ہے پروفیسر اختر اینوی (پٹنہ کالج) کے پندرہ انتہائی حالات کا۔ بعض میں مخصوص حضرات کے ادب پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

تاریخی حیثیت سے "بولیوں کا سنگم" بڑا اہم مقالہ ہے اور فنی حیثیت سے بھی کئی مقالے بڑی کاوش و تحقیق کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ فن اور ماحول۔ انسانی حقیقت طرازی۔ ڈرامائی نقطہ نظر سے، خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہیں۔

پروفیسر اختر اینوی بڑے مشاق اور مشہور نقاد ہیں اور ان کے مضامین کو اہل نظر بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ قیمت تین روپیہ۔ طے کا پتہ:۔ شاد بک ڈپو۔ پٹنہ۔

مقصد جلد اول مجموعہ ہے پروفیسر اختر اینوی کے آٹھ انتہائی مقالات کا جو اس سے قبل ملک کے مختلف رسائل میں شایع ہو کر کافی مقبول ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ کا پہلا مقالہ ترقی پسند ادب پر ہے جس میں بہت سوچے سمجھے مکتوبات ترقی پسند ادب کے حال و مستقبل پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرا مقالہ "ادبیات عالم اور اردو میں ترقی پسندانہ رجحانات" بھی اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جس میں زیادہ تر اصولی بحث کی گئی ہے اور انہیں مقصد و نام مقصد مقالہ "ادب میں روایات اور تبدیلیاں" بھی اس بحث سے تعلق رکھتا ہے اور اس طرح یہ تینوں مقالے مل کر "ترقی پسند ادب" پر بڑی جامع گفتگو ہو جاتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی اور غالب کے فن شاعری پر بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے خیالات شعرو شاعری کے متعلق کتنے گہرے ہیں۔ اس مجموعہ کی قیمت دس روپیہ ہے، لیکن غالباً تین روپیہ ہوگی۔ طے کا پتہ: شاد بک ڈپو۔ پٹنہ۔

لیات اکبر جلد اول بزمِ اکبر کراچی کی علی کوشش کا یہ پہلا نتیجہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ پہلی جلد ہے اور اس میں اکبر کی شاعری کے مختلف ادوار کا اہم کر کے ان کے کلام کو مرتب کیا گیا ہے۔ پہلے دور میں سترہ سال سے ۳۰ سال

کی عمر تک کا کلام ہے، دوسرے دور میں ۲۰ سے ۴۰ سال عمر تک کی غزلیں ہیں، تیسرے دور میں ۴۰ سے ۵۰ سال عمر تک کا کلام ہے۔ اخیر میں انکی رباعیات اور قطعیات وغیرہ دئے گئے ہیں

کتابت و طباعت میں کافی نفاست کا خیال رکھا گیا ہے اور کاغذ بھی بہت اچھا استعمال کیا گیا ہے۔ جلد بھی نہایت خوبصورت و مضبوط ہے

قیمت چھ روپیہ۔ ضخامت ۴۴ صفحات۔ طے کا پتہ: بزم انگریز کراچی

جناب مکن اتھ آڈا کی ایک طویل نظم ہے جو انھوں نے اردو مجلس دہلی کی سہ ماہی سالگرہ کی تقریب میں ۱۹ ستمبر ۱۹۷۷ء کو پڑھی تھی۔

اردو جناب آزاد نے ایک کامیاب شاعر ہونے کے لحاظ سے جو شہرت حاصل کی ہے، اس کی بنیاد چند در چند خصوصیات پر قائم ہے جن کا تعلق فن سے بھی ہے اور ان کی ذات سے بھی۔ فن کا جہاں تک تعلق ہے، وہ ایسے چند شاعر ہیں کہ مشکل ہی سے دو چار ان کی صف میں آسکے ہیں، لیکن جس حد تک ان کی ذات یا ذاتی تاثرات کی بلندی کا تعلق ہے، وہ چار بھی ایسے نہیں گئے کہ آزاد کے نام کے ساتھ ان کا نام لیا جائے۔ آزاد کی شاعری خواہ وہ غزل ہو یا نظم یکسر درد مندانه خلوص کا اظہار ہے اور اس اظہار میں وہ ان تمام سلیقوں سے کام لیتے ہیں اور جو قدیم و جدید اردو ادب کے مطالعہ سے ان میں پیدا ہوا ہے

اس نظم میں انھوں نے جو کچھ اردو زبان کے متعلق لکھا ہے وہ بحالات موجودہ ایک "شہر آشوب" کی صورت رکھتا ہے جس کے ایک ایک لفظ سے

ان کا خلوص اور ان کی درد مندی ظاہر ہے۔ قیمت ۶ روپے کا پتہ: دہلی کتاب گھر دہلی

مجموعہ نثری نگہ ناتھ سنگھ باجر دہلی کی غزلوں کا۔ باجر صاحب اب سے ۳۰ سال قبل کے شاعر ہیں، جب دہلی کے ہندو مسلمان دو

شان محفل ایک اسی کچھڑے تھے اور زندگی کے مسائل کو خالص انسانی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے

جناب باجر یک معزز کھتری خاندان کے فرد تھے اور اس عہد کے رواج کے مطابق فارسی کی تعلیم سے نا آشنا نہ تھے، اسی لئے ان کی زبان میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک بڑے لکھے شاعر کے کلام میں پائی جانا چاہئے

ان کے تغزل کی زبان وہی ہے جو دہلی کے اونچے معزز خاندانوں میں رائج تھی اور انداز بیان میں بھی وہی سلاست و صفائی پائی جاتی ہے جو ایک زبان ان کے کلام میں ہونا چاہئے۔ اس مجموعہ کی قیمت دو روپیہ ہے۔ طے کا پتہ: کوثر راج رگھندن سنگھ ساحر کناری بازار دہلی

ترجمہ ہے سائنس کے کتاب کی کتاب

آزادی کے بعد ہے اور اس کی اکثر کتابوں کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اردو میں غالباً بالکل پہلی اور بڑی کامیاب کوشش ہے اور

باوصف امریکہ ہونے کے، موجودہ امریکی ذہنیت کا سخت مخالف ہے اور وہ امریکہ کی جمہوریت کو جو اس کے نزدیک فاسیتیت ہی کی دوسری صورت ہے، بہت

بریں نگاہ سے دیکھتا ہے اور اسی لئے حکیمت نے اسے نظر بند کر دیا ہے۔ وہ امریکہ کے اس فلسفہ کا قابل نہیں کہ شائستگی و تہذیب نام ہے صرف ڈاکٹر اور آئٹم کا

بلکہ وہ تہذیب کی بنیاد اس جذبہ انسانیت کو قرار دیتا ہے جو نوع انسانی کے تمام افراد کو ایک ہی نقطہ نظر سے دیکھے۔ اور ڈاکٹر کا انداز بیان بہت عیب

اور ترجمہ میں اس کا باقی رکھنا آسان نہ تھا، لیکن اس کے فاضل ترجمہ حسن علی خاں قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اصل کتاب کے طرز و انداز کی خوبیوں کو قائم

رکھتے ہوئے اس کو عریض و صاف ترجمہ کیا ہے کہ ترجمہ مستقیم ہی نہیں ہوتا۔ حجم ۲۷۴ صفحات۔ قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے۔ طے کا پتہ: کتب پبلشرز پٹیالہ

مجموعہ ہے جناب اختر سیال احمد بگڑی کی فنون کا جسے خود انھوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ جلد شائع کیا ہے۔

خاورستان اختر صاحب کے رنگ سخن کے متعلق کسی تفصیلی اظہار خیال کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان کا کلام اکثر نگاہ میں شائع ہوتا رہا ہے۔

کافی پسند کیا جاتا ہے۔ اختر صاحب نے ابتدا ہی سے اقبال کے رنگ میں نگہنا شروع کیا اور اس وقت تک استقلال کے ساتھ اس پر قائم ہیں

شکوہ الفاظ، حسن ترکیب، بلندی خیال اور فنی رکھ رکھاؤ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کی ۳۵ نظمیں

ہیں اور ۲۸ غزلوں کے کاغذ پر نہایت دیرہ زیب طباعت و کتابت کے ساتھ جلد شائع کی گئی ہیں۔ قیمت چھ روپیہ۔ ضخامت ۲۵۲ صفحات۔ طے کا پتہ: اختر سیال۔ جلیس منزل۔ احمد نگر

ہنگامہ کی پُرانی مکمل جلدیں

۶۳۶	۶۳۵	۶۳۲	۶۳
۱۵	۱۵	۱۵	۱۵
۶۳۶	۶۳۵	۶۳۲	۶۳
۱۵	۱۵	۱۵	۱۵

۶۳۶ ۶۳۵ ۶۳۲ ۶۳



تنقیدی اشارے

سر آں احمد سرور۔ ریڈر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے انیس تنقیدی
ت کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل
ہو فیصد سرور اس جلد کے نہایت مشہور نقادوں میں سے ہیں اور
تنقیدی مقالات سنہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئے ہیں۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات
۱۰ روپے۔ قیمت تین روپے علاوہ محصول۔ نیچرنگار۔ لکھنؤ

جن بچوں کو
بڑا ہو کر اس دُنیا کا بوجھ اٹھانا ہے
ان کی پرورش نو نہال پر ہونی چاہیے

نو نہال

نئے بچوں کو مضبوط بنانا والا
ان کا دل پسند نائک
محمد دودا خانہ وقفہ ملی



Humdard

جہاں اشتہار دینا حرام ہے، بس اس سے زیادہ میرے پاس
کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، ماننا۔ ماننا آپ کا فعل ہے

ن غنبری موجود ہیں۔ داعی کو دوری کے لئے اگر کیفیت پر جان بڑھ سب
ہیں اس دوا کے مقابلہ میں ایک دوا کی قیمت اور تین جات بلکہ اس سے
س قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سو روپے اور پانچ سو روپے تک پہنچ سکتے ہیں اس قدر غریبی
ہا کہ بچوں کی باتیں بھی خود بخود یاد آئے جتنی ہیں اس کو کوشش کیجات لکھنے والے
نہال کو لے کر پتلا ہوا زون کر کے ایک شیشی جہاں سات سو روپے آپ کا جسم دوا
اس کے استعمال سے ۱۵ گھنٹے کام کرتے سے مطلقاً نکلے نہ ہوگی۔ یہ دوا خالص
لاہ بھول کے سرخ واد میں گذرنے کے درخشاں بنادے گی۔ یہ دوا نئی نہیں ہے
روان دوسرے علاج اس کے استعمال سے باہر دوا بلکہ شش بندہ سولہ سال کے
ن لے ہیں۔ یہ نہایت درجہ غریبی وہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے بقصد اسکی
تجزیہ نہیں ہو سکتی تجویز کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر غریبی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے
قیمت فی شیشی ۱۰ روپے خوراک چار روپے (لکھنؤ)

۱۔ قادیہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ غریب دوا خانہ مفت شیشی پر آمادہ
بالرہاں کر کے بھول کو یہ دوا اکبر کا کام کرتی ہے۔ نقالی سے ہوشیار رہئے

میری ۳۱ سالہ شہرت پر غور فرمائیے
حکیم نہایت علی بیج زبان خوش کلام
(اعمال غنوی سے لکھائے دوم صاحب)
محمد ونگرنگار لکھنؤ۔ یو۔ پی

دی مغل لائن لمیٹڈ

سے برائی ہندوستانی جہاز ران کمپنی

بحر احمر اور مارشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ

بیمبئی سے

عدن، جدہ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی
اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ضرورت پڑنے پر
دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کر سکیں گے

مزید معلومات کے لئے

حسب ذیل پتہ پر لکھیں

ٹرنر مارین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۰۔ بک اسٹریٹ۔ بمبئی

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

شہاب کی سرگزشت

جذبات بھاشا

فلاسفہ قدیم

شاعر کا انجام

حضرت نیاز کا وہ مدبر و نظیر جناب نیاز نے ایک	اس مجموعہ میں حضرت نیاز	جناب نیاز کے غفوان نیاز
افسانہ جو اردو زبان میں دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین	کے دو علمی مضامین	کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق
بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری ہندی شاعری کے نمونے	شامل ہیں :-	کی تمام لذت بخش کیفیات
اس کی برکت لکھا گیا ہے اس کی	(۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم	اس کے ایک جملہ میں موجود
زبان و تخیل اس کی نزاکت	تشریح کی ہے کہ دل بیاب	کی روحوں کے
بیان اس کی بلند میضون ہو جاتا ہے اردو میں بھی	ساتھ	اور انشائے کے لحاظ سے
اور اس کی انشائیہ سحر	سب سے پہلی کتاب اس	(۲) مادین کا مذہب
علا کے درجہ تک پہنچتی	موضوع پر لکھی گئی ہے	نہایت مفید و دلچسپ
یہ ادیشن نہایت صحیح	جس میں ہندی شاعری	کتاب ہے
اور خوش خط ہے	کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں	قیمت
قیمت دو روپے	قیمت بارہ آنے	ایک روپیہ
علاوہ محصول	علاوہ محصول	علاوہ محصول

فراس تالید

نقاب بھانیکے بعد

مذاکرات نیاز

انتقادات

مذہب

مولانا نیاز فوجپوری اس کے	نیاز فوجپوری کے تین فنانوں	یعنی حضرت نیاز کی ڈائری	حضرت نیاز کے انتقادی مقالے	حضرت نیاز کا وہ
مطالعہ سے ایک شخص	کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے	جو ادبیات و تنقید عالیہ کا	مجموعہ فہرست مضامین پر	سرگزشت آثار و مقالات جس میں
انسانی تہ کی شناخت	کہ ہمارے ملک کے اداہان	عجیب غریب ذخیرہ ہے	ایران ہندوستان کا اثر و جرم	انھوں نے بتایا ہے کہ
اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر	طریقت علما کے کرام کی	ایک بار اس کو شروع کر دینا	شاعری پر فارسی زبان کی	مذہب کی حقیقت کیا
اپنے یاد دہرے شخص کے	اندرونی زندگی کیا ہے اور	آخر تک پڑھ لینا ہے	یہ بیڈل پر بخانا نظر آزد و	ہے اور دنیا میں کیونکر
مستقبل، سیرت، عروج و	ان کا دور و ہماری معاشرت	میں جدید ادیشن جس میں	شاعری پر تاریخی تبصرہ لکھ	راج ہوا اس کے مطالعہ
زوال، موت و حیات	و اجتماعی حیات کیلئے کس	صحت اور نفاست کا	غزل گوئی کی عہد یہ عہد ترقی	کے بعد انسان خود فیصلہ
صحت و بیماری، شہرت	سرم قاتل ہی زبان پلاٹ	و طباعت کا خاص اہتمام	نقشائے رنگ رنگ (غالب)	کر سکتا ہے کہ مذہب کی
نیک نامی پر صحیح پشین گوئی	انشائے کے لحاظ سے جو مرتبہ	کیا گیا ہے	کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ	پابندی کیا سنی گئی ہے
کر سکتا ہے :-	ان افسانوں کا ہے وہ مرتبہ	قیمت	ادبیات و اصول نقد	قیمت
قیمت ایک روپیہ	دیکھنے سے حلق رکھتا ہے	ایک روپیہ	نمونہ ادبیہ حقیقت نگاری	ایک روپیہ
علاوہ محصول	قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول	علاوہ محصول	قیمت چار روپیہ علاوہ محصول	علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۴۳ء

فروری مارچ

جنوری ۱۹۴۴ء

اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے

۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد بر ملک کے بہترین اہل قلم

اس سال نامہ کا نام ماحدولین نمبر ہے جس میں ایک نیشنل فرسٹی

کلام بر ملک کے متعدد شاعر نے نقد و تبصرہ

اور ارباب فکر کے معانی پر مشتمل ہے۔

ادب کی ایک مکار و مریخی کڑی کو اردو میں منتقل کیا گیا جو ادب

کر کے بتا رہا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

اور جذبات نگاری کے لحاظ سے بڑا دل اپنا نظیر نہیں رکھتا

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری فروری ۱۹۴۸ء

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

د پاکستان نمبر نگار کا جو فی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفته

اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا جو تا کہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر

کے وقت اسلام کے دور ترین کو نہ بھول جائے جن پر علم حکومت کی ترقی کی

بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

ہر اسکول کا میااری فائدہ کیا ہونا چاہیے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

۱۹۴۸ء

۱۹۴۹ء

۱۹۵۰ء

۱۹۵۱ء

۱۹۵۲ء

۱۹۵۳ء

۱۹۵۴ء

۱۹۵۵ء

۱۹۵۶ء

۱۹۵۷ء

۱۹۵۸ء

۱۹۵۹ء

۱۹۶۰ء

۱۹۶۱ء

۱۹۶۲ء

۱۹۶۳ء

۱۹۶۴ء

۱۹۶۵ء

۱۹۶۶ء

۱۹۶۷ء

۱۹۶۸ء

۱۹۶۹ء

۱۹۷۰ء

۱۹۷۱ء

۱۹۷۲ء

۱۹۷۳ء

۱۹۷۴ء

۱۹۷۵ء

۱۹۷۶ء

۱۹۷۷ء

۱۹۷۸ء

۱۹۷۹ء

۱۹۸۰ء

۱۹۸۱ء

۱۹۸۲ء

۱۹۸۳ء

۱۹۸۴ء

۱۹۸۵ء

۱۹۸۶ء

۱۹۸۷ء

۱۹۸۸ء

۱۹۸۹ء

۱۹۹۰ء

۱۹۹۱ء

۱۹۹۲ء

۱۹۹۳ء

۱۹۹۴ء

۱۹۹۵ء

۱۹۹۶ء

۱۹۹۷ء

۱۹۹۸ء

۱۹۹۹ء

۲۰۰۰ء

۲۰۰۱ء

۲۰۰۲ء

۲۰۰۳ء

۲۰۰۴ء

۲۰۰۵ء

۲۰۰۶ء

۲۰۰۷ء

۲۰۰۸ء

۲۰۰۹ء

۲۰۱۰ء

۲۰۱۱ء

۲۰۱۲ء

۲۰۱۳ء

۲۰۱۴ء

۲۰۱۵ء

۲۰۱۶ء

۲۰۱۷ء

۲۰۱۸ء

۲۰۱۹ء

۲۰۲۰ء

۲۰۲۱ء

۲۰۲۲ء

۲۰۲۳ء

۲۰۲۴ء

۲۰۲۵ء

۲۰۲۶ء

۲۰۲۷ء

۲۰۲۸ء

۲۰۲۹ء

۲۰۳۰ء

۲۰۳۱ء

۲۰۳۲ء

۲۰۳۳ء

۲۰۳۴ء

۲۰۳۵ء

۲۰۳۶ء

۲۰۳۷ء

۲۰۳۸ء

۲۰۳۹ء

۲۰۴۰ء

۲۰۴۱ء

۲۰۴۲ء

۲۰۴۳ء

۲۰۴۴ء

۲۰۴۵ء

۲۰۴۶ء

۲۰۴۷ء

۲۰۴۸ء

۲۰۴۹ء

۲۰۵۰ء

۲۰۵۱ء

۲۰۵۲ء

۲۰۵۳ء

۲۰۵۴ء

۲۰۵۵ء

۲۰۵۶ء

۲۰۵۷ء

۲۰۵۸ء

۲۰۵۹ء

۲۰۶۰ء

۲۰۶۱ء

۲۰۶۲ء

۲۰۶۳ء

۲۰۶۴ء

۲۰۶۵ء

۲۰۶۶ء

۲۰۶۷ء

۲۰۶۸ء

۲۰۶۹ء

۲۰۷۰ء

۲۰۷۱ء

۲۰۷۲ء

۲۰۷۳ء

۲۰۷۴ء

۲۰۷۵ء

۲۰۷۶ء

۲۰۷۷ء

۲۰۷۸ء

۲۰۷۹ء

۲۰۸۰ء

۲۰۸۱ء

۲۰۸۲ء

۲۰۸۳ء

۲۰۸۴ء

۲۰۸۵ء

۲۰۸۶ء

۲۰۸۷ء

۲۰۸۸ء

۲۰۸۹ء

۲۰۹۰ء

۲۰۹۱ء

۲۰۹۲ء

۲۰۹۳ء

۲۰۹۴ء

۲۰۹۵ء

۲۰۹۶ء

۲۰۹۷ء

۲۰۹۸ء

۲۰۹۹ء

۲۱۰۰ء

۲۱۰۱ء

۲۱۰۲ء

۲۱۰۳ء

۲۱۰۴ء

۲۱۰۵ء

۲۱۰۶ء

۲۱۰۷ء

۲۱۰۸ء

۲۱۰۹ء

۲۱۱۰ء

۲۱۱۱ء

۲۱۱۲ء

۲۱۱۳ء

۲۱۱۴ء

۲۱۱۵ء

۲۱۱۶ء

۲۱۱۷ء

۲۱۱۸ء

۲۱۱۹ء

۲۱۲۰ء

۲۱۲۱ء

۲۱۲۲ء

۲۱۲۳ء

۲۱۲۴ء

۲۱۲۵ء

۲۱۲۶ء

۲۱۲۷ء

۲۱۲۸ء

۲۱۲۹ء

۲۱۳۰ء

۲۱۳۱ء

۲۱۳۲ء

۲۱۳۳ء

۲۱۳۴ء

۲۱۳۵ء

۲۱۳۶ء

۲۱۳۷ء

۲۱۳۸ء

۲۱۳۹ء

۲۱۴۰ء

۲۱۴۱ء

۲۱۴۲ء

۲۱۴۳ء

۲۱۴۴ء

۲۱۴۵ء

۲۱۴۶ء

۲۱۴۷ء

۲۱۴۸ء

۲۱۴۹ء

۲۱۵۰ء

۲۱۵۱ء

۲۱۵۲ء

۲۱۵۳ء

۲۱۵۴ء

۲۱۵۵ء

۲۱۵۶ء

۲۱۵۷ء

۲۱۵۸ء

۲۱۵۹ء

۲۱۶۰ء

۲۱۶۱ء

۲۱۶۲ء

۲۱۶۳ء

۲۱۶۴ء

۲۱۶۵ء

۲۱۶۶ء

۲۱۶۷ء

۲۱۶۸ء

۲۱۶۹ء

۲۱۷۰ء

۲۱۷۱ء

۲۱۷۲ء

۲۱۷۳ء

۲۱۷۴ء

۲۱۷۵ء

۲۱۷۶ء

۲۱۷۷ء

۲۱۷۸ء

۲۱۷۹ء

رجسٹرڈ نمبر ۴۶۶
چونچانہ کارخانہ
پاکستان پرنٹنگ

- 6 NOV 1951



ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ

قیمت فی کاپی ۱۰/-

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان

آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

چھ روپیہ (بغیر سالنامہ)

”مومن نمبر“ دوسرا اڈیشن شائع ہو گیا

دو روپیہ اضافہ محصول

تصانیف نیاز فوری

مذہبی استفسارات و جوابات

کا

مجموعہ

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے والی

انجیل انسانیت

من ویزوال

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:-
1۔ اصحاب کھٹ- معجزہ و کرامت
2۔ انسان مجبور ہے یا مختار- مذہب و عقل- طوفان نوح حضرت کی حقیقت- مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں- یونس اور دہان ہاں
3۔ حسن دوست کی داستان- قارون- سامری- علم غیب- دعا
4۔ توبہ- لقمان- عالم برزخ- یاجوج ماجوج- ہاروت اور دوت-
5۔ حوض کوثر- امام مہدی اور پل صراط- آتش نمود و غیرہ
6۔ ضخامت ۶۲۴ صفحات کا غنہ سفید دینہ قیمت علاوہ محصول باختر و پیکٹ آف

مولانا نیاز فوری کی ۳۴ سالہ دو تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کا زمانہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند انشاء اور بزرگوں خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے
7۔ ضخامت ۶۲۴ صفحات مجلد نو روپیہ علم علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

ترغیبات حسنی یا

شہوانیات مجلد

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ اس کتاب میں نفیاشی کی تمام فطری جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا اور غیر فطری قسموں کے حالات بہترین استخراج آپ کو نظر آئے گا اور تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت ندرت ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر ربط کے ساتھ متفقاں تہمہ و کیا گیا ہے واضح ہو گا کہ تاریخ کے سہولے اوراق کو نفیاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں ہوتی ہیں یہ کہ مذہب عالم نے اسے رائج حضرت نیاز کی انشاء نے اور میں کتنی مڑکی اس کتاب میں آپ کو زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے مینا پڑیں قیمت دور روپیہ علاوہ محصول قیمت ہار روپیہ علاوہ محصول

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالے اور نثر نگار کے افسانوں اور مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن و نادر خیال اور پاکیزگی زبان کے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے انمازہ اس ہو سکتا ہے کہ اسے متفقاں بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے ہیں اور ان اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی میں متفقاں نے اور ادبی مقالے نظر آئے گا کہ افسانہ اور ہر مقالہ ہی جگہ ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس ادب میں متفقاں نے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ادب میں نہ تھے۔ ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت باختر و پیکٹ آنے علاوہ محصول قیمت ہار روپیہ علاوہ محصول

6 NOV 1951

ورق نہ اٹھنے پہلے اس خط کو پڑھ لیجئے

(اس پرچم کے ساتھ ایک مطبوعہ کارڈ آپ کو ملے گا اسکی خانہ پوری کر کے بوابسی ڈاک بھیج دیجئے)

کمری - تسلیم

آپ کو معلوم ہے کہ کاغذ کی حدود جہ گرافی اور مصارف طباعت و اشاعت کے بڑھ جانے کی وجہ سے ہم باورل ناخواستہ اس بات پر مجبور ہوئے ہیں کہ نگار کے سالانہ چندہ میں (سالنامہ کے زیادہ ضخیم ہوجانے کی وجہ سے) دو روپیہ کا اضافہ کریں۔

اس اضافہ کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو تقریباً پونے تین آنے ماہوار زیادہ ادا کرنے پڑیں گے اور یہ رقم غالباً اتنی نہیں کہ آپ اسے برداشت نہ کر سکیں، جبکہ آپ اس سے کہیں زیادہ روزانہ اپنے مشاغل تفریح میں صرف خرچ دیتے ہیں۔ لیکن اگر آپ نگار کی دینے خدمات کے پیش نظر اتنا ایشیا بھی گوارا نہیں کر سکتے تو کم از کم تین پیسہ کی قربانی گوارا فرما کر ایک کارڈ کے ذریعہ سے مطلع فرما دیجئے کہ آپ کو سالنامہ کی ضرورت نہیں ہے اور دو روپیہ کا اضافہ سالانہ چندہ میں نامنظور ہے (آپ کارڈ بزرگ بھی بھیج سکتے ہیں)

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۰ء میں ختم ہو رہا ہے تو نامنظوری کی اطلاع نہ ملنے پر نگار کے سالنامہ کا دوسری آٹھ روپیہ چھ آنے میں روانہ کیا جائے گا اور اگر دسمبر ۱۹۵۰ء کے بعد کسی اور مہینے میں آپ کا چندہ ختم ہوتا ہے تو دو روپیہ چھ آنے کا دوسری آٹھ روپیہ چھ آنے کے ساتھ کہ آپ اسے واپس کر کے ہمارا نقصان پسند نہ فرمائیں گے۔

یقیناً یہ امر آپ سے مخفی نہ ہوگا کہ آدو اسوقت نہایت نازک دور سے گزر رہی ہے اور ہر اس شخص سے جو آمد دہ کی بقا چاہتا ہے زیادہ سے زیادہ ایشار و قربانی چاہتی ہے، لیکن ہم تو آپ سے صرف دو روپیہ سال کی مدد چاہتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے عوض میں دو روپیہ سے کہیں زیادہ قیمتی چیز آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

سالانہ چندہ یا سالنامہ کی قیمت ذریعہ منی آرڈر روانہ کرنے میں آپ کو ۶ روپیہ کی بچت ہوگی پاکستان کے خریداروں کے نام دی، پی نہیں جاسکتا اس لئے وہ اپنا چندہ آٹھ روپیہ یا سالنامہ کی قیمت دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر ذیل کے کسی پتہ پر بھیج سکتے ہیں کہ اطلاع دیدیں۔

۱۔ ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الہی بخش کالونی - کراچی

۲۔ ملک محمد دین اینڈ سنز پبلشرس ۱۰ بل روڈ - لاہور

(نوٹ) آئندہ سالنامہ کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے پشت صفحہ کا اعلان ملاحظہ فرمائیے۔

منیجر

دہائی طرزِ تعلیمی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہو گیا

نگار

اڈیشا: نیاز فچوری

جلد ۶۰

فہرست مضامین نومبر ۱۹۷۷ء

شمار ۵

۳۴	ہندو حاضرینِ حجری دور کا انسان فقیر صدیقی	۲	علامتات
۳۷	اوپل لکاتبہ و الشاعر	۵	وسط ایشیا کی کلچری ترقی ... علیہ الدین احمد
۴۱	باب لا ستفسار	۱۳	انسان و انسان اعلیٰ ... سعید جاوید (بی۔ اے۔)
۴۴	کائنات کی عظمت	۲۱	ہجری ادبی تاریخیں ... سید محمد عقیل
۴۵	منظومات ... قیرا کو آبادی نیشاں کو آبادی پیشتر جنجناؤی صفیہ نسیم	۲۷	امداد خاں تھام ہوا؟ (ایک سوانحی نقش) ... (پروفیسر) حمید احمد خاں

آئندہ سالنامہ حسرت نمبر کی اہمیت

دنیا نے تغزل میں حسرت سوانحی کی انفرادیت کو ہر دوستان شاعری نے تسلیم کیا ہے اور انھیں رئیس المستغزلین کہنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو، لیکن ان کی شاعری کی وہ کیا خصوصیات ہیں جنہوں نے ہر شاعر و نقاد سے یہ خراج تحسین حاصل کیا، اس کا صحیح اندازہ آپ کو حسرت نمبر کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے، جس کی تکمیل میں پاکستان و ہندوستان کے تمام بڑے بڑے ادیب و نقاد حصہ لے رہے ہیں مثلاً: - مرزا جعفر علی خاں اتر - پروفیسر رشید احمد صدیقی - پروفیسر مجنوں - پروفیسر فراق - پروفیسر افتخار حسین - پروفیسر سرور - پروفیسر ڈاکٹر عبادت بیگم - پروفیسر خواجہ احمد فاروقی - غلیل الرحمان اعظمی - اڈیشا نگار وغیرہ۔

اس سالنامہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ کلام حسرت کا مکمل انتخاب اس میں شائع کیا جائے گا کہ کلیات حسرت کے مطالعہ سے آپ بالکل بے نیاز ہو جائیں گے۔
اس سالنامہ کو معیاری چیز بنانے کے لئے ضخامت کا کوئی سوال سامنے نہ ہوگا اور غیر خریدارانِ نگار کے لئے اس کی قیمت دور و پیہ سے کم نہ ہوگی، ممکن ہے زیادہ ہو جائے۔

منہجر

ملاحظات

نوابزادہ لیاقت علی خاں کی شہادت یونٹ پر ان کا قتل اپنی جگہ افسوسناک ہوا کرتا ہے، لیکن کسی ایسے فرد کی ہلاکت جس کی ذات کسی قوم یا جماعت کی ملکیت ہو، قوم و جماعت کی ہلاکت ہے۔

ولیں سریر الغش بالسمونہ

ولا کنہ اصلا ب قوم تقصفت

(یہ جو تم سن رہے ہو موت کی چرچا ہٹ نہیں ہے بلکہ قوم کی ریڑھ کی ہڈیاں چٹک رہی ہیں)

نوابزادہ مرحوم ۱۸۹۵ء میں بمقام کرنال پیدا ہوئے اور علیگڑھ، الہ آباد اور آکسفورڈ میں ریکرائیو تعلیم کے لئے ہندوستان کی تقسیم قبل بھی وہ ہمارے یہاں کلیدی مناسب پرفائزر رہے اور تقسیم ہند کے بعد تو خیر وہ قاید اعظم کے دست راست تھے ہی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان ایک جداگانہ سلطنت تو بن گئی تھی، لیکن اس کی حیثیت ایک جائے تارتار سے زیادہ نہ تھی۔ اور مشکل سے باور کیا جاسکتا تھا کہ وہ آسانی سے منزل استقامت تک پہنچ سکے گی۔ مگر قاید اعظم کی ملک میں غیر معمولی جوش و ولولہ اور کیفیت عزم و یقین پیدا کیے پاکستان کو ابتدائی منزل تعمیر کی دشوار گزار راہوں سے یہ آسانی گزارے گئے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس مجاہدانہ عزم میں بھی نوابزادہ مرحوم کی شخصیت بڑی عظیم شخصیت ثابت ہوئی۔ زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ قاید اعظم اس جہان سے رخصت ہو گئے اور یہ پہلا نہ بد دست صدمہ تھا جو پاکستان کی نوابزادہ سلطنت کو پہنچا، لیکن نوابزادہ مرحوم کے وجود نے یہ صدمہ بھی ملک کو زیادہ محسوس نہ ہونے دیا اور انہوں نے ان تمام ذمہ داریوں کو بر قاید اعظم نے سنبھال رکھی تھیں اپنے مضبوط شانوں پر لے لیا اور حکومت کا وہ ڈھانچہ جو چکا تھا بگڑنے نہ پایا۔

یہ موقع نہیں کہ نوابزادہ مرحوم کی قیام کی ہوئی پالیسی پر رائے زنی کی جائے، لیکن مختصر اظہار کر دینے میں کوئی حرج نہیں کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنا ان کی انتہائی خواہش تھی اور اس خواہش کی تکمیل میں جو موانع پیش آتے تھے ان سے وہ خوش دھرتی سے اور قوم میں ذہنی اعتدال قائم رکھنے کا انہیں بڑا خیال تھا۔

نوابزادہ مرحوم کے واقعہ شہادت کے اسباب کیا تھے، ان کا ہمیں صحیح علم ہے، ان کے معلوم کرنے کی ضرورت کیونکہ دنیا میں اکثر بڑے بڑے کام کرنے والوں کا یہی حشر ہوا ہے اور اس انجام کے بعد جو رد عمل ملکوں میں ہوا کرتا ہے وہ ہمیشہ جراثیم ہوا کرتا ہے۔

نوابزادہ مرحوم کی جگہ خواجہ سرناظم الدین کا انتخاب متعدد وجوہ کی بنا پر بہت مناسب انتخاب ہوا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ان کی ہدایت و سرکردگی میں پاکستان امن و سکون کے قیام کو (جو اسلامی تعلیم کا تنہا نصب العین ہے) اولین سیاسی ضرورت قرار دے گا اور اپنی تمام ہمسایہ سلطنتوں کے اس کے تعلقات زیادہ خوشگوار ہو جائیں گے۔

ایک اور نیا خطرہ مشرق وسطیٰ کی آئین بھی بڑی عجیب تاریخ ہے، ایک طرف وہاں مارگریٹریڈل نے جنم لیا تو وہ سری ملین بڑی بڑی خونریزیوں بھی ایک اور نیا خطرہ وہاں ہوئی۔ پہرہا کہ پیٹریڈل ہونا نہ ہو گا، اس طرف وہاں خونریزیوں ہی خونریزیوں ہوں تو حیرت نہ کرنا چاہئے مشرق وسطیٰ کی اہمیت زیادہ تر اس لئے ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے درمیان ایک بڑی اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے اور مغرب جو اب تک مشرق پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی طرف سے دایم سے نہیں ہوتا ہے، اس پر اپنا تسلط ضروری سمجھتا ہے۔

گو مشرق وسطیٰ سے مراد صحن ایشیا کا وہ حصہ ہے جو بحر روم، خلیج فارس اور آبنائے بسفورس کے درمیان واقع ہے، لیکن چونکہ اس کے حدود ایک طرف ایران سے ملتی ہیں اور دوسری طرف مصر سے اس نے مشرق وسطیٰ کے مسائل سے ایران و مصر کو بھی بے تعلق نہیں رہ سکے، اور اسی بنا پر ایران میں پٹرول کو قومی ملکیت بنانے کی تحریک اور مصر میں سوئز کے علاقہ سے انگریزوں کا تعلق، برطانیہ کے نزدیک مشرق وسطیٰ ہی کے مسئلہ دفاع سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ابھی ایران کا جھگڑا نہ ہوا تھا کہ برطانیہ کو مصر سے الجھ جانا پڑا اور یہ آؤیزش حدود میں خطرناک ہے۔ کیونکہ برطانیہ اس کو توڑا کر سکتا ہے کہ وہ ایران کے پٹرول سے ہاتھ دھوئے لیکن نہر سوئز سے اپنا اقتدار بٹانے پر وہ شاید کبھی راضی نہ ہوگا۔

مسئلہ ۶ میں برطانیہ نے نہر سوئز کے علاقہ سے اپنی فوجیں ہٹانے کو محسوساً تسلیم کر لیا تھا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ فلسطین کو وہ اپنا فوجی مستقر نہیں بنا سکتا تو اپنی فوجیں وہاں رکھنے کے لئے ایک نئی وجہ پیش کی کہ مشرق وسطیٰ کے امن و سکون کے لئے انگریزی فوجوں کا وہاں رہنا ضروری ہے اور مصر کی موجودہ حکومت نجاس پلٹنے کے ہاتھ میں ہے اور قوم نے ان کا انتخاب اسی لئے کیا تھا کہ وہ نہر سوئز کے مکمل تعلق اور مصر کے ساتھ سوڈان کے الحاق کے حامی تھے اور اب چونکہ حکومت مصر نے ان دونوں مطالبات کی توثیق کر دی ہے، اس لئے مصر و برطانیہ کی کشیدگی کا جنگ کی صورت اختیار کر لینا بالکل قرین قیاس ہے۔

برطانیہ کی طرف سے مصر کے ان دونوں مطالبات کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ سوڈان کے مستقبل کا فیصلہ خود اہل سوڈان کے ہاتھ میں ہے اور سوئز کے علاقہ میں برطانوی فوجوں کا قیام اس لئے ضروری ہے کہ مشرق وسطیٰ کا دفاع تنہا مصر کے بس کی بات نہیں۔ برطانیہ کے اس طرز عمل کا رد عمل مصر میں ہوا ہے کہ وہاں کام ملک میں برطانیہ کے خلاف زبردست مظاہرے ہو رہے ہیں اور بعض جگہ یہ اس جگہ پہنچ گئے ہیں کہ برطانیہ کو اور مزید فوج طلب کرنا پڑی ہے۔

حفاظت کونسل سے کوئی توثیق رکھنا یا کر رہے کیونکہ وہ بالکل برطانیہ و امریکہ کے ہاتھ میں ہے، اس لئے اگر یہ سوئز کم نہ ہوئی تو اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ و مصر کے درمیان لڑائی چھڑ جائے گی اور پھر یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور یہ آگ پھیل کر وادی نیل سے آگے اور کن کن ملکوں تک پہنچے گی۔

کانگریس کی ذہنی تبدیلی جواہر لال نہرو نے جبے صدارت کانگریس کی خدمت قبول کی ہے، کانگریس کی ذہنیت میں بہت نمایاں تبدیلی پیدا ہو چکی ہے، اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت وہاں سبھا کے لیڈروں کی طرف سے جو تقریریں سننے میں آ رہی ہیں، وہ ان کے احساس کمتری کے ثبوت میں بہ آسانی پیش کی جاسکتی ہیں۔

جواہر لال نہرو نے اس وقت تک سب سے زیادہ مخالفت فرقہ داری ذہنیت کی ہے اور انھوں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ اس فرقہ ذہنیت کو مٹانے میں کوئی دقیقہ کو شش کا اڑا سٹھا نہیں گئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ میں سبھا کے بزم ہونے کی کیا وجہ ہے، اور وہ کیوں اس کو پی کر اپنے سر منڈھ رہی ہے۔

اگر وہ کوئی فرقہ پرست اور رجعت پسند جماعت نہیں ہے تو وہ اس نشانہ کا بدن اپنے آپ کو کیوں قرار دے اور اگر واقعی اس کی ذہنیت فرقہ وارانہ ہے تو اسے اس کا اعتراف کرنا چاہئے اور یہ دعویٰ چھوڑ دینا چاہئے کہ اس کا پلٹ فارم مسلمانوں کے لئے بھی کھلا ہوا ہے۔

مگر ہے کہ الگشن میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو اہل زیادہ آزاد خیال ثابت کرے، لیکن اس کی یہ کوشش بیکار ہو چکی کیونکہ مسلمان ابھی طرز جانتا ہے کہ سبھا جس کی بنیاد ہی انسانیت کی تعریف اور متعصبانہ قدامت پرستی پر قائم ہے، کبھی مسلمانوں کی وجہ سے نہیں ہو سکتی اور اس کے نزدیک آزاد حکومت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ہندو قوم مسلمانوں کو ہندوستان سے باہر نکال دے، ان کو ہندوستانی ہندو بنائے اور ان کے معابد کو ہندوؤں میں تبدیل کر دینے کے لئے ہر طرح آزاد ہو اور اس سے کم پر وہ حکومت سے سمجھوتہ کرنے کے لئے طیار نہیں۔ پھر ہمیں حیرت ہوا سبھا کے اس سلسلے میں نہیں بلکہ حکومت کے اس رعا دادانہ طرز عمل پر ہے جس نے اس جماعت کے وجود کو اس وقت تک برداشت کیا اور اس سے زیادہ تنجب ہوگا اگر آئندہ آئے۔ کے بعد نئی حکومت نے بھی یہ عنصر ہندوستان میں اتاری رہنے دیا۔

وسط ایشیا کی کلچری ترقی

(سلسلہ اسبق)

سوویت ادب کلچر کی بین المیت اہم مرحلے کا ہونا بھی ضروری تھے۔ وفاقی جمہوریوں میں اتحاد پیدا کرنے کا سب سے اہم وسیعہ روسی زبان تھی۔ مختلف قوموں کی ایک وفاقی حکومت بننے کے لئے ایک بین الاقوامی زبان کا ہونا از بس ضروری تھا۔ اور یہ حقیقت دنیا بھر نے مان لی ہے کہ روسی ادب جمہوریت کی اسپرٹ سے مالا مال ہے

اپنی افتاد ادب میں گورکی نے صرف ہی نہیں کہا کہ انیسویں صدی کی تنقیدی واقعیت سے کام لیا بلکہ اس نے لوک گیتوں اور عوامی قصوں سے بھی بھلا کام لیا۔ عوام کی اس بے لگھی شاعری سے معیاری ادب پیدا کرنا ہی اس بات کی ضمانت ہو گیا کہ معیاری ادب اور عوامی ادب کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے۔ یہ حقیقت آج سوویت کے ہر قومی ادب کی خصوصیت بن گئی ہے

اس اشارہ اور پر کیا جا چکا ہے کہ روسی ادب میں غیر روسی کردار انقلاب سے پہلے بھی پیش کے جا رہے تھے، لیکن اس وقت ایسا ہونا کسی غایت اور مقصد کی بنیاد پر نہ تھا۔ لیکن جب اشتراکیت نے تمام سوویت قوموں کے بھائی چارے کو ایک حقیقت بنادیا تو ان تمام قوموں کے ادب میں موضوع اور تکنیک کے اندر از خود وحدت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ پوری سوویت یونین کے اندر ”قومی اپیک اور کلاسک“ کا ایک جشن منایا گیا جس میں ہر علاقے کے لوگوں نے ایک قومی نمائندگی کی طرح دل کھول کر حصہ لیا۔ آج ”ڈیوڈ ساسون“ ”ژنگار“ ”فرادوشیرس“ ”مچنوں اور سرود مخصی فارسی یا ازبکی، محض ادبی یا آذربائیجانی نہیں بلکہ پوری سوویت یونین کے قومی کردار بن گئے ہیں

وسط ایشیا کی قوموں کا پھر دنیا کے کلچر سے الگ تھلک نہیں رہا ہے۔ اس میں غیر ملکی جواہر بھی شامل کئے گئے ہیں۔ ٹلکسیر، مولیر، ہڈاک، ڈاکس فلڈامیر، لالگ قیلو، ارک قومیں اور بہت سے یورپی اہل قلم کی تصانیف سے دل کھول کر استفادہ کیا جا رہا ہے۔ ازبکستان میں ابراہیم دایت اوٹ، ٹلکسیر کے کرداروں کی تعبیریں یورپ کے ایکٹروں کا اہم پل سمجھا جاتا ہے۔ وسط ایشیا کا ادب ان تمام جلیل القدر فنکاروں سے پوری طرح روشناس ہے، اور بالکل اس طرح جانتا ہے جس طرح وہ سوویت، حافظہ اور نوائے واقف ہیں جس طرح تیسری، خود قلمی اور مینیکو جانتا ہے یا جسطرح پلٹن، دوستوفسکی، چخوف اور گورکی سے روشناس ہے۔ پلٹن کے Eugene Onegin کا ترجمہ ایک کے قلم سے ہوا ہے اور ”قفقاز کا قیدی“ ”بنت البحر“ کے ترجمہ جن میں ”مپسی“ اور ”پکستان کی میٹھا“ بھی ہیں۔ اسی طرح لار آنتون، گوگول، چخوف، شولہین، استرافسکی اور گورکی کے مشہور ادب پارے ترجمہ ہو چکے ہیں۔ تنقیدی ادب کے سلسلہ میں پلٹن کی اور دو بروکیو بات بھی نقل کر لئے گئے ہیں

اسی کے ساتھ ساتھ اکثر غیر روسی سوویت شاعروں اور ادیبوں کے کارنامے روسی اور دوسری سوویت زبانوں میں برابر منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں گورکی انٹی ٹوٹ کا ذکر بہت ضروری ہے جو محض اس غرض کے لئے قائم کیا گیا ہے کہ عام طور پر دنیا کی زبانوں کے ادب پارے اور خاص طور پر سوویت زبانوں کے ادبی کارنامے سوویت زبانوں میں منتقل ہوتے رہیں۔ اس طرح ۵۲ سوویت زبانوں کا ادب اہم منتقل ہوتا رہتا ہے۔

درغیرملکی ادبی کارنامے تمام سووٹ زبانوں میں ترجیح ہو کر ان کو مقبول بناتے رہتے ہیں

پوری ترقی کے ذیل میں ایک اور اہم کام یہ انجام پا رہا ہے کہ تمام سووٹ قوموں کے قومی ایک روسی زبان میں مقل کر لئے گئے ہیں۔ نظامی نجوی بڑے حد لیسرچ کی گئی اور اس کا کلیات بمسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، نظامی کی آٹھ سو سال کی یادگار حال میں پوری سووٹ قوموں میں مٹائی گئی ہے۔ اسی طرح ملاطی شیرزادی پر لیسرچ کر کے اس کے کلام کے نفیس ایڈیشن نکلے اور پانصد سالہ برسی بڑے اہتمام کے ساتھ منائی گئی۔ مختلف سووٹ قوموں کے ادب کے ذیل میں یہ کہنا شاید صحیح نہ ہو گا کہ ایک ادب کے کردار دوسرے ادب میں لے لئے جاتے ہیں بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ ان تمام زبانوں کے ادب میں جو کردار تخلیق پاتا ہے وہ بین اعلیٰ سووٹ کردار ہوتا ہے اور اس سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ ہر سووٹ قوم کے ادب کی غایت اور اس کے فن کاروں کی تخیل بھی چیزیں گئی ہے۔ حاجی نصیر الدین اور پرنس ایگو۔ اسی طرح بین ملی ادبی کرداریں طرح بعض خاص مشرقی کردار روسی ادب کے کردار بن گئے ہیں (ایچہ بعض کرداروں کے نام پہلے دئے جا چکے ہیں) الحاصل سووٹ روس میں ایک شریک ولایت اور ایک مشترک پھر وجود میں آ گیا ہے

ترکمان، کازاک اور تاجک زبانوں میں جیسا ادب پر کہا جا چکا ہے، کوئی کلاسیک ادب موجود نہ تھا۔ لیکن ان زبانوں میں نثری ادب مفقود تھا۔ بناچار تعلیم عام ہو کر ان قوموں میں انتشار بردار اور اہل قلم پیدا ہوئے تو انھوں نے گورکی کی تصانیف کو اپنا کلاسیک قرار دیا، اور وہی ان کے لئے مصلحت پایت بنا۔ اس بنا پر گورکی کو اگر وسط ایشیا کے نئے ادب کا دوا آدم کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ البتہ یہ سمجھ لینا غلط ہو گا کہ چونکہ ان قوموں کے اہل قلم نے درکی کا اتباع کیا اس لئے ان کا ادب ”قومی اسپرٹ“ سے لازماً بیگانہ ہو گا۔ کازاک محنت مشابہت تصنیف نے خود نوشت سوانح عمری لکھی تو گورکی کا۔

میراجیکین۔ اوڈونیا کے اندر اس کے سامنے تھیں۔ کازاک زبان میں اسے پہلے کوئی کتاب واقعت نکالی کے اصول پر لکھی ہی نہیں گئی تھی۔ المفروض یہ ایک امر حقیقت ہے کہ سووٹ قوموں کے اہل قلم کو انسانیت پرستی، وطنی دوستی اور واقعت نگاری کی جو تعلیم روسی ادب نے فطرت اور پیروی سے ملی وہ کسی اور ذریعہ سے نہ مل سکتی تھی۔ سب سے بڑا فائدہ ان قوموں کو یہ پہونچا کہ وہ متحدہ و قسم کی قوم پرستی اور روایتی قدردانہ سے چشمہ کار پائیں، تصعب اور تنگ نظری کی بڑے بچے گئیں اور واقعتی مصاحبت ادب کی وسیع اور روشن شاہراہ پر قدم زن ہو گئیں

جس طرح سووٹ اقویت ماضی ادب کا سہرا لگوانے کے سرے اس طرح شعری ادب کی مہر بھی کاغذ لیا کو فکس کو حاصل ہے۔ ان قوموں کے ادب دیا کو فکس کی شعری روایات نے زندگی کی قوت بخشی۔ وسط ایشیا کے صدیہ شاعروں نے مایاکوفسکی کے اتباع میں عروض کی اکثر باجندوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا اس لئے قومیت پرستوں نے اتنی سخت مخالفت کی کہ کچھ دور کے لئے شعر و ادب کی ترقی رک گئی، لیکر یہ غیر تصدیقہ کو شاعرانی الجملہ سماج کے اذر نہ رکھتے تھے اور ان کی مخالفت کارگر تھی۔ لیکن نئی نسل کے شاعر بھی اسی سمت سے اڑ رہے۔ مایاکوفسکی کی روایات شعری نے ان کے بازوؤں کو قومی تر بنا دیا تھا اس لئے وہ کامیاب ہو کر رہے

غیر مصیبت کے ساتھ مایاکوفسکی کا ازغفور غلام، شیخ زادہ اور کلسون وغیرہ کے کلام میں زیادہ ملتا ہے۔ لیکن ان شاعروں نے مایاکوفسکی کا اتباع اس کو قتل کر کے نبیو کیا بلکہ اپنے قومی جانیائی احساس کو مایاکوفسکی کے رنگ میں بیان کیا

طنی آزموئیں اور فزع انسانی کے دلول میں قومی اتحاد پر زور اور پرتا لیر طریقے پر پیش ہوا ہے

غفرانہ، انوکیتان کا بے مدحوب شاعر ہے، اور اپنے شاعرے اس قدر محبت کرنا انوک غلام کے پھر کی حدیں بھی بنا دیتا ہے اس کی مقبولیت کا نازہ کرنے کے لئے یہ ایک واقعہ کافی سے زیادہ ثبوت ہے۔

دہلی کی طرح تاشقند بھی درحصول پر مشتم ہے۔ جیہ تاشقند اور پرتا تاشقند۔ غفور پرتا شہر میں رہتا ہے۔ نئے تاشقند میں اس کی ملاقات ایک روسی شاعر سے ہوتی ہے۔ جب رخصت ہوتے ہیں تو غفور اس روسی شاعر کو اپنے گھر کا بتا جاتے ہوئے کہتا ہے کہ ”پرتا شہر میں پہونچ کر کسی سے بھی چھوڑنا، وہ تمھیں میرے گھر پہونچا دے گا۔“ تاشقند دس لاکھ کی آبادی کا شہر ہے، لیکن پھر بھی تاشقند کا ہر شعری غفور کا ملک جانتا ہے اور پہونچنے والے کو غفور کے گھر تک پہونچا دینے پر مکلف بھی ہے۔ اس ایک واقعہ سے ایک شاعر کی بے مثال مقبولیت اور ایک قوم کی ادب پرستی اور پوری بندھن

دونوں ثابت ہو جاتی ہیں

قومی پیکر ادب و اس کا اشتراکی وصف

اشتراکی حقیقت نگاری اختیار کرنے کے ساتھ ادب میں نئے اصناف داخل ہونے لازمی تھے اور وسط ایشیا کی مختلف قوموں کے ادب کا شکل و صورت کے اعتبار سے "قومی" ہونا اور وصفی نوعیت کے اعتبار سے "اشتراکی" ہونا آپ ایک واقعہ اور حقیقت بن گیا ہے۔ اس واقعہ کے اس نظریے کی مزید تشریح یہ ہے کہ سارے فن کاروں کی کوشش یہ رہتی ہے کہ قومی کلہ کی ادب کی بہترین روایات کے نثرانے جن کو قومی فطانت نے صدیوں میں جمع کیا تھا، نئے عہد کے ترقی پسند خیالات کے ساتھ سموئے جائیں۔ اس کوشش کا حاصل یہ ہے کہ تمام سوویٹ قوموں کا ادب صناعی ترقی کی اس منزل میں پہنچا ہے وہ بین الاقوامیت و اتحاد کا ضامن بن گیا ہے۔

وسط ایشیا کی پُرانی تہذیب بالکل ایرانی رنگ میں رنگی ہوئی تھی اس لئے شاعری کا پرواز بھی ایرانی تھا۔ ہندوستانی شاعری کی طرح روایت قافیہ و ہاں بھی لازمی چیز تھا۔ لیکن اب نئے پیکر اختیار کئے گئے ہیں اور قافے کی پابندی باعتبار صورت رہ گئی ہے۔ لیکن ان جدیدوں یا بدعتوں کے باوجود ہر قوم کا ادب شدت کے ساتھ "قومی" ہے اور مشرقی رنگ و انداز میں قائم ہے۔ خیالات و تصورات، اور ان و اصناف، رموز و استعارات سب کچھ مشرقی ہے۔ طویل نظموں کے بیچ بیچ میں حکایتیں اور غزلیں اسی طرح دی جاتی ہیں جیسے قنوی مولانا روم میں ہیں، اور یہ مشرقی رنگ ہر اعتبار اور ہر جہت سے مقامی اور قومی ہے اور انجمنیت دیکھنے کو نہیں ہے۔ آخر مضمون میں تین غزلیں جو اصل زبان میں میری نظرت گزری ہیں شامل کی جا رہی ہیں۔ ان کو پڑھ کر ان تمام باتوں کا صحیح اندازہ ہو جائے۔

وسط ایشیا کی اقتصادی حالت

کسی قوم کی کچری ترقی کو سمجھنے کے لئے اس کے اقتصادیات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سمجھنے والے سمجھے ہیں کہ کچری ترقی کے معنی ہیں کہ معیار زندگی اور بنیاد ہو، اور زندگی کا معیار اور بنیاد ہونا اقتصادی بحالی پر منحصر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ کچری ترقی کے معنی ہی اقتصادی ترقی کے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اشتراکی فلسفہ کی بنیاد تمام سرمایہ حقیقت یعنی اقتصادیات پر قائم ہے، اس کی نظر میں کلچر اور اقتصاد کی ترقی لازم و ملزوم ہے۔ چنانچہ وسط ایشیا کی قوموں نے اکثر کچری ترقی کی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں صنعتی ترقی بھی اسی تیزی کے ساتھ ہوئی ہے۔

وسط ایشیا کے علاقوں میں زار شاہی زمانہ میں کوئی کارخانہ اور فیکٹری نہ تھی۔ سائبیرین ریلوے کی وجہ سے دو چار درگشاہ قائم کئے گئے جنہیں مشکل سے دو چار ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں سوویٹ یونین کی پالیسی یہ ہے کہ کچری علاقے تیز ترقی کریں تاکہ کچری اعتبار سے ترقی یافتہ علاقوں کے برابر ہو جائیں۔ اس لئے جتنی انڈسٹری قائم ہوئی اس کا بڑا حصہ روس کے ایشیائی علاقوں ہی میں قائم کیا گیا۔ بین الاقوامی حالات کا بھی تقاضا یہ تھا کہ سوویٹ انڈسٹری جہاں تک ہو سکے وسیع علاقے میں پھیلا دی جائے۔ کیونکہ جنگ کی حالت میں تنگ کارخانے آسانی سے برباد کئے جاسکتے ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ سوویٹ طاقت کو فوجی اعتبار سے اپنے دونوں پہلوؤں سمیت ضروری تھے۔ مشرق میں جاپان کا خطرہ اور مغرب میں جرمنی خطرہ کا اندیشہ۔ اس بناء پر سرخ فوج دو جدا جدا حصوں میں منظم کی گئی۔ ادھر ہر حصہ کے لئے پوری جنگی صنعت اسی علاقے میں قائم کرنا ضروری ہو گیا تاکہ فوجی پہلائی اور رسد و سامان کے انتظامات فوج کے ہر حصہ کے لئے آسان ہو رہیں۔ لہذا مشرقی سرخ فوج کی ضرورت کی ساری جنگی انڈسٹری اسی علاقے میں قائم ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں مغربی روس کی انڈسٹری کبھی مشرقی علاقے میں منتقل کرنا پڑا تھا۔ پھر ساری سوویٹ یونین کے لئے روس کی پہلائی وسط ایشیا کا علاقہ فراہم کرنا ہے۔ اس لئے کچری کی ساری صنعت اور ان خام پیداواروں کی صنعتیں جو اس علاقے میں پیدا ہوتی ہیں، اس علاقہ میں قائم ہوئیں۔ کاشتہ کو اتنی ترقی دی گئی ہے کہ ریگستان مرغزار بن گیا ہے۔ ایک بڑی نہر نکال کر فراد کے نام پر ایک کچی پیدا کرنے کا بہ دست پیش کیا گیا ہے اور فی الواقعہ بے ستوی کو لاکھ کر نہر نکالی گئی ہے۔ اس ذکر میں یہ ملاحظہ کرنا چاہیے کہ روس میں ایکلے ازبکستان کی صنعتی پیداوار اس سال کی افغانستان، ایران اور ترکی کی مجموعی پیداوار سے زیادہ تھی، حالانکہ ازبکستان کی آبادی ساٹھ لاکھ ہے اور ان تینوں ملکوں کی ساٹھ چار کروڑ۔ یہ حقیقت ہر وقت ذہن میں رکھنا چاہئے کہ سوویٹ یونین کے ایک علاقے میں جو حالات نظر آئیں گے وہی کم و بیش دوسرے علاقوں میں بھی دکھائی

دیں گے۔ غلط ہے کہ صنعتی پیداوار سائنسی ترقی کی محتاج ہے، اور سائنس نے جتنی ترقی سوویت روس میں کی ہے، اس کے بیان کے لئے ایک جھوٹا کتاب بھی کافی نہ ہوگی

زمانہ جنگ کا ادب کثیر الملتی سوویت لکچر بڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا کہ تازی چرمی نے حملہ کر دیا۔ بہت سے اہل فن اور صناعتوں نے مطالعہ کے کمروں کو مورچے کی خندقوں سے بدل لیا۔ اکثر لکھنے والے پہلی مرتبہ اخباری نامہ نگاروں کی حیثیت سے جنگی محاذوں پر پہنچے اور جو اہل قلم ادبی محاذ پر ہی رہے انھوں نے اسٹالین کی جولائی ۱۹۴۱ء کی اپیل کی تعمیل میں وطنی جہاد کا وعظ اور ناپاک دشمن سے متفرک یقین شروع کر دی۔ نشر نگار، واقعاتی اسکچوں اور ”رپورٹاج“ کی شکل میں سرخ فوج کے امٹ کارنامے بیان کرنے لگے، مورچے کے پیچھے جو مرد، عورت، بڑے بچے جنگی خدمات میں لگے تھے ان کو زندہ جاوید بنانے لگے۔ اسوقت کے سوویت ادب میں بلکہ تمام وسطی ایشیاء کے ادب میں دشمن دشمنی، سرد کی روز افزائی، تنظیم اور مورچوں پر جاننا تازی اور سورما کی زندہ مرقعے نظر آتے ہیں۔ کثیر الملتی سوویت شہریوں کا غیر محدود و حوصلہ اور وطنی محبت کے وہ مظاہر سامنے آتے ہیں، جہاں شکست کمرہ ہوئی اور موت عزیز ہو جاتی ہے

ایک نہایت معمولی اور جیوتنا سا واقعہ ہے لیکن اس کی تہ میں بہت بڑی اہمیت چھپی ہوئی ہے۔ ایک سرخ سپاہی اپنی خندق سے دشمن کے بڑھتے ہوئے ٹینک پر راسخ گولا پھینکتا ہے، وہ نشانہ اتنا غلط ٹھہرتا ہے کہ پھینکنے والے کو انٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کے ساتھی سمجھے ہوں گے کہ مجھ پر خوں غالب ہو گیا تھا جب ہی تو نشانہ اتنا غلط پڑا اب اس سرخ سپاہی نے اپنے اوپر لازم کر لیا کہ کوئی ایسا عمل کرے کہ اس کا تھیلہ خوں سے ڈھلک سمجھ بھی لیا ہو تو اس کا انال ہو جائے۔ چنانچہ دشمن کا جو دوسرا ٹینک اس کی مدد میں آ رہا ہے، وہ سپاہی اس پر گولا نہیں پھینکتا اور بڑھتا آتا دیتا ہے۔ وہ ٹینک بڑھتا آتا ہے یہاں تک کہ اس خندق کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ مگر وہ سرخ سپاہی اب بھی اس پر گولا پھینک کر تباہ نہیں کرتا جب وہ ٹینک اس کے اوپر سے گزر کر کچھ فاصلے پر پہنچتا ہے تو یہ سپاہی خندق سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا اور بھرگلا کر اس ٹینک کو تباہ کر دیتا ہے اس واقعہ کی اہمیت اس سپاہی کے عمل میں نہیں بلکہ اس کے احساس میں ہے

دوران جنگ کے سوویت ادب میں ایسے بے شمار کردار تخلیق ہوئے جس سے یہ ادب پہلے سے روشناس نہ تھا۔ عبداللہ قہار نے ”نچکا، غازی“ کی سوانح عمری لکھی جو ایک فوجی آدمی تھا۔ اس سوانح عمری کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف اپنے ہیرو کے داخلی کردار کے سلسلہ میں یہ بتاتا ہے کہ اس ہیرو کے سرخ نشانہ اور جاننا تازی نامہ گراموں کے اندر کوئی اسپرٹ کام کر رہی تھی، اس کی اصل دنیا دیکھ تھی۔

جنگ سے پہلے سوویت قوموں کے ادب میں جس لہ زوال قومی بھائی چارے کا اظہار ہو رہا تھا، وہ جنگ کے زمانہ میں زیادہ گہرا اور زیادہ پھیلا ہوا ہو گیا تھا۔ ہر قوم کے ادب نے صوف اپنی قوم ہی کے ہیرو اور کردار پیدا نہیں کئے، بلکہ دوسری سوویت قوموں کے ہیرو بھی تخلیق کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرخ فوج کے ہیرو تخلیق کرنے کے عمل نے تمام قوموں کے ادب کی ندیوں کو ایک بڑے دریا کا دھارا بنا دیا۔ ادب کا شاعر شجرہ فاش درندوں کے ہاتھوں یورپی قوموں کی تباہی دیکھتا ہے تو ترپ کر چیخے لگتا ہے۔

”جو سناعتی اور لکچری جو اس سرحدوں میں جمع ہوئے تھے وہ آٹا کا خاک سیاہ کر دئے گئے اور ان ابروؤں میں آفتاب نہ رہا! یورپ! آتشزدہ جنگ یورپ! لشکر زدہ زراعت یورپ! آج یورپ کی زمین زمین نہیں، ٹیکوں کے غار ہیں اور بس آج یورپ کی جوا نہ رہی ہے اور نہ ہوا لاشوں سے پٹا پڑا ہے آج یورپ کے شہروں کے انار اوجاڑ اور مکاں بے سقف و درہیں! مکاؤں کے ترخانوں میں انسان کھوپڑیوں کے خزانے بھرے ہیں آج یورپ کی دوشیزا اپنے محبوب کے دیوار سے محروم ہے آج یورپ کے بچے اپنے مردہ ماں باپ کے انتظار میں بلک رہے ہیں! یورپ! یورپ!“ اس پوری نظم میں بین قومیت اور انسانیت پرستی کا جذبہ کام کر رہا ہے۔ فرانس، پولینڈ، آسٹریا، اور چیکو سلواکیا کے محب وطن شاعر اپنے وطن کی تباہی کا وہ اس نظم سے بہتر کیا لکھتے؟

سوویت آئین نے رنگ و نسل کا فرق جرم قرار دیا اور لکچری براہمی کے لئے سوویت حکومت نے بحث ایسے بنائے اور **لکچری غلامشیں** انڈسٹری کو اس طرح مرتب کیا کہ آئین اور پالیسی پوری طرح کامیاب ہوں۔ مگر ان تحفظات کو بھی کافی نہیں سمجھا گیا۔

الغرض ہر دفعتی جمہوریہ نے اپنے جو ہر قابل بھیج کر اس جشن رنگ و راسخ کو کامیاب بنایا تھا۔
ترکمان سویتوں طرازوں اور سلطنت کاروں نے اظہارِ رائے کی تخلیق کی ہیں۔ قیامت کاروں پر "آوازیں" اور "سہیلی" کوئی کلمہ پر مشتمل ضرب
اور قیامت و دیگر ترکمان کلاموں کی مشترک کوشش کا نتیجہ۔ سلام اٹھائیں، کی علامتیں ٹائٹل میں ہیں

اسکو میں پوری سوویت یونین کے شاعروں اور ادبی قلم کی یونین کا ایک مرکز ہے جس کی شاخیں تمام دفعتی جمہوریوں
سوویت مصنفین کی یونین میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسکو کائنات کو ذات و حوت نے بھیج کر دفعتی جمہوریتوں کے ادیبوں کو بلایا اور اس جمہوریت کے نام
سے ایک شام منعقد کی جاتی ہے یا سوویت اور غیر سوویت مصنف جب اسکو آتے ہیں تو ان کے "شام" کے یہ اجتماع ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس
ادبی کلب اور مرکز کی "شامیں" کثرت سے منعقد ہوتی اور ہر ایک مستقل اداکار بن گئی اور قومی سبائی چارے کی پالیسی کا عملی پہلو ہیں
چنانچہ سوویت کی سر دیوں میں اسکو کی مرکزوں پر تاثرات رنگ کی صورتیں عام دیکھی جا رہی تھیں، کیونکہ سوویت مصنفین کے کلب نے روشن نظر
ازبکستان کے شاعروں اور ادیبوں کو جہاں بلایا تھا۔ چنانچہ اس "شام" پیٹ قائم پر بہت سے بلوروسی، یوکرینی، روسی، لیتھونیائی اور دیگر ممالک کے
ادیب و شاعر بھیجے تھے، ہاں کچھ کچھ سہل ہوا تھا

سب سے پہلے عیدِ عظیم جان، ازبک مصنفین کی یونین کے سکریٹری نے تقریر کی اور مشہور ازبک مورخ شرف الدین علی یزدی قدیم شاعر کا شہری ایوان
لطیف اور ادبی شیر ذائقے کے حوالوں سے بتایا کہ مشرقی ادب میں ازبک ادب کس قدر زیادہ متاثر ہے اور یہ کون سا تاریخی میں اس نے کیسے کیسے نشیب و فراز
دیکھے اور آج کس طرح اپنی قومی و کلاسیکی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے سوویت ادب کے تجربے دھارے میں مل کر رہا ہے۔ اس نے اس حقیقت
پر روشنی ڈالی کہ موجودہ ازبک شعراء اور ادیبوں کے نام جیسے غفور غلام، شیخزادہ، ایفول اور آفانے شعراء و اخترا و ایک سوویت یونین کے
بچے تھے کہ معلوم ہیں

حمید کی تقریر کے بعد ازبک شاعروں نے اپنی نظمیں اور ان کا روسی ترجمہ سنایا۔ یہ ادبی پروگرام قرائی کی فحوی، خرد و شیریں کے چند شعراء
پھر ازبک ایک "روشن" کا کچھ حصہ سنانے پر ختم ہوا۔ اس پرانے ایک کے اشعار جو سنانے لگے ان میں بازار کا بیان تھا اور ادبی اظہار کی قدرت
تخیل کے تصور بیان کی شگفتگی اور نازک مزاجی رنگ کا نمونہ ہیں۔ بازار کا یہ بیان دنیا کے ادب پاروں میں شمار کیا جاسکتا ہے

اس شام کا باقی پروگرام قصہ دوسیقی اور نغمہ طرازی پر مشتمل تھا۔ ازبک قصہ ہندوستانی ناپچ کی طرح زیادہ تر ہاتھوں کے حرکات اور چہرے
آواز چڑھاؤ یا ادب کے حصہ جسم کی حرکات پر مشتمل ہے۔ رقاصہ کے بازوؤں اور کلائیوں کی حرکات میں ایک وقت اگر سانپ کی ہری چال نظر آتی ہے تو
کبھی چہرہ ہونے کے آواز پر ہمارے دل کو نقشہ پیش ہو جاتا ہے۔ کسی وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کپڑے پر عجیب کیا جا رہا ہے تو دوسرے وقت روئی کے
چھنے کی کیفیت سامنے آ جاتی ہے۔ قصہ کرنے والی کے خد و خال بہت زیادہ حسی آفرینی ہوتے ہیں۔ ازبک قصہ کا کمال یہ ہے کہ رقاصہ

چہرے کے نقوش کبھی خم محراب کی شعریت کا اشارہ کرتے ہیں اور کبھی نشہ شباب کا مادہ محسوس ہونے لگتے ہیں
شان و جمال کی تصویر، رقاصہ کرم قزموں کیٹھانے جب اپنے سفید ریشمی کرتے کی دراز آستین کو دانستوں میں دبا کر بلا رقاصہ پر پیر ناخود
کیا تو لوگ وقت کا شمار بھول گئے۔ اندازِ قصہ میں اس کے مسکرا دینے سے تاشا ایفول کو زندگی کی کھیتیں یاد دہندیں۔ اور جب اس نے ناچنے ناچنے یا
پاؤں کے نیچے پر پیر کیاں میں تو لوگوں کو جھپکاتے لگے تھے

حلیہ ایضاً دفعتی سوویت یونین کے "مناع حوام" کے معزز خطاب سے سرخراہ ہے، اور مشہور ہے کہ وہ صورت کے نہیں بلکہ شکل کے لحاظ سے گنا
کھنے میں اس کی آواز کھٹکتی لگتی ہے۔ ایک نقاد نے لکھا ہے کہ وہ جب گاتی ہے تو کالج کی طرح نانگ معلوم ہوتی ہے اور اس کے گانے میں ایک غیر منظم
پرواز دے سکتی ہے۔ حلیہ و صورت سوویت یونین کی متعدد زبانیں جانتی ہے بلکہ غیر کی زبانوں میں بھی گاتی ہے اور اس کا یہ گانا خوا
نہیں کہ بولے اور گانے والوں کی طرح گلیں ہوتا ہے۔ جتنی وہ باکمال گانے والی ہے اتنی ہی شوق واداد طرازی ہے۔ یہ ادب کے حلقہ پر ہرگز
ناپیش نہ ہوئے حلقہ تکسین حاصل کر چکی ہے

اس کچری اجتماع میں جموں ڈائریکٹ تھا، سوویٹ یونین کے گوشے گوشے میں جس کا احترام کیا جاتا ہے
"کچری حضروں" کی تفصیلات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے

وسط ایشیا کے علمی اداسے
سوویٹ روس کے جامعہ کی شاخیں پر وفاقی جمہوریت کے مرکز میں قائم ہیں جہاں سریشے کی تحقیق و تلاش برابر ہوتی رہتا ہے۔ اس پورے علاقے کی علمی و کچری حرکت و عمل اندازہ کرنے کے لئے صرف ازبکستان کا فکر کافی ہوگا۔ اس لئے کہ سوویٹ یونین میں جو کام ایک علاقے میں ہو رہا ہے وہ باقی حصوں میں اسی پیمانہ پر جاری رہتا ہے۔ ازبکستان کی علمی سرگرمیوں کا مرکز ڈاکٹر اباجان نیاز محمدوف کی ہستی ہے۔ اپنی مصروفیت کے اعتبار سے نیاز محمدوف "ازبکستان کے زبان و خیال" کے انسٹی ٹیوٹ میں تحقیقاتی کام کرتا اور پہلا ماہر سائنات ہے۔ قومی لحاظ سے وہ تاجک نسل سے ہے جہاں انقلاب سے پہلے کوئی تحریری زبان بھی نہ تھی۔ نیاز محمدوف نے اسی تاجک زبان کے صرف و نحو مرتب کئے ہیں۔ وہ خود ایک غریب موچی کا لڑکا ہے اور اگر اس کا باپ بہت بڑا اور مخمذ بھی ہوتا تب بھی نیاز محمدوف کو وہ نہ بنا سکتا جو اسے سوویٹ نظام نے بنا دیا ہے

۱۹۷۷ء میں میرا ایک مضمون علی گڑھ کے رسالہ مصنف میں "ازبکستان میں علمی سرگرمیاں" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں میں نے وہاں کے متعدد علمی و کچری اداروں کے حالات بیم پہنچائے ہیں۔ اس نے اس جگہ صرف اتنا کا حوالہ کافی سمجھتا ہوں۔ سوویٹ یونین کے ادارہ شریات کی تاشقندی شاخ نے نظامی گنجوی کے فن و کلام پر پوری تحقیق و ترقیق کر کے اس کا کلیات ایک مبدعہ مقدس کے ساتھ اصل اور دوسری ترجمے کی صورت میں شائع کیا ہے۔ تاشقند میں ایک اور ادارہ "لسانی تحقیق کے لئے مخصوص ہے۔ اس ادارے نے لاطینی شرفائی کے علم و فضل اور شعرو ادب پر تحقیق کی ہے، اس کی ایک سوانح عمری مرتب کی ہے اور اس کے کلیات کا ترجمہ روسی زبان میں کر دیا ہے۔ تاشقندی شاخ جامعہ علوم نے ایک مشترکہ مخطوطات کا کتب خانہ بھی فراہم کیا ہے جس میں پچھتر ہزار قلمی نسخے ہیں اور دنیا میں اس قسم کا سب سے زیادہ عظیم الشان کتب خانہ ہے۔ قلمی نسخوں کے علاوہ پچیس ہزار مطبوعہ کتابیں ایسی ہیں جو قلمی مسودوں سے بھی زیادہ نادر ہیں۔ وہاں ایک اور ادارہ ہے جو سوویٹ یونین کے حکمران آثار قدیمہ کی ازبکستانی کمیٹی کہلاتا ہے۔ اس ادارے نے بہت سی اہم تاریخی تحقیقات عمل کی ہیں جن میں گورامیر یعنی امیر تھور کے مقبرہ اور شہزادہ النجریک کی رصد گاہ، اکثر مقبروں اور مساجد کا کھوج لگایا، مرمت کرائی یا تعمیر ثانی کی ہے۔ قادی نیازوف جو اس ادارے کا صدر بھی ہے، رصد گاہ الٹینک اور اس کی نیچے پرستار ہا جاتا ہے۔ ایک اور ادارہ "انسٹی ٹیوٹ آف میٹرل کچر" کے نام سے قائم ہے جس نے حلال ہی میں دریائے سیر کے کنارے شہر غورازم کے پانچ ہزار سال پرانے تمدن کے آثار نکالے ہیں اور کام جاری ہے

اسی طرح دوسری جمہوریتوں میں بھی یہ کام چل رہے ہیں۔ ترکمانیہ میں شیخ جمال الحق والدین کا مزار اور ستر تعمیر کرایا گیا مگر بالکل پرانے نقشے پر۔ یہ مقبرہ شیخ کے لڑکے محمد نے ۱۶۷۷ء کے قریب تعمیر کرایا تھا اور اہرین کے خیال میں ایک نہایت اہم تعمیری نمونہ ہے۔ مزہب سلطان شہر کا مقبرہ بھی ایک قدیم عمارت ہے جس کی صناعی بے مثال سمجھی جاتی ہے۔ ایک اور عمارت طائرہ بیگ خانم کا مقبرہ ہے۔ اسے امیر تیمور کی بیگم بنا دیا جاتا ہے ان سب کی مرمت یا تعمیر ثانی ہوئی ہے۔ تشر آباد، مسرائے اور داری کے درمیان ایک قصبہ ہے۔ یہاں ایک قدیم شہر کے آثار نکالے جا رہے ہیں جس کے متعلق خیال ہے کہ گیارہویں صدی میں آباد تھا

۱۹۷۷ء کے محلہ ہندوستانی میں میرا ایک اور مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان ہے "وسط ایشیا کی قوموں کا سوویٹ ادب"

طوائف کے خیال سے مزہب خانے شامل نہیں کر رہا ہوں مگر آخر میں جن شاعروں کی غزلیں اصل زبان میں دی گئی ہیں، ایک ہی درجہ کا نمونہ میں بھی لکھی ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان غزلوں میں طائفہ فکینک اور قومی پیکر و اشتراکی وصف کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ لاجپتی (دوبیہ نام) اصل زبان میں ہے اور اپنے ترقی پسندانہ فکر و خیال کی بنا پر ترک وطن پر مجبور ہوا۔ ازبکستانی وطنیت اختیار کر لی اور اب ان کا دفتر علمی و ادبی ششم، شادابی آن دم شراب شدرخ، کر شوق انقلاب و در آفتاب شدرخ نامزد ہیں۔ زمان کہ یہ نیوے پکت (دہلیا) و داس (پٹنہ)۔ ہندوستانی ہندو گروہ سلطان طائفہ سرخ

دریائے انقلاب خود پدھاب سرخ
در شریع انقلاب بہ نقس کتاب سرخ
در بزم انقلاب بہ انگ رہاب سرخ
از غول مستبد قدس دہ شراب سرخ
از انقلاب سرخ دہ آفتاب سرخ
باید بہ انقلاب دشن کتاب سرخ
گرا زمانہ بستہ بہ گردن طاب سرخ
تفسیر آیتہ ست زام الکتاب سرخ
صد بحر فحل برول جہد اندامی باب سرخ
حاضر شوہر ایک بوم الحساب سرخ
بادرکن کہ ہست بعالم خراب سرخ
از غول ظالمات دہد گر شراب سرخ
ہر چند بستہ اند بعارض نقاب سرخ
لطیف الدین احمد

قربان آل سے کہ زخوب تو تھراں
در غول شیخ و شہد و شہد واجب است غسل
مرد آن بود کہ قص نامہ بخون خویش
عینی :- در آتش ستم جگم شد کباب سرخ
بر انقلاب روس مرا سرخ کے کند
عینی بیک غزل نتوان شمع حال کرد
فطرت :- آفاق را گرفتہ سراسر سحاب سرخ
در خاک و غول فدا دین بنیان جور و ظلم
اب چشم غیر خود و ہمیں انقلاب را
صحاب ثروت ایک جہاں را بخون زود
ہر گوی کہ شیش شود مابل انقلاب
ممنون دست ساقی کو لڑخی شوم
فطرت خود قریب سید طیفان زہر

”نگار“ کے پرائے متفرق پرچے

- ۳۲ء - مارچ ۱۲ - اپریل ۸ - مئی ۸ - اگست ۸ - ستمبر ۸ - اکتوبر ۸
۳۵ء - اپریل ۱۲ - اگست ۸ - ستمبر ۸ - اکتوبر ۱۲ - نومبر ۱۲
۳۶ء - فروری ۱۲ - مئی ۱۲ - جولائی ۱۲ - ستمبر ۱۲
۳۷ء - جنوری، فروری (اصحاب کھٹ) ۸ - مارچ ۸ - مئی ۱۲ - جولائی ۱۲ - اگست ۱۲
۳۸ء - جنوری (اریخ اسلامی ہند) ۸ - فروری ۱۲ - اپریل ۸ - مئی ۱۲ - جولائی ۱۲ - اگست ۱۲
۳۹ء - جنوری (مصطفیٰ نبی) ۸ - فروری ۸ - مارچ ۸ - اپریل ۸ - مئی ۱۲ - جولائی ۱۲ - اگست ۱۲
۴۰ء - فروری ۸ - مارچ ۸ - اپریل ۸ - مئی ۸ - اگست ۸ - ستمبر ۸ - اکتوبر ۸ - نومبر ۸ - دسمبر ۸

- ۳۱ء - جنوری (فرست انجری) ۸ - جولائی ۸ - اگست ۸ - اکتوبر ۱۲ - نومبر ۸ - دسمبر ۸
۳۲ء - فروری ۱۲ - مئی ۱۲ - جولائی ۱۲ - ستمبر ۱۲
۳۳ء - جنوری، فروری (اصحاب کھٹ) ۸ - مارچ ۸ - مئی ۱۲ - جولائی ۱۲ - اگست ۱۲
۳۴ء - جنوری (اریخ اسلامی ہند) ۸ - فروری ۱۲ - اپریل ۸ - مئی ۱۲ - جولائی ۱۲ - اگست ۱۲
۳۵ء - جنوری (مصطفیٰ نبی) ۸ - فروری ۸ - مارچ ۸ - اپریل ۸ - مئی ۱۲ - جولائی ۱۲ - اگست ۱۲
۳۶ء - جنوری (اصحاب کھٹ) ۸ - مارچ ۸ - مئی ۱۲ - جولائی ۱۲ - اگست ۱۲
۳۷ء - جنوری (اریخ اسلامی ہند) ۸ - فروری ۱۲ - اپریل ۸ - مئی ۱۲ - جولائی ۱۲ - اگست ۱۲
۳۸ء - جنوری (مصطفیٰ نبی) ۸ - فروری ۸ - مارچ ۸ - اپریل ۸ - مئی ۱۲ - جولائی ۱۲ - اگست ۱۲
۳۹ء - جنوری (اصحاب کھٹ) ۸ - مارچ ۸ - مئی ۱۲ - جولائی ۱۲ - اگست ۱۲
۴۰ء - جنوری (اریخ اسلامی ہند) ۸ - فروری ۱۲ - اپریل ۸ - مئی ۱۲ - جولائی ۱۲ - اگست ۱۲

منبر نگار

انسان و انسان اعلیٰ

(برنارڈ شا کے ڈرامہ کا ایک حصہ)

(بہ سلسلہء سابق)

فرزان — توبہ! — وہی پڑا لڑکھو! — بطینت دوست! تمہاری ضرورت کا ایک کڑوہ پہلو ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ تم بہت جلد فریب کھا جاتے ہو۔ تم انسان کو خود اسی کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ تم نے اس کی بات جس راسے کا اظہار کیا ہے وہ اسے اپنی سبک بڑی تعریف سمجھے گا۔ اُسے خود کو بہادر و بد سمجھنے کا بڑا شوق ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ان میں سے کچھ بھی نہیں۔ وہ صرف بزدل ہے۔ اُسے تم ظالم۔ بیرحم۔ قاتل۔ قزاق۔ تہرہ پند کر کر پکارا تو وہ تمہاری پستش کرے گا اور اپنی رگوں میں قدیم ”بحری سلاطین“ کا فخر رواں دواں محسوس کر کے فتنہ فرد سے جھوٹے لگے گا۔ اُسے بزدل کہو تو وہ حصہ سے دیوانہ ہو جائے گا اور اس نیش زن حقیقت کو مٹانے کے لئے موت سے مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ انسان اپنے فعل و عمل کی صورت ایک خاص دم کے علاوہ ہر ایک وجہ پیش کر دیتا ہے۔ اپنے جرایم کے لئے صرف ایک خاص دم کے علاوہ ہر ایک عذر ظاہر کر دیتا ہے۔ اپنی حفاظت و سلامتی کے لئے صرف ایک چیز کے علاوہ ہر چیز کا معزز ہو جاتا ہے۔ وہ چیز اس کی بزدلی! — ایسے ہمہ اس کی تمام تہذیب اس کی اسی بزدلی اور حقیر دست اطاعت پسندی پر قائم ہے۔ وہ اسے اپنی شرافت کہتا ہے۔ گدھا اور بیل بھی ایک خاص حد سے آگے حکومت گوارا نہیں کر سکتا، لیکن انسان لا تنہا ہی طعہ پر خود کو ذلیل کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اُس کی چڑھتی خود اس کے ستارے والوں کی نظر میں اس قدر نفرت انگیز ہو جاتی ہے کہ وہ خود ہی اس کی اصلاح پر مجبور ہو جاتے ہیں

ابلیس — بالکل صحیح! — یہ ہے وہ مخلوق جس کے اندر تم وہ شے دیکھتے ہو جسے تمہارے الفاظ میں ”توبہ حیات“ کہنا چاہیے!

فرزان — بیشک! — کیونکہ ابھی اس مسئلہ کا انتہائی حیرتناک پیلو تو میں نے بیان ہی نہیں کیا

ابلیس — وہ کیا ہے؟

فرزان — یہاں کہ اس بزدلی مخلوق میں سے ہر ایک کو صرف اس کے دماغ میں ایک خیال پیدا کیے بہادر و شجاع بنایا جاسکتا ہے

مجسمہ — یہ بالکل لغو ہے۔ ایک تجربہ کار سپاہی کی حیثیت سے میں بزدلی کا اعتراف کرتا ہوں۔ یہ سب اس قدر عام ہے جتنی کہ سمندری بیادری

اور اسی قدر غیر لازم بھی۔ لیکن یہ انسان کے دماغ میں خیال پیدا کرنے والی بات بالکل لغو نہیں ہے۔ میدان جنگ میں نوجوان لڑکے

کرنے کے لئے تمہیں صرف حضورؐ سے گرم خون اور اس پختہ یقین و علم کی ضرورت ہے کہ شکست فتح سے زیادہ خطرناک ہے

فرزان — یہی وجہ ہے شاید کہ جنگ اکثر بے کار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن انسان اُس وقت تک درحقیقت خون پر غلبہ نہیں آتا جب تک وہ یہ تصور

دکھائے کہ وہ ایک طاقتور شخص کی کامیابی کے لئے جنگ کر رہا ہے۔ یعنی ایک خاص ذہنیت و خیال کی خاطر لڑ رہا ہے۔ صلیبی جنگ اسی

بحری قزاقی سے زیادہ بہادر کیوں تھا؟ — صرف اس لئے کہ وہ اپنے لئے نہیں بلکہ صلیب کے لئے لڑتا تھا۔ وہ کوئی قوت تھی جس نے

صلیبی سپاہی کا عقائد ان ہی شہادت کے ساتھ کیا جتنی کہ وہ خود رکھتا تھا۔ یہ قوت ان انسانوں کی طاقت تھی جو اپنے

مذہب کے نام پر اس کی خاطر صرف بیکار تھے۔ قریم کو دہانے والوں کے لئے لڑے تھے لیکن انھوں نے ہم سے تین چھین لیا۔

اس کے بعد جب خود ہم نے بھی اُس عظیم و بڑی عظمت و اوقاف کی خاطر نیر و آذانی کی جے "کیتھولک کلیسا" ایک آزاد مذہبیت قبول کرنا چاہئے تو ہم نے اُن کو پھر فرقہ کی طوط و کھیل دیا

ابلیس — (ظفر نے) کیا فرمایا؟ — آپ اور ایک کیتھولک! — ایک عابد! — مبارکباد قبول فرمائیے!

مجسمہ — (خجیدگی سے) دیکھو! — ایک سپاہی کی حیثیت سے میں کلیسا کے خلائق ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔

فرزان — خون نہ کیجئے کہناں صاحب! — یہ آزاد مذہبیت کا خیال و اعتقاد خود اسلام - صلیب اور اُن نااہل طفلانہ و غیر مذہب سوراٹوں کے بعد بھی زندہ رہے گا جن کی باعث کو تم فوجہ کے نام سے یاد کرتے ہو۔

مجسمہ — دیکھو فرزان تم مجھے مجبور کر رہے ہو کہ تمہیں اس مذہبہ دہنی کا مزہ چکھاؤں

فرزان — اہل بشرطیک میں اپنی توار سے اپنی حفاظت نہ کر سکیں۔ ہر وہ خیال جس کے لئے انسان اپنی زندگی قربان کرے گا صحت ایک آزاد عالمگیر خیال ہی ہوگا۔ جب اپنی کے باشندے کو آخر کار یہ علم ہوگا کہ اس میں ایک بدوی عرب سے برتر کوئی شے نہیں اور اُس کا پیغمبر بھی محمد سے بلند تر کوئی امتیاز نہیں رکھتا تو وہ بیدار ہوگا۔ پہلے سے کہیں زیادہ آزاد عالمگیر ذہنیت لے ہوئے۔ اور جس خلیفہ کو کہے میں وہ نازل مر رہا ہے اُس میں ایک عالمگیر آزادی و مساوات کے لئے اپنی زندگی کی قربانی پیش کر دے گا

مجسمہ — بالکل لغو!

فرزان — جس چیز کو تم لٹو کر رہے ہو صحت ہی ایک وہ شے ہے جس کی خاطر انسان کبھی انسانیت کے لئے مریں گے اور اس کے لئے اپنی تمام آزادی بخوشی شہید کر دیں گے

ابلیس — بے شک! — یعنی وہ ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ہمیشہ تراشتے رہیں گے

فرزان — اس میں نقصان ہی کیا ہے؟ — درحقیقت اہمیت جس چیز کو حاصل ہے وہ موت نہیں بلکہ موت کا خوف ہے۔ ہمیں ذلیل و پست کرنے والی شے دراصل ہلاک کرنا یا ہلاک ہونا نہیں بلکہ ذلیل طور پر زندہ رہنا اور ذلت کی مزدوری و انعام قبول کرنا ہے۔ ایک زندہ غلام یا آقا سے بہتر دس مردہ انسان ہیں۔ ابھی انسان پھر بیدار ہوگا۔ باپ بیٹے کے خلائق اور سبائی بھائی کے خلائق بغاوت کرے گا۔ اور یہ سب ایک دوسرے کو انسان و غلامی کی خاطر ہلاک کرنا شروع کریں گے

ابلیس — اور آخر کار یہی آزادی و مساوات جس کے لئے تم قصیدہ خوانی کرتے ہو آزاد سفید فام عیسائیوں کو مزدوری کے بازار میں اُن سیاہ کافر غلاموں سے بھی کہیں اڑا کر دے گی جو چوراہوں پر نیلام کے ذریعہ فروخت ہوتے ہیں

فرزان — ڈرو نہیں! — سفید فام مزدور کی بھی باری آکر رہے گی۔ لیکن اس وقت میں ان سرائی ننگوں کی حمایت نہیں کر رہا ہوں جو عظیم و بلند خیالات اختیار کر لیتے ہیں۔ میں تمہارے سامنے اس حقیقت کی مثالیں پیش کر رہا ہوں کہ یہ پست جانور جو انسان کہلاتا ہے اور جو اپنے ذاتی خود غرضانہ معاملات میں سراسر ایک بزدل حیوان ہے، ایک بلند و عالمگیر خیال کی خاطر ایک مثالیں پیش کر رہا ہوں کہ یہ پست جانور جو عظیم و بلند ایک بڑا امن شہری کی حیثیت میں انسان ذلیل و پست ہو سکتا ہے لیکن ایک عقیدہ کے پرچم پرست کی شکل میں وہ بڑا خطرناک ہے اُسے صحت اس حالت میں غلام بنایا جاسکتا ہے جبکہ وہ روحانی طور پر اس قدر ضعیف ہو کہ عقلی استدلال کو سن سکے۔ میں آپ سب کے سامنے دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر آپ انسان کے سامنے اُس کام کا ایک جزو پیش کریں جسے وہ آجکل فدائی کا کام کہتا ہے اور جسے وہ مستقبل میں اور بہت سے جدید ناموں سے منسوب کرے گا تو آپ اُسے اس کام کے اُن تمام نتائج کی طرف سے قطعی بے خوف بناسکتے ہیں جو اُس کی ذات کے لئے خطرناک ہو سکتے ہیں

سارہ — ہاں ہاں — وہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے پہلے چلی کرے گا اور ان سے جنگ کرنے کے لئے اپنی خیرک زندگی کو تہا چھوڑ دے گا۔

مجسمہ — بہت خوب میری بیٹی! — تم اس کی گفتگو کو اپنی نظری عقل پر حاوی نہ ہونے دینا۔

ابلیس — افسوس کہتاں صاحب! — اب جبکہ ہماری گفتگو کا سلسلہ ”حیثیت“ کے عنوان تک پہنچ گیا ہے، پیشکش اور بھی زیادہ تقریر و مباحثہ کرے گا۔ ایں ہمہ میں اعتراض کرنا ہوں کہ میرے لئے ایک ہی عنوان انتہائی دلچسپ چیز ہے

نرزان — معزز خاتون! — ایک عورت کے لئے مرد کی نام ذمہ داریاں اور فرائض صرف اس ایک کام سے شروع اور اس کا خاتمہ ہوتا ہے جس کو کہ اس عورت کے بچوں کے واسطے روٹی نہیا کر دے۔ عورت کے نزدیک، مرد کا وجود صرف اس ایک مقصد کا ذریعہ ہے کہ بچے پیدا ہوں اور پھرورش یابن۔

سارہ — کیا ایک عورت کی ذہنیت کی بابت یہ خیال ہے تمہارا؟ — میں اسے انسانیت کی ذلت اور تفریق پر حیرت مانتی ہوں۔

فرزان — معاف کرنا سارہ! — میں نے عورت کی پوری ذہنیت کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا۔ میں نے صرف یہ بتایا ہے کہ وہ مرد کو ایک جداگانہ جنس کی حیثیت سے کس نظر سے دیکھتی ہے۔ میرے اسی الفاظ میں انسانیت کی ذلت اس سے زیادہ ہرگز نہیں جتنی کہ خود اپنے متعلق عورت کے اس زاویہ نظر میں کہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت ”ان“ ہوتا ہے۔ جنسی لحاظ سے عورت ایک ذریعہ ہے جسے غفلت اپنے بلند ترین کارنامہ کی بقا کے لئے استعمال کرتی ہے۔ جنسی لحاظ سے مرد ایک ذریعہ ہے جسے عورت غفلت کے ارشاد کو انتہائی گفایت شعاری کے ساتھ بھلا جانے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ وہ جتنی طور پر یہ جانتی ہے کہ سلسلہ ارتقاء کی دور دراز گزشتہ منزلوں میں خود اسی نے مرد کو ایجاد کیا۔

جنسی تنوع عطا کیا۔ اور تخلیق کیا تا کہ یہ ”جنسی عمل“ کے ذریعہ جو مخلوق پیدا کی جاسکتی ہے اس سے بہتر کوئی شے پیدا کی جاسکے۔ جب تک مرد اس مقصد کی تکمیل کرتا رہتا ہے جس کے لئے عورت نے اسے بنایا ہے اُس وقت تک مرد کو آزادی ہے کہ وہ اپنے خواہشوں۔ اپنی حاکمیتوں۔ اپنے خیالات اور اپنے شہوانہ مشاغل میں مصروف رہے بشرطیکہ اسی سب مشاغل کا مرکز عورت۔ مال۔ خاندان اور گھر دار کی پرسش ہے۔

لیکن کس قدر محنت آمیز اور خطرناک امر تھا ایک ایسے جداگانہ حیوان کو تخلیق کرنا جس کا واحد مقصد آفرینش عورت نے یہ قرار دیا کہ خود اسے بچے عطا کرے! — کیونکہ خدا دیکھئے اور سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ سب سے اول تو یہ کہ مرد نے عورت کے ذریعہ اپنی تعداد بڑھائی ہے یہاں تک کہ اب مرد بھی اسی قدر ہیں جتنی کہ عورتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عورت اپنے مقصد کے لئے اس زبردست قوت کا حصہ ایک حقیقی جزئی استعمال کر سکتی ہے جو اس نے مرد کے اندر اس کو عمل پروری کی زبردست مشقت سے محفوظ کر کے رکھ دیا ہے۔

تھی۔ یہ زبردست قوت مرد کے داغ اور اصحاب کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ وہ اس قدر قوی ہو گیا ہے کہ عورت جسمانی لحاظ سے اُس پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ دماغی لحاظ سے وہ اس قدر توانا اور تعمیل پسند ہو چکا ہے کہ صرف اپنے ہی جیسے دوسرے انسان پیدا کرنے پر قناعت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اُس نے تہذیب و تمدن کو پیدا کیا۔ لیکن عورت سے استعصاب رائے کے بغیر ہی۔ اس تہذیب کی بنیاد ہی اس نے اس خبیثت پر رکھی کہ عورت غافل خدمت کے لئے ہے۔

سارہ — دیگر امور سے قطع نظر چیزِ ماضیہ ایک حقیقت ہے

ابلیس — ہاں! — اور یہ تہذیب! — یہ کیا بلا ہے؟

فرزانی — تمہاری بہت دفر مسودہ زہر افشا نیوں کا ایک خوبصورت عنوان ! — وہ حقیقت تہذیب نام ہے مرد کی اس کوشش کا جس کی غرض ولادت ہے کہ مرد صرف عورت کے مقصد کا ایک ذریعہ نہ رہے بلکہ اس سے بلند تر کوئی مقام حاصل کر سکے۔ زندگی نے صرف اپنی بقا و قیام ہی کے لئے ہمیں بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ حیوانی شکل حاصل کرنے اور خود اپنے اس راہ کے متعلق کھلے سے کھلے علم پر دسترس پانے کے لئے تکیہ کیا جو مسلسل و طویل کوشش جاری کر رکھی ہے اس کا انجام ہنوز خشک و نظر آنا نہیں ہے اور نہیں کیا ہو سکتا کہ زندگی اور موت و انحطاط کی قوتوں کے درمیان جو معرکہ آرائی قائم ہے وہ کس طرح ختم ہوگی۔ اس جنگ کے تمام محاربات محض انحطاط ہیں اور حقیقی عسکری محاربات کی طرح ان میں سے جیتری فتح و کامیابی کو پس پا لادنے کی ہمت سے کوئی شخص نہیں رہا۔

جسٹس۔۔۔ مجھ پر ایک طنز ہے۔۔۔ فری کوئی مضامین نہیں۔۔۔ ان خراجے۔

فرزان — مظہر ہے ایک ایسی قوت پر جو تم سے کہیں بلند ہے کہ تان صاحب! — یہ معاملہ تو تم نے بھی اپنے پیشے میں تجربہ کیا ہو گا کہ ایک برہنہ قوت پر ظہر بھی کاربائے میں تعجب ہو سکتا ہے بشرطیکہ فہم کا سپہ سالار اس سے کسی قدر زیادہ برہنہ قوت ہو

مجسمہ — (بہت سنجیدگی سے) بالکل صحیح فرزان — بالکل صحیح — بعض گڑھے چیز تک طرہ برہنہ قوت ہوتے ہیں

فرزان — اہماتو سنو — ”قوت حیات“ برہنہ قوت ہے لیکن اس قدر برہنہ قوت نہیں جتنی کہ موت و اختلاط کی قوتیں ہیں۔ علاوہ انہی یہ قوتیں پیشہ سے ملتی لازم بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ”ذہنی“ جیت جاتی ہے۔ ہم اپنی طبیعت میں وہ سب کچھ رکھتے ہیں جسے قوت تولید کی افراط و تفریط کہہ سکتی ہے اور حواس محض قائم و باقی رکھ سکتی ہے۔ تہذیب خواہ کوئی بھی شکل اختیار کریں نہ کرے۔ یہ یقین ہے کہ دنیا میں بہترین تفنگ اور توڑنا ترین تفنگ ہوا کا جوہر باقی ہی رہے گا۔

ابلیس — بالکل درست! — یعنی دنیا میں ”ذہنی“ کا نہیں بلکہ موت کا موثر ترین ذریعہ باقی رہے گا تم اپنی گفتگو میں کچھ وسیع راستہ پر ہوتے ہوئے اپنی کچھ کچھ اور پہلو تھی کی ہزاروں کوششوں کے باوجود آخر کار خدا اسی نتیجہ پر پہنچے ہو جو میں انداز کرتا ہوں۔ اور پھر تمہاری تقریر دل کا یہ طول!

فرزان — خوب! — طویل تقریریں پہلے کے شروع کریں؟ — یہ معاملہ اگر میری گفتگو تمہاری فہم کو متقابل برداشت ہو چکا معلوم ہوتی ہے تو تمہیں اختیار ہے کہ ہم سے رخصت ہو جاؤ اور حق و محنت کی اسی نوعیت کے اپنے دیگر مفصل کی محبوب مشاغل کی تلاش کرو

ابلیس — (بہت آدردہ ہو کر) — الفاظ دیانت و انسان کے مظہر نہیں فرزان — اور آداب مجلس کے بھی علمان ہیں۔ ہم و غرض کی دنیا میں مجھے بھی ایک جگہ حاصل ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے اور کئی پر کہہ سکتا ہے۔ میں بڑی دیانت سے تمہارے ساتھ بحث کر رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ کامیابی کے ساتھ تمہارے دلائل کو قطع کر رہا ہوں۔ اگر تم چاہو تو آؤ ایک گھنٹہ اور یہی سلسلہ جاری رہے

فرزان — بہت مناسب! — آؤ۔

مجسمہ — مجھے ذرا بھی امید نہیں کہ تم کسی خاص فیصلہ پر پہنچ سکو گے فرزان — باہمی جہد و کوشش اس دنیا میں ہمیں تفسیر اوقات کے بجائے ”تفسیر اہریت“ کرتا ہے اس لئے تم دونوں اپنی بحث کو ضرور جاری رکھو

فرزان — (کسی قدر تنگ کر) — میری سرواٹے قدیم شاہکار! — میرا نقطہ گفتگو تمہاری فہم سے ایک قدم آگے ہے۔ کیا تم سب کو میرے اس نقطہ سے اتفاق ہے کہ ”ذہنی“ ایک ایسی قوت ہے جس نے عموماً کو نظم کرنے کے لئے بے شمار بحرواں کئے ہیں یعنی انسان اور تدبیر عظیم و خالق عظیم! — چہاں اور قدیم دیو سیکل بناتی کیڑے۔ گھماں اور لپٹو اور لپٹاؤں کیسا۔ سب کے سب اسی ”قوت خام“ کو اعلیٰ سے اعلیٰ افراد کی شکل میں ترتیب دینے کی کم و بیش کامیاب کوششیں ہیں۔ اور اہل تمام کوششوں کا آخری مقصد ارفع ہے کہ کسی طرح ایک ایسا وجود ترتیب دیا جائے جو سب کچھ کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ جسے سب کچھ علم ہو۔ جس سے کوئی سہو و خطا ممکن نہ ہو اور جسے اہل سب خصوصیات کے ساتھ ساتھ خود اپنے وجود کا کل و حقیقی علم حاصل ہو۔ یعنی مختصر آئیں کہ ایک دیوتا! — کیا تمہیں میرے اس نقطہ سے اتفاق ہے؟

ابلیس — میں اس سے اتفاق کرتا ہوں بحث کی خاطر۔

مجسمہ — میں اس سے اتفاق کرتا ہوں بحث سے بچنے کے لئے۔

سارہ — جہاں تک رہنمائی کیلیاں کا تعلق ہے میں تمہارے اسی الفاظ سے شدید مخالفت کرتی ہوں۔ میں تم سے درخواست کروں گی کہ ان بزرگ ہستیوں کو اس موجودہ بحث میں کھینچ کر نہ لائے

فرزان — میں کام تو میں نے ساتھ شخص اس نے اس ضمن میں لیا ہے کہ مجھے اتفاق میں صوفی کیسائیت کی دعوت مطلوب تھی۔ اور آئندہ میں اہل کی طرف کوئی اشارہ نہ کروں گا۔ اہل تو اب ایک ساتھ کے اس تصور عرض سے قطع نظر سب میری گفتگو سے بالکل متفق ہو چکے ہیں تو میں ایک قدم اور آگے آتا ہوں۔ کیا تمہیں اب اس کے بعد تسلیم نہیں کہ ”ذہنی“ نے دنیا میں تحقیق کرنے کے لئے جوہر میں جس قدر بھی

بنائیں اُن میں اپنی کامیابی کو ناپنے کے لئے حسن ظاہری و جسمانی تکمیل کو چھوڑ نہیں بنایا کیونکہ جیسا کہ بہت عرصہ ہوا ہمارے دوست ارسطو قانیئر نے ظاہر کیا ہے حسن و جسمانی تکمیل کے لحاظ سے ہر عرصہ بہت ہی بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اُن کی قوت پر داز۔ اُن کے خوبصورت پردہ بال۔ اور بھون کی معصومانہ محبت و آشتیاں سازی کی وہ شہرت۔ ان تمام خصوصیات نے اُن کو ظاہری حسن و جمال اور جسمانی تکمیل دونوں لحاظ سے مخلوق میں اس درجہ پر مہولی حد تک برتری دیدی ہے کہ اگر زندگی کا آخری سطح نظر واقعی حسن و محبت ہی ہو تا تو یہ ناقابل یقین ہے کہ ان خوبصورت طبعہ کو تخلیق کرنے کے بعد وہ ایک دوسرے راستے پر جدوجہد شروع کرتی اور اُس جہد سے باقی اور ہیبت ناک ہند کی تخلیق میں عرق و زہی کرتی جس کی افلاک ہم سب ہیں

سارہ — ارسطو قانیئر کا فرشتہ اور مجھے ڈر ہے فرزان کو تم اس سے کچھ بہتر نہیں ہو۔
الیس — تو ان تمام امور سے تم ہی نتیجہ اخذ کرتے ہو تاکہ ”زندگی“ بھدی اور بد ہیبت مخلوق کی آفرینش چاہتی تھی؟
فرزان — نہیں! — کچھ ہم الیس — ہزار بار نہیں — ”زندگی“ داغ — کچھ آفرینش چاہتی تھی — داغ! — زندگی کی محبوب شہ! —
اور ایک ایسا آکھ جس کی مدد سے زندگی صرف شعور ذات ہی نہیں بلکہ تہہیم ذات بھی کر سکے
جستہ — یہ تو ابجد طبیعیات ہے فرزان! — کس کم بخت شیطان نے کہا ہے کہ تم۔۔۔۔۔ (الیس سے) توبہ معاف کیجئے!
الیس — معافی کی ضرورت نہیں۔ لوگ جب کسی فقرہ پر زور دینے کے لئے میرا نام استعمال کرتے ہیں تو میں ہمیشہ اسے اپنے لئے باعث اعزاز و تحسین تصور کرتا ہوں۔ میرا نام تمہاری خدمت کے لئے ہمہ وقت حاضر ہے پستان صاحب۔

جستہ — شکریہ! — بڑی عنایت ہے تمہاری۔ گفتگو کی اپنی قدیم فوجی عادت سے میں جنت میں بھی کبھی پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا میں فرزان سے جو سوال کرتا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ زندگی کو ایک ”داغ“ کے حصول کے لئے خود کو پریشان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟۔ زندگی خود کو کھینچا ہی کیوں چاہتی ہے؟۔ صرف خود سے لذت اندوز ہونے پر قناعت کیوں نہیں کرتی؟

فرزان — اگر ”داغ“ نہ ہو تو ہم محض لاعلمی کی کیفیت ہی میں حفا اندوز کیسکتے ہیں۔ اور یہ لاعلمی سارے کیف و حفا کو تباہ کر دیتی ہے
جستہ — صبح۔ بالکل صبح۔ لیکن میرے خیال میں صرف اس قدر داغ کافی ہے کہ ہمیں یہ علم ہو سکے کہ ہم مسرور و محظوظ ہو رہے ہیں۔ میں یہ نہیں سمجھتا چاہتا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ ہماری تفریح و مسرت اپنے متعلق فکر و غور کو برداشت نہیں کر سکتی
فرزان — یہی وجہ ہے کہ ہم و خرد اس درجہ ناقابل ہے۔ لیکن انسان کے پس پردہ زندگی کی جو قوت کار فرما ہے اس کے لئے ہم و خرد ایک اہم ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ گمراہ ہو کر موت کی گھاٹی میں پہنچ جاتی ہے۔ جس طرح زندگی نے قرون کی جدوجہد کے بعد آکھ جیسے حیرتناک جسمانی آکر ارتقاء عطا کیا تاکہ ذہنیات جسم دیکھ سکے کہ وہ کھر جا رہا ہے اور اس کی اداد یا ایذا کے لئے کیا چیز اس کی طرف آرہی ہے اور اس طرح اُن ہزاروں خطرات سے خود کو محفوظ رکھ سکے جو اس سے شیراز کو ہلاک کر ڈالتے تھے بالکل اسی طرح ”زندگی“ آج ایک ذہنی و داغی آکھ کی ارتقاء عطا کر رہی ہے جو کہ ادنیٰ دُعا کو نہیں بلکہ ”زندگی“ کے مقصد کو دیکھ سکے گی اور اس طرح ہر فرد انسانی کو اس قابل بنادے گی کہ وہ اس مقصد کے لئے کار فرما ہو جائے اور اس کی راہ میں ان کوتاہ نظر ذاتی مقاصد کی دیواریں حایل نہ کرے جو کہ آجکل حایل نظر آ رہی ہیں۔
واقعہ یہ ہے کہ صرف ایک ہی قسم کا انسان ایسا ہے جو ہمیشہ مسرور رہا ہے اور جو مختلف مفادوں اور خود فریبیوں کے تمام اختلافات کے درمیان ایک عالمگیر نگاہ تو قیود اعزاز سے دیکھا گیا ہے

جستہ — تمہارا مطلب فوجی انسان سے ہے۔
فرزان — پستان صاحب! میرا مطلب فوجی انسان نہیں۔ فوجی انسان کو قریب آتا ہے کہ دنیا اپنی روح کی مقفل اور اپنی عورتوں کو غائب و مفور کر دیتی ہے۔ نہیں! — میری تحسین کا موضوع ”شہاوت انسان اور اس کے اسلحہ“ نہیں بلکہ میرا مرکز نظر دھن ہے فلسفی انسان۔
وہ انسان جس کا غور و فکر دنیا کے باطنی اداد و مقصد کو بے نقاب کرے۔ جس کی قوت اختراع و ایجاد اس مقصد کی تکمیل کے ذریعہ

تلاش و مہیا کرتی ہے۔ اور جس کا فصل و فحل ان دریافت شدہ ذیلیع سے اس اہم مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ اس انسان کے علاوہ اور باقی تمام اقسام کے انسانوں سے میں طبعی آگاہی چکا ہوں۔ باقی سب کے سب ناکام ہیں۔ یلوس کن اور منہجن حد تک ناکام۔ جب میں کرۂ ارض پر موجود تھا تو تمام قسم کے اہرین علوم و فنون میری تکمیل میں گئے رہتے تھے تاکہ میرے وجود میں کوئی ایسا نقص یا بیاہ جزو یافتہ نہ ہو جس کو وہ اپنا تختہ مشق بنائیں۔ علم الادویہ کے ماہرین مجھے اس فکر و غور پر مجبور کرنا چاہتے تھے کہ مجھے اپنے جسم کی حفاظت کے لئے کیا کرنا ضروری ہے اور محض قیاسی امراض کے لئے نیم حکیمانہ قسم کی دوا میں پیش کرتے تھے۔ میں ان کو جواب دیتا تھا کہ میں خلل دروغ میں مبتلا نہیں ہوں۔ وہ مجھے جاہل و احمق قرار دیتے اور چلے جاتے تھے۔ ذہبیات کے علماء مجھے اس غور و فکر پر مجبور کرنا چاہتے تھے کہ مجھے اپنی روح کی حفاظت کے لئے کیا کرنا ضروری ہے۔ لیکن میں ذہنی اختلال سے روحانی طور پر بھی اسی قدر دور تھا جتنا کہ جسمانی اعتبار سے اور اس لئے اس مشورہ پر بھی کوئی کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ اس لئے یہ لوگ مجھے کافر و مہین قرار دیتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے بعد سیاست دان آتے تھے اور کہتے تھے کہ فطرت کے تمام کارخانے میں صرف ایک ہی مقصد کا فرما ہے اور وہ یہ کہ سیاست کا ماہر کسی طرح پارلیمنٹ میں پہنچ جائے۔ میں اپنے سیاسی دوست کو جواب دیتا تھا کہ مجھے اس کے پارلیمنٹ میں پہنچنے یا نہ پہنچنے کی کوئی پروا نہیں۔ سنی کروہ مجھے مردود سیاست قرار دیتا اور چلا جاتا تھا۔ اس کے بعد روانوی انسان آیا۔ فنون لطیفہ کا ماہر۔ اپنے محبت الگیر لغات و تصادیر اور نظمیں لے ہوئے۔ یہ وہ شخص تھا جس کی سعادت میں مجھے کئی سال تک بڑی مسرت اور بڑا فائدہ حاصل ہوا کیونکہ اس کی خاطر میں نے اپنے حواس کو ارتقاء و تربیت دی۔ اس کے لغات نے میرے کانوں کو سینے کا ایک بہتر طریقہ، اس کی تصاویر نے میری آنکھوں کو دیکھنے کا ایک بہتر سلیقہ اور اس کی فطرتوں نے میرے دل کو تہیں کرنے کا ایک گہرا انداز عطا کیا۔ لیکن اس شخص نے مجھے انجام کار عورت کی پرستش میں مبتلا کر دیا

سارہ — فرزان !

فرزان — ہاں — مجھے یقین ہو گیا کہ عورت کی آواز ہی میں لغت کی تمام موسیقیت پنہاں ہے۔ اس کے حسن صورت ہی میں بہار کی تمام رعنائیاں اور اس کی روح میں نظارہ شہریت کے تمام جذبات مخفی ہیں۔

سارہ — اور خاتما یہ چیز تمہارے لئے بڑی یلوس کن ثابت ہوئی ہوگی۔ لیکن اگر تم نے ان تمام غریبوں کو عورت کی طرف منسوب کیا تو کیا اس میں کوئی عورت کا قصور تھا ؟

فرزان — ہاں ایک حد تک ! — کیونکہ ایک حیرتناک جتنی چالاک کے ساتھ وہ خود خاموش رہی اور مجھے اس امر کی اجازت دیدی کہ میں اُسے اسی طرح محاسن سے متصف کرتا رہوں اور اُس کی بابت خود اپنی قیاس آرائیوں اور خیالات و احساسات کو غلطی سے اُس کی فطرت کے حقیقی سمجھتا ہوں میرا دوست یعنی ”روانوی انسان“ خود اس قدر غفلت اور ڈر پرک شخص تھا کہ جو عورتیں جن و حال ان تہذیب و اخلاق میں اس کے بلند ترین معیار کے لحاظ سے مکمل ثابت ہوئی تھیں وہ ان کے نزدیک یونچے سے محروم تھا اور اس لئے وہ صرف اپنے خواہوں کا یقین اپنے ساتھ لے جاتا اپنی قبر میں جا کر سو گیا۔ لیکن فطرت اور حالات مجھ پر زیادہ مہربان تھے۔ میں اعلیٰ خاندان سے متعلق ایک اور دولت مند انسان تھا اور اگر کبھی میری شخصیت عورتوں کو مسرور کرنے میں ناکام ثابت ہوتی تھی تو میری زبان ان کی تصنیف خواہی کر کے اس کی کوریا کر دیتی تھی حالانکہ عام پر میں نے ان دونوں امور میں خود کو خوش قسمت پایا ہے۔

مجسمہ — بڑے خود ناہو تم !

فرزان — بالکل صحیح — لیکن میری خود نانی بھی مسرور کن تھی — مجھے تجربہ ہوا کہ جب کوئی محبت میری ذات میں ایک جاہلیت و دلکشی محسوس کرنے لگتی تھی تو وہ مجھے اس خیال پر یقین کرنے کے لئے پوری آگاہی دیتی تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ لیکن جب میرا تمام محبت منظور کر لیا جاتا تو کبھی بھی یہ نہیں کہتی تھی کہ ”میں مسرور ہوں۔ میری محبت غلط ہے۔“ وہ ہمیشہ سب سے پہلے کہتی کہ ”تمہارا تمام بندشیں اور کلاں دور ہند ہی نہیں ہے اور اس کے بعد وہ دریافت کرتی کہ ”اب پھر کب آؤ گے ؟“

سارہ — بالکل سچی بات مرد کہتے ہیں۔

فرزان — میرا دھوی ہے کہیں نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ لیکن عورتیں سب کی سب یہی کہتی ہیں۔ ان کے دوجلوں سے میں ہمیشہ خالیں دسرا سیر ہو کر رہ گیا ہوں۔
کیونکہ ان دونوں میں سے پہلا جملہ کا مفہوم تو یہ ہے کہ اس تمام معاشرے سے عورت کا حقیقی مقصد اور اصلی جذبہ صرف یہ تھا کہ میری شخصیت کی چہار دیواریوں کو منہم کر کے میرے وجود پر قابض ہو جائے۔ اور دوسرے جملہ کا مطلب اعلانِ طور پر یہ ہے کہ اب آئندہ وہ مجھے اپنی ایک مقبوضہ و ملوکہ شے تصور کرتی ہے اور میرے تمام اوقات کو اپنے لئے وقف سمجھتی ہے۔

ابلیس — یہی وہ مقام ہے جہاں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ تمہارے پہلو میں ولی نہیں ہے۔

جسمہ — (اپنا سر ہلاتے ہوئے) عورتوں کے ادا کردہ الفاظ تم کو دہرانے نہیں چاہئے۔

سارہ — (سختی سے) وہ الفاظ تمہارے لئے مقدس امانت ہیں۔

جسمہ — ایسے ہی واقعہ ہے کہ عورتیں ایسا کہتی ضرور ہیں۔ ہندوؤں اور یہودوں کی تو مجھے کبھی زیادہ پردہ نہیں رہی لیکن ہاں یہ دوسری بات کسی حد تک حیرت و حسد کی چیز ہے۔

فرزان — اور اس کے بعد یہ عورت جو قبل ازیں کافی مسرور اور کابل رہ چکی ہے یکایک فکر مند اور مجبورِ حد سے زیادہ متوجہ ہو جاتی تھی۔ اب اس کا ایک مستقل شغل یہ ہو جاتا تھا کہ میرے خلاف سازشیں اور چال بازیوں کو کرتی رہے۔ میرا تعاقب کرے۔ مجھے سخت نگرانی میں رکھے۔ میری خاطر اپنی کین گاہ میں بیٹھی رہے اور اس طرح اپنے شرار کو بالکل "یقینی و محض" بنانے کے لئے اپنی تمام تر قوتیں صرف کر دے۔ اور یہ شکار کوں تھا؟۔ میں!۔ لیکن یقیناً یہ چیز ہرگز وہ نہ تھی جس کی خاطر میں نے یہ جھگڑا مول لیا تھا۔ جو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ بالکل مناسب اور بالکل فطری قرار دیا جائے، لیکن مجھے جس موسیقی، مصوری اور شربت کی تلاش تھی اور ایک حسین عورت کی شکل میں جس مجسمہ مسرت کی جستجو تھی اس محبت میں اس کا کوئی رد نہ تھا۔ اسی لئے میں اس سے اپنا دامن چھڑا کر بھاگ گیا۔ مجھے اکثر اس سے فرار ہونا پڑا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ میں اس طرح فرار ہونے میں کافی مشہور ہو گیا۔

سارہ — تمہارا مفہوم بڑا نام ہونے سے ہے۔

فرزان — میں تمہارے پاس سے نہیں بھاگا۔ کیا تم دوسری عورتوں سے فرار ہونے پر مجھے لازم تصور کرتی ہو؟

سارہ — کس قدر خوب باتیں کرتے ہو!۔ تم اس وقت ایک، دو، سال کی عمر محض سے گفتگو کر رہے ہو۔ اگر تمہیں موقع مل جاتا۔ یا یہاں کہو کہ اگر میں تمہیں ایسا موقع دیتی تو تم یقیناً مجھے بھی چھوڑ کر فرار ہو جاتے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ مجھے گریز اختیار کرنا تمہارے لئے اس قدر سہل ثابت نہ ہوتا جتنا کہ شاید چند دوسری عورتوں کے مسئلے میں ہوا ہوگا۔ اگر وہ اپنے گمراہ اپنے فرائض کے ساتھ وفادار رہیں رہتے تو ضرور ہی یہ کہ ان کو جس پر آکادہ لگا جائے مجھے یہ کہنے میں کوئی ہلک نہیں کہ تم سب مرد ہی چاہتے ہو کہ موسیقی، مصوری، شربت کے خوبصورت مجسموں سے شادی کرو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تم یہ نہیں سمجھتے کہ یہ سب کچھ کہہ کر دنیا میں ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اگر تمہیں کوئی وقت دہشت سے بے بسی ہوئی عورتیں تمہارے نزدیک قابلِ پسند نہ لگی ہیں تو پھر تمہیں ان کے بغیر ہی زندگی گزارنا ہوگی۔ عورتوں کو جس کوئی دہشت دہشت سے بڑا ہے شہو ہوں بدعت کتا ہوتی ہے انہیں گشت و بہشت سے بے بسی ہی ہوئی عورتوں کو برداشت کرنا ہوگا۔ (ابلیس کچھ مذہب نظر آتا ہے اور مجسمہ نگار اندر میں شعر بناتا ہے) میں دیکھتی ہوں کہ تم میرے کس کو مجھے چھوڑ نہیں۔ لیکن ناچہ۔ ایک حقیقت ہے۔ اس نے اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو مجھ کو کواہ سے قبول لگائی ہوگا۔

فرزان — حیرت خیزی!۔ تم نے دو ماں کے خلاف میرے تمام دلائل و غماز کو چند جملوں میں ادا کر دیا ہے۔ بالکل سیدھا ہے۔ میں جس کے تحت میں نے اس روحانی انسان سے کبھی آپس کا کبھی گفتگو کی تھی اپنے سمیع و سماعت زندہ اور لہجہ خود محاسن کو اپنی فانی و جمالیات پسند فطرت سے تیر کرنا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی جہالت میں اپنی آنکھوں اور کانوں کا استعمال کیسے کیا لیکن میں نے اس سے کہہ دیا کہ ایک فلسفہ و حیات کے اعتبار سے اس کی تمام پسند و ناپسند اور کاش صورت ایک پرکاش سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ میں کہتا ہوں کہ اس نے مجھے ایک کن کا اثر اپنی ان پختہ ہمت

قرار دیا اور چلا گیا۔

سارہ — اس سے معلوم ہوا کہ عورت نے اپنے تمام نقایص و معائب کے باوجود تمہیں کچھ سکھایا بھی ضرور۔

فرزان — عورت نے میرے لئے اس سے کہیں زیادہ کام کیا۔ اس نے دیگر تمام تعلیمات کا مفہوم بھی مجھے سمجھایا۔ آہ! میرے دوستو! نہ پوچھو کہ جب پہلے پہل حجابات و قیود اٹھے تو کس قدر حیرتناک روشنی میری عقل و فہم پر طلوع ہوئی! میں کو طیار کیا تھا سوچ رہا تھا کہ میرے لئے۔ مسرت و غمخوار ہو جانے کے لئے اور محبت کے نوجوان خواب کے تمام طلسمات میں جذب ہو جانے کے لئے۔ لیکن اُن! جب درمیانی منزل میں اور رکاوٹیں ہٹ گئیں تو میں نے دیکھا کہ میری قوت اور کمال فہم اس قدر واضح و تیز اور میرا شعور و عقیدہ اس درجہ اور بے لاگ حساس ہو گیا تھا کہ اس سے پہلے کبھی بھی نہ ہونے لگا تھا۔ میری محبوبہ کی ذات کا ہر ایک عیب اُس کے انتہائی حاسد و قریب کو بھی اس درجہ وضاحت کے ساتھ نظر نہ آسکتا تھا جتنا کہ مجھے۔ وہ مجھے بیوقوف نہیں بتا سکی۔ میں نے اس کو قبول کیا پورے ہوش و حواس کے ساتھ۔ اس آپریشن کے وقت میں کلوروفارم کے زیر اثر نہ تھا!

لیکن تم نے اسے قبول تو کیا!

فرزان — یہ ایک الہام تھا۔ اس ساعت سے پیشتر میں نے کبھی اپنے اس شعور و احساس کو ضائع نہ ہونے دیا تھا کہ اپنا مالک میں خود ہوں۔ اور کبھی کوئی قدم ایسا نہ اٹھایا تھا جس کا میری عقل و خرد نے جائزہ لیکر مناسب قرار نہ دیدیا ہو۔ میرا عقیدہ ہو چکا تھا کہ اس ایک خاص اسلامی مخلوق ہوں۔ ایک مفکر!۔ احقر فلسفی کا ہمنا ہو کر میں بھی کہتا تھا کہ میں زندہ ہوں اور اس لئے سوچتا ہوں۔ نیز کہ ”میں اور زیادہ سوچوں گا اور اس لئے اور زیادہ زندہ بن سکوں گا“

مجسمہ — یہ الفاظ تو انتہائی غیر مادی اور ابعاد الطبیعیات کی دنیا سے متعلق معلوم ہوتے ہیں فرزان۔ اگر تم محسوس اور مادی حدود میں رہو اور اپنے حقیقت کردہ حقایق کو عقوتوں کی بابت دلچسپ و رنگین دکایات کی صورت میں بیان کرو تو تمہاری گفتگو کو سمجھنا زیادہ آسان ہوگا۔

فرزان — لیکن اب مجھے کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ جب میں ”عورت“ کے بے پناہ قرب میں اس کے بالکل بالمقابل استاد تھا تو میرے صاف و روشن اور عقیدہ دار باغ کا ہر ایک ریشہ مجھے متنبہ کرتا تھا کہ میں اُسے نظر انداز نہ کر دوں اور خود کو پچا لوں۔ میں ”عورت“ کی طرف آگے بڑھنا چاہتا تھا تو میرے اخلاق چلا اٹھے کہ۔ ”ہرگز نہیں“۔ میرا ضمیر بکارتا تھا ”ہرگز نہیں“۔ میرا جذبہ شجاعت اور خود عورت کے لئے میرا احساس ترحم مجھے روکتا تھا کہ ”ہرگز نہیں“۔ میری سلامتی کے لئے میری مصلحت اندیشی کہتی تھی کہ ”ہرگز نہیں“۔ میری سماعت کو ہزاروں قنفذوں کی مشق حاصل تھی اور میری بصارت کو ہزاروں تصویروں کی۔ ان دونوں نے عورت کی آواز۔ عورت کی شکل و صورت اور عورت کے رنگ و رخسار کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میرے سامنے ڈال دیے اور ان مقررہ اجزا میں مجھے صاف نظر آگیا کہ اب سے تیس سال کے بعد اس عورت کی شکل و صورت کیسی ہو جائے گی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہنسنے ہوئے بوڑھے منہ کے اندر ایک مردہ دانت پر سونے کی جھلک نمایاں ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے بوڑھے رنگ و ریشہ کے کیمیادہی اجزاء سے عجیب قسم کی بو آ رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ میں اپنے حسین روانہ و انوی خواہش میں غرق ہوں کے دلچسپ میدانوں کے درمیان ایک ایسی مخلوق کے پیلوں پہلو محو فرام تھا جو موت اور بڑھاپا دونوں سے آزاد نظر آتی تھی اور جس کی تخلیق خود حسن سے ہوئی تھی۔ لیکن اب زندگی کے اس اہم موقع پر وہ تمام خواب مجھے چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔ مجھے وہ سارے خواب اب تک یاد ضرور تھے اور میں انہیں دوبارہ حاصل کرنے کے لئے جدوجہد بھی کرتا تھا، لیکن اب وہ سب کے سب انتہائی بے بنیاد و بھل اختراعات نظر آتے تھے۔ میری قوت تیز و فیصلہ کسی طرح اپنی صحت کو قربان کرنا نہیں چاہتی تھی اور میرا باغ اب بھی ہر معاملہ میں ”ہرگز نہیں“ کی صدا بلند کرتا تھا۔ اور پھر ٹھیک اس وقت جبکہ میں اس عورت سے معذرت کے ساتھ گریز اختیار کرنا چاہتا تھا ”زندگی“ نے مجھے اپنی گرفت میں جکڑ لیا اور اس عورت کی آغوش میں مجھے اس طرح پھینک دیا جیسے کوئی طرح مچھلی کے ایک نالارہ ٹکڑے کو ایک بکری طائر کے منہ میں پھینک دے۔

مسعود جاوید (بی۔ اے۔)

(بانی)

کے اقبل کے دور کے بعض شعراء کے معاصر رہے ہیں مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ اقبل کے شاعر دور اقبل میں نوجوان اور نو آموذ تھے اور اس وقت انھوں نے کوئی شہرت نہیں حاصل کی تھی اور دور اقبل کے شاعر کچھ سال اور شائق مشہور ہو چکے تھے اس کے علاوہ زبان کا فرق بھی بہت کم قابل ملاحظہ ہے۔ اس دور میں یہ مقابلہ دور اقبل کے زبان اور نیز ہندش کے اعتبار سے شعریں بہت کم ترقی ہوئی بہت سے پرانے الفاظ اور ترکیبیں متروک ہو گئیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ اور جدید ترکیبوں نے لے لی۔ اس معاملہ میں زبان اور دافشا کی بہت احسان مند بہ جنھوں نے اس کی ترمیم اور ترقی کے لئے بہت سے نئے تجارب اختیار کئے۔ معصی البتہ قدما کے پیرو تھے جنھوں نے نظم کی قدیم روایات کو جاری رکھا۔ جرات بھی غزل میں تیر کے پیرو تھے۔

(تاریخ ادب اردو معصفہ وام بابو سکینہ)

یہ دونوں اعتبارات ملاحظہ کیجئے اور اس دور کی خصوصیات پر کس کے یہاں زیادہ روشنی پڑتی ہے اس کا فیصلہ آپ خود کر لیجئے۔ مواد اور ساختہ خاص طور سے قابل توجہ ہے۔

عموماً ہمارے مورخین نے تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جو بہت کچھ سوانح حیات سے متعلق ہوا کرتا ہے جس میں گہر نہیں سیرت نگاری کی بہت۔ ہند کی جھلک نظر آتی ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں شاعر کے کلام پر رائیں ہوا کرتی ہیں جن کا بیشتر حصہ قصیدہ ہوتا ہے۔ سوانح حیات کا ایک بڑا حصہ جیسا کہ ابھی ادھر کہا جا چکا ہے روایتی ہوا کرتا ہے جو دوسروں سے مستعار ہوتا ہے۔ اس میں شکی نہیں کہ اس کے لئے کم مورخین کو تھوڑی رعایت دے سکتے ہیں اس لئے کہ مواد کی فراہمی میں بعض اوقات ایسی دقتیں ضرور پیش آتی ہیں مگر جہاں سے سیرت نگاری کی سرحد شروع ہوتی ہو وہاں ہم مورخ کو قطعی معاف نہیں کر سکتے۔ شخصیت کی پرکھ میں کیسا نیت کا ہونا کچھ عجیب ضرور ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کے متعلق جو رائے میں قائم کروں اور وہی رائے آپ کی بھی ہو۔

تاریخ کے اس حصہ کو اور خاص طور سے پوری تاریخ کو جو چیز نامکمل بنائے ہے وہ ہمارا اخلاقی نظام ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ زندگی کی قدر و قیمتیں ہمارے ہمارے ناواقفیت۔ ہمارا اخلاقی نظام بھی اور چیزوں کی طرح پور زوالی ہے جس کا معیار صرف چند چیزوں پر ہے۔ آدمی کو باعصمت ہونا چاہئے۔ آدمی میں سنجیدگی ہونی چاہئے۔ اسے صرت ثواب کاٹنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ گناہ کا خیال آنے ہی کو یا انسان آدھا گناہ کر لیتا ہے۔ سچے بولو۔ جھوٹ سے پرہیز کرو۔ ہر وہ چیز جسے ہم تیری سمجھیں تیری ہے۔ بڑوں کا کہنا ماننا چاہئے عام اس کے آدھ غلط کہتے ہیں یا سمجھ۔ یا پھر وہ چیزیں جو انسانی اخلاقیات کا بلند ترین معیار قرار دی گئی ہیں۔ گویا انسان کو فرشتہ ہونا چاہئے۔ دوسری بات جو ہمارے ذہن میں ہے وہ یہ کہ ہر اچھا آدمی بالکل اچھا ہے اور ہر بُرا آدمی بالکل بُرا۔ ناچھے آدمی میں کوئی بُرائی آسکتی ہے نہ بُرے آدمی میں کوئی اچھائی ہو سکتی ہے۔ زندگی کی قدریں جیسی بن گئیں ویسے ہی قائم ہیں۔ اس نظریے سے بظاہر تو کوئی نقصان نظر نہیں آتا مگر غور کیا جائے تو ایک بڑی حد تک نظریات ادیب کی فکر اور اس کی شخصیت پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات ہم اسی وجہ سے انہیں سمجھ پانے قادر سعدی جس نے گلستاں اور بوستاں میں ایسے بہترین اخلاقی نکات پیش کئے ہیں اُسی سعدی نے اپنی اخلاقی تعلیم میں ایک باب (باب پنجم گلستاں) ایسا کیسے لکھ دیا جسے لوگ آج محرب اخلاق سمجھتے ہیں یا تیرنے :

پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم

تمیش رو بہت ہے وہ زر گر پسر

اُسے عطار کے فونڈے سے دوا لیتے ہیں

تیر کی سادے ہیں پیار ہوئے جس کے سبب

یا شاہ آبرئے :

کاش دے حور کے بدلے بھی تو غلاماں مجھ کو

ہاں تک خوش ہوں امداد سے کہ راب کریم

جہاں جاویں دہاں ال آدھ کو ہم تاک رہتے ہیں

زہن ہم کو نہایت شوق ہے امد پرستی سے

جیسے اشعار کس ذہنی تحریک کے تحت میں لکھے۔ جب ہم ان چیزوں کو دیکھ کر تاریخ پر ایک تجسس آمیز نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں اس کی وجہ کی نظر نہیں آتی اور اگر کہیں کچھ ظاہری ہیجہ عبارت میں کوہ غزل کا شہرین جاتا ہے جس کا اطلاق مشرقی حقیقی و مجازی۔ سیاست۔ حقیقت۔ طریقت سب پر ہو سکتا ہے۔ پردہ پوشی کچھ تو اس لئے ہوتی ہے کہ ہم نے غصہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور زیادہ تر اس لئے کہ خطائے بزرگان کو نقصان خطاست چنانچہ ہم۔ جاننے کی

کوشش نہیں کرتے کہ محنت اور مشق بنیادی صوبہ کی ہر کون چکر لگا کر کتے ہیں اس کے دائرے کے باطن میں ہے اور کیوں جرات کے یہاں لذت پر پڑا ہو گئی ہے۔ وہ ان کی ساری زندگی جو درد کو صوفیانہ مسائل سے دلچسپی لینے پر مجبور کرتا ہے اور وہ کوئی چیز ہے جو نظریہ آزادی سے جاڑے کا شاہد دیکھ کر کچھ کہتا ہے۔

جب ایسی سوجھ بوجھ دل تپ رہا ہو کہ کھاتیں ہوں کچھ نرم سمجھنے کے عمل کے کچھ عیش کی لمبی راتیں ہوں
مشتوق لگے سے پشیمان ہو، اور کہنی، چٹلی، لائیں ہوں کچھ بوسے جے جاتے ہوں کچھ میٹھی میٹھی باتیں ہوں
دل عیش و طرب میں چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہمارے مورخین کی یہ زبردست غلطی ہے کہ وہ فن کار کے قیود پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ کسی ادیب کی وہ ذہنی یا عصبی تحریک جیسے مغرب خلاق یا گناہ سمجھا جاتا ہے اس پر کوئی ایسی روشنی ڈالی جائے کہ ایہات اور گتھیاں جسے بعض اوقات ہم سمجھنے سے مجبور ہو جاتے ہیں ہمارے سامنے آئیں کی طرح روشن ہو جائیں۔ ادیب میں انفرادیت کا جزو کم اور اس کی زندگی کی الجھنوں یا خوشگوار لمحوں کا بڑا حصہ ہوا کرتا ہے اور یہی چیز کبھی کبھی انفرادیت نظر آنے لگتی ہے۔

یہ ایک اور زردانی ذہنیت رہی ہے کہ آرٹ کو ہم نے یا تو انفرادی چال یا معاشرتی۔ دراصل ایک آرٹ فیلڈ ہے آرٹ کی انفرادیت اور اس کے گرد و پیش کے ماحول سے تضاد کا اور یہی وہ ٹکڑی ہے جو آرٹ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ آرٹ کو محض آرٹ کے لئے خلق نہ کرے بلکہ عینیت پرستی سے پیچھا چھڑا کر ایک عام انسانی درد اس کے ذمہ رہنے کی جہد و جدوجہد کرتی ہے۔ آئے آرٹ کے ساتھ پیش کرے۔ ہمارے قدیم فنکار اس میں شک نہیں بڑی مددگار بن گئے تھے۔ عامی رہے مگر ہمیں ان کی تخلیق پر نظر ڈالنے وقت ان کی زندگی اور ان کے گرد و پیش کو فراموش نہ کرنا چاہئے۔ خواہ انھوں نے ایسا شعوری طور پر کیا یا غیر شعوری اور پر گمراہی میں ہی کے ماحول اور ان کی کششوں کا زبردست ہاتھ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے روایت سے خوب کام لیا جس سے ہمیں ان کی زندگی کے سمجھنے میں سخت دقتیں پیش آتی ہیں۔ ان کے انکار ان کی زندگی پر قطعیت کے ساتھ کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ وہ یکسانیت کے رنگ میں اتنے گہرے رنگے ہوئے ہیں کہ آپ لام سے پہلے پتہ نہیں لگا سکتے کہ کسے واقعی مشق تھا اور کون محض دم نہا رہا ہے سب کے جذبات اور حیات میں یکسانیت لے گی۔ وصل و وصل ایک ہی طریقہ پر ہوگا۔ ہمیں سب کو ایک ہی طرح کی دشواریاں پیش آئیں گی سب کا مشق بے وفا ہوگا۔ وعدہ شکن ہوگا۔ سب کا سراپا ایک ہوگا۔ سب خوبصورتی کا شالہ بنوے۔ دل لگے۔ یہی دقتیں ہیں جن کی بنا پر ہمارے مورخین جو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی صحیح طور پر شاعر کو نہیں سمجھ پاتے مگر کچھ یہ بھی ہے کہ ہمارے مورخین یا دہریہ ایک ہی ٹکڑی کو دیکھتے آئے ہیں اور وہ گہرے غریبی ہے۔

سماں بھول کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مورخین کے سامنے کسی شاعر کے کلام پر نظر ڈالنے وقت صرف ایک ہی چیز پیش نظر ہوتی ہے اور وہ یہ کہ فنکار نے کہاں تک فن کی تکمیل کی ہے اور فنی اصولوں کو اس نے کہاں تک نبھایا ہے۔ کہاں اضافت کی غلطیاں ہیں۔ کہاں حروف گرتے ہیں، کہاں شکر گرتی ہیں، ہفتی کو صرہ کا درجہ کیا ہے۔ کون کون سی رعایتیں ہیں۔ کہاں روانی ہے۔ کہاں سلاست ہے۔ مارتات تھیں کا بیان مکمل اور جامع ہے یا نہیں۔ یہ چیزیں ہیں جنہیں ہمارے مورخین اور رجعت پسند نقاد و منتقد کی طرح دہرا دہرا کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں یہ ذہنیتیں چاہتی ہیں کہ ہر ادیب۔ ہر فن کار کا وہی فقار نظر ہی سیدھا ہو جاوے کچھ شاعروں اور ادیبوں کا ہونا آیا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہر دوسرے دو کا ادیب یا شاعر اپنے پہلے دور کے ادیب یا شاعر کی طرح کبھی سچے یا اس کے نظریات بھی دہرا کیوں رہیں۔ کروچے (CROCE) کا کہنا ہے کہ آرٹ ابہام ہے اور ابہام انفرادیت اور انفرادیت دہرائی میں جا سکتی ہے۔ خیال مجھے ہے تو ہر کس طرح ایک انفرادی خصوصیت جو آپ کو پسند ہے اور جو کبھی صدی میں موجود تھی۔ آج کے فن کار سے بھی آپ ان کے اب ہوں۔ ہم دیکھتے تو اٹھ کرتے وقت کو یا داس کے فن کی ہونے اور زمانہ کی رفتار کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ گویا ہم چاہتے ہیں کہ آرٹ جس طرح بھی عام یا غیر معمولی ہو جو ہمیں کسی طرح قایم رہے اور اگر پڑے تو انھیں اصولوں پر اور اس طرح ہم ہمیشہ غرور کو آواز دیتے رہیں۔ ہمارے مورخین اس سے قضا کر رہے ہیں اور ان کی کئی کئی بار کہاں تک اپنی سماجی ضرورتیں اور دقتیں پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے اور کہاں اس نے چشم پوشی کی ہے اور

ایک پتھر روشنی کسی جبر کے باعث ہوئی ہے، ادب کی ذہنیت ہی میں فرسودگی اور خوشامد کا انداز آگیا ہے۔ ہاں اسے ان ضرورتوں سے انکار ہے یا وہ آرٹ کو بعض خود غرضی بنانا چاہتا ہے۔ کہاں اس نے ضمیر فروشی کی ہے اور کہاں اس نے ضمیر فروشی کرائی تھی ہے۔ ایک مورخ ان سب باتوں کو واضح طور پر پیش نہیں کر رہا ہے تو وہ مورخ تو ہے مگر ادب کا مورخ ہرگز نہیں۔

”خطائے بزرگانِ گرفتار خطاست“ سے بہت کچھ سنا جلتا ہمارے مورخین کا ایک اور رجحان ہے جسے ”خطائے خرداں“ شخصیت یا ہیرو پرستی کہہ لیتے۔ ہمارے مورخ اس کا بہت جلد شکار ہو جاتے ہیں اور اسی سے ایک اور شاخ پھوٹتی ہے وہ ہے شخصیت دشمنی۔ مورخ کسی سے یا تو بے انتہا متاثر ہونا ہے یہاں تک کہ اسے اس فن کار میں کوئی خرابی ہی نظر نہیں آتی اور اگر کوئی کمی ہے تو اسے بھی خوبی میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یا پھر کسی فن کار سے محبت میں دشمنی مول لے لی جاتی ہے اور اس کی تمام خوبیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس کی خوبیوں کو بھی اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ خرابی معلوم ہوں۔ اس کی بین مثال ’آب حیات‘ میں ذوقی و طالب کا تذکرہ۔ موازنہ آئیں و دستبردار یا دگار غالب (گویہ ذوقی کتاب میں تاریخی نوٹیں مگر واقعات ان میں تاریخی حیثیت ہی سے بیان کئے گئے ہیں) ہیں۔ یہ تینوں کتابیں میر پرستی کا شکار ہیں۔ اور لطف تو یہ ہے کہ جو تاریخی ان کے بعد مرتب ہوئیں وہ بھی ان سے متاثر ہیں اور اسی طرح کے بے سرو پیر واقعات اور غیر تحقیقی تصورات کا ایک ذخیرہ ان میں بھی موجود ہے۔

تاریخ۔ خصوصاً ادب کی تاریخ صرف واقعات کا مجموعہ ہرگز نہیں بن سکتی۔ مورخ کو انسان کے ارتقائی راج اور ارتقائی جدوجہد کو اپنے اندر واضح طریقے سے سمجھنا بہت ضروری ہے جو مورخ کو واقعات کے ساتھ ملا کر ایک صحیح شکل کے مرتب کرنے میں مدد ثابت ہو اور اگر وہ انسان کے اجتماعی، اقتصادی، اور ثقافتی ارتقاء سے بہ خوبی واقف نہیں ہے تو وہ ہرگز ایک مورخ نہیں بن سکتا۔ عملی طریقے سے انسان کی ترقی مادی ہی ہو سکتی ہے چاہے وہ اقتصادیات میں ہو چاہے کچر میں۔ اور یہی ایک ایسی ترقی ہوگی جس کی منزل ایک معلوم منزل ہوگی۔ تصور پرستی نہ تو ترقی ہو سکتی ہے اور نہ انسانی جماعت اس سے مستفید ہو سکے گی۔ ہمارے مورخ زیادہ تر اسی کمزوری کا شکار ہیں۔ ان کے نظریات بھی زیادہ تر عینی ہیں۔ نہ وہ مادہ کی گونا گوں صلاحیتوں سے واقف ہیں اور نہ اس کے کوشش کو انسانی ترقی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید کا میلان بہت کچھ تصور پرستی کی طرف ہے جس میں ترقی کے صرف چند محدود اصول مل سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ عینی اصول عمل کے میدان میں بالکل بے کار ثابت ہوں گے۔ نتیجہ کے طور پر مورخین یا تو ان کے موافق رائے دیتے ہیں جنہوں نے تصور پرستی سے کام لیا ہے اور جسے تفصیل کی بلندی کہا جاتا ہے یا پھر ان کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کریں گے جو تصور کی چٹھیل پر نہیں پہنچتے جاتے اس لئے کہ وہ عمل کے میدان میں چل رہے ہیں۔

آج جدید ادب کا ترقی پسند حصہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کا حامل ہے اور بعض ایسی تلخ حقیقتیں ہیں جن سے ابھی لوگ واقف بھی نہیں اور کچھ یہ بھی ہے کہ لوگ جس طرز پر یہ بیانات چاہتے ہیں، ہمارا طرز اظہار اس سے الگ ہے۔ آپ فن چاہتے ہیں اور صرف فن۔ اور آئی وہ آرٹ جسے پرہیزگار کہا جاتا ہے۔ اس میں احساس کی تلخی اتنی آشجری ہوئی ہے کہ بعض اوقات ہمارے مورخین اور رجعت پرست نقادوں کے نزدیک فن کا فن ہو جاتا ہے اور جس کا ہونا لازمی ہے اس لئے کہ جدوجہد میں کسے رکھ رکھاؤ کا خیال رہ جاتا ہے۔ یہ لوگ شاید اس نقطہ سے واقف نہیں کہ انقلابی دور کا آرٹ صرف آرٹ نہیں رہ سکتا۔ اسے فہم، مفکر، سیاست دال، سبھی کچھ ہونا پڑتا ہے۔ انقلابی دور کا یہ خاصہ ہوا کرتا ہے اس کے علاوہ زندگی حرکت ہے اور انقلاب ایک زبردست حرکت۔ آرٹ ایک مقام پر جا رہا ہو کہ نہیں رہ سکتا۔ اسے یا تو آگے بڑھنا ہوگا یا پیچھے ہٹنا ہوگا۔ بین بین چلے گا کوئی راستہ نہیں ہے۔

سید محمد عقیل

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عظیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان و تخیل اس کی نثر کی زبان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء حال سحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔ قیمت دور ویر علاوہ محصول

نیمبر نگار

(مرزا غالب آئے ہیں)

لو۔ اب میان مٹھو کو تھوڑی سی چوری دے دو۔

غالب — چڑیا بین بے سیر۔ آپ نے بھی یہ دخل سنا، لیکن زندگی کتنی ہی بے ثبات ہو اس کا یہ مرتبہ تو دیکھئے کہ اس پر دخل کچھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ دھوٹا بھر بولتا ہے کہ میں مٹھو! اب کیا فریاد ہے؟ آج چوری نہیں ملی؟ اسے میان خوش رہو۔ نہ تمہارے بچے نہ جمد، چوری کھاؤ اور مرے کرو۔ یہی زندگی ہے!

بیگم — ان باتوں سے کیا فائدہ؟ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری اپنی زندگی کیسی ہے؟

غالب — اچھی اور بُری اور اچھی!

بیگم — اب یہ پیلیاں بھلا کون بوجھے؟

غالب — بات تو صاف کہنا ہوں۔ سب سے پہلے اچھی اس لئے کہ ہا ہوں کہ شروٹ میں برسوں تک زندگی خوب گزری۔ سب سے بُری اس لئے کہ کچھ چار پانچ برس سے ہم لوگ چکر میں ہیں اور پھر دوبارہ اچھی اس لئے کہ مقدمے کا فیصلہ ہونے ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

بیگم — میں تو پانچ سال سے انھیں امیدوں پر جمی رہی ہوں!

غالب — تو اب یوں ہونے کی کوئی وجہ بھی ہو، سرکار انگریزی نے بچپن میں برس پہلے ہم دونوں بھائیوں کے لئے دس ہزار سالانہ کی جاگیر ضروری کی۔ شمس الدین خاں نواب ہیں تو فریاد نہ کر، جبر کے ہیں، میرے سرکاری وظیفے کے نواب نہیں ہیں۔ نہ اس میں تعزیت کرنے کے مجاز ہیں۔ ہمارے اس دس ہزار کو مندرجہ کون بنا سکتا ہے؟ سرکاری شے کسی کی جعل سازی سے بدل نہیں جاتے۔ یہ تم مل کر رہے گی، بلکہ اگر انصاف ہو تو اب تک اس ملک میں قدر کم رقم ملتی رہی ہے۔ اُس کی اصلاحات ابتداء سے آج تک دلوائی جائے گی۔

بیگم — (زہر خند سے انصاف! میں نے صرف اس کا نام سنا ہے۔ انصاف کرنے والے فاکم جلتے ہیں۔ معزول ہوتے ہیں، مرتد ہیں مگر انصاف نہیں ہوتا۔

غالب — انصاف ہوگا!

بیگم — نہیں ہوگا! ایسے انصاف کو میں کیا کروں جس کے انتظار میں اب بھائی پاگل ہو گیا اور دوسرا۔

غالب — اور دوسرا؟

بیگم — اور دوسرا مل گیا۔ چٹکی کے دباؤوں تلے پس کر رہ گیا۔

غالب — میرا پس ہوا کچھ ایسا آسان نہیں ہے۔ چٹکی کے پاٹ البتہ گھس گئے ہیں۔ ابھی اور گھسیں گے۔

(باہر کے دروازے پر دستک۔ وار خاں لازم آتا ہے)

وار خاں — سرکار! مولانا فضل حق صاحب کا آدمی یہ رقعہ چھوڑ گیا ہے۔

غالب — مولانا کو آہ خود یہاں آتا تھا۔ خیر لاؤ۔ رقعہ — (رقعہ کھولتے ہوئے) اچھا! کر ڈی مل جا جن کو میرے خلاف ڈگری مل گئی۔ ہوں!

کہہ ڈی مل بھی کیا کرے، کلکتہ جانے سے پہلے اُس سے قرضہ لیا تھا۔ اب کر ڈی مل اور دیوانی عدالت کا پیادہ میری تلاش میں مڑا رہا ہے۔

بیگم — اب کیا ہوگا؟

غالب — ہو گیا، گھر میں بیٹھوں گا۔ (طوطا بولتا ہے) میان مٹھو سے باتیں کر دوں گا۔ آپ کی نازی میں عارض ہوں گا۔ دستور کے مطابق شرفا کو دیوانی عدالت کے ڈگری دار گھر کے اندر تو گرفتار نہیں سکتے۔ اور دی کے وقت میں! بھر نکلنے سے سہا (ڈرا ہنس کر) دونوں وقت تھے جب چورخ میٹھی بڑتی ہے میں میں بھی چمکے ڈروں کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے نکلا کر دوں گا، اور باہر کا کام دھندلا کر آیا کر دوں گا۔ وار خاں! دیکھو سرس کی لگی جاؤ۔ جو چھینٹ میں نے آج فضل کے لئے فریدی تھی وہ عزیز انسا (خاتم میری بھتیجی کو دے دو) (بیگم سے ذرا دیر سے بچے میں) (دیکھتے ہوئے کوسرے کو)

ہے۔ اور دیکھو! یوسف بیگ خاں کا حال دیکھنا اور کہنا کہ میں آج حکیم صاحب کو نہیں لاؤں گا۔ میں کل صوبہ کے بعد انھیں ساتھ لے آیا تھا۔ (وار خاں جانتا ہے) بھابھا بوسن! ہمارے لوگوں میں لوگ کہا کرتے تھے کہ دونوں بھائیوں میں دھبی گناؤں بھگا۔ کیا بھائی تھا، مجھے لوہے کی لکڑی۔

وہ جب حیدر آباد سے اپنے رسلے کو چھوڑ کر آیا تو دیکھ کر دل کا پھٹا جاتا تھا۔ — مجھ کو، ٹوٹی ہوئی مکان کی طرح بے حال، اگر اُس کو

مال ٹھیک ہوتا تو میں اس مقدس کے لئے شاید اسی کو کھڑے بیٹتا۔

بیگم — ان کلکتہ کے کام سے میرے سینے میں ایک تیر لگتا ہے۔ اس کلکتہ کی امید نے ہمیں ویرانی کر دیا۔ ورنہ کلکتہ کے دہار سے کچھ نہ کچھ مل گیا ہوتا۔
غالب — (فراتنی سے) تمہیں کلکتہ کے دہار کا حال کیا معلوم؟ دشمن اقلیدہ کے ہاتھ دو چار ہزار کے عوض اپنی آبروی بچ ڈالتا؟ وہ اگر اپنی سلطنت
تھا، تو میں بھی خاندانی شریف تھا۔ وہ میری تعظیم دینے پر کیوں آمادہ نہ ہوا؟ کیا اس کے لئے یہ کافی نہ تھا کہ میں نے اس کی مدد میں ایک شرطیار
کی؟ اس کے ساتھ یہ شرطیوں کو لگائی گئی۔ کہ اگر انہوں کی طرح غور بھی پیش کر دوں؟ میں نے خود کہا کہ میں ایسی مصوری سے معافی چاہتا ہوں۔
بیگم — اچھا ہمارا مقدر!

غالب — جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ ہم اگر شکوہ کریں بھی تو کیا حاصل؟

بیگم — ہاں تمہارے لئے سب کچھ آسان ہے۔ اور نہیں تو شعر لکھ کر دل کی بھڑاس بھال لی۔

غالب — آپ کے آنسوؤں سے بھی تو دل کی بھڑاس خوب نکل جاتی ہے!

بیگم — (دردناک آواز میں) تو کیوں نہ روؤں! باپ مر گیا۔ بھائی سے تمہاری ان بن ہو گئی۔ مکان بیک گیا۔ گھر میں جو زیور یا کپڑا تھا وہ بھی یہ جاگیر کا
مقدور کھا گیا۔ اب تمہارے پیچھے عدالت کے پیادے قید کوئے کو بھرتے ہیں۔ بچے تھے۔۔۔۔۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) وہ مرکز مجھے جس شانے
میں چھوڑ گئے میرا ہی دل جانتا ہے (سسکایاں لے کر دوتے ہوئے) کیسے پیارے بچے تھے جیسے چاند کے ٹکڑے! ابھی تھلا نا ہی شروع کیا تھا کہ اٹھ کر
پیارے ہو گئے (روتے ہوئے) ایک ایک کر کے سب گئے۔ پلا۔۔۔۔۔ اور دوسرا پھر تیرا بھی۔۔۔۔۔ چھٹا بھی۔ (مختصر وقفہ)

غالب — (آہستہ سے) دو دنیاویں انسان بن خاں آج ادھر نہیں آیا؟ میں نے سمجھ اُس سے کہا تو تھا کھڑی دو گھڑی کے لئے اپنی خانہ کے پاس ہو جایا کرو۔۔۔۔۔
بڑا نیک بہت لڑکا ہے کسی کام کی وجہ سے رُک گیا ہو گا۔ دیکھو صبح اُن کے ہاں جانا اور کہنا میاں بھول کیوں گئے؟ تمہاری خاندانی میں کڑھتی
رہتی ہیں۔ یہاں آؤ گے، کچھ میں تمہیں بڑھا دوں گا۔ کچھ تمہاری خاتم سے باتیں کریں گی ان کا بھی پہل جائے گا۔۔۔۔۔ اور بیگم اب جلد ہی ہمارے
دن پھریں گے۔ میرے کاغذات کو ریزہ ریزہ کے سامنے مقرب پیش ہوں گے۔ انگریز مسکریٹری میرا دوست ہے۔

بیگم — ہاں مگر سال بھر پہلے وہ بھی تو تمہارا دوست تھا۔ دلی کا انگریز ایکٹ۔۔۔۔۔

غالب — کون بڑک؟

بیگم — جو معزول ہو گیا۔ خیر سب تر نے دل کو یوں تسلی دی کہ اس کی جگہ دوسرا انگریز دوست آ گیا۔

غالب — ہاں ان فریئر۔

بیگم — لیکن فریئر چھ ہفتے کے اندر بدل گیا اور اس کی جگہ نیارینڈنٹ آیا جو تمہارا نہیں، شمس الدین خاں کا دوست ہے۔

غالب — تو کیا ہوا ہر دارا ایسے ہی اتفاق تو پیش نہیں آتے۔ نہ بالکتر کی روداد پر آخری فیصلہ ہو جائے گا۔ کلکتہ میں لاٹ صاحب کا مسکریٹری اسٹرنگٹ
میرا محکمہ اور بھی خواہ ہے۔ کیا خوب آدمی ہے۔ پہلی ملاقات پر شریفوں کی طرح اُسے کچھ تعظیم دی۔ اپنے ہاتھ سے عطر اور لالچہ پیش کی اور بعد
میں بھی ہوشیار کریم سے پیش آ رہا۔ میرے کاغذات اسی کے ہاتھ سے نکلیں گے۔ پھر ابھی چند سال وہ اپنی جگہ سے ٹل بھی نہیں سکتا۔ اس لئے مجھے کوئی
خطرہ نہیں ہے۔ اسٹرنگٹ کلکتے میں ہے تو سب ٹھیک ہے۔
(باہر کے دروازے پر دستک)

بیگم — بااںہی خیر! اب یہ کون آیا؟

غالب — کوئی نہیں، دارخان صاحب آئے ہوں۔

دارخان — سرکار صدر الصدور صاحب کا توئی میرے ساتھ ہی پہونچا اور یہ پرچہ ہے کیا۔

غالب — آج صبح دو سنتوں کی طرف سے ایک ایک رقم فرود آئے گا۔ لاؤ دیکھیں کیا کچھ ہیں مفتی صدر الدین خاں صاحب (کاغذ کھولتے ہیں)

بیگم — خدا کی قسم خیر! خیر!

غالب — لکھتے سے خبر آئی ہے۔۔۔۔۔ اسٹرلنگ صاحب ۲۲ روپے کو مرگے! — اسے جوں مرگ!

یہ مرزا غالب کی زندگی کا ایک رخ تھا لیکن اس ذاتی اور ذاتی پریشانی کے علاوہ ان کی زندگی کے کچھ اور پہلو بھی تھے۔ ان پہلوؤں کا تعلق ان کے روشن ضمیر دوستوں کی صحبت اور ان کی بڑھتی ہوئی شاعرانہ شہرت سے تھا۔ لاہور ڈولیم پبلشنگ کمپنی نے مقدمات فیصلہ کن کے خلاف کیا۔ کچھ پرانی پریشانیوں میں کچھ ہوئی، کچھ نئی پریشانیوں کا اضافہ ہوا۔ اسی طرح وہ بارہ سال گزار گئے۔ اس زمانہ میں ایک صبح کا ذکر یہ کہ مولانا فضل حق خیر آبادی مرزا غالب کے مکان پر پہنچے۔

مولانا — ارے بھئی مرزا، اب اٹھو اور خدا کا نام لو۔ مرد خدا یہ بھلا سونے کا وقت ہے؟ میں دو گھنٹی تم سے بات کرنے آیا تھا اور تم ہو کہ شرابیوں کی طرح صبح کے وقت غافل پڑے ہو۔

غالب — یہ جو آپ نے مجھے شرابی سے تشبیہ دی، اسے اصطلاح میں تشبیہ نام کہتے ہیں۔

مولانا — اب آپ علم معالیٰ پر اپنا درس رہنے دیجئے اور ذرا اٹھ کر ہاتھ منہ دھو لیجئے۔

غالب — بھئی مولانا، مجھے اتنی مہلت تو دو کہ تمھاری تقریب آوری پر ذرا غرض ہو لوں۔ میں خواب دیکھ رہا تھا کہ قلعہ رملی سے چوہا مارنے آکر خبر دی کہ جلال اللہ نے یاد فرمایا ہے سو اسی خواب کی تعبیر تمھاری ملاقات ہے۔

جہاں نے مختصر خواہم کہ درو سے ہمیں جائے من و جاہے تو باشد

کھڑا آتا ہے میں پانی لاؤ۔ ذرا منہ بھی دھو لیں اور بائیں بھی کہتے جائیں۔ اور دیکھو مولانا کے لئے شربت بھی لاؤ۔ مولانا، یہ پیشکادہ حضور میں طلبی کا خواب کچھ اور معنی بھی رکھتا ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کبھی کبھی میرا ذکر کرتے ہیں۔ میاں ابراہیم خاں قاضی ہند حسب معمول اس پر جبر ہوتے ہیں۔ لیکن بادشاہ سلامت کو اس طرح تو بد ضرور ہو گئی ہے۔ خیر یہ قصہ تو سچ سناؤں گا، آپ کہئے کہ صبح صبح کیسے آنا ہوا۔

مولانا — بھئی پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، یہ غیر مقلدین کا فن ہے کسی طرح فرد ہونے نہیں آتا۔

غالب — میں تو آپ کے مقلدین میں سے ہوں۔ یوں کہ منہ دھو لے بغیر دین کی بات نہیں کرتا۔ لیجئے یہ شربت نوش فرمائیے اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔

مولانا — مرزا، اس پیلے میں سے دو ایک گھونٹ پہلے تم پیو!

غالب — یہ کیوں؟

مولانا — اس لئے کہ تمھاری زبان کا اثر میری زبان میں آجائے۔

غالب — مولانا، اگر ایک زندگان ہمارا کرویوں کا ٹوٹا ہوا گھسٹوئے تو میں اٹھ کر تمھارے قدموں کو چھو لوں گا۔ میرے لئے یہ سعادت کم نہیں کہ میں اہم ایک ہی

سال پیدا ہوئے اور تم نے جانی سے بلکہ اس عمر تک جس طرح میری رہنمائی کی ہے۔۔۔۔۔

مولانا — تو بھی مرزا! اُس رہنمائی کے بدلے اب کچھ میری رہنمائی کرو۔ وہی مسئلہ امتناع فکیر قائم البتین۔۔۔۔۔ اس پر اپنا اور وہابی جماعت کا اختلاف مجھے پریشان کر رہا ہے۔ تم میرا یہ عقیدہ جانئے ہو کہ قائم البتین کا مثل متمنع بالذات ہے یعنی جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا۔ اُسی طرح قائم البتین کا مثل بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ ان کو اصرار ہے کہ قائم البتین کا مثل متمنع بالذات ہے، یعنی آخضر کا مثل اسلئے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خالقیت کے منافی ہے۔ وہ اس لئے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ مرزا تم ذرا غور کرو کہ کیا بالواسطہ ختم نبوت سے انکار نہیں ہے؟

غالب — ہے، مگر مولانا اگر خدا لگتی سنو تو میں، کہوں کہ کچھ تم کہتے ہو وہ ذات باری کی قدرت کا بدلہ سے انکار ہے، شاہ اسماعیل کے پیر و اس پر چراغ با

نہیلی قویوں؟

مولانا — اسے میاں! یہ کیا گفتار کیجئے گئے ہو؟ کون خدا کی قدرت کا بدلہ کر سکتا ہے۔ تمھارے نزدیک تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی قدرت کے قوانین کو خود ہی توڑے، حالانکہ اس طرح اُس کی قدرت محدود ہو جاتی ہے۔ میرے رسالہ "تعلیم نبیاس" میں

یہ ذکر موجود ہے۔ اس جس کی طبیعت مقبول کے بجائے غیر مقبول کی طرف راغب ہو، اس کا راستہ بند سے جدا ہے۔ (ذرا ٹھہر کر) تو میں آج اسے تمہارے پاس آیا تھا کہ تم سے ایک مبسوط اور مدلل فتویٰ لکھنے کو کہوں جس سے نظیر قائم المبین کا امتناع ثابت ہو۔ کاش مجھے بھی بیان پروری قدرت حاصل ہوتی جو تمہیں ہے تو میں یہ خدمت انجام دیتا۔

غالب — مولانا! یہ معاملہ نازک ہے اور شعروء محبت کو جمع کرنا بھی کچھ آسان نہیں۔ تاہم آپ کے ارشاد کی تعمیل ناگزیر ہے۔ میں اس باب میں ضرور فکر کروں گا۔ اب کہو تو مصطفیٰ خاں کے ہاں چلیں۔ وہاں آج صدر الصدوق صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ شاید موافق خاں بھی ہوں مولانا — تو آؤ چلیں، میری بالی باہر موجود ہے۔

غالب — بس میں ذرا کان میں دو ڈال لوں۔

مولانا — کیوں خیریت تو ہے؟

غالب — کچھ دنوں سے اونچا سننے لگا ہوں۔ اس سے گھبراتا ہوں۔ حکیم صاحب نے سہیل پلاکرت ترقیہ کیا۔ اس کے بعد ہفتہ سیر عسوق اتار ترش اور دھن گل ساوی ملا کر خیز طرے نیم گرم۔ کان میں پٹکا تار۔ کل سے آب برگ شفا تو نیم گرم پٹکا رہا ہوں۔ ابھی تک کچھ فائدہ نہیں ہوا مولانا — یہ تشویش کی بات ہے۔ تمہاری تمام دنیا تو میں ہی چشم و گوش کی دنیا ہے۔

غالب — کئی برس ہوئے، میں نے ایک غزل کہی تھی جس کا ایک شعر یوں ہے۔

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے جنگ وہ جنتِ نگاہ یہ فردوسِ گردش ہے

اب اس فردوسِ گردش سے کھٹے کا تصور مجھے اُسی طرح مضطرب کر دیتا ہے جس طرح آدم اول کو فردوسِ بریں سے نکلنے کا خیال..... پیچھے دو دوکان میں پر لگی آئیے اب چلیں۔

اس طرح یہ دونوں ہم عزمِ خلق، ہم علمِ دوست باتیں کرتے ہوئے فواب مصطفیٰ خاں شیفۃ کے مکان تک پہنچے فواب صاحب کے دیوان خانہ میں مجلسِ احباب جمی ہوئی تھی۔ گاہ اور ہاتھ اور ایک غزل ابھی ختم ہوئی تھی۔ مرزا غالب اور مولانا فضل حق کو سارا دل کی موسیقی کے ساتھ صرنا آخری لفظ "ایسی" کی توجہ سنائی دیتی ہے۔

شیفۃ — (دونوں دوستوں کو آتے دیکھ کر) آئیے مرزا صاحب، آئیے مولانا، تشریف لائیے۔ میری آنکھیں تو دردناک سے پر لگی ہوئی تھیں اور مولانا صدیق علی خاں آزدہ بھی کئی بار چہرہ چمکے ہیں۔ مفتی صاحب! یہ لیجئے آخر آہی پہنچے مرزا نوشہ۔

آزدہ — اور مرزا نوشہ کے مرزا شہ بلا بھی تو ساتھ ہیں۔ بہت خوب، خوش آمدید!

شیفۃ — انیسویں صرنا آتا ہے کہ آپ مفتی صاحب کی ایک حویلی غزل سے محروم رہے۔ مفتی صاحب کم گو ہیں اور غزلگو۔ کاش آپ آج آجائے اور سننے۔

غالب — تو آپ میری موجودگی کو عدم موجودگی سے کیوں تعبیر فرماتے ہیں۔ مجھے دقت کی مدافعتی مقررہ فرمائیے کہ ابھی ہوں اور ابھی نہیں ہوں۔ (دشمن کو) ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

مولانا — مفتی صاحب! بڑا غلام ہوگا اگر ہم محروم نہ گئے۔

آزدہ — صاحب غزل شاعر ہے اور اس میں بھی کام کے شعر ہیں وہ ہیں آپ کو اصرار ہے تو میں خود ہی سنائے دیتا ہوں۔

مولانا — ارشاد۔

آزدہ — کھڑا ہوا، ازین سیہ، خام رو کا فر کیا خاک بجے جس کی شب ایسی، سحر ایسی

(”واہ واہ، مرزا، کیا شعر ہے! کاثر۔ آزدہ دوسرا شعر پڑھنے سے پہلے معصوم دہرے ہیں۔ م کیا خاک بجے جس کی شب ایسی سحر ایسی۔ اور پھر

پھر شعر پڑھتے ہیں) یہ خاک نہ کرنا صبح تا دوں مجھے آتا یا جہل کے دکھانے دیکھ ایسا کر ایسی (پھر داد کا شور)

مولانا — کیا اچھا شعر ہے! اور پھر یہ ہیں! مفتی صاحب! زمین کہاں سے پڑتی؟

بندگی میں بھی وہ آزاد، دغود میں ہیں کہم آئے پھر آئے در کعبہ اگر دانہ ہوا
 سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک گیا خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
 نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا کام کا میرے ہے وہ فتنہ کہ ہر پا نہ ہوا
 تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں کے مڑے دیکھئے ہم بھی گئے تھے پتا نشانہ ہوا
 اس طرح مرزا غالب کی زندگی کے پندرہ سال اور گزر گئے اس عرصہ میں مرزا صاحب اپنے ہوسے بڑا گلاب ادب میں شمار ہونے لگے۔ ایک خاندانی
 صدر اس عرصہ میں انھیں پیونجا۔ زین العابدین خاں عازت جوان ہوئے، شاعر بنے اور مر گئے۔ ان کا چھوٹا بچہ حسین علی خاں اب مرزا صاحب
 گھر میں رہتا تھا، اور مرزا صاحب اُسے اپنے بیٹے کے مانند عزیز رکھتے تھے۔ شعر و سخن، انجمن و سرود، محبت و دوستی کی یہ فضا آخر کار شہداء میں ایک نام
 برہم ہوئی۔ پہلی سیڑھی اگھر بڑھتی ہوئی۔ لیکن پھر تسمیر میں انگریزوں کی فتح مندرجہ ذیل میں داخل ہوئی اور دلی کے مسلمانوں نے وہ مصیبتیں کھیں
 جن سے جنگیز اور بلا کو کی باتازہ ہو گئی۔

ستمبر ۱۸۵۷ء میں مرزا غالب اپنے مکان میں بیٹھے ہیں۔ حسین علی خاں بھی موجود ہیں۔

غالب — بیٹا! بیٹا حسین علی خاں! حکیم صاحب نہیں آئے؟ — بہراں تو جان کاروگ بن گیا!
 حسین علی خاں — (آکا زبند کر کے) دادا حضرت! شہر میں بلوہ ہو رہا ہے۔
 غالب — بلوہ؟ ابھی تک۔

حسین علی خاں — (پچ کر) آپ سُن نہیں رہے ہیں۔ ہماری جگہ میں سے لوگ بھاگتے ہوئے جا رہے ہیں؟

غالب — ہاں کچھ شور سنا سنا تو دیتا ہے۔ ہائے دلی! کیا تو اس طرح سبک سبک کر رہے گی؟ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے جا۔ پھر دادا بھی
 آواز میں) اودھ کی سلطنت مجھ پر ہر باں ہوئی۔ میری قضا نے اُسے دو برس میں ختم کر دیا۔ دلی کی سلطنت کچھ زیادہ سخت جالی تھی۔ سات برس تک
 مجھ کو روٹی و کپڑے گڑھی۔

حسین علی خاں — (پھر ہلا کر) سنئے۔ مادشاہ سلامت کو نوہوں نے پکڑ لیا!

غالب — (اسی پوچھیں) اچھا! شمع بھی بج گئی!

حسین علی خاں — (چنچ کر) اور سنئے، میرے گیس اور مولانا صاحب باقی قتل ہو گئے۔

آلب — (سر دھاک کر) اللہ! اللہ! — (بھم کا شور گول چلنے کی آواز)

حسین علی خاں — کلو کہتا ہے مولانا فضل حق کو گورسے پکڑ کر لے گئے!

آلب — (بے تابانہ) ہائے!

حسین علی خاں — اور نواب مصطفیٰ خاں اور مفتی صاحب کو بھی!

آلب — اچھا، اچھا! میں بھی اب کفن پہن کر زندگی کے دن گزار دوں گا۔ جاؤ کلو سے کہو، میرے کپڑے لائے، میں اپنے دوستوں سے ملنے جاتا ہوں
 وہ حوالات میں میرے منتظر ہیں۔ (بھم کا شور گول چلنے کی آواز)

حسین علی خاں — (لاہجہ بولی آواز میں) سرس کی ٹکی سے آدمی تپا ہے۔ دادا یوسف بیگ خاں کو گورول نے مار ڈالا۔

آلب — مر گیا یوسف مر گیا! آف۔ آف! میرا بھائی۔۔۔ (قرعہ لگا کر) دیولے کو گولی مار دی! آف۔۔۔ (لاہجہ بولی آواز میں) بیٹا لوگ یوسف کو گولوں

کہتے تھے۔ آج میں مجبوزوں سے بدتر ہوں۔ حسین علی خاں — دادا حضرت خدا کے۔۔۔ (حسین علی خاں کی آواز گولوں کی بارش میں گم ہو جاتی ہے)

بن علی خاں۔ دادا حضرت! حکیم صاحب شریف لارہ ہیں! — غالب — اب کیا فائدہ! — میرے سننے کو اب رہ ہی کیا گیا ہے۔

(پروفیسر) حمید احمد خاں

(الحمد)

عہدِ حاضر میں جبری دور کا انسان

آسٹریلیا کی شمالی اطراف کی آبادی اب بھی ”جبری دور“ سے گزر رہی ہے۔ یہ آج بھی پتھر گھس کر اپنے اوزار بناتے ہیں اور دو لکڑیاں آپس میں رگڑ کر آگ پیدا کرتے ہیں۔ ملکوں کی تعمیر میں یہ پرندوں سے زیادہ نہیں ہیں اور بارش سے بچنے کے لئے درختوں کی چھال، گھاس، اور جنگلی لکڑیوں سے کسی نہ کسی طرح بنے گھونسے طیار کر لیتے ہیں۔ یہ آج بھی قدیم طرز کے شکار اور جنگلی پھل پھول پر اوقات بسر کرتے ہیں۔ اس ملک میں گوند، تانبا، چاندی، تین، لوہا، سب کچھ ہے لیکن ان کے لئے بالکل بیکار ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نو تو یہ لوگ سونے کو رند کر چکے ہیں لیکن ان کی غربت کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ انھوں نے زمین کو بھی جوتے بونے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ ان میں کبھی خوردنی اشیاء پیدا کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ جو کچھ بھی اچانک ہاتھ لگ گیا قسمت سے سامنے آگیا اسی پر زندگی بسر کرتے رہے اور آج بھی وہ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ مختصر انسان کی شکل و صورت اور جسم و حرکت رکھتے ہوئے بھی یہ لوگ آج تک جانوروں ہی کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں

اس ملک کے باشندوں یا ان کی فطرت سمجھنے کے لئے ان جانوروں پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے جن کے ساتھ یہ ہزاروں صدی سے رہتے چلے آئے ہیں۔ جو جانور آج کے مہذب ملکوں میں ہزاروں صدی قبل پائے جاتے تھے وہ آسٹریلیا میں آج بھی موجود ہیں۔ ہمارے یہاں کے بڑے بڑے عجائب گھروں میں ازمائشِ قدیمہ کے جن جانوروں کے صرف ڈھانچے ملتے ہیں وہ آسٹریلیا میں آج بھی بہ کثرت پائے جاتے ہیں اس ملک کے جانوروں میں سب سے پہلے کنگارو سامنے آتا ہے اس کے اگلے پاؤں بہت چھوٹے ہوتے ہیں، لیکن پچھلے پاؤں نہایت مضبوط ہوتے ہیں۔ ویسے تو یہ جانور خطرناک نہیں لیکن چھوٹے یا پیچھا کرنے پر اپنی حفاظت کے لئے اڑ جاتا ہے اور انسان کی جان تک لے لیتا ہے

زہریلے سانپ اور مکڑوں کے علاوہ اس ملک میں ایک قسم کی زہریلی چیونٹیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ سفید رنگ کی ہوتی ہیں اور زمین کے نیچے رہتی ہیں۔ ان کا دل کا دل باہر نکلتا ہے اور جو بھی لکڑی سامنے پڑ جاتی ہے اسے چاڑھتا ہے۔ ایک اور قسم کی چیونٹیاں ہوتی ہیں جو حملہ بھی کرتی ہیں۔ لیکن آسٹریلیا کے قدیم باشندے سب سے زیادہ اپنے یہاں کوؤں کو مارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کوئی بھیڑ بچہ دیتی ہے یا گرمی سے پریشان ہو کر تھک جاتی ہے تو کوئے اس کا گوشت فوجنے کے لئے اس پر حملہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھیڑ کی آنکھ تک فوج کرے جاتے ہیں اور اس جانور کو گھل گھل کر مرنے پر مجبور کر دیتے ہیں، اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص جنگل میں راستہ بھول کر پیاس سے مریا ہو کر گر پڑتا ہے تو کوئے اس کی آنکھ نوچ کر کھا جاتے ہیں۔ اسی لئے یہاں کے باشندے کوؤں کو مارنے کے لئے دن دن بھراس کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں

یہاں کے جنگلوں میں کچھ ایسے بھی پرندے رہتے ہیں جو انسان کے لئے کارآمد ثابت ہوئے ہیں ان میں ایک ”کوکا بورا“ ہے اس کی بولی ٹھیک انسان کی ہنسی جیسی ہوتی ہے۔ یہ سانپوں کے مارنے میں بڑا تیز ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں کے باشندے اسے ”مقدس“ تصور کرتے ہیں۔ آسٹریلیا کے پرانے نیشنل پارکوں کے خیالات اور معاشرتی زندگی پر انھیں جانوروں کا زیادہ اثر پڑا ہے

جب سے موجودہ دنیا کو آسٹریلیا کی دولت کا بہت سے یورپین واپس لگے ہیں اور ان کا اثر پرانے باشندوں پر پڑا ہے۔

لیکن بہت کم

”کارپریٹا“ کی خلیج کے جنوب مغربی حصے میں قریب قریب ایک لاکھ سے زائد اب بھی قدیم باشندے پائے جاتے ہیں جو بیرونی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ جہاں یہ قومیں سکونت پذیر ہیں وہاں سال کے زیادہ حصے میں بانی اور اشیائے خوردنی کی بڑی قلت رہتی ہے اور اسی وجہ سے آبادی

بڑھنے نہیں پاتی۔ میس سے لیکر سو آدھوں تک کی آبادی ایک جگہ پر رہتی ہے لیکن خاص خاص موقعوں پر اس آبادی میں وقتی اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ ان کی رسمیں بھی عجیب و غریب ہیں اور ان رسوم کو ادا کرتے وقت یہ لوگ اپنے ملک کے جانوروں اور پرندوں کی سی بولی بولتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کا جسم پورے انسان کا جسم نہیں تھا۔ اور ان کو پورا بنانے کا خراج جانوروں کے اندر رہنے والے فرشتوں کو حاصل ہے۔ کافی مقدار میں غذا میسر نہ آنے کے باعث ان ”جبری دور“ میں رہنے والوں کے اہل بعض عجیب رسمیں برتی جاتی ہیں۔ مثلاً قوم کا نائیدہ بننے کے لئے آزمائش کی کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور ہر آزمائش نہایت خطرناک ہوتی ہے۔ بچے جب بڑوں کو درپیش آنے کے لائق ہوتے ہیں تو ان پر کھانے پینے کی چیزوں کی پابندیاں عاید کر دیا جاتی ہیں۔ انھیں ایک خاص قسم کی لذیذ چربی کھانے سے روک دیا جاتا ہے۔ جسے اس قسم کی چربی دستیاب ہوتی ہے تو سب سے پہلے بوڑھوں کو دیا جاتی ہے اور جو شخص اس قانون سے انحراف کرتا ہے اسے سخت سزا ملتی ہے۔ اور جادو کے اثر سے اندھے، لٹے اور لنگڑے ہونے کا خوف بھی دلایا جاتا ہے۔ اسے یہ بھی یاد کرایا جاتا ہے کہ ممنوعہ حرکات کا مرتکب ہونے سے وہ بھی جو بزرگی کی نشانی ہے، فظاہر نہ ہوگی۔ اس قسم کے سخت قوانین اور رسوم کا مقصد یہ ہے کہ بوڑھوں کو ذائقہ دار چیزیں ہمیشہ ملتی رہیں۔ جو شخص کسی خدمت سے سلحدہ کیا جاتا ہے اسے معزول ہونے سے قبل طرح طرح کی اذیت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ان عقوبتوں میں اس کا زندہ بھونا جانا بھی ہے۔ کندہ کی آگ پر وہ باجی منٹ تک جت لٹایا جاتا ہے آج دھیرے دھیرے تیز کر دیا جاتی ہے۔ پھر بیلی منٹ تک وہ پٹ لٹایا جاتا ہے۔ شخص مذکور کو برابر کروٹ بدلتے رہنا پڑتا ہے تا کہ اس کے جسم کا ہر حصہ جل سکے۔ اس آزمائش کے ختم ہونے کے بعد وہ غصہ رسم ادا کرنے والے بوڑھوں سے پوشیدہ باتیں سیکھنے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ بوڑھے اس موقع پر اپنے آپ کو قوم کے آباؤ اجداد کے نام سے رسوم کرتے ہیں اور اسی لئے ان کے جسم پر خاص قسم کی نقاشی بھی ہوتی ہے۔ اپنے جسم پر سانپ کی تصویر بنانا زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ اسی کو یہ لوگ آدمی کو پیدا کرنے والی ”مقدس تہ“ سمجھتے ہیں۔

اس کے علاوہ زبان شکنائی اور موثر راشی کا رواج بھی ہے۔ قوم کے کسی شخص کی وفات پر گرم پتھر سے سینے کو داغنے کی رسم بھی پائی جاتی ہے۔ مرد اپنے بالوں کے بدلے عورتوں کے بال کاٹ کر اپنی ہانہوں پر باندھتے پھرتے ہیں۔ دانت توڑوانے کا رواج اب مردوں سے آٹھ گیارہ لیکن عورتوں کے لئے لازم گردیا گیا ہے۔ چھڑی سے مار مار کر پہلے ان کے دانت ہلا دئے جاتے ہیں اور پھر تھکر کی دود سے اٹکاٹسے جاتے ہیں۔ اس عمل کے بعد عورتیں سمجھتی ہیں کہ وہ بہت خوبصورت ہو گئی ہیں۔

طرح طرح کی عقوبتیں برداشت کرنے کے باعث یہاں کی عورتوں کی عمر بہت کم ہوتی چکیں سال کے اندر ہی ان میں پیری کے تمام آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یہاں سے زیادہ اذیت برداشت کرنے والی عورتیں دنیا کے اور کسی ملک میں شاید ہی ملیں۔ کھانے کی تمام اچھی چیزوں سے عورتوں کو جہنا کرنا پڑتا ہے، رسوم ادا کرتے وقت بھی کھانے پینے کی عمدہ چیزیں ان سے الگ کر دی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ مردوں کے ہاتھوں اور بھی طرح طرح کے ظلم ہوتے رہتے ہیں۔ کسی قبیلہ کے چار آدمی اگر تھوڑے عرصہ میں مر جاتے ہیں تو سب عورتوں کو ایک سال تک گونگار ہونا پڑتا ہے۔ وہ ایک لفظ نہیں بول سکتیں۔ سال کے آخر میں وہ مرد کا آٹھ دانت سے کاٹتی ہیں اور اسے کھانا دیتی ہیں۔ اس کے بعد انھیں اس قبیلہ سے نجات ملتی ہے۔ اگر کوئی عورت تکلیف برداشت کرنے کے ڈر سے بھاگے کا ارادہ کرتی ہے تو اس وقت وہ ایک خاص طرح کی آواز سنتی ہے جسے اس کی قوم کے تمام افراد ”توانیکاد پوہ“ کی آواز مانتے ہیں۔ اس آواز کا مفہوم وہ یہ سمجھتی ہے کہ دیو مذکور اس کو نہ بھانگے کی تلقین کر رہا ہے۔ بڑی ہو جانے پر وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتی ہے کہ وہ آواز ایک کھوکھلی لکڑی سے نکلتی ہے تاہم سماج کے قانون کے مطابق وہ اس راز کو کسی پر افشا نہیں کر سکتی۔

کھانے کی چیزیں کثیر مقدار میں نہ ملنے کے باعث جب انھیں کوئی بیماری ہو جاتی ہے تو وہ اسے سحر کا نتیجہ جانتی ہیں اور یقین رکھتی ہیں کہ یہ جادو دشمن نے زہر پی ڈھکی کی شکل میں ان پر کیا ہے۔ علاج کے لئے مریض لیٹ جاتا ہے اور جادو جھاڑنے والے کچھ دیر اسے غور سے دیکھتے ہیں اس کے بعد مریض کے جسم پر لیٹ کر اس کی مالش کرتے ہیں اور دانت سے کاٹ کاٹ کر زہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فطری موت پر بھی ان کو یقین نہیں ہے۔ اس لئے اس سلسلہ میں وہ عجیب و غریب رسمیں ادا کرتے ہیں۔ جس وقت کوئی شخص نرمے کی حالت میں ہوتا ہے اسی وقت سے ماتم شروع ہو جاتا ہے۔ لوگ روتے چلاتے اور بے ہوش ہونے لگتے ہیں۔ عورتیں اپنی ران کو زخمی کر دیتی ہیں اور کچھ کھیں یہ

زخم اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ وہ کھڑی بھی نہیں ہو سکتیں۔ ایک شخص کے مرتے ہی عورت مرد صبح چھڑی لٹھی ہاتھ میں لیکر ایک دوسرے کو مارتے ہوئے جلوس بنا کر نکلتے ہیں۔ اس موقع پر ایک دوسرے کے حملے سے بچنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس لئے لوگوں کا جسم اہو بہان ہو جاتا ہے۔ تین روز کے بعد لوگ کسی کھوہ کے پاس جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہاں کسی جانور یا پرندے کا نقش قدم ہے یا نہیں۔ اگر کوئی نشان انھیں مل جاتا ہے تو اس کے ذریعہ سے وہ اُس دشمن کا پتہ لگا لیتے ہیں جس کے سحر سے اس کا انتقال ہوا ہے اور اس سے وہ انتقام لیتے ہیں۔ اگر درخت کی کھوہ میں انھیں کوئی نشان نہیں ملتا تو وہ لاش کو ایک سال تک وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ سال کے ختم ہونے پر لاش کی ہڈیاں نکالی جاتی ہیں۔ اس موقع پر سب کم عمر جوان بٹھر کے کھائے سے اس کے ڈھانچہ کو توڑتا ہے اور ہاتھ کی ایک ہڈی کو چھوڑ کر باقی تمام ہڈیوں کو درخت کی چھال میں لپیٹ کر رکھ دیتا ہے۔ آسٹریلیا میں کچھ قومیں ایسی بھی ہیں جو مردوں کا گوشت کھانا اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہیں۔ کیونکہ اس سے وہ سمجھتی ہیں کہ مرنے والا پھر نہیں کی قوم میں جنم لے گا کچھ قومیں ایسی ہیں جو درخت کے کھوہ سے ہڈی نکال کر اسے سفید حیوانوں کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ صرت ہاتھ کی ہڈی یا سر رکھ دی جاتی ہے۔ قوم کا سردار اس ہڈی کو کھال میں لپیٹ کر کسی درخت کے کھوہ میں رکھ دیتا ہے۔ اس کے بعد لوگ شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں اور شکار کا گوشت پتے میں لپیٹ کر مردوم کے ہاتھ کی ہڈی کے ساتھ جو الگ لپیٹ جاتی ہے۔ مردوم کے باپ کو دیدی جاتی ہے۔ اس موقع پر تمام عورتیں جمع ہو کر روتی چلاتی ہیں۔ مرنے والے کا باپ سب سے زیادہ مہر عورت کو ہڈی رکھنے کو دیتا ہے۔ باقی عورتیں کھانے کے لئے سانپ بکانے لگتی ہیں۔ اور مرنے والے کا بھائی پوڑھی عورت سے ہڈی لے کر کسی گڑھے میں دفن کر دیتا ہے۔ یہ لوگ ان رسوم کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں کیونکہ یہ رسوم ہی ان کی مذہبیت کے بہترین سامان ہیں اگر ان کو اٹھا دیا جائے تو ان کی زندگی بے لطف ہو جائے

عورتیں کھانے کے لئے سانپ، چھپکلیاں، یا کھانسنے کے بیج جمع کرتی رہتی ہیں۔ سارا کام یہاں عورتوں کو کرنا پڑتا ہے۔ مردوں کو فراغت ہی رہتی ہے۔ انھیں جب اور کوئی رسم و رواج ادا نہ کرنا ہوتا تو کسی خاص جگہ پر اکٹھے ہو کر پرندوں کے پر سے اپنے آپ کو سجاتے اور رقص کرتے ہیں وہ رقص کو وہ ”کور و بوری“ کہتے ہیں۔ اس جشن میں وہ بچوں اور عورتوں کو شریک نہیں کرتے۔

نظیر صدیقی

عورت اور تعلیمات اسلام

از مالک رام ایم۔ اے

نادانہ لوگوں کی طرف سے اسلام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے عورت کی اصلاح اور اس کے حقوق کی حفاظت کا خیال نہیں کیا اور اس کو مذہبی کی حیثیت سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ مالک رام صاحب نے اس تصنیف میں بتایا ہے کہ گوارہ سے لیکر ملحدت کی عورت کی اور اس کی زندگی کی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو اسلام نے ترک کر دیا ہو اور اس کا اقتدار قائم کرنے کی انتہائی تاکید نہ کی ہو۔ اس کتاب میں عورت سے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس سے بحث نہ کی گئی ہو اور اس انعام کے ساتھ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف قرآن پاک ہی کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ کتاب نہایت نفیس کاغذ پر پاکیزہ طاعت و کتابت کے ساتھ شایع کی گئی ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول۔ نگار بک ایجنسی لکھنؤ

کیا اس کتاب کا مطالعہ آپ کر چکے ہیں۔ اگر نہیں۔ تو پہلی فرصت میں اسے طلب فرمائیے :-

”۵۵ سال کے بعد“

یہ کتاب نفسیات علمی پر اتنا مفید و دلچسپ لکھی ہے کہ آپ اس کو بار بار پڑھیں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک کم نہ کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ

زندہ رہنا بھی ایک فن ہے

اور اگر اس فن کو آپ نے سمجھ لیا تو پھر

۱۔ دنیا کا ہر رخ و عالم آپ کے لئے بے معنی ہو جائے گا۔

۲۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات نو کا آغاز ہوگا۔ قیمت پندرہ روپیہ

ادب لکاتبہ اشاعر

(افادات علی حیدر طباطبائی نظم مرحوم)

ادنیٰ تغیر کے ساتھ

جس طرح کانے میں آواز اور جسمانی حسن میں اعضا کا تناسب ضروری ہے اسی طرح شعر و ادب میں تناسب الفاظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے گو اس کا تعلق زیادہ تر ذوق و وجدان سے ہے اور اس کا کوئی عام اصول مقرر نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر ہم الفاظ یا ترکیب کے حسن و قبح کو پہچان سکیں تاہم اہل فن نے کچھ اصول منضبط کر دیے ہیں مثلاً:-

- (۱) کلام کو تینا فرسے پاک ہونا چاہیے۔ اس سے مراد ایسے حروف کا اجتماع ہے جو قریباً لمخروج ہیں جیسے یہ جملہ حیدر آباد میں مشہور ہے:-
(کیا بٹ لی پتلی بتی) چونکہ اس جملہ میں ب، پ، ٹ اور ت سب قریباً لمخروج ہیں اس لئے ان کا اجتماع مناسب نہیں
- (۲) دو لفظوں کی ترکیب سے اگر کوئی ایسا کردہ معنی پیدا کرے والا لفظ بن سکتا ہو یا جس میں ذم کا پہلو نہکلے۔ تو اہل لکھنؤ نے اسے قابل ترک قرار دیا ہے۔ مثلاً ایک صاحب کا مصرع ہے:

منہ تمہارا ہے اور میری نظر دونوں ساتھ — یا — منہ تو دیکھو آئینہ کا یہ صفتائی لاسکے

پہلا مصرعہ میں ”موت مارا“ اور دوسرے میں ”موت اور دیکھو“ کا تلفظ ہوتا ہے یا مثلاً ایک مصرع ہے:-
”سب ترے ناز ہیں گو زندہ ہی گمرے والے“ — اس مصرع کا لکھنؤ میں یہ نتیجہ ہوا کہ جناب مرزا اوج نے کلیہ بنالیا کہ گو کے بعد ایسا لفظ ہی نہ آئے پاس جس کی ابتدا دے ہو۔

شیخ ناسخ کے شاگرد سید علی حسن اشک مرحوم منصب داروں میں تھے اور صاحب دیوان تھے۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں ان کی زبان سے یہ مصرع نکل گیا:-
”دست و پا دیں گے گواہی مری روز محشر“ — لوگوں نے مصرع بار بار پڑھوایا اور آج تک بآواز کا ذکر چلا جاتا ہے۔
قدیم زمانہ کا ذکر ہے کہ ملول تازہ وارد لکھنؤ کے مشاعرہ میں شریک ہوئے۔ منقطع یہ تھا:-

یہ آرزو ہے کہ شمشیر ناز سے گزر دن کوئی ملول کی اُس رہ گزار پر مارے

سامعین کو تاب ضبط نہ رہی ہر شخص کہتا تھا دوسرا مصرعہ پھر فرمائیے۔ دوسرے مصرعہ سے حد درجہ قبیح معنی پیدا ہوتے ہیں۔
(۳) الفاظ مضحک و درلک کے علاوہ دیوں بھی کوئی ایسا لفظ استعمال کرنا جس سے مقصود کے علاوہ کچھ اور معنی پیدا ہو سکتے ہوں بڑا ہے۔ کیونکہ اس سے سننے والے کو دھوکا ہو جاتا ہے۔ مثلاً میں نے ایک مطلع کہا:-

پھری ہوئی مری آنکھیں ہیں تیغ زن کی طرف — کہ مجھ کو چھوڑ کے بسمل چلا ہرن کی طرف

ساتھ ہی خیال ہوا کہ اس کو بول بھی لکھ سکتے اور پڑھ سکتے ہیں:- ”چلا ہے دن کی طرف“ — اس لئے یہ مصرع بدل کر یوں کر دیا:-
”چلا ہے چھوڑ کے بسمل مجھے ہرن کی طرف“ — ایک مرثیہ کا مصرع ہے:- ”تمام شہر ہے شایق علی کے پیادوں کا۔“

میں دھوکا ہوتا ہے کہ شاید شایق علی کسی خاص شخص کا نام ہے۔ میر مونس مرحوم کی غزل کا مطلع ہے :-
 کیا خبر لائی صبا موسم گل لانے کی
 بوتلیں سرخ ہیں ساقی ترے میخانے کی
 نے میں گل کا لام دوسرے لام سے مل جاتا ہے اور بڑا معلوم ہوتا ہے یا مصرع :- ”چمن میں گل، گلوں میں بوسے جب تک“ — پڑھنے
 لگلوں ہو جاتا ہے۔

شیخ آتخ نے اپنے تلامذہ کو اخیر زمانہ میں جو وصیت کی تھی اس میں اس امر کی بھی ہدایت کی تھی کہ کسی لفظ کے آخر سے الف، واو، ہی کا
 تلفظ گرا دینا اچھا نہیں معلوم ہوتا اور برہنہ کی کلام کے منافی ہے۔ لیکن شیخ کی اس وصیت پر کسی سے عمل نہ ہو سکا۔ شیخ کا تنبیہ کرنا اس بنا پر تھا کہ فارسی
 ہمیں ایسا نہیں دیکھا گیا کہ سبکی و میروسی میں سے ہی کو گرا دیں یا گفتگو و شہست و خویس سے واو اور دریا و گویا میں الف ساتھ ہونے دیں۔
 الف مقصورہ کو وہ لوگ کبھی الف سمجھتے تھے کبھی ہی اور محمد تقی خاں سپہر نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ الف مقصورہ کو ہی کی طرح بھی نظم کر سکتے
 ہیں۔ آزاد مرحوم آپ حیات میں خواجہ آتش پر علوہ بے دود کے استعمال پر اعتراض کرتے ہیں۔ یہ اعتراض ان کا غلط ہے۔ علوہ میں ہ نہیں ہے
 الف مقصورہ ہے، اور علوہ بے دود اور علوی بے دود دونوں طرح لکھا صحیح ہے۔ ہائے مخفی کو فارسی والے کبھی گراتے ہیں اور کبھی نہیں گرتے
 بقال مرحوم، مژہ کی ہ کا گرا نا لازم سمجھتے ہیں مثلاً :- ”دل میں چھری چھو مژہ گر غول چکاں نہ ہو“۔ مجھے یہ نہایت بڑا معلوم ہوتا ہے۔
 دوسری کا مصرع ہے :- ”مژہ تیرگی بردہ از تیر زاغ“۔ اس میں مژہ کی بندش اچھی معلوم ہوتی ہے۔

جلال مرحوم نے ایک دفعہ اپنی کچھ غزلیں مجھے سنائیں یہ کہ کہ کہ اس میں کوئی حرفت دبے نہیں پایا ہے۔ میں نے ان غزلوں کو سن کر کہا کہ شیخ کا
 قصود یہ نہیں ہے کہ میں، تے، کو، کے میں بھی ہی اور واو و زگرے، فارسی والے بھی دو اور تو اور جو کا داؤ گراتے ہیں۔ بلکہ غرض یہ ہے کہ جن حرفت
 لڑنا جن الفاظ میں گراں معلوم ہوا انہیں نہ گرا نا چاہئے، کہنے لگے میں نے تو التزام کیا کہ کوئی حرفت نہ کرے اور اس میں زیادہ بندش کی صفائی معلوم
 تھی ہے، میں نے کہا جب نہیں اور ہیں اور میں کا فون آپ نہ بچا سکے تو التزام کہاں رہا، اس پر وہ ہنسنے لگے۔
 فارسی والے آخر کلمہ سے الف نہیں گراتے لیکن ابتدائی کلمہ کے الف کو بے تکلف گرا دیتے ہیں، اردو میں بھی باتفاق اسے جایز سمجھتے ہیں مگر
 بعض جگہ سیلاست کلام کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مصرع ہے :-

لکھنوی شرح اس کی تو ہو جائے کتاب عبرت — یا جیسے — ہوئے ہیں حاکم شرع آج ساقی کو شر
 پنے مصرعہ میں ”شرح اس کی“۔ ”شر اس کی“ ہو گیا اور دوسرے مصرعہ میں ”شرح آج“ ”شر آج“ پڑھا جاتا ہے۔

اردو میں عربی فارسی کے جو الفاظ پائے جاتے ہیں وہ تین طرح کے ہیں :-

ایک وہ جن میں اہل ہند نے لفظی و معنوی کوئی تغیر نہیں کیا جیسے الم و رقم وغیرہ ایسے الفاظ بے تامل استعمال کئے جاسکتے ہیں۔
 دوسرے وہ الفاظ جن میں لفظی تغیر ہو گیا ہے جیسے علف کو خلف اور حرفت کو حرفت بول یا دیوانہ کو دوآنہ، بیگانہ کو بیانہ، المضاف
 والمضاف، لیمو کو نیبو کہ دیا کرتے ہیں یا جیسے موسم و موکب و موقوف و موقیع و مولد و مودود وغیرہ اور سید و جد و میت و تیر وغیرہ میں
 حرف آخر کے اقبل فتح دیا کرتے ہیں حالانکہ صحیح یہ ہے کہ کسرہ پڑھیں یا جیسے حص حص بیض کو ایک صاحب اسے ایسے ہی سمجھے اور لیس کے ساتھ
 اسے قافیہ کر دیا۔ اس قسم کے الفاظ کا صحیح استعمال لازم ہے۔ اسی طرح خون و جنون و زمین و آسمان وغیرہ بہ اعلان خون ہندی الفاظ
 ہیں، اس لئے ایسے الفاظ کی ترکیب فارسی میں لاکر اعلان خون کا باقی رکھنا غلطی ہے۔ کیونکہ اہل فارس کی زبان میں اعلان خون نہیں ہے، اس
 غلطی سے بھی شعرا احتراز کرتے ہیں تاکہ ترکیب میں ہندی و فارسی الفاظ کا خلط ملط نہ ہو جائے، لیکن آج۔ سوا اور بعض یہ تین لفظ اس قدر زبان
 پر چڑھے ہوئے ہیں کہ ان الفاظ کو بے تکلف ہندی لفظوں کی طرح مضان کر دیتے ہیں اور یہ آفت مستبر لوگوں کے کلام میں بھی موجود ہے مثلاً :-
 ”سوائے اس کے کہ آشفہ سر ہے کیا کہئے“۔ مع تین رقوم جواہر۔ بعض لوگ وغیرہ۔ یہ عامیانہ محاورہ ہے اور لطف یہ ہے کہ مضان الیم

کبھی کبھی کے بھی لگا دیتے ہیں مثلاً ”سوائے تم لوگوں کے میرا کون ہے“ ”مع دیکھ بالوں کے روانہ ہوا“۔ اسی طرح لفظ بعض اشخاص میں کسرۃ اضافی سے غفلت کرتے ہیں مگر جو لوگ لکھے پڑھے ہیں وہ اس سے احتراز کرتے ہیں۔

میسرے وہ الفاظ عربی و فارسی کے ہیں جن میں معنوی تغیر ہو گیا ہے، یعنی اہل زبان اس لفظ کو کسی اور معنی میں استعمال کرتے ہیں اور اہل ہند کی یہ معنی میں مثلاً ”محرم“ کا لفظ اردو میں (دنگیا) چھوٹے کپڑوں کے معنی میں مستعمل ہے اور عربی میں اس شخص کو کہتے ہیں جس سے پردہ نہ کیا جائے یا تردد کا لفظ عربی میں اور و رفت کے معنی میں ہے اور اردو میں فکر و تشویش کے معنی میں بولتے ہیں یا جیسے لفظ تم کہ فارسی میں تری کے معنی میں ہے اور اردو میں تر کے معنی میں بولتے ہیں یا جیسے لفظ خفت اردو میں شرمندگی کے معنوں پر مستعمل ہے۔ اس قسم کے الفاظ کا نقص کرنا چاہئے اور ان کو ہندی سمجھنا چاہئے۔ انھیں فارسی-عربی کا لفظ سمجھ کر ترکیب اضافی سے بچنا چاہئے۔ یعنی جس طرح کپڑہ رنگین کہنا صحیح نہیں۔ اسی طرح محرم رنگین اور چشم کہنا بھی ناجائز ہے کیونکہ کسرۃ اضافی یا توصیفی فارسی الفاظ کے لئے مخصوص ہے اس قسم کی غلطیوں سے بچنا بہت مشکل امر ہے میں نے مرزا بیدل کے کلام میں دیکھا ہے۔ ”فارغ از جوش غبار است زینے کہ نم است“ اور فنی سا شخص بھی دھوکا کھا گیا، اگر کوئی کہے کہ بیدل توصیفی جو کچھ کہ جائیں وہ غلط نہیں ہو سکتا، تو اہل فن اس کو نہیں مانیں گے۔ اہل زبان کبھی چشم کہتے ہیں جب کہیں گے چشم کہیں گے ان تینوں قسموں کے علاوہ ایسے لفظ بھی اردو میں بہت سے بولے جاتے ہیں کہ ہندیوں نے کسی عربی یا فارسی لفظ سے ان کا اشتقاق کر لیا ہے اور اہل زبان اس اشتقاق سے بے خبر ہیں مثلاً توڑ توڑ فارسی لفظ ہے اس سے ہندیوں نے تازت مصدر عربی بنایا۔ اسی طرح علالت، بختالت، ذہانت، لیاقت، شجاعت، ملت، یکانگت وغیرہ ہندیوں نے قیاس سے مصدر بنائے ہیں ایسے الفاظ کا استعمال اکثر تو ناجائز ہے لیکن اگر کوئی لفظ فصحا کی زبان پر چڑھ گیا ہے جیسے بادشاہت وغیرہ تو اسے ہندی لفظ سمجھنا چاہئے کسرۃ اضافی یا توصیفی یا کسی اور ترکیب عربی و فارسی کے ساتھ اس کو استعمال کرنا درست نہیں مثلاً جس طرح پیار و چاہت لفظ فارسی کہنا جائز نہیں اسی طرح امارت و بادشاہت کہنا بھی نادرست ہے۔

بعض الفاظ میں یاے مصدری زیادہ کی جاتی ہے حالانکہ وہ سب الفاظ خود معنی مصدری رکھتے ہیں یہ بھی ہندیوں کا تصرف ہے جیسے ”انتظامی“ ”تغافل“ ”طغیانی“ ”غلطی“ ”صفائی“ ”ادائی“ ”اجرائی“ وغیرہ۔ بعض الفاظ میں علامت جمع زیادہ کر دیتے ہیں حالانکہ وہ سب الفاظ خود جمع ہیں جیسے ”اخیاروں“ ”کھاروں“ ”اردو احوں“ ”آثاروں“ ”اعمالوں“۔ یا یہ کہ فارسی یا ہندی الفاظ میں علامت جمع عربی کی لگادی جیسے ”جاگیرات“ ”دیہات“ ”باغات“ ”جہازات“ ”بہتات“ وغیرہ اسی طرح لوازمات و احکامات کو بھی سمجھ لیجئے۔ یا اسی طرح اسم صفت بہت سے ہیں جو ہندیوں نے تراشے ہیں۔ جیسے ”رقتی“ ”صنعتی“ ”پیشگی“ ”گھنڈی“ ”جوشیلا“ ”شوقین“ ”سمجھدار“ ”دستدار“ ”تاددار“ وغیرہ۔ اس قسم کے الفاظ کا نقص کرنا اہل قلم کو ضرور ہے ورنہ خطا سے نہیں بچ سکتے۔ ابو الفضل ساحلہ اور لکھے۔ ”از محر احتیالی روزگار کم حضرت“۔ یہاں میں نے یہ تاویل کرنی کہ احتیالی میں یاے مصدری کاتب نے بڑھادی ہوگی۔ لیکن ”مسرة الصدر و منفرة القدر“ میں کیا تاویل ہو سکتی ہے یا عند التواہش و علمک ناقصک و محبت ناقصک“ و مقدم الانامی و اعتضاد الکرامی و مخلصان اعتضادی و مخلصان استنہادی و تبدل کاہی وغیرہ میں شوخی قلم کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں تعجب ہے کہ قدرتی، فطرتی، عادی کہنا تو غلط یا ہندی سمجھا جائے اور کم قدرتی و بلند فطرتی و خوش عادی فارسی صحیح ہو جائے۔ مثلاً:-

آہم بروئے آئینہ نہ کھن شود ایں گرم الفتی تو تا بر طوت شود

بعض الفاظ اردو میں ایسے زبان زد ہیں کہ ان کا کچھ بہت نہیں لگتا کہ کس زبان کے ہیں اور اصل ان کی کیا ہے۔ جیسے ”الغاروں“ ”زرغسل“ ”الماخوچی“ ”لغات“ ”مررتی“ ”مرزہ“ وغیرہ یہ سب الفاظ عامیانہ سمجھے جاتے ہیں اور اہل ادب ان سے بھی احتراز کرتے ہیں۔

اکثر الفاظ انگریزی کے اردو میں لپٹے چلے جاتے ہیں اہل ادب ان کے استعمال سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ بلکہ عربی و فارسی کے سوا جن جن زبانوں کے الفاظ اردو میں مکرر اصل سے متجاوز ہو گئے ہیں ان کا صحیح کر کے استعمال کرنا بہرگز درست نہیں سمجھتے مثلاً ”بوسل“ ”تبر“ ”لائٹن“ ”بسکٹ“ وغیرہ کو اب ہندی ہی سمجھنا چاہئے۔ اسی طرح سنسکرت اور بھجا کے بہت سے الفاظ اردو میں آکر بدل گئے ہیں۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جو خاص طبقہ والوں کی اصطلاح ہیں مثلاً کبوتر بازوں نے لگا لگا کا لفظ یا لعلیہ کبوتر کے لئے وضع کیا ہے، اگر کوئی کہے کہ فلاں شخص بڑے کھا لگا ہے یا یہ

زبان سے لگتا رہا ہے تو اسے سمجھنا چاہئے کہ اس شخص یا بچہ کو کبوتر قرار دیکر ایسا کہا گیا ہے، اسی طرح ایک مثال یہ ہے: ”فلاں عورت کو کاکڑا ہی“
 یا اسے مرغی سمجھ کر ایسا کہا یا ”میری ان کی دودھ چوٹیں ہو گئیں“ مرغیاں زول کی زبان ہے اسی طرح شیخی بگھارنا۔ جھاڑو پھیر دینا یا درختوں کی
 اصطلاح ہے۔ کہتے ہیں ”اس کو تو گڑھی مل گئی“ یہ کسانوں کی اصطلاح ہے یا رتی چڑھ گئی جو ہریوں کا محاورہ ہے۔ اسی طرح گاڑھی چھیننا اور
 چٹے چھوٹنا جسٹک پینے والے اور جواری بولتے ہیں یا مثلاً شے دینا اور پیچ پڑ جانا اور پٹا توڑنا کلکتے کے مصطلحات سے ہے، فوج و فوجی ہتھیار کی گھڑی
 چلنا صورت (غیر عورتوں کی زبان ہے یہ سب محاورات ایسے ہیں کہ اہل زبان بھی جب تک ان کی اصل سے واقف نہ ہوں محض استعمال میں غلطی
 کرتے ہیں۔

ہر زبان میں بعض الفاظ محلِ مدح کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور بعض انھیں کے ہم معنی مقامِ ذم میں مستعمل ہیں مثلاً توانا اور ٹانٹھا اور
 شستا اور دیکھا یا چھیرا اور لقات، اسی لئے آسمان شکوہ و سپہ مرتبت کہنا صحیح ہے اور چرخ شکوہ یا چرخ مرتبت کہنا غلط۔ اس کے علاوہ
 ہر ظلم کو اس بات کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض الفاظ کا استعمال کہیں حسن پیدا کرتا ہے اور کہیں وہ حسن پیدا نہیں ہوتا۔ ادیب وہی ہے جو
 ہر لفظ کے محض استعمال کو اچھی طرح جانتا ہو اور ہر مقام میں جو نازک فرق ہے اسے پہچانتا ہو۔ مرزا دیکر کی زبان کہیں محاورہ لکھنؤ سے الگ
 تھوڑی ہے بلکہ ہر لفظ اور ہر محاورہ ان کا اردو کے لئے سند ہے لیکن میر تقی میر کی زبان اور ہی کچھ ہے۔

اردو کے بعض الفاظ لکھنؤ کے اکثر غزل گوؤں نے ترک کر دیئے ہیں، ان لوگوں میں رشک و تجروا سیر و انس ہیں اور متبعین میں عشق و
 جلال دامیر و منیر و قدر بلگرامی ہیں۔ موقوفات میں کہیں تو تحفیت لفظ کو انھوں نے فشا و ترک قرار دیا ہے مثلاً لک میں بہ نسبت ملک کے تحفیت
 ہے اور دکھانا، بتلانا اور بھلانا کے مقابل میں دکھانے، بتانے، بھٹانے میں اختصار ہے۔ ہوس کے بدلے ہو کہنا بہتر ہے۔ ہریا میں گام اور کر
 اور لکھنؤ میں کو بیکار ہے۔ کہیں انھوں نے قیاس خوبی کو بھی دخل دیدیا ہے مثلاً لک کہنا غلط سمجھتے ہیں اگر چاہئے بھول سے غلط ہے سب سے
 کہنا چاہئے۔

کہیں غلاف فصاحت ہو۔ نہ کو سبب قرار دیا مثلاً مرزا، ترزا قابل ترک ہے میرا، تیرا کہنا چاہئے۔ لیجئے، دیجئے، تجھے کی جگہ لیجئے، دیجئے،
 لیجئے کہنا اچھا ہے، گم کے بدلے گم اور سدا کے مقام پر ہمیشہ اور چر، اوپر کی جگہ لیکن گم کی جگہ لیکن، والے کے محل پر یہاں، وہاں، تمہیں کی جگہ
 کو کہنا چاہئے۔ ان سب باتوں پر انیس و دبیر و منس و انس و وحید و نفیس وغیرہ اور بعض غزل گوؤں نے بھی اعتنا نہیں کیا، ان کے شاگردوں
 میں البتہ اس کی پابندی رہی اور بعض شعرائے جہل مثلاً مرزا داغ وغیرہ کے دھوکے میں آکر ان باتوں کے پابند ہو گئے، ان موقوفات میں جہاں جہاں
 تحفیت لفظ و قیاس خوبی کو انھوں نے فشا و ترک ٹھہرایا ہے وہ قابل قبول نہیں۔ رہا یہ کہ جن الفاظ میں انھوں نے غلاف فصاحت ہونے کو سبب
 لک خیال کیا ہے اس پر عمل کرنا البتہ بہتر ہے۔ ہاں ایسے الفاظ کا استعمال جو زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں کسی قدر غیر فصیح ہونے کے باوجود ہر زبان میں
 چڑھ کر اگر جرات نے ترک کر دیا ہوتا تو یہ شعر کا ہیکو سننے میں آتا:

گودل سے زبان تک ہیں ہزاروں ہی گئے، پر کچھ منہ سے نکلتا ہی نہیں وقت ملے پر
 البتہ نثر میں اس کی پابندی نہ کرتا ہوں۔ اسی طرح تمہیں کہ بالکل چھوڑ دینا بھی مشکل ہے۔ ایک شخص سے کسی نے کہا کہ تمہیں کا لفظ نہ بولا کیجئے
 انھوں نے جواب دیا کہ اگر مجھے یہ کہنا منظور ہو کہ ”اپنے تمہیں میں بیوقوف سمجھتا ہوں“ تو کیا اس کے بدلے میں یہ کہوں کہ ”آپ کو میں بیوقوف سمجھتا ہوں“

(نوٹ) اس مضمون کا سلسلہ کئی حصے تک جاری رہے گا۔ اس کی دوسری قسط آئندہ ماہ دسمبر میں

شائع ہوگی اور باقی قسطوں کا سلسلہ سالانہ کی اشاعت کے بعد مارچ ۱۹۷۷ء سے پھر شروع ہوگا

(اداریٹ)

باب الاستفسار

مذہب عالم اور خدا کا تصور

(ام - امام، معتزہ ہاری)

کرمی - سلام منوی !

مجھے مذاہب عالم کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنی ہے اور اس کے لئے سارے ہندو پاکستان میں اگر کسی پر نظر پڑتی ہے تو وہ آپ ہیں اور مجھے امید ہے کہ علم کے اس سمندر میں جہاں پڑھتی ہوئی سوچیں دعوتِ نظارہ دے رہی ہیں وہاں اترتی ہوئی آپس ایک پیاسے کو اس کی پیاس بجھانے کا بھی موقع عنایت کریں گی !

تاریخ کے لحاظ سے مذاہب عالم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک وہ جہاں اپنی دوکان بڑھا چکے ہیں اور دوسرے وہ جہاں بھی کشت و خن کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں۔ جہاں تک پیچہ گردہ کا تعلق ہے میرے خیال میں آریہ، مصری اور یونانی قومیں ثقافتی اعتبار سے آج بھی اپنی انفرادیت کا دعویٰ کر سکتی ہیں مگر کیا ذہنی طور پر بھی ایسا ممکن ہے؟ میرا مطلب ہے کیا ان میں خدا اور اس کی پرستش کے لحاظ سے بھی یکاگلت پائی جاتی ہے؟ اگر ہاں تو کسی اور نہیں تو کیا بعد ہے؟

آریہ قوم سے میری مراد اسی وٹا وٹوں (Vedic) سے ہے جن کی تہذیب ایشیا میں اگر ہڑپہ اور موہنجو دڑو کی سہولتوں سے سر اٹھا رہی ہے تو یورپ میں مسیحیت و کاتھولک کے طغیانیوں سے (جیسا کہ خیال ہے) اسی طرح مصری تمدن سے فراعنہ مصر کا تمدن مراد ہے اور یونانی ثقافت سے وہ ثقافتی دور جب (Dionysus) کے مندر بنانے کے جذبے نے وہاں والوں میں کود لی تھی !

اب رہے موجودہ دور کے مذاہب تو ان کی رو سے ساری دنیا کی آبادی مندرجہ ذیل قوموں پر مشتمل ہے :

۱۔ زرتشت

۲۔ قدیم ہندو (Hinduism)

۳۔ اہل ہندو

۴۔ جرمن ہندو اور آئس لینڈ کے اسکیمو

۵۔ چین

۶۔ امریکہ کے سرخ ہندی

۷۔ بودھ

۸۔ آسٹریلیا کے قدیم باشندے

۹۔ نصرانی

۱۰۔ افریقہ

۱۱۔ مسلمان

۱۲۔ ایشیا

۱۳۔ سکھ

۱۴۔ یورپ

۱۵۔ بالٹکس

۱۶۔ اسرائیلی (یہودی)

کیا میں کسی اور مذہب کا نام گزانا تو نہیں بھول گیا؟ اور اگر بھول گیا ہوں تو کیا آپ میری رہنمائی کی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟ اب ان مذاہب کے متعلق جو مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ان میں انفرادی طور پر خدا کا تھیں (Concurrence) کیا ہے اس کی پرستش (Polytheism) کے کیا طریقے ہیں اور قدامت کے لحاظ سے ان کی تنظیم کھلی؟

کیا یہ سوالات آپ کے قیمتی وقت کے شایان شان ہیں؟ — یا پیاسے کو شہنم ہی ملے گی؟ — اگر کچھ کتابیں ایسی ہوں جن سے ان طبائین پر سیر حاصل معلومات بہم پہنچ سکیں تو میں شاید اپنی مدد آپ کر سکوں مگر قیمتی کتابوں کا بغل مجھ جیسا طالب علم شاید نہ ہو سکے! پھر بھی اگر گزراں خاطر نہ ہو اور آپ ان کے نام ارسال فرمائیں تو میں کتب خانوں کی خاک بھی جھان لوں!

اب سب کی طرح میں بھی جواب جلد ارسال فرمانے کی گزارش کیجئے کہ وہ جب بھی پتہ نہیں کہ آیا یہ خط آپ کے لئے جواب کے قابل بھی ہے!

(مکمل) آپ کے سوال کے دو حصے ہیں ایک تو یہ کہ پرانے زمانہ کی قوموں میں خدا کا تصور اور اُس کی پرستش کے طریقے کیا تھے اور دوسرا یہ کہ سمجھو وہ اقوام میں اب اس کے کیا معنی ہیں۔

پرانے زمانہ میں وادی سندھ (ہڑپا اور مہن جو دارو وغیرہ) میسوپوٹامیا۔ مصر اور کریٹ میں قریب قریب یکساں تمدن پایا جاتا تھا۔ یہاں کے لوگ ”شیو اور شکتی“ کی پوجا کرتے تھے یعنی وہ پنجر کی پیداوار پر درش کرنے والی قوتوں کا تصور مرد عورت کی شکل میں کرتے تھے۔ عورت کو ”ہمانا“ مانتے تھے جس کے بت اس طرح بنائے جاتے کہ وہ اپنے ماتھے سینے پر رکھے ہوئے ہے۔ ایسے بت ہر جگہ ملتے ہیں۔

یہ دیوی بابل والوں میں ایشتر کہلاتی تھی جس کا خاوند بل دیوتا تھا۔ مصر والوں میں ہی جڑا آئیس (دیوی) اور اسپریتو کہلاتا تھا۔ اسی طرح مختلف مقامات پر ان دیوی دیوتاؤں کے مختلف نام تھے۔ جنہیں خوش کرنے کے لئے قربانیاں کی جاتی تھیں اور ان پر چڑھائی جاتی تھیں۔ اس کے بعد یہ تصور پیدا ہوا کہ خدا ایک قوت ہے جس کے تین کام ہیں۔ پیدا کرنا۔ پالنا اور مارنا۔ ان تین قوتوں کا تصور تین انسانوں کی شکل میں کیا گیا جن کے نام مختلف اقوام میں یہ تھے:-

میسوپوٹامیا	ہندوستان	یونان	روم
پیدا کرنے والا	پرہما	زیئیس	جو پیٹر
پالنے والا	دشنو	پوزیڈان	نیپتون
مارنے والا	ہیش (یا شیو)	ہیڈس	بلوڈ

میسوپوٹامیا کے لوگ اپنے تینوں دیوتاؤں کو ایک ہی مرتبہ کا مانتے تھے، لیکن یونان اور روم میں زیئیس اور پیٹر ہی سب کچھ تھے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں میں آفریدگار دیوتا غائب ہو گیا دشنو اور ہیش (شیو) رہ گئے اور ان میں بھی شیو کے ماننے والوں کی اکثریت ہے۔

پھر ان دیوتاؤں پر ان کی شکلیوں (بیویوں) کا اضافہ کیا گیا اور ان کے بچوں وغیرہ کا ہونا بھی ظاہر کیا گیا۔ اس طرح ان دیوی دیوتاؤں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ یہی نہیں بلکہ دوسرے مظاہر فطرت جیسے چاند سورج اور دریا وغیرہ کے دیوتاؤں نے مل کر ہر قوم میں دیوتاؤں کی ایک خاصی فوج طیار کر دی۔ چنانچہ مصر والوں میں تو اتنے دیوی دیوتا تھے کہ ہمارے لئے ان میں مذکورہ تریمورٹی (برسمہا۔ دشنو اور ہیش) کا پتہ لگانا بھی ناممکن ہو گیا ہے۔ اور یہی حال ہندوؤں میں ہوا۔ فی الحال پڑھ لکھے ہندوؤں کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا ایک ہی ہے جو مختلف قوتوں سے مشغف ہے اور چونکہ انسان کسی بجز قوت کا تصور نہیں کر سکتا لہذا ان قوتوں کے اعتبار سے خدا کو مختلف صورتوں میں دکھایا جاتا ہے جنہیں اردو پالیشور کے مختلف روپ سمجھنا چاہئے۔

یہودیوں میں جیسا کہ ان کی مذہبی کتابوں سے پتہ چلتا ہے خدا کائنات سے الگ تھلک ایک قوت ہے جس کا تصور انسان کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ آئسٹائل میں کہیں تو آدم سے باتیں کرتے دکھایا ہے اور کہیں گلگشت کرتے۔ وہ ایک ظالم بادشاہ کی طرح ہے جو انسان کو ڈاڈا دسی بات میں ہنسنے کی دھمکی دیتا ہے۔ قریب قریب یہی تصور عیسائیوں اور مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔

خدا کا سب سے اعلیٰ تصور ہندوؤں کے اُس فلسفہ میں پایا جاتا ہے جسے ”ویدانت“ کہتے ہیں۔ اس مذہب کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ خدا مخلوق سے الگ نہیں۔ وہ ہر چیز میں سایا ہوتا ہے اور ہر چیز اس میں ہے۔ اگر وہ ایک سمجھتے تو ہم اس کے تعجب ہیں۔ انسان کی استعجاب اچھے کاموں سے

اتہائی پاک ہو جائے گی تو پریم آتما میں مل جائے گی اور جب تک آتما، پریم آتما میں نہ ملے گی اُسے بار بار پیدا ہونا پڑے گا۔ اگر پریم کرم کس کی توجہ انوں میں اٹھ کر چھ تو انسانوں میں اُسے پریم آتما تک پہنچنے میں بہت سے جہانی اور روحانی راج طے کرنا پڑیں گے۔ اور جب وہ پریم آتما میں مل جائیگا تو اُسے "نردان" (سچات) حاصل ہو جائے گا۔ اس کو مسئلہ "آواگون" کہتے ہیں۔ اور یہی عقیدہ جہ مذہب کے ماننے والوں کا ہے۔

تفاسخ کے ماننے والوں میں خدا کا تصور بہت دلچسپ ہے یعنی اسی کے یہاں خدا "پریم آتما" یعنی خوشی محض ہے۔ وہ دنیا کو پیدا کر کے الگ تھلک ایک سرور کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ اُسے دنیا کے جھیلوں سے کوئی مطلب نہیں۔ اُس نے کائنات کو بنا کر مشین کی طرح چلا دیا ہے اور خود آرام کر رہا ہے گویا اس تصور کے مطابق خدا یہ انسان کی الحاح و زاری کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ حمد و ثنا کا۔ بالافاضہ دیگر اس مذہب کے ماننے والوں کے نزدیک انسان مختار ہے اور اپنے افعال کا خود ہی ذمہ دار۔

ہندوؤں کا فلسفہ "ویدانت" مسلمانوں کے تصور کا اخذ ہے اور اُس کی تعلیمات کسی حد تک مہینوں کے اُس مذہب سے ملتی ہیں۔ جیسے "طاؤ ازم" کہتے ہیں جس کی تعلیم یہ ہے کہ "خود انکار ہی پر عمل کر دو اور طاؤ میں وصل اور جذب ہو جاؤ۔ کیونکہ طاؤ ہی دائمی اور غیر فانی راستہ ہے اہم ہو کر تمام چیزوں اور ہستیوں کو چلنا پڑتا ہے۔ وہ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ وہ تمام چیزوں کا سبب اور نتیجہ ہے۔ تمام چیزیں اُس سے پیدا ہوئیں اور اُس کی مطیع رہتی ہیں اور اُس کی طرف آخر کار مراجعت کرتی ہیں۔ وہ سب چیزوں کا سر مشہ ہے۔" اس کے بعد اہل فارس کو دیکھئے ایران کی مسلم آبادی کو چھوڑ کر وہاں ایک طبقہ "آتش پرست" لوگوں کا ہے۔ یہی لوگ ہندوستان میں پارسی کہلاتے ہیں۔ ان کا پیغمبر زرتشت یا زوراستر ہے جس کا زمانہ ۱۰۰۰ سال قبل مسیح خیال کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ دو خدا کے قائل ہیں اور ساری کائنات کو دو قوتوں کے تابع سمجھتے ہیں۔ خیر اور شر یا نور و تاریکی نیک اور خورانی قوت کا نام "یزدان" اور "اہورا" اور "دانا" ہے اور بد اور تاریک قوت کا نام "اہرمن"۔ ان میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی ہے لیکن ان کا عقیدہ ہے کہ آخر میں نیک بری غالب آئے گی۔ آخر میں ہم نیم مذہب اقوام کا ذکر کریں گے جن میں ایشیا اور یورپ کی کچھ قومیں۔ وسطی اور جنوبی افریقہ۔ آسٹریلیا۔ نیوزیلینڈ۔ ملائیشیا۔ کرویئشا۔ پالی فیشیا اور شمالی اور جنوبی امریکہ کے پرانے باشندے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ایک قوم کے لوگ جو بحر آرکٹک کے نیچے کے حصہ میں آباد ہیں۔ ان اقوام میں بہت کم ایسی ہیں جن میں خدا کا تصور پایا جاتا ہے۔ عموماً وہ دنیا کو نیک اور بد میں تقسیم سمجھتی ہیں۔ انسان کے ہر درد اور دکھ کا باعث یہی بد روحیں ہیں جنہیں جادو منتر کے ذریعہ زیر کیا جاتا ہے اور نیک روحوں کی تعریف کو کے بد روحوں کو مغلوب کرنے کی تہذیب و جاتی ہے۔ اس مذہب کا اصطلاحی نام "شاماں پرستی" ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مذہب ہے جسے "ٹوٹم ازم" کہتے ہیں۔ یعنی لوگ اپنے آباؤ اجداد کا رشتہ سمجھ کر اور حیوانوں سے جوڑتے ہیں جس قبیلہ کا جو ٹوٹم ہوتا ہے اُس کی وہ حفاظت کرتا ہے اور اگر اسے ہی کی ضرورت پڑ جائے تو پیٹے اپنی مجبوروں کا اظہار نہایت ہی موثر الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ آپ کے سوال کا مختصر جواب ہے۔ زیادہ تفصیل کے لئے آپ کو "تاریخ مذہب" "تاریخ اہم قدیمہ" علم الاقوام وغیرہ کی کتابیں دیکھنا چاہئیں۔

چند کتابوں کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں:-

The ancient Maya by (۷)	(۱) (۱)
Sylvanus Griswold Morley	(۲) اردو ترجمہ "نیا دور کا ہندو نامہ" مطبوعہ گریٹ برٹین ۱۹۳۵ء
Short History of the World (۸)	(۲) "من ویردان" مشفق نیاز فخری
by H. G. Wells	(۳) "مذہب"
The great monarchies (۹)	Chaldia by Lenaid. Rapozine (۴)
of the ancient Eastern	Assyria " " (۵)
world by (۱۰)	Assyria by A. H. Sayce (۶)
George Rawlinson	Missionary Travels. Dr. Livingstone

کائنات کی عظمت

پروفیسر ایشیٹن مشہور ماہر ریاضی دان نے کائنات کی وسعت کا اندازہ یہ کیا ہے کہ اس کا قطر ۸ ارب فوری سال کی مسافت رکھتا ہے۔
الفاظ دیگر یوں سمجھ کر روشنی جس کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکند ہے، ۸۴ ارب سال میں اس قطر کو طے کر سکتی ہے۔
یہ ہے صرف قطر کی وسعت کا اندازہ، لیکن اگر کائنات کے محیط یا پورے دائرہ کو طے کرنا ہو تو روشنی ۵۰ لاکھ طین (یعنی ۵۰ شکہ) سال میں طے کرے گی۔

آفتاب کا درجہ حرارت ۵ کروڑ ہے اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ آفتاب کی قوت حرارت دنور ۲۵ کروڑ ٹن فی منٹ کے حساب سے کم ہوتی جا رہی ہے۔

چاند کا قطر صرف ۲۱۶۳ میل ہے۔ وہ اپنا دورہ زمین کے گرد ۲۸ دن، ۸ گھنٹے ۴۳ منٹ اور ۱۱ سکنڈ میں ختم کرتا ہے یعنی بحساب ۲۳۵ میل فی سکند۔

زمین کا قطر ایک قطب سے دوسرے قطب تک ۷۹۲۶ و ۲۸ میل ہے اور آفتاب کے گرد اس کا دائرہ طواف ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کا ہے جسے وہ ۱۰۰ میل فی سکند کی رفتار سے ۳۶۵ دن، ۹ گھنٹے، ۹ منٹ اور ۹ سکنڈ میں طے کرتی ہے۔

کہکشاں کے قطر کا اندازہ ایشیٹن نے ۲ لاکھ ۵۰ ہزار فوری سال لگایا ہے۔ ان گنت کائناتوں کے مطابق کہکشاں مجموعہ ہے ۳ کھرب تاروں جس میں بے شمار نظام شمسی پائے جاتے ہیں اور جن کے آفتاب ہمارے آفتاب سے کہیں زیادہ بڑے ہیں لیکن وجود اس عظمت کے کہکشاں خود اپنے نظام ہائے شمسی اور سیاروں کے اپنے محور پر گردش کرتی رہتی ہے اور اس کی ایک گردش ۳ کروڑ سال میں پوری ہوتی ہے۔
لیکن کہکشاں بھی صرف ایک ہی نہیں ہے۔ ۱۰۰ ارب والی دور میں سے دیکھنے کے بعد پتہ چلا ہے کہ ۲۰ لاکھ کہکشاں ہیں اور جن کا فاصلہ ۲۰ لاکھ فوری سال ہے۔

ہمارے کرۂ زمین کی عمر ۲ ارب سال ہے اور اس میں آغا حیات پیدا ہونے کا زمانہ اب سے ۳۰ کروڑ سال پہلے ہوا تھا لیکن آدمی کی پیدائش اب سے صرف ۳ لاکھ سال پہلے ہوئی ہے۔

فراست الید

جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی یا حق کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال و موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔ منجرِ حکار۔ لکھنؤ

قفس و نشین

اب آگے کھیل مقدر کا - آب و دانہ کا قفس میں خواب تو دیکھا ہے آشیانے کا
یہ انقلاب پسندی بھی جزوِ فطرت تھی قفس کا ہو کے رہا میں نہ آشیانے کا
قفس میں لاکے اسے صیاد رکھ دے سارے گلشن کو جواب آشیاں تو ہو سکے گا پھر بھی مشکل سے
آسمان کو میرے خالی آشیاں سے کیا غرض جس جگہ میں ہوں وہاں بجلی گھرا نا چاہئے
تھی یہی فصل کہ جب اپنا نشین اُجڑا بڑھ گئی وحشتِ دل اور بہار آنے سے
آشیاں کا ایک اک تنکا ابھی تو یاد ہے بھوتا جاؤں گا جو جو دن گزرتے جائیں گے
قفس صیاد رکھ تو دے ہوئے صحنِ گلشن میں اجل آئے کہ خیزد آئے اسیروں کے مقدر سے
بلا سے قید کر صیاد یہ عقدہ تو حل ہو گا چمن میں آشیاں سے ہم تھے یا تھا آشیاں ہم سے
چمن کی زمزمہ سنجی چمن کے ساتھ تھی نیر قفس ہے اب قفس میں بیٹھ کر آہ و نغاں کر لیں
اور تو کیا کہیں ہم پر جو قفس میں گزری آگیا موسم گل یہ بھی سنا کانوں سے
آشیانے کی کشش کیا روکتی، آنے والا زیرِ دام آ ہی گیا،
چمن والوں کو یاد آیا تھا میں بھی موسم گل میں؟ بتا اے نوگرفتارِ قفس کچھ ذکر تھا میرا؟
کیوں سنا تا ہے نشین کی کہانی، صیاد! قید میں ٹوٹ چکے ہیں بربرِ روانہ - دھمید،
خبر بہار کی آئے گی اور سمجھ آئے گی قفس نصیب کہیں ایک سال ہو جائے
پڑے ہیں جو منتشر وہ تنکے اٹھا اٹھا کر سجا رہا ہوں خبر کرے کوئی بکلیوں کو کہ پھر نشین بنا رہا ہوں
قیدِ قفس میں ذکرِ نشین کروں گا میں کھلتی نہیں زبان کہ تازہ ہے غم ابھی
چمن تو چھوٹا قفس میں آئے اسی کو اللہ اس لائے وہاں نشین بنا چکے ہم، یہاں نشین بنا رہے ہیں
ابھی کے دن ہوئے اُجڑے ہوئے میرے نشین کو ابھی پہچانتا ہے مجھ کو سہریۂ گلستاں کا
نیر اکبر آبادی

نیساں اکبر آبادی :-

موجیں یہ تبسم کی تیرے ہونٹوں پہ جو کھیلا کرتی ہیں
کچھ حسن میں تو بھی یکتا ہے تسلیم کیا میں نے لیکن
طوفان میں کشتی آئی بھی اور ڈوبنے والا ڈوب گیا
بیتاب ہے دل جنگلی خاطر میں جن کو ترستا رہتا ہوں
اس دل کے فسر وہ عالم میں اک حشر سا برپا کرتی ہیں
کچھ میری نگاہیں بھی تیرے جلووں کو سنوا کر کرتی ہیں
اب کیا ہے جو ساحل پر لہریں اٹھ اٹھ کے نظار کرتی ہیں
مجھ سے بھی چھپا کر میری طرف وہ نظریں دیکھا کرتی ہیں
تہائی میں ٹہیں اٹھ اٹھ کر یہ کس کو پکارا کرتی ہیں

مشیر جھنجھانوی

محبت میں سحر اسے دل برائے نام آتی ہے،
نہ جانے کیوں دل غم آشنا کو دیکھ لیتا ہوں،
محبت نے ہر اک سے بے تعلق کر دیا مجھ کو
نہ جانے کون سی منزل میں اب تم جلوہ فرما ہو
یہ وہ منزل ہے جس منزل میں اکثر شام آتی ہے
جہاں کانوں میں آواز شکست جام آتی ہے
تمھاری یاد بھی اب تو برائے نام آتی ہے
نظر رہ کے اٹھتی ہے مگر ناکام آتی ہے
تمھارا نام لیکر گردشِ ایام آتی ہے
بدل سکتا ہوں اس کا رخ مگر سوچ کر چپ ہوں

رباعیات

(صفیہ شمیم طبع آبادی)

اے سینہ گردوں کے شرار و ٹھہرو
آنکھوں سے ابھی تو بہ رہے ہیں آنسو،
ڈھلتی ہوئی رات کے سہار و ٹھہرو
اے ڈوبتے غمناک ستار و ٹھہرو

ہر لمحہ طرب خیز ہے ماتم گویا،
گلشن میں بہار ابی آئی کیسی
ہر پھول ہے اک دیدہ پر نعم گویا
جنت میں سبڑک اٹھا جہنم گویا

تقدیر تھر جاگ اٹھی ہے گویا
کھڑے کی یہ سرخیاں، تبسم کی یہ ضو
تویر قمر جاگ اٹھی ہے گویا
جنت میں سحر جاگ اٹھی ہے گویا



شکار کی پرائی مکمل جلدیں

۳۶	۳۵	۳۲	۳۱
۱۵	۱۵	۱۵	۱۵
۳۴	۳۴	۳۴	۳۴
۱۵	۱۵	۱۵	۱۵

نمبر شکار

تنقیدی اشائے

پروفیسر آل احمد سرور ریڈر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے انہیں تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں شامل ہے۔ پروفیسر سرور اس جہد کے نہایت مشہور نقادوں میں سے ہیں اور ان کے تنقیدی مقالات سنہری جہت رکھتے ہیں۔ صفحات ۲۳۲ صفحات کاغذ ۲۸ پونڈ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول - نمبر شکار - لکھنؤ

جسٹ اشتہار دینا حرام ہے پس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے انسان ماننا آپ کا فعل ہے یہ دوا دنیا میں مسیبت حاصل کر لی تو ولایت میں اسکے دماغ میں عجب غمیری موجود ہے۔ دماغ کو دوسرے کے آکسیر صفت ہے جو ان بوڑھے سب کھاتے ہیں اس دعا کے مطابق میں سیکڑوں قیمت ادویات اور کشتہ جات بکا رہا ہوں اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پانچ سو گلی ٹیم کر سکتے ہیں اس قدر مقوی دماغ ہے کہ کہیں باقی بھی خود بخود ادا نہ لگتی ہے اس کو کسل آجی جات کے تصور نہ لگے اسکے استعمال کرنے سے پہلے اپنا دماغ کر لے ایک سی سی جسات سیرخون ایک مہر اضافہ کر دے گی اسکے استعمال سے ۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی یہ دوا زخموں کو شلی گلاب کے پھل کے سرخ اور مثل کنڈی کے درخشاں بنا دے گی۔ دوا انہی نہیں ہے بلکہ ہزاروں مالوس العلوق اسکے استعمال سے ہمارے ہنگامی پندرہ سو سال کے جان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی دوا ہے کہ آپ محبوب عمل نہیں کر سکتے۔ انھیں اسکی صفت تحریریں نہیں آسکتی تھی جو کہ دیکھ لیتے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا میں نہیں ہے قیمت فی شیشی ۳۴ روپے عوامی چار روپیہ (لکھنؤ)

نوٹ :- خایہ نہ ہو تو قیمت دہا میں - فہرست دوا خانہ مفت شکار ہے۔ میں انڈیا کو حاضرہ انڈیا میں لکھا ہوں کہ دوا آکسیر کا کام کرتی ہے نقادوں سے ہوشیار رہتے میری ۱۲ سالہ شہرت بہت بڑھ گئی ہے

حکیم ثابت علی شیخ زبان خوش کلام

(عام انشوی مولانا کے روم صاحب)

محمود شکار لکھنؤ یو۔ پی

جن پتوں کو

بڑا ہو کر دنیا میں اپنی آواز بلند کرنی ہے ان کی پرورش نو نہال پراں چاہیے

نو نہال

نچے پتوں کو مضبوط بنانے والا

ان کا دل پسند مانک

ہمدرد دوا خانہ وقفہ ملی



Hamdard

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہاز ران کمپنی

بحر احمر اور مارشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ

بمبئی سے

عدن، جدہ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی
اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ضرورت پڑنے
پر دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کر سکیں گے
مزید معلومات کے لئے
حسب ذیل پتہ پر لکھئے

ٹرنر مارین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶-بنک سٹریٹ-بمبئی

مکتوبات نیاز شہاب کی سرگزشت جذبات بھاشا فلاسفہ قدیم شاعر کا انجام

تین حصوں میں	حضرت نیاز کا وہ قدیم نظم	جناب نیاز نے ایک	اس مجموعہ میں حضرت نیاز	جناب نیاز کے عنوان لباب
ڈیڑ لکھ کے تمام وہ خطوط	افسانہ رور زبان میں	دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین	کے دو طبعی مضامین	کا لکھا ہوا افسانہ حسن و متق
جذبات نگاری، سلاست بیان	بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری	ہندی شاعری کے نمونے	شامل ہیں :-	کی تمام نش و نشان کیفیات
رنگینی اور البلیہ بن کے لحاظ	کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی	پیش کر کے ان کی ایسی	(۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم	اس کے ایک جملہ میں موجود
سے فن انشائیں بالکل پہلی	زبان و تخیل اس کی نزاکت	تشریح کی ہے کہ دل بیاب	کی روحوں کے	میں یہ افسانہ اپنے پلاٹ
جہیز میں اور جن کے سامنے	بیان اس کی بلندی مضمون	ہو جاتا ہے اردو میں بھی	ساتھ۔	اور انشائے کے لحاظ سے
خطوط غالب بھی پھیلے معلوم ہوتے	اور اس کی انشا حالیہ سحر	سب سے پہلی کتاب اس	(۲) مآدین کا مذہب	اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسرے
میں ان آدیشوں میں پہلے	حلال کے درجہ تک پہنچتی	موضوع پر لکھی گئی ہے	منہایت مفید و دلچسپ	بلکہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی
آدیش کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے۔ یہ آدیش نہایت صحیح	جس میں ہندی شاعری	کتاب ہے۔		تازہ آدیش نہایت صحیح و
اور وہ اپنے اند کے کاغذ پر عطا	اور خوش خط ہے۔	کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں	قیمت	خوش خط، سردرق رنگین
ہوتی ہے قیمت ہر حصہ کی	قیمت دو روپیہ	قیمت بارہ آنے	ایک روپیہ	قیمت بارہ آنے
چار روپیہ علاوہ محصول	علاوہ محصول	علاوہ محصول	علاوہ محصول	علاوہ محصول

فراسات الہد نقاب بھاشا کے بعد مذاکرات نیاز انتقادات مذہب

مولفہ نیاز فتحپوری اس کے	نیاز فتحپوری کے تین فنانوں	یعنی حضرت نیاز کی ڈائری	حضرت نیاز کے انتقادی مقالہ	حضرت نیاز کا وہ
مطالعہ سے ایک شخص	کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے	جو ادبیات و تنقید عالمیہ کا مجموعہ، نہایت مضامین پر	محکمہ آثار و امانات میں	محکمہ آثار و امانات میں
انسانی اتمہ کی شناخت	کہ ہمارے ملک کے ادیان	عجیب غریب ذخیرہ ہے	ایران ہندستان کا اثر جس میں	انہوں نے بتایا ہے کہ
اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر	طریقت علماء کرام کی	ایک بار اس کو شروع کر لیا	شاعری پر فارسی زبان کی	مذہب کی حقیقت کیسا
اپنے یاد دہانہ شخص کے	اندرونی زندگی کیا ہے اور	آخر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ	پیدائش پر یونانہ نظر آرد و	ہے اور دنیا میں کیونکر
مستقبل، سیرت، عروج و	ان کا دور و ہماری معاشرت	بھی جدید آدیش جس میں	شاعری پر تاریخی تھرو آرد و	راج ہوا اس کے مطالعہ
زوال، موت و حیات	واجتماعی حیات کیلئے کس کس	صحت اور نفاست کا غفر	غزل گوئی کی عمدہ ہر عمدہ	کے بعد انسان خود فیصلہ
صحت و بیماری، شہرت	سرمقال ہو، زبان، پلاٹ	و طباعت کا خاص اہتمام	نقشائے رنگ رنگ (غالب)	کر سکتا ہے کہ مذہب کی
نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی	انشائے کے لحاظ سے جو مرتبہ	کیا گیا ہے۔	کی ناسی غزل گوئی پر تبصرہ)	پابندی کیا معنی کہتی ہے
کر سکتا ہے :-	ان افسانوں کا ہے وہ مرث	قیمت	ادبیات و اصول نقد	قیمت
قیمت ایک روپیہ	دیکھنے سے طبع رکھتا ہے	ایک روپیہ	نمونہ ادبی حقیقت نگاری	ایک روپیہ
علاوہ محصول	قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول	علاوہ محصول	قیمت چار روپیہ علاوہ محصول	علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۴۳ء

فروری مارچ

جنوری ۱۹۴۴ء

اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام ہر ملک کے مستند شاعرین نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیانی قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

یونین اقتادہ ہر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے معنائیں پوشل ہے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

اس سالنامہ کا نام ماحولین نمبر ہے جس میں ایک نیشنل لٹریچر ادیب کی ایک ہزار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا جو ادب اور جذبات نگاری کے لحاظ سے بڑا دلربا نظریہ نہیں رکھتا قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری فروری ۱۹۴۸ء

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

پاکستان نمبر نگار کا جو بی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہوتا کہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زرین کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً بیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے پراسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا سرمایہ کیسی فائدہ پہنچا ہے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری فروری ۱۹۵۰ء

جنوری ۱۹۵۱ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا پتہ پڑ جس میں ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و اشتقاقی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعرا کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

اس سالنامے کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں اس ہینڈس کی مشہور عالم کتاب "ایک منتقل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ مالک اسلامی کی سیاحت کے بعدوں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کننا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹنگ کے قلم کار ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو لکھا گیا ہے قیمت دو روپیہ

جولائی ۱۹۵۱ء

سالنامہ ۱۹۴۸ء

مومن نمبر

جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کے لئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ایک منتقل کتاب ہے جس کا نام ہے ۵۵ سال کے بعد یہ کتاب انبیاء علیہ السلام پر آمنا مفید و دلچسپ لکچر ہے کہ آپ ان کی ایک نیا نیا تصویر دیکھ سکتے ہیں ایک چھوڑی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی زندہ رہنا بھی ایک فن ہے اور اگر اس فن کو آپ سمجھ لیا تو پھر (۱) دنیا کا ہر فنچ دان آپ کیلئے بنی ہو جائے گا (۲) آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات کو آغا ہو گا (۳) آپ کی طبیعت کا سبب بارگاہِ عالم (۴) خطاطی و مصطفیٰ کا موجودہ نمونہ طبعی باقی رہے گا (۵) شاہراہ حیات پر چلنے کا وہ طریقہ معلوم ہو جائیگا جو وقت نکل ہی آگے اور جمل قیامت میں

۱۲/۱۹۱
چونکہ پاکستان میں ایک ایسا
پندرہ روزہ

رجسٹرڈ نمبر ۴۶۶

- 2 DEC 1951



ہندوستان و پاکستان دونوں ملک
میں فی کپی ۱۰ روپے
سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان

آٹھ روپیہ (مع سالانہ)
چھ روپیہ (بغیر سالانہ)

توہین شری و سرادین خان بھگیا
مدیر

تصانیف نیاز فوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے والی
انجیل انسانیت

مذہبی استفسارات و جوابات

کا

مجموعہ

من ویزواں

مولانا نیاز فوری کی ۴۴ سالہ دو تصنیفیں اچھا ایک
غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام
ذوہ انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامتہ کے ایک رشتہ
سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہو اور جس میں مذہب
کی تخلیق دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور محاکمہ و قدر
کی حقیقت پر تاریخی علمی اخلاقی اور نظیاتی نقطہ نظر سے
ہدایت بلند افشار اور بہ زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہو
ضخامت ۶۴ صفحات مجلد نو روپیہ لغت علاوہ محصول

جس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے
ان کی مختصر طور پر یہ ہے: صاحب کف معجزہ و کرامت
مشائخ مجبور ہے یا مختار مذہب عقل طوفان روح فخر
کی حقیقت مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں یس و یس اور دہان ہی
حسن و حسن کی داستان عقارون سامری علم غیب دعا
آپ انسان عالم برزخ یا روح ماجد اروت اروت
حق کوئی نام نہادی اور محمدی اور بنی صراط آتش نمرود وغیرہ
ضخامت ۶۴ صفحات کثیر تصدیق و توثیق علاوہ محصول پانچ روپیہ علاوہ

نگارستان محاسن

حسن کی عیاریاں

ترغیبات حسنی یا

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالے اور دیگر کار کے فاضل و صلاح
اور انسانیوں کا مجموعہ نگارستان نے ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں
ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا عورت خیال اور پاکیزگی زبان کے
اعلاؤں اس کو ملکا اور اس کے متعلق بہترین شاہکاروں کے علاوہ ہنگ
فیروز راویوں کی شکل کے گئے اس میں
میں حسنہ انسانی اور ادبی مقالے نظر آئے گا ہر خانہ اور ہر مقالہ ہی جگہ
ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے مجموعہ ادب کی حیثیت کمزوری میں
ایک شخص میں نہ تھے اس لئے میں متذکرانہ اعانہ کئے گئے ہیں
مطلوبت بھی زیادہ ہے جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے
قیمت ۴ روپیہ علاوہ محصول قیمت پانچ روپیہ علاوہ آنے علاوہ محصول

اور دوسرے افسانے اور دوسرے افسانوں کا تیسرا مجموعہ
جس میں تاریخی اور الفائد لطیف کا
بہترین استخراج آپ کو نظر آئے گا اور تاریخی و فنیاتی حیثیت سے نہایت
ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ ہر درجہ کے ساتھ متعارف ہو کر گاہ
دیکھ ہو گا کہ تاریخ کے پورے ادراکی اور فنیاتی حیثیت سے نہایت
میں کتنی دکن جیتھیں پائیدہ نہیں ہوئے ہو کہ اسلام کے نام کے نام
حضرت نیاز کی ان رائے اور میں کتنی ملک اس کتاب میں آپ کو
زیادہ دلکش بنا دیا ہے
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول قیمت پانچ روپیہ علاوہ آنے علاوہ محصول

اس کتاب میں فاضلی کی تمام فطری
اور غیر فطری قسموں کے حالات
تاریخی و فنیاتی حیثیت سے نہایت
درجہ کے ساتھ متعارف ہو کر گاہ
دیکھ ہو گا کہ تاریخ کے پورے ادراکی اور فنیاتی حیثیت سے نہایت
میں کتنی دکن جیتھیں پائیدہ نہیں ہوئے ہو کہ اسلام کے نام کے نام
حضرت نیاز کی ان رائے اور میں کتنی ملک اس کتاب میں آپ کو
زیادہ دلکش بنا دیا ہے
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول قیمت پانچ روپیہ علاوہ آنے علاوہ محصول

بالکل آخری اطلاع

نمبر کے نگار میں ایک مطبوعہ کارڈ رکھ دیا گیا تھا تاکہ خریداران نگار اس کی خانہ پوری کر کے واپس کر دیں لیکن سب اس طرف آ نہیں کی۔ اگر آپ کو اپنے پرچہ میں مطبوعہ کارڈ ملے تو اس کے منے یہ ہیں کہ آپ کی اطلاع ہم کو نہیں ملی (پاکستان کے خریداروں کے نام کارڈ علیحدہ روانہ کئے گئے ہیں) آپ کو تکلیف فرما کر تین پیسہ کا صرف گوارا کر کے کارڈ کے ذریعہ سے اطلاع دینا چاہئے (کارڈ اب بیرنگ نہیں جاسکتا، تلفت کر دیا جاتا۔ اگر آپ نے اب بھی کوئی اطلاع نہیں دی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو دور روپیہ کا اضافہ سالانہ چندہ میں منظور ہے اور آپ کے سالانہ آٹھ روپے چھ آنے میں ذریعہ دی پی بھیجا جائے گا۔ اگر آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۷۷ء میں ختم ہو رہا ہے۔ ورنہ دور روپیہ چھ آنے میں۔ اگر آپ نے اپنی نامظوری کی اطلاع دیدی تو سالانہ تو آپ کے پاس نہ بھیجا جائے گا لیکن اس کے بعد ختم میعاد پر حسب معمول و چھ روپیہ چھ آنے کا وہی پی کیا جائے گا۔

اگر آپ سالانہ چندہ یا سالانہ کی قیمت ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں تو ہر مصارف رجسٹری بھی ضرور شامل کر دیجئے۔ ورنہ سالانہ کم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

پاکستان کے خریداروں کے نام دی پی نہیں جاسکتا اس لئے وہ اپنا سالانہ چندہ آٹھ روپیہ پانچ آنے یا سالانہ کی قیمت دور روپیہ پانچ آنے (۵ روپے مصارف رجسٹری ہیں) ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ پر روانہ فرما کر ہم کو اطلاع دیں :-

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الہی بخش کالونی - کراچی

»نگار« کا آئندہ سالانہ

حسرت نمبر ہوگا

جو صرف آٹھ روپیہ سالانہ چندہ ادا کرنے والوں کو مل سکے گا

یہ بات بالکل طے شدہ ہے کہ آئندہ سالانہ "حسرت نمبر" ہوگا لیکن فی الحال یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کس نوعیت کا ہوگا خاص ہے کہ اس حسرت کے حالات زندگی، انکی شاعری پر تبصرو، ان کے کلام کا انتخاب ہوتا ہی ہے، لیکن اس کے علاوہ اور کیا ہوگا، اس کی تفصیل نہ پوچھئے۔

کوشش کی جا رہی ہے کہ عہد حاضر کے تمام اکابر نقد و ادب کے مضامین حاصل کئے جائیں اور ان کے کلام کا ایسا انتخاب پیش کیا جس سے حسرت کی غزل گوئی کی انفرادیت پوری طرح واضح ہو سکے۔

منہر نگار

قیمت فی کاپی غیر خریداران نگار سے دور روپیہ (عام) — ایجنٹوں سے ایک روپیہ آٹھ آنے (پر) فی کاپی۔

سالنامہ جنوری ۱۹۵۲ء
دوسرے ہفتے میں شایع ہو جائے گا

نگار

ادبیر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۰	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۵۱ء	شمار ۶
۳ ملا خطا	۲۶ ادب لکاتب وانشاعر.....	
۵ انسان و انسان اعلیٰ مسعود جاوید (بی۔ اے).....	۳۵ فانی برائیونی (تقابلی مطالعہ)..... سید محمد رشید درو.....	
۱۹ آزاد نگار جلیل عابدی.....	۴۱ باب لکڑی و المناظرہ.....	
۲۳ وسط ایشیا کی جدید شاعری کے نمونے..... لطیف الدین احمد.....	۴۴ مطبوعات موصولہ.....	

پہلے اس پر پڑھیے



داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس بات کی کہ آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ختم ہو گیا اور اب آئندہ سال کا چندہ وصول کرنے کے لئے جس میں سالنامہ بھی شامل ہوگا، جنوری، فروری کا مشترک پرچہ ذریعہ دی، پی آٹھ روپیہ چھ آنے میں روانہ کیا جائے گا، اور آپ کو معافی منی آرڈر چھ روپیہ آٹھ آنے ادا کرنے کے بعد ملے گا۔

اس لئے اگر آپ سالنامہ نہیں چاہتے تو ازراہ کرم بوالہسی ڈاک مطلع فرمائیے اور ہمیں چھ آنے کے نقصان سے بچائیے۔

اب رجسٹری کے مصارف بھی بڑھ گئے ہیں اور ایک آنہ دی پی ٹیکس بھی زیادہ دینا پڑتا ہے۔

اگر آپ نے سالنامہ لینا پسند نہ کیا تو مارچ ۱۹۵۲ء کا پرچہ حسب دستور چھ روپیہ چھ آنے میں دی، پی کیا جائے گا۔

اگر آپ آٹھ روپیہ چندہ ذریعہ منی آرڈر بھیجیں تو پانچ آنے مصارف رجسٹری بھی ضرور اس میں شامل کر دیں۔ تاکہ سالنامہ آپ کو محفوظ پہنچ سکے۔ چندہ ذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں آپ کو تین آنے کی بچت ہوگی۔

پاکستان کے خریدار اپنا سالانہ چندہ (اگر ان کا چندہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ختم ہو رہا ہے) آٹھ روپیہ چھ آنے یا اگر چندہ دسمبر ۱۹۵۰ء کے بعد کسی مہینے میں ختم ہوا ہے تو صرف سالنامہ کی قیمت دو روپیہ پانچ آنے ذریعہ منی آرڈر کراچی کے پتہ سے روانہ فرمائیں۔
منہج

ملاحظات

ازدواجی برکات آج نہ صرف ہندوستان بلکہ تقریباً ساری دنیا اقتصادی دشواریوں میں مبتلا ہے اور اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی صورت اس کی سمجھ میں نہیں آتی البتہ جب وہ ماضی کی خوشحالیوں کو یاد کرنا ہے تو اپنے آپ کو تسکین یا غریب تسکین دینے کے لئے یہ بھی سمجھتا ہے کہ ممکن ہے آئندہ پھر وہی دور فراغت لوٹ آئے اور زندگی کی اس کشمکش سے نجات لے جائے لیکن وہ اس حقیقت سے واقف نہیں اور اس کا نادانانہ رہنما ہی بہتر ہے کہ جو زمانہ گزری وہ لوٹ کر واپس آئے والا نہیں اور جو زمانہ آئے والا ہے وہ حال سے زیادہ ہولناک ثابت ہوگا۔

جس وقت آپ صبح کو بیدار ہوتے ہیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ دنیا جہاں کل تھی وہیں آج بھی ہے، حالانکہ وہ روز ایک نئے ہنگامہ سے دوچار ہوتی ہے۔ کل رات کو جس وقت آپ بستر خواب پر گئے تھے، اس وقت آپ اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھے کہ صبح آپ جو وقت ناشتہ کرنے بیٹھیں گے تو دنیا میں آپ کے ساتھ ۵۵۰۰۰ ناشتہ کرنے والوں کی تعداد اور بڑھ جائے گی۔ اسی طرح آج کے بعد جب کل بیچ ہوگی تو بھی آپ کو اس کا علم نہ ہوگا کہ اس میں ۵۵۰۰۰ کا اضافہ اور ہو گیا ہے اور یہ اضافہ روزانہ اسی طرح ہوتا رہے گا، خواہ انسان مرے یا بچے۔ دنیا کی آبادی میں روزانہ ۵۵۰۰۰ کے اضافہ کے معنی یہ ہیں کہ ہر سال ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ آدمیوں کا اور ہر پندرہویں سال ہندوستان یا چین کے برابر پورے ایک ملک کا اضافہ دنیا میں ہوتا جا رہا ہے حالانکہ زمین جس سے غذا حاصل کی جاتی ہے اس میں ایک انچ کا اضافہ بھی نہیں ہوتا۔

یہ ہے وہ ”سرد اعصابی جنگ“ جس نے ساری دنیا کو گروہ برائز کر رکھا ہے اور یہ ہے وہ تلخ حقیقت جو ہر منٹ انسان کو فقر و فاقہ سے قریب تر کرتی جا رہی ہے۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ انسان دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لئے ہمدوق، توپ اور آٹم بم تو طیارہ کر رہا ہے لیکن گھر کے اس سب سے بڑے دشمن سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر متحدہ اقوام کی جبرل اسمبلی کو بھی نہیں موصوفی۔

یورپ میں رہتے بڑا، طاقتور، ذی شعور اور ہوشمند ملک انگریزوں کا ہے، لیکن وہ بھی آج تک اتنی غذا پیدا نہیں کر سکا جو اس کی ضروریات کیلئے کافی ہو لیکن خیر جنگ سے قبل تو صورت کچھ اور تھی اور وہاں کا انسان آج بھی اس زمانہ کو یاد کر رہا ہے جب کتاؤ کے گھروں، نیوز فینڈ کے کھن، ڈنگر کے گوشت، الیکٹریک بائیں، برازیل کے قہو، مشرقی تعمیر کی سکر، ورجینیا کے تاکو اور سویڈن کی دیاسلائی سے وہ اپنی تمام ضروریات آسانی سے پوری کر سکتا تھا اور گو سوائے اس الوداعی بوسے کے جو گھر سے رخصت ہونے وقت اسے بیوی سے مل جاتا تھا، کوئی ایک چیز بھی گھر کی نہ تھی، تاہم وہ خوش تھا کہ خیر چرنب جیتا تو ہو جاتی تھیں، وہ ان کو آسانی سے خرید کر لے سکتا تھا، لیکن اب کہ ہر ملک اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا ہے اسے یہ آسانیاں بھی حاصل نہیں اور پریشانی ہے کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے۔

ایشیا میں اس لحاظ سے سب سے زیادہ غریب و محتاج ملک ہندوستان ہے اور اس کے پڑوسیوں میں سے کوئی ملک ایسا نہیں جو اسکی ضروریات کو پورا کر سکے۔ برما میں چاول کی پیداوار زیادہ ہے اور اس نے اس کی فراہمی کا وعدہ بھی کیا ہے، لیکن ادلی تو صرف چاول ہماری غذائی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا اور دوسرے یہ کہ برما کے لئے بھی اب ایغا و عہد مشکل ہو گیا ہے۔ پاکستان میں غلہ کی پیداوار یقیناً اس کی ضروریات سے زیادہ ہے، لیکن ادلی تو وہ اتنی نہیں کہ اپنے ذخائر محفوظ رکھتے ہوئے بھی ہندوستان کی ضرورتوں کو پورا کر سکے اور اگر اس کا امکان ہو تو شرح تبادلہ کی ناہمواری کی وجہ سے وہاں کا غلہ ہندوستان بہت گراں پڑتا ہے، چین کی پیداوار بھی اچھی ہے، لیکن کوریائی جنگ کی وجہ سے وہ بھی فی الحال ہندوستان کی کوئی قابل ذکر مدد نہیں کر سکتا دوسری بھی ہندوستان کو غلہ بھیج سکتا ہے لیکن نہ صرف ذریعے نقل و حمل کی دشواری بلکہ سیاسی، سماجی کی بنا پر بھی ہندوستان اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اس لئے اب صرف دو ملک امریکہ اور کینیڈا رہ جاتے ہیں جن کی مدد سے ہندوستان اپنے فقر و فاقہ کی مصیبت میں کمی پیدا کر سکتا ہے۔ (آسٹریلیا کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ اس کی امداد کا دیر بہت محدود ہے) لیکن اس کی امداد کی جو اخلاقی قیمت ہندوستان کو ادا کرنا پڑے گی وہ شدید فقر و فاقہ کی مصیبت سے

زیادہ المناک ثابت ہوئی۔ ظاہر ہے کہ امریکہ ہوا کنڈا، ان میں سے کسی کو ہمارے ساتھ اس لئے بھروسہ نہیں ہو سکتی کہ یہ انسانیت کا تقاضہ ہے بلکہ صرف اس لئے کہ آہستہ آہستہ یہاں اپنا اقتدار قائم کر کے روس کے خلاف وہ اپنا ایک نیا محاذ طیار کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ مسٹر جنرل جلال باجوہ نے جو کنڈا کی طرف سے کوئٹہ پلان کے ایڈمنسٹریٹر ہیں، اپنی ایک تقریر میں صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ ”اگر مغرب کی جمہوری حکومتیں یہ چاہتی ہیں کہ ایشیا کا وہ حصہ جو ابھی آسکو کے اثر سے محفوظ ہے، آئندہ بھی محفوظ رہے، تو ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ خود اپنے اثرات ایشیا میں قائم کریں۔“

کنڈا نے حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ وہ ایک کروڑ امریکیوں ہندوستان کو تھکاپیش کرنا چاہتا ہے لیکن صرف اس خیال سے کہ ہندوستان سے فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت کو ملک کی ترقی اور منصوبہ بندیوں کی تکمیل میں صرف کرے گا اور اس طرح اسکی رعایا کنڈا اور امریکہ کے ان احسانات کے اعتراف میں روسی اثرات کو قبول نہ کرے گی۔ لیکن جمہوری حکومتوں کا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہونا نظر نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں اب بھی افادہ زمین اتنی ہے کہ اگر اس میں کاشت کی جائے تو پیدوار دو چند ہو سکتی ہے۔ اسی طرح بہت سی چھپی ہوئی دولتیں معدنیات کی صورت میں بھی یہاں پائی جاتی ہیں اور صنعتی ترقی کے لئے بھی یہاں خام پیداوار کی کمی نہیں لیکن باوجود اس کے یہ بات ہندوستان کے بس کی نہیں کہ وہ اپنی ترقی کے کسی منصوبہ کو کامیاب بناسکے، کیونکہ اس کے لئے روپیہ سے زیادہ عزم و ارادہ، اخلاق کی بلندی، فرض شناسی اور راہی و رعایا کے باہمی تعاون کی ضرورت ہے اور ہر قسمی سے ان میں سے کوئی چیز یہاں نہیں پائی جاتی۔

مسٹر منشی وزیر غذائیات نے یقین دلایا تھا کہ وہ بہت جلد ہندوستان کو غلہ کی پیداوار کی طرف کنیل بالذات بنا دیں گے، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا انھوں نے سب سے پہلے ”غلہ پیدا کرو“ کی اسیمبلی کے سامنے پیش کی، جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو ”درخت لگاؤ“ کی تحریک شروع کی اور اب وہ صرف ”دل مضبوط رکھو“ کی تلقین فرما رہے ہیں، اور وہ بھی غالباً اس اطمینان پر کہ اشتراکیت و جمہوریت کی کشش کی بدولت غلہ کی رشوت کسی نہ کسی طرف سے مل ہی جاوے گی۔

کس قدر شرم و افسوس کی بات ہے کہ پچیس ربح صدی تک جنگ کی مصیبت میں مبتلا رہنے کے بعد جب آزاد ہوتا ہے تو صرف دو سال کے اندر اتنا غلہ پیدا کر لیتا ہے کہ اپنی کم کر دہ کی آبادی کی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اس کی برآمد کر سکتا ہے اور ہندوستان جو ایک صدی سے براہ راست کسی جنگ میں مبتلا نہیں ہوا، آزاد ہونے کے چار سال بعد بھی اس قابل نہ ہوا کہ وہ اپنی آبادی کو زندہ رکھنے کے لئے غیر ممالک کے کم و کرم کا محتاج نہ رہے۔ ہندوستان کے پاس دولت کی کمی نہیں، زمین کی کمی نہیں، خام پیداوار کی کمی نہیں، معدنیات کی کمی نہیں، لیکن اس تمام افراط کے مقابل میں بغرض کام کرنے والوں اور فرض شناس انسانوں کی کمی اتنی بڑی تعریف ہے کہ ہم اپنے ذہنی خوشحالی میں کسی ایک سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ پھر ایسا نہیں کہ حکومت اس حقیقت سے بے خبر ہو، لیکن اس کا علاج اس کے پاس کوئی نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق غلہ سے نہیں بلکہ انسان پیدا کرنے سے ہے اور وہ ملک جس کے اکابر بھی اب بھی ہزاروں سال کی مردہ تہذیب کو زندہ کرنا ترقی سمجھتے ہوں، اب کیا کبھی بھی انسان پیدا نہیں کر سکتا۔ ہندوستان نے تقسیم کے بعد جتنی بھی غلطیاں کی ہوں، لیکن اس کی سب سے بڑی غلطی جس کو زمانہ کبھی معاف نہیں کر سکتا، یہ تھی کہ اس نے آزادی و سیاست دونوں کو ایک جیسے چیز سمجھا حالانکہ آزادی حاصل کرنے سے پہلے یہ سوچنے کی ضرورت تھی کہ اس آزادی کو قائم رکھنے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔ حکومت نام نہ صرف آئین سازی کا ہے نہ ارکان پارلیمنٹ کا، بلکہ ان افراد و عمال کا جو حکومت کے قانون اور حکومت کی پالیسی کو چلاتے ہیں اور ایسے افراد دفعتاً پیدا نہیں ہوتے بلکہ سالہا سال کے تجربہ کے بعد آہستہ آہستہ اس منزل تک پہنچتے ہیں۔ کسی ملک کا انتظام یا ایڈمنسٹریشن بچوں کا کھیل نہیں، یہ ایک مستقل فن ہے اور اس کے لئے خاص تربیت یافتہ دماغوں اور معیاری اخلاق رکھنے والے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن حصول آزادی کے بعد ہماری حکومت نے ہر قسمی سے اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا اور اس نے سمجھ لیا کہ ہر وہ شخص جو جیل جاسکتا ہے وہ ملک کا انتظام بھی کر سکتا ہے۔ برطانوی قوم جیسی کچھ بھی ہو، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ انتظام اور ایڈمنسٹریشن اس کا حصہ تھا جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مٹھی بھر انگریزوں کی مدد سے اس نے ہندوستان ایسے بڑے ملک کے نظم و نسق کو اس نہج سے چلایا کہ جب تک اس نے چاہا ملک آزاد نہیں ہو سکا اور اب کہ وہ نہیں ہے ہم حکومت کی ایک ایک چل ڈھیلی نظر آ رہی ہے۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ حصول آزادی کے بعد انگریز افسروں کو یہاں سے نہ جانے دیا جاتا، گوہر سے لیکر کلکٹر تک بالکل نظم و نسق کا وہی ڈھانچہ باقی رکھا جاتا جو پہلے چلایا جاتا تھا اور جب ان سے آٹھ دس سال میں ایڈمنسٹریشن سیکھ لیا جاتا تو آہستہ آہستہ یہاں سے جانے دیا جاتا، لیکن حکومت نے نہ صرف یہ کیا کہ انگریز افسروں کو فوراً رخصت کر دیا حالانکہ انگریزی حکومت انھیں کوئی دہائی (تقریباً) بلکہ سلاطین کو بھی گلیہ میا صاحب سے مشاڈا (حالانکہ انگریز کے بعد سب سے زیادہ مسٹر ٹروٹی تھے) اور اس طرح اس سے ملتا جلتا کو بھی ختم کر دیا جو حکومت کو خود داسی کے دوستوں سے بچانے کے لئے از بس ضروری تھا۔

انسان و انسان اعلیٰ

(برنارڈ شا کے ڈرامہ کا ایک حصہ)

(سلسلہ ماضی)

مجسمہ — تم یہ سب کچھ سوچے ہوئے بغیر ہی اتنی خوبی کے ساتھ اس منزل پر پہنچ سکتے تھے فرزان — تم بھی دنیا کے دوسرے عقلمند انسانوں کی طرح جو — تمہیں ضرورت سے زیادہ دماغ مل گیا ہے

ابلیس — اور کیا اس تجربے نے تمہیں پہلے سے زیادہ مسرور نہیں بنادیا فرزان صاحب؟

فرزان — مسرور؟ — نہیں — البتہ زیادہ عقلمند! — یہ وہ سب سے پہلا لمحہ تھا جس نے مجھے خود مجھے اور میرے ذریعہ دنیا سے متعارف کرایا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ناقابل مزاحمت دے بناہ "قوت حیات" پر شرائط و قیود عاید کرنے کی کوشش کس قدر بے مہر ہے یعنی ہوشمندی و مصلحت کو کسی — محتاط انتخاب — نیکی — عزت — پاکیزگی و عصمت وغیرہ کی تعلیم دینا کس قدر....

سارہ — فرزان! — پاکیزگی و عصمت کے خلاف لب کشائی میری امانت ہے

فرزان — میں تمہاری پاکیزگی و عصمت کے خلاف کچھ نہیں کہتا محترمہ — کیونکہ اس نے ایک شوہر اور ایک درجن بچوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اگر تم ایک انتہائی گمراہ دے یا روبرو دگار عورت ہو تو بھی اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی تھیں؟

سارہ — میں یہ کر سکتی تھی فرزان کہ میرے ایک درجن شوہر ہوتے اور بچہ کوئی بھی نہ ہوتا — یہ تعداد جو میں کر سکتی تھی! — اور

یاد رکھئے میری صورت ایک ہی حرکت اُس دنیا میں جس کی آبادی میں میری وجہ سے اضافہ ہوا زمین و آسمان کا فرق پر کیا کر سکتی تھی

مجسمہ — شاہ اش سارہ! — اب تم فرزان بالکل چاروں شانے چت ہو گئے

فرزان — بالکل نہیں — کیونکہ اگرچہ یہ فرق حقیقی و بنیادی فرق ہے (مجھے تسلیم ہے کہ محترمہ سارہ بالکل سیدھی اصلی مسئلہ پر پہنچ گئی ہیں)

لیکن یہ فرق درحقیقت محبت و پاکیزگی و عصمت یا وفا شعار کی کافرق نہیں ہے، کیونکہ ایک درجن مختلف شوہروں سے پیدا ہونے

والے ایک درجن بچے کرۂ ارض کی آبادی میں اس سے کہیں زیادہ ہتہ اضافہ کر سکتے تھے۔ فرض کیجئے کہ میرا دوست اور تمہارا شوہر فلوری

تمہاری تیس سال کی عمر سے پیشتر مر جاتا۔ اس وقت تم کبھی ایک بیوہ بن کر نہ رہ سکتیں کیونکہ تم بہت خوبصورت تھیں۔ فرض کیجئے کہ

فرزانی کا جانشین تمہاری چالیس سال کی عمر سے پیشتر مر جاتا

اس وقت بھی تم حسن و کشش کے لحاظ سے بے پناہ ہو تھیں اور یہ حقیقت ہے کہ

جو عورت دوسری مرتبہ شادی کرتی ہے وہ بشرط آزادی تیسری مرتبہ بھی شادی ضرور کرتی ہے۔ ایک اعلیٰ و معزز خاتون سے ایک

درجن جائزہ بچوں کا تین مختلف شوہروں سے پیدا ہونا ناممکن نہیں اور نہ اسے عامہ اسے معیوب قرار دیتی ہے۔ یہ بالکل اور بے شبہ

صیغہ ہے کہ ایسی معزز خاتون اُس غریب لڑکی سے کہیں زیادہ قانون و روایت کی فرماں بردار ہو سکتی ہے۔ جس کو ہم صورت ایک خاص

ناجائزہ پہنچا کر پیداکرنے کے جرم میں اپنی بیرحم ٹھوکروں سے سلاج کی غلاطی میں ڈھکیں دیتے ہیں۔ لیکن کیا تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتی

ہو کہ وہ معزز خاتون اس گنہگار لڑکی سے کچھ کم خواہش پرست اور نفیس پرورد ہے؟

گوارا بنانے کی کوشش کرنا ہوگی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی رفاقت متحد و موافقوں پر بہت زیادہ محبت انگیز صورت اختیار کر لیتی ہے اور اکثر و بیشتر کم از کم ایک ملکی دوستی کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ چیز قیدی کی زنجیروں کو قابلِ تمنا اور قید خانے کو ایک مسرت کردہ نہیں بنا سکتی۔ جو لوگ شادی کی برکات اور اس کے پیمان و فاداری کی بابت قصیدہ خوانی کرتے نظر آتے ہیں وہی لوگ دوسری طرف یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ اگر یہ زنجیر توڑ دی جائے اور قیدیوں کو انتخاب کی آزادی مل جائے تو سماج کے تمام کار و پود کھر جائیں گے۔ لیکن ایک استدلال کو ہر دو جانب سے اپنی ہی موافقت میں موڑا نہیں جاسکتا۔ اگر قیدی مسرور ہے تو زنجیروں میں جکڑا کیوں جائے؟ — اگر مسرور نہیں ہے تو یہ ظاہر کیوں کر ہے کہ مسرور ہے؟

سارہ — واقعہ کچھ ہی کیوں نہ ہو میں ایک مرتبہ پھر اپنی سن رسیدگی سے فائدہ اٹھا کر تمہیں صاف صاف بتا دینا چاہتی ہوں کہ شادی دنیا کو آباد کرتی ہے اور نفس پروردی و عیاشی ایسا نہیں کرتی

فرزان — لیکن اگر کوئی زمانہ ایسا آگیا کہ تمہارا یہ نظریہ صحیح نہ رہا تب؟ — کیا تم کو علم نہیں کہ ارادہ خالق ہے تدبیر کا مرد آج جو کچھ حقیقت کو رچا چاہتا ہے اس کے لئے وہ کوئی طریقہ آخر کار دریافت کر لے گا۔ جہاں تک تم نیکو کار خود تین اور تمہاری بھینالی دیگر بہتوں کا تعلق ہے یقیناً تم سب نے اپنی بہترین کوششیں اس بات پر صرف کر دی ہیں کہ مرد کے دماغ کو کبھی طور پر اس چیز کی طرف مایل کر دینا اور باعثِ محبت ہی سب سے بڑی نیکی ہے اور اس شریفانہ و باعثِ محبت کا مفہوم صرف یہ سمجھا جائے کہ مرد حسین و شایستہ اور نازک و محبت کش عورتوں ہی کے تصرف میں دنیا کا تمام رومان - حسن اور سامان مسرت تلاش کرے۔ تم نے دوسری طرف عورتوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اپنے شباب - صحت - اعضا کو مناسب شکل و صورت اور نفاست کو باقی تمام امور پر ترجیح دیں۔ لیکن ذرا یہ بتلاؤ کہ جو اس و جذبات کی اس خوبصورت جنت میں روتے ہوئے بچوں اور خانداری کی اُلجھنوں کا مقام کوٹا ہے؟ — کیا اس تمام تضاد کا بالکل ناگزیر اختتام و نتیجہ یہ نہیں ہے کہ انسانی ارادہ و خواہش انسانی دماغ سے بالآخر یہ استدعا کرے کہ — ”میرے واسطے کوئی ایسا ذریعہ تخلیق کر دے جس کی مدد سے مجھے محبت - حسن و جمال - رومان - اور احساسات و جذبات تو ضرور نصیب ہو جائیں لیکن ان کے تمام فوری ملذات یعنی سزائیں - اخراجات - پریشائیاں - اہتمامات - امراض - موت کی تکلیفیں اور خطرات - طاعین - زہر اور ڈاکٹر وں اور دھرموں کے استادوں وغیرہ کے ہمبیلوں سے نجات مل جائے۔“

ابلیس — انسان کی یہ خواہش یہاں میری سلطنت میں پوری طرح تسکین پاتی ہے فرزان!

فرزان — ہاں - گہر موت کی قیمت کے بدلے! — مرد اس چیز کو اس قیمت پر لینا نہیں چاہتا۔ اس کی خواہش تو یہ ہے کہ تمہارے جہنم کی روانوی مسرتوں سے اُس وقت کسبِ کھٹ کرے جبکہ وہ کرفہ ارض پر موجود ہے۔ بہر حال اس کے ذرائع دریافت کر لے جائیں گے۔ اگر مادہ صادق ہے تو دماغ جواب نہیں دے گا۔ وہ دن قریب ہے جبکہ ہر مردم شماری پر دنیا کی بڑی بڑی اقوام اپنی تعداد کو کم ہوتا ہوا دیکھیں گی۔ مختصر و بہانہ ملکان اپنی قیمت میں ایک عالی شان خاندانی عمارت سے بڑھ جائے گا۔ انسانی نسل کی فنائیں تھوڑی سی تاخیر و تعویذ پیدا کرنے کے لئے بڑا کارآمد حد تک لاپرواہ مفلس لوگ اور احمقانہ حد تک نیکو کار و دہمنہ انسان انسانی نسل کو پستی میں ڈھکیلنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن وہ تمام لوگ جو جبری و عاقبت انگیز - کفایت شعارانہ قسم کے خود غرض و عالمِ عملہ تشکیل پرست و شاعرانہ فطرت - دولت و راحت مادی کے پرستار اور کامیابی و فتوح و محبت کے پیجاری بھلاتے ہیں سب کے سب ضبط و تحریک تو لید کی تدبیروں سے ”قوتِ حیات“ کی مخالفت کر رہے ہیں

مجسمہ — تمہارے یہ سب الفاظ بہت سلیس و خوبصورت ہیں میرے نوجوان دوست — لیکن اگر تم دنیا میں اتنے غور و فکر نہ کرے جتنی مدت کہ سادہ کہ یا مجھے نصیب ہوئی ہے تو تمہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی کہ جو لوگ افلاس - اولاد - اور دیگر تمام خاندانی پریشانیوں سے آزاد ہو جاتے ہیں اور زندگی سے خطا اندوزی کے لئے اپنے اوقات و وقت کر دیتے ہیں وہ اپنے دماغوں کو دراصل کھوت - برصورتی

ضعف و نامردی اور موت کے خون کے لئے آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک بے اولاد مرد و زور اپنی بیوی کی کاہلی اور دلچسپی و تفریح کے منتقل مطالبات سے جس قدر اذیت و عقوبت پاتا ہے اتنی اسے بیس بچے بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اور پھر اُس کی بیوی کی حالت خود اُس سے بھی زیادہ اذیت انگیز ہوتی ہے۔ فطری پنہار اور حسین پسندی کا انسانی حصہ مجھے بھی ملا ہے۔ جب میں نوجوان تھا تو عورتیں میری طرف کھینچتی تھیں اور اب جبکہ میں ایک مجسمہ ہوں تو فن کارانہ قدیم میری تعریف کرتے ہیں۔ لیکن مجھے اعتراض ہے کہ اگر مجھے ان مسرتوں کی کچھ نہیں دیتے تو عہدہ دنیا میں اور کوئی کام کرنے کو نہ ملتا تو میں خود کو ذبح کر ڈالتا۔ جب میں نے سارہ کی ماں سے شادی کی یا غالباً زیادہ صحیح طور پر یوں کہنے کو جب میں نے کوشش مزاحمت ترک کر دی اور سارہ کی ماں کو یہ موقع دیدیا کہ وہ مجھے شادی کرے تو میں یہ سمجھتا تھا کہ میں اپنے بستر پر کانتے پچھا رہا ہوں اور یہ شادی مجھ جیسے نوجوان اور ہنوز غیر مفتوح افسر کے لئے شکست و گرفتاری کی حیثیت رکھتی ہے۔

سارہ — (ناگواری و برہمی سے) آہا!

مجسمہ — میری عزت بچی مجھے انہوں سے کہ میں نے تمہیں صدمہ پہنچایا۔ لیکن چونکہ فرزان نے اس بحث و گفتگو سے تکلف و نفاست کے تمام محاب ہٹا دیے ہیں اس لئے میں نے بھی بالکل ٹھوس حقیقت کو بیان کرنا مناسب سمجھا

سارہ — اُن! — تو غالباً ان کانٹوں میں ایک میں بھی تھی

مجسمہ — ہرگز نہیں۔ تم اکثر میرے لئے ایک گلاب ثابت ہوئیں۔ تم جانتی ہو کہ تمہاری پریشانیوں کا زیادہ حصہ تو تمہاری ماں نے برداشت کیا۔ فرزان — تو کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ تان صاحب کب جب یہ بات ہے تو تم فردوس کو چھوڑ کر یہاں ان مسرتوں کی کچھ نہیں دیتے تھے کیوں کہ بوجہ بقول تمہارے ایک مرتبہ تمہیں خود کشی پر آمادہ کر چکی ہیں؟

مجسمہ — (متاثر ہو کر) یقیناً۔ یہ بالکل صحیح ہے

المیس — (خون زدہ ہو کر) کیا! — دیکھو تم اپنے وعدے کو فراموش کر رہے ہو! — (فرزان سے) اور تمہاری یہ تمام فلسفہ طوائف و حقیقت خیز اپنے ذہب کی تہینے کا ایک پردہ تھی! — (مجسمہ سے) کیا تم اتنی جلد اُس ہیبت ناک کوفت و دبکی کو مہول گئے جس سے میں تمہیں پہل پہنہ دے رہا ہوں؟ (فرزان سے) اور تم نے اب تک جو کچھ انسان کی ضبط و قطع نسل اور فحشاء نسل کے بارے میں جو دلائل پیش کئے ہیں کیا اُن سب کا اس سے بہتر کوئی اور نتیجہ نکلتا ہے کہ فن اور محبت کی اُن مسرتوں سے پوری طرح کیف حاصل کیا جائے جن کی مدد سے بقول تمہارے خود تمہارے حواس کو شایستگی۔ بلندی اور ارتقا نصیب ہوا ہے؟

فرزان — میں نے انسانی نسل کی فنا کے متعلق کوئی ثبوت و دلیل پیش نہیں کی۔ زندگی خواہ اندھے کیڑے کوڑوں کی شکل اختیار کرے یا کوئی اور شکل جس میں وہ خود کو اب تک نظم کر سکی ہے لیکن یقیناً زندگی کسی حالت میں بھی خود اپنی فنا کا ارادہ و خواہش نہیں کر سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی گفتگو کو پوری طرح ختم نہیں کرنے پایا تھا کہ حضور نے میرا قطع کلام کر دیا۔

مجسمہ — مجھے تو ڈر یہ ہے دوست کہ شاید تم کبھی بھی یہ گفتگو ختم نہ کر سکو گے۔ تم خود اپنی گفتگو سننے کے بہت زیادہ شائق ہو

فرزان — صحیح — لیکن اب کہ تم اس قدر برداشت کر چکے ہو اگر اختتام تک تحمل کرو تو اچھا ہے۔ اس سے بہت بیشتر کسل کو بند کر دینے کا یہ جذبہ

ایک صاف واضح امکان مستقبل کی شکل اختیار کرے اس کا رد عمل شروع ہو جائے گا۔ نسل پیدا کرنے کا زبردست مرکزی مقصد کہ تولید نسل کے تجربات کو ارتقا و ترقی دیتے دیتے آخر کار ایک ا فوق الانسانی ہستی پیدا کی جائے۔ ہاں یہ مقصد جو آج تک محبت۔ زمان۔ باطل شرم و حیا اور جمہولی نفاست و شایستگی کے سموم بدلوں کے پیچھے پوشیدہ ہے اس پردہ کو چاک کر کے سورج کی پوری روشنی میں نمودار ہو جائے گا اور اس کے بعد اس اہم مقصد کو ذاتی خواہشات کی تسکین۔ نوجوان لڑکوں لڑکیوں کے خواب مسرت کے نامکون الحاصل یا محروگوں کی تجارتی شادی و رفاقت کی ضرورت کے ساتھ غلط فہم نہیں کیا جائے گا۔ معاہدہ میں شمول و عقد کے

یہی فقرات میں صاف و صریح الفاظ کو ناشایست سمجھ کر ٹھہرا بخود نہیں کیا جائے گا۔ ایک عجیدہ نفاست۔ خندہ ارادہ و عزم اور شادی کے حقیقی مقصد کے ذمہ دارانہ اعلان کو احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا اور قبول کیا جائے گا اور تمام رومانوی ہمدردیمان اور "رفاقت نامہ" قسم کے تمام خوبصورت وعدوں کو قطعی ناقابل برداشت ہملات قرار دیکر شادی کی رسوم سے خارج کر دیا جائے گا میری جنس کے افراد کو انصاف کی نظر سے دیکھو سارہ اور یہ تسلیم کر دو کہ مرد نے ہمیشہ ہی اعتراض کیا ہے کہ جنسی تعلق ایک ذاتی یا دوستانہ تعلق بالکل نہیں ہے

سارہ — ذاتی یا دوستانہ تعلق نہیں! — تو پھر اور کونسا تعلق اس سے زیادہ ذاتی؟ اس سے زیادہ پاکیزہ اور اس سے زیادہ مقدس ہو سکتا ہو؟
فرزان — اگر تم چاہو تو سارہ اس تعلق کو تم پاکیزہ و مقدس کہہ سکتی ہو لیکن ذاتی طور پر یا دوستانہ تعلق ہرگز نہیں۔ خدا سے تمہارا تعلق پاکیزہ و مقدس ہے۔ کیا تم اس تعلق کو ذاتی دوستانہ کہنے کی جرأت کر سکتی ہو؟ جنسی تعلق میں جانیہیں بالکل مجبور آؤ گے کہ اس کا ذاتی تخلیقی قوت کے جو تمام ذاتی لمحوں پر حاوی ہو جاتی ہے اور تمام ذاتی تعلقات کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ جنسی تعلق میں تمہارے ہونے والا انسانی جوڑا ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہو۔ مختلف مادری زبانیں بولتا ہو۔ نسل و رنگ میں مختلف ہو۔ عمر و مزاج میں مختلف ہو۔ اور ان کے درمیان کوئی رشتہ بھی موجود نہ ہو سوائے اس مقصد تو یہ کہ جس کی خاطر "قوت حیات" نے اُن کو صرف ایک تبادلہ نگاہ کے بعد ایک دوسرے کی آغوش میں گرا دیا ہے۔ کیا یہ اسی چیز کو تسلیم کرنے کا ثبوت نہیں ہے کہ ہم والدین کو یہ اجازت دیتے ہیں کہ وہ عورت سے مشورہ حاصل کے بغیر ہی شادی کر دیں؟ — کیا تم نے خود اکثر انگریز قوم کی اس بدکاری و بداندیشی پر نفرت کا اظہار نہیں کیا کہ اس قوم کے شریف مرد عورتیں ایک دوسرے سے متعارف ہو کر بالکل دیہاتی لوگوں کی طرح عشق و محبت کا کھیل کھیلتے ہیں؟ — لیکن ایک دیہاتی جوڑا اہم منسوب ہونے سے پیشتر ایک دوسرے کے متعلق کتنی واقفیت رکھتا ہے؟ — میرا خیال ہے کہ تم جس قدر حقیر واقفیت پر ایک مرد سے محبت و شادی کر سکتی ہو اتنی واقفیت پر تم اُسے اپنا قانونی وکیل یا طبی مشیر بھی بنانا پسند نہ کرو گے!
سارہ — ٹھیک ہے فرزان۔ ہم عیاض مرد کے فلسفہ سے پوری طرح واقف ہیں۔ عورت کے لئے اس کی روش کے کیا نتائج ہوں گے اس کو مرد ہمیشہ نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور تم بھی

فرزان — نتائج! — ہاں بیشک نتائج کے مد نظر مرد پر عورت کی خوفناک و زبردست گرفت کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یقیناً تم اس وابستگی و تعلق کو قلبی و جذباتی نہیں کہہ سکتیں۔ ورنہ ایک برس کے سپاہی کا جو تعلق اس کے قیدی سے ہوتا ہے اُسے بھی جذباتی کہا جائے گا۔
سارہ — اگرچہ تمہاری نظر میں محبت تمام انسانی تعلقات میں سب سے زیادہ معمولی و خفیف تعلق کا نام ہے لیکن حقیقتاً تمہیں اس امر کا احقران کرنا پڑا ہے کہ شادی ایک ضروری چیز ہے

فرزان — تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمام انسانی تعلقات میں یہ سب سے بڑا تعلق ہیں؟ — اتنا اہم و عظیم تعلق کہ اس میں ذاتی جملات کوئی جگہ نہیں پاسکتے۔ اگر تمہارے والد اپنے وطن کے کسی دشمن کو صرف اس لئے ہلاک کر کے اُنہیں ذاتی طور پر اُس سے کوئی نفرت نہیں ہے، تو کیا وہ اپنے وطن کی خدمت کر سکتے تھے؟ اگر کوئی عورت کسی مرد سے صرف اس لئے شادی کرتے سے انکار کر دے کہ اُسے ذاتی طور پر اس مرد سے کوئی محبت نہیں تو کیا وہ اپنے وطن کی خدمت کر سکتی ہے؟ — یقیناً نہیں۔ ایک شریف و معزز عورت کا شادی کرنا اور ایک شریف و معزز مرد کا جنگ کے لئے تلوار اٹھانا یہ دونوں کام ایسے ہیں جو ذاتی مقاصد کے تحت نہیں کئے جاتے بلکہ سیاسی و خانہ دانی اغراض کے تحت ہوتے ہیں

مجتمہ — (متاثر ہو کر) بڑی پر مغز دلیل ہے یہ فرزان۔ مجھے اس نکتہ پر غور کرنا چاہئے۔ درحقیقت تمہارا دلخ بدیع خیالات و اہم نظریات سے لبریز ہے۔ تمہارے ذہن میں یہ نکتہ کس طرح آیا؟

فرزان — میں نے اسے تجربہ سے سیکھا ہے۔ جب میں کوہ ارض پر تھا اور عورتوں کے سامنے اپنے وہ خیالات و جذبات پیش کرتا تھا تو وہ غامض طور پر

میسوب قرار دئے جانے کے باوجود اس قدر عجیب تھے کہ ان کی وجہ سے میں ایک نہایت دلچسپ افسانوی ہیرو میں تبدیل ہو گیا تھا تو اس وقت اکثر مشیر میرے ساتھ جو رہتاؤ کیا جاتا تھا وہ یہ ہے۔ عورت کہتی تھی کہ وہ میرے اقدامات کا عمل کر سکتی ہے بشرطیکہ یہ اقدامات شریفانہ و باعزت ہوں۔ اس "شریفانہ و باعزت اقدامات" کی شرط کا مفہوم تحقیق کرنے پر مجھے جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ میں اس عورت کی لکھت میں بشرط موجودگی حشہ دار بنوں اور اگر اُس کے اعتراضات کا کوئی ذریعہ نہیں تو اس کا کفیل ہونا برداشت کروں۔ علاوہ ازیں اُس کی مستقل محبت۔ صلاح و مشورہ اور باہمی گفتگو کو اپنی زندگی کے آخری دن تک ایک قابلِ تمنا شے سمجھتا رہوں اور یہ زبردست قسم کھاؤں کہ میں ہمیشہ ان چیزوں سے مسحور رہوں گا۔ اور سب سے زیادہ اہم یہ عہد کروں کہ میں اس عورت کی خاطر دنیا کی باقی تمام عورتوں کو پس پشت ڈال دوں گا۔ ان شرائط پر اگر مجھے اعتراض تھا تو اس نے نہیں کہ یہ شرطیں حد سے زیادہ سخت اور غیر انسانی و بیرحانہ تھیں بلکہ اس لئے کہ ان شرائط کا تعلق موجودہ مقصد سے ذرا سا بھی نہ تھا۔ میں نے ہمیشہ ہر ایک عورت کو پوری بیباکی کے ساتھ یہی جواب دیا کہ مجھے تو ان چیزوں کا کبھی خواب و خیال بھی نہیں تھا۔ نیز یہ کہ اگر اس خاتون کا کردار اور عقل و ذہانت میرے برابر یا مجھ سے برتر ہیں تو اس کی گفت و شنید ضرور مجھے بہت اور صلاح و مشورہ مجھے گراہ کر دے گا۔ علاوہ ازیں یہ کہ بالکل ممکن ہے کہ اس کی مستقل محبت میرے لئے ناقابلِ برداشت حد تک ایک بار بن جائے۔ میں کہتا تھا کہ جب میں اپنے جذبات کے تغیر کی بابت ایک ہفتہ بیشتر کوئی یقین نہیں دلا سکتا تو زندگی کے اہتمام تک کی ضمانت کیسے کر سکتا ہوں۔ رہا دنیا کی دوسری عورتوں کے متعلق تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنی دنیا کی نصف آبادی سے تمام فطری و بے تعلقات کو قطع کر دوں۔ یہ چیز اگر میں نے اختیار کی تو اس سے میری ذہنیت تنگ و محدود ہو کر راہِ راست سے دور ہٹ جائے گی یا پھر مجھے خفیہ و پوشیدہ عشق بازی کے عذاب میں گرفتار کر دے گی۔ اتنا کہنے کے بعد میں عورت سے آخر میں یہ صاف صاف طور پر کہہ دیتا تھا کہ میری محبت اور اظہارِ آرزو کو ان تمام معاملات سے ذرا سا بھی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ تو اُس خالص سادہ جذبہ کا اظہار ہیں جو کہ فطری طور پر ایک مرد کی جنسی سرفخت ایک عورت کی جنسی سرفخت کی طرف محسوس کرتی ہے۔

سارہ — تمہارا مقصد یہ ہے کہ یہ ایک غیر اخلاقی جذبہ ہے؟

فرزان — محترمہ ! خود فطرت بھی وہی کچھ ہے جسے تم لفظ "غیر اخلاقی" سے تعبیر کرتی ہو۔ مجھے یہ کہتے شرم آتی ہے لیکن میں بالکل معذور ہوں فطرت ایک دلاڑ ہے۔ وقت غار نگہ ہے اور موت ایک قاتل۔ میں نے ہمیشہ ان حقایق کی متابعت کی کہ کوشش کی ہے اور ان کے احساس و اعتراف کے تحت رسوم اور ادارے تخلیق کرنے چاہئے۔ لیکن تم نے ہمیشہ ان تینوں شیطانوں کے مطالبات کو تسکین دینے کو ترجیح دی اور ان کی عصمت و پاکیزگی۔ ان کا ہوشمندی اور ان کی محبت انگیز فطرت کا اعلان کیا۔ اور ان جھوٹی خوشامدیں باتوں پر اپنی رسوم و روایات کی بنیاد ڈالی۔ پھر اگر اب یہ رسوم و روایات مطمئن کن طور پر کار فرما نظر نہیں آتیں تو اس میں کوئی عجب کی بات ہے؟

محترمہ — عورتیں کیا کہا کرتی تھیں فرزان؟

فرزان — دیکھو بھئی رازداری دونوں طرف سے برابر ہونا چاہئے۔ پہلے تم یہ بتلاؤ کہ تم عورتوں سے کیا کہتے تھے؟

محترمہ — میں ! میں تو قسم کھا کر یہ کہتا تھا کہ جب تک جسم میں روح ہے و فداوارہ ہوں گا اور اگر میری محبت کو قبول نہ کیا گیا تو میں مرجاؤں گا نیز یہ کہ میری نظر میں دنیا کی کوئی عورت وہ حیثیت حاصل نہ کر سکے گی جتنی کہ اُسے حاصل ہے۔۔۔۔۔

سارہ — اُسے؟ کس کو؟

محترمہ — اُس عورت کو جو اس وقت میری مخاطب ہوتی تھی خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ میری پاس چند خاص جملے تھے جو میں ہمیشہ ادا کرتا تھا۔

ان میں سے ایک یہ تھا کہ اُس وقت بھی جبکہ میرا سن دس سال انٹی برس کا ہو گا میری محبوبہ کے سر کا ایک سفید بال میرے جسم میں اس سے

کبیں زیادہ شرم کی لپی پیدا کرے گا جتنی کہ کسی انتہائی حسین و زبوران عورت کی خوبصورتی و لطفیں کر سکتی ہیں۔ دوسرا جلد یہ تھا کہ میں اس خیال کو برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اور عورت میرے بچوں کی ماں بنے

فرزان — (نفرت سے) یہ پرکاری و منافقت !

مجسمہ — (مضبوطی سے) ہرگز نہیں۔ کیونکہ میں اس وقت ان تمام خیالات پر اپنی روح کے پورے غلوص کے ساتھ یقین رکھتا تھا۔ تمہارا برعکس میں اپنے پہلو میں ایک دل رکھتا تھا۔ اور میرا یہی غلوص تھا جس نے مجھے کامیاب بنایا

فرزان — غلوص ! — ایک صاف و صریح اور طوفانی مہر و عشق جو تیرے دل کو باور کر لینے کی حد تک احمق بن جانا۔ یہ ہے وہ چیز جسے تم غلوص کہتے ہو ! — ایک عورت کے لئے اپنی حرص و جوس سے اس حد تک مغلوب ہو جانا کہ تم اسے فریب دینے کے شوق میں خود بھی

فریب کا شکار ہو جاؤ۔ تم کہتے ہو یہ غلوص ہے !

مجسمہ — لعنت تمہاری اس کج بکھی پر ! — میں تو ایک عاشق تھا۔ وکیل نہیں۔ اور عورتیں اسی لئے مجھ سے محبت کرتی تھیں۔

خدا ان کو اس کا اجر دے !

فرزان — یہ خیال بھی تمہارے ذہن میں عورتوں ہی نے پیدا کیا۔ تم کیا کہو گے اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ اگرچہ میں عورتوں کے معاملات میں ایک انتہائی

بے حس وکیل ثابت ہو رہا تھا لیکن خود عورتوں نے ہی مجھے خود کو ایسا خیال کرنے پر مائل کیا ؟۔ مجھے بھی جذباتی مغلوبیت و حماقت کے

ایسے لمحات اپنی زندگی میں نصیب ہوئے ہیں جبکہ میں لغو و بھل الفاظ کے دریا بہاتا تھا اور ان پر یقین کرتا تھا۔ بعض مرتبہ خواہشات

الفاظ کے ذریعہ عورتوں کو مسرور کرنے کی خواہش میرے دل میں اس قدر قوت کے ساتھ جذباتی سیلاب کو ابھارتی تھی کہ میں قطعی

بے خوف اور لاپرواہ ہو کر انہیں اپنی زبان سے ادا کر جاتا تھا۔ اس کے برخلاف بعض اوقات میں خود اپنے جذبات و یقین کی مخالفت

ایک ایسی شیطانی بے حس کے ساتھ کرتا تھا جو دوسروں کی آنکھوں میں آنسو کھینچ لاتی تھی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ جرم بہانہ عورتوں

سے فرار ہونا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ مہربان بن کر۔ جب عورت کی جبلت مجھے شکار کے لئے جن لیتی تھی تو اس کے بعد شرم بھر کی

غلامی یا پھر فرار کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ ہوتا تھا

سارہ — تم خود میرے اور میرے باپ کے سامنے یہ باطل دعویٰ کرنے کی جرأت کرتے ہو کہ تم ہر ایک عورت کے لئے بے پناہ کشش رکھتے تھے۔

فرزان — کیا میں باطل دعویٰ یا خود ستائی کر رہا ہوں ؟ — میرا خیال تو یہ ہے کہ میری شکل و صورت انتہائی قابلِ رحم حد تک حسن و دلکشی

سے محروم ہے۔ علاوہ انہیں میرے الفاظ یہ ہیں کہ۔ ”جب عورت کی جبلت مجھے اپنے شکار کے لئے جن لیتی تھی“ لیکن ہمیشہ

ایسا نہ ہوتا تھا۔ اور اگر کبھی ایسا ہوتا تھا تو خدا کی پناہ۔ مذہب و چہرہ کو مجھے کتنے شدید پاکیزانہ قہر و غضب کا بہت بنایا جاتا تھا !

اور مجھے ایک بدسرشت اغوا کار قرار دیکر کتنی زبردست مخالفت و عتاب کی بارش مجھ پر ہوتی تھی

سارہ — لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے تو صرف اپنے باپ کو آواز دی تھی

فرزان — ہاں۔ لیکن جب وہ کیا تو بیغ بکنت اور اس بات پر آمادہ کہ مجروح عزت و اخلاق کا انتقام لینے کے لئے مجھے قتل کر ڈالے

مجسمہ — قتل ! — یہ تم کیا کہتے ہو ؟ — میں نے تمہیں ہلاک کیا یا تم نے مجھ ؟

فرزان — ہم دونوں میں کون بہتر و مشاق تیغ زن تھا ؟

مجسمہ — میں تھا

فرزان — یقیناً تم تھے۔ لیکن اُن ہزاروں بدکارانہ انسانہائے محبت کے پیرو ہونے کے باوجود تم ابھی بیان کر رہے تھے تمہیں چنانچہ

جرأت ہو گئی کہ ایک مجروح عزت و اخلاق کا انتقام لینے والے انسان کی حیثیت سے خود کو دنیا کے سامنے پیش کرو اور میرے لئے موت

کا فتویٰ صادر کر دو۔ صرف ایک اتفاقی امر نے میری جان بچا دی ورنہ تم نے مجھے قتل کر دیا ہوتا

محبتہ دنیا کی نظر میں مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ فرزان — کہہ ارض پر یہ معاملات اسی طرح طے ہوتے ہیں۔ میں کوئی سماجی مصلح نہیں تھا۔ میں تو ہمیشہ وہی کرنا تھا جس کی توقع سماج میں ایک شریف انسان سے کی جاتی ہے

فرزان — یہ چیز مجھ پر تمہارے حملہ کو جائز بنا سکتی ہے لیکن تم نے بعدہ ایک محبتہ کی حیثیت سے جو نفرت انگیز منافقت اختیار کی اس کا جواز نہیں بن سکتی۔

محبتہ — یہ سب کچھ میرے جنت میں جانے کی وجہ سے ہوا

ابلیس — یہ بات میں اب تک سمجھنے سے قاصر ہوں فرزان کہ تمہاری اور کپتان صاحب کی ارضی زندگی کے یہ تمام واقعات اُس فطرۃ زندگی کی تحقیر و تردید کیسے کرتے ہیں جو کہ میں رکھتا ہوں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہاں جہنم میں تھیں وہ سب کچھ نصیب ہے جس کی تمہیں تلاش تھی

اور وہ تمام چیزیں یہاں معدوم ہیں جن سے تم احتراز کرتے تھے

فرزان — اس کا برعکس میرا خیال ہے کہ یہاں مجھے ہر وہ شے نصیب ہے جو دنیا میں یا اس کن ثابت ہوئی اور اس میں وہ تمام اجزاء موجود ہیں

جن کو میں پیشتر ہی آزمائش و تجربہ کر کے ناکافی و نامکمل پا چکا ہوں۔ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ جب تک مجھے کسی ایسے وجود کے

تصور کی اہمیت نصیب ہے جو خود مجھے بہتر و اعلیٰ ہو اُس وقت تک مجھے اگر واقعی سکون و راحت مل سکتی ہے تو صرف اس چیز میں کہ

میں اس تخلیقی وجود کو زندگی عطا کرنے کی کوشش کرتا رہوں یا اس کے واسطے راستہ صاف کرتا رہوں۔ یہی میری زندگی کا قانون ہے۔

یہی میرے اندر زندگی کی وہ مسلسل جدوجہد ہے جو وہ ایک بلند تر نظام۔ ایک وسیع تر عمیق تر اور شدید تر شعور کنسی اور ایک واضح تر

ادراکِ ندوی کے حصول کے لئے ہمیشہ سے کرتی آئی ہے۔ یہ اسی مقصد کی بندی و فوقیت تھی جس نے میرے نزدیک محبت کو محض

ایک لمبی نشاط۔ فنی لطیفہ کو محض تربیت صلاحیت کے ذرائع اور مذہب کو محض ایک عذر تساہل و تعطل میں تبدیل کر دیا کیونکہ مذہب

ایک ایسے خدا کا تصور مجھے عطا کیا جو دنیا کو دیکھتا تھا اور سمجھتا تھا کہ دنیا اچھی ہے حالانکہ میری جبلت میری آنکھوں کے ذریعہ اسی

دنیا کو دیکھتی تھی اور محسوس کرتی تھی کہ دنیا میں اصلاح کی گنجائش باقی ہے۔ میں تم سے بچ کہتا ہوں کہ خود اپنی ذاتی سرت۔ ذاتی

صحت اور ذاتی دولت کے حصول کی جدوجہد میں مجھے کبھی خوشی نصیب نہیں ہوئی۔ مجھے جس شے نے "عورت" کے حوالہ کر دیا وہ عورت

کی محبت نہ تھی بلکہ وہ خود میری خستگی و پشیمانی تھی۔ عالم طفولیت میں اگر میں کسی بچہ سے مل کر اپنے سر کو مجبور کر لیتا تھا تو میں قریب بہ

عورت کے پاس دوڑتا ہوا جاتا تھا اور اس کے دامن پر سر رکھ کر اپنی تکلیف کو اپنی آہ و بکا پر صرخت کر دیتا تھا۔ جب میں پختہ سن و سال

کو پہنچا اور میری روح اُن بیدار دیوں اور حماقتوں سے لنگر کر بخروج ہو گئی جن کے خلاص میں جدوجہد کر رہا تھا تو میں نے بالکل

دبی پھر ایک بار کیا جو بچپن کے زمانہ میں کر چکا تھا۔ پھر اس میں شک نہیں کہ میں نے اس طرح اپنی آرام و راحت۔ تفریحات۔ اوقات

فرصت اور جدوجہد کے بعد اس شدید ترین خستگی و افنادگی میں کافی لطف و کیف حاصل کیا لیکن درحقیقت میں مغربی تہذیب کے

اس تمام سامان، نشاط و تفریح سے بہتر اس اعلیٰ انوی مشاعرے جہنم کو سمجھتا ہوں جسے تم بیوقوف قرار دے چکے ہو اور یہی وہ شے ہے

جس نے تمہارے اس موجودہ جہنم کو۔۔۔ اس ابدی نشاط کردہ کو میرے واسطے اس قدر ہلک و تباہ کن بنا دیا ہے۔ یہی وہ جبلت ہے

جس کے فقدان نے تمہیں اس عجیب و غریب کی شکل دیدی جسے ابلیس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تم نے لوگوں کو ان کے ان حقیقی مقاصد

سے جو کسی نہ کسی حد تک خود میرے مقاصد حیات کے مانند تھے بٹری کامیابی کے ساتھ منحرف کر کے خود اپنے مقاصد کی طرف متوجہ کر دیا

ہے اور تمہاری یہی وہ کامیابی ہے جس نے تمہیں "ترغیب و ہند" کا لقب عطا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے ارادہ و مقصد۔

کے مطابق عمل کرنے کے بجائے تمہارے ارادہ و مقصد کے لئے کار فرما ہیں یا زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہو کہ تمہارے فقدان مقصد کے

ساتھ بہتے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سب لوگ بچپن و بے آرام۔ مضطرب و بد مزہ اور مصیبت زدہ ہیں اور اُن کی زندگی کسیرا ہل

اور تصنع آمیز ہے

ابلیس — (مجرد احساس کے ساتھ) فرزائن صاحب — آپ میرے دوستوں کے ساتھ با اخلاقی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔
 فرزائن (اظہارِ نفرت کے ساتھ) میں اُن کے ہاتھ اسے ساتھ اخلاق کا یہ تونگیوں کیوں؟ دروغ و کذب کے اس محل میں جو دوزخ کہلاتا ہے میری زبان سے نکلنے والی ایک یا دو سچی باتیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی۔ تمہارے دوستوں سے زیادہ بدقوتوں کے تھے میں نے آج تک نہیں دیکھے۔ تمہارے دوست حسین و دلکش نہیں بلکہ محض عزم و مصراع ہیں۔ وہ پاک و صاف نہیں بلکہ سطحی طور پر صاف بنے ہوئے ہیں۔ وہ شاندار و پُرسلطوت نہیں بلکہ محض خوش قطع لباس میں ملبوس ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ نہیں بلکہ محض تعلیمی اداروں میں سے گزرنے والے راہرو ہیں۔ وہ مذہبی انسان نہیں بلکہ مذہبی نشستوں کے مالک ہیں۔ وہ پاکیزہ اخلاق کے حامل نہیں بلکہ صرف روایت پرست ہیں۔ وہ نیک سرشت نہیں بلکہ محض بزدل ہیں۔ وہ تو بدسرشت بھی نہیں بلکہ محض ”کمرود“ ہیں۔ وہ فن کار نہیں بلکہ صرف ہوس پرست ہیں۔ وہ خوش حال نہیں بلکہ صرف دولت مند ہیں۔ وہ وفادار نہیں بلکہ محض غلامی پسند ہیں۔ فرض شناس نہیں بلکہ محض ایک بھیڑی کی طرح مطیع۔ فلاح عام کے جذبہ کے مالک نہیں بلکہ صرف وطن پرست۔ جبری و اجابت نہیں بلکہ محض انحراف پسند۔ صاحبِ عزم و استقلال نہیں بلکہ صرف خدشی۔ یارِ عجب پر وقار نہیں بلکہ صرف جابر۔ اپنے جذبات و خواہشات پر قاصر نہیں بلکہ کند و بیمار جذبات کے مالک۔ غیرت مند نہیں بلکہ صرف مغرور۔ مہربان و ہمدرد نہیں بلکہ محض جذباتی۔ ملنسار نہیں بلکہ محض جانوروں کی طرح گروہ پسند۔ دوسروں کے جذبات کے پاسدار نہیں بلکہ محض شایستہ۔ ذہین نہیں بلکہ صرف خود رائے۔ ترقی پسند نہیں بلکہ صرف ذاتی ترقی کے تلاشی و خود غرض۔ قوتِ تمیز و تفکر کے مالک نہیں بلکہ محض ادا پرست۔ انصاف پسند نہیں بلکہ محض انتقام پسند۔ فیاض نہیں بلکہ صرف چا پلوس۔ نظم و قواعد کے پیر و کار نہیں بلکہ محض خون زدہ۔ اور صداقت تو اُن میں ہے ہی نہیں۔ ان میں سے ہر ایک شخص جھوٹا ہے جس کے رنگ و ریشہ میں جھوٹ سرایت کر چکا ہے

مجسمہ — تمہارے الفاظ کی روانی تو بڑی حیرتناک ہے فرزائن! — کاش میں بھی اپنے سپاہیوں سے اسی طرح باتیں کر سکتا!
 ابلیس — لیکن یہ صرف باتیں ہی ہیں۔ یہی سب کچھ پہلے بھی کہا جا چکا ہے لیکن کیا کبھی اس نے کوئی انقلاب پیدا کیا؟ کیا دنیا نے کبھی ان باتوں پر توجہ دی؟

فرزائن — بیشک یہ صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔ لیکن سوچو کہ آخر یہ صرف باتیں ہی کیوں ہیں؟ — صرف اس نے میرے دوست کو حسن و جمال، پاکیزگی عزت و شرف، مذہب، اخلاقیات، فن، حب وطن، شجاعت اور اسی نوعیت کی باقی سب چیزیں محض الفاظ ہیں جن کو ہم یا تم ایک داستان کی طرح جب چاہیں سیدھا اٹھا کر سکتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں حقیقت ہوتیں تو جو الزامات میں نے تم پر عاید کئے ہیں اُن کا تم کو اعزاز کرنا پڑتا۔ لیکن میرے ابلیس دوست یہ تمہارے وقار و عزت کی خوش قسمتی ہے کہ یہ چیزیں حقایق نہیں ہیں۔ بقول تمہاری یہ سب محض الفاظ ہیں جن کے ذریعہ وحشی لوگوں کو بدقوتوں بنا کر تہذیب اختیار کرنے پر ایل کیا جاسکتا ہے اور جہندپسندوں کو قریب دیکر غارتگری و غلامی پر صابر و شاکر رکھا جاسکتا ہے۔ حکمران طبقہ کا یہی سرسبز و نسلی راز ہے۔ ہم لوگ جو ایک ایسے ہی طبقے سے متعلق ہیں اگر خود اپنی مصیبت زدہ زندگی کے لئے زیادہ قوت و عزم کے حصول کی جدوجہد کے بجائے ساری دنیا کو زیادہ زندگی دینے کی کوشش کرتے تو یہی راز ہم کو ایک بلند مرتبہ عظیم قوم بنا دیتا۔ اب چونکہ میں خود ایک بلند مرتبہ و عالی طبقہ کا فرد ہونے کی وجہ سے اس راز سے واقف ہوں اس لئے ذرا تصور کرو کہ اخلاقی رنگ کارپوں کے متعلق تمہاری یہ منافقانہ و لامتناہی تقریریں میرے لئے کس درجہ مضحک کن ثابت ہو سکتی ہیں اور ان کے لئے تمہاری اپنی زندگی کی قربانیاں کس قدر غلیظ حد تک تباہ کن۔ اگر تم اپنے اخلاقی کھیل پر صرف اتنا یقینی و ایمان رکھتے کہ اسے دیانت کے ساتھ کھیل سکتے تو اس حالت میں بھی اس کا تاثر دلچسپ نہ ہوتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تم ایسا بھی نہیں کرتے۔ تم ہر قدم پر دھوکہ دیتے ہو اور جب تمہارا حریف اس قریب کاری میں تم پر ہمت بیجا

تو تم کھیل کود پر ہم پر ہم کر دیتے ہو اور اسے قتل کرنے کی کوشش کرتے ہو
یس — کردار میں ہر ممکن ہے کہ ان باتوں میں کچھ صداقت ہو کیونکہ وہاں لوگ غیر تعلیم یافتہ ہیں اور میرے مذہب حسن و محبت کی صحیح قیمت کا
اندازہ نہیں کر سکتے۔ لیکن یہاں۔۔۔۔۔

فرزان — ہاں ہاں۔ میں خوب واقف ہوں۔ یہاں محبت اور حسن کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں — اُٹ! — یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے
کوئی تماشائی ایک رسمی ڈرامہ کے صحن پر پہلے ایکٹ کو ہی ابدی آباد تک دیکھتا رہے اور ڈرامہ کی سید گیاں کبھی شروع نہ ہوں! —
ادھام پرستانہ دہشت و خوف کے بدترین لمحات میں بھی مجھے کبھی یہ تصور نہیں آیا کہ جہنم اس درجہ خوفناک مقام ہو سکتا ہے۔ یہاں میری
زندگی ایک مشاطہ کی طرح حسن کے مسلسل فکر و خیال میں اور — زنجیری زنجیوں سے کھیلے ہوئے گزرتی ہے۔ میں ایک شیرینی فروش کے طاقم
کی طرح مسلسل طور پر ایک شیریں خضامیں سانس دیتا ہوں۔ کپتان صاحب! کیا جنت میں کچھ حسین عورتیں ہیں؟
تمہ — کوئی نہیں۔ قطعی نہیں۔ سب کی سب برہنیت و برقعہ ہیں۔ درجنوں عورتوں کو دیکھ جائے تو ان کے پاس چند پیسوں کے زیورات
نہیں گے۔ انہیں زیادہ صحیح طور پر کچاس سالہ مرد قرار دیا جاسکتا ہے!

فرزان — میں وہاں جانے کے لئے بیتاب ہوں۔ کیا وہاں لفظ ”حسن“ کبھی سننے میں آتا ہے۔ اور کیا وہاں کچھ فن کار لوگ موجود ہیں؟
بسمہ — یقین کرو کہ اگر ایک بہترین مجسمہ جنت کے باشندوں کے قریب سے ٹھٹھا ہوا بھی گزر جائے تو اس وقت بھی وہ لوگ اس کی تعریف
نہیں کریں گے

فرزان — تو میں جاتا ہوں

بیس — فرزان — کیا میں بے تکلفی سے کچھ کہوں؟

فرزان — تو کیا اس سے پیشتر تم بے تکلفی سے بہت کچھ نہیں کہ چکے؟

بیس — جو کچھ میں نے کہا وہ بے شک بے تکلفی سے کہا تھا لیکن اب میں کچھ اور آگے کہنا چاہتا ہوں اور تمہارے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں
کہ انسان ہر چیز سے اکتا جاتا ہے۔ وہ جنت سے بھی اسی طرح اکتا جاتا ہے جس طرح کہ دوزخ سے۔ اور انسان کی تمام تاریخ
ان ہی دو انتہاؤں کے درمیان مسلسل تغیر و تبدل کی روداد ہے۔ ہر ایک زمانہ کھڑی کے پنڈولم کی ایک حرکت ہے۔ اور ہر ایک نسل
انسانی صحن پر دیکھ کر کہ دنیا بھی ہمہ وقت حرکت میں ہے یہ خیال کرتی ہے کہ دنیا آگے بڑھ رہی ہے۔ لیکن جب تم اس قدر عمر کو پہنچو گے
جتنی کہیں رکھتا ہوں — جب تم جنت سے ہزاروں مرتبہ اسی قدر اکتا چکو گے جتنا کہ میں یا کپتان صاحب بھگت چکے ہیں۔ اور جب
تم ہزاروں مرتبہ جہنم سے بھی اسی قدر اکتا جاؤ گے جیسے کہ اب نظر آتے ہو تو اس وقت تم اس قریب خیال میں مبتلا نہ ہو سکو گے کہ جنت سے
جہنم کی طرف انسان کی ہر ایک زندگی ایک نجات اور جہنم سے جنت کی طرف ہر انسانی سعی و حرکت ایک ارتقائی اقدام ہے۔ جس جگہ تمہیں
اب اصلاح۔ ترقی۔ صعودی رجحان کی تکمیل و تسکین اور انسان کی وہ مسلسل جدوجہد نظر آتی ہے جو وہ خود اپنی مردہ زندگیوں کے زینے
پر فز تر مقامات تک چڑھ جانے کے لئے کرتا آیا ہے اُس جگہ تمہیں اگر کوئی شے ملے گی تو صرف ایک لامحدود فریب خیال و نظر سے تمہیں اس وقت
اس قول کی تصدیق ہو جائے گی کہ دنیا میں کوئی شے نئی نہیں۔۔۔۔۔

فرزان — (بالکل بے تاب ہو کر) بخدا تمہارے یہ الفاظ تو اُس منافقانہ تقریر سے بھی خراب ہیں جو تم نے حسن و محبت کی شان میں کی ہے۔ بڑے
چالاک جو تم! — اگر انسان ہر چیز سے سیر ہو کر اکتا جاتا ہے تو کیا محض اس وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان ایک کیڑے سے برتر
نہیں یا ایک کتا ایک بھیڑے سے بہتر نہیں؟ — کیا انسان ایک کیڑے سے برتر نہیں یا ایک کتا ایک بھیڑے سے بہتر نہیں؟ — کیا انسان
محض اس وجہ سے غذا کھانا ترک کر دے کہ وہ اپنی بھوک کو تسکین دینے کی کوشش میں اس بھوک کو تباہ کر لیتا ہے؟ اگر ایک حکمت
غیر مزدومہ پڑا ہوا ہے تو کیا اس کی محض قوت بالکل بے عمل رہتی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے کپتان صاحب یہاں اپنی جہنی قوت

کو صرف کریں اور آئندہ مبارک فردوسی کے زمانے کے لئے فردوسی قوت اُن کے اندر مجتمع نہ ہو جائے؟ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہماری عظیم "قوت حیات" نے اپنے مقصد کے لئے لکڑی کے موجود والی پنڈولم کی ترمیم اختیار کی ہے اور یہ کرۂ ارض اس پنڈولم میں لٹکا ہوا ذوقی گولہ ہے "قوت حیات" اس طرح ایک زبردست پنڈولم کی طرح کرۂ ارض کو لئے ہوئے ایک حد سے دوسری حد تک بار بار حرکت کرتی رہی ہے۔ اس پنڈولم کی ہر ایک حرکت کی تاریخ ہم انسانوں کو جو کہ اس تاریخی نمٹن کے اداکار ہیں بالکل نئی معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تاریخ اس پنڈولم کی سابقہ حرکت کی پرانی تاریخ ہے جو اب دہرائی جا رہی ہے۔ اور صرت اتنا ہی نہیں بلکہ جس طرح کسی سرکس کا بانڈیکر ایک کینڈ کو بار بار اُچھال کر دو بوج لپٹا ہے اسی طرح وقت کی "قابل قیاس لاناہایت وسعتوں میں سورج ہزاروں مرتبہ زمین کو پھینکتا رہا اور پھر دو چتر ہا ہے اور ہمارے طول طویل زمانے اس پھینکنے اور دو بوجنے کے درمیان واقع ہونے والے محض لمحات ہیں۔ لیکن کیا اس عفریت نام نظام کے پس پشت کوئی مقصد کار فرما نہیں؟

ابلیس — کوئی بھی مقصد نہیں میرے دوست — تم سوچتے ہو کہ چونکہ تم ایک مقصد رکھتے ہو اس لئے فطرت کا بھی کوئی مقصد ضرور ہوگا۔ حالانکہ یہ سوچنا تو ایسا ہی ہو گا جیسے تم یہ کہو کہ چونکہ تم ہاتھ پاؤں میں انگلیاں رکھتے ہو اس لئے فطرت کو بھی ایسی ہی انگلیاں حاصل ہونی ضروری ہیں۔

فرزان — لیکن اگر ان انگلیوں کا کوئی مقصد نہ ہوتا تو یہ کبھی مجھے نہ ملتیں — اور میرے دوست میں فطرت کا بالکل ایسا ہی ایک حصہ ہوں جیسا کہ میری انگلی میرا ایک حصہ ہے۔ اگر میری انگلیاں ایک ایسا آلہ ہیں جس کے ذریعہ میں شمشیر و باب کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہوں تو یقیناً میرا داغ ایک ایسا آدہ ہے جس کے ذریعہ قدرت خود اپنی ذات کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ میرے کتے کا داغ صرف میرے کتے کے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے لیکن میرا داغ ایک ایسے علم کے لئے محنت و مشقت کرتا ہے جو ذاتی طور پر میرے واسطے کچھ کرنے کے بجائے میرے جسم کو میرے لئے تکلیف دہ بنا دیتا ہے اور انحطاط و موت کو میرے واسطے ایک تباہی کی شکل دیتا ہے۔ اگر میرا مقصد میری ذات سے ماوراء نہ ہوتا تو میں ایک فلسفی کے بجائے ایک کسان بننے کو ترجیح دیتا — کیونکہ — کسان اتنی ہی مدت زندہ رہتا ہے جتنا کہ ایک فلسفی — بلکہ یوں کہو کہ وہ فلسفی سے زیادہ ہی عمر پاتا ہے — زیادہ کھاتا ہے — بہتر منڈ سوتا ہے اور اپنی شریک حیات کے آغوش محبت سے کسب کفایت و مسرت کرتے ہیں اس کا داغ فلسفی کی طرح شکوک و شبہات سے منفص نہیں ہوتا۔ فلسفی اس قدر مختلف کیوں ہے؟ — صرت اس لئے کہ وہ "قوت حیات" کی گرفت میں ہے؛ — "قوت حیات" اس سے کہتی ہے "میں زندہ رہنے کے صرت ارادہ کے ذریعہ اور قلیل ترین دشواری کے راستوں کو اختیار کر کے غیر شعوری طور پر ہزاروں چیزوں کا کائنات کر چکی ہوں۔ اب میں چاہتی ہوں کہ خود اپنی حقیقت اور اپنی منزل مقصود کو معلوم کروں اور اپنا راستہ انتخاب کروں۔ اسی مقصد کے لئے میں نے ایک خاص دماغ تخلیق کیا ہے — ایک فلسفی کا دماغ — تاکہ یہ فلسفی میرے لئے اس عرفان ذات پر اسی طرح گرفت حاصل کرے جیسے کہ ایک کسان میرے واسطے اپنے ہل کو گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور یہ وہ کام ہے اسے فلسفی جس کے لئے تجھے جہد و جہد کرنا ہی ہوگی اُس وقت تک کہ تو مر جائے؛ — تیری موت کے بعد اس کام کو جاری رکھنے کے لئے میں ایک اور دماغ اور ایک اور فلسفی بناؤں گی۔"

ابلیس — لیکن اس عرفان و علم سے فائدہ ہی کیا؟

فرزان — فائدہ یہ ہے کہ قلیل ترین دشواری کی سمت جھپکنے کے بجائے کثیر ترین مفاد کے راستے کو انتخاب کرنے کی اہلیت نصیب ہو جائے گی ایک جہاز کا اپنی مقررہ و متعین منزل کی طرف رواں ہونا ایک ادھر ادھر جھپکنے ہوئے لکڑی کے تختے سے بہتر نہیں ہے؟ — فلسفی فطرت کے جہاز کا رہنما ہے۔ اور یہی وہ فرق ہے جو مجھ میں اور تم میں حایل ہے — دوزخ میں رہنا لکڑی کے تختے کی طرح جھٹکنا ہے۔ اور جنت میں رہنا ایک جہاز کی طرح خود راستہ پیدا کرنا۔"

ابلیس — لیکن یہ راستہ اغلب یہ ہے کہ جہاز کو چٹانوں کی طرف لیجائے گا۔

فرزان — چنانوں کی طرت یاسمندر کی تہ میں کونسا جہاز زیادہ ترچتا ہے ؟ — بھنگے والا جہاز یا وہ جہاز جس پر ایک رہنما موجود ہے ؟

المیں۔ اچھا اچھا!۔ آپ اپنے راستے پر بڑھے چلے جائیے فرزان صاحب!۔ میں تو اپنی ذات پر خود اپنا اختیار قائم رکھنے کو ترجیح دیتا ہوں اور کسی غلط کار کا لائق قوت کا آلہ کار بننا پسند نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں کہ کُن نگاہوں کی مسرت ہے۔ موسیقی سماعت کا سرور ہے۔ محبت احساس کی جنت ہے اور یہ تمام چیزیں ہمارے خیالات والفاظ کے واسطے ایک دلچسپ مواد جمیا کرتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ان احساسات۔ ان جذبات اور ان مشاغل میں تنہک ہونے سے ہی ایک ہستی پاکیزہ مذاق اور شستہ و ہذب پہلا سکتی ہے۔ گروہ ارض پر معابد کے اندر مجھے لوگ خواہ کچھ بھی کیوں نہ کہیں میں جانتا ہوں کہ اعلیٰ سوسائٹی کے اندر تمام دنیا میں ”شہزادہ ظلمت“ کو ایک شریف و معزز شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ اور میرے لئے بس اتنا ہی کافی ہے۔ رہا تمہاری اس ”قوت حیات“ کی بابت جسے تم بے پناہ اور ناقابل مزاحمت خیال کرتے ہو تو واقعہ یہ ہے کہ میرے خیال میں ہر ایک معمولی کردار کے انسان کے لئے یہ قوت دنیا بھر میں سب سے زیادہ قابل مزاحمت چیز ہے۔ لیکن اگر تم ایسے ہی پست مذاق اور سرسبز الاعتقاد ہو جیسا کہ دنیا کے نام مصلعین ہوتے ہیں تو اس صورت میں یہ ”قوت حیات“ پہلے تو تمہیں کسی مذہب کے حدود میں ڈھکیچتی ہوئی لیجائے گی جہاں تم شیرخوار بچوں کی روح کو مجھے بچانے کے لئے اُن پر مقدس پانی چھڑکو گے۔ اس کے بعد یہ قوت تمہیں مذہب کی طرف سے ہاتھتھی ہوئی سائنس کی طرف لیجائے گی جہاں تم شیرخوار بچوں کو مقدس پانی کے چھینٹوں سے دور کھینچ کر لجاؤ گے اور اُن کے جسم میں ٹیکہ کی شکل میں بیماری کے جراثیم صرف اس لئے داخل کر دو گے کہ یہ بیماری اُن کو محض اتفاقیہ نہ لگ جائے۔ اس کے بعد تم سیاسیات میں داخل ہو گے جہاں تم بد اخلاق عاملین کے آلہ کار اور بلند و صند فریب کار کھوکھی شخصیتوں کے دست راست بن جاؤ گے۔ اور اس سب کا انجام ہو گا یا دوسری اور پانچ بڑھاپا۔

مفلوج قوت اور شکستہ امیدیں۔ شدید پریشانی و افسوس دنیا کی بدترین اور احمق ترین بربادی و قربانی پر۔ یعنی اہلیت خاندان و بزرگی کی بربادی و قربانی!۔ یا مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ”عمدہ شے“ پر قابو پانے سے پہلے ”عمدہ ترشے“ کے تعاقب میں دوڑ جانے والے احمق کو جو سزا ملنی چاہئے وہ تمہارا حصہ ہوگی۔

فرزان — لیکن کم از کم میں کوفت سے تو محفوظ رہوں گا۔ ”توت حیات“ کی خدمت کرنے میں اس قدر فائدہ تو بہر حال ہوتا ہی ہے۔ اس لئے الوداع المیتس صاحب!“

ابلیس۔ (زمی سے) اوداع فرزان! — تجھے انشورہ دلچسپ گفتگو یاد آیا کرے گی جو تم عام امور کی بابت کرتے رہے ہو۔ میری تمنا ہے کہ تم ہر ایک مسرت سے بیرو ہو سکو۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے جنت کچھ لوگوں کو اس بھی آجاتی ہے۔ لیکن اگر کبھی تمہاری ٹائے تبدیل ہو جائے تو اسے یاد رکھو کہ کتاب مغرورین کے لئے یہاں دوزخ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اگر کسی وقت بھی تمہیں اپنے آخر ایسی چیزوں کا احساس ہو جیسے گرمی قلب، پر فصوص بے اختیار محبت، معصوم خطا اور زمی۔ اور گرم دھڑکتی ہوئی اور مائل لیتی ہوئی حقیقت۔

فہرستان - یعنی مختصر یہ کہ گوشت و پوست :- ان تمام الفاظ کے بجائے صراحت گوشت و پوست کیوں "کہا جائے" . دانتہ ہے کہ ہم ان دونوں عامیانہ گندی چیزوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں ؟

ابلیس۔۔۔ (غصہ سے) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں ٹھیس واپسی کی دعوت جو دے رہا ہوں اُسے تم واپس میرے منہ پر چھینکنا چاہتے ہو؟
فرزاد۔ ہرگز نہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر ابلیس محض ایک قسطنطنیہ شخصیت کا مالک یا ایک سائنسک ہو تو میں اُس سے بہت کچھ استفادہ
کے لئے طیارہوں کو ایک جہز باقی ابلیس کا وجود میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کپتان صاحب! آپ دوزخ و جہنم کی سرحد کا راستہ
جاتے ہیں۔ براہ کرم میری رہنمائی کیجئے۔

مجسمہ — دوزخ و جنت کی سرحد؟ — یہ سرحد تو صرف وہ فرق ہے جو دنیا کے متعلق دوزاویہ ہائے نظر کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اگر تم درحقیقت وہاں جانا چاہتے ہو تو کوئی بھی راستہ تمہیں سرحد کے پار لے جاسکتا ہے۔

فرزان — بہت خوب! (سارہ کو سلام کرتے ہوئے) محترمہ! — آپ کا خادم۔۔۔۔۔

سارہ — لیکن میں تو تمہارے ساتھ جاؤں گی

فرزان — جنت کے لئے میں صرف اپنا راستہ پاسکتا ہوں سارہ! — تمہارا نہیں۔ (ناٹک ہو جاتا ہے)

سارہ — اُن! — کس قدر پریشان کن ہے یہ معاملہ!

مجسمہ — (فرزان کی سمت پکارتے ہوئے) سفر مبارک فرزان! — (وداعی سلام کے طور پر ساری کی ایک زبردست جھلکار پیدا کرتا ہے جسکے

جواب میں دور سے پہلے صیاد روحانی نغمہ بھٹاتا ہے) — آہ! — وہ جا رہا ہے فرزان!! (اپنے ہونٹوں سے ایک طویل سانس

باہر نکالتے ہوئے) کیسی دلکش باتیں کرتا ہے وہ! — جنت کے لوگ اس کی گفتگو کو کبھی نہ سمجھ سکیں گے

ابلیس — (ایویسی سے) — اُس کا جانا ہماری ایک سیاسی شکست ہے۔ میں ان "پرستارانِ حیات" کو روک نہیں سکتا۔ وہ سب کے سب

یہاں سے چلے ہی جاتے ہیں آخر کار! — فرزان کا چلا جانا ہمارے بڑے نقصان ہے۔ تقریباً ایسا ہی نقصان اُس وقت ہوا

تھا جبکہ وہ ولندیزی مصور یہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ وہ بھی عجیب مصور تھا۔ اُسے ستر سال کی ایک جڑیل ضعیفہ کی تصویر بنانے میں

بھی ایسا ہی لطف ملتا تھا جیسا کہ ایک مہینے سا لکھن کی!

مجسمہ — ہاں مجھے یاد ہے۔ وہ جنت میں آیا تھا۔ اس کا نام ریمبرٹ تھا۔

ابلیس — ہاں ریمبرٹ! — ان لوگوں میں کچھ عجیب ایک غیر فطری رنگ پایا جاتا ہے۔ ان کے اعتقادات کی داستان کو کبھی نہ سننا کتنا صائب

وہ بڑی خطرناک ہے! — فوق الانسانی انسانوں کے مشاغل سے خبردار رہئے! — یہ مشاغل خالص انسان سے ایک مذہبی

نفرت کرنے کا سبق پڑھاتے ہیں ایک معمولی خالص انسان کے نزدیک گھوٹے۔ کتے۔ اور بکیاں محض حیوانات کی قسمیں ہیں جو اخلاقی

دنیا کے احاطے سے خارج ہیں۔ لیکن ایک "فوق الانسانی انسان" کے نزدیک مرد اور عورتیں بھی محض حیوانات کی قسمیں ہیں اور

یہ بھی اخلاقی دنیا کے احاطے سے خارج ہیں۔ یہی فرزان اپنی دنیا میں عورتوں پر مہربان تھا اور مردوں سے خوش اطواری سے پیش

آتا تھا لیکن اس کی یہ مہربانی بالکل ایسی ہی تھی جیسی کہ تمہاری۔ لڑکی سارہ اپنی پالتو بلیوں اور کتوں کے لئے روار کھتی

ہے۔ یہ مہربانی تو ضرور ہے لیکن اس سے خالص انسانی روح کی خصوصیات کی تردید ہوتی ہے۔

مجسمہ — مگر یہ "فوق الانسانی انسان" آخر کیا بلا ہے؟

ابلیس — یہ "قوت حیات" کے دیوانوں کی تازہ ترین آپک ہے۔ کیا جنت میں فواروں کے درمیان تمہیں پولینڈ کا وہ جرمن نسل پاگل باشندہ

نہیں ملا؟ — اس کا کیا نام تھا؟ — ہاں — نطشے!

مجسمہ — میں نے کبھی اس کا نام نہیں سنا۔

ابلیس — اپنے ہوش و حواس کی بجائی سے پیشتر وہ سب سے پہلے اسی جگہ آیا تھا۔ مجھے اس کی ذات سے کچھ توقعات تھیں لیکن وہ "قوت حیات"

کا ایک راسخ پرستار تھا۔ اگرچہ "فوق البشر انسان" اسی قدر قدیم چیز ہے جتنا کہ پرتھیس لیکن یہ نطشے ہی تھا جس نے اس کو ٹپ مٹ

کو اٹھا کر کھڑا کر دیا اور اب یہ بیسویں صدی جب دنیا سے — گوشت و پوست سے اور مجھ کترین خادم سے اٹکا جائے گی تو قدیم محبوب

حافظوں میں سے جدید ترین حلقہ و خبط کے پیچھے دوڑنا شروع کر دے گی۔

مجسمہ — "فوق البشر انسان" ایک اچھا انفر ہے۔ اور ایک اچھا انفر نصف جنگی نفع کے مساوی ہوتا ہے۔ میں اس نطشے سے ملاقات

کرنا چاہتا ہوں۔

آزاد فکارت

آرٹ اور ثقافت کی آزادی کے متعلق اتنے متضاد نظریات اور تصورات پیش کئے گئے ہیں کہ ان مسائل سے متعلق جو بحثیں کی جاتی ہیں وہ جلد ہی سیاسی رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ اور ان کا مقصد محض یہ رہ جاتا ہے کہ کسی خاص سیاسی نظریے کی تائید میں دوسرے تمام سیاسی نظریات کی تنقیص کی جائے اس لئے یہ ضرورت سمجھی گئی کہ آزاد فکارت کی خصوصیات واضح کر دی جائیں۔

وہ کیا چیز ہے جو ایک فکارت کو آرٹ کی خدمت پر ابھارتی ہے وہ اس کی انانیت ہے، اس کے نظام فکری کا ایک فطری زور ہے، اس کی عظیم انفرادیت کا ایک پر جوش اثبات ہے۔ یہجا وجہ ہے کہ آرٹ کے تمام آزاد شہپارے اپنی خالق کی عظیم شخصیت، کاحسین پر تو ہوتے ہیں، پس اگر اسکی انانیت آزاد ہے، اسے پھیلنے پھولنے اور اپنے وجود کا اثبات کرنے کے مواقع میسر ہیں تو اس کا آرٹ بھی آزاد ہے۔

یہ نہ سمجھے کہ نظام کائنات کو انسانوں سے کوئی ہمدردی ہے۔ وہ تو بڑا ہی بے درد اور ظالم ہے اس کو شخصیت کے ارتقا سے صرف یہ کہ کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ اس کا سختی سے مزاحم بھی ہوتا ہے۔ شوہنبار اور عمر خیام اس کے آگے سپرد آئے ہیں اپنی خیر سمجھتے ہیں، کائنات کا زبردست ہاتھ انھیں اٹھا کر پھینک دے، کچل دے، دبا دے، انھیں کوئی شکوہ نہیں، دل اور رات سے بنی ہوئی شطرنج کبھی ہوتی ہے اور کوئی نامعلوم اور زبردست ہاتھ انھیں اپنی مرضی کے مطابق چلاتا رہتا ہے، کیونکہ ان کے خیال میں اس سے مقابلہ کرنا بے سود ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، نظام کائنات کو مفتوح کیا جاسکتا ہے، انسان عظیم تر ہے، خواہ کتنی ہی مدت صرف ہو لیکن انسان اسے مغلوب کر کے رہے گا۔ غلطی اسے مغلوب کرنے والی قوت کو جو انسان کے اندر خواہیدہ پڑی رہتی ہے، زور زندگی کا نام دیا ہے۔ یہ زور زندگی آزاد فکارتوں کی انانیت کی ارتقائی شکل کا دوسرا نام ہے۔ اسی لئے ایک فکارت اپنی انانیت اور اپنی عظیم انفرادیت کے اظہار پر مجبور ہوتا ہے، یہی اسے آزاد شہپاروں کی تخلیق پر ابھارتا ہے اور اس طرح کائنات محض (فکارت کی شخصیت) کائنات مفصل سے برسر پیکار ہوتی ہے، اور مسلسل کوشش کرتی رہتی ہے کہ اسے محکوم کرے۔ ایک فکارت کی انانیت جو کبھی پتھروں کو، حساس بنشتی ہے، کبھی تصویر کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی شعر و گیت کا جامہ پہنتی ہے۔ کبھی آتشیں تقریر کی صورت میں، اپنی ہمتی کا اثبات کرتی ہے، کبھی نغمہ فزون خیر کی خالق ہوتی ہے، ارتقا کے مختلف مدارج نظام کائنات اسے پھیلایاں دیکر سلانے کی کوشش کرتا ہے، سیاسی نظریات اس پر زریں کھڑے کی تھیں لپیٹ کر اس کی آواز کو دبائے کی کوشش کرتے ہیں، ہمارا آزادی کش ماحول اسے گھیلنے کی فکر میں لگا رہتا ہے لیکن ان تمام بندشوں اور رکاوٹوں کے باوجود فضا نے بسط میں ایک بے انتہا راہ بیچ بند ہوتی ہے جو نظام کائنات کو ہلا دالتی ہے، جو صرف حال پر ہی محیط نہیں ہوتی بلکہ مستقبل کا بڑا حصہ بھی اس کے اختیار میں آجاتا ہے اور اسی بے اختیار راہ بیچ کو آزاد شہپارے کا نام دیا جاتا ہے۔

آزاد فکارت کی فطری صلاحیتوں کو ابھرنے سے روکنے والے عناصر میں سب سے پہلے مذہب کی ہادی قوت ہے۔ مذہب اپنے بلند مفہوم میں انفرادیت کے اظہار پر کوئی قابل اعتراض پابندی نہیں لگاتا۔ اس کی پابندی صرف اس حد تک ہوتی ہے کہ آرٹ کا نمونہ خدا کی حاکمیت سے انکار کا دعویٰ نہ ہو۔ یہاں تک آزاد فکارت کی شخصیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ ایک حد تک خدا کی ربوبیت کا صحیح تصور اسے دوسری زنجیروں میں مقید ہونے سے روکتا ہے۔ لیکن آج کل جب کہ مذہب رسوم اور عود ساختہ فروعی عقاید کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے، اظہار جذبات ہر مذہب کے علم بردار بڑی بندشیں لگاتے ہیں۔ ہماری تہذیب اور معاشرت نے کچھ ایسا رجحان اختیار کر لیا ہے، گویا وہ فضا کی احکام کی طرح قائم و دائم ہیں، نہ ان میں زیادتی کی گنجائش ہے نہ کمی کی، مروجہ طرز معاشرت اور موجودہ تہذیب اپنے فضا کوئی آواز نہیں سن سکتی،

حالانکہ وہ تہذیب کو زیادہ مکمل اور زیادہ شاندار بنانے کے لئے بلند کی جاتی ہے۔ بہت سے فنکار اسی معاشرتی احتساب کی وجہ سے بہت دھیمے سروں میں لاپتے ہیں ان کے نعمات میں وہ گنج نہیں پیدا ہو پاتی جو آفاق کی پہنائیوں میں پھیل جائے۔

موجودہ سیاسی نظام، جو اقتصادی بنیادوں پر قائم ہونے کی وجہ سے دو خاص گروہوں میں منقسم ہے (یعنی سرمایہ داری اور اشتراکیت انفرادیت کی نمود کو مختلف ڈھنگوں سے روکتا ہے۔ ان ممالک میں جہاں سرمایہ دارانہ نظام حکومت ہے، طرح طرح کی احتسابی قوتیں موجود ہیں جن میں سے کچھ بلا واسطہ کام کرتی ہیں کچھ بالواسطہ۔ تمام ذرائع پیداوار سرمایہ دار اور بورژوا طبقہ کی ملکیت میں ہونے کی وجہ سے وہی ادیب پنپ سکتا ہے جو وہ ذات قدروں کے گیت گائے۔ الغرض معاشرت کے سارے شعبوں میں بورژوائی رجحانات کی حکمرانی ہوتی ہے۔ اگر کوئی فنکار ان رجحانات کی ترجمانی نہیں کرتا تو لوگ ایک ناگوار تاثر کے ساتھ اس کی تصنیفات کا مطالعہ بند کر دیتے ہیں۔ سرمایہ دار لوگوں کے دماغوں کو سنانے کی خاطر ایسی تصنیفات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جو زندگی کے متعلق خوبصورت جھوٹ پیش کریں۔ ادیب اور مصور ایسے ناول اور راگ تصنیف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جس کی بازار میں مانگ ہو تاکہ اس طرح اپنی مالی حالت درست کر سکیں بصورت دیگر وہ اپنے پیچھے بڑے افسانے اور اشعار، ایسے عامیانه گیت اور ایسے آزاد آرٹ سے معراصنام کی تخلیق کبھی نہ کرتے اس کے علاوہ ایسے ممالک میں براہ راست سانسزپ کا طریقہ ہوتا ہے اگر کوئی فنکار ایسی تخلیق کرتا ہے جس سے اس کی پرورش انانیت گرد و پیش میں ایسی گونج پیدا کر دے جو سوتے ہوئے عوام کی انفرادیت کو جگا دے تو اس کی تخلیق ضبط کر دی جاتی ہے اور پھر اس کے لئے جیل کے دروازے یا قاتلوں کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔

اشتراکی نظام کے متعلق تو کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔ وہ تو ایک بل صراط ہے جو تلوار سے تیز تر تو نہیں، مگر بال سے باریک ضرور ہے۔ اگر کوئی ماضی کے گھنڈروں کی طرف نظر محبت ڈالتا ہے تو اس پر رجعت پرستی کا لبیل چپکا دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ اس کے اجداد کی عظمت کے نشان ہیں۔ میں نے ہیلوئز ودا کی نظم ”کربلین کا انسان“ پڑھی۔ ذہنی مرعوبیت اور فکری غلامی کی اس سے بدتر مثال شاید ہی ہمیں مل سکے۔ پتہ نہیں پشکن کو ریگیوں نے رجعت پسند کیوں نہیں کہا۔ اس کی آزاد زندگی تو اس سے بھی ”بدتر“ خطاب کی مستحق تھی۔ اس کے علاوہ طبقاتی تعصب، جو اس نظام کی خصوصیتوں میں سے ایک ہے، ایک فنکار کے آزاد میلانات کو سختی سے کچل دیتا ہے۔

اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ ایک فنکار کی انانیت مختلف ارتقائی مدارج رکھتی ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا تجزیس فنکار کو ایسا مقید کر دیتی ہیں جن کو مجال دم زدن نہیں رہتی کسی کو خوابیدہ کر دیتی ہیں۔ پھر کسی فنکار کی انانیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنا اظہار دھیمے سروں میں کرتی ہے، کبھی اس کی لئے اتنی بلند اور گونجنے والی موتی ہے کہ عوام کی خوابیدہ انانیت جاتے لگتی ہے۔ ماحول کی مشکلات ان پر کوئی اثر نہیں کرتیں۔ آزاد فنکار یا تو نتائج سے بے پروا ہو کر ان ہندشوں کو توڑ دینے کی کوشش کرتا ہے، یا انھیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ سوڈرٹ نے جو پہلی آزاد راگ تصنیف کرنے شروع کئے، اس کی آمدنی ختم ہو گئی، وہ سردی کے دفوں میں اپنی بیوی کے ساتھ قفس نہ رہا تھا۔ اس لئے انھیں کاپنے نفس کو آسودہ کرے، بلکہ اس لئے کاپنے جسم میں کام کرنے کے لئے گرمی پیدا کرے اور مصائب کی اسی حالت میں اس نے اپنے مشہور ترین شاہکار تخلیق کئے۔ ۱۹۱۷ء میں جب موت کے فرشتے میٹرک کے سر پر منڈلا رہے تھے، فرانسیسیوں نے ویاکام پر بمباری کی، اس کے نوکر ڈر گئے اور ان کی روجوں پر ہتھکڑیاں لگا دی گئیں مگر میٹرک کی روح جاوید سکون سے نہ مٹی۔ موت سے کچھ دیر پہلے اس نے کہا کہ اسے پپانو کے پاس پہنچا دیا جائے، اس کی زرد انگلیاں پپانو پر تیزی سے چلنے لگیں، ایک دھیمسا افسردہ راگ نکلا اور اس نے اپنا شاہکار ”آسٹریائی نمونہ عبادت“ بجایا، وہ بجاتا رہا تاکہ اس کی انانیت کی گنج جنگ کے دھماکوں پر غالب آجائے۔ پھر ایسا نہ ہوا، تین مرتبہ اس نغمے کے بجنے کے بعد موت نے اسے سیاہ پردوں میں چھپا دیا۔ ویاکام کے ایک دوسرے کو نے میں تھوڑے دن اپنے کانوں میں روٹی ٹھونسنے بیٹھا تھا، تاکہ اس کا ذوق لطیف بعد ہی آواز میں سن سن کر مردہ نہ ہو جائے، لیکن وہ بھرا ہو گیا وہ اس طرح وہ غور اپنے ہی نغمے نہ سن سکا۔ یہ دونوں جنگ کی ہونائیوں کو نظر انداز کرتے رہے اور ایسی شکست کھائی جس پر ہزار فقیں قرعہ ہیں۔ انھوں نے اپنی عظیم انفرادیت کو بونے نہ دیا اور آخری وقت تک آزاد آرٹ کی تخلیق کرتے رہے، پھر جب وہیں کی حکومت نے مشہور مصور، منظر نویس، بورڈر گرائڈر یا نیل وراکٹو کو فائرس سے بلوایا تاکہ وہ ایک مشہور جنرل کا کیا آئی کی یادگار قائم کرے اور جب وہ وہیں

(حالانکہ اگر ان کی اتانیت بھی جاگتی ہوتی تو ایک عظیم راز کے انکشاف کے روپ میں زود شروع سے اُچھلتی ہوئی باہر نکلتی ہے۔)

فرق صرف اتنا ہے کہ بہت سے فنکار غیر متعلق راہیں اختیار کر لیتے ہیں اور بہتوں کی چھین ایک ہی مقصد کے لئے بند ہوتی ہیں۔ پہلی قسم کے فنکاروں کی اتانیت پر چھٹی نہیں ہوتی بلکہ رنگینے والی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کی بھی ہوئی سب باتوں کو بھول جاتے ہیں۔ کوئی آدمی ایک ہی فنکار سے منسوب کردہ مختلف اور متضاد نظریات کو یاد نہیں رکھ سکتا۔ ہاں دوسری صورت میں جبکہ فنکار اپنی بھی ہوئی ایک ہی بات کی تشریح کرتا ہے، تو اس کے فحوش زیادہ گہرے ہوتے جاتے ہیں اور ایسے ہی فنکاروں کو قبولیت عوام اور شہرت و وام نصیب ہوتی ہے۔

ان آزاد فنکاروں کو چھوڑ کر جن کی انفرادیت گرد پیش کی یا بندیوں کو نظر انداز کر دیتی ہے، آزاد فنکار کے ارتقاء کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا نظام قائم کرنے کے لئے جدوجہد کی جائے جس میں پابندیاں نہ ہوں تاکہ ایسے فنکار بھی آزادانہ تخلیق کے عمل کو انجام دے سکیں جن کی اتانیت زیادہ پر چھٹی نہیں ہے۔

جلیل عابدی

ایک قدیم کتب خانہ کی بعض نادر کتابیں

غیاث اللغات مطبوعہ ۱۸۴۷ء (فارسی) -----	چار روپیہ
سواطح الالہام از فیضی (عربی) -----	سات روپیہ
منتخب اللغات دارالشکوہی (فارسی) -----	سات روپیہ
علم جفر و شعبہ جات (اردو) -----	چار روپیہ
مثنوی یوسف زلیخا جاتی (فارسی) -----	تین روپیہ
مصدق الرمل، انوار الرمل (فارسی) -----	سات روپیہ
مرثیہ انیس -----	چھ روپیہ
نالہ عندلیب (فارسی) -----	آٹھ روپیہ
ترجمہ حدائق البلاغت (اردو) -----	تین روپیہ
علم الکتاب خواجہ دردہ (فارسی) -----	چھ روپیہ
طب کی اُردو کتابیں	
ترجمہ کلیات نفیسی مکمل -----	سولہ روپیہ
ترجمہ قانون پوعلی سینا مکمل -----	تیس روپیہ
کنج حکمت مکمل ۱۳ حصے -----	دس روپیہ
مفردات المفردات -----	چار روپیہ
امراض چشم -----	پانچ روپیہ
ترجمہ کلیات و معالجات -----	پندرہ روپیہ
بحر محیط - حکیم اصغر حسین فرخ آبادی -----	آٹھ روپیہ
قشریح کبیر - حکیم محمد کبیر الدین دہلوی -----	بارہ روپیہ
کتاب التشنیص مکمل -----	آٹھ روپیہ
اسرار حکمت - از حکیم محمد عبدالعزیز لاہوری -----	چار روپیہ
طب کی فارسی کتابیں	
قرا بادین کبیر مکمل -----	سولہ روپیہ
مجموعات فرنگی (از ہنری برکیٹر) -----	مندرہ روپیہ
مخزن الادویہ تہ تحفۃ المؤمنین - از حکیم محمد حسین طوسی شیرازی -----	دس روپیہ
محیط اعظم مکمل - از حکیم محمد اعظم خاں دہلوی -----	پچیس روپیہ
اکسیر اعظم " " " -----	پنیتیس روپیہ
مفرح القلوب - مفید الاحسام (علم جراحی) -----	بارہ روپیہ
علاج الامراض از حکیم محمد شریف خاں دہلوی -----	آٹھ روپیہ
مخزن اکسیر مکمل ۶ جلد از حکیم امام الدین پاک پٹن -----	دس روپیہ
قرا بادین اعظم - از حکیم محمد اعظم خاں دہلوی -----	پندرہ روپیہ
قرا بادین قادی - از حکیم محمد اکبر اندانی -----	بارہ روپیہ

تکمار پک ایچی لکھنو

وسط ایشیا کی جدید شاعری کے نمونے

دماغوں پر صدیوں سے تالے پڑے ہوئے تھے لیکن انقلاب کے ہواڑے نے دفعتاً وہ تالے توڑ دیے اور ایک تاجیک دہقان منور شاہ زونگی پر ان لفظوں میں تنقید کرنے لگا:-

”جنگ ہو رہی تھی اور میں قلعہ کی دیوار کے نیچے کی سڑک پر بیٹھا جا رہا تھا، گرمی سخت تھی اور غبار چھایا ہوا تھا۔ میرے پاؤں میں سکتہ نہ رہی تھی کہ دھان کے کھیتوں میں گھس گھس جادوں جہاں اگرچہ لاشیں بٹڑ رہی تھیں مگر ایک گھوڑے سوار سے چھپنا بھی چاہتا تھا۔“

”شکستہ تجربے میرے بڑھے استاد پر آدھ ہوئے جنہوں نے مجھے کچیس سال پڑھایا تھا۔ علم و فضل کی پوٹ، ملا صاحب فرماتے ہیں:-

”میری بات پر دھیان دو! میرے لفظ یاد رکھنا!“

”میں نے جواب دیا:- ملا صاحب! مجھے آپ کی پہلی سب باتیں یاد ہیں، آپ نے فرمایا تھا تاج ہمیشہ سلامت رہے گا۔ گرد و تلخ ریزہ ریزہ ہو گیا آپ نے کہا تھا تخت کو شکست نہیں ہوگی گردہ تخت پاش پاش ہو گیا! آپ کا فرمان تھا کہ بادشاہ کا خون حرام ہے! مگر وہ خون میری تلوار پر جا ہوا ہے! آپ کا ارشاد تھا کہ قرآن کا حکم اٹل ہے، عورتیں پردے میں رہیں گی۔ مگر عورتوں نے برقعے جلا ڈالے! آپ فرماتے تھے کہ اسلام کا بل بال ہوا گا اور مسجدیں آباد رہیں گی مگر مسجدیں تو اب برائے نام آباد ہیں! آپ کا کہنا تھا کہ خان و ملا بے اور سوداگر ہمارے ملک کے آقا ہیں، مگر آج وہ سب معدوم ہیں! استاذی! آپ کی ساری پیشین گوئیاں جن کے خیال سے بھی منکلی ہوتی ہے کیا ہوئیں!“

ایک دوسرا ازبکستانی دہقان شاعر لینن پر اپنی نظم میں کہتا ہے:-

”جڑیں باقی ہو چکا رہے تو سفیدار کے درخت پہاڑی سے بھی اونچے ٹکل جاتے ہیں! ریگستان کی ساری ریت اور پائیر کے ٹیلے بھی سمندر کو نہیں پاٹ سکتے۔“

”ہولناک جرم کو کے یا بڑی خیرات کو کے آدمی لوگوں کو اپنا نام یاد کرادے سکتا ہے، کو یہ جرائم کو دیکھ کر دنیا اکثر لرز گئی ہے، لیکن نیک عمل انسان چند ہی ہوتے ہیں!“

”پائیر کی چوٹیاں زمیں دوز ہو جائیں، ساری دنیا سمندر بن جائے، اور پھر پائیر سے دس ٹن اونچے پہاڑ ٹکڑے ہو جائیں، مگر زمانہ کی آہنی رفتار نہیں رک سکتی!“

”انسان اپنے بزرگوں کو بھلا دے سکتا ہے، اپنی مادری زبان کو بھی فراموش کر دے سکتا ہے لیکن وہ لینن کا نام فراموش نہیں کر سکتا! سب سے بڑے انسان کا نام بھلا نہیں جاسکتا! کیا لینن نے جنگ کو فوراً نہیں روک دیا؟ کیا اس نے ہمارے آسمانوں پر پوچھے؟ کیا اس نے اپنی روح کی کھڑوں سے ہمارے دلوں کو نہیں گرایا؟ اور کیا اس نے انسانیت کی چونک یعنی ذمہ داروں کو فنا نہیں کر دیا؟

”ہم نہیں جانتے کہ لینن میں بے پناہ طاقت کہاں سے آئی، ہماری کردور نظریں اس عظیم شخصیت کی روح کو نہیں دیکھ سکتیں، ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ دنیا نے اس سے زیادہ بڑے دل و دماغ کا انسان پیدا نہیں کیا!“

”ہم جی رہے ہیں، اس لئے جیتے ہیں کہ اس عظیم انسان ہمیر کی ذات سے حقیر سی مناسبت پیدا کر لیں!“

شاعر سلیمانی، اصلاح و تعمیر کے دور میں رجعت پرست عناصر کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے:-

ایک جماعت — ہم مورچے پر جا رہے ہیں، جنگی مورچے پر برقعہ و چادر کے خلاف جنگ کرنے جا رہے ہیں! ہماری سرحد پر بننے والا مشرق کس لئے!

ہم اپنی بیویں اور بچوں کی زندگی اور آزادی کے لئے جنگ کر رہے ہیں !
دوسری جماعت - گر چہ تو دنیا کے چورنگ جاکر بھی برطانوی جھنڈا اٹھا لیتے ہیں ! اور ہمارے بھائیوں کو قتل کر کے غری کی نذرانہ پہناتے ہیں
اب آنکھوں کو موند دیتے ہیں جو ان کی کینٹنی کی شاد ہیں !

پہلی جماعت - چین ! ہندوستان ! تم تمہیں آزادی دلانے کو لڑ رہے ہیں !
دوسری جماعت - لیکن چین دہند تو سامراج کے لئے بلاؤ کی تاب ہے !

پہلی جماعت - اب ہمارے یہاں آمر دلا اور بے کے لئے ٹھکانا نہیں رہا ! جس خدا کے خدمت گار ایسے ہوں اس خالقِ سرور سے میرا نہیں ہے !
دوسری جماعت - لاہور آئیں تو زمین کے پرے پرے کے کاؤ جو غریب کی خمیدہ کمر پر لاد دیا تھا ؟ ہندو کسان کے بچے کا بلاس غولہ کڑا ہے !

پہلی جماعت - جی ہمارے اشناؤں کے لئے نئی دنیا کا دار وازہ کھول رہے ہیں !
دوسری جماعت - جنت ! تو ہماری گردنوں پر اپنا جہاز لادے رکھنا اور گولی گولے کا تاشاد کھانا جاتا ہے !

دونوں جماعتیں ٹھکر - وراہد سنا ہے اور سورج طلوع ہو رہا ہے ! ہم کہتے کر ٹیک و بکر کھانا اور رشتہ کوڑا !

انجمنی شاعر لہوتی کا شمار صرف سوویٹ یونین میں نہیں بلکہ ساری دنیا کے چوہ بندہ - خدوں میں سے کیا جاتا ہے - سوویٹ یونین میں
اس در مقبولیت کا یہ عالم ہے دورِ غلوہ دیہاتی علاقے بھی اسے دھوکے اور اس کے لئے آسکے بچھاتے ہیں - لاہوتی اپنی ایک نظم میں بادشاہ سے مکالمہ کرتے ہیں :

شاہ نے کہا ! دو حقیقتوں کی جنگ شناس رہا ہوں : تم دونوں کے لئے غلوہ دیتے ہو - دنیا میں امیری و غریبی ، تو گری و غناہی ، دونوں غریبی
ہیں ! ہمدردی شکر واجب ہے ! - دنیا کے ناقوت نے دنیا کو غلوں کے فصل دے - ! - دنیا کے غلوہ تو نے دنیا کو روٹی کھلائی ، شاہ شش !

" میں نے بادشاہ کو جواب دیا ، حق کا ذب بوڑھے ، تیری باتیں جھڑت ہیں - ہر چیز دھقان و مزدور کے ہاتھ پر کر کے ہیں ، اگلی شقت
مقدس ہے ! - تیری گندی کھواس ، تیرے غلوں کی یہ دوکان ، تیرے غریبوں کا یہ کارخانہ اور ناپاکی کی یہ کچھال ، تیرا سب کچھ جتنی ہندو قتل کے

گیت میں فنا ہو جاتا تھا ! اور یہ ہندو قتل کسان و مزدور کے ہاتھوں میں ہوں گی - وقت آگیا ہے اور ہمارے بازو طاقتور ہیں ! - تمہاری خاک سے
ایک بنالائیات پات کا سلج ، ایک نئی دنیا پیدا ہوگی ۔

لاہوتی کی ایک دوسری نظم وسط ایشیا کی نئی اپرٹ کی آئینہ دار ہے ، جس کی صفت دیکر بھی جدید ہے - اس پیکر کو سوویٹ ادب میں " پرتو نامی " کا نام دیا گیا ہے -

سینٹرل کیونسٹ پارٹی کے آرگن ، اخبار پر آوا کو لاہوتی نے ایک رپورٹ نظم میں بھیجی تھی :-

" ایک تاش میں تین کاسک روز افزوں پھینکا جا رہا ہے - آدمی سب بدل گئے ہیں ، ہر شخص اشتراکیت کا محل کھڑا کرنے میں لگا ہوا ہے !

خود بھی غلام زندہ دار ، کل ایک جن لوگوں کو پاؤں سے روندنا تھا ، وہ عوام آج اشتراکیت کا محل جن رہے ہیں ! وہ عوام جو کھانے کے جال اور
پہننے میں پھنسے ہوئے تھے حیرت ہے کہ کلاس کے دکھا رہے ہیں !

علیہ کل ایک بادل کی کواک سے آنکھیں مچھلتی اور جی کی طرح کا پٹنے لگتی تھی ، وہی علیہ آج علم و سائنس پر آغائی کر رہی ہے ؟ حضرت کی
قوتیں اس کی لڑکیاں بن گئی ہیں اور اس کی نرم دازک آنکھیاں ریڈیو سیٹ طیارہ پر بھی ہیں -

ترسمی بھی علیہ سے بچے نہیں ، لکڑی کے دقیاؤسی ہل کو چھوڑ کر اب ترسموں ٹریکٹر چلا رہا ہے ، اس کے دماغ میں چل پیدا ہوگئی وہ ہر وقت
اچے کی پٹنے لگا ہے - مٹی نئی باتیں نکالتا ہے !

یہ اسی اشاروں سے بتا چکا ہے کہ سوویٹ مشرق میں باقی ایشیا کی آزادی کے لئے کتنی تڑپ ہے - اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام دوسرے مذہب والوں
لانیوں سکھات - نیز اشتراکیت سچے انسانی بھائی چارہ کی تعلیم دیتی ہے -

جن پگڑیوں پر کل تک اونٹ اور غمراہ گئے چلتے تھے، ان راستوں پر آج کارکنوں کے طوفان امنڈ رہے اور موٹریں اور ٹرک دھڑکتے پھر رہے ہیں! نیچے ٹرک ہیں اور اوپر ہوائی جہاز!

بیکار گریستان کی طرح کی بیکار باتیں اب سب مفقود ہیں، اب نہ وہ مشرقی غنودگی ہے نہ سست رفتاری! اب وقت کا ہر لمحہ کام کا ہے اور انگلیں دستکام کا دور دورہ ہے!

سست قدم ہل کے پیچھے گنگنا آ جانے والا، آنکھیں موند کر دنیا چلانے والا، اور اونگھتے اونگھتے بونی کرنے والا، ترسوں آج غائب ہے تو قہقہے کیوں ہو! آج کا ترسوں مفقود ہے اور نہ اونگھتا ہے، مشین کا موٹر اسے ہر وقت خوش اور چمک رکھتا ہے!

سستی اور بے دلی پرانی باتیں ہیں، آج ہماری نظر دور دکھتی ہے، ہم مستقبل کا پیغام سن رہے ہیں! آج ہمارے بولوں میں جان ہے۔ ہمارے گیت ذہنیات ہیں!

کامریڈ پرائڈ، شاعر کی ان باتوں کو یاد ہوائی نہ سمجھو، حقیقی زندگی کی رپورٹ ہے! شاعر اپنی اشتراکیت کو گواہ کر کے کہتا ہے کہ اب ہمارا دھقان "میرا گیت" نہیں کہتا اب تو ہر چیز "ہماری" ہو گئی ہے! اسی طرح جیسے ہمارا "ہماری" ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔ آج ذہنی تہوار روزہ (عید) ہے۔ پرانے زمانے میں آج کے دن گنوار کھیت سونے ہو جاتے اور مسجدیں بھر جاتی تھیں۔ لیکن آج "روزہ" کا کسی کو خیال بھی نہیں ہے، اب ہمارے لوگ غلام انسی کی یاد بھی کرنا نہیں چاہتے۔

آج ہمارے اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں "برگنڈ" اور "شاک در کرس" کے لفظ بولے جاتے ہیں۔ باؤ زندگی میں گھوڑے پر صحت اس دن سوار ہوئی جس دن شادی کے بعد کے سے رخصت ہوئی تھی۔ آج کی باؤ روزمرہ میں پرسوار ہو کر اسکول جاتی ہے۔

کامریڈ، آپ ہمارے کسی آدمی سے بھی پوچھئے کہ تمہارا بیڈ روم کون ہے؟ تو دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کر دے گا۔ اس کی تصویر کی طرف جس سے ہمیں محبت ہے اور ہم جس کا احترام کرتے ہیں۔

علی قیوم بابائیت، اگر تمہیں شاعر کسی مٹی کے عالم میں وطنی ترانہ الاپتا ہے:-

"منحوس دشمن پر ہماری فتح دھڑکاؤ طوفان پھٹ پڑا ہے! میں اُس لمحے کی عزت کرتا ہوں! اس طوفان نے ہماری بیڑیاں کاٹ دیں غلامی کو آڑا دیا کہ وہ جنگی علم بلند کریں! میں اُس پر غفلت دن کا خیر مقدم کرتا ہوں۔۔۔ ادیل اکتوبر کے دن کا!

سرزمین وطن میں دن رات تیری حفاظت کرنے کا عہد کرتا ہوں!"

ادین صابروفا، ازبک شاعر، وطن کی سب سے بیش قیمت پیداوار، کمپاس کا قصیدہ پڑھتی ہے:-

"آزاد دھقان! تمہارا دل نہیں دھڑکتا کہ اب تمہاری رادیاں اور کھیتیاں سرسبز شاداب ہوں گی؟ یہ ایک دلگیر خواب کے پروں پر اڑتا نہیں! اب تم کو ہم ہمارے سینے پر مشقت کیا کرو گے! اب ہل اور بھاؤ سے نہیں! اب تمہاری زراعت بڑی بڑی مشینیں کریں گی! دھقانو! آج تم مسرت کے آقا ہو اور تمہارا عزم دار دہ دنیا کی صورت بدل دے گا! ٹرک پر تمہارا دوست ہے اور تم خود اپنے آقا! آرازی مطلقا تمہاری اپنی ہے! اب تمہارے چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں!"

علی بے، ترکمان شاعر جب سرزمین وطن پر نہیں جاری دیکھتا ہے تو غمزدہ مسرت سے چیخ اٹھتا ہے:-

"کون لایا، ہمارے گریستان میں یہ سرور اور گاتی سولی نہیں کوئی لایا؟۔۔۔ پینتخ (ندی) کے طوفانی دھارے کو کس نے سدھایا؟۔۔۔ ہمارے مفکر اور دکھی دھقانوں کے لئے یہ راحت و مسرت کون لایا؟۔۔۔ اتر کے رہنے والے لائے! شانوی سے بھری آزادی دلانے والے لائے!۔۔۔ مارکس اور لینن والے۔۔۔ بولشویک لائے!"

ایک معلوم تاجیک شاعر نے اچھڑانے، سامنت شاہی اور سماج داد۔۔۔ یورپ و ایشیا کا معرکہ اس طرح نقش کرتا ہے:-

”میں نہ لائن چاہتا ہوں نہ پے (زمیندار) اور آجر، میں نہ حق ادا نہ ہمارا، درخشاں بننا چاہتا ہوں نہ ریشم میں بیوی تاجر زادہ! میں اپنے چہرے، بر رنگ و روغن چڑھا نا نہیں چاہتا، میں نہ ناؤ کا مالک بننا چاہتا ہوں نہ امیر و تحصیلدار! میں نہ بوڑھے بوڑھوں، طیب بننا چاہتا ہوں نہ بازاریں ایک دوکان کا مالک، میں نہ توذاکر بنوں گا یا لبریرین اور یا بخر! میں وہ بننا چاہتا ہوں جو تین لاکھ فنکوں میں لوگوں کے ذہن و خیال کے اندر خم مری کر سکے جس طرح وہ مقام زمین میں تاج بنائے! میں عوام کا کیسا بننا چاہتا ہوں!“

ایک تاجیک لوگ گیت میں شاعر قومی کردار کو اس طرح بیان کرتا ہے:-

”ہم تاجیک جو چہرہ دیکھتے ہیں اسی کا گیت گاتے ہیں — ہمارے سامنے گھوڑا آتا ہے تو اس کا گیت بناتے ہیں —

اور ہمارے گیت غیر اس کلام شاعروں کے بنائے ہوئے ہیں — ایک گیت جو زمانہ کی یاد رکی لوٹ پر پچھتے اور دھوکے ہیں! —

پرانے شاعر سنوانی حسن و جمال اور گل و بلبل کے گیت گاتے تھے — ہمارے مئی کے شاعر نئی زندگی اور آزادی کے نوازے گاتے ہیں! —

حسین مستقیل کا، مبین اور ہوائی جہاز کے گیت! — اور وہ سب سے زیادہ لیکن کا گیت گاتے ہیں، کیونکہ وہ تو کوئی گیت گایا ہی نہ جاتا! —

وہی ننانوں اور امیروں کے قصیدے بچے جاتے! — ہمارے شاعروں کو لیکن نے بچہ دیا کہ وہ جس کا جاؤں گیت گائیں! اور وہ سب لیکن کا گیت گاتے لگے!“

سہیلی بھی ایک تاجیک شاعر ہے اور حیات نو کا قصیدہ خواں! کہتا ہے:-

”تم ایک شہر دیکھو گے، فوشہ کے لباس کی طرح جگمگا تا ہوا شہر! — اور کتھرائی کا شام! بھی سنو گے!

سنو! ہوائی جہاز کا پٹنگھا گن گھنار ہے! وہ دیکھو، موٹر کس زائے کے ساتھ جا رہی ہے! یہاں لوگوں اور دھوئیں کے بادل کو اتنی ریلی

فراتے بھرتی جا رہی ہے!“

اسی نظم میں آگے چل کر سہیلی بجلی کی روشنی اور ٹرکیٹر کی غزل خوانی کرتا ہے:-

”دن ڈھلے سنو کہ وہ مقام کی جہیز بڑی سے کس گیت کی آواز آ رہی ہے، وہ گار ہے:- وہ دیکھو آسمان پر آزادی کا سورج چمک رہا ہے!

نہوں کا آزاد بانی ہماری دادی میں سرست! قرآن گنگنا تا جا رہا ہے! سو دیت شہری گاتے پھر رہے ہیں — ہر طرف گاتے پھر رہے ہیں!“

اور آگے چل کر سہیلی سوال کرتا ہے:-

”سن رہے ہو تم، آزاد و بلکستان کی پرست آواز! — بلکستان! تیری شان و عظمت کا، تیری خوشیوں کا زمانہ آگیا! — اے میرے

بلکستانی تاجکستان! تیری سرتوں کی ساعت آگئی!“

بروی قد بابائے ترکمان شاعر، انقلاب کی سرحدوں میں سالگرہ پر اپنے دوستوں کو مبارکباد دیتا ہے:-

”آج میں چلتی کلیوں کھلتے پھولوں کا گیت گاتا ہوں کہ پرانی دنیا دفن ہو چکی ہے!

میرے ہاتھ میں یہ سرخ گلاب نہیں، فوٹو لوہے کے ہیں!

ہم نے اپنے وطن کی زمین کو نانوں اور امیروں کا خون پلایا ہے، اور اس خشک سالی کے بعد چراغِ دفن ہے، یہ تازہ گلاب پھولے ہیں!

آسمان پر سورج بھی نیا نکلا ہے، نئی زندگی کا سونچ! جو سب سے زیادہ خوبصورت ہے! ایک دو... دس گیارہ... سو سو سترہ!

ایک کے بعد دو سرگز کرتے ہوئے پورے سترہ سال گزر گئے! اور جہد و کوشش کا دھارا تیز تر ہوتا گیا، یہاں تک کہ میرے محبوب بھی ترکمانہ۔

سو دیت ترکمانیہ، میں زندگی سرت کا پھول بن کر کھلتے لگی!

اے! وطن عزیز، زندگی کے اس شگفتہ پھول کو لے! اور اس کی خوشبو سے ہر دم کو شتر ایک کا معطر دی بنائے!“

لطیف الدین احمد

ادب لکاتب الشاعر

(افادات علی حیدر طباطبائی نظم مرحوم)

ادنی تغیر کے ساتھ

شاعر و ادیب کو دینی اور لکھنؤ کے اختلافات سے بھی مطلع ہونا چاہئے تاکہ جو جس زبان کا متبع کرتا ہو اس سے ملحد نہ ہو جائے۔ ان دونوں شہروں کے لحجہ میں تو بڑا اختلاف ہو گیا ہے لیکن الفاظ و محاورات میں زیادہ اختلافات نہیں ہے۔ جن باتوں میں اختلاف ہے اس کا استیعاب کسی نے نہیں کیا۔ مجھے جو اختلاف معلوم ہیں لکھتا ہوں۔ اکثر یہ اختلاف مرزا داغ مرحوم اور اہل دہلی کے بعض دوسرے اصحاب سے معلوم ہوئے بشکلاً ایک دفعہ انھوں نے کہا کہ لکھنؤ میں ہمارے یہاں بولتے ہیں دلی میں ہمارے ہاں کہتے ہیں اور یہی صحیح ہے۔ یہ سن کر میں نے اس بات کا تھکس کیا تو معلوم ہوا کہ دہلی میں بھی محاورہ ہمارے یہاں اور ہمارے ہاں دونوں ہیں۔ میر کا دیوان جو کلاتہ میں چھپا ہے اور قرون کا چھپا ہوا ہے اس میں حاجبا ہمارے ہاں اور ان کے ہاں موجود ہے، میں نے میر تقی میر مرحوم سے پوچھا تو انھوں نے کہا ہم تو جب کہیں گے ہمارے یہاں کہیں گے۔ صبا کہتے ہیں:-

”لیلۃ القدر ہے بندہ کے یہاں آج کی رات“

اسی طرح مرزا داغ مرحوم ایک دفعہ کہنے لگے کہ زیور گھر نادہلی کا محاورہ ہے، اہل لکھنؤ نے اس میں تصرف کر دیا اور گڑھنا کہنے لگے، لیکن نفس سے معلوم ہوا کہ اصل لفظ گڑھنا ہی ہے اور پہلے دہلی کا محاورہ ہی تھا۔ قدرت افندہ شوق سنبھلی نے ”شہادہ“ میں طبقات الشعرا تصنیف کی ہے۔ تصنیف کے بائیس برس بعد کا لکھا ہوا نسخہ میر تقی میر کا موجود ہے، ظاہر ہے کہ یہ نسخہ سو برس سے زیادہ کا لکھا ہوا ہے اس میں امیر خسرو دہلوی کے دو شعر درج ہیں اور دونوں شعروں میں گڑھنے کا لفظ آیا ہے:-

کچھ گڑھنے سمنوارے بکا را

زور گھر پسرے چو ماہ پارا

آخر نہ گڑھنا نہ کچھ سمنوارا

نقد دلی من گرفت و بنگست

اتیس مرحوم سے میں نے ایک دفعہ ذکر کیا کہ میر محمد حسین آزاد، مالا کی جمعہ مالا میں کہتے ہیں، انھوں نے کہا کہ مالا، دہلی کی زبان پر مبنی

ہے لیکن میر حسن کی شہنشاہی میں یہ شعر موجود ہے:-

وہ موتی کے اے ٹپتے ہوئے رہیں دل جہاں سبز چٹکتے ہوئے

میں نے یہ شعر انھیں سنایا اور انھوں نے بہت تعجب کیا۔ ایک دفعہ ان مرحوم سے میں نے پوچھا کہ لکھنؤ کی زبان کے کچھ الفاظ ایسے تھے جو دہلی میں نہ پائے جاتے ہوں اور اہل دہلی ان لفظوں کو گروہ سمجھتے ہوں، کچھ سوچ کر کہنے لگے کہ یہ محاورہ لکھنؤ کا کہ ”یہ کام مجھے کھلتا ہے“ مجھے بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے جن اطفال سے مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب ابن الوقت ایک صاحب دیکھتے تھے وہ میرے پاس لے آئے اور پوچھنے لگے کہ کھتر کیا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں، اسے دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ کھتر کی جگہ پر دہلی میں کھتر آتے ہیں۔

ایک نقل اور مجھے یاد آئی انھیں مرحوم کی فرمائش سے میں کچھ شعر پڑھا رہا تھا صحبت بے تکلف تھی میں نے پڑھا:-

لگا دے تیرے پر مجھ کو بقیراری دل کو نہ کہ بھل میں گروں جا کے اپنی منزل پر

کہنے لگے دہلی میں منہ کیل کہیں گے میں نے کہا کہ لکھنؤ میں تو سب منہ کے بھل کہتے ہیں اس پر انھوں نے کہا کہ میر گمان ہے کہ میر تقی میر نے کہیں نہ کہا ہوگا۔

میر انیس کی رباعی کا یہ مصرع میں نے پڑھا ۶ ”گر پاؤں تھکے تو سر کے بھل جاؤں گا“
 مرزا داغ مرحوم تذکرہ آب حیات کو کچھ اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ مصنف نے بھی تو بڑی نا انصافی کی کہ ذوق کے ضمن میں بھی داغ کا ذکر نہیں کیا۔ آزاد کے اس فقرہ پر غصہ چینی ہو رہی تھی کہ اہل لکھنؤ کھانے کا ہوتا تھا کہ کہتے ہیں اور پینے کا ہوتا تھا کہ بولتے ہیں۔ میں نے کہا صاحب وہ تو بڑے محقق معلوم ہوتے ہیں وہ تو اندھیاری رات کا بھی انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دلی کی زبان میں گھوڑے ہی کا اندھہ آری کو اندھیاری کہتے ہیں۔
 اندھیاری رات کہنا خلاف محاورہ اردو ہے مرزا داغ مرحوم نے کہا یہ تو ٹھیک لکھا ہے۔ میں اسی زمانہ میں سودا کا دیوان پڑھ رہا تھا، کو تو ال کی جو ملک جب مقام درس پہنچا تو یہ شعر دیکھنے میں آیا:-

ہوئی کب تک بچا فخر داری چور جاتے رہے کہ اندھیاری
 پھر ملاقات ہوئی تو یہ شعر میں نے انھیں سنایا اور یہ ثابت کر دیا کہ اندھیاری رات دلی کی زبان ہے۔ جواب نہ بولتے ہوں یا لکھنؤ کے مقابلہ میں ترک کر دیا ہو۔

یادش بخیر آغا شاعر دہلوی بڑے خوش فکر و صاحب دیوان مرزا داغ مرحوم کے انصاف تلامذہ میں ہیں۔ ایک دفعہ مجھے راہ میں ٹھہر کر کہنے لگے کہ یہ مصرع کیسا ہے:- ”ہونٹ سل جاتے ہیں جب سامنے تو ہوتا ہے۔“ میں نے کہا ہم تو یوں کہیں گے:- ”ہونٹ سی جاتے ہیں جب سامنے تو ہوتا ہے“ یہ سنا کر کچھ افسردہ ہو کر کہنے لگے کہ استاد نے بھی یہی بنا دیا ہے۔ میں نے کہا آپ نے ان سے کیوں نہ کہا کہ سل جانا، دھل جانا دلی کا محاورہ ہے اور سی جانا، دھو جانا لکھنؤ کی زبان ہے، ہم کیوں لکھنؤ کی زبان کا متبع کریں۔ ہنس کر کہنے لگے میں نے بھی کہا تھا مگر استاد پر ہم ہونگے اور فرمایا کہ ہم نے پھر استاد ذوق سے ایک دفعہ ایسی ہی بحث کی تھی تو انھوں نے ایک تمبیڑ مارا، جو لوگ تحقیق زبان اردو کا شوق رکھتے ہیں ان کو استاد شاکر دلی یہ اصلاح و بحث نظر غور سے دیکھنا چاہئے۔

مرزا داغ مرحوم کہتے تھے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا سانس اور فکر کا لفظ ذکر ہی بولے سنا مگر استاد ذوق نے جب سانس کو نظم کیا مونٹ نظم کیا بلکہ بادشاہ کی خروں میں بھی اُسے مونٹ کر دیا اور فرماتے تھے کہ میر کی زبان پر بھی یہ لفظ مونٹ ہی تھا اور مرزا غالب نے مجھے: پخت کی ہے کہ فکر کو بھی مونٹ ہی نظم کیا کرو۔

نون غنہ زیادہ کہتے ہیں۔ بیسے کوئیل۔ جھونٹ۔ سینکڑوں۔ تنو نلا (یعنی درخت کا تنہا) مرزا
 باندھا وغیرہ لکھنؤ کے لہجہ میں ان الفاظ میں نون غنہ لفظوں میں تو بولتے ہیں مثلاً بوجھاڑ آئی، کراؤڑوں بونڈیاں ٹنگی
 میں نے میر جہدی بخروج مرحوم کے کلام میں کواڑ کا قافیہ بچھاڑ دیکھا ہے۔ دلی میں جہڑت کا قافیہ کواڑ
 لگتے ہیں۔ لکھنؤ میں جہڑت کا لفظ بضم میم بولتے ہیں۔ انیس کو وہ لوگ بہ تشدید آ اور لکھنؤ میں بہ تخفیف تا بولتے ہیں۔ گھینچنا وہ لوگ بے جھوا
 کے ساتھ بولتے ہیں، اور لکھنؤ میں بغیر کان۔ کچھ الفاظ دلی کی زبان کے ایسے بھی ہیں کہ لکھنؤ میں بولے نہیں جاتے مثلاً
 گھنڈی بھڑت ہو گیا۔ پا لکھنؤ کرتا ہے۔ کڑی جالہ پورتی ہے۔ اور ٹوپی اوٹھنا۔ اس طرح ہتھیار بچنے کو ہتھیار جانا۔ ٹلیک نکل جانا۔
 پترے کھولنا۔ رونگے ہوجانا۔ بڑکنا۔ اور ٹسا۔ چھینے سے چھون اور دھکے سے دھکھن اور ہولنا ہولنا یعنی آہستہ آہستہ لکھنؤ میں کوئی نہیں بولتا
 مجروح کہتے ہیں:- رشک اعدا کا گھن مرے دل کو ہولے ہی ہولے کھائے جاتا ہے

مرزا قادر بخش سا بر شاہزادہ دہلوی کے کلام میں بل جانا، صدے ہو جانے کے معنی پر میں نے دیکھا۔ شخراے دلی تیوری اور ڈیوڑھی وغیرہ
 تی کو وزن میں داخل کرتے ہیں اور اہل لکھنؤ کے لہجہ میں تی کو معدود سمجھتے ہیں۔ بخروج دہلوی نے پیاسے کی سی کو بھی وزن شعر میں داخل کر دیا ہے
 یہاں ہیں آب خنجر کے پیاسے بجھے کیا لٹکلی آب بٹاسے

یہ سب تو لفظی اختلافات تھے ایک بڑا نحوی اختلاف بھی دونوں زبانوں میں ہے یعنی حرف تے کو دلی میں حرف انصاف کے معنی میں بولتے ہیں جو
 زمانہ میں دیوان غالب کی شرح میں لکھ رہا تھا اس بات پر جی جھے متنبہ ہوا لیکن میں سمجھا کہ اس طرح کاتے حال میں پیدا ہو گیا ہے اور اہل پنجاب

کی صحبت کا اثر ہے مگر ہر ظفر بادشاہ طالب شہزاد کے دیوان میں، جا بجا یہی (نے) دیکھنے میں آیا اور اس سے پتہ لگا کہ موت سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے۔ یہ پنجاب کا محاورہ بادشاہ کی زبان پر بھی چڑھا ہوا تھا۔

ہم نے ہے خوب اس کی طرز ناز پچانی ہوئی جال پچانی ہوئی آواز پچانی ہوئی
 نیلے دل کو جان تو چھوڑے اگر امکان کیا خوب ہی ہم نے تجھے ہے دستاں دیکھا ہوا

مگر دہلی کو اس امر سے سبق لینا چاہئے کہ وہاں کے تمام شعرا ممنون - ذوق - مومن - غالب نے کیوں اس محاورے سے احتراز کیا اور ان کے بعد اصغر علی خاں نسیم، مرزا قادر بخش صاحب، میر محمدی مجروح، نواب مرزا داغ نے کہیں بھی اس طرح سے آنے کو استعمال نہیں کیا۔

سالک دہلوی، مرزا فوشہ کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ حیدر آباد میں، مرحوم ہو گئے۔ اکثر ان کا کلام میں نے سنا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑا اس طرح (نے) استعمال انھوں نے کیا ہو۔ یہ تو سب لوگ، اہل فن اور اہل زبان ہیں۔ ان لوگوں کا اس لفظ کو استعمال نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ محاورہ پنجاب کا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ظفر کی ایک غزل کا ردیف وقافیہ ہے۔ کہا جھوٹے موٹ - وفا جھوٹے موٹ یہ دہلی کا خاص محاورہ ہے اور لکھنؤ میں جھوٹے موٹ کہتے ہیں۔ بزرگ محض لکھنؤ میں پڑے ہیں۔ دہلی کے لکھنوی کہتے ہیں: "لوٹا ہے دن دھاڑے یہ انھیں ہو گیا"۔ دہلی میں دن دے کہیں گے۔ لکھنؤ کا زردہ، میٹھے چانول اور دہلی کا زردہ کھانے کا متباکو۔ لکھنؤ میں کہیں گے زمین گھومتی ہے لیکن دہلی میں گھومتے کا لفظ ہی نہیں ہوتا۔ چند الفاظ اختلافات دہلی و لکھنؤ کے متعلق اور یاد آگئے مثلاً اہل لکھنؤ بڑی کو راہیڑی - کن پڑی کو کول - سناؤنی کو سانی لاکھنے کو ناگنا - ناک سینکے کو ناک چنگنا - جولاہی کو جولاہن - سناری کو سنا رہن کہتے ہیں اور یہ بیان ان کا بہت درست ہے۔ لیکن ایک رسالہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اہل لکھنؤ آٹھنسی کو پرسی - دھوبی کو برٹھا، چھو کرے کو بردا - گولے کو بوڑلا - تمباکو کو بھسا کو - گھارے کو دھنگار - ہمارے کو کہا دن - لنگوٹیا یا کو لنگوٹیل یا - بانس کو بہتر کہتے ہیں - بالکل غلط ہے۔ لکھنؤ کی زبان کے یہ الفاظ نہیں ہیں۔ لیکن کے بہتر کو دھنگانا یعنی دھوئیں کی بو اس میں پیدا کرتا۔ لکھنؤ میں کوئی نہیں کہتا۔ بوڑلے کی ہوا ہوتے ہیں، لیکن گولہ یا بولہ اور چیز ہے۔

ہی کا استعمال اہل دہلی اس طرح بھی کرتے ہیں کہ حرون معنویہ کے بعد اُسے لے آتے ہیں مثلاً ہم نے ہی لکھا۔ تم نے ہی پڑھا۔ اسے ہی سنا اہل لکھنؤ ہمیشہ ہی کو مقدم کر کے کہتے ہیں۔ جیسے ہمیں نے لکھا۔ تمھیں نے سنا۔ اسی نے پڑھا یا مثلاً وہ کہیں گے دلی کی دل میں ہی رہی۔ اور کہیں گے دلی کی دل میں ہی رہی۔ مومن خاں صاحب کہتے ہیں کہ

کچ داروہ مرز کب تلک یوں ساقی مجھے دے شراب نگلوں

لکھنؤ میں یوں، دول، کیوں، جول یہ سب الفاظ بڑاؤ مجھول بولے جاتے ہیں۔ دہلی میں اپنے آپ کو بولتے ہیں۔ لکھنؤ میں اپنے کو یا اپنے تئیں کہیں گے۔ پیر نے اور تیر تئیں بھی کسی قدر اختلاف ہے تذکرہ تائینٹ کے رسالے جو لوگوں نے لکھے ہیں اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر لفظوں میں دہلی و لکھنؤ کے محاورے میں اختلاف ہے مگر ایسا نہیں ہے اختلاف محاورہ اس لفظ میں مسلم ہے جو لفظ محاورہ عام میں داخل ہو۔ جیسے سانس اور فکر کی تذکرہ تائینٹ میں دونوں شہروں میں اختلاف ہے یا جو لفظ محاورہ خاص میں داخل ہو۔ جیسے عارض و گیسو کی تذکرہ اور شمشیر و سنان کی تائینٹ شعرا کے محاورہ میں داخل ہو گئی ہے ایسے الفاظ میں بھی اگر دہلی و لکھنؤ میں اختلاف ہو تو البتہ اسے بھی اختلاف کہیں گے وجہ اس کی یہ ہے کہ کو اس قسم کے الفاظ محاورہ عام میں داخل نہیں ہیں۔ اہل شہر ان الفاظ کو بولتے نہیں ہیں۔ لیکن سمجھتے تو ہیں۔ اس کے سوا جتنے الفاظ مجھول ان میں دہلی و لکھنؤ کا اختلاف قابل اعتبار نہیں۔ اسے اختلاف محاورہ کہہ سکتے ہیں۔ پہلا مانوس و غیر مشہور الفاظ میں محاورہ

لے ہم لوگ اور کوٹھینا، وہ اور کوٹوں بیٹھا بنوں غز بولتے ہیں۔ ہم چنگ لینا بیٹے مجھول بولتے ہیں وہ لوگ چنگ یاے معروہ کے ساتھ کہتے ہیں ہم ترزا کہتے ہیں وہ ترنگ بولتے ہیں۔

کیا دخل ہے جو جس طرح چاہتا ہے استعمال کر لیتا ہے۔ ایسے الفاظ میں کسی کو وہی دلکھنوں کی تقلید کرنا کچھ ضرور نہیں۔ اہل لکھنؤ اور اہل دہلی خود ایک دوسرے کے ساتھ لفظوں میں اختلافات ظہور رکھتے ہیں اور یہ اختلافات آٹھ تو کیونکر آٹھ۔ مدار محاورہ پر ہے۔

لفظ طرز، لکھنؤ دہلی میں کسی زمانہ میں مونث تھا اور اب بعض شعرا جو اپنے اساتذہ کی تقلید کو محاورہ حال پر مقدم سمجھتے ہیں وہ مونث نظم کر جاتے ہیں ورنہ دونوں جگہ کے محاورے میں مذکر ہے۔ میں نے اکثر اہل دہلی کی تقریر و تحریر میں مثل سر سید احمد خاں مرحوم کے اس لفظ کو تذکرہ دیکھا۔ بلکہ اگلے زمانہ میں بھی یہ لفظ دہلی میں تذکرہ مستعمل ہوا ہے۔ شاہ عالم بادشاہ آفتاب دہلی کا یہ مطلع صغیر بلگرامی نے رشحات میں لکھا ہے :-

جب سامنے مرے وہ پر نر زاد آگیا ، دیوانگی کا طرز مجھے یاد آگیا ،

لفظ مخلوق لوگوں میں اس مونث مشہور ہو گیا ہے لیکن لکھنؤ کے محاورہ میں یہ لفظ مذکر صفت رکھتا ہے۔ کہتے ہیں آسمان خدا کا مخلوق ہے اور زمین خدا کی مخلوق ہے۔ لفظ نظیر کو لوگ عموماً مونث بولتے ہیں لیکن اہل لکھنؤ ذوی العقول کے مقابل میں مذکر بولتے ہیں۔ کہتے ہیں اس عورت کا نظیر نہیں میرے شفیق کرم حکیم میرضامن علی مرحوم جلال نے مجھ سے کچھ اشعار پڑھنے کی فرمائش کی۔ اس زمانہ میں منجملہ حضور مرشد زادہ مرشد آباد مشاعرے کیا کرتے تھے۔ انھیں کی طرح میں کچھ شعر میں نے بھی کہہ کر بھیج دئے تھے۔ وہی اشعار مجھے یاد آگئے۔ پڑھنے لگا۔ اور باصرہ میں نے کہا کہ اگر کوئی شعر لکھنے کے قابل ہو تو ضرور کہہ دیجیے گا۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو اعتراض سے بڑا مان جاتے ہیں۔ چنانچہ میرے اس شعر پر :

سر جو ٹکرا یا تو دیواروں کو رنگیں کر دیا ، اڑیاں رگڑیں تو صیقل ہو گئی زنجیر میں

جناب جلال صاحب نے کہا کہ صیقل مذکر ہے اور یہ فرمانا ان کا بعض اساتذہ کی تقلید کے لحاظ سے تھا ورنہ لفظ صیقل دہلی و لکھنؤ میں اب مونث بولا جاتا ہے۔

تذکرہ تائید الفاظ سے بحث کرنا اہل لغت کا کام ہے۔ لیکن میں اس مسئلہ میں بعض امور کا ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ صفت تذکرہ تائید میں موصوف کے تابع ہوا کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ تیز و ظروف و بعض متعلقات فعل تذکرہ تائید سے معتر ہوتے ہیں۔ مثلاً "تو نے اچھا کام کیا" اس جملہ میں اچھا صفت ہے اور کام موصوف۔ کام کے ذکر ہونے کی وجہ سے اچھا بھی اس مقام پر مذکر ہے۔ اگر یہ کہیں کہ "تو نے اچھا کیا" تو اچھا مذکر ہے۔ مونث ہے۔ اس سبب سے کہ اچھا اب صفت نہیں ہے، مثل اس کے کہ "تو نے جو کچھ کہا" میں یہ کہ "تو نے وہ خوب پڑھا" ان جملوں سے جو کچھ پڑھا وغیرہ کا ذکر ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ کہیں کہ سب جو کچھ پڑھا کھل گیا تو اس سے جو کچھ پڑھا کا ذکر ہونا ثابت ہو تا تو ایسے کہ یہاں تیز فعل نہیں۔ بلکہ فاعل ہے۔ مثل اسی کے ہے، اگر یہ کہیں کہ زید ایک دن آیا، اس جملہ میں دن تذکرہ تائید سے معتر ہے۔ اس سبب سے کہ ظرف فعل ہے تیرے یہ کہ اُردو میں بعض اسماء جزو فعل ہو جاتے ہیں اور اس صورت میں ان اسماء کو تذکرہ تائید سے یک تعلق نہیں رہتا مثلاً میں نے سبق یاد کیا۔ اس مثال میں یاد کا لفظ تذکرہ تائید معتر ہے۔ اُردو کی نحو میں بحث اہم مسائل سے ہے۔ گلگڑت کے سوا کسی نے ادھر توہ نہیں کی۔ چوتھے یہ کہ افعال ناقصہ کی خبر اور افعال مقلوب کا دوسرا مفعول یہ دونوں تذکرہ تائید سے معتر ہوتے ہیں۔ مثلاً اشک گوہر ہو گیا۔ اشک گوہر کر دیا۔ اشک کو گوہر سمجھنا۔ ان فقروں سے گوہر کی تذکرہ تائید نہیں ثابت ہو سکتی۔ پانچویں یہ کہ مضان ایہ کے بعد اگر مضان ہو تو دون معنویہ کے لحاظ سے مضان کی تائید میں کچھ تغیر نہیں ہوتا یعنی (کی) جو علامت تائید مضان ہے اس کا باقی رکھنا ضرور ہے۔ مثلاً :-

نور نظر کی آنکھوں میں سرمہ دیا۔ لیکن اگر ترکیب اضافی مقلوب ہو جائے۔ جیسے میرا نیس کے اس مصرعے میں ہے :-

"سرمہ دیا آنکھوں میں کبھی نور نظر کے۔ اس صورت میں (کی) کی جگہ کہنا بھی درست ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اس مصرعہ میں سے اگر (آنکھوں میں) حذف کر دیں تو یہ فقرہ باقی رہ جائے گا (سرمہ دیا کبھی نور نظر کے) اور اب (کے) کہنا واجب ہو جائے گا۔ جیسے لوگ کہتے ہیں اس کے لکھی کی اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ میں یا بالوں میں اسی طرح کہتے ہیں اس کے کہ لکھی کی یا اس کے چٹائی کی اور یہ مقصود ہوتا ہے کہ بعض میں

لے داغ کہتے ہیں :- طرز اپنا ہے جدا سب سے جدا کہتے ہیں

یا گردن میں۔ غرض کہ ضابطہ یہ ہے کہ ترکیب اضافی اپنی اصل پر ہو تو علامت تانیث مضان یعنی کی کہنا واجب ہے اور حذف و تقدیر مضان کی صورت میں (کے) کہنا واجب ہے۔ اور قلب ترکیب کی حالت میں دونوں طرح جائز ہے۔ انیس کے اس مصرع کو:-

میدان میں تھا حشر بجا حال سے اسکے

اور آتش کے اس شمر کو سے

معرفت میں اس خدا سے پاک کے اڑتے ہیں ہوش و حواس اور پاک کے صغیر لکڑی نے اس بات کی سند میں لکھا ہے کہ چال اور معرفت مذکور ہے۔ میں اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ میری رائے میں ان معرعوں میں کی اور کے دونوں کہہ سکتے ہیں۔ شاعر نے ضرورت شعر کے سبب سے کے اختیار کیا اور اسی قیاس پر برقی کا یہ مصرعہ:-

"داڑھی میں لال بال تھے اس بدنہاد کے" اور تیسرا یہ مصرعہ "آکھوں میں ہیں حقیر جس تس کے" غلط نہیں ہو سکتا۔ کلکتہ میں ایک صاحب کی غزل میرے پاس اصلاح کو آئی اس میں یہ مصرعہ تھا اور یہی زمین تھی:- "بھینگی کند آہ طون آسمان کے"۔ میں نے دیکھا کہ یہاں کی کہیں تو محاورہ کا خون ہوتا ہے یا نہیں رہنے دیا۔ اب چاہے کوئی غلط سمجھے لیکن لفظ طون میں محاورہ یہی ہے کہ اصل ترکیب باقی ہو تو کی کہیں کے اور قلب ترکیب کی صورت میں کے کہتے ہیں۔ بہاؤ عشق:- "جان پرین رہی ہمارے ہے" مر رہا ہو جگت کے مارے ہے۔

بلا ضرورت ہر زبان کا لفظ لے لینا بھی نہیں درست البتہ فارسی کا میل اردو میں حسن رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جو الفاظ عربیہ فارسی میں غلط ہو کر مخلوط ہو گئے ہیں ان کی تصحیح کرنا بھی نہ چاہئے اور بلا واسطہ الفاظ عربیہ کا لینا تو بہت نفیس ہے۔ لیکن فارسی زبان کے اسما و صفات ہی اردو میں کچھ اچھے معلوم ہوتے ہیں مصادر و روابط سے فضا کراہیت کرتے ہیں۔ یہ نہ چاہئے کہ درمیں انتظار آپ کا خطا پہنچا اور خیریت آپ کی درگاہ خدا سے نیک درکار ہے۔ بہت سے الفاظ جو ہنر مند و اہل کلام ہیں۔ فارسی غوافول کی زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ اور بعض عربی کے الفاظ بھی اسی قسم کے اہل کتب نے فارسی بڑھنے کی بدولت زبان میں داخل کر لئے ہیں۔ وہ سب کے سب کسی قدر فصاحت سے گرسے تو ہوتے ہیں مثلاً جو کہ اذ بسکہ ہرستی کو تحقیق کے حال آئنگے باوجودیکہ باوصفیکہ چنانچہ جزیں نیست ہر آئینہ قابل البعد پیش آئیں علاوہ بریں در پیش کار در اصل در حقیقت بر خلاف برعکس، برعکس بہ نسبت بہ موجب بدولت ہونہو نہیں۔ لہذا لایزال لاریب فی الحال بالفعل بالکل فہما حتی الوسع حتی المقدور بالمشافہہ بالموجہ نقطہ یعنی وغیرہ جس زمانے میں میر تقی میر مرحوم حیدر آباد میں تھے۔ انھیں دفن کا ذکر ہے کہ ایک صاحب ان کے کلام کو کلام تیسرے ترجیح دینے لگے، میر صاحب نے فرمایا کہ میر استاد کامل تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ کے اور ان کے کلام کا میں نے مقابلہ کر کے دیکھا آپ ہی کا کلام تفوق رکھتا ہے۔ میر صاحب کو تعجب ہوا کہ مرثیہ اور غزل کا کس طرح مقابلہ ہو سکتا ہے؟ اور راہ ہے وہ اور کچھ ہے۔ ان بزرگ نے تیسرا ایک مطلع پڑھا:-

اس زلف پہ بچو ہو گئے ہم یعنی سر شام سو گئے ہم
اور کہا کہ اس مطلع میں اس زلف اور یعنی کہ لاشعہ کیجئے اور اسی زمین میں آپ کا مطلع بھی کیجئے یاد ہے اس کی صفائی کو دیکھئے:-

ایک آہ میں سر ہو گئے ہم
تختہ ڈی جو ہوا تنہی سو گئے ہم

یہ سن کر میر انیس مسکرائے گئے۔

فارسی و عربی کے بعض الفاظ اردو میں غلط ہوئے جاتے ہیں۔ اور غلط ہی ہونا چاہئے بھی۔ ان کا صحیح کر کے ہونا ہندیوں کی زبان پر نفیس ہے۔ جیسے عیادت و عیال و عیال بکسر عین ہے۔ گرو بے بغور ہیں۔ ایک نقل میں نے سنی ہے کہ میر حکیم ضامن علی مرحوم جلال سے نواب کلب علی خاں مرحوم والی رامپور نے پوچھا کہ آپ عیال کو عیال کہیں گے انھوں نے جواب دیا کہ عیال تو ہم کبھی نہ کہیں گے۔ لفظ رفو میں کت ساکن پڑھنا چاہئے لیکن فارسی و ہندی کے لہجوں میں اس کا تلفظ مشکل تھا۔ رفو بضم فاستعمل ہو گیا۔ اسی طرح ناگوار و گوارا میں کات معنوم ہے لیکن اردو میں بفتح کات ہی مستعمل ہے، لفظ رشتہ اور لفظ عید کو اکثر اہل لغت بکسر اول صحیح سمجھتے ہیں لیکن اردو میں بفتح اول ہی ہونا چاہئے۔ لفظ مطلع بکسر لکھنا اور لفظ موقع بکسر قاف صحیح ہے لیکن اردو میں اس کی تصحیح مکن نہیں جمیع سے التماس ہو اجاتا ہے۔ حوض علی خاں، میر انیس کے ایک شاعر دکن

دل نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے عمود کو بواو معروف پڑھا تو میر صاحب نے منع کیا اور کہا عمود کہو بواو جھول اور نور چشم کے لفظ میں کسرہ اضافی کے لئے کو بھی میر صاحب منع کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے یہ اضافت اردو میں بری معلوم ہوتی ہے۔

بعض الفاظ عربی الاصل اردو میں اس طرح مل گئے ہیں کہ ان کا بدل نہیں ہو سکتا اور پھر اصل معنی بھی ان میں باقی نہیں رہے، جیسے واسطے۔
ج۔ معارف وغیرہ ممکن ہی نہیں کہ ان کی تصحیح کی جائے۔ البتہ یہ غلط سمجھا جائے گا کہ تقریباً کے محل پر قریباً، اندازاً لکھا جائے یا حال کے محل پر
ظ موجودہ۔ ایسے محاورے غلط ہیں دوسرے یہ کہ بعض لوگوں کے نکالے ہوئے یہ الفاظ محاورہ عام نہیں ہیں بلکہ وہ محاورہ
ام ہیں۔ محاورہ عام کی تصحیح البتہ محفل فصاحت ہے جیسے لا یعقل ولا ابالی بلائی خاصہ میر شکم وغائب ہوتے ہیں۔ اس طرح لفظ یعنی ہے کہ اس میں
میر غائب کا لحاظ مطلق میں کرتے۔

بعض الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصل ان کی کہ اور تھی لیکن دہلی لکھنؤ کے لوگوں نے تصریح کیا ہے مثلاً جھکے کو جھکولا کہنا
دونوں شہروں کا محاورہ ہے مگر میر خیال میں جھکولا ہی فصیح ہے اور قدیم اردو یہی ہے قدمائے شعر کے کلام میں یہ لفظ موجود ہے۔ اسی طرح
نظا چیدہ میں تصریح کر کے دہلی، لکھنؤ کے لوگوں نے پغندہ کہنا شروع کیا۔ اور یہ بھی عامیانہ محاورہ ہے، جھلک میں اہل لکھنؤ نے تصریح کر کے
جھلکی بنا دیا۔ شاہزادہ میرزا آسماں جاہ مرحوم کا ایک شعر مجھے یاد آیا ہے

سبک جاتے ہیں اک جھلکی دکھا کر کہ رہ جائے پھٹک کر دل کسی کا
در اہل دہلی نے تصریح کر کے جھلکا بنایا مرزا داغ مرحوم کہتے ہیں مصرعہ ”اپنے کوٹھے سے جو کل اس نے دکھا یا جھلکا“۔ بعض الفاظ دہلی میں
پنے اصل پر ہیں اور اہل لکھنؤ نے تصریح کیا مثلاً دھلکنا دال اکبر سے دلی کی زبان ہے اور ڈھلکنا دال ہندی سے لکھنؤ کا محاورہ ہے۔
اسی طرح کھردرا کو مخفف کر کے اہل لکھنؤ کھدرا کہتے ہیں مگر مجھے کھردرا ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔

بعض الفاظ اصل میں جمع ہیں اور محاورے میں مفرد ہوئے جاتے ہیں جیسے ارواح، اوقات، اولاد، بعض الفاظ مفرد ہیں اور محاورے
میں جمع ہوئے جاتے ہیں مثلاً ”اس کے کیا معنی“ جو خالص زبانیں دنیا میں ہیں ان میں اہل دیہہ کا محاورہ مستند سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اہل شہر
کی زبان غیر قوموں کے غلط سے محفوظ نہیں رہتی۔ ابتدائے اسلام میں جب عربی کی زبان بگڑنے لگی تو اہل بادیه و اعراب سے زبان کو مطابقت
دینے کے لئے تھے لیکن اردو مخلوط زبان ہے۔ اس کا معاملہ برعکس ہے اہل شہر کی اردو گائوں والوں سے اچھی سمجھی جائے گی، تنجب ہوتا ہے کہ لکھنؤ
سے تھوڑی دور باہر جائیے تو آنکھیں کھینے کے بدلے آنکھیں لٹخ کاٹ اور گلا گھونٹنے کو گھونٹنا بواو جھول اور جانے کو جھٹکا بولتے ہیں۔ یہی
حال دہلی کے گاؤں والوں کا ہے۔ آئے کو آتما۔ روٹی کو روٹی، بٹہ بٹہ پانی کو پائڑیں بولتے ہیں۔

تازگی لفظ کا سہرا اہل قلم کو خیال ہوتا ہے اور بیشک لفظ تازہ مضمون تازہ کے برابر بلکہ بہتر ہے لفظ کے انتخاب کرنے کا امتیاز خدا داد
بات ہے کوئی لفظ خوبصورت ہوتا ہے کوئی بھونڈا پھر صحت کرنے کا سلیقہ بھی فطری قابلیت ہے بعض الفاظ اصل میں اچھے ہیں لیکن کسی ایسے
محل پر صحت ہوا کہ خوبصورت ہو گیا ہے نہ ہونا چاہئے کہ آپ نے لفظ کو تازہ سمجھ کر صحت کیا اور سننے والے کو وہ لفظ غریب و وحشی معلوم ہوا۔
میر انیس، شاہزادہ علی اکبر کی اذان کا ذکر فرماتے ہیں ۶ ”وہ لودھی کہ جس کی فصاحت دلوں کو بھائے“ اکثر لوگوں کی رائے ہے کہ
یہاں لودھی کا لفظ غریب ہے اور بیکل بھی صحت ہوا ہے۔ تنوی ششقیہ میں جہاں ملاؤں اور قاریوں پر آواز سے کہے ہیں ایک شعر میں الفاظ
غریب کو عوام میں بھر دیا ہے ۷ آپ عربی میں ششتم ہیں آپ غریب ہیں غلط ہیں

محل بچو میں ان الفاظ کا استعمال غالباً بجا تو نہیں ہوا۔ اس سبب سے کہ یہاں اس کی نقل کرنا منظور ہے میر علی اوسط مرحوم کہتے ہیں :-
”دشک کو اقرار ہے رائے زریں یا راکا“ اس مصرع میں لفظ زریں تازہ نہیں ہے بلکہ غریب ہے اور پھر اپنے محل سے بھی الگ ہے مگر حضرت واعظ
یاجناب شیخ یاناصح مشتق کی رائے زریں کا اقرار ہوتا تو شاید اس قدیم زمانہ معلوم ہوتا۔ دیکھو ایک لفظ کے بے محل ہونے سے سارا شعر کیسا بے مزہ
اور سست ہو گیا۔ سر سید احمد خاں کے ایک مضمون میں ہے ”جانوروں کی چھاتیاں“ اس لفظ کو وہ بے محل استعمال کر گئے چھاتیاں انسان

اور چاہتا ہے کہ میری شہرت ہو۔ یہ ایک شر ہے۔

نہیں رنگ میں کہ پا کر اوری

بعض اصحاب نے یہ شعر شکر کہا کہ میرا میں نے پہلے کسی کو گھبرایا ہی صاحب کی آپ اس شعر کو چھاپنا نہیں کہتے۔ میں نے کہا میرا صاحب نے
روح میں اس لفظ کو صحت کیا ہے اور میں نقش و نگار زمانہ کی دوست کو ہم اہل جگہ میں اس کی ضرورت نہیں کہ مشہور کی رونق بڑھاؤں۔

میر صاحب کے اس مصرع پر اعتراض ہوا تھا:۔ "گھوڑے نے آگے فیک میں حالت اپنے کو دکھائے۔" یعنی سرور سے دانت کو کھولنے
اور فیک میں دانت کھلنے ہیں۔ اس اعتراض کا جو کچھ جواب دیا وہ ہے ہوا ہونے میں نہیں آیا۔ مگر میں عرض کرتا ہوں کہ مستر میں نے کھوکھلے اور
کھلنے میں جو امتیاز کیا ہے وہ آدمی کے دانتوں کے لئے ہے۔ میر صاحب نے گھوڑے کے دانتوں کو کہا ہے۔ اُن کا مطلب ہے کہ گھوڑا فیک میں بھی
دانت کو کھولتا ہے کھل کر نہیں۔ اس کو ارجحاً لفظ کہتے ہیں اور یہ ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ افسوس ہے ارجحاً لفظ کی تفسیر زیادہ نہیں ملتی۔
مگر جہاں لکھنؤ کی زمین نے دیکھا کہ لفظ انھوں نے کہے جو اعتبار دینی و ترکیب نہایت مضحک تھے اور ایک لفظ بھی استعمال نہیں تھا۔
خدا ایک جگہ کی طاب علم قرأت کیلئے کے لئے کوسوں سے ہر روز تیار رہے میں آکر تا تھا میں نے ایک دن اُس کا نام پوچھا۔ ابھی اُس نے جواب نہیں دیا
تھا کہ ایک صاحب بول اُٹھے کہ ان کا نام ہے چیتی الہی۔ میں نے پوچھا آپ کو ان کا نام کیوں معلوم ہو گیا کہا کہ اسی لوگوں کے نام میں دیکھ رہا ہوتا
ہے۔ میں نے کہا کہ دین کے لفظ کو تو میں سمجھا۔ لیکن چیتی کے معنی تو بتائیے۔ کہنے لگے آپ کو قرأت کا بہت شوق ہے بے قرأت کے بات ہی نہیں کرتے
میں نے کہا کہ قرأت کا قاتل ہے لیکن سچ اور آپ کی شرح باقی ہے، انھوں نے جواب دیا کہ وہ دونوں حرف حیت سے ماخوذ ہیں۔
(اس کا سلسلہ اب ارجحاً لفظ سے شروع ہوگا)

فرنگی عہد حاضر کا پہلا شخص تھا جس نے ہنگ ڈور اور کچی کی مدد سے برقی قوت معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن سرزمینِ مہر
کے حضرات سے پتہ چلا کہ وہ ۳۰۰ سال قبل اہلِ مہر لکھنؤ ڈینگ کے محکمہ Eclairage کے لئے استعمال کرتے تھے

بارود اور پھاپ خانہ جو موجودہ ہندوب کی بنیادیں، قدیم چین کی چیزیں ہیں۔ خنگائی اور کوویا سانچوں سے مٹی کے ٹاپ
بنائے جاتے تھے اور ان سے ٹاپیں چھاپتے تھے۔ اس طرح قدیم ہندوستان میں گڑی کے ٹاپ سے کتابیں چھاپنے کا کام لیتے تھے

ہشیا کی قیمت بالاقساط اور کرنے کا طریقہ آجکل عام ہے، لیکن عراق کے کھنڈروں سے جو مٹی کی تختیاں برآمد ہوئی ہیں ان سے
پتہ چلتا ہے کہ ۲۱۰۰ سال قبل وہاں بھی خرید و فروخت کا یہ طریقہ رائج تھا

اب تقریباً سو سال قبل افریقہ میں بعض پیشی حکومتوں میں پروانچنے کے کارخانے متعدد پائے جاتے تھے جن میں انہیں نعل طیار کی جاتی تھی

سڑکوں کا باقاعدہ طیار کرنا اور اس کے دونوں طرف نہ ختمی کا نصب کرنا نئی چیز نہیں، پہلے ڈاک کے کھنڈروں سے پتہ چلتا ہے کہ
تین چار سال قبل مسیح دامن شہروں کی تعمیر بالکل حفاظتِ صحت کے اصول پر ہوتی تھی، سڑکیں گناہ نہ بنائی جاتی تھیں اور ہر گھر میں ایک نعل طیار
ضرور بنایا جاتا تھا

سنگ کی سڑک پر آج بھی پانی گرنے کے لئے... مٹی کی چٹان کھد کر بنائی جاتی تھی۔ انہی کھد سے مٹی کی کھدیں آسانی سے
اس کے اندر سے گزرتی تھیں۔ یہ سڑکیں مسیح سے ۲۰۰ سال قبل بنائی گئیں تھیں۔ یہ سڑکیں آج بھی

فانی بدایونی

(تقابلی مطالعہ)

فانی کی زندگی مرتبہ یاس و حیران تھی، کبھی غم معاش ہے تو کبھی مرگ پر کار بخ - کبھی والدہ کی مفارقت کا الم ہے تو کبھی بڑوں کی طرح یاسی، لڑکی جو ان کیفیت طبعی وہ بھی جاتی رہی اور آخر میں بیوی کے ساتھ ارتحال نے فانی کے لئے احساس غم ہی کو اصل زندگی بنادیا۔ فانی موت اور زندگی کے درمیان ہمیشہ ٹھوکرین کھاتے رہے، موت نے جب آنکھیں دکھائیں تو حیات کی طرف پلے اور جب حیات نے پریشان کیا تو موت کو آواز دی۔ فانی کی یہی زندگی تھی

زندگی سے ہو بیزار فانی اس سے کیا حاصل موت کو منالوے جان سے نفع ہو کر
فانی کا ہر شعراں کے راز و رول کا ترجمان ہے۔ اور فانی کی تینوں شرطیں (سادگی، اصلیت اور جوش) ان کے ہر شعریں موجود ہے
تیسرا اور فانی تیسرا اور فانی کی زندگیوں ہر معاملہ میں کچھ اس قدر مشترک ہیں کہ ان کا انشاک شکل ہو گیا ہے، تیسرا کو ساکنان اکبر آباد کی بے ہوشی کی شکایت
تھی تو فانی اہل وطن کے عناد کے شانی تھے، تیسرا اگرنگلی معاش سے تنگ آکر دلی کے تو فانی کو حیدر آباد جانا پڑا۔ تیسرا کی جس طرح کھٹو
کے قیام میں امن و سکون میر نہیں آیا اسی طرح فانی کو حیدر آباد کی اقامت گزینی سے آرام اور راحت نصیب نہیں ہوئی، تیسرا اگر خودی اور خوداری تھی
تو فانی بھی اس معاملہ میں کچھ سمجھتے نہیں تھے۔ دونوں کو غفلت و ضلالت کا خیال۔ دونوں ناکام اور دونوں کو تنگی معاش کی شکایت۔ اس لئے دونوں کے کلام
میں بھی ملالت ہونا چاہئے۔

تیسرے یہاں آہ و فغاں، مجبوری و بے کسی، نا کامی و نامرادی، بے ثباتی عالم اور نا پائیداری دنیا، عشق کی ستم انگیزی اور فقر و قحط انکی غزل
کی نمایاں خصوصیات ہیں اور وہ انھیں کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والے کلیجہ پکڑے کہ وہ جاتے ہیں، کبھی وہ زبان اور طرز ادا
کی سادگی سے یہ کام لیتے ہیں اور کبھی نثرنا فقروں میں یہ بات کہہ دیتے ہیں مثلاً :-

کہا میں نے کرتا ہے گل کا ثبات	کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
کہلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے	تیسری آنکھوں کی نیم خرابی سے
فیضان آسے صدا کر چلے	میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

فانی کی طبیعت بھی اسی سوز و گداز، یاس و حیران اور درد و کرب کا مجموعہ تھی، مگر فانی اسی غم کو غم جاوداں جانتے ہیں، جذبات کی
تیزی اور احساسات کی شدت میں وہ میر صاحب سے بہت نزدیک ہیں۔ مثلاً :-

آج ہم ملی سکے نہ وہ آئندہ	اُن کے آگے جو بار بار آیا
کس سے اب درد کی دعا چاہوں	درد و آہستہ ہے لے کے تیرا نام
آس ہو تو اس سہارا پر	میر مکن نہ سہتا مگر کرے
میر پرست جان وہ کہتے ہیں کیا جانتے کیا ہو جانتے	کچھ یوں بھی زبان نہیں کھلتی کچھ درد و سوا ہو جانتے
دل کو کس دن قرار آیت	تم کسے بے قرار کر کے چلے

اور کسلی سے سوا ہو گیا ، — — — — —
 اور جو کچھ اے مجھے کیا ہو گیا
 اب بھی ترا وعدہ دیا ہوا ہے
 موت کا وعدہ تو دیا ہو گیا
 اب میرے سمجھنے کا نہ سمجھنے کا
 زندگی کا ایک سوے خواب ہے دیکھنے کا

فانی نے جو غزلیں بھر مقارب میں لکھی ہیں بالکل تیر کے رنگ کی ہیں اور بعض وقت فانی پر تیر کا رنگ لٹکا چھا جاتا ہے کہ وہ تیر صاحب کے زمانے کے الفاظ و فقرات کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کرتے ہیں۔ مثلاً:

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلائے آگے جگاتو جاتے ہیں
 ہم ہی گروہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

کیا چھپاتے کسی سے حال اپنا
 جی ہی جب ہو گیا ٹھو حال اپنا

دل کا اجڑنا سہل ہے، بننا سہل نہیں ظالم
 بستی بننا کھیل نہیں، بستی بے بستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے، ویرانے بھی دیکھے ہیں
 جو اڑے اور پھرنے لے، دل وہ توڑا ہی ہے

باوجود اس کے فانی، تیر نہیں، سوا سوا بریں کی زبان اور تیر کے سوز و گداز نے دل کو فانی کے کلام میں جو دلاؤ بڑی اور دلکشی پیدا کر دی ہے وہ کہنے کی نہیں سوس کرنے کی چیز ہے۔ تیر صاحب کی طرح فانی رنج و غم سے گھبراتے نہیں۔ بلکہ اس میں ان کو سکون نصیب ہوتا ہے:-

غم مجھ نظر آیا تو ہم انسان سمجھے
 برق جب جسم سے وابستہ ہوئی جاں سمجھے

تیر صاحب جبرے قابل ہیں مگر فانی کا عقیدہ جبر و اختیار کے درمیان ہے:-

گناہ کا رکھتے حالت ہے رحم کے قابل
 غم کشش جبر و اختیار میں ہے

گلشنِ تصویر میں تھے طائر تصویرم
 کیا کہیں، کیونکر ہے مجبور بھی آزاد بھی

تیر کے اسلوب بیان میں حسرت، سوز و گداز، اثر، دلکشی اور روانی پائی جاتی ہے مگر فانی کے یہاں یہ چیزیں نسبتاً کم ہیں، تیر کے کلام میں فلسفہ و حکمت کا دخل نہیں ہے، مگر فانی کے کلام میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

غالب اور فانی
 غالب کا رنگ کلام کئی رنگوں کا مجموعہ ہے، مرزا یحیٰی کی ترکیبیں، تیر کا درد و غم، نظیری کا تغزل، عرفی کی جدت آفرینی کے امتزاج یا انقباضی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس کی حقیقت معلوم کرنے کی وہ سعی کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:-

غالب :- — — — — —
 لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ بے رنگ و نام ہے
 یہ جانتا اگر تو مٹا نہ گھسہ کو میں

فانی :- — — — — —
 بہلانہ دل، نہ جیرگی شامِ غم گئی
 یہ جانتا تو آگے لگاتا نہ گھسہ کو میں

غالب :- — — — — —
 عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا
 درد کا حد سے گزرتا ہے، دوا ہو جانا

فانی :- — — — — —
 قطرہ قطرہ رہتا ہے، دریا سے جوارہ نکلتے
 جو تابِ ہوائی لاندے کے، وہ قطرہ فنا ہو جاتا ہے

فانی نے اپنی قادر الکلامی سے غالب کے رنگ کو اور زیادہ جو کھا بنا دیا۔ ملاحظہ فرمائیے

آزردہ تھا کہ ضبطِ خفاں میں اتر نہیں
 شرمندہ ہوں کہ ضبطِ مرادِ بیگانہ نہ تھا

مقدس رہے بے نیازیِ آدابِ انصاف
 دیکھا مجھے تو پاسے نظر درمیان نہ تھا

آتشِ نہیں ہے، تہمتِ نظارہ کی بھل
 شہد دیکھتا ہوں جلوۂ نظارہ ساد کا

ملک وہ دیکھ کے سہرا دیا
 کوئی دیرانہ گھر یاد آیا

نکلاً کہ غالب سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ بیانی کی شگفتگی ہے۔ یہاں تو زندگی کی حقیقت اُجاگر کرنے میں وہ ظن سے بھر جاتا ہے کہ ساتھ دیکھا ہے مگر فانی نے اس کے ساتھ الفاظ و تراکیب کی شگفتگی اور دلاؤ بڑی کو اچھے سے جلتے نہیں دیا، لہذا اس کا شعر غالب کا محتاج ہے۔ ملاحظہ اس کے فانی کے

بیان خود لطیف ہے اور اسی سے ان کی آواز غیب کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ علامہ اس کے لسانی نے ہر موقع پر دین کو سامنے رکھا ہے، ملاحظہ فرمائیے:-

غائب :- ہستی کے مت غریب میں آجائے آسہ عالم تمام معلقہ دام خیال ہے
 فانی :- ہو خرد نگاہ غلط جلد خود غریب عالم دلیل گرہی چشم و گوش تھا
 غائب :- جو غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جاگے ہیں خواب میں
 فانی :- تجلیات دم ہیں مشاہدات آب و گل کرشمہ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا
 فانی نے اسی خیال کو دوسری جگہ جوش فلوں کے ساتھ ظاہر کیا ہے اس کی داد نہیں دی جاسکتی:

اک لمحہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کا ہی کو ہے خواب ہے دیوانے کا
 غائب کا شعر ملاحظہ فرمائیے:-

ہاں کھائیو مت غریب ہستی، ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
 فانی نے اسی مفہوم کو اس طرح پیش کیا ہے:-

ہے کہ فانی نہیں ہے کیا کہے، راز ہے بے نیاز محرم راز
 غائب کے بیان قطعیت ہے اور فانی کے بیان محویت۔ غائب کے یہاں غنی محض ہے اور فانی کے یہاں اثباتیت۔ دونوں نے وحدت الوجود پر طبع آزمائی کی ہے ملاحظہ فرمائیے:-

غائب :- تمہا جب کچھ خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈوب یا مجھ کو ہونے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
 ”کیا ہوتا“ کے اندر جو منوہیت پائی جاتی ہے اس کا جواب نہیں، مگر فانی نے انسان کے احساس اثباتیت کا فلسفہ بڑی خوبی سے ظاہر کیا ہے:-

میرا وجود ہے میری نگاہ خود نشاں اس وہ راز ہول کن ہوتا جو راز داں ہوتا
 بلکہ خیالی موتن کے کلام میں جو جذبہ آم موجود ہے مگر بعض وقت اشکال پیدا کر کے شمر کی لطافت کو ختم بھی کر دیتے ہیں۔ موتن کو ترکیبیں
 موتن اور فانی کی تراش و تراش میں بدلتی حاصل ہے۔ موتن کے عشق میں رکاکت نہیں ہے۔ جیسے وہ خود دار تھے، ویسا ہی ان کا عشق بھی
 خود داری کے جذبول سے معمور تھا، اسی لئے موتن کے کلام میں وہ تمام کیفیات پائی جاتی ہیں جو حسی و عشق کی دنیا میں پیدا ہوتی ہیں۔

فانی کے کلام میں بھی معنی آفرینی اور نزاکت خیال کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں مگر ان کی معنی آفرینی موتن کی معنی آفرینی سے مختلف ہے۔ موتن
 معنی آفرینی میں اس درجہ غرق ہو جاتے ہیں کہ مفہوم کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے مگر فانی کی معنی آفرینی ہمتا نہیں ہوتی۔ موتن ترکیب نو کے اختراع
 کے شوقین ہیں مگر ترکیب کی پیروی عام فہم سے بالا ہو جاتی ہے اور فانی کی دلکش ترکیبیں اس قسم کی نہیں ہیں، موتن کے کلام میں جہاں خیال کی ہندی
 ہے وہاں موتنا، لہجہ بھی بدلتی ہے، فانی کے یہاں یہ بات نہیں ہے۔ مثلاً:-

تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا،
 یہ بھی اک التفات ہے ورنہ دعوتِ نالہ ہائے پیہم کیا
 کمال ضبط غم عشق اورے معاذ اللہ کہیں کہیں سے جریہ اجرا بیاں ہوتا
 جلد اختیار سے نسبت چہرے مجھے، شعلہ آرمیدہ ہوں دادی برقی ناز میں

موتن قدرت ادا، دلکش ترکیب اور خوبصورت بندشوں کے اختراع کرنے میں جہاں مشہور ہیں، وہیں اپنے مطلق اعتبار سے ہر کہ و مر کہ
 زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ یہ چیز فانی کی شاعری کا بھی نمایاں جوہر ہے ملاحظہ فرمائیے:-

کسی کے قسم کی کہانی ہے زندگی فانی، ناز ایک فنانہ ہے مرنے والوں کا
 خاک فانی کی قسم ہے تجھے سے دشت جوں کس سے سیکھتا رہے ذہن نے بیاں ہونا

میں سے رخصت فانی تریسا ہے شاید
کس کی کشتی نہ گرداب فنا جا پھیرے
کچھ اب کی ہوتے تھیں دامن بہار میں ہے
شہد لیک جو فانی لب ساحل سے اٹھا
آج روز وصال ہے فانی
موت سے ہو رہے ہیں ناز و نیاز

داغ و امیر اور فانی
داغ کے رنگ سے کون واقف نہیں، شعر کا اور داغ بچا ہے۔ ان کی روانی و بلاغت فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے
بیان میں شوخی، رنگ کا پتہ، بالکل، میسا کھلی ہے، معشوق سے بے محابا باتیں کرنا، جلی کٹی سے، صحن صحن کرنا، انکا
لام ہے۔ امیر کا بھی یہی رنگ ہے گردہ لگا ڈالت، چھین جھپٹ میں امیر کچھ رہ جاتے ہیں، امیر ادب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ گرداغ، جرأت کی طرح
آزاد ہے۔ فانی کے یہاں جتنے جتنے داغ و امیر کے رنگ کے اشعار بھی موجود ہیں۔ یہ اشعار اس وقت کے ہیں جب فانی لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے

سے گفن گرد گرد، دیکھ نہ میلا ہو جائے
آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں ہنسا کے بدلے
اداسے آؤ میں خبر کے منہ چھپائے ہوئے
مری تھنا کو وہ لائے دولہن بنائے ہوئے
آل سوز لہجائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ
مواقل کن کے ہاتھوں یہ تو باتیں
کچھ ان کی ہیں، کچھ ان کے نامہ بر کی
تم کہوں نے تھے آئینہ خانے میں بے عجب
اجھا ہوا کہ شرم و شرمات میں چل گئی
تربت کے پھول شام سے مر جھاکے رہ گئے
دوروں کے صبح کی مری شمع حرا نے

فانی پر لکھنؤ کے قیام تک لکھنؤ میں کا اثر ایک نیا بعد کو یہ رنگ اڑ گیا۔ الغرض فانی نے میر میں، غالب، نہ مومن ہیں، نہ امیر و داغ مگر میر بھی سب
کچھ ہیں امیر کا درد غم، غالب کا فلسفہ و تصوف، مومن کی بلند خیالی اور نزاکت، ندرت و ترکیب الفاظ۔ امیر و داغ کی شوخی ان سب کو ملا دیا جاتا
تھی فانی کی شاعری کا درجہ یہ آسانی متعین کیا جا سکتا ہے۔

فانی کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان کی زندگی کی آئینہ دار ہے اور اسی لئے ان کی زندگی کے ہر موڑ کے ساتھ ان کے کلام کا رخ
بھی بدلتا رہا۔ فانی کے یہاں سپردگی، پندار نیاز، احساسِ حق، عرفانِ حیات کے شدید جذبات موجود ہیں۔ مگر ان سب میں غم کی جھلک بھی شامل ہے۔
سپردگی کا تقاضہ یہ ہے کہ شاعر اپنے کو بھول جائے۔ مگر فانی نے اپنی انفرادیت کو ہمیشہ سامنے رکھا اور اس طرح کا احترامِ حق یا انکسارِ حقوق کے دامن
میں غرق نہ ہوا۔ اس لئے یہاں تک کہ یہ جذبہ عجز و انکسار غرور و عجز و انکسار بن گیا۔ غالب نے ایک ہی شعر میں معشوق کے علو کے مرتبت کے ساتھ اپنی حقارت کا
کرمی نظم لکھا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

عشق نے غالب نکما کر دیا
مگر فانی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:-
ور نہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

چُن لیا تیری محبت نے مجھے، اور دنیا ہا سمیت مل کر رہ گئی
بے ذوق نظر، بزم تماشا نہ رہے گی، منہ پھیر لیا ہم نے، تو دنیا نہ رہے گی
اپنے کمال شوق پر، حشر کا دن ہے نہر، وعدہ دیدہ چاہئے، دیدہ انظار کیا
عرض شوق میں نہ رہے بندگی کی لاک، اکی سجدہ جا پھتا ہوں ترے آستانِ بگودہ

جس شخص سے فانی کو عرفانِ حیات حاصل ہوا جس نے فانی کے احساس و ادراک کو گوت عطا کی، جس نے زندگی کو انوار سے بھر دیا، فانی اس کو
کیسے بھول سکتے تھے:-

نور برق معرفت بخشا دل آگاہ سے
ور نہ پہلے سوز غم کی شعلہ خاموش تھا

فانی مشن دہسپردگی کے باوجود ہمیشہ اضطراب و خلش محسوس کرتے ہیں اور فانی کا اضطراب جس غم کا غلاق ہے وہ بجز موت کی یا پوری دنیا کے کسی

نہیں ہے۔ یہی وہ ہے کہ جسے غم میں جہاں ان کو فراقی حیات حاصل ہوتا ہے وہ موت سے بھی محبت کرتے گئے ہیں۔

سکون قلب میرے، موت ہی سے بھی
غرض کہ خاتمہ رنجی اضطراب ہوا
تو کہاں تھی اسے اجل، اسے ناہر ادوی مراد
مرے دے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے
کی قصائے میر نے زندگی کی غنچہ اری
درد کی دوا پہنچی درد بے دوا ہو کر
فانی کے جذبہ اضطراب کی تخلیق، محبت و خود داری، غم اور مواسات کے جذبات کی آمیزش سے ہوئی۔ ان میں بعض جذبے ابدی ہیں۔

قبر میں جب کسی طرح دل کی زنجیر نہ ہوئی
یاد خرام ناز نے حشر کا آسرا دیا،
سینہ فانی ہے یا جو لنگہ برق فرشا
دل ہے یا بے بلائے آسمانی اضطراب
بعد فنا بھی کم نہ ہوئیں بے قرار یاں
لا تہ نہ تھی کوئی بجلی کفن میں تھی
اور فانی بڑھنگی بیتابی دل بے درگ
کیا کہیں مر کر گرفتار بلا کیوں ہو گئے
سکون موت مری لاش کو نصیب نہیں
رہ نہ کر کوئی اتنا بے قرار رہے

اگر فانی کے جذبات کا تجزیہ کریں تو معلوم ہو گا کہ وہ اپنی خوشی کو عین غم اور غم کو حقیقی مسرت محسوس کرتے ہیں، اور ایک وقت وہ آجاتا ہے کہ وہ ہر دما سے اپنے کو محروم تصور کرنے لگتا ہے اور عدم حصول دعا، انکا دعا بن جاتا ہے، ملاحظہ فرمائیے۔

مری حیات ہے محروم دعا کے حیات
وہ رہ گزر میں جسے کوئی نقش پانہ لا

فانی زندگی کی ہر وقلوئی کو محبت کی ہر وقلوئی تصور کرتے ہیں، محبت ان کی رگ دہلے میں اس طرح جاری و ساری ہے کہ دل کی ہر کھٹک، محبت کی کھٹک محسوس ہوتی ہے، وہ اپنے گمراہی و اہم سے درست تو دوست دشمن کو بھی رلا دیتے ہیں وہ اپنے غم کا عکس تمام مظاہر میں موجود پاتے ہیں چہرہ شرم و غصہ و غم میں در و فرقت سے جاں بسپ ہوں، تمہیں یقین و نا یقین ہے

میری ہوس کو عیش و دوا عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا
نذر درد دل، غم دنیا کیا
اک مٹایا داغ اک پیدا کیا
بجلیاں بھر دیں نگار یار میں
تو نے آہ آتشیں یہ کیا کیا
زیرت تھی بیکار فانی دل کے بعد
جان بھی قربان کی، اچھا کیا
دیرنی ہے رنگ دل میں ڈوب کے کھینچنے کے بعد
تم ابھی کیا دیکھتے ہو تھم کے غنچہ دیکھنا
سائنس کے جو آخری جھٹکوں میں ٹکرتے ہوئیں
ہائے اُن ناشاد آہوں کا مقدر دیکھنا
سُن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
موت آنے تک نہ آئے اب جو آئے ہو تو ہائے
زندگی مشکل ہی تھی، مرنا بھی مشکل ہو گیا
آج تیرا نام لے کر کوئی فاضل ہو گیا
موت آنے تک نہ آئے اب جو آئے ہو تو ہائے
زندگی مشکل ہی تھی، مرنا بھی مشکل ہو گیا
آج تیرا نام لے کر کوئی فاضل ہو گیا
موت آنے تک نہ آئے اب جو آئے ہو تو ہائے
زندگی مشکل ہی تھی، مرنا بھی مشکل ہو گیا
آج تیرا نام لے کر کوئی فاضل ہو گیا

فانی کے نزدیک محبت کا مقام بہت بلند ہے، یعنی جب انسان اپنے کو غم کی آگ میں اچھی طرح تھاپے، ہر سانس غم الودہ ہو جائے، ہر شمع نقرے اور دسے شراب سے اڑنے لگیں، اس وقت انسان اس قابل ہوتا ہے کہ عشق و محبت کا دھوی کرے، فانی کی زندگی اس نظریہ محبت کی پوری طرح آئینہ دار ہے، وہ خود کہتے ہیں۔

عشق کا طعاصن جہاں میں تھا ہرگز
عشق کا ہر اظہار نام کی انتہا ہو کر
آئی رہے گی خیراب اس دنگ کی کوہ
وہ کہ ہو کر موت مری زندگی ہوئی
کی شکوہ سچی کا انداز بھی کیسے لگتا ہے
وہ لگ کر کہتے ہیں کہ وہ لگتا ہے لفظ فرمائیے
انجیری ہوئی ہے چوٹ دل درد مند کی
وہ لگتا قدم تصور جانناں منجھال کے
کا نظریہ محبت انفرادیت آمیز ہے۔ وہ انتظار کو انتظار ہی تک محدود رکھتا ہے ہیں یہی انتظار ان کی شاعری کی روح ہے۔
نصیب ہو بھی تو کیا لطف وصل یا نہیں ہے
سوائے عیش سو تقدیر انتظار میں ہے
قافی نے اپنی شکست خوردگی پر عشق و محبت کا پردہ ڈالا ہے اور اس کے ذریعہ سے انھوں نے اس کو پوشیدہ رکھنا چاہا ہے، مگر قافی آپس
سیاہ نہیں ہوئے ملاحظہ فرمائیے:-

مر کر ترے خیال کو مٹائے ہوئے تو ہیں	ہم جان دیکے دل کو منجھالے ہوئے تو ہیں
جنوں نے دی ہمیں راحت و گرنے قافی	نشانہ الم روزگار ہم بھی ہیں
مری اک عمر قافی نزع کے عالم میں گزری ہے	محبت نے مری رنگ رنگ کیے کچھ پناہ ہو برول
کئے جائیں گے دل کے خاتمہ پر شکر کے سجدے	وفاؤں نے کیا ہے غبی حسرت سے و طو برول
قافی کا جذبہ حسرت و یاس اس اثر کا خلاق ہے جس میں بجز شکستگی کے اور کچھ نہیں ہے ملاحظہ فرمائیے:-	
راحت انجام غم اور راحت دنیا معلوم	گھسدا دل کے مقدر میں پریشاں ہونا
بریا تھا دل کی لاش پر اک عشر سکوت	تیرے شہید ناز کا اتم غموش صحت
دل ہے تری نگاہ تک جاں ہے ایک آدمک	جسٹہ امید کیا ظن امید وار کیا
گمال ہوش ہے یوں ہے نیاز ہوش ہو جانا	ترے آغوش میں بیگانہ آغوش ہو جانا
اُس جان تمنائے بے پردہ نہ شکوہ کر	وہ تجھ سے خفا ہے تو بیٹے سے خفا ہو جانا

سید محمد رشید درو گو کچھو دی

ہست و بود ————— از تالاب راشدی جمالی القادری —؟؟

ہست و بود: تغزل کا انتہا ہے۔ نہ فکر کا ارتقا، نہ شعلہ ہے، نہ شرر، نہ عرش ہے، نہ زمین نہ رامنش ہے نہ جنگ۔۔۔۔۔
ہست و بود: ذہن کی بڑھ کر کیاں کھل سکتی ہیں نہ انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ وقت کے بچے ہوئے دھابے کا منہ موڑنا اس کا کام نہیں۔ "ہست و بود"
اور انھیں آپ کے وجدان کو چھو تو سکتی ہیں مگر نرم سے نرم گاہ تک نہیں پہنچا سکتیں۔ وہ حضرات جو انقلابی ہیں اور شاعری میں
غلوں و دولت، مذہب و انسانیت، جبر و قدر، مصیبت و غیر مصیبت اور جہد و مسجود کی محرک آرائیاں جاتے ہیں اسے نہ دیکھیں اور وہ حضرات
جو کہ ہمیشہ فن دیکھنا پسند فرماتے ہیں اور غزلوں کی عظمت کے معترف ہیں وہ انرا چاہیں تو قیمت کتاب ادارے کے نام روانہ فرما دیں، بعد از
ایک مہینہ ان کی خدمت میں ارسال کروا جائے گا۔ مجلہ قیمت ڈھائی روپے۔ نیز مصیبت کی دو اور تصنیفیں "سوز و فکر"
و "حقائق و معارف" زیر ترتیب ہیں۔ ناشرین کی وجہ سے یہ ایک نہیں ملتا ہے۔ شریک حقوق کے شائق خود کتابت کے ذریعہ
کریں۔

منیجر مکتبہ قادریہ نیشنل خانقاہ شریف لین کلکتہ نمبر

باب المراسلۃ والمناظرہ

استفادہ، سرقہ و توار کی بحث

(فضا ابن فضی غظمی)

کرمی و غظمی :- ”ننگارہ ماہ اگست ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں جناب افسر صاحب کے غم و غصہ کا گرجا ہوا اہل اور چڑھتا ہوا طوفان دیکھا خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس سے کتنے دل متاثر ہوئے ہوں گے، مگر زبان قضا پر یہی مصروف جاری تھا: ”ہم لغتی و غرض ہم عفاک اعداؤ کو لغتی“۔ اور اس ادبے خاص نے کہ قضا کا کلام اگر شایع ہو گا تو میں ننگارہ کا مطالعہ بند کر دوں گا آپ کے دل کو بھی گرایا۔“ ”ناؤک نے تیرے سید نہ چھوڑا زمانہ میں۔“

حضرت! میری خاموش نظرات اس کی متقاضی دہتی کہ کچھ عرض کرتا، اور ذرا لام و دمن ہی اس کی اجازت دیتے تھے، مگر آپ کے بے لاگ تنقیدی جائزے نے مجھے مجبور کر دیا کہ چند کلمے بطریق معذرت پیش کر دوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نہ شاعر ہوں اور نہ مجھے دعویٰ سخن بخوبی، کبھی طبیعت کسی چیز سے متاثر ہوتی ہے تو بے اختیار کہہ لیتا ہوں۔ اس سے نہ اظہارِ علم و فن مقصود ہے نہ جلبِ شفقت نہ علوئے مرتبت۔ ”نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا“۔

لاریب، جو غزل گو اشیت و افسی ہوں مجھے اس کے اعتراف میں غصہ نہیں، میں اپنے ان بزرگوں کا بہت سبب اس ہوں جو مجھ کو میری کمر و ہڈی کو کس بیتنا وہ میرے سخن میں اور ہزاروں شکر کے مستحق۔ مجھے اپنی تمام انسانی کردہ دلی کے اعتراف کے باوجود اس امر کا یقین و اطمینان ہے کہ میں نے کلام فکر کبھی ایسی چیز کے اجنانے کی ناجائز کوشش نہیں کی جو دوسروں کی علامتیں اور خاص حصہ بن چکی ہوں۔ بلاشبہ ایک مخصوص طرزِ ادا، ایک خاص شہسوار، شعر کی ہیئت مجموعی کسی موجد کی ملکیت ہوتی ہے، مگر الفاظ، محاورے اور امثال کسی کی میراث نہیں، نیز اکثر تشبیہات، استعارات، خیالات و نظریات میں اس درجہ توافق، یکسانیت اور عمومیت ہے کہ کسی کے کلام میں استفادہ، سرقہ اور توار کا فرق کرنا دشوار ہے، اور استفادہ کو سرقہ، سرقہ کو تیار یا اد کو سرقہ اور سرقہ کو توار کہنا آسان بھی ہے اور بہ نظر خاطر دیکھا جائے تو سخت مشکل، ایک سرقہ بتاتا ہے تو دوسرا سرقہ کو کیا توار کا بھی شاہ نہیں سمجھتا، یہاں تک آئندہ مشابہتوں سے معلوم ہوگا۔ یہ واقعہ ہے کہ تیار و تقلید بزرگوں کا قدیم طریقہ ہے، حالانکہ وہ خود صاحبِ طرز تھے مگر دوسروں کے کلام کو موجدی چیز قرار دینا ان کے تیار کا اعتراف کرتے تھے اور صرف اعتراف ہی نہیں بلکہ اپنی شاعری کا سنگ بنیاد ان کے طرزِ سخن پر رکھا۔

علامہ شبلی خواجہ حافظ کے متعلق لکھتے ہیں: ”خواجہ حافظ نے غزل گوئی شروع کی تو خواجہ کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا“۔

خواجہ حافظ خود لکھتے ہیں: ”استاد غزل سعدی پیش ہم کس ادا وار و سخن حافظ طرزِ سخن خواجہ

ایمیر خسرو امیر الشعراء ہیں، ابھی ہمہ نغمہ شیراز سے سرقی کا کیسا اعلان کرتے ہیں۔“ خسرو سہرست ندر ساغر سنی برکت: ”شیراز نغمہ مستی کہ در شیراز بود مرزا صاحب آداب حافظ کو لکھتے ہیں: ”روایت صاحب آگزیست از جویو: ”تیار غزل خواجہ گرجے بے ادبی است

مرزا غالب کا مشہور شعر ہے: ”باتے نہیں جب ماہ تو چہدہ جلتے ہیں“، ”رنگی ہے مری طبع تو بے ادبی ہے، رولان ادا“

کسی کا شعر ہے نام یاد نہیں ہے: ”مکان نہیں بد کے مرا جوش طبیعت“، ”چشمہ روضہ شامیں بڑا ہے رولان ادا“

یہ شعر مرزا کے شعر کا ایک بڑے بڑے جو تیار و استفادہ کے حدود میں ہے۔ تیار و استفادہ کے علاوہ بقول برو فیسقا درسی صاحب بعض خیالات بعض الفاظ

بعض اصالیب بیان، بعض ترکیبیں ایسی عام ادبی فطری ہوتی ہیں کہ اکثر آدمیوں کے ذہن میں بغیر کسی خاص خود کو لکھنے آجاتی ہیں، ان کے استعمال پر سرقہ کا لازمہ نہیں

کلام ہے۔ ”عربی کا شعر ہے: ”کافر و راست زاد از بر جہنم و لیکن اور بات است در سرور آستین ندارد

غالب کہتے ہیں: ”از من مدد نہ کنی گر لباس دین و دم نہفت کا فرم و بیت در آستین دارم

مرزا کے اس شعر کو عربی سے سرقہ کے امثال میں چلی آیا ہے۔ حالانکہ سرقہ کا توار کا بھی شاہ نہیں، ”بیت دہا آستین داشت“ کا محاورہ سرقہ کی دلی بھی

مطبوعات موصولہ

پشتو لوک گیت مجموعہ ہے ان گیتوں کا جو پشتو بولنے والے پشٹانوں میں لگے جاتے ہیں۔ اس میں سات قسم کے گیتوں کو جمع کیا گیا ہے جو مختلف موقعوں پر مردوں اور عورتوں کی طرف سے گائے جاتے ہیں۔

ایک قوم کا صحیح مزاج سمجھنے کے لئے اس قسم کے گیتوں کا مطالعہ لازماً ضروری ہے اور انہیں عوام کے انہیں سادہ جذبات سے ان کے بھانائے و بھانائے کا بہتہ پہنچا ہے۔ پشٹان قوم بڑی سخت دل اور ناقابلِ اندیش بھی جاتی ہے۔ لیکن ان گیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فطرت ایسی نہیں ہے اور ان کے دل بھی حس و محبت اور ہمدردی و ایثار کے جذبات سے خالی نہیں۔ جناب فادرغ بخاری نے ان گیتوں کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ بھی اردو میں صاف کر دیا ہے جو بہت سلیس ہے۔

کتابت و طباعت بہت پاکیزہ ہے۔ قیمت ڈھائی روپیہ۔ نئے کا پتہ: نیا کتبہ قصہ خوانی پشاور

نالیہ پابند نے مجموعہ ہے جناب اختر انصاری اکبر آبادی کی غزلوں اور نظموں کا۔ ابتدا میں جناب علی اختر حمید آبادی اور جناب شاعر گھنوی کے دیباچے نظر آتے ہیں جس میں انھوں نے کافی وضاحت کے ساتھ اختر صاحب کے محاسن کلام پر روشنی ڈالی ہے۔

اس مجموعہ میں بڑا حصہ غزلوں کا ہے جن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی زمین بالکل نئی ہے۔ اختر صاحب کو نئی زمینوں میں غزل لکھنے کا بڑا شوق ہے اور وہ اس میں اکثر جگہ بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ اختر صاحب جو کہ اپنے مقالات کے لحاظ سے جدید دور کے شاعر ہیں اچھے ان کے جذبات میں بھی کافی ایچے پائی جاتی ہے۔ جذبات کے اظہار میں انھوں نے زیادہ فضول تصنیف سے کام نہیں لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ جو کچھ لکھیں معقولیت کے حدود کے اندر لکھیں۔

آخر میں چند گیت بھی ہیں اور وہ زیادہ کامیاب نہیں ہیں۔ کتاب مملد شایع ہوئی ہے اور دور درہم میں حلقہ آراب فکر رتن تلاؤ کرنا چاہی سے مل سکتی ہے۔

لسان العصر اس مجموعہ میں تمام ان قطعات و منظومات کو لکھ کر دیا گیا ہے جو حضرت اکبر الہ آبادی کی وفات پر لوگوں نے لکھی تھیں اور جن کی تصادمہ کے قریب ہے۔ یہ کتاب ہم اکبر گرامی کی طرف سے شایع ہوئی ہے اور اختر انصاری اکبر آبادی نے اسے مرتب کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس مجموعہ کی اشاعت بے محل ہوئی ہے۔ اس کی اشاعت کا صحیح وقت وہ تھا جب اکبر کے تمام کلام اور اس کے سوانح شایع ہو جاتے۔ قیمت تین روپیہ ہے اور کتابت طباعت نہایت پسندیدہ نئے کا پتہ بزم اکبر گرامی۔

جنوبی ہند میں دو مہینے یہ مختصر سا سفر نامہ ہے جناب بلکن ناتھ آزاد کا جو انھوں نے جنوبی ہند کی سیاحت کے دوران میں مرتب کیا تھا جناب آزاد کو گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس کی طرف سے شرکت مشاعرہ کی دعوت دی گئی تھی لیکن وہ اس سلسلہ میں حمید آباد بھی گئے اور مدراس کے دوسرے مقامات کی بھی سیر کی۔

آزاد کے جذبات خاص و صدقات اپنے ذہن کے ان کی قدر رکھتی تھی۔ وہ جہاں پہنچے لوگوں نے انھیں سزا گھول پر بٹھایا اور ان کی شاعری سے بہت لطف اُٹھایا۔ جناب آزاد نے اسی داستانِ پذیرائی کو اپنے موثر و دلکش ازماد میں بیان کیا ہے کہ اس کو شروع کر کے ختم کرنا بھی پڑا ہے۔ قیمت ایک روپیہ اور نئے کا پتہ: دہلی کتاب گھر دہلی۔

ولی گجراتی نتیجہ ہے جناب سید ظہیر الدین حق ام۔ اسے ملی اپنی ڈی کی تبریک کا جو انھوں نے ولی گجراتی کے سوانح اور شاعری کے متعلق کئی سالوں کی جاری رکھی۔ ابتدا میں انھوں نے گجرات کی تاریخ نہایت شریعہ و سادہ کے ساتھ بیان کی ہے اور پھر یہاں کے ادبی و فنی و فنی

لاؤ کر کے ہرے، اردو ادب کے نشوونما پر روشنی ڈالی ہے۔

دلی کو اس وقت تک دشمنی کا شکار سمجھا جاتا تھا، لیکن دلی صاحب ملت کے ذریعے سے اس کا جراتی ثابت کیا ہے۔ دلی کے علمی استعداد اور ان کی شاعری پر بھی انھوں نے کافی لمبھٹا کشنگ کی ہے۔ الغرض یہ کتاب معیاری ریسرچ کی چیز ہے اور ہمیں دلی صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر اردو ادب کی تاریخ میں بڑا مفید اضافہ کیا ہے۔ قیمت چار آنہ اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی سے مل سکتی ہے۔

مجموعہ ہے جناب عبداللہ خان بیدل عظیم آبادی کی غزلیں اور نظموں کا۔ بیدل صاحب پٹنہ کالج میں اردو فارسی کے پروفیسر تھے اور ان مخصوص استادوں میں سے تھے جو علمی خدمت خالص علمی حیثیت سے انجام دیتے ہیں اور اسی سلسلہ میں ان کو شاعری کی طرف بھی متوجہ کیا ایک شعرے ذوق کا پڑھا لکھا شخص ہر کام سلیقہ سے کرتا ہے اس نے بیدل صاحب کی شاعری بھی ان کے سلیقہ و ذوق کی آئینہ دار ہے۔

نوائے بیدل

جناب بیدل متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں جو اس سے قبل شائع ہو چکی ہیں، لیکن ان کے مجموعہ نظم کی اشاعت کی طرف غالباً اب باطل پہلی بار توجہ کی گئی ہے اور یقیناً بیدل زبان دونوں کے ساتھ بالائی ہوتی اگر ایسا نہ کیا جاتا۔

بیدل کی شاعری دراصل شاد اسکول کی شاعری ہے اور میں اس کو ایک علیحدہ اسکول اس لئے قرار دیتا ہوں کہ شاد عظیم آبادی کی شاعری یقیناً لکھنؤی اور دہلی اسکول سے مختلف تھی۔

عظیم آباد ہمیشہ سے اہل فضل و کمال کا مرکز رہا ہے اور اس کے لئے یہ امر باعث صد ہزار افتخار ہے کہ مرزا عبدالقادر بیدل ایسا شاعر اس نے پیدا کیا۔ پروفیسر عبداللہ خان صاحب نے بھی اپنا تخلص بیدل رکھا ہے اور گوان دونوں میں اول و آخر کی نسبت نہیں پائی جاتی تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے شاد عظیم آبادی کے رنگ کو بڑی کامیابی کے ساتھ نبھایا ہے اور یہ آسان بات نہ تھی۔ مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

جب بے نیازیاں تھیں محبت بھی سہل تھی اب اس کے افقات نے مشکل بن دیا
 نفس لڑنے ڈوٹے لذت کو کشش تو تھی جو چنگ لینے دوسر کو بال پر سے کھیل لینے دو
 خبر نہیں مرا تنکوں کا ایک جا کھڑا ہے بجلیوں کے لئے یا کو آستیاں کے لئے
 میں تو الفت میں وفا کر کے پشیمان ہوا دیکھتا تم نہ وفا کر کے پشیمان ہوتا
 خود اپنے ہاتھ سے چمن اپنا مٹا دیا شرمندہ برق سے ہیں گل آسمان سے ہم

ان اشعار سے شاعری قوت بیان، غریب ادب اور ہندی ذوق پوری طرح نمایاں ہے اور ملک کو اقبال تک فہم پٹنہ کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس نے اس مجموعہ کو شائع کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ قیمت چار روپیہ، کتابت و طباعت پسندیدہ، کاغذ ہینر و مفید۔

رفیق صحت لاہور

ایک طبی رسالہ ہے جسے جناب حکیم اقبال حسن نے لاہور سے جاری کیا ہے۔ اس وقت تک اس کے دو نمبر ترقی اور پوری یا خبر کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور بہر ذریعہ بہت کامیاب ہیں۔ یہ دونوں مرض اپنی جگہ بڑے اہم مضمون ہیں جن میں علاج سے زیادہ تاخیر حفظ اعتدال کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ حکیم صاحب موصوفوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ ان امراض کے مختلف اہم تمام باتوں کو ظاہر کر دیا ہے جن کا جاننا ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور اسی کے ساتھ خود اپنے اور اپنے خاندان کے تجربے کے ہونے شماتت کو بڑی مفید خدمت انجام دی ہے۔ یہ التزام کہ ہر شخص نہ کسی مرض کے لئے مخصوص ہو بڑی سودمند کوشش ہے اور ملک کو اس سے فوری فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اس رسالہ کا سالانہ چند حکیم صاحب نے صرف دو روپیہ اس طے کیا ہے کہ عوام زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ خود اعلیٰ پتہ سے طب کیا جائے حکیم اقبال حسن صاحب بمبئی دربارہ انگریزی بخش لاہور۔ ہندوستانی میں جو صاحب اس کو لیتا چاہیں وہ اپنا چندہ دفتر لکھیں یہی بھیج سکتے ہیں۔

کتبہ اردو لاہور سے ہر سال ایک مجموعہ کچھ سال کے بہترین مقالات و مضامین کا شائع ہوتا رہتا ہے چنانچہ

۱۹۵۷ء کا بہترین ادب اسی سال بھی حسب معمول شائع کے بہترین ادب کے نام سے مجموعہ شائع کیا گیا ہے جو اردو صحافت کو تحفہ ہے۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہاز ران کمپنی

بحر احمر اور مارشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ

بئی سے

عدن، جدہ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت
باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ضرورت
پڑنے پر دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کر سکیں گے

مزید معلومات کے لئے

صوبہ ذیل پتہ پر لکھئے

ٹرنر مارین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ بینک سٹریٹ۔ بمبئی

مختم ہو چکا تھا اور جس کی انگلیں ہاتھوں کے ساتھ
 دو بارہ ٹالچے لگایا ہے یونہی کے مطابق
 کے لئے اس کا بڑھنا از بس ضروری ہے
 (مختم ہو چکا تھا اور جس کی انگلیں ہاتھوں کے ساتھ)

